جامعہ سلفیہ کے پہلے ناظم اعلیٰ

مولانا عبدالوحید صاحب سلفیؒ کی حیات و خدمات

پر

خصوصی شمارہ

بفـ

★

عدد مسلسل ۹۶، ۹۷ ● جمادی الآخرة، رجب ۱۴۱۱ھ ● جنوری، فروری ۱۹۹۱

شمارہ ۱/۲ / جنوری، فروری ۱۹۹۱ء | جمادی الآخرۃ، رجب ۱۴۱۱ھ / جلد ۹

جناب مولانا عبدالوحید صاحب سلفیؒ کی حیات و خدمات

پر

خصوصی شمارہ

مدیر

عبدالوہاب حجازی

پتہ

دارالتالیف والترجمہ

بی ۱۸/۱ جی ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰

بدلِ اشتراک

سالانہ ۵۰ روپئے، فی پرچہ ۴ روپئے۔ اس شمارہ کی قیمت ۸ روپئے — اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب آپکی مدتِ خریداری ختم

ع. ق. نیفی،

اس شمارہ میں

مقالات و تاثرات

منظومات

تاریخی مادے اور قطعات

مقالات و تاثرات

افتتاحیہ

کچھ ناظم صاحب رحمہ اللہ کے بارے میں

جناب مولانا عبدالوحید صاحب سلفی رحمہ اللہ سابق ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ بنارس وسابق امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی حیات وخدمات پر مشتمل ماہنامہ محدث بنارس کا خصوصی شمارہ قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے، مرحوم کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالنے کے لئے یہ شمارہ کس قدر مفید ہے، اس کا فیصلہ قارئین کرام فرمائیں گے، ہم نے مواد کے جمع وترتیب کے لئے لمبا وقفہ صرف کیا ہے، اس کے لئے محدث میں پیہم اعلانات شائع کئے گئے، اور جماعت وجمعیۃ کے ذمہ دار اصحاب کو انفرادی طور پر خطوط لکھے گئے، کئی حضرات نے ہماری گذارش پر اپنی وقیع تحریروں سے نوازا، کچھ حضرات نے معذرت کا اظہار فرمایا، اور کچھ حضرات نے " خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری " کے رویہ کا اظہار فرمایا، بہرحال مرحوم

سے متعلق جماعت دجمعیۃ نے ماہنامہ محدث کو اپنی تحریروں اور تاثرات کا جو حصہ عطا فرمایا وہ ہدیہ قارئین ہے، اخلاص اور عمل صالح کی جنس کمیاب کے خریداروں کے لئے چند فقرے بھی کافی ہوتے ہیں، شاید اسی لئے جماعت سلفیین کے ہر دور میں بڑی بڑی شخصیات کے بھی مختصر احوال ملتے ہیں اور وہ غلو واغراق سے بھری ہوئی طولانی سوانح عمریوں پر بھاری ہوتے ہیں، شخصیات کے ٹھیک ٹھیک احوالُ اعمال کو احاطہ تحریر میں لے آنا یقیناً اہم کام ہے، البتہ اعمال کے اثرات کی جو تحریریں جمہور کے دلوں پر نقش ہو جاتی ہیں، ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

اس خصوصی شمارہ میں دوران تحریر اگر کہیں کچھ انتقادات آجائیں تو ان کے متعلق کسی جذباتیت کا شکار ہونے کے بجائے توازن کی راہ اپنانی چاہئے، صحافتی امانت کا تقاضا ہے کہ تحریریں من وعن شائع کی جائیں، قارئین کرام سے بھی گذارش ہے کہ امانت ودیانت کے زاویہ سے ان کا مطالعہ فرمائیں، نقد اگر بے جا ہو تو سلیم الفہم انسانوں کے لئے اس میں کلام کی گنجائش ہوتی ہے، اور اگر برمحل اور صحیح ہو تو اسے تسلیم کرلینا عین اسلام ہے، قرآن مجید نے متعدد انبیاء ورسل پر نقد کیا ہے، اور اسے قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی بڑی بڑی شخصیات کے احوال کو پرکھنے کا معیار قرار دیدیا ہے۔

ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہزاروں افراد پر مشتمل اپنے ذی ثروت قبیلہ کے سردار ہونے بڑے دولت مند ہونے کے ساتھ علم دین سے آراستہ ہونے، ممتاز تاجر ہونے کے ناطے شہر اور بیرون شہر کے حلقہ تجار میں نمایاں حیثیت رکھنے، خاندانی شرف ووجاہت کے سبب

شہر دبیرون شہر میں برادران وطن کے درمیان سیاسی روابط، اثر ورسوخ اور وزن رکھنے، مختلف ملی تنظیموں اور کاموں میں شریک وسہیم ہونے اور مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی سرپرستی میں قائم ہونے والے مشہور ادارے جامعہ سلفیہ کے ناظم اعلیٰ ہونے اور پھر مرکزی جمعیۃ اہلحدیث کے صدر اور امیر ہونے کی حیثیت سے ایسی تہ دار اور پہلودار شخصیت کے مالک تھے، کہ بزور انشار ان کا ایک ایسا مفصل تذکرہ مرتب کیا جا سکتا ہے جو انھیں حالیہ ملی تاریخ کی اہم شخصیات کے درمیان ایک نمایاں مقام دلا سکتا ہے، لیکن شخصیات اور ان کے کارناموں کو اچھالنا جماعۃ السلفیین کا شیوہ نہیں، اس کا اعتقاد ہے کہ "فاما الزبد فیذھب جفاء و اما ماینفع الناس فیمکث فی الارض" میل کچیل رائیگاں ہو جاتا ہے اور جو کچھ لوگوں کو فائدہ پہونچا سکتا ہے وہ زمین میں ٹک جاتا ہے۔

ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے حسنات میں سے اپنے خصوصی دست راست جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی معیت میں جامعہ سلفیہ بنارس کی بھرپور خدمت اور اسکی ذیشان نظامت ہے، غیر منقسم ہندوستان کی جماعت اہل حدیث کے غیور وجسور علماء کرام کے روابط مملکت سعودیہ عربیہ کے موحد ومتبع سنت ملوک سے ہمیشہ رہے ہیں، ان روابط کی واحد بنیاد توحید اور اتباع سنت تھی، تقسیم ملک سے خصوصیت سے شمالی ہندوستان کی جماعت اہلحدیث کی اجتماعی ہیئت پارہ پارہ ہو گئی تھی، مرکزی جمعیۃ کی سرپرستی میں قائم ہونے والے ادارہ جامعہ سلفیہ کے توسط سے جماعت کو بڑا سہارا ملا، موحد مملکت سے روابط اسطرح استوار ہوئے کہ جامعہ سلفیہ کو نہ صرف شاندار عمارات ملیں بلکہ

کے اعیان جماعت کا بڑا دخل تھا، بعض اہل حدیث خاندانوں کے روابط موحد مملکت سے بہت پرانے تھے، جامعہ سلفیہ کے لئے ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ان خدمات میں موحد مملکت سے جماعت وجمعیۃ اہل حدیث کے قدیم روابط کے ساتھ ان روابط کا بھی بڑا دخل تھا، جامعہ سلفیہ نے جب روابط کو تعاون کے فیضان میں تبدیل کردیا، توجماعت کے ایک سے زیادہ اولوالعزم اوربالغ نظر علماء نے جماعت کے بڑے حلقہ کوکئی ناحیوں سے اس تعاون سے مالامال کردیا۔

ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی قیادت کا بھی اعزاز حاصل ہوا، تقسیم ملک کے بعد جمعیۃ بے خانماں تھی، آپ کے دور قیادت میں جمعیۃ کے مختلف شعبہ جات کے شایان شان ایک قیمتی عمارت خریدی گئی، گوجماعت ابھی تک اس کے بارے میں مطمئن نہیں، جماعت مسلک کے لئے جو بلند عزائم اپنے سینے میں بطور امانت رکھتی ہے، اس کے پیش نظر جماعت کے افراد عموماً اس بات کے شاکی ہیں کہ اس دور میں بھی اس کے لئے کوئی کام نہ ہو سکا، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی پوری ذمہ داری ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر ڈالنا درست نہیں ہے، مسلکی احوال کی ناہمواری اور پیچیدگی کا بھی اس میں دخل ہے، قومی اور اکثریتی معاشرہ میں طبقہ واریت کی جڑیں ہزاروں برس پرانی ہیں، تمام مصلحین اسے بطور ایک حقیقت کے مان کر اس کے دائرے میں اپنی اصلاحی مساعی کے کاروبار پھیلاتے رہے

ہیں، مسلم معاشرہ سماجی طور پر اسی کا عکس اور مثنیٰ ہے جس سے بدقسمتی سے جماعت اہل حدیث بھی مستثنیٰ نہیں ہے، جماعت اہل حدیث اپنے بلند مسلکی عزائم میں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب اپنی راہ سے اس سنگ گراں کو ہٹا لے جائے ورنہ جماعت کے ہر قائد سے صرف اتنی ہی توقع رکھنی چاہئے، جتنا یہ دائرہ اسے اجازت دے۔

اخیر میں ہم اپنے ان علماء کرام اور شعراء حضرت کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اپنی منثور و منظوم دقیع نگارشات سے ہمیں نوازا، اور خصوصی شمارہ کی افادیت اور زینت میں اضافہ فرمایا، اللہ تعالیٰ ہمیں اخلاص اور اعمالِ صالحہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

مولانا عبدالوحید صاحب رحمانی
ناظم
مرکزی دارالعلوم بنارس
کے
چند خصائل اور اوصاف حمیدہ کا تذکرہ

مولانا عبدالرؤف الرحمانی جھنڈانگری

جناب مولانا عبدالوحید صاحب رحمانی ناظم مرکزی دارالعلوم بنارس گوناگوں صفات حسنہ واخلاق حمیدہ کے حامل تھے، موصوف ایک صاحب بصیرت، متواضع اور ملنسار وخوش مزاج عالم تھے، ان سے جو بھی ملتا تھا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، وہ بڑے ہی متحمل مزاج اور صائب الرائے تھے۔ جس زمانہ میں مدنپورہ کے اکھاڑے کے پاس جدید طرز پر دو منزلہ جامعہ رحمانیہ تعمیر ہوا اس وقت حضرت مولانا منیر خان بنارسی کے صدر مدرس کے زمانہ ہی میں میں بھی جامعہ رحمانیہ میں مدرس ہو کر گیا تھا، اس وقت حاجی عبدالرحمن صاحب مرحوم کے تین فرزندگان نامی گرامی باحیات تھے، انھیں لوگوں کے دم خم سے بنارس میں دینی زندگی وبیداری کے جذبات دیکھے جا سکتے تھے۔

حاجی صاحب مرحوم کے ایک فرزند مولانا عبدالاحد تھے جو بہت ہی خوش اخلاق اور صاحب لطف وکرم تھے، دوسرے فرزند مولانا عبدالمتین صاحب تھے جو ایک جلیل القدر عالم اور ائمہ سلف اور شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی کتابوں کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے، علم تفسیر اور تاریخ وسیر پر انھیں کافی عبور تھا، یہ مسجد طیب شاہ مدنپورہ کے بہترین خطیب اور ولولہ انگیز بصیرت افروز مقرر تھے، اور تیسرے حاجی عبدالحق صاحب مرحوم تھے جو بہت کم سخن اور کم آمیز تھے۔

انہیں حاجی عبدالحق صاحب مرحوم کے فرزند ارجمند مولانا عبدالوحید صاحب سلفی تھے جو شکل وصورت میں بڑے ہی حسین وجمیل تھے اور ان کو قد وقامت بھی بہت موزوں اور معتدل عطا ہوا تھا، قدرت نے انہیں حسن وجمال کے ساتھ ساتھ حسن اخلاق سے بھی نوازا تھا، اور اخلاق عالیہ کا پیکر ومظہر بنایا تھا ۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

بنارس میں اپنے درس کے زمانے میں جبکہ میں بالکل نوجوان تھا مولوی یحیٰ صاحب فرزند ارجمند مولانا عبدالمتین صاحب اور مولانا موسیٰ صاحب فرزند حاجی محمد ادریس صاحب مرحوم مولانا الیاس صاحب فرزند حاجی محمد صاحب کوٹھا والے، مولوی عبید الرحمن صاحب فرزند حاجی مٹھو میاں وغیرہ موجود تھے، میرا تعلق ربط وارتباط صرف مولانا عبدالمتین اور مولانا عبدالاحد مرحوم سے زیادہ تھا رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

اسی طرح جب میں نے آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس نوگڈھ میں ایک مرکزی دارالعلوم کے قیام کی اہمیت وضرورت بڑی شدت سے بتائی اور جماعت سے اس کے لئے اپیل کی، اس وقت بنارس میں مرکزی دارالعلوم کے بنانے کا کوئی قومی منصوبہ نہیں تھا، مختلف احباب سے یہ تقاضا ہو رہا تھا کہ مرکزی دارالعلوم کے لئے جگہ کون دے گا، تو اس وقت موضع جمنی حلقہ بانسی کی جماعت نے بھی اس کے لئے ایک زمین کی پیش کش کی تھی، جس کا اعلان بھی اخباروں میں آگیا تھا، لیکن مرکزی دارالعلوم کی ضرورت کے پیش کرنے کے موقع پر بنارس کے عالی ہمت اصحاب خیر میں حاجی صدیق صاحب مرحوم اور مولانا عبدالوحید صاحب مرحوم اور چند خواص نے مرکزی دارالعلوم کو بنارس میں قائم کرنے کی خوشخبری سنادی، سارے اہل حدیث اخوان واکابر اچھی طرح سے واقف ہیں کہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس نوگڈھ کی برکات میں خود ایک عظیم برکت مرکزی دارالعلوم بنارس کا وجود ہے۔

اس طرح جب مرکزی دارالعلوم بنارس نے عملی شکل اختیار کی تو ایک جلسہ عام منعقد ہوا، مولانا عبدالوحید نے ازراہ محبت مجھ سے تقاضا کیا کہ اس جلسہ میں چندہ کے لئے تحضیض و ترغیب کے کلمات کہتا رہوں، اور لوگوں کی امداد وعطیات کے سلسلے میں شکریہ کے کلمات عرض کرتا رہوں، جب مدراس کے سی فضل الرحمن صاحب نے اس جلسہ میں اپنے والد حاجی عبدالشکور صاحب مرحوم کی طرف سے ۲۵ ہزار کے گرانقدر عطیہ کا اعلان کیا تو میں نے بھی اس کا بھرپور شکریہ ادا کیا، اللہ تعالیٰ عبدالشکور صاحب مرحوم پیارم پیٹ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کی آخری منزل میں انھیں ہر طرح کا آرام وسکون نصیب کرے۔

اسی طرح جب علاقائی طور پر ۵ ہزار روپیہ مہیا کرنے کے لئے ایک معینہ تاریخ مقرر کی گئی تو ہم نے بھی پانچ ہزار روپیہ مختلف مقامات ومواضعات کا دورہ کرکے فراہم کیا، اور مرکزی دارالعلوم کو یہ رقم روانہ کردی گئی، اس زمانے میں پانچ ہزار روپیہ کی بڑی قیمت تھی، مجھے یاد ہے کہ خوب چلچلاتی ہوئی دھوپ اور سخت گرمی کے ایام میں بس رکشوں سے دورہ کرتا ہوا گاؤں گاؤں پہنچتا تھا، اور کبھی جب سڑک سے گذرتے ہوئے سر راہ کوئی نل نظر آجاتا تو پانی پی کر تسلی حاصل کرلیتا، صبر وسکون اور نیکی کی لالچ سے ایک بڑے مقصد کے خاطر اس پر صعوبت سفر کو میں نے گوارا کیا۔

مولانا مرحوم کے لئے بھی یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ دیگر دینی مدارس کا بھی وہ خیال رکھتے تھے، اور ان کے لئے بھی اپنے مناسب

مشورے اور صائب رائے کو برمحل پیش کرتے تھے، چنانچہ جب پہلی بار میں رابطہ کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے سعودیہ اور رابطہ کے اجلاس سے فارغ ہو کر الدکتور مولانا وصی اللہ کے گھر مقیم تھا تو عقیقہ کی دعوت میں مولانا عبدالوحید صاحب مرحوم اور مولانا ازہری صاحب بھی تشریف لائے تو میں نے پیشاب رک جانے کا عارضہ پیش کیا اور تکلیف کا ذکر کیا، تو اس وقت مولانا ازہری صاحب نے فرمایا، اس تکلیف کے عالم میں آپ کا سفر کرنا مناسب نہیں ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ ہندوستان لوٹ جائیں، اور وہاں اپنا علاج و معالجہ کرائیں ان کا بھی مشورہ «النصح لکل مسلم» کے تحت خیر پر مبنی تھا، لیکن مولانا عبدالوحید صاحب مرحوم نے ان کے مشورہ کے خلاف ایک دوسرا مشورہ یہ دیا کہ آپ کو خدا نے یہاں تک پہونچا دیا ہے، آپ اس وقت مکہ مکرمہ میں ہیں، اور کویت کا ٹکٹ وغیرہ آچکا ہے، آپ اللہ کا نام لیکر اپنا سفر جاری رکھئے، ایسے مواقع بار بار نہیں آتے، آیا ہوا موقع ضائع نہ کریں اور آپ کویت ضرور جائیں، وہاں بھی اللہ کے بندے ہیں آپ کی مدد کریں گے، وہاں اسپتال و شفاخانے ہیں، ضرورت کے وقت وہاں بھی رجوع کرسکتے ہیں، اس دوسری رائے کو مدرسہ کے ساتھ عشق و محبت کے نظریہ نے مجھے قبول کرنے پر مجبور کر دیا، چنانچہ میں کویت اس سال گیا، وہاں کے اہل خیر حضرات نے ابتدائی تعارف کے زمانہ میں ایک طرح کی معقول امداد کردی، اور وہاں میری تکلیف کا علاج بھی ہوتا رہا، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو ان کے نیک و محبت آمیز مشورے کا بہترین صلہ دار آخرت میں عطا فرمائے۔

اسی طرح مرحوم سے میں نے اپنی مدد کے لئے توصیہ کے کلمات طلب کئے تاکہ اہل خیر حضرات کے سامنے اسے پیش کرکے اپنی مدرسہ کے لئے مساعدت حاصل کروں، چنانچہ آپ نے مولانا ازہری صاحب سے لکھوا کر بہت اچھا توصیہ عنایت فرمایا۔ جن میں میری جدوجہد کی اور میرے امانت داری اور خدمت گذار ہونے کی بھی تصدیق تھی، اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کے دل میں یہ بات ڈال دی، انہوں نے ہماری امانت و دیانت کی بھرپور تصدیق کی، اگر کوئی شخص وصول تحصیل کرکے بددیانتی سے مدرسہ کی رقوم کو کھا جائے تو اس کی وصول تحصیل لغو و بیکار ہے، لیکن مولانا کو حقیقت پسندی کے ساتھ یہ بات قطعی طور پر معلوم ہو چکی تھی کہ میں مدرسہ کے ساتھ اپنی الفت و محبت میں اور اس کی رقوم کو بادیانت خرچ کرنے میں کس قدر مخلص واقع ہوا ہوں۔

ایک دفعہ میں کویت میں تھا جبکہ میں آج سے بہت زیادہ قوی تھا، میری عمر اس وقت ۶۴، ۶۵ سال کی تھی، اس وقت کویت میں ایک صاحب نے کہا کہ "ألم يوجد فيكم أقويا؟" کیا تمہاری جماعت میں قوی اور زیادہ طاقتور نہیں پائے جاتے ہیں، میں نے کہا، نعم یوجد ولکن لا یوجد أمناء۔ میں نے کہا ہاں: قوی و طاقت والے پائے تو جاتے ہیں لیکن ان میں دیانت و امانت داری کی صفت نہیں پائی جاتی، جب ان میں امانت داری کی صفت نہ ہو تو قوی ہونے سے کیا حاصل؟۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس بات کا افسوس ظاہر کیا تھا کہ اصحاب علم ملتے ہیں مگر ان میں کارکردگی اور امانت و دیانت کے اوصاف

مفقود ہیں، اس لئے میری یہ تمنا ہے کہ ہم میں عبیدہ بن جراح جیسے امین الامۃ لوگ پیدا ہوں۔

مرحوم کو خدا نے فن تعمیر میں شاہجہانی ذوق عطا فرمایا تھا، مرکزی دارالعلوم کی حسین وجمیل اور بلند وبالا عمارتیں آپ کے اس ذوق کی آئینہ دار ہے، جس طرح بادشاہ شاہ جہاں نے دہلی اور اس کے اطراف واکناف میں تعمیرات کے بے نظیر اور نادر نمونے چھوڑے ہیں، اس طرز کی نوع بنوع حسین وجمیل عمارتیں آپ کی زندہ وجاوید یادگار ہیں، مرکزی دارالعلوم کی بلند وعظیم الشان مسجد بنائی جو ایک منزلہ کے باوجود دو منزلہ معلوم ہوتی ہے، محراب ومنبر اور در ودیوار میں عجیب جدت اختیار کی گئی ہے، اور نقش ونگار سے در ودیوار خوب آراستہ وپیراستہ ہیں، اس طرح دارالحدیث کی عمارت اپنی شان میں یکتا ومنفرد ہے، اور اس کی چھت کی بالائی منزل کے قریب جو چہار جانب سے گوشے نکالے گئے ہیں وہ بڑا ہی خوبصورت منظر پیش کرتا ہے، اس طرح مرکزی دارالعلوم کا مستحکم اور شاندار گیٹ اپنے بانی مرحوم کی ہمت واستقلال کی یاد دلاتا ہے، الغرض دارالعلوم کا گوشہ گوشہ اور اس کی چمن بندیاں اور چہار جانب گملوں کی قطاریں پر بہار منظر پیش کرتی ہیں، اور خوبصورت ومستحکم پانچ منزلہ عالی شان مہمان خانہ اور اس کے بہترین ومنظم انتظامات کی تعریف وتحسین سے قلم قاصر ہو رہا ہے، دارالعلوم کے اندر یہ سب جلوہ افروزیاں اور کارہائے اہتمام مولانا مرحوم کے مشورے اور اشارہ ابرو سے انجام پاتے تھے، اس فن تعمیر میں آپ پورے خاندان میں یکتا اور بے نظیر وبے مثال تھے، جزاہ اللہ خیرًا۔

اسی طرح ایک بار مرکزی دارالعلوم کی خوش بختی واقبال مندی کے تحت منیصل مرحوم سے ایک عطیہ مرکزی دارالعلوم کے لئے منظور ہوا، لیکن مملکت سعودیہ کے ادارہ مالیہ نے نہ معلوم کس غلط فہمی کے سبب جامعہ اسلامیہ بنارس کے نام اس عطیہ کا ڈرافٹ بنا دیا جو سفارت خانہ سعودیہ نئی دہلی میں آگیا، مرکزی دارالعلوم کے بغل میں ہمارے دیوبندی نقطۂ نظر کے حاملین کا یہ مدرسہ جامعہ اسلامیہ کے نام سے تھا، یہ ڈرافٹ جامعہ اسلامیہ والوں کو مل گیا، اور ہمارے ادارہ مرکزی دارالعلوم کو نہ مل سکا، اس سلسلہ میں انہوں نے پیہم کوششیں جاری رکھیں، اس امید وبیم کے عالم میں کبھی امید بندھتی تھی کبھی کٹ جاتی تھی، اس وقت یہ حال تھا جو کسی شاعر نے اپنے شعر میں پیش کیا ہے ؎

چوں یک گرہ کشایم دیک عقدہ وانمایم
گرہے وسخت گرہے وکارے وسخت کارے

اس وقت مولانا مقتدی حسن ازہری صاحب / حفظہ اللہ بھی ساتھ تھے، انہوں نے بھی اور خاص طور پر مولانا مختار ندوی نے بھی اس گرہ کشائی میں امداد چاہی، مگر بقول شاعر ؎

مشورے دے کے ہٹ گئے احباب
آڑے آیا نہ کوئی مشکل میں

مولانا مرحوم نے اس نازک لمحہ میں جس طرح صبر وتحمل اور ثبات قدمی وبیدار مغزی سے کام لیا اس کی تفصیل کا موقع نہیں، لیکن جو لوگ اس معاملہ سے واقف ہیں وہ ان کے حسن تصرف کے آج بھی معترف ہیں، دینی مدارس میں بھی سرکاری تعلیمی اداروں کی طرح ناخوشگوار صورتحال پیش آتی رہتی ہے، مرکزی دارالعلوم میں بھی اس طرح کے بعض حالات پیش آئے جس کے حل کرنے میں ناظم صاحب کی بروقت مساعی حمیدہ سے نازک صورتحال پر کنٹرول ہوا، اور مسائل بہت خوش اسلوبی سے حل ہو گئے، آپ کے تجربہ کار ذہن اور اصابت رائے نے اس قضیہ نامرضیہ کو جس ڈھنگ سے حل کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔

عربی مدارس کے طلبہ میں اب اساتذہ اور عملہ وخدام و دربان کی مارپیٹ اور مدرسہ کے سامان توڑ پھوڑ اور اپنے اساتذہ کے ساتھ بدزبانی وبدتہذیبی کرنے کی وبا آج عام ہوتی جارہی ہے، اور دینی مدارس میں یہ وبا پھوٹ پڑی ہے، اس کی کوئی نظیر ہم عہد سلف میں نہیں دیکھتے۔

اس دور میں کبھی اساتذہ ومشایخ کے خلاف نہ کوئی بغاوت ہوتی تھی نہ کبھی کوسرکشی وسرتابی کا منظر سامنے آتا، کتب تاریخ میں ابن الجوزی کی صفۃ الصفوۃ، علامہ ذہبی کی تذکرۃ الحفاظ، حافظ ابن کثیر کی البدایۃ والنہایۃ اور علامہ یافعی کی مرآۃ الجنان اور نواب صدیق حسن کی اتحاف النبلاء، اور ذہبی کی سیر اعلام النبلاء وغیرہ وغیرہ میں نے پڑھی ہے، طلبہ کی اساتذہ سے بغاوت اور علم وتعلیم کے مشغلہ کے بجائے سرکشی وسرتابی بلکہ آج کے حالات کے تحت سرکوبی وظلم وتشدد اور وحشت وبربریت کے واقعات کسی کتاب میں مذکور نہیں، آج کا جو ماحول ہے اس ماحول کو سدھارنے کیلئے حسن انتظام حسن تربیت وبیدار مغزی، اعلیٰ تدبر ودوراندیشی، اساتذہ طلبہ کے ماحول پر پورا کنٹرول اور پوری طرح گرفت اپنے حیطۂ اقتدار میں رکھنی چاہئے، ایسے ہی ہوشیار پُرتاثیر اور پرقوت لوگوں کے ہاتھوں میں یہ عربی مدارس ترقی پذیر بھی رہیں گے اور مفید ونفع بخش بھی ہوں گے، ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کیا خوب لکھا ہے ؎

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹوں میں ہو خوئے حریری

یعنی یہ طلبہ جو پھولوں کی طرح کھل رہے ہیں ان کے لئے کانٹوں کا حصار ضروری ہے یہی قدرت کا انتظام ہے تاکہ ان پھولوں کی حفاظت ہے اگر یہ کانٹے ریشم کی طرح نرم ہو جائیں تو ہر ایک ہاتھ پھول تک پہنچ جائیگا اور پھول مجروح ہوتے رہیں گے، تو اسی طرح ناظمین مدارس کو بھی اپنے ان طلبہ کی حفاظت جو پھول کی طرح ہیں کانٹا بنکر اور ضرورت پر سخت گیر ہوکر کرنی چاہئے تاکہ یہ طلبہ آوارگی وشورش پسندی اور بداخلاقی وکردار سے محفوظ رہیں۔

حلم وبردباری

انتہائی خوشحال ومالدار ہونے کے باوجود کبر ونخوت سے بالکل دور رہتے ، غرور وگھمنڈ ان کو چھو کر بھی نہیں گیا جامعہ سلفیہ کی نظامت سے لے کر جماعت کی قیادت تک وہ تواضع اور خاکساری کا مجسمہ تھے ، منصب وعہدہ کا نشہ کبھی بھی ان کے ذہن ودماغ میں نہیں پیدا ہوا ، بلکہ اپنے تمام فرائض وذمہ داریوں کو نہایت خوش اسلوبی اور خاکساری کے ساتھ انجام دیتے رہے ۔ صبر وضبط تحمل وبردباری ان کی نمایاں ترین صفت تھی ، مختلف مواقع پر ان کے صبر وتحمل کا عین مشاہدہ کیا گیا ہے ۔

علماء وطلبہ کی تعظیم

اتنے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود علماء وطلبہ کی انتہائی تعظیم وتکریم کرتے تھے ، کبھی بھی آپ (نعوذ باللہ) کسی عالم کی توہین وتحقیر کے درپے نہیں ہوئے ، شاید کسی بھی استاذ کو اپنے دور نظامت میں نوٹس نہیں دیا بلکہ ان کی خدمت کو وہ اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے ، اپنے جوانی کے زمانہ میں کسی بھی تقریب کے موقع پر علماء وطلبہ کو کھانا کھلانے میں پیش پیش رہتے تھے ، خدام کی کثرت کے باوجود یہ کام خود بھی اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے تھے ، عدل وانصاف کے پیکر تھے ، معاملات میں سب کو ایک نظر سے دیکھتے تھے ۔

خندہ پیشانی کیساتھ ملاقات کرنا

ان کا نورانی چہرہ ہمہ وقت منور وروشن رہتا تھا ، ہر وقت لبوں پر مسکراہٹ رہتی تھی ، جس سے بھی ملاقات کرتے ہنستے اور مسکراتے ہوئے چہرہ سے ملتے ، اس طرح ملاقات کرنے کا انداز میں نے بہت لوگوں میں دیکھا ہے ، فرمان رسول ہے کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو اس پر تاحیات عمل پیرا رہے میرا ذاتی واقعہ ہے کہ میں جب کبھی بنارس پہونچا ، پہلی ملاقات کے وقت سلام ومصافحہ پر قناعت نہیں کرتے ، بلکہ اٹھ کر بغلگیر ہو کر خوشی خوشی معانقہ کرتے ، ان سے ملاقات کرنے کا بہترین موقع سب سے محبوب ترین جگہ تھی ، وہاں نہایت ہی آسانی سے ملاقات ہو جاتی ، اساتذہ وطلبہ اور دوسرے ضرورتمند حضرات مسجد ہی میں زیادہ ملاقات کرتے تھے ۔

اصلاح میں شفقت وحکمت کا لحاظ وخیال

اگر کسی کے اندر کوئی خامی یا کوتاہی نظر آتی تو اسے بھی خنداں رو ہو کر اس کی اصلاح کی تلقین فرماتے ، رعب ودبدبہ ، تخویف وتہدید کا اندازہ ذرا بھی نہیں ہوتا ، مولانا عبد الحنان صاحب جو اس وقت مرکزی دار العلوم میں مدرس تھے ، اور آجکل ہمارے جامعہ سراج العلوم میں تدریسی فرائض انجام دیتے ہیں ، ان کا بیان ہے کہ مجھے بھی جامعہ سلفیہ کے چار سالہ دور میں مولانا مرحوم نے دو باتوں کی تلقین فرمائی ، ایک لباس وپوشاک کے سلسلہ میں ، ایک پان کھانے کے بعد مناسب جگہ تھوکنے کے سلسلہ میں ۔ لباس کے سلسلہ میں زیادہ اہتمام نہیں کر پاتا تھا اس لئے ازراہ خیر خواہی وفود مشائخ کے آنے سے قبل ہی مجھے بلا کر چپکے سے اس کی ہدایت کر دیتے اور تاکید فرماتے

کہ شیروانی پہن کر آئے گا۔

مجھے پان کھانے کی عادت ایک زمانہ سے ہے، ایک روز چلتے چلاتے جامعہ کے جنوبی برآمدے میں میری ان کی ملاقات ہوگئی، حسب معمول خندہ کے ساتھ وہ ملے اور کندھے پر شفقت ومحبت سے ہاتھ رکھ کر نصیحت فرمائی کہ جہاں پائپ لگا ہے مولانا وہیں تھوکئے، فجزاہ اللہ أحسن الجزاء۔

طلبہ کے کھانے کا بہترین انتظام

عربی مدارس میں جہاں سو دو سو لڑکے باہر کے قیام پذیر رہتے ہیں، وہاں اکثر وبیشتر کھانے پینے کے مسائل میں بڑی ابتری وبدنظمی قائم رہتی ہے، کبھی ٹھیک سے چاول نہیں پکتا اور کبھی دال نہیں گلتی، اور کبھی سالن کا رنگ وروغن اور نمک ومصالحہ ٹھیک نہیں رہتا، لیکن مرکزی دارالعلوم میں کھانا وناشتہ اس قاعدے کا ہوتا ہے کہ جیسا کہ ہمارے اطراف واکناف ودیگر ضلعوں وصوبوں کے تمام طلبہ اس کھانے اور ناشتے میں اچھی طرح سے مطمئن ہیں، اور وہاں ہر طرح سے ان کی تسلی ودلداری کی جاتی ہے۔ بنارس کے وہ معزز ومقتدر حضرات جن کے دامن تربیت میں مرکزی دارالعلوم آباد ہے، ان کی خورش اور اچھی غذاؤں کا اہتمام خود ان کے گھروں میں بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ تر ہوتا ہے تو ایسے حضرات کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کے طلبہ کا کھانا یا ناشتہ کمتر یا کمزور ہو، اس لئے میں یقین سے کہتا ہوں اور اکثر اپنی طرف کے طلبہ کی مسموعہ روایات پر اطمینان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مرکزی دارالعلوم میں طلبہ واساتذہ کے کھانے کا معیار ہندوستان کے تمام سلفی مدارس کے مقابلہ میں ممتاز اور لائق غبطت ہے۔ میں نے حسب حال قدرے تصرف کے ساتھ یہ شعر کہا ہے۔ ؎

نعمت ہند فراواں بود اما نرود ٭ یاد کاشی نہ دل حسرت نان کاشی

اللہ تعالیٰ ہمارے مرحوم ومغفور مرکزی دارالعلوم کے بہترین ناظم وبہترین مہتمم اعلیٰ درجہ کے مہمان نواز طلبہ واساتذہ کی سرپرستی ونوازش رکھنے والے کے ساتھ اپنی کرم فرمائی وکرم گستری سے ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطاء فرمائے، اور ان کے اخلاق اور ان کی عالی تبار اولاد کو ان کی سچی جانشین کی توفیق بخشے، اور خاندان کے بقیہ افراد کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی سعادت نصیب فرمائے، ہم بارگاہ الٰہی میں رحمت الٰہی کے نزول کے لئے ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم کے لفظوں میں دعا مانگ رہے ہیں۔ ؎

نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا ٭ مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا،

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ٭ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اوّل ناظم جامعہ سلفیہ اور سابق امیر جمعیۃ اہلحدیث ہند رحمہ اللہ کی یاد میں

از مولانا محمد الاعظمی صاحب ــــــــــــ شیخ الجامعۃ العالیۃ العربیۃ مئو

حضرت مولانا عبدالوحید صاحب ناظم اول جامعہ سلفیہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے راقم الحروف کو تعارف و تعلق کی سعادت جامعہ سلفیہ کی تاسیس کے تقریباً دو تین سال بعد حاصل ہوئی، اپنی حرماں نصیبی اور نااہلی کے نتیجہ میں بنارس کے اہل علم و فضل اور اصحاب قدر و منزلت میں سے سوائے چند بزرگوں اور عزیزوں کے کسی سے اب تک تعارف کی توفیق حاصل نہیں ہوسکی ہے، ۱۳۶۸ھ میں ہم لوگ (مولانا مختار احمد ندوی مدظلہ اور راقم الحروف وغیرہ) حضرت مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی رحمہ اللہ کی خدمت میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے لئے حاضر ہوئے تھے، اور ۲۸ صفر ۱۳۶۹ھ کو حضرۃ الاستاذ پر دوسرا یا تیسرا فالج کا جان لیوا حملہ ہوا، اور ایک ساعت کے بعد ہی ہم تشنگان علم کو گریاں و بریاں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے، رحمہ اللہ و رفع درجتہ۔

بنارس کے اس مختصر دور طالب علمی میں ایک مرتبہ جامعہ رحمانیہ کی زیارت کا اتفاق ہوا، وہاں کے ایک مدرس مولانا عبید اللہ پیغمبر پوری مرحوم کی مجلس درس میں حضرت مولانا عبدالوحید صاحب رحمانی شیخ الجامعہ کو غالباً کافیہ پڑھتے ہوئے دیکھا تھا، اس لئے آں محترم سے قیام جامعہ سلفیہ تک صرف صورت آشنا ہونے کا تعارف رہا۔

حضرت مولانا سیف بنارسی رحمہ اللہ کی وفات کے دوسرے یا تیسرے روز مدرسہ سعیدیہ کے باقی و جاری رہنے کے مسائل پر غور و فکر کے لئے ایک مجلس منعقد ہوئی تھی، اسی مجلس میں بنارس کے مشہور خانوادۂ علم و فضل کی دو بزرگ ہستیوں (مولانا عبدالماجد اور مولانا عبدالمتین رحمہما اللہ) کی دید و شنید کا شرف پہلی بار حاصل ہوا تھا، ہم ادنیٰ طالب علموں کو یہ جرأت کہاں ہو سکتی تھی کہ ان سے لقاء کی منزل تک پہونچ پاتے۔

جب جامعہ سلفیہ کی تاسیس کا زمانہ آیا تو مئو اور بنارس کے درمیان جماعتی اور انفرادی سطح پر باہمی تعارف و تعاون کا آغاز

ہوا، غالباً ۱۹۶۲ء میں جامعہ سلفیہ کی تاسیس وتعمیر کے لئے تعاون ومساعدہ حاصل کرنے کی غرض سے معززین بنارس کا ایک وفد مئو آیا تھا جس میں الحاج صدیق صاحب مرحوم، مولانا عبدالقدوس صاحب حفظہ اللہ اور شاید حضرت مولانا نذیر احمد صاحب املوی رحمہ اللہ اور ان کے علاوہ اور حضرات بھی شامل تھے۔ اس وقت ناچیز کے سر پر جامعہ عالیہ عربیہ مئو کے نائب ناظم اور جمعیۃ اہل حدیث مئو کے ناظم ہونے کی پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس لئے اپنے مخلص بزرگوں نے ناچیز کو اس سعادت سے سرفراز کیا کہ اس عظیم وفد کے ساتھ دامے درمے معاونین ومحسنین کی نشاندہی اور ملاقات کراتے ہوئے خود بھی تعاونِ قدمے کا اجر حاصل کروں، ورنہ بلا مبالغہ اپنی حیثیت تو یہ تھی کہ۔ ع

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

اس کی تصدیق کے لئے یہی کافی ہے کہ اس وفد نے واپسی کے بعد جو رپورٹ شائع کی تھی اس میں میرے نام کے بجائے حکیم مولانا عبدالباقی صاحب کا اسم گرامی لکھ کر وفد کے وقار کو دوچند کیا تھا، جب کہ حکیم موصوف اپنی مصروفیت کی وجہ سے وفد کی رفاقت میں شاید ہی کوئی حصہ لے سکے تھے۔ ابھی تازہ واقعہ ہے کہ گذشتہ ستمبر میں جامعہ سلفیہ کی جو کمیٹی ہوئی تھی، اس میں محترم ناظم جامعہ سلفیہ حفظہ اللہ کی دعوت پر مئو سے یہ ناچیز اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ناظم جامعہ فیض عام مئو ایک ساتھ شریک ہوئے تھے مگر ترجمان ہفت روزہ دہلی میں اس کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تو شرکائے کمیٹی کی فہرست میں اس ناچیز کا نام ناقابل ذکر ہونے کی وجہ سے دوسرا نام مولانا عبدالحلیم صاحب ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ اس کمیٹی میں مئو سے ہم دو کے علاوہ کوئی تیسرا شریک ہی نہیں تھا۔ ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعویٰ پہ یہ حجت ہے کہ مذکور نہیں

اب حضرت ناظم مرحوم کی حیات وخدمات پر کچھ لکھنے کے لئے محترم مدیر محدث حفظہ اللہ نے اس ناقابل ذکر شخص کو یاد فرما کر عزت افزائی فرمائی تو سخت حیرت ہوئی کہ مدیر محترم سے یہ سہو کیسے ہوگیا؟ ظاہر ہے کہ ایک مجہول اور ناقابل ذکر شخص کے قلم سے کسی عظیم ہستی کا تذکرہ سرتاسر اس کی عظمت پر دھبہ اور تحقیر ہے، اِلّا یہ کہ مذکورہ دونوں واقعات کی طرح اس قلمی حقیر کوشش کا انتساب کسی بڑی شخصیت یا معروف صاحب قلم کی طرف کر کے منظر عام پر لایا جائے تاکہ تذکرہ نگار اور صاحب تذکرہ کی سطح مساوی ہو۔ یہ عرض داشت شکایۃً یا تواضعاً نہیں ہے، بلکہ اپنی بے ننگ ونامی پر اثبات حجت اور مدیر محترم کی عزت افزائی پر خوشی کے ساتھ اظہارِ حیرت ہے۔

جامعہ سلفیہ بنارس ہماری پوری جماعت کا مرکز وماویٰ ہے، اس کی جانب سے کسی خدمت کی پیش کش مجھ جیسے ناچیز کے لئے بہت بڑا اعزاز ہے، جس کو قبول نہ کرنا بہت بڑی ناسپاسی ہے، اس لئے حضرت ناظم صاحب مرحوم کے حالات زندگی سے قلیل واقفیت

کے باوجود اپنی محدود معلومات کو بطور نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی یہ حقیر کوشش کی گئی ہے ۔

سلسلۂ تعارف

جامعہ سلفیہ میں افتتاح تعلیم کے بعد حضرت ناظم صاحب مرحوم سے راقم الحروف کو ملاقات اور ایک طرفہ تعارف کی سعادت ایک دو سال تک کبھی کبھار حاصل ہوتی رہی، لیکن جانبین سے تعارف کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب آں مرحوم وفد کی شکل میں مئو تشریف لائے تھے۔ رمضان المبارک کا مہینہ تھا.. راقم الحروف بازار جانے کے ارادے سے اپنے مکان سے نکلا تو سامنے صحن میں (دو تین) ذی وجاہت اجنبی بزرگوں کو دیکھا کہ سواری سے اتر کر ہاتھوں سے اشارہ کرتے ہوئے سوالیہ اور متحیرانہ انداز میں کچھ باتیں کر رہے تھے، میری خوش بختی ان کے قریب لے گئی، دیکھا کہ حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ، مولانا ابو عبید اللہ حریری مرحوم اور شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید صاحب مدظلہ العالی "نشان منزل، کارخانہ روغن احمر" معلوم کرنے کے لئے تحری کر رہے ہیں، ان حضرات کی رفاقت میں کارخانہ روغن احمر پہنچا، مولانا عبدالاحد صاحب مرحوم منیجر کارخانہ روغن احمر و ناظم جامعہ عالیہ عربیہ مئو اور ان کے صاحب زادے مولوی عبدالغفار انصاری مرحوم سے ملاقات اور تکمیل مقصد کے بعد دوسرے محسنین سے مل کر واپس ہوئے، جامعہ سلفیہ کے لئے حضرت ناظم مرحوم کی رفاقت اور ان کا تعاون جماعتی فریضہ ہونے کے علاوہ میرے لئے بہت بڑی سعادت تھی، لیکن انہوں نے بنارس پہونچ کر مولانا عبدالاحد صاحب مرحوم کے نام شکریہ کا خط لکھا تو اس میں ناچیز کے نام بھی سلام اور شکریہ کا پیام تھا، ہم لوگ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایک رئیس کبیر عالم اجنبی شہر میں کسی کے دروازے پر اس تواضع کے ساتھ حاضری دے سکتے ہیں، لیکن جامعہ سلفیہ کے لئے عزت نفس کی قربانی اور منتہائے اخلاص تک پہنچی ہوئی جفاکشی جو اسلاف کے تذکروں میں پڑھی جاتی ہے اس کی چلتی پھرتی تصویر حضرت ناظم والاجاہی کی ذات گرامی تھی، اس طرح کا ایک اور اہم واقعہ آگے بعنوان "مثالی مجاہدانہ قیادت" آرہا ہے،

مئو میں اس پہلی یا دوسری ملاقات و رفاقت کے صلے میں حضرت ناظم صاحب کی طرف سے سلام و شکریہ کے ساتھ یاد فرمائی کو ناچیز نے ایک ہنگامی اخلاقی مظاہرہ تصور کیا تھا، لیکن جلد ہی مجھ گنہگار کو اس بات پر تنبیہ ہوئی کہ یہ باطل تصور حضرت ناظم صاحب کی شان میں سخت گستاخی ہے، ان کے مکتوب گرامی مؤرخہ ۲۳ رجون ۱۹۶۶ء میں حسب ذیل عبارت پڑھ کر میرا ضمیر پکار اٹھا کہ موصوف " إِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ " کے پرتو ہیں، لکھتے ہیں:

" مرکزی دارالعلوم جماعت کی امانت ہے، اور جماعت کے ہر فرد کا فرض ہے کہ اس میں دلچسپی لے، حقیقت میں آپ حضرات کی توجہ اور تعاون ہی سے یہ کام اتنا بڑھ سکا ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں خلوص اور عمل میں سچائی پیدا کرے، آمین! امید کہ آپ بخیر ہوں گے، اپنی خیریت سے مطلع کیجئے گا، الخ "

مثالی مجاہدانہ قیادت

جامعہ سلفیہ کے ابتدائی دور میں جناب مولانا مختار احمد صاحب ندوی مدظلہ پوری سرگرمی کے ساتھ حضرت ناظم صاحب کے معاون خاص کی حیثیت سے جامعہ کی خدمت کرتے رہے لیکن جب ان کی ساری توانائیاں اور کاوشیں جامعہ سلفیہ سے منصورہ مالیگاؤں کی آبادکاری کی طرف منتقل ہوئیں تو حضرت ناظم صاحب "الامام جنة يقاتل من ورائه" کی عملی تصویر بن کر وفد جامعہ سلفیہ کے قائد کی حیثیت سے خارجی جہاد کے لئے بغیر لیت ولعل نکل پڑے، اللہ تعالیٰ نے مجھ فقیر کو گذشتہ سال جب زیارت سعودیہ کی سعادت سے نوازا تو ریاض میں عزیزم حافظ محمد اسماعیل حفظہ اللہ نے بتایا کہ حضرت ناظم صاحب جب پہلی مرتبہ جامعہ سلفیہ کا وفد لے کر حاضر ہوئے تو میں (محمد اسماعیل) بھی ان کے ساتھ ریاض میں ایک معروف محسن کے یہاں گیا، باریابی کے لئے ہم لوگ گھنٹوں دروازے پر انتظار کرتے رہے، میں گھبرا کر واپس چلا آیا لیکن حضرت ناظم صاحب کے پائے ثبات میں ذرا بھی لرزش نہیں ہوئی۔

جس ہستی کی عظمت شان کا یہ عالم رہا ہو کہ بڑے بڑے علماء و رؤسا اور اغنیاء اس کے یہاں باریابی کو فخر سمجھیں، وہ امانت عامہ کا بوجھ اٹھائے سمندر پار خود ایک اجنبی کے یہاں باریابی کے لئے انتظار کی کڑی دھوپ میں کھڑا تپ رہا ہے، اور تماشائے اہل کرم دیکھنے کے بلٰہ فی اللہ اپنی عزت و وقار کی قربانی پیش کر رہا ہے، اخلاص وایثار کی اور مثالیں نہ معلوم کتنی ہوں گی جن سے ہماری آنکھ اور کان ناآشنا ہیں۔ بلکہ کچھ ایسی سربستہ بھی ہوں گی جو صرف حضرت ناظم صاحب اور ان کے مولیٰ کے درمیان محدود ہوں گی۔

خلوص و حسن سلوک

آں مرحوم نے اپنے مذکورہ خط میں جس خلوص اور سچائی کی دعا مانگی تھی وہ پہلے ہی سے ان کے حق میں مستجاب تھی، ان کی جہود مسلسلہ اس پر شاہد ہیں۔ اس پیکر اخلاص اور مجسم حسن اخلاق سے ابتدائی ملاقاتوں میں جس مخلصانہ سلوک اور مشفقانہ برتاؤ نے مجھ کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے یہاں اس کو ذکر کئے بغیر قلم آگے کھسکنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔

مئی ۱۹۷۶ء میں جامعہ محمدیہ مالیگاؤں کی تاسیس کے موقع پر مولینا مختار احمد ندوی مدظلہ نے ایک عظیم تقریب منعقد کی تھی، اس میں ہندوستان کے اکابر و اصاغر علماء اور عوام و خواص کے علاوہ سعودیہ اور خلیجی بلاد کے عظیم المرتبت محسنین کی ایک بڑی تعداد بھی شریک ہوئی تھی، جامعہ عالیہ عربیہ مئو کی طرف سے راقم الحروف اور حکیم مولانا عبدالباقی صاحب پر مشتمل وفد بھی اس تقریب ہمہ شرکت سے شرفیاب ہوا تھا، میدان محشر جیسا سماں تھا۔ ع

کس نمی پرسید کہ بھیا کیستی؟

تقریب کے خاتمہ پر فوراً واپسی کی فکر دامن گیر ہوئی، بوقت شب مولانا قاری عبدالرشید خان جہاں پوری مظلہ کے ساتھ منماڈ اسٹیشن پہنچا، ہم لوگوں کو ٹرین کی چالو بوگی میں قسمت آزمائی کرنی تھی، اسی اثنار میں حضرت ناظم صاحب اپنے بنارسی وفد کے ساتھ بنارس واپسی کے لئے اسٹیشن پر نظر آئے، ہمارے سفر کی کیفیت پر متفکر ہوگئے، اتنے میں ٹرین آگئی، قاری صاحب چونکہ مشاق تھے چالو بوگی میں گھس گئے، یہ نامراد دھکے کھا کر بچھڑ گیا، اور رات کے تقریباً گیارہ بجے پھر منصورہ واپس گیا، دوسرے روز جامعہ محمدیہ کے طلبہ جو مشرقی یوپی جا رہے تھے، انہوں نے نفیس لے کر اپنی سیٹوں پر گنجائش بنالی، کچھ ہی عرصہ کے بعد مبارکپور یا املو وغیرہ میں کہیں پر کسی خاص شخصیت کے جنازے میں حضرت ناظم صاحب سے ملاقات ہوئی، سلام مسنون کے بعد انتہائی مشفقانہ انداز میں پہلا سوال کیا کہ مالیگاؤں سے کس طرح آئے تھے؟ سفر میں اس قسم کے حالات تو پیش آتے ہی رہتے ہیں، کسی کو کس کی فکر ہوتی ہے، بالخصوص ٹرین میں مسافروں کی خود غرضی ایک اصولی بات ہوگئی ہے، لیکن ایک ادنیٰ مسافر کی پریشانی پر حضرت ناظم صاحب کی یہ دردمندی اور بیقراری اس وقت تک ان کو ستاتی رہی، جب تک انکا حال معلوم نہیں کر لیا، پھر افسوس کے ساتھ فرمایا کہ مالیگاؤں سے دو تین اسٹیشن کے بعد ہم لوگوں نے تلاش کر کے قاری صاحب کو اپنے پاس بلالیا اور تم کو نہ پاکر بہت تشویش ہوئی ۔

مالیگاؤں کے اس سفر نے پھر دوبارہ مالیگاؤں کے سفر کی ہمت سلب کر لی، لیکن اس آزمائش کی ایک اور کڑی میرے نصیب میں مقدر تھی، جنوری ۱۹۸۱ء میں بمبئی جانا ہوا اور واپسی کے وقت حضرت مولانا مختار احمد ندوی کی خواہش اور حکم پر (لیتم الرؤف) اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری صاحب مولینا ندوی کے ہمراہ ان کی گاڑی سے صبح سویرے مالیگاؤں پہنچے تو یہ افسوس ناک خبر ملی کہ آج الحاج عبدالجبار صاحب کا انتقال ہوگیا ہے، ہم لوگ بھی فوراً تعزیت کے لئے گئے، اور نماز جنازہ وغیرہ میں شریک ہوئے، میری بدنصیبی سے واپسی کے لئے مہانگری کا ٹکٹ ملا جس کا وقت صبح ۷ بجے منماڈ اسٹیشن پر آنے کا تھا، مولانا نے بعد نماز عشار مجھ کو منصورہ سے کچھ پرائیویٹ سواری اور کچھ سرکاری بس کے ذریعہ منماڈ اسٹیشن بھیجدیا، کیونکہ اس کے بعد صبح تک کوئی سواری نہیں تھی، سخت سردی کا موسم اور اس پر مزید بوندا باندی کا سلسلہ اور تنہائی کا معاملہ۔ سونے پر سہاگہ ۔ رات بھر بیٹھتے ٹہلتے یہ سوال دوہراتے رہے ۔

اے شب ہجر کہیں تیری سحر ہے کہ نہیں ؟

مالیگاؤں کے ان دونوں تاریخی سفر کے تصور سے آج بھی میری روح لرز جاتی ہے، اب حضرت ناظم مرحوم کی دردمندی، اور شان کریمی کہاں جو پریشان حالوں اور کس مپرسوں کی غم گساری اور خبرگیری کی فکر کرے ؟ ۔

ایثار و احسان

حضرت ناظم صاحب کی میزات میں ایک اہم چیز یہ ہے کہ انہوں نے جامعہ اور جمعیۃ کا کبھی استحصال نہیں کیا اور نہ اپنی خدمات کو صرف جامعہ سلفیہ اور جمعیۃ تک محدود رکھا، بلکہ ملکی سطح پر تمام جامعات

اور جماعت کے مفادات اطلاف کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے، دار الافتاء ریاض اور رابطہ عالم اسلامی مکہ وغیرہ کے بعض مبعوثین کو ہندوستان کے دوسرے جامعات و مدارس میں بھی ضرورت و اہمیت کے تناسب سے خدمت کے لئے بھیجا کرتے تھے، یہاں تک کہ بعض دفعہ جامعہ سلفیہ کے موظف استاذ کو بھی دوسرے ضرورت مند اداروں میں مبعوث فرمادیتے تھے، اس سلسلے کی ایک تازہ مثال بلکہ ہم لوگوں کے ساتھ حضرت ناظم صاحب کا ناقابل فراموش احسان یہ ہے کہ ۱۹۸۹ء میں کلیہ فاطمۃ الزہراء للبنات مئو کی طالبات کو پڑھانے کے لئے ایک تجربہ کار معمر استاذ کی سخت ضرورت پیش آئی، ہر طرف سے محرومی کے بعد اس مشکل کو حل کرنے کے لئے حضرت ناظم صاحب کی ذات بابرکات مرجع قرار پائی، ایک سہ نفری وفد جو ڈاکٹر عبدالعلی ازہری، حکیم مولانا عبدالباقی اور راقم الحروف پر مشتمل تھا بنارس پہونچا، اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری (یہ سب لوگ اس وقت مولانا مختار احمد ندوی مدظلہ کے منتخب و نامزد دائمی ممبران مجلس ادارۂ کلیہ فاطمۃ الزہراء للبنات میں سے تھے) کے ساتھ حضرت ناظم صاحب کی خدمت عالیہ میں باریاب ہوکر لیکن مشکل پیش کی، اور عرض کیا کہ مولانا عابد حسن صاحب استاد جامعہ سلفیہ کو کم از کم اس تعلیمی سال کی تکمیل تک کلیۃ فاطمۃ الزہراء میں تدریسی خدمت کے لئے اجازت دے کر ممنون فرمائیں، حضرت ناظم صاحب نے نہ صرف کلیۃ فاطمۃ الزہراء کے لاینحل مسئلہ کو حل فرمایا بلکہ انتہائی خوشی کے ساتھ مولانا موصوف کو جامعہ سلفیہ کی جانب سے بطور مبعوث کلیہ فاطمۃ الزہراء میں خدمت کے لئے بھیجدیا۔ أثابه الله خيرا۔

اسی طرح جامعہ عالیہ عربیہ اور عالیہ گرلس ہائی اسکول مئو بھی اس مثالی عظیم محسن کی عنایات اور مادی و معنوی فیوض برکات سے برابر مستفیض ہوتے رہے، جب کبھی کوئی فریاد لے کر آنمرحوم کی خدمت ہم لوگ حاضر ہوئے، امکانی حد تک فریادرسی سے مایوس نہیں فرمایا۔

کرم گستری

حضرت ناظم مرحوم کی ملاقات سے جب کبھی راقم الحروف کو مسعود و مفتخر ہونے کا موقع آتا تو آنمرحوم ایک عظیم المرتبہ بزرگ کے بجائے ایک مخلص بے تکلف دوست کی طرح پیش آتے، اور مزاحیہ و طنزیہ شگوفوں سے بھی محظوظ فرماتے تھے، بعض دفعہ بمبئی وغیرہ کی کسی تقریب میں حاضری کا اتفاق ہوا، اس موقعہ پر حضرت ناظم صاحب نے جامعہ سلفیہ یا جمعیت کی میٹنگ منعقد فرمائی تو خلاف اصول اس ناچیز کو شریک میٹنگ فرما کر عزت و شرف سے نوازے بغیر نہیں چھوڑا۔

غالباً مئی یا جون ۱۹۸۹ء میں مرکزی جمعیۃ کی میٹنگ دار الضیافہ جامعہ سلفیہ بنارس میں منعقد ہوئی تھی، اس میں شرکت کے لئے مولانا مختار احمد ندوی مدظلہ نے مئو سے بنارس جاتے ہوئے راقم الحروف کو بحیثیت خادم کلیۃ فاطمۃ الزہراء

رفیق سفر کا اعزاز بخشا، بعد نماز ظہر دارالضیافہ میں کھانے پر حضرت ناظم صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوتے ہی وہ اپنی مشفقانہ عادت کے مطابق پوچھ بیٹھے کہ کب آئے؟ جب ان کو معلوم ہوا کہ میں مولانا ندوی کے ہمراہ یہاں پہونچا ہوں تو خفگی کے انداز میں فرمایا کہ یہاں میٹنگ میں کیوں نہیں شریک ہوئے؟ کھانے سے فارغ ہو کر ان کے ساتھ جب دارالضیافہ کے گیٹ پر پہنچا تو میرا راستہ روک لیا اور میٹنگ کی دوسری نشست میں باصرار شریک فرمایا، اس بندہ نوازی اور عزت افزائی پر بعض شرکاء کمیٹی مجھ کو حیرت و استعجاب کی نظر سے گھورنے لگے، میں بھی حضرت ناظم صاحب کے اس التفات خسروانہ سے خوشی اور شرمندگی کی ملی جلی کیفیت سے آزاد نہ ہو سکا، شاید حضرت ناظم صاحب کی مبارک زندگی میں مرکزی جمعیۃ کی یہ آخری میٹنگ تھی، افسوس اس کے بعد اپنے اس مخلص کرم فرما سے ملاقات کی سعادت حاصل نہ ہو سکی، مزید افسوس یہ کہ ان کی وفات حسرت آیات کے وقت یہ بدنصیب غریب الوطن تھا، اس لئے نماز جنازہ وغیرہ میں شرکت کے ثواب سے بھی محروم رہا۔

حضرت ناظم صاحب کی کرم فرمائیوں اور قدردانیوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اس نااہل کو دو تین مرتبہ باوقات مختلفہ جامعہ سلفیہ کی خدمت کے لئے یاد فرمایا، اس سلسلے کے بھی چند خطوط بقلمہ وخطہ لکھے ہوئے میرے پاس تبرکاً و تذکاراً محفوظ ہیں، ہر مرتبہ جامعہ عالیہ عربیہ مئو کی ضرورت آڑے آتی رہی، اور حضرت ناظم صاحب اس غریب جامعہ کی ضرورت کو مقدم رکھتے ہوئے معذرت نامہ قبول فرمالیتے رہے۔

حضرت ناظم صاحب کی مخلصانہ کرم فرمائیوں اور بے تکلفانہ ملاقاتوں نے ناچیز کو کسی قدر جری بنا دیا تھا، اس لئے ان کی شان میں بے ادبیاں اور گستاخیاں ضرور سرزد ہوئی ہوں گی، چنانچہ کچھ عرصہ پہلے ناچیز ایک ایسی گستاخی کا مرتکب ہوا جس کی ان سے معافی طلب کرنا ضروری تھا، مگر افسوس اس کی توفیق حاصل نہیں ہو سکی، اور آں محترم ہمیشہ کے لئے ہم سب سے جدا ہو گئے، حقیقت یہ ہے کہ مرحوم کی ذات بابرکات صبر وتحمل کا ایسا خاموش سمندر تھی جس کو اتھل پتھل کرنے کے لئے لوگوں نے لعن طعن کے بڑے بڑے پتھر پھینکے مگر سب اس کی گہرائی میں ہضم ہو گئے، اخیر دور میں امیر جمعیۃ کی نسبت سے ان کو جو دکھ پہونچایا گیا اس سے ان کا دل و دماغ بری طرح متاثر ہوا، اور اغلب یہ ہے کہ اسی تاثر سے ان کی مرض الموت کی شروعات ہوئی۔

جامعہ سلفیہ کا مؤرخ کبھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کر سکتا کہ اس کے معمار اول حضرت ناظم صاحب مرحوم نے اپنے پسماندگان میں جامعہ سلفیہ کے لئے ایسے مخلص اور تجربہ کار رفقاء چھوڑے ہیں جو اس امانت کو ان شاء اللہ ضرور سینے سے لگائے رکھیں گے، اور اس کی ترقی کے لئے ہر طرح کی قربانیاں پیش کرتے رہیں گے، ناظم صاحب مرحوم کے جانشین مولانا شاہد جنید صاحب اسی ادارہ کے فارغ التحصیل ہیں اس لئے وہ زیادہ بہتر طور پر اس کو سنبھالیں گے۔

ہماری ان معروضات پریشاں کو یادش بخیر کی حیثیت دی جائے یا عقیدت کا نذرانہ تصور کیا جائے، بہرصورت حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ سے متعلق اپنے قلبی تاثرات پریشاں کو ہم نے سینے سے سفینے میں منتقل کر دیا ہے، اب انمرحوم کا ہم پر واجبی حق ہے کہ جس طرح انہوں نے قوم و جماعت اور جامعہ کے نفع کو اپنی قیمتی زندگی کا مشن بنایا، اور اسی حالت میں اپنے رب کے پاس جا پہونچے، ہم بھی ان کے لئے دعا خیر کا نفع رساں سلسلہ ہمیشہ باقی و جاری رکھیں۔

یہ سیاہ کار سراپائے تقصیر و خطا دربارگاہ مولائے آمرزگار حضرت ناظم صاحب رحمہ اللہ کی مغفرت اور بلندی درجات کے لئے دست دعا اٹھائے ہوئے امیدوار ہے کہ

درمقامیکہ صدارت بہ بزرگاں بخشند

چشم دارم کہ بجاہ از ہمہ افزوں باشی

اللهم اغفرله اللهم اجعله يوم القيامة فوق كثير من خلقك ومن الناس وادخله مدخلا كريما۔
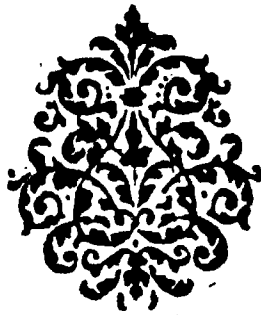
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

جامعہ سلفیہ بنارس کے ناظم اعلیٰ اور مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے امیر خلد آشیاں مولانا عبدالوحید سلفی رحمہ اللہ کی باعظمت و پرکشش شخصیت پر میں تین تحریر لکھ چکا ہوں۔ پہلی تحریر اردو میں بہت مختصر اور عجلت میں لکھی گئی تھی جو محدث اور آواز ملک بنارس میں شائع ہوئی۔ دوسری تحریر اردو میں قدرے مفصل تھی جو محدث ہی میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد تیسری تحریر عربی میں صوت الامۃ کے افتتاحیہ کے طور پر شائع ہوئی۔ ان تمام تحریروں کے بعد بھی مجھے یہ احساس ہے کہ مرحوم کی شخصیت کے بہت سے پہلو ابھی "تشنۂ تحریر" ہیں۔ اخلاص نیت، وسعت قلب، اور توفیق الٰہی سے بہرہ ور اہل قلم ضرور ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔ اور اس طرح جماعتی تاریخ کا یہ باب مکمل ہوگا۔

مولانا عبدالوحید رحمہ اللہ جماعت اہل حدیث کی آل انڈیا تنظیم "مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند" اور اس کے مرکزی دارالعلوم "جامعہ سلفیہ" کی سربراہی کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ اس ناطے ملک و بیرون ملک کے بے شمار افراد و شخصیات سے آپ کے قریبی تعلقات تھے۔ دونوں اداروں کے انتظام و انصرام کے سلسلہ میں مختلف النوع مسائل سے

آپ کا سابقہ تھا۔ خاندان کی عظیم موروثی تجارت کے نشیب و فراز کو سنبھالنے اور گوناگوں معاملات کو سلجھانے میں آپ کا بنیادی کردار تھا۔ اس ضمن میں بھی آپ کے تعلقات کا دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع تھا۔ اس لیے میرے ناقص خیال میں آپ کے سوانح کی ترتیب کے کام کو دو حصوں میں تقسیم کرنا زیادہ مناسب ہے۔ پہلے حصہ میں ایسے واقعات و مسائل کا تذکرہ ہو جن کا تعلق آپ کے ذاتی اوصاف و محاسن سے ہے اور دوسرے حصہ میں آپ کے نظریات، افکار و خیالات اور تاثرات پر روشنی ڈالی جائے۔ موصوف کی شخصیت اور ان کے افکار کو اس طرح زیادہ مفید اور منظم شکل میں سامنے لایا جاسکتا ہے۔

موصوف کے سوانح کا اول الذکر حصہ دوسرے حصہ ہی کی طرح بہت زیادہ تفصیل طلب ہے، اس پر کماحقہٗ روشنی ڈالنا کسی ایک شخص کا کام نہیں۔ ساٹھ سالہ زندگی کے نشیب و فراز کی تعیین شخصیت کی تعمیر میں کارفرما عوامل کی شناخت، پیچیدہ مسائل کو حل کرنے پر قدرت کی نشاندہی، تعمیری کاموں میں خلوص و بے نفسی کے ساتھ آگے بڑھتے رہنے کا ذکر، کسی بھی موڑ پر اپنے آپ کو نمایاں کرنے سے گریز کی توضیح اور اس جیسے بہت سے دوسرے پہلو سوانحی تذکرہ کے پہلے حصہ میں آئیں گے، جس کی تکمیل مجھ جیسے خاکسار کے بس میں نہیں۔ اس تحریر میں پہلے حصہ کے صرف بعض پہلوؤں پر میں روشنی ڈالوں گا اور دوسرے حصہ کو ابھی نظر انداز کر رہا ہوں کیونکہ اس کے لیے قدرے تفصیل کی ضرورت ہے، جس کا متحمل یہ مختصر مضمون نہیں ہو سکتا۔ موصوف کے ذاتی محاسن کا اس تحریر میں احاطہ مقصود نہیں، نہ ان کے مابین کسی طرح کی ترتیب پیش نظر ہے۔ مدعا صرف یہ ہے کہ ان کی ذات سے متعلق بعض واقعات و احوال احاطۂ تحریر میں آجائیں تاکہ سوانح کی ترتیب کے کام میں آسانی ہو اور معاملات کو کسی اور رخ پر لے جانا آسان نہ رہے۔

۱۔ صاحب ترجمہ کی ایک نمایاں خوبی ملی و جماعتی کاموں کی محبت اور ان کی انجام دہی کا شغف تھا۔ وہ مثبت فکر سے کام کی تکمیل کے لیے یکسو ہو جاتے تھے اور بے جا رد و قدح سے دل برداشتہ نہیں ہوتے تھے۔ جو لوگ کسی بھی کام کے سلسلہ میں ان کے سامنے منفی رویہ کا اظہار کرتے یا کسی اعتراض کو مدلل کرنے کی کوشش کرتے، ان کی باتوں کو لائق التفات نہ سمجھتے تھے۔ ان کی دھن صرف یہ ہوتی تھی کہ جب کام اچھا اور ضروری ہے تو اسے انجام دینا چاہیے، اور اس سلسلہ میں کوئی ایسا رویہ اختیار نہ کرنا چاہیے جس سے کام میں رکاوٹ پیدا ہو جائے، اور اس طرح لوگ اس کی افادیت سے محروم ہو جائیں۔

عمل سے محبت کے اسی جذبہ کی وجہ سے انھیں غیر معمولی برداشت اور چشم پوشی سے کام لینا پڑتا تھا۔ جماعتی کاموں میں ایسا اکثر دیکھا جاتا ہے کہ افراد کی آرا اس حد تک مختلف ہو جاتی ہیں کہ منصوبہ کے فیل ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ لوگ بے تکے اعتراض کرتے ہیں اور ان کا اصرار ہوتا ہے کہ ان کی بات تسلیم کی جائے۔ موصوف ایسے موقع پر محنت سے محنت

تنقید کا جواب دیتے تھے اور غیر مطمئن افراد کو کام کی افادیت کی جانب متوجہ کرکے مثبت انداز میں سوچنے کی تلقین کرتے تھے۔ ان کا زور صرف اس بات پر ہوتا تھا کہ جب مفید کام سامنے آگیا ہے تو اسے مثبت طور پر انجام دینے میں فائدہ ہے، کبھی کبھی ان کے سامنے ایسے مسائل آجاتے تھے جن میں نقص صاف ظاہر ہوتا تھا اور لوگوں کی کوتاہیاں سامنے ہوتی تھیں، لیکن انھیں نمایاں کرنے کے بجائے مرحوم ان پر خاموشی اختیار کر لیتے تھے تاکہ کام میں تعویق نہ پیدا ہو۔

۲۔ جامعہ اور جمعیۃ میں کارکنوں کی ایک بڑی تعداد ان کی نگرانی میں مصروف کار تھی، تدریسی عملہ کے معاملات سے براہ راست ان کا تعلق کم تھا، کسی اہم فیصلہ کے لیے ان سے رجوع کیا جاتا تھا، لیکن ہر شخص کی قوتِ کارکردگی اور مزاج سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اگر کسی مسئلہ میں کبھی کوئی الجھاؤ پیدا ہوتا تو کسی کارکن کی شخصیت کے کمزور پہلو کا سہارا لے کر استحصالی قسم کا کوئی فیصلہ کبھی نہیں کرتے تھے بلکہ کمزوری کو نظر انداز کرکے صلاحیت کے مطابق کام لینے کی سیاست کو اپناتے تاکہ آدمی کا دل مجروح اور اس کی کارکردگی متاثر نہ ہو۔ اس حصہ سے متعلق کچھ مثالیں قابلِ ذکر ہیں، لیکن میں انھیں مضمون کی اس قسط کے لیے ملتوی کر رہا ہوں، جس میں شخصیات سے متعلق مرحوم کے تاثرات و تجربات کا بیان ہوگا۔

۔ غیر تدریسی عملہ کا حال سب کو معلوم ہے، سرکاری اور پرائیویٹ دونوں طرح کے اداروں میں ان سے متعلق پیچیدہ مسائل سامنے آتے رہتے ہیں، لیکن پرائیویٹ اداروں میں یہ مسائل زیادہ سنگین ہوتے ہیں، کیونکہ عملہ کے تقرر کے وقت میں کارکردگی کی اہمیت و صلاحیت کے ساتھ ہی بعض دوسری چیزوں مثلاً غربت وغیرہ کا بھی لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ اس نوعیت کی تقرریوں کے نتیجہ میں کبھی کبھی کام بہت زیادہ خراب ہو جاتا ہے۔ یہ موقع نگران کار و ذمہ دار کی آزمائش کا ہوتا ہے، ایک طرف کام کی خرابی اور دوسری طرف ملازم کی بیچارگی و ناواقفیت، انسان نہ سخت بن سکتا ہے نہ نرم۔ ایسے متعدد مواقع پر میں نے مرحوم کے رویہ کا غور سے مطالعہ کیا۔ وہ بڑے ضبط سے کام لیتے تھے اور آدمی کو پشیمانی میں مبتلا ہونے سے بچا لیتے تھے، لیکن کام کی خرابی پر جب نظر جاتی تھی تو بار بار اظہار افسوس کرتے تھے۔ کبھی کبھی طبیعت کا تکدر بڑھتا تھا تو ملازمت سے علاحدگی کی بات بھی سوچ لیتے تھے۔ لیکن اس نوعیت کے سخت فیصلہ پر طبیعت کی نرمی غالب آجاتی تھی اور غلط کار آدمی اپنی جگہ پر رہ جاتا تھا۔

مرحوم کے ضبط و برداشت کا غیر معمولی مظاہرہ میں نے اس وقت دیکھا جب جامعہ کو ملنے والا ایک عظیم تعاون معمولی دفتری غلطی سے پڑوس کے دوسرے ادارہ کو مل گیا اور وہاں کے ذمہ داروں نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اسے حاصل کر لیا۔ اس معاملہ کا جب انکشاف ہوا تو مرحوم کی کیفیت ناقابلِ بیان تھی، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس سے بڑا صدمہ انھیں کبھی نہیں پہنچا۔ اضطراب و بے چینی کو ضبط کرتے تھے، لیکن چہرہ پر غیر معمولی کرب کے آثار نمایاں رہتے تھے۔ اس معاملہ میں مرحوم کی غیر معمولی تلخی کا

احساس اس لیے بھی ہوتا تھا کہ بعض ذمہ داران کی معمولی غفلت سے یہ حادثہ پیش آیا تھا۔ پھر جن لوگوں نے اتنی بڑی امانت پر ہاتھ صاف کیا تھا ان کا موقف بے حد جارحانہ و تحکمانہ تھا۔ شرافت سے گرے ہوئے رویہ کا اظہار برملا ہوتا تھا۔ ندامت و شرمساری کی جگہ ہنرمندی و فتحیابی کی کیفیت نمایاں تھی۔ مقامی جماعت پر یاس و بے چینی کا غلبہ تھا۔ مرحوم سب سے اہم ذمہ دار کی حیثیت سے زیادہ متاثر تھے، لیکن اس کے باوجود زبان سے کوئی نازیبا بات نہیں نکلی۔ اپنے کرب کو چھپاتے ہوئے دوسروں کو صبر و ضبط کی تلقین کرتے تھے اور جامعہ کے مستقبل کے سلسلہ میں ہمیشہ باحوصلہ طرز سخن اختیار کرتے تھے۔

۳۔ صاحب ترجمہ کا ایک نمایاں وصف حسن تصرف تھا، مشکل مواقع پر وہ بڑی حاضر دماغی اور جرأت کے ساتھ صحیح اقدام کر کے صورتحال کو قابو میں کر لیتے تھے اور معاملہ سے متعلق لوگوں کو پوری طرح مطمئن کر دیتے تھے۔ جامعہ کی تاریخ میں سلفیہ طبیہ کالج کا قیام ایک اہم واقعہ بلکہ حادثہ کہا جائے گا۔ اس کالج کا قیام شاید ریاست کے احوال کا جائزہ لیے بغیر بعجلت عمل میں آیا تھا۔ جامعی پلیٹ فارم سے اس طرح کے ادارہ کے قیام کا کوئی تجربہ نہ تھا، لہذا کالج کے افتتاح کے بعد سے مسائل کا آغاز ہو گیا، اور یہ سلسلہ جب تک کالج رہا، چلتا رہا۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے جس نوعیت کی کوشش یا بالفاظ دیگر داؤں پیچ کی ضرورت تھی اسے ذمہ داران نے پسند نہ کیا۔ نتیجہ کے طور پر کالج کی منظوری وغیرہ میں دیر ہوئی۔ طلبہ میں غیر جماعتی اور شر پر عناصر زیادہ تھے، ان لوگوں نے مخالفین کی شہ پا کر جامعہ کے سامنے بھوک ہڑتال کی اور جامعہ کے خلاف ریشہ دوانیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ماحول کی خرابی کے بعد عارضی طور پر کالج بند کر دیا گیا اور طلبہ کو حکم دیا گیا کہ ہوسٹل خالی کر دیں۔ ان لوگوں نے بہت زیادہ گستاخی اور سرکشی کا مظاہرہ کیا اور ہوسٹل چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اس موقع پر مرحوم نے اپنے حسن تصرف، شجاعت اور حاضر دماغی سے دیکھتے ہی دیکھتے ہوسٹل خالی کرا لیا اور معاملہ میں مداخلت کرنے والے ان لوگوں سے جو شر پسندوں کے حامی تھے، بڑی فیصلہ کن گفتگو کی جس سے ان کے حوصلے پست ہو گئے اور معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اس فتنہ کے فرو ہونے کے بعد جب حکومت کے متعلقہ ذمہ داران سے کالج کے معاملہ میں گفتگو کی گئی تو انھوں نے بڑی وضاحت سے سمجھایا کہ اس طرح کے دینی ادارہ میں کسی کالج کے قیام کا تصور غلط ہے، اس کے لیے علیحدہ عمارت اور بعض ابتدائی کارروائیاں ضروری ہیں۔

۴۔ مرحوم مالی معاملات اور حساب و کتاب میں مبالغہ کی حد تک سخت تھے۔ جن لوگوں کو آمد و خرچ کا صاف ستھرا حساب رکھنے کی عادت نہ تھی، ان سے وہ کبھی بھی مطمئن نہ ہو سکے، خواہ ان کی صلاحیت اور کارکردگی کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو، اور جن لوگوں نے حساب کتاب صاف رکھا، ان کو تمام کمزوریوں کے باوجود مرحوم نے ہر موقع پر سراہا اور عزت کی نظر سے دیکھا۔ انسان کی دینی

داخلاقی حیثیت کا اندازہ وہ اسی چیز سے کرتے تھے۔ مالی معاملات میں اگر کوئی شخص ان کے سامنے کھرا ثابت نہ ہوتا، پھر اس پر کبھی بھروسہ نہ کرتے، اور اس کے ساتھ آئندہ بڑی احتیاط سے معاملہ کرتے۔

عوامی اداروں میں مالیات کا صیغہ بڑی نزاکت رکھتا ہے۔ اچھے اچھے لوگ اس آزمائش پر پورے نہیں اترتے، کسی نہ کسی طرح دامن داغدار ہو ہی جاتا ہے۔ لیکن موصوف نے اس صیغہ کو قابل تعریف حد تک صاف ستھرا رکھا اور کسی بھی موڑ پر کسی شبہ کی گنجائش نہ چھوڑی۔ اس سلسلہ میں ان کے اندر نہ تو کوئی لچک تھی نہ نرمی۔ حالات جن مسائل کے اظہار کا موقع نہ دیتے، انہیں مرحوم ظاہر نہ کرتے تھے۔ لیکن تمام مسائل کو تحریری شکل میں اس قدر صاف اور واضح رکھتے تھے کہ دیکھنے والے حیران ہو جاتے تھے۔ اس کے لیے ان کو بڑی محنت کرنا پڑتی تھی۔ کئی کئی گھنٹے مسلسل بیٹھ کر حساب وکتاب کی دیکھ بھال کرتے تھے اور متعلقہ افراد کو ضروری ہدایات دیتے تھے۔ ان کی حساب کے معاملہ میں محنت وتندہی کی تعریف آڈیٹر صاحبان کرتے تھے اور اس سلسلہ میں ان کی بصیرت اور کمال کا اعتراف ان کو تھا۔ بسا اوقات ان کی نشاندہی پر وہ لوگ اپنا لکھا ہوا حساب درست کرتے تھے۔ پرانے حسابات کو وہ اپنی زبانی یادداشت سے درست کرادیتے تھے۔ میں مضمون کے شخصیت والے حصے میں مرحوم کے ساتھ کام کرنے والے بعض لوگوں کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالوں گا جن کا تعلق مالیات سے ہے اور ان سے مرحوم کی سیرت کا کوئی پہلو مختلف ہے۔

۵۔ صاحب ترجمہ ایک دردمند دل رکھتے تھے اور دوسروں کے مسائل ومشکلات کو سمجھنے میں ہمیشہ واقعیت پسندی سے کام لیتے تھے۔ عربی مدارس میں عام طور پر اساتذہ قلیل مشاہرہ پر کام کرتے ہیں، جس کی وجہ سے انہیں دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جب کوئی بڑا خرچ درپیش ہوتا ہے تو فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ یہ کام کس طرح انجام پذیر ہوگا۔ مدارس کے ضابطے سخت ہوتے ہیں، کسی طرح کا قرض یا پیشگی تنخواہ دینے کی کوئی گنجائش آسانی سے نہیں نکلتی۔

مرحوم کے سامنے بھی اس نوعیت کے مسائل اکثر پیش ہوتے تھے۔ مالی معاملات میں ان کی ضابطہ پسندی کے باعث ہم لوگ ان کے سامنے اس طرح کے مطالبات رکھنے سے گریز کرتے تھے، لیکن مجبوری جب سخت ہو جاتی ہے تو آدمی کی زبان کھلتی ہے اور ایسی حالت میں اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب معاملہ کا برتاؤ کیسا ہے۔ مرحوم نے اپنے پورے دور نظامت میں شاید کسی آدمی کو مایوس نہیں کیا۔ وہ ضابطہ کا خیال ضرور رکھتے تھے، لیکن ساتھ ہی ان کی نظر انسانی ضرورت اور زندگی میں پیش آنے والے سرد وگرم حالات پر بھی ہوتی تھی۔ مجھے بارہا کا تجربہ ہے کہ ان کے سامنے قرض یا تعاون کے بڑے بڑے مطالبے پیش ہوئے۔ اصولی طور پر ان کو پورا کرنے کی کوئی صورت سامنے نہ تھی لیکن مرحوم نے ازراہ ہمدردی دمِ معاملت

ضرورتمندوں کی دل جوئی کی، اور اگر جامعہ سے بروقت انتظام میں دقت محسوس ہوئی تو ذاتی طور پر اس بوجھ کو برداشت کیا، اور وقت پر مطالبہ پورا کیا۔

ایک طرف اگر ان کو انسانی ضرورت کا احساس تھا تو دوسری طرف وہ اہل علم کی تکریم و توقیر کے خیال سے بھی ایسا کرتے تھے۔ رحمانیہ کی نظامت کے دور میں بھی ان کے اس طرح کے بعض واقعات مشہور ہیں۔ بعض مدرسین کے ساتھ انھوں نے کسی مطالبہ کے بغیر بروقت تعاون کیا اور ان کے اس طرح کے اقدام سے اساتذہ کو اطمینان حاصل ہوا۔

اس نوعیت کی ہمدردی و خبرگیری فی الحقیقت جامعہ کی سرپرستی کرنے والے پورے خاندان کا نمایاں وصف ہے اور اس سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ علماء و طلبہ کے ساتھ ان کے برتاؤ سے اجنبیت و غیریت کا اظہار نہیں ہوتا اس خاندان کے افراد مختلف بہانوں سے لوگوں کی دل جوئی کرتے ہیں، اور ان کے مسائل پر ہمدردانہ نظر رکھتے ہیں جس سے ان کی کرم گستری و علم نوازی کا اندازہ ہوتا ہے۔ میں نے مرحوم کے تذکرہ میں اس وصف کو اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ ضابطوں کی رکاوٹ کے باوجود اہل علم کی خبرگیری اور ان کے ساتھ تعاون کا اہتمام کرتے تھے، لہذا ان کے تعلق سے یا مذکورہ خاندان کے کسی دوسرے فرد کے تعلق سے کسی عالم یا جماعتی خادم کی مجبوری و بیکسی کا تذکرہ قرین انصاف نہ ہوگا۔

جیسا کہ معلوم ہے جامعہ میں ہند و بیرون ہند سے مہمانوں کی آمد کا سلسلہ قائم ہے۔ ان مہمانوں کے قیام و طعام کا بندوبست جامعہ ہی میں ہوتا ہے خواہ ان کا قیام طویل ہو یا مختصر۔ مرحوم ان مہمانوں کو جن کی علمی و جماعتی زندگی میں اہمیت ہے، دعوت دے کر اپنے گھر بلاتے تھے اور بڑی عزت کے ساتھ پرتکلف ضیافت کرتے تھے۔ اگر کسی مجبوری سے گھر نہ بلا پاتے تو سامان ضیافت جامعہ ہی بھجوا دیتے اور اکثر اوقات خود بھی شریک ہوتے۔ اس طرح کی ضیافتوں میں بعض مدرسین بھی مدعو ہوتے تھے۔ ہوٹلوں سے کھانے کے انتظام کو مرحوم پسند نہ کرتے تھے۔ ان کا اصرار تھا کہ جو کچھ بھی میسر ہو گھر ہی پر تیار کر کے مہمانوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس سلسلہ میں کبھی کبھی الجھن پیدا ہو جاتی تھی، لیکن وہ اس کو گوارا کرتے تھے اور بدرجہ مجبوری ہی ہوٹلوں کے کھانے پر مطمئن ہوتے تھے۔ مہمانوں کے اجتماع کے موقع پر منتظمین کو جملہ ہدایات خود ہی دیتے تھے اور کھانے کے اقسام سے لے کر تمام چیزوں کا انتخاب و تعیین بھی خود ہی کرتے تھے۔ اس سے ایک آدمی اندازہ کر سکتا ہے کہ ان کے دل میں مہمانوں کے لیے کتنی جگہ تھی۔ اور وہ کس طرح ان کی عزت و توقیر کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ بعض ظاہر بیں ان کے اس اہتمام کو عدم انتظام یا توفیر کے رجحان پر محمول کرتے تھے، لیکن یہ بہت بڑی نادانی ہے۔ مرحوم کے پیش نظر صرف اہتمام و تکریم ضیوف کا پہلو تھا۔

۶۔ مرحوم کا ایک نمایاں وصف یہ تھا کہ طلبہ اور مدرسین کی علمی ترقی کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں پیدا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا دل بیحد وسیع اور حوصلہ بلند تھا۔ عربی مدارس کے سلسلہ میں بارہا سنا جاتا ہے کہ منتظمین اور اساتذہ داخلی سیاست میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جوڑ توڑ کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے اور اس کا اثر طلبہ تک بھی پہنچتا ہے۔ بعض طلبہ کسی استاد یا انتظامیہ کے غیظ و غضب کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے ان کا مستقبل تباہ ہو جاتا ہے، یا انتظامیہ کی طرف سے بروقت تعاون اور حوصلہ افزائی نہیں ہوتی جس سے ان کو خاطر خواہ ترقی کا موقع نہیں مل پاتا۔ اور وہ دل برداشتہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ تو دانستہ طلبہ کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں، جس سے کش مکش کا بیحد گھناؤنا ماحول سامنے آتا ہے۔

صاحب ترجمہ نے اپنے دور نظامت میں اس طرح کا کوئی ماحول پیدا نہیں ہونے دیا۔ داخلی سیاست اور رسہ کشی کا جب بھی کوئی عنصر ابھرا اسے حکمت و دانائی سے دبا دیا اور ماحول کو صاف ستھرا رکھنے پر ہمیشہ زور دیا۔ طلبہ میں سے کسی کو اگر علمی ترقی کے لیے کسی طرح کے تعاون کی ضرورت پیش آئی تو بڑی فراخدلی سے پیش کیا۔ مدرسین کو اس طرح کے مواقع کم پیش آئے، لیکن جب پیش آئے تو مرحوم نے کسی تامل کے بغیر اپنا تعاون پیش کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ سے طلبہ کے باہر جانے کا سلسلہ عرصہ سے قائم ہے۔ اس میں کبھی کبھی ایسی صورت پیش آئی کہ طلبہ کے ٹکٹ کسی وجہ سے نہ پہنچ سکے اور تاریخ گزر جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا، ایسے موقع پر مرحوم نے کسی پس و پیش کے بغیر جامعہ کی طرف سے یا کسی بھی دوسرے ذریعہ سے ٹکٹ کا انتظام کر کے طلبہ کو بروقت روانہ کیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے کبھی کسی طرح کی سیاست کو داخل نہ کیا، نہ ہی کسی ایسی تنگ دلی کا مظاہرہ کیا جس سے طلبہ کا مستقبل متاثر ہو۔ ان کی بلند حوصلگی عالی ظرفی اور بے نفسی سے بہت سے لوگوں کا مستقبل سنور گیا۔ کسی ادارہ کے ذمہ دار کے لیے یہ ایک بڑا وصف ہے۔

۷۔ اس مضمون میں صاحب ترجمہ کی علمی حیثیت پر بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ کیونکہ اب تک ان کے احوال پر جو تحریریں نظر سے گزری ہیں، ان میں یہ پہلو تشنہ محسوس ہوتا ہے، بلکہ بعض تحریروں سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ مرحوم کا بذات خود علم سے کوئی خاص تعلق نہ تھا، البتہ انتظامی حیثیت سے وہ بہت کامیاب تھے۔ شخصیات کے تجزیے میں لکھنے والا آزاد ہوتا ہے، جو رائے چاہے قائم کرے اور اس کی تائید میں دلائل پیش کرے۔ مرحوم کے سلسلہ میں مذکورہ بالا رائے سے مجھے اتفاق نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ مرحوم نے تدریس، تالیف اور تقریر کو مشغلہ نہیں بنایا اور نہ اس میدان میں ان کو کوئی خاص شہرت حاصل ہوئی۔ لیکن اس سلسلہ میں اس پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ انھوں نے

جامعہ رحمانیہ سے باقاعدہ فراغت حاصل کی تھی اور تجارتی مشاغل کی کثرت سے پہلے وعظ و تبلیغ کی سرگرمیوں سے بھی ان کا تعلق تھا۔ ایک طویل عرصہ تک محلہ کی مسجد کے وہ امام تھے اور اس ذمہ داری کو بڑی خوش اسلوبی سے نبایا۔ لوگ ان کی قرأت کو سننے کے مشتاق رہا کرتے تھے۔ دینی مسائل پر گفتگو میں وہ باقاعدہ حصہ لیتے تھے اور بڑے سلجھے انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ دینی کتابوں کے مطالعہ کا سلسلہ بھی تھا، اس لیے مسائل مستحضر رہتے تھے۔

سفر حج میں ایک مرتبہ ایام منیٰ میں ایک مقام پر میں ان کے ساتھ تھا۔ آرام کے لیے ایک مقام پر بیٹھ گئے۔ بہت سے لوگ حج سے متعلق مسائل ان سے دریافت کرنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ موصوف بے تکلف سائلین کی رہنمائی کر رہے ہیں اور ان کے سوالات کے جوابات دے رہے ہیں۔ یہ سلسلہ دیر تک قائم رہا۔

جامعہ کی عربی مراسلت راقم سطور کے ذمہ تھی، بہت سے معاملات میں طویل اور قدرے علمی انداز کے خطوط لکھنے ہوتے تھے۔ موصوف تمام خطوط کو پڑھتے تھے اور ان پر اپنے اطمینان کا اظہار کرتے تھے، کبھی کبھی مضمون بدلنے کی ہدایت بھی کرتے تھے، اس سلسلہ میں ان کی رائے بیحد صائب ہوتی تھی۔ زبان و بیان کے نشیب و فراز سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ مختلف شعراء کے کلام پر مشتمل جو طویل انتخاب انھوں نے مرتب کیا تھا، اس سے ان کے ذوق کی ستھرائی و بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو کے اس انتخاب سے ان کے ادبی شعور کو جلا ملی تھی، اور عربی زبان کو سمجھنے اور انگریزی لکھنے میں اس کا اثر نمایاں تھا۔ دعوتی کارڈ اور کتبات وغیرہ کے مضمون کی تعیین و تحسین میں بھی ان کی رائے بیحد وقیع تھی، وہ جس لفظ یا ترکیب کو مجروح قرار دیتے تھے وہ سب کو کھٹکتی تھی۔

مرحوم کے علمی مقام و حیثیت پر اظہار خیال کرتے ہوئے جامعہ سلفیہ کی تصنیفی و اشاعتی سرگرمیوں کی جانب اشارہ ضروری ہے۔ حضرت شیخ الحدیث حفظہ اللہ تعالیٰ کی مرعاۃ المفاتیح کی اشاعت کے سلسلہ میں مرحوم کسی بھی تعویق و تاخیر کے متحمل نہیں تھے، اور انھی کی تاکید و توجہ سے اس کی دو اشاعتیں جامعہ سے شائع ہوئیں، تیسری اشاعت کی منظوری بھی وہ دے چکے تھے، لیکن اس کی تفصیل کا مقام مضمون کا دوسرا حصہ ہے۔

اسی طرح دیگر علمی منصوبوں کی بھی موصوف بیحد حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ جامعہ کے ادارۃ البحوث سے اب تک چھوٹی بڑی تقریباً دو سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ موصوف نے کبھی بھی اس پروگرام میں کسی طرح کا التوا پسند نہ کیا جب بھی کسی کتاب کے ترجمہ یا تصنیف یا اشاعت کی بات آئی، انھوں نے فراخدلی سے اس کی تنفیذ کی اجازت دی، جبکہ ان کو — دوسروں کی طرح — بخوبی یہ علم تھا کہ جامعہ کا اشاعتی منصوبہ اس کے لیے کسی بھی طرح کے

مادی فائدہ کا سبب نہیں، بلکہ اس کا جو کچھ حاصل ہے وہ علمی وثقافتی ہے۔ مرحوم نے اپنی علم دوستی وقدردانی کی بناپر ادارۃ البحوث کے تصنیفی واشاعتی منصوبوں کی قابل فخر طور پر سرپرستی کی اور ادارہ کے کارکنوں کو ہمیشہ حوصلہ شکنی سے بچایا۔ قرآن کریم کے اردو ترجمہ وتفسیر کے منصوبہ کا جب انھیں علم ہوا تو بیحد خوش ہوئے اور جیب خاص سے اس کی تکمیل کے لیے ایک خطیر رقم مخصوص کردی۔ یہ سب کچھ انھوں نے بلاشبہ فرض شناسی کے طور پر کیا۔ لیکن ہمیشہ ان کی یہ تمنا بھی رہی کہ جامعہ سلفیہ کے شعبۂ تصنیف واشاعت کو علمی وتجارتی دونوں سطح پر اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ مالی اعتبار سے یہ ادارہ خود کفیل ہو جائے، اور ساتھ ہی علم وتحقیق کے میدان میں اس کا اعتبار قائم ہو جائے، لیکن اس پاکیزہ منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں سب سے بڑی دشواری عدم تعاون تھا۔ موصوف اس عظیم کام کو تنہا انجام نہ دے سکتے تھے اس لیے بڑی حسرت سے جامعہ کی اس ناکامی کا تذکرہ کرتے تھے۔ یہ منصوبہ کیوں عملی شکل نہ اختیار کر سکا اس کا ذکر بھی مضمون کے دوسرے حصہ میں قدرے تفصیل سے ہوگا۔

ادارۃ البحوث سے عربی واردو دونوں مجلے بحمداللہ سنہ۱۹۶۹ء سے شائع ہو رہے ہیں۔ ان کی اشاعت وترسیل پر مبا خرچ آتا ہے۔ لیکن خریداری محدود ہے۔ کبھی کبھی یہ خیال سامنے آیا کہ ان پرچوں کی اشاعت بند کردی جائے۔ معلوم نہیں اس طرح کی تجویز پیش کرنے والوں کی نیت کیا تھی۔ لیکن موصوف نے بڑی سختی سے اس کی مخالفت کی۔ البتہ وہ یہ کہا کرتے تھے کہ مرکزی درسگاہ کے مجلات کے سلسلہ میں جماعت کے اہل علم وغیرہ کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ان کے علمی ومادی تعاون سے یہ سلسلہ جاری رہے۔ ان کی تمنا تھی کہ جماعت کے عربی مدارس ان مجلات پر خصوصی توجہ مبذول کریں، بالخصوص عربی مجلہ پر کہ یہ مرکزی درس گاہ کا منفرد عربی مجلہ ہے جو تقریباً دو دہائیوں سے برابر شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ میں جب جماعت کے نام کسی اپیل کی اشاعت کا سوال سامنے آیا تو موصوف نے اس سے اتفاق نہ کیا۔ اسی طرح انھوں نے ان تمام تاثراتی خطوط کی اشاعت سے بھی منع کردیا تھا جن میں مجلہ (عربی یا اردو) کی بابت مدح وستائش مرقوم ہوتی تھی، ان کا نظریہ یہ تھا کہ دینی وعلمی کاموں کی ادائیگی فرض کے طور پر انجام دینا ضروری ہے، کسی دوسرے پہلو پر نظر غلط ہے۔

۸۔ علمی اداروں کے ساتھ جامعہ کے تعلقات کی استواری میں موصوف کے ساتھ توفیق ایزدی شامل تھی۔ ان کے دور نظامت میں جامعہ کے علمی وثقافتی تعلقات عالم عرب کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں سے استوار ہوئے اور طلبہ کو استفادہ کا بہترین موقع میسر ہوا۔ موصوف اس نوعیت کے تعلقات کو بڑی اہمیت دیتے تھے، ان کو یہ احساس تھا کہ

موجودہ دور میں تعلیمی اداروں کا باہمی ربط اساتذہ و طلبہ دونوں کے لیے ضروری ہے۔ اس سے بحث و تحقیق کی نئی راہیں سامنے آتی ہیں اور علمی منصوبوں کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے جامعہ کے آغاز ہی سے مدینہ یونیورسٹی سے اس کا تعلق استوار ہوگیا اور طلبہ کے وہاں تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ شروع ہوگیا جو بحمداللہ آج بھی قائم ہے۔ اس کے بعد مکہ مکرمہ کی ام القریٰ یونیورسٹی، ریاض کی امام محمد بن سعود یونیورسٹی اور ملک سعود یونیورسٹی، پھر سعودیہ سے باہر دوسری اسلامی یونیورسٹیوں سے بھی تعلقات قائم ہوئے اور اس سے جامعہ کے اعتبار میں اضافہ ہوا۔

ملک کے اندر بھی مرحوم نے سنٹرل یونیورسٹیوں اور علاقائی یونیورسٹیوں کے ساتھ تعلقات کی استواری کو اہمیت دی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے بنارس ہندو یونیورسٹی کے لیے کوشش کی گئی جس میں کامیابی نہ ہوسکی۔ اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلقات استوار ہوئے اور بحمداللہ ان تمام اداروں سے طلبہ کے استفادہ کا سلسلہ جاری ہے۔

پچھلے سال جون کی بات ہے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ کی ممبری کے لیے ایک ہمدرد نے راقم سطور کے پاس لکھا، مجھے اپنے مشاغل کے پیش نظر تامل تھا۔ مرحوم سے میں نے استصواب کیا، انھوں نے زور دیکر کہا کہ ممبری قبول کرلینا بہتر ہے۔ جب کورٹ کے اجتماع میں شرکت کا وقت آیا تو میں نے سفر کی تیاری کی۔ اچانک شہر کے حالات ناہموار ہوگئے اور میں نے سفر ملتوی کردیا۔ موصوف کو عدم شرکت کا علم ہوا تو ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس طرح کے مواقع کو کھونا نہیں چاہیے۔

جامعہ کی علمی شہرت اور یونیورسٹیوں کے ساتھ اس کے تعلقات کی بناپر عربی ادب اور اسلامی علوم سے دلچسپی رکھنے والے اساتذہ و پروفیسران مختلف اوقات میں جامعہ آتے رہتے تھے۔ ان میں قابل ذکر نام ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر نورالحسن انصاری مرحوم، ڈاکٹر عبدالعلی ازہری اور ڈاکٹر ظہیر صدیقی کے ہیں۔ مرحوم اپنی مصروفیتوں کے باوجود ان حضرات کے ساتھ بیٹھ کر علمی مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے تھے اور جامعہ کی تعلیمی ترقی کے لیے ان سے مشورے طلب کرتے تھے۔ ڈاکٹر مختارالدین اور ڈاکٹر نورالحسن کے ساتھ آپ کی طویل مجلسیں بھی ہوئی ہیں۔ ان ملاقاتوں میں مرحوم بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ بات کرتے تھے۔ دیکھنے والا یہ محسوس نہیں کرپاتا تھا کہ آپ کے مشاغل کسی اور نوعیت کے ہیں۔

بیرون ہند کے سفر میں موصوف کا سابقہ ہر میدان کی عظیم شخصیات سے پڑتا تھا۔ ان میں اعلیٰ حکام، وزراء، تجار، اطباء اور مشائخ بھی ہوتے تھے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اس کے منصب اور حیثیت کے مطابق اس طرح گفتگو کرتے تھے

کہ آدمی مطمئن ہو جاتا تھا۔ بلکہ اکثر لوگ ان کی شخصیت، وجاہت اور طرزِ تکلم سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتے تھے۔ ایک بڑے عالم نے اپنے اس تاثر کا مجھ سے بصراحت اعتراف بھی کیا، بلکہ قطر میں میں نے ایک معروف عالم دین کو دیکھا کہ مرحوم کے جوتے اپنے ہاتھ سے اٹھا کر ان کے پاس رکھ دیے، مرحوم منع کرتے رہ گئے، وہ نہ رکے۔ میں اس منظر سے بیحد متاثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ جسے قبول عام سے نوازتا ہے اس کی اسی طرح توقیر ہوتی ہے۔ مرحوم کا ظرف یہ تھا کہ اس طرح کی پذیرائی سے خوش ہونے کے بجائے شرمساری و تواضع کا اظہار کرتے تھے۔

۹۔ صاحب ترجمہ کی ملی و جماعتی زندگی کا سب سے نمایاں اور قابلِ فخر وصف معلوم نہیں ان کے سوانح نگار کیا متعین کریں گے، لیکن میں ان کی دینی و جماعتی زندگی میں جس وصف کو سب سے زیادہ نمایاں اور قابلِ فخر بلکہ واجب التسلیم سمجھتا ہوں وہ موصوف کا اخلاص اور ان کی بے نفسی وللّٰہیت ہے، جس کی جلوہ نمائی کسی ایک مقام یا واقعہ کے ساتھ محدود نہیں، بلکہ ان کی جماعتی زندگی کے تقریباً ہر گوشہ کو محیط ہے۔ اس وصف پر اگر اپنے تاثرات میں پورے طور پر پیش کروں گا تو مضمون اپنے موجودہ دائرہ سے نکل کر دوسرے حصہ میں داخل ہو جائے گا، اس لیے بحد مختصر انداز میں صرف ایک دو باتیں ذکر کروں گا۔

موصوف جس خاندان سے متعلق تھے وہ اپنی ثروت و عزت کے لیے مشہور رہے۔ ان کے سامنے ہر طرح کی راحت و آسائش کے اسباب و وسائل مہیا تھے، وہ چاہتے تو دکھاوے کے طور پر "خدمتِ دین" کا لبادہ اپنے اوپر ڈال کر نام پیدا کر لیتے، لیکن ان کا اخلاص آشنا دل اس کے لیے آمادہ نہ تھا۔ انھیں حقیقی معنوں میں جماعتی ترقی کا سودا تھا، ممکن ہے ان کے کسی اقدام سے دوسروں کی نظر میں جماعت کو نقصان پہنچا ہو، لیکن اپنی دانست میں انھوں نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس سے جماعت کی ترقی اور اس کے وقار کو ٹھیس پہنچے۔ اپنے آرام اور اپنی صحت کو تج کر انھوں نے جماعتی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی کوشش کی، اور اللہ تعالیٰ نے جس قدر کامیابی مقدر کی تھی وہ انھیں حاصل ہوئی۔

مرحوم کو جماعت کے دو عظیم اداروں کی سربراہی کا اعزاز حاصل تھا اور اپنے منصب پر وہ ہر طرح معروف و مقبول تھے، منصب اور مقبولیت سے منفعت اندوزی کی مثالیں بھی ان کے سامنے تھیں، لیکن انھوں نے کمالِ احتیاط سے اپنا دامن محفوظ رکھا اور اتنا صاف ستھرا کردار ہمارے سامنے پیش کیا کہ کہیں سے انگلی نہ اٹھ سکی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بیرونِ ہند کے ایک سفر کے دوران جماعت اہل حدیث کے ایک بیحد مخلص کرم فرما نے مرحوم کے ساتھ تجارتی مسائل پر گفتگو شروع کی، دیر کے بعد خوبصورت انداز میں مرحوم سے کہا کہ آپ ایک بڑی تجارت کے مالک ہیں، اگر اس سفر میں

اگر کچھ تجارتی مشغلہ بھی رکھیں تو اس سے فائدہ ہو۔ مرحوم نے بڑی صفائی سے انھیں جواب دیا کہ میرے تجارتی مشاغل علیحدہ ہیں گھر سے جب میں جامعہ کے کام سے نکلا ہوں تو پھر اس میں مادی منفعت کے کسی پہلو کو داخل کرنا میری طبیعت اور اصول کے منافی ہے۔

پیر کی بیماری کے باعث مرحوم کے لیے ٹرین کا سفر تکلیف دہ تھا، لیکن جب تک برداشت کرسکے ٹرین ہی سے سفر کیا۔ آخری چند برسوں میں جب تکلیف بہت بڑھ گئی تو ہوائی جہاز کا سفر اختیار کیا۔ اس سلسلہ میں وقت بچانے یا تکلیف سے بچنے کی دلیل ان کو مطمئن نہ کرسکی۔ ان کی غیور و محتاط طبیعت کا یہ حال تھا کہ سفر کے اخراجات خود برداشت کرتے تھے، اور اگر کہیں سے اس نام پر رقم ملتی تھی تو اسے جامعہ کے حوالہ کردیتے تھے۔ مادی منفعت سے بے نیازی کے ساتھ ہی مرحوم ہر طرح کی ستائش و تحسین سے بھی بے پرواہ تھے، ورنہ ان کی خدمات جس قدر عظیم و روشن تھیں، ان پر مدح و ستائش کے انبار لگ جاتے۔

ان سطور کے اختتام پر رب ذوالجلال سے دعا ہے کہ مرحوم کی خدمات کو قبول فرمائے، ان کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور ملت و جماعت کو ان کا مخلص جانشین عطا فرمائے۔ آمین۔

بقلم مقتدیٰ حسن ازہری

۱۴ رجب ۱۴۱۰ھ

کچھ یادیں .... کچھ تاثرات

از ڈاکٹر عبد العلی عبد الحمید ازہری

اس وقت میری عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی، مئو ناتھ بھنجن کے سب سے پرانے سلفی معہد مدرسہ عالیہ میں عربی کی تیسری جماعت مکمل کر لینے کے بعد میری والدہ کا اصرار ہوا، کہ مجھے کسی دوسرے مدرسہ میں بھیجا جائے، تاکہ میں اپنی دینی تعلیم مکمل کروں، کیونکہ اس وقت مدرسہ عالیہ میں چار جماعت سے اوپر کی تعلیم کا انتظام نہیں تھا، اس زمانہ میں عربی مدارس کے طلبہ کے درمیان بنارس کے جامعہ رحمانیہ کا بڑا شہرہ تھا، اور ہر شخص دل میں یہ ارمان لئے رہتا تھا کہ اسے اس میں داخلہ مل جائے اس کی خاص وجہ یہ تھی، کہ عام طور پر مدارس کے طلبہ کے ساتھ انتظامیہ کا برتاؤ کچھ اس طرح کا ہوتا تھا کہ گویا طلبہ ان کے اوپر بوجھ ہیں اور انھیں قیام وطعام کی سہولت فراہم کر کے ان کے اوپر احسان کیا جارہا ہے، اسی لئے طلبہ کو صرف سد رمق کے برابر خوراک دی جاتی تھی، صرف دو وقت دال کے ساتھ دو روٹیاں، یا ایک روٹی اور تھوڑا سا چاول ملتا تھا، ناشتہ ضروریات زندگی سے اوپر کی چیز تھی، اس لئے اس کو طلبہ کے لئے مہیا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، ایک کمرے کے اندر آٹھ دس طلبہ زمین پر اپنے بستر ڈال کر سوتے تھے۔

ان حالات میں واقعی بنارس کا جامعہ رحمانیہ نادار طلبہ کے لئے جنت سے کم نہ تھا، وہاں پر نہ صرف یہ کہ سونے کے لئے چارپائی ملتی تھی، اور صبح کو ناشتہ میں چنا ملتا تھا، بلکہ دونوں وقت کے کھانے میں بھی دال کے ساتھ سبزی یا گوشت ہوتا تھا، اور عام طور پر روٹی اور چاول دونوں کا انتظام ہوتا تھا۔

جامعہ رحمانیہ میں محدود تعداد میں طلبہ لئے جاتے تھے، مدرسین میں مئو ناتھ بھنجن کے دو فاضل اساتذہ تھے، مولانا عبد العزیز عمری، اور مولانا فضل الرحمٰن عمری، أطال اللہ حیاتہما۔ دونوں میرے قریبی رشتہ دار تھے، بلکہ مولانا فضل الرحمٰن مدظلہٗ میرے سگے ماموں ہیں، والدہ نے اپنی خواہش کا اظہار ان کے سامنے کیا، اور انہوں نے مجبوری کا اظہار کیا، اور مجھے مدرسہ فیض عام میں

مزید تعلیم کے لئے بھیج دیا گیا، بقرعید کی تعطیل میں جب مولانا فضل الرحمٰن صاحب بنارس سے مئو تشریف لائے، تو انہوں نے والدہ محترمہ کو یہ خوشخبری سنائی کہ جامعہ میں ایک سیٹ کسی طالب علم کے چلے جانے کی وجہ سے خالی ہوگئی ہے، اور انہوں نے میرے داخلے کے لئے مہتمم جامعہ سے بات کرلی ہے، اور پھر مجھے ان کے ساتھ بنارس بھیج دیا گیا، اس وقت مہتمم حضرت مولانا عبدالمتین صاحب رحمہ اللہ، تھے۔ طیب شاہ کی مسجد عصر کی نماز کے بعد مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے مجھے ان کی خدمت میں مسجد ہی میں پیش کیا، انہوں نے وہیں کھڑے کھڑے میری قابلیت کا امتحان لینے کا فیصلہ کیا، ہم لوگوں نے تیسری جماعت میں حدیث کی مشہور کتاب، " بلوغ المرام " پڑھی تھی، لیکن اسے زبانی یاد نہیں کیا تھا، لیکن اس وقت اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم میرے اوپر کچھ ایسا تھا کہ عبارتیں بڑی جلدی ذہن نشین ہوجاتی تھیں، حافظہ بہت قوی تھا، مہتمم صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ بلوغ المرام کی آخری حدیث کون سی ہے؟ میں نے اپنے مخصوص مئوی لہجے میں جواب دیا:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کلمتان خفیفتان علی اللسان، ثقیلتان فی المیزان، حبیبتان إلی الرحمٰن، سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم۔

یہ حدیث اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے تقریباً سبھی طلبہ کو یاد تھی، پھر انہوں نے پوچھا کہ کتاب کی پہلی حدیث کون سی ہے؟ میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالنے کے بعد اسے بھی بتادیا، اور داخلہ کے امتحان میں کامیاب ہوگیا۔

نئے ماحول میں مجھ کو ہر چیز نئی اور عجیب سی لگتی تھی، لیکن چند چیزیں اور چند شخصیتیں ایسی تھیں جو ذہن پہ چپک کر رہ گئیں ان شخصیتوں میں سے ایک شخصیت طیب شاہ جامع مسجد کے امام کی تھی، ہم لوگ پنجوقتہ نماز کی ادائیگی کے لئے اسی مسجد میں جاتے تھے نماز جو صاحب پڑھاتے تھے ان کی شخصیت بے حد جاذب نظر تھی، خوبرو، شکیل، تنومند، شباب کی توانائیوں سے بھرپور، چہرے پر خوبصورت سی کالی داڑھی، جامہ زیب، نفاست اور شائستگی کا ایک نمونہ، چال میں وقار وتمکنت، بات چیت میں تواضع وانکساری، چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ، غرضیکہ ان کی شخصیت ان تمام صفات حسنہ کا مجموعہ تھی، جو ہم لوگ قرآن وحدیث میں ایک مؤمن کی نسبت سے پڑھتے چلے آئے تھے، تلاوت قرآن اتنی مؤثر اور دلنشیں آواز میں کرتے تھے کہ آل داؤد کی مزامیر کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، صبح کی نماز میں خاص طور پر جب قرأت کرتے تھے، تو سننے والوں کا جی یہی چاہتا تھا کہ اس کا سلسلہ منقطع نہ ہو۔

میں نے اپنے ساتھیوں سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں؟ انہوں نے مختصر سا جواب دیا: " مولوی عبد الوحید کوٹھی والے " کوٹھی کیا تھی، ابھی مجھے معلوم نہیں تھا لیکن میں اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ مولانا عبدالمتین صاحب ناظم بھی کوٹھی والے

ہیں، یہ صاحب بھی ان کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہوں گے، لیکن کوٹھی والے تو بہت امیر تھے، ان کی دولت کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آتی تھیں، پھر یہ خاکساری اور انکساری اور تواضع اور مذہب سے اس قدر لگاؤ اور علم کی دوستی! میں نے سنا تھا، اور پڑھا بھی تھا کہ علم اور دولت کبھی اکٹھا نہیں ہوتے، اور اپنی زندگی میں دیکھا بھی کہ عالم اگر دولت کے پیچھے بھاگا تو علم نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، لیکن اللہ تعالیٰ نے کوٹھی والوں پر یہ انعام کیا تھا کہ انہوں نے دونوں چیزوں کی حفاظت کی تھی،

مولانا عبدالوحید سلفی امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند اور ناظم اعلیٰ مرکزی دارالعلوم (جامعہ سلفیہ) کو قریب سے دیکھنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔

میں دو سال سے زیادہ جامعہ رحمانیہ میں نہیں ٹھہر سکا، اقتصادی مجبوریوں کے تحت مجھے اپنی پڑھائی چھوڑ دینی پڑی پھر بنارس سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔ دو سال کے وقفہ کے بعد میں نے اپنی بقیہ تعلیم مئوناتھ بھنجن کے مدرسہ فیض عام میں مکمل کی، اس دوران نوگڈھ میں مرکزی جمعیت اہل حدیث کے کل ہند اجتماع کا اہتمام کیا گیا، جماعت ایک طویل عرصہ سے جمود اور تعطل کا شکار تھی اور بہت سے مخلص عناصر اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ اس کے مردہ جسم میں روح پھونک کر اسے حرکت میں لایا جائے، ان ہی کی کوششوں کے نتیجے میں نوگڈھ میں کانفرس کا انعقاد عمل میں آیا، وہاں پر پھر دوبارہ مولانا عبدالوحید کو دیکھنے کا موقع نصیب ہوا، وہ اپنے کچھ احباب اور رفقاء کے ساتھ کافی سرگرم نظر آ رہے تھے۔

دراصل وہ جماعت کی آنے والی نسلوں کی دینی بقاء اور تحفظ کے لئے پریشان تھے، وہ اپنے لئے کچھ نہیں تلاش کر رہے تھے جیسا کہ بہت سے سرگرم عناصر کانفرس میں اپنے ذاتی مفاد کے لئے سرگرداں و پریشان تھے، اللہ کا یہ بندہ اس فکر میں چکر لگا رہا تھا کہ جماعت اہل حدیث کا تشخص باقی رکھنے کے لئے اور دین کی صحیح تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھنے کے لئے کوئی ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے، جہاں سے تشنگان علوم دینیہ قرآن وحدیث کی صحیح تعلیم حاصل کر کے مسلمانوں کو ان کے مذہب کی بنیادی باتوں سے آگاہ کر سکیں، اس کے لئے وہ ہر بااثر فرد سے بات کرتے، اور اس کو جماعت اہل حدیث کی ایک مرکزی درسگاہ کے قیام کی ضرورت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے اپنے ایک اور عمل سے عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی، کانفرس میں شرکاء کی تعداد توقع سے زیادہ ہوگئی، اور مضبوط مرکزی قیادت کے فقدان کی وجہ سے افراتفری کا عالم تھا، بسا اوقات ہنگامے کی شکل پیدا ہو جاتی تھی، ایسے موقعوں پر مولانا عبدالوحید صاحب مصری قاری عبدالباسط کی تلاوت قرآن کا ٹیپ لگا دیا کرتے تھے، جو انہوں نے ریڈیو سے ریکارڈ کر رکھا تھا۔ تلاوت شروع ہوتے ہی مجمع میں بالکل سکوت طاری ہو جاتا تھا، اور لوگ اطمینان سے بیٹھ

جاتے تھے۔

نوگڈھ کی کانفرنس سے کوئی اور نتیجہ تو نہیں نکل سکا لیکن مرکزی دارالعلوم کے قیام کی تجویز منظور ہوگئی، اور اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو کانفرنس کامیاب تھی، تجویز منظور ہوجانا کوئی بڑی بات نہیں تھی، جماعت اہل حدیث پہلے بھی بہت سی تجویزیں پاس کرچکی تھی، جو کبھی عملی شکل میں سامنے نہ آسکیں، لیکن عبدالوحید نے اس تجویز کو عملی شکل دینے کا عزم کر رکھا تھا، اور اسے پورا کرکے دکھایا۔

جس وقت مرکزی دارالعلوم کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا، ہم لوگ جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے قاہرہ میں تھے، خبر سن کر خوشی ہوئی، اور اس کی کامیابی کے لئے دل سے دعائیں نکلیں، اس کے بعد ۱۹۶۸ء ہمارے رفقاء میں سے حافظ مقتدیٰ حسن الازہری جب واپس وطن تشریف لائے تو ان سے مرکزی دارالعلوم میں تدریس اور بحث وتالیف کے فرائض انجام دینے کے لئے رابطہ قائم کیا گیا، انہوں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی، اس طرح مولانا عبدالوحید صاحب کے ساتھ جو کہ مرکزی دارالعلوم کے شروع ہی سے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے تھے، ہمارے ایک نئے رشتے کا آغاز ہوا، جب میں ۱۹۶۹ء میں وطن لوٹا تو ڈاکٹر ازہری صاحب نے مجھے ناظم صاحب کی خدمت میں پیش کیا، ان سے براہ راست گفتگو کرنے کا میرا یہ پہلا موقع تھا، انہوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ مجھ سے مصافحہ کیا، اور بیٹھ کر دیر تک باتیں ہوئیں، میں ان سے اس طرح بات کرتا تھا جیسے ایک شاگرد کو استاذ سے کرنی چاہئے، لیکن ان کا برتاؤ میرے ساتھ ایسا تھا جیسے کہ میں کوئی بہت بڑا عالم اور باحث ہوں، ان کی خاکساری اور تواضع سے میں پہلے ہی سے متأثر تھا، اس ملاقات نے مجھے ان کا اور زیادہ گرویدہ بنادیا۔

پھر میں نائجیریا چلاگیا، وہاں سے جب بھی وطن آتا بنارس ضرور جاتا، اور ناظم صاحب سے ملاقات کرتا، اور اس طرح ہمارے تعلقات مضبوط ہوتے گئے، نائجیریا سے واپسی کے بعد بمبئی میں قیام کے دوران ہم لوگوں کو ملاقات کے زیادہ مواقع فراہم ہوئے۔ وہ جب بھی بمبئی تشریف لاتے ملاقات کا شرف بخشتے، اور میں جب بھی بنارس سے گذرتا، سلام کرنے کے لئے ان کی خدمت میں حاضری دیتا، انہوں نے مجھے مرکزی دارالعلوم کی مجلس منتظمہ کا ممبر بھی بنادیا، اسی طرح جمعیت اہل حدیث کی سرگرمیوں میں بھی مجھے داخل کرنے کی کوشش کی، میں اپنی ذاتی مصروفیات اور کچھ دوسرے اسباب کی بناء پر تمام اجتماعات میں شرکت نہیں کرسکا، لیکن جامعہ سلفیہ کی ترقی اور اس کے تعلیمی پروگراموں کو بہتر بنانے کے لئے جو اسکیم میرے ذہن میں آتی تھی میں اس سے ناظم صاحب کو باخبر کردیتا تھا۔

آخری دنوں میں ان پر کام کا دباؤ بہت زیادہ محسوس ہوتا تھا، مرکزی جمعیت اہل حدیث کچھ اس طرح کے مسائل

کاشکار تھی، جن میں ذاتی مفاد جمعیت کے لئے خطرہ بن رہا تھا، وہ اپنی طرف سے ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ جماعت کا کوئی کام رکنے نہ پائے، ان کو اپنی ذات کے لئے کچھ درکار نہ تھا، مئو میں کلیۃ فاطمۃ الزہراء الاسلامیہ للبنات اساتذہ کی کمی کی وجہ سے ایک بحرانی کیفیت کا شکار تھا، کلیہ میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیاں مایوسی میں مبتلا تھیں، اراکین میں خاکسار، ڈاکٹر مقتدیٰ حسن اُلازہری اور برادرم مظہر احسن الازہری کے نام بھی تھے، ہم نے دوسرے احباب کے ساتھ بیٹھ کر مشورہ کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ناظم صاحب سے مدد مانگی جائے اور درخواست کی جائے کہ وہ جامعہ سلفیہ کے کسی مدرس کو عاریۃً کلیہ کے لئے دیدیں، ایک وفد کی شکل میں جن میں مولانا محمد الاعظمی اور حکیم عبد الباقی عمری بھی شریک تھے، ناظم صاحب سے ملاقات کی گئی، اور اپنا معروضہ ان کے سامنے رکھا، انہوں نے ہماری بات بڑے غور سے سنی، اور جب انہیں یہ بتایا گیا کہ تمام مسائل اور رہنگامی حالات کے باوجود کلیہ کی طالبات ہندوستان کے کسی بھی مدرسہ یا جامعہ کی طالبات سے بہتر ہیں، اور کلیہ نہ صرف مئو میں بلکہ پورے صوبہ کے اندر اپنا نام پیدا کر رہا ہے، تو انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا، اور ہمیں یہ اطمینان دلا کر رخصت کیا کہ جامعہ سلفیہ اس کے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں ہر ممکن مدد کرے گا، ڈاکٹر ازہری کے ساتھ انہوں نے کچھ مزید مشورے کئے، اور بعد میں ہم لوگوں کو بلا کر یہ خوش خبری سنائی کہ جامعہ سلفیہ کے ایک سینئر اور تجربہ کار مدرس مولانا عابد صاحب کو ایک سال کے لئے عاریۃً کلیہ فاطمۃ الزہراء میں بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا ہے، اس طرح کلیہ ایک بہت بڑے بحران سے بچ گیا، اور مایوسی کی شکار طالبات کو کامیابی کی علامتیں نظر آنے لگیں۔

ناظم صاحب کی صفات عالیہ میں سے ایک بہت بڑی خوبی ان کا علو نفس تھا، وہ کبھی بھی اپنے ذاتی مفاد کے لئے یا کسی کی بدخواہی میں اپنے آپ کو دوسروں کے سامنے اپنے مرتبہ سے نیچے نہیں اتارتے تھے۔ میرے ساتھ ان کا رویہ بہت ہی مخلصانہ اور ہمدردانہ تھا، لیکن جب میں ایک بحرانی دور سے گذر رہا تھا، انہوں نے کبھی بھی میرے سامنے دوسروں کے خلاف زبان نہیں کھولی، اور نہ نقصان پہونچانے کی غرض سے کوئی مشورہ دیا، اور نہ مجھ سے تمام تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کی، میں نے بھی ان کے احسانات کا خیال کرتے ہوئے کبھی اپنی داستان غم سنانے کی کوشش نہیں کی، انہوں نے کبھی بھی مجھے جامعہ سلفیہ میں کام کرنے کے لئے بہکانے یا پھسلانے کا ارادہ نہیں ظاہر کیا۔ لندن کے لئے روانہ ہوتے وقت انہوں نے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا، کسے معلوم تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہوگی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے، اور اپنے مقرب بندوں کے ساتھ جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے، اور دوسروں کو ان کے اخلاق حسنہ اور اعلیٰ کردار سے سبق حاصل کرنے کی توفیق دے۔ (آمین)

آہ ! والد صاحب رحمہ اللہ

عبد اللہ سعود ابن عبد الوحید سلفی

اس دنیائے ناپائدار میں جتنے بھی چھوٹے یا بڑے لوگ آئے، سب کو ایک دن جانا ہے، نہ کوئی یہاں ہمیشہ رہا اور نہ رہے گا، مگر سب کا جانا ایک جیسا نہیں ہوا کرتا۔ والد محترم کی رحلت جمعیۃ اہلحدیث کی تاریخ کا عظیم سانحہ ہے، جس کا تعلق صرف افراد خاندان سے نہیں، جماعت و جامعہ سے نہیں بلکہ ملتِ اسلامیہ کے ہر اس فرد سے ہے جس کو والد صاحب سے محبت و لگاؤ تھا۔ جس نے بھی آپ کو نزدیک سے دیکھا، یا آپ کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق ہوا، اس نے آپ کے اخلاص و محبت، زہد و تقویٰ، ایثار و قربانی، عزم محکم، صبر و استقامت، قوتِ برداشت، اور تحمل مزاجی کی تعریف کی۔ آپ صحیح معنوں میں حق و صداقت کے علمبردار، پیکر صدق و وفا اور دائمی ایمان و یقین تھے۔ آپ کی حیاتِ مخلصانہ سے کس قدر روحانی سکون ہوتا تھا اور کتنے دل کو فرحت و خوشی ہوا کرتی تھی، وہ ہم سے رخصت ہو گئے، علم و عمل، محبت و شفقت اور اخلاق و کردار کا ایک عہد بیت گیا۔ ہم خدائے ذو الجلال کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم کو ایسی شفقتِ پدری عطا کی کہ ہم دونوں بھائیوں کو علم دین کی تعلیم کا موقع ملا، جب کہ اکثر لوگ تعلیم کو روزی روٹی سے جوڑ کر اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے محروم رکھتے ہیں، یہ وہ دولت بے بہا ہے جس پر ہم جتنا بھی ناز کریں کم ہے، جو والدِ محترم کی دینی محبت کے صلہ میں دونوں بھائیوں کو حاصل ہوئی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو صحیح معنوں میں دین کا شیدائی، اسلام کا خادم اور والدین کے لیے اجر و ثواب کا باعث بنائے۔ آمین

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

آپ کی ولادت مدن پورہ میں ۴ ر جمادی الآخرہ ۱۳۴۲ھ مطابق ۲۳ ر جنوری ۱۹۲۴ء بروز چہار شنبہ ہوئی۔ بچپن سے ہی آپ اپنے والدین کو سب سے پیارے تھے، خدا نے آپ کو بہت سی خوبیوں سے نواز تھا۔ نوجوانی کی عمر سے آپ نے حالات کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تاریخیں اور واقعات ۱۹۳۷ء کے قبل سے ملتے ہیں۔

اس وقت آپ کی عمر بارہ سال کے قریب تھی، بچپن کی تعلیم مدرسہ سے شروع ہوئی، جامعہ رحمانیہ کا قیام آپ کے تعلیمی دور میں ہوا، اور آپ یہیں سے فارغ ہوئے۔ آپ کے اساتذہ میں مولانا منیر خاں صاحب کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے جن سے آپ نے علم حدیث حاصل کیا، مولانا منیر خاں صاحب مرحوم مولانا سید صاحب محدث بنارسی اور مولانا میاں نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کے شاگرد تھے۔ اسی طرح فقہ و تفسیر کے استاد مولانا عبدالغفار حسن صاحب رحمانی تھے۔ مولانا عبدالمجید صاحب حریری جو علم و ادب کے استاد اور کئی زبانوں کے ماہر تھے، والد صاحب کے استادوں میں تھے، جن سے دیوان حماسہ پڑھا تھا۔ مولانا عبیداللہ صاحب عنبر، مولانا ابوالقاسم صاحب (شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید صاحب رحمانی کے والد) اور مولانا حبیب اللہ صاحب بھی آپ کے استاد تھے، جن سے آپ نے فارسی و عربی ادب و قواعد وغیرہ کی تعلیم حاصل کی۔ ماسٹر اکبر خاں مرحوم جو اپنی زندگی کے آخری ایام میں جامعہ سلفیہ میں مدرس تھے، والد صاحب کے انگریزی کے استاد تھے، ناچیز کو بھی اکبر خاں مرحوم کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ والد صاحب نے علم تجوید اور قرأت قاری احمد سعید صاحب مرحوم بن مولانا محمد سعید صاحب محدث بنارسی سے حاصل کیا۔ قاری صاحب کا شمار جامعہ رحمانیہ کے محسنین میں ہوتا ہے، جن کے دور میں مدرسہ رحمانیہ کا ایک مقام تھا اور قاری صاحب کی سب عزت کرتے تھے، جامعہ سلفیہ کے قیام کے لیے بھی آپ کافی متحرک تھے، آپ کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ قرآن تجوید کے ساتھ پڑھاتے تھے، اور جس نے آپ سے قرآن پڑھا وہ مکمل قاری ہوگیا۔ عربی و فارسی امتحانات یوپی بورڈ سے عالم کا امتحان ۱۹۴۳ء میں پاس کیا، انگریزی زبان کا بھی کافی اچھا ملکہ تھا، ۱۹۴۶ء میں انٹر کا امتحان پرائیویٹ پاس کیا تھا۔ آپ اس کے اوپر کی تعلیم آپ مکمل نہ کرسکے تھے اپنے کاروباری اور جامعہ سلفیہ کے تمام انگریزی خط و کتابت شروع سے آپ ہی انجام دیتے رہے۔

حساب کتاب اور اکاؤنٹنگ میں کافی ماہر تھے، وکلاء اور آڈیٹر بھی آپ کی حاضر دماغی کی تعریف کرتے، آپ نے جو بھی ذمہ داری قبول کی اس کے حسابات کو جس خوبی سے رکھا ہے۔ اس کی مثال کم ملے گی۔ آپ ہمیشہ تعلیم دیتے کہ روپیہ پیسہ کا حساب بہت صاف ہونا چاہیے، اس سے ذہن پر بوجھ نہیں پڑتا اور آدمی بدگمانی سے محفوظ رہتا ہے۔ بچپن سے ہی آپ حساب کتاب میں بہت محتاط تھے، کوئی سامان ادھار لانے سے منع کرتے۔ آپ کا ایک واقعہ مجھے آپ ہی کے قلم کا ملا ہے۔ ۵۳-۱۹۵۰ء میں اہل خاندان نے دنگل کرایا، بڑے بڑے پہلوانوں کو دعوت دی، کافی انعامات تقسیم کیے۔ ٹکٹ رکھنے کے بعد بھی نقصان ہوا۔ آپ اس کے منتظمین میں تھے یا نہیں، یہ معلوم نہیں، مگر آپ نے یہ نوٹ کیا ہے:

"۲۰ر صفر ۱۳۷۳ھ ۲۱ر اکتوبر ۱۹۵۳ء بدھ: آج دنگل بابت خیمہ والے کو اپنے پاس سے پیسہ دے کر چکتا کردیا"،

اب روپیہ وصول کرنا ہے۔" آپ کی طبیعت ایسی ہی اخیر عمر تک تھی۔

آپ شاعر نہ تھے، مگر شعر وادب سے دلچسپی تھی، آپ نے ۱۹۲۷ء میں ایک ضخیم کتابی پر مشہور شعراء کا کلام جمع کیا، جو ۴۵۵ صفحات پر محیط ہے۔ اس میں نظم، مثنویات اور قطعات وغیرہ ہیں، اس مجموعہ کا نام آپ نے "گلدستہ" رکھا ہے جو شعراء کے منتخب کلاموں کا مجموعہ ہے۔ ظاہر ہے اتنے ضخیم اور چار پانچ ہزار اشعار پر مشتمل یہ مجموعہ ایک دو سال میں تیار نہیں ہوا ہوگا بلکہ اس میں دس بارہ سال لگے ہوں گے۔ اس مجموعہ میں پہلی نظم "بندے کی فریاد" کے عنوان سے ہے، شاعر کا نام نہیں لکھا ہے، اس کے چند شعر یہ ہیں:۔

چشم کرم کا صدقہ آمرزگار سن لے — کچھ کہہ رہا ہے تجھ سے اک شرمسار سن لے
دونوں جہاں کے خالق، ہے کون سننے والا؟ — جو تو نہیں سنے گا، پروردگار سن لے
اب دل سے تیرا بندہ ہے شرمسار سن لے — آنکھوں میں اشک حسرت، لب پہ صدائے توبہ
بے آس ہو رہا ہے امیدوار سن لے — ناشاد بیکسوں کو او شاد کرنے والے
آمرزگار سن لے، پروردگار سن لے — مجرم کی التجا ہے، ناشاد کی دعا ہے

کچھ اور اشعار:

اسی تلاش میں گم ہو گئی حیات تری — تلاش حق سے فروزاں تھی کائنات تری
مجھے تو کیا مرے نقش قدم مٹا نہ سکے — زہے خلوص محبت کہ حادثات جہاں
ڈرتے نہیں سیاست اہل جہاں سے ہم — بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجاز
بے سر اٹھا رہے ہیں ترے آستاں سے ہم — دیکھیں گے ہم بھی کون ہے سجدہ طراز عشق

عنفوان شباب ہی سے دینی کاموں سے دلچسپی تھی اور ہمارے جد امجد حاجی حافظ عبدالرحمٰن مرحوم نے گھر کا جو ماحول بنایا تھا، اس کا اثر ہونا بھی لازمی تھا۔ یہ وہی شخص ہیں جن کے نام پر انجمن رحمانیہ اور مدرسہ رحمانیہ کا قیام عمل میں آیا ہے۔ آپ کافی دیندار اور غریب پرور تھے۔ خدا نے آپ کو دولت بھی بہت دی تھی، جس کی وجہ سے آپ "بیوپاری" کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔ بنارس کے مہاجن اور افسران بھی آپ کی عزت کرتے۔ دین سے لگاؤ اتنا تھا کہ آپ کی زندگی میں ریڈیو سے گانا سننے کی ہمت کسی کو نہ ہوتی۔ آپ کے مکان سے کافی دور پہلے باجا وغیرہ کی آواز بند کر دی جاتی تھی کہ حافظ صاحب کے کان میں نہ پڑ جائے۔ غریبوں میں اناج و پیسہ تقسیم کرتے، محلہ والوں کا خیال رکھتے۔

مدنپورہ کے علاقہ گول چبوترہ پر کنواں آپ ہی کا بنوایا ہوا ہے ۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ جب بنارس میں فساد ہوا تو آپ نے بیل گاڑی پر اناج منگا کر ایک بڑے کمرے میں بھروا دیا اور سب محلہ والوں میں تقسیم کرا دیا۔ جب آپ حج بیت اللہ پر تشریف لے گئے، تو وہاں بھی کافی چادر، کپڑا اور روپیہ تقسیم کیا۔

اسی ماحول میں آپ کے تینوں فرزند، مولوی عبدالاحد و حاجی عبدالحق و مولانا عبدالمتین صاحبان نے بھی پرورش پائی جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دینی ماحول گھر میں باقی رہا، ان کے بعد ان تینوں کے اولاد میں بھی بچوں نے دینی تعلیم حاصل کی مگر خاندان کی روایت اور رہن سہن میں پہلی جیسی بات نہ رہی، موجودہ دور کی آلائشوں نے اس خاندان پر بھی اثر ڈالا، مگر اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ اب بھی یہ خاندان دینی کاموں میں سرگرم عمل ہے، اور درمے، درمے، سخنے، قدمے ہر طرح سے دینی کام میں لگا ہوا ہے، میرے والد محترم بچپن سے ہی دینی ماحول میں رہے ہیں۔ تعلیم کے ایام میں بھی جلسہ وغیرہ میں شریک ہوتے، چنانچہ آپ نے لکھا ہے، "۲۵ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ ۲ اپریل ۱۹۴۳ء جمعہ، مئو آئمہ اہلحدیث کانفرنس میں شرکت کے لیے گئے، بیرسٹر ظہور احمد کے مکان پر قیام ہوا، بہت آرام ملا"۔ اس وقت آپ کی عمر انیس سال تھی، اس کے بعد بھی آپ کی تعلیم جاری تھی چنانچہ ۱۵ اپریل ۱۹۴۳ء پر رقمطراز ہیں "امتحان میں ہم اور محمد زبیر اور مولوی ابوالخیر سکنڈ پاس ہوئے"۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء میں نوٹ کیا ہے کہ "امتحان کا فارم آج بھرا"۔ غالباً یہ انگریزی کا امتحان تھا، اس کی مارک شیٹ میرے پاس تھی جو تلف ہو گئی۔

آپ کو ذمہ داری کا بہت احساس تھا، جوانی کی عمر میں ہی خاندان کے بزرگوں کی نظر آپ پر پڑنے لگی تھی، جب ہمارے یہاں کاروبار الگ ہوا اور کام تقسیم ہوا تو حساب کتاب کی ذمہ داری آپ کو سونپی گئی۔ خط و کتابت بھی آپ ہی کرتے تھے۔

سیاست میں کھل کر حصہ کبھی نہیں لیا، لیکن سیاست سے کنارہ کش بھی نہ تھے، ۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو مولانا عبدالمجید صاحب حریری مرحوم کے الیکشن میں حمایت کے لیے مئو گئے تھے، آپ نے لکھا ہے کہ "نہیں اور عیسٰی کرہاں دیہات میں تھے۔ ۱۳ مارچ کو خبر آئی مولوی صاحب ۲ ہزار ووٹ سے ہار گئے"۔ جب میرے بڑے ابا حاجی عبدالعلیم صاحب مرحوم ۱۹۶۲ء میں میئر کے الیکشن کے لیے کھڑے ہوئے، اس میں بھی آپ نے حصہ لیا تھا، اور حال میں میرے پھوپھا محمد صالح انصاری صاحب کے میئر کے الیکشن میں کافی سرگرم عمل رہے۔ بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں سے ربط و تعلق تھا اور سب آپ کی عزت کرتے تھے، جب آپ ۱۹۸۳ء میں یوپی حج کمیٹی کے ممبر بنے اور قرعہ اندازی میں ۳ مئی ۱۹۸۳ء کو لکھنؤ تشریف لے گئے تو ریاستی وزیر محمد امین انصاری نے جو حج کمیٹی کے سربراہ تھے، آپ سے قرعہ اندازی کے آغاز کی فرمائش کی، آپ وہاں کے کام سے مطمئن نہ تھے

اس لیے اس سے الگ ہوگئے۔ آپنے ۵رمئی ۱۹۷۶ء کو دہلی میں منعقدہ آل انڈیا مومن کانفرنس میں شرکت کی تھی، آپ اس کے رکن بھی تھے۔

مدنپورہ کی جامع مسجد (طیب شاہ) میں آپ نے تیس سال تک امارت کی ذمہ داری کو انجام دیا، ۱۹۵۹ء میں میرے نانا مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم جب بیمار وکمزور ہوگئے تو یہ ذمہ داری آپ کو سپرد کردی۔ اللہ تعالیٰ نے والد صاحب کو بلند اور دلکش آواز عطا کی تھی۔ لوگ آپ کی قرأت کی بہت تعریف کرتے۔

آپ رمضان المبارک میں شب قدر کی نماز مسجد میں پابندی کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ اس نماز کا یہ حال تھا کہ لوگ شہر اور مضافاتِ شہر سے رات کی تاریکی میں آپ کے پیچھے نماز ادا کرنے آتے اور مسجد نمازیوں سے تنگ پڑجاتی۔ عورتیں بھی تہجد کی نماز مسجد میں آپ کے پیچھے پڑھنے لگی تھیں۔ آپ نے یہ ذمہ داری اخیر عمر تک نباہی، مگر پیر کی تکلیف کی وجہ سے فجر کے علاوہ چار وقت کی نماز اکثر گھر پڑھ لیا کرتے تھے۔ فجر کی نماز برابر پڑھاتے رہے۔ آخری نماز ۲۷ر اکتوبر ۱۹۸۹ء جمعہ کو پڑھائی، جس روز آپ کے پیٹ میں درد شروع ہوا، پھر آپ مسجد میں دوبارہ نہ جاسکے۔

جامعہ رحمانیہ مدنپورہ بنارس جو ہمارے خاندان کا قائم کردہ پرانا ادارہ ہے، مختلف مدارج طے کرتا ہوا موجودہ منزل پر پہنچا ہے، اس کے قیام کی کڑی ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء سے ملتی ہے۔ جس وقت ہمارا خاندان حنفی سے اہلحدیث ہوا اور اپنے بچوں کی تعلیم صحیح مسلک اور کتاب وسنت کے مطابق دینے کی فکر ہوئی۔ یوں تو ہمارا خاندان بہت بڑا ہے اور ہمارے جدامجد پیر محمد عرف فرنگی جن کی پیدائش اندازاً ۱۷۵۰ء میں ہوئی تھی، کی طرف منسوب کرکے "فرنگی" مشہور ہے۔ اس خاندان کے افراد میں آج بھی بہت سے حنفی ہیں اور شہر بنارس کے علاوہ بیرونی شہروں میں بھی آباد ہیں، مگر جہاں سے ہمارا خاص خاندان ممتاز ہوتا ہے وہ اللہ بخش ولد نذر محمد پیر محمد کے پوتا ہیں۔ آپ کو چار بچے تاج محمد، وارث محمد، نور محمد اور عبدالرحیم اور ایک بچی رحم بی بی تھی۔ یہی تاج محمد و وارث محمد کے اعتبار سے ہمارا خاندان "داداوارث" کے نام سے مشہور ہے۔ اہل بنارس عموماً حنفی تھے۔ ان میں تاج محمد وغیرہ بنارس کے اولین اہلحدیث میں سے ہیں۔ انھیں بزرگوں کی محنت کا ثمرہ ہے جو بنارس میں اتنی بڑی تعداد میں کتاب وسنت کے متبع اور مسلک اہلحدیث کے ماننے والے پائے جاتے ہیں۔

والد محترم بچپن سے ہی اپنے خاندان والوں کی معلومات جمع کررہے تھے۔ آپ نے خاندان کا جو شجرہ نسب مرتب کیا ہے وہ ایک نادر چیز ہے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جو بھی دیکھتا ہے، تعجب کرتا ہے اور والد صاحب کی محنت کی تعریف کرتا ہے۔ اتنے بڑے خاندان کے تمام افراد کی واقفیت اور ان کی اولاد کا عمر کے حساب سے تذکرہ وہی کرسکتا ہے، جس کو

خدا کی طرف سے ایسی صلاحیت عطا ہوئی ہو۔ والد صاحب کہتے تھے، قرابتداری کا علم رکھنا اور سب کے ساتھ صلہ رحمی کرنا اسلام کا شعار ہے، اور بغیر معلومات حاصل کیے اپنے خاندان والوں کو کیسے جان سکتے ہو۔ آپ نے جو شجرہ مرتب کیا ہے اس کے مطابق آپ کا سلسلۂ نسب یہ ہے: عبدالوحید بن حاجی عبدالحق بن حافظ عبدالرحمٰن بن حافظ عبدالرحیم بن اللہ بخش بن نذر محمد بن پیر محمد عرف فرنگی بن غلام محمد عرف غلامن ان کے بعد بھی پانچ پشت کا ذکر ہے، مگر ان کے حالات کا صحیح علم نہیں ہے۔

نذر محمد کو تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں، جن میں اللہ بخش سب سے بڑے تھے۔ اللہ بخش کو پانچ اولاد ہوئی جن میں تاج محمد پھر وارث محمد پھر نور محمد پھر رحیم بی بی اور سب سے چھوٹے عبدالرحیم تھے۔ عبدالرحیم کو دو لڑکے عبدالرحمٰن و عبدالخالق اور ایک لڑکی نوبل بی بی تھی۔ عبدالخالق جو چھوٹے تھے، بچپن میں انتقال کر جانے کی وجہ سے حافظ عبدالرحمٰن اپنے باپ کے اکلوتے لڑکے رہے، ان کی والدہ مریم بی بی بنت حاجی نہنو کی دعا تھی کہ آپ کو اتنی عزت نصیب ہوئی، اور ایک زمانہ وہ آیا جب خاندان کے تمام افراد انھیں کی سرپرستی اور دیکھ بھال میں تھے۔ آپ نے تجارت کو وسعت دی اور اللہ تعالیٰ نے برکت دی۔ آپ ہی کے نام کی نسبت سے آج بھی ہمارا خاندان "تاجا بیوپاری" کے نام سے مشہور ہے۔ دینداری اور خدا ترسی آپ کو اللہ کی طرف سے ملی تھی۔ آپ کے والد حافظ عبدالرحیم بھی بہت دیندار تھے۔ والد صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ تاریخی مضمون ایک سند کے طور پر یاد کیا جائے گا۔

سنہ ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۲ء: کچھ عرصہ سے بنارس میں جماعت اہل حدیث کا تبلیغی سلسلہ جاری تھا اور بہت سے لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ ان میں حاجی تاج محمد و حافظ عبدالرحیم، دلال محمد دبھیا دا، محمد یوسف دشیر کے یارا کے، وغیرہ پیش پیش تھے۔ چنانچہ مولانا عبداللہ صاحب غازیپوری کی آمد پر لوگوں کے اعتقاد میں پختگی آئی اور لوگوں نے اپنے فیصلہ کو کھلم کھلا بنارس والوں کو سنانا چاہا۔ اس وقت حاجی تاج محمد حج بیت اللہ کے لیے گئے ہوئے تھے، کچھ لوگوں نے حاجی تاج محمد کی واپسی تک اس اعلان کو ملتوی رکھنا چاہا، مگر خدا جب راہِ راست دکھلاتا ہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ طے یہ ہوا کہ نیک کام میں کسی کا انتظار کرنا ٹھیک نہیں۔ اس وقت خوش خیال جماعت میں سب سے بزرگ ہستی حاجی تاج محمد کی تھی، لیکن ان کی غیر موجودگی ہی میں مولانا عبداللہ صاحب غازیپوری کی قیادت میں طیب شاہ کی مسجد میں پہلی بار آمین بالجہر اور رفع الیدین شروع کیا گیا، اور اس کے بعد پھر جماعت اہلحدیث کی بنیاد بنارس میں مضبوط ہوتی گئی۔ اسی دور جہد میں مولانا محمد منیر خاں مرحوم نے بنارس میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔"

اس وقت مدرسہ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ حاجی محمد صدیق صاحبؒ کے مکان سے جو مسجد طیب شاہ کے بغل میں واقع

سے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا جو بعد میں مدرسہ مصباح العلوم کے نام سے جانا جانے لگا۔ جب یہ مدرسہ اٹھ کر اس مقام پر گیا جہاں آج مولانا عبدالمجید حریری مرحوم کا مکان ہے تو اس کو اور وسعت ہوئی اور اس کا نام مدرسہ عربیہ اسلامیہ رکھا گیا۔ پھر جب سنہ ۱۹۳۳ء میں موجودہ جامعہ رحمانیہ بنات کی بلڈنگ حافظ عبدالرحمن صاحب مرحوم نے بنوائی تو مدرسہ نئی بلڈنگ میں منتقل ہو گیا اور سنہ ۱۹۳۳ء میں حافظ عبدالرحمن صاحب کے انتقال کے بعد اس کا نام بدل کر انھیں کے نام پر جامعہ رحمانیہ رکھا گیا۔ اس وقت مدرسہ کی دیکھ بھال حافظ عبدالرحمن مرحوم کے فرزندان وغیرہ کر رہے تھے اور اپنے ذاتی خرچ سے مدرسہ چلا رہے تھے۔ سنہ ۱۹۶۱ء سے پہلے اس کے ناظم مولانا عبدالمتین صاحب مرحوم تھے۔ مدرسہ کے اراکین اور اہل خاندان نے اس ذمہ داری کو ۴ دسمبر سنہ ۱۹۶۱ء کو والد محترم کے سپرد کر دیا اور آپ اس کے ناظم ہو گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۱ سال تھی۔ مدرسہ کی مالی حالت انتہائی توجہ طلب تھی آپ نے اپنی خداداد صلاحیت اور حوصلہ و ہمت سے اس کے سدھار کا بیڑا اٹھایا۔ رمضان میں گھر کی عورتوں سے ان کے زیور کی زکوٰۃ وصول کی اور شوال آنے سے پہلے پہلے مدرسہ کی مرمت و سفیدی کرائی۔ اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کیا اور مدرسہ میں ایک حرکت پیدا کر دی۔ والد صاحب کی نظامت کے زمانہ میں مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی رحمہ اللہ جامعہ رحمانیہ کے صدر مدرس تھے۔ ان کے دور کے کئی دلچسپ واقعات اہم ہیں لیکن ان کو بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، البتہ ان کی تفصیل کسی اور موقع سے ضرور پیش کروں گا، کیونکہ ان واقعات سے کچھ دوسری کہانیاں وابستہ ہیں، جن کی حقیقت منظر عام پر آنا ضروری ہے۔ اسی تفصیل سے یہ علم بھی ہوگا کہ مولانا مرحوم کی غیرت و خودداری اور بیکسی و تنگدستی کا تذکرہ زور دے کر کیوں کیا جاتا ہے۔ یہاں صرف یہ عرض کر دوں کہ جامعہ رحمانیہ کی نظامت جب والد صاحب کے حوالہ کی گئی تو مولانا نذیر احمد صاحبؒ اپنی کسی مجبوری کے تحت رحمانیہ میں تدریس کے سلسلہ میں متردد تھے۔ والد صاحب کا بیان ہے کہ مولانا مرحوم نے تعلیمی سال کے اختتام پر گھر سے جامعہ کے ناظم کے نام ایک مکتوب معذرت کے طور پر ارسال کیا۔ ادھر میں نے تنخواہوں پر غور کیا تو کمی کا احساس ہوا اور اضافہ تنخواہ کی خبر پر مشتمل ایک خط میں نے مولانا مرحوم کو لکھ دیا۔ عجیب اتفاق کہ ان کو میرا خط اور مجھے ان کا خط ایک دو روز کے اندر ملا۔ چند روز بعد مولانا مرحوم کا دوسرا خط موصول ہوا، جس میں انھوں نے وضاحت فرمائی کہ ان کا عذر دور ہو گیا اور آئندہ ماہ شوال میں وہ جامعہ آئیں گے۔

مولانا مرحوم کی بیماری کے ایام میں جامعہ رحمانیہ کے سرپرستوں اور والد صاحب نے ہر ممکن تعاون پیش کیا، علاج کے لیے بھاگ دوڑ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، لیکن نوشتۂ تقدیر کا پورا ہونا ضروری ہے۔ مرض جان لیوا تھا جس سے سب کو مجبوری اور حسرت کا احساس تھا، لیکن اس کو مولانا مرحوم کی تنگدستی و بیکسی یا اہل مدنپورہ کی لاتعلقی و بے توجہی کا رنگ

ینا غلط ہے ۔ یہاں کے لوگ علماء کے ساتھ اچھا معاملہ کرتے ہیں ، اسی وجہ سے معمولی حیثیت کے لوگ بھی یہاں سے آسودہ
کر واپس جاتے ہیں ۔ والد صاحب ۶ رشعبان ۱۳۸۹ھ مطابق نومبر ۱۹۶۹ء تک جامعہ رحمانیہ کے ناظم رہے ۔ جب جامعہ
لفیہ میں تعلیم کا آغاز ہوا ، طلبہ کی نگرانی کے لیے اکثر دار الاقامہ جاتے ۔ مجھے یاد ہے ایک بار فجر کی نماز میں اکثر طلبہ واساتذہ
حاضر تھے ۔ آپ مسجد سے سیدھے دار الاقامہ تشریف لے گئے اور وہاں جا کر سب کو تنبیہ کی ۔ اس دوران آپ نے بہت کچھ
دھار کیا ۔ آپ کے دور نظامت میں مدرسہ اپنے معیار تعلیم کے لحاظ سے ممتاز قرار پایا ، جس کی وجہ سے شہر کے حنفی و شیعہ
کتب فکر کے اچھے گھرانے بھی اس مدرسہ میں بچوں کو تعلیم دلانا پسند کرنے لگے ۔

آپ نے رحمانیہ کی نظامت کے ساتھ ساتھ جماعت کی تنظیم کا کام بھی شروع کیا اور ۲۷ اگست ۱۹۶۱ء بروز یکشنبہ ،
عہ اہلحدیث مدنپورہ میں شہر جنوبی کی ایک عام میٹنگ طلب کی ۔ آپ نے ایکسو بیس آدمیوں کو دعوت دی ، جن میں اکسٹھ
ی جمع ہوئے ۔ طے ہوا کہ شہر شمالی کی طرح شہر جنوبی میں بھی جملہ اہلحدیث باشندگان کی ایک تنظیم دینی اغراض کے لیے بروئے کار
ئی جائے اور باضابطہ ممبر سازی وغیرہ کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی ۔ مولانا عبدالمجید حریری رحمۃ اللہ علیہ نے سات نام پیش
، جو باتفاق رائے منظور ہوئے ۔ ان میں مولانا نذیر احمد رحمانی ، مولانا عبدالمتین صاحب ، مولانا عبدالمجید صاحب حریری
ی عبید اللہ صاحب حریری ، مولوی محمد یحیٰی صاحب ، مولوی عبدالقدوس صاحب اور مولوی عبدالوحید صاحب والد محترم
مل تھے ۔ آپ اس کمیٹی میں عمر کے لحاظ سے سب سے چھوٹے تھے ، مگر آپ داعی تھے ، اس لیے آپ ہی کو کنوینر منتخب کیا گیا ۔

جامعہ سلفیہ (مرکزی دار العلوم) کی جب ۱۲ رجب ۱۳۸۳ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۹۶۳ء کو تاسیس ہوئی ، اس
نت آپ ہی انجمن جامعہ رحمانیہ کے ناظم اعلیٰ تھے ۔ دار العلوم کی بلڈنگ کی تعمیر آپ کی نگرانی میں شروع ہوئی ۔ اس بلڈنگ کے
نقشہ و ڈیزائن میں آپ کی ذہانت کا بہت بڑا دخل ہے ۔ جامعہ کے اندر مسجد کا نقشہ آپ ہی کا بنایا ہوا ہے ۔ میرے دادا
جی عبدالحق صاحب مرحوم بھی جو حاجی صاحب کے نام سے مشہور ہیں ، تعمیرات کے سلسلہ میں کافی ماہر تھے ۔ آپ کی زیر نگرانی
ی عالیشان عمارتیں تعمیر ہوئیں ۔ جامعہ رحمانیہ مدرسہ و دار الاقامہ کی بلڈنگ میرے دادا مرحوم کی نگرانی میں تعمیر ہوئی ہیں ۔
معہ سلفیہ میں اس جانب پانچ کمرہ مکمل کرنے کے بعد ۲۹ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ مطابق ۲۱ مارچ ۱۹۶۶ء میں جامعہ مرکزیہ
مرکزی دار العلوم) کے نام سے یہاں باقاعدہ تعلیم کا افتتاح ہوا اور آپ کی کوشش سے مرکزی جمعیۃ اہلحدیث کے دو رہ
داب کی تعمیر مکمل ہوئی ۔

۶ ذیقعدہ ۱۳۲۴ھ مطابق ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ہندوستان میں جماعت اہلحدیث ہند کا قیام عمل میں آیا تو اکابرین جماعت

نے جہاں بہت سے منصوبے تیار کیے وہاں ایک منصوبہ مرکزی دار العلوم کے قیام کا تھا۔ ابھی ہمارے یہ بزرگان دین افراد جماعت کو منظم کرنے میں کوشاں ہی تھے کہ ۱۹۴۷ء کے فساد میں مسلمانوں کی عام اور جماعت اہلحدیث کی خاص تباہی میں جماعت کا شیرازہ بکھر گیا جب حالات معمول پر آئے تو دوبارہ کوشش کے بعد جماعتی نظام کسی حد تک درست ہوا، لیکن مرکزی دار العلوم کے قیام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ البتہ ہندوستان کے طول و عرض میں جماعت اہل حدیث کے چھوٹے چھوٹے بے شمار مدارس بن گئے۔ مگر ایک ایسی مرکزی درس گاہ کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی جو تمام جماعتی مدارس کو ایک لڑی میں پرو سکے۔ اسی اثنا میں ایسے واقعات بھی پیش آئے، جس سے اس کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا۔ آخر ۲۰ رجمادی الآخرہ ۱۳۸۵ھ مطابق ۱۹ رنومبر ۱۹۶۵ء کو نوگڑھ کے اجلاس میں یہ طے پایا کہ اہل بنارس اس ذمہ داری کے لیے آمادہ ہیں، اس لیے اس کا قیام بنارس شہر میں ہوگا، ہمارے آباء و اجداد نے بہت پہلے سے یہ زمین جہاں آج جامعہ کی عالیشان عمارتیں قائم ہیں دینی ادارہ کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ اللہ کا کرم ہے کہ ان کا خلوص بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہوا اور جماعت اہل حدیث ہند کا مرکزی ادارہ اس روئے زمین پر ۱۹۶۶ء میں عالم وجود میں آگیا۔ اب اس کے انتظام و انصرام کو چلانے کے لیے با صلاحیت فرد کی ضرورت تھی۔ اکابر جماعت کی نظر والد صاحب پر پڑی، کیونکہ جامعہ رحمانیہ کو سنبھالنے کے بعد اس کا جو معیار قائم ہوا تھا، اس کی عمدہ مثال ان کے سامنے موجود تھی اور ایک مرکزی ادارہ کو چلانے کے لیے ایسا ہی با صلاحیت و با ہمت شخص درکار تھا، آپ نے جس محنت و جانفشانی کے ساتھ اس جامعہ کو ایک تناور درخت کی شکل میں کھڑا کیا ہے، وہ ارباب جماعت سے مخفی نہیں۔ اسی لیے یوم تاسیس سے لے کر آخر عمر تک آپ جامعہ کے نظامت علمی جیسے اعلیٰ منصب پر فائز رہے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ آپ نے ضعیفی اور بیماری کے باوجود اپنی انتھک محنت اور مسلسل جانفشانی سے جامعہ کو اس منزل پر لا کھڑا کیا ہے کہ تعلیم و تدریس، ترجمہ و تالیف اور شرح و تحقیق ہر میدان میں اس کا سر اپنے وقیع کارناموں سے بلند ہے اور پوری جماعت اور ساری دنیا کے سلفی بڑے اعزاز کے ساتھ اسے اپنا مرکز قرار دیتے ہیں اور یہاں سے فارغ شدہ علماء سے بڑی امیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہمیشہ سدا بہار رکھے اور یہاں کے عاملین و معاونین کے اندر خلوص پیدا کرے۔ آمین

اس مدت میں آپ نے جامعہ کے اندر کئی کانفرنسیں اور بڑے بڑے جلسے منعقد کیے تاکہ لوگوں کے دلوں میں جامعہ کو جگہ مل سکے اور اس کے مقاصد کو اجاگر کیا جا سکے۔ ان جلسوں کے انتظام میں جو محنت اور مشقت جھیلنی پڑتی ہے وہ آپ کے ساتھ کام کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کے انتظام میں آپ رات رات بھر جاگتے، کھانا، پینا مشکل ہو جاتا،

فکر رہتی کہ جامعہ کا نام بلند ہے، لوگوں کے دل میں اس کی عزت بڑھے اور جس مقصد کے لیے اکابر جماعت نے اس کو قائم کیا ہے وہ مقصد پورا ہو سکے۔ آپ کو بہت کچھ سننا بھی پڑتا تھا، مگر آپ نے جس صبر و تحمل اور رواداری کی مثال قائم کی ہے وہ آپ کے بعد کام کرنے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام دے گی۔ آپ کو جامعہ کے در و دیوار سے محبت تھی، اس میں جن جن لوگوں نے ہاتھ بٹایا، ان سے محبت تھی، آپ ان کی قدر کرتے تھے۔ اس جامعہ کی ترقی کے سلسلہ میں ہر طرح کے لوگوں سے تعاون کی اپیل کی اور ان کی ہمدردی کو خوش آمدید کہا۔ آپ جامعہ کے مستقبل کے لیے ہمیشہ فکرمند رہا کرتے۔ زندگی کے اخیر ایام ہسپتال میں بھی آپ اکثر جماعت و جامعہ کے مسائل پر گفتگو فرماتے تھے۔ آپ نے جامعہ کے اندر جو آخری تقریر کی ہے وہ آپ کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہے۔ آپ نے کہا تھا:

"یہ در و دیوار اور میری زندگی، یہ لازم و ملزوم ہیں۔ ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا اور ذمہ داریوں کو سنبھالنا اسے پورا کرنا یہ ایک ایسا فریضہ ہے اور بحیثیت مسلمان ہونے کے ہر مسلمان کو جب کوئی ذمہ داری دی جاتی ہے تو اس کی ادائیگی امانت داری کے ساتھ کرنے کے لیے اپنے شب و روز کو بالکل قربان کر دینا پڑتا ہے۔"

آگے فرماتے ہیں:۔

"سب برابر ہیں اور سب کو برابر بن کے رہنا ہے، عہدہ کی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ہر شخص کا فرض ہے کہ ہم نے اگر کسی کے ذمہ کوئی عہدہ دیا ہے، کوئی ذمہ داری دی ہے تو اس کی ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے بھی ہم کوشش کریں ورنہ وہ اکیلا نہیں ادا کر پائے گا۔ میری بھی یہی گزارش ہے۔"

والد صاحب جماعت کے کاموں میں شروع سے منسلک رہے، کتاب و سنت کے سچے داعی تھے، کاروباری مشغولیت کے باوجود آپ سفر کے لیے وقت نکال لیا کرتے، شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی مدظلہ العالی سے ملاقات اور مشورہ کے لیے اکثر مبارکپور تشریف لے جاتے، آپ نے جملہ اہم کاموں میں شیخ صاحب سے رائے لینا ضروری سمجھا اور ہمیشہ آپ کی رہنمائی کو تمام آراء پر مقدم رکھا۔ دہلی کا سفر بسا اوقات ہوتا رہتا تھا، گھٹنے میں درد کی وجہ سے ریل پر سفر میں تکلیف ہوتی تھی۔ ہم لوگوں کے بہت اصرار پر اخیر ایام میں ہوائی جہاز سے سفر کرنے لگے تھے۔ آپ ایک زمانہ سے مرکزی جمعیۃ کے ممبر تھے۔ ۱۹۶۳ء میں جب انتخاب ہوا تو آپ نائب صدر بنا دیے گئے، اور پھر ۲ دسمبر ۱۹۷۹ء کو آپ کو صدر چن لیا گیا۔ آپ پر جامعہ کے ساتھ ساتھ جمعیۃ کی بھی ذمہ داری ڈال دی گئی۔ کن حالات میں آپ امیر بنائے گئے، یہ اہل جماعت سے مخفی نہیں۔ والد صاحب نہیں چاہتے تھے کہ میری وجہ سے انتشار پیدا ہو، آپ کی

خواہش تھی کہ جماعت میں اتحاد قائم ہو جائے۔ چنانچہ آپ نے ۱۹ / دسمبر ۱۹۸۹ء کو جماعت کے متعدد حضرات کو خط میں لکھا تھا:

"جماعت کے چند معتمد اصحاب اگر آگے آویں اور اختلاف کو ختم کرانے کی کوشش کریں تو یہ ایک بہت بڑا احسان جماعت پر ہوگا، میں اس اختلاف کی موجودہ فضا میں صدارت پر نہیں رہنا چاہتا میری صحت بھی اس لائق نہیں ہے کہ اتنی بڑی ذمہ داری اٹھا سکوں، اس لیے کسی مناسب شخص کا انتخاب کر لیا جائے۔ جماعت میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو جائے، یہی میری سب سے بڑی خواہش ہے، امید ہے کہ آپ فوری توجہ دیں گے۔"

اس طرح کے مضمون کا کئی خط آپ نے متعدد ذمہ داران جماعت کو لکھا تھا مگر ارباب جماعت نے آپ کو اس عہدۂ عظمیٰ سے الگ ہونے نہ دیا اور بار بار آپ ہی کا انتخاب کر کے یہ عظیم ذمہ داری آپ ہی کے سر باقی رکھی، آپ نے جماعت کو کیا کچھ دیا یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ جب آپ صدر بنائے گئے تو جمعیۃ کا دفتر کرایہ کے مکان میں تھا، اس کی اپنی کوئی جگہ نہ تھی۔ ۱۹۸۱ء میں آپ نے جمعیۃ اہلحدیث ہند کو جامع مسجد جیسے اہم اور گنجان مسلم علاقہ میں مستقل بلڈنگ عطا کی۔ اس کے پاس فنڈ کی کمی تھی، آفس کا خرچ چلانا مشکل تھا۔ مگر آپ نے جس حوصلہ اور ہمت سے کام کیا ہے اسے بھولنا آسان نہیں۔ آپ نے جمعیۃ کو منظم کیا، ریاستوں اور ضلعوں سے اس کو جوڑا، اس کو متحرک بنانے کے لیے متعدد پروگراموں کی تشکیل دی، شعبۂ دعوت و تبلیغ کو آگے بڑھایا، ریلیف فنڈ قائم کیا، آپ کی خواہش تھی کہ اہل حدیث ویلفیر ٹرسٹ کا بھی قیام عمل میں آجائے جو جمعیۃ کی بلڈنگ وغیرہ کا انتظام دیکھے، اس کے لیے بھی برابر کوشاں رہے۔ مگر آپ کی زندگی نے وفا نہ کی اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔

آپ جمعیۃ اور اہل حدیث منزل کی نگرانی کے لیے برابر دہلی کا سفر کرتے رہے، اندرون ہند اور بیرون ملک کے کئی جلسوں اور کانفرنسوں میں شرکت کی، کئی بار حج کی ادائیگی کے لیے سفر کیا، آپ کا پہلا سفر حج یکم ستمبر ۱۹۴۳ء کو ہوا تھا، اس کے بعد ۱۵ / اکتوبر ۱۹۵۷ء کو میرے دادا حاجی عبدالحق صاحب کا انتقال ہو گیا تو میری دادی کو بیگم مع اہل و عیال ۲۳ / اپریل ۱۹۵۸ء کو حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ اس کے بعد ۱۹۷۲ء میں تیسرا حج کیا، پھر کئی بار حج پر جانا ہوا، میری والدہ محترمہ حفظہا اللہ کے ساتھ آخری حج ۱۹۸۷ء مطابق ۱۴۰۷ھ میں کیا جب آپ نے پورا رمضان المبارک مکہ مکرمہ میں گزارا اور اپنی زندگی کا آخری حج جولائی ۱۹۸۹ء میں رابطۃ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کی ضیافت میں ادا کیا، آپ نے یہ حج اپنی والدہ محترمہ خدیجہ بی بی بنت مولوی عبدالحکیم مرحوم کی زندگی میں ان کی طرف سے حج بدل کے طور پر کیا تھا۔ اللہ

عالیٰ سب کو شرفِ قبولیت بخشے آمین۔ اس دوران مملکتِ سعودیہ عربیہ کے کئی مؤتمر میں شرکت کی، پہلی شرکت مؤتمر المسجد
ی العام مکہ مکرمہ میں رمضان المبارک ۱۳۹۵ھ میں ہوئی۔ مؤتمر رسالۃ المسجد میں بھی شریک ہوئے، جسے رابطۃ العالم الاسلامی
نے مکہ مکرمہ میں منعقد کیا تھا۔ المؤتمر العالمی لتوجیہ الدعوۃ واعداد الدعاۃ جو صفر ۱۳۹۷ھ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ
میں منعقد ہوئی، شریک ہوئے اور المؤتمر العالمی الاول للتعلیم الاسلامی ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ جو جامعۃ الملک عبدالعزیز کی
رف سے مکہ مکرمہ میں منعقد ہوئی تھی، اس میں بھی شامل ہوئے، ان کے علاوہ خلیج کے ملکوں کا کئی بار سفر کیا۔

۱۲ مئی ۱۹۷۶ء کو لدھیانہ تشریف لے گئے تھے۔ ۲۵ فروری ۱۹۸۲ء کو کالیکٹ کیرالہ میں منعقدہ مجاہدین اسٹیٹ کانفرنس
ں شرکت کی۔ ۲۵ مارچ ۱۹۸۲ء کو بریلی و کلکتہ کا سفر کیا، اسی سال ۱۵ مئی کو اپنی گاڑی سے بانسی ضلع بستی تشریف لے گئے
ور ۲۴ مئی ۱۹۸۲ء کو بنارس میں نئی چوک کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا اور اس مسجد کو ادارۃ اصلاح المساجد کے تعاون
ے اپنی نگرانی میں مکمل کرایا۔ اس مسجد میں مدرسہ محمدیہ کے نام سے ایک مدرسہ قائم کرکے اس علاقہ کے بچوں کی تعلیم و تربیت
ا انتظام کیا، آپ اس کی نگرانی خود کرتے تھے۔ بنارس کی کئی اور مساجد کی تعمیر میں آپ کا ہاتھ ہے۔ آخری مسجد جلالی پورہ کی
جایہ مسجد ہے جو آپ ہی کی خواہش کے مطابق اس علاقہ میں تعمیر ہو رہی ہے۔ بمبئی کا سفر اکثر ہوتا تھا۔ ۴ مارچ ۱۹۸۳ء
مالیگاؤں جامعہ محمدیہ دیکھنے گئے تھے، وہاں آپ کئی بار تشریف لے گئے۔

۱۲، ۱۳ مئی ۱۹۸۳ء کو بھدوہی میں منعقدہ ریاستی کانفرنس آپ ہی کی صدارت میں ہوئی جو ریاستی جمعیۃ
ہل حدیث مشرقی یوپی کی طرف سے منعقد کی گئی تھی۔ مئو والوں سے پرانا تعلق تھا، ۱۳ جولائی ۱۹۸۴ء کو عالیہ ہسپتال اور
مسجد کے سنگ بنیاد کے موقع پر آپ وہاں تشریف لے گئے اور جب ۱۶ نومبر ۱۹۸۵ء کو اس کا افتتاح ہوا، اس میں
ی حاضر ہوئے۔ ۱۱ مئی ۱۹۸۵ء کو بنگلور کا تاریخی اجلاس آپ ہی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ۲۷ جنوری ۱۹۸۶ء
ال گوپال گنج میں مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ۷ مارچ ۱۹۸۶ء کو بینی پورہ میں مدرسہ محمدیہ کی بنیاد رکھی، ۲۵ مارچ ۱۹۸۶ء
مرکزی جمعیۃ کے سلسلہ میں کلکتہ کا سفر کیا، ۱۶، ۱۷ اپریل ۱۹۸۶ء کو اٹوا بازار ضلع بستی اپنی موٹر سے تشریف لے گئے اور
ں ریاستی کانفرنس جمعیۃ اہلحدیث مشرقی یوپی کی صدارت کی۔ اسی سال آپ حج پر تشریف لے گئے تھے۔ ۲۲ نومبر ۱۹۸۶ء کو
ہ سلفیہ میں شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ پر سیمینار ہوا اور ۲۷ نومبر کو دہلی میں حرمت حرمین شریفین کنونشن میں شرکت
جو آپ ہی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

والد صاحب کو ۷ مارچ ۱۹۸۹ء کو دل کے دورہ کی شکایت ہوئی تھی، جس کے علاج کے سلسلہ میں دس دن

تک آپ ہسپتال میں بھرتی رہے، اس کے بعد بھی آپ کی مصروفیت میں کمی نہ آئی۔ ۲۸ رمئی ۱۹۸۹ء کو جامعہ سلفیہ
مرکزی جمعیۃ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ بلائی۔ شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ رحمانی مدظلہ العالی سے آخری ملاقات ۲۶ رجوا
مبارکپور میں کی۔ آپ کا آخری خطبۂ صدارت ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ء کا وہ خطبہ ہے جس کو آپ نے دہلی کے پسرد ہاؤس میں کل
شبان اہلحدیث کنونشن کے موقع پر کھڑے ہو کر پڑھا تھا۔ اس میں آپ نے جماعت سے ہمدردی رکھنے والوں اور جوانوں
خاص طور پر خطاب فرمایا اور ان کو یاد دلایا کہ موجودہ دور میں ان کی کیا ضرورت ہے۔ عملی میدان میں سب مل جل کر
و ملت کے لیے کام کرنا چاہیے۔ آپ نے فرمایا:

"بلاشبہ انسانی نفوس وطبائع میں اختلاف کا عنصر موجود ہے، عداوت وکینہ بھی دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے
ایک شخص کو دوسرے سے ذاتی یا جماعتی طور پر شکایت ہو سکتی ہے، لیکن اسلام نے اس صورتحال کو ختم کرنے کے لیے موثر ط
بتایا ہے۔ بہت سے اختلاف بے بنیاد ہوتے ہیں اور بہت سے اختلافات کی معقول بنیاد ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں
مناسب طور پر ادب واحترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے تبادلۂ خیال کیا جائے تو بڑی سے بڑی غلط فہمی اور عداوت وکینہ دور ہو

آج ضرورت ہے کہ ایک امیر جماعت ہونے کی حیثیت سے آپ کے فرمودات کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے، اس میں ہما
لیے بڑی معنویت اور تجربات مضمر ہیں، جس ذات نے اپنی پوری زندگی اسلام کی خدمت کے لیے وقف کردی اور بیماری تو
کے ساتھ ساتھ کاروباری مشغولیت فرض کی ادائیگی میں حائل نہ ہو سکیں، اس کے خلوص اور محبت کی ہمیں قدر کرنی چاہیے۔
میں انسان آتے اور جاتے رہتے ہیں مگر اللہ کے خاص بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ باقی
رہتے ہیں۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۲۹ راکتوبر ۱۹۸۹ء کو اپنڈکس کے آپریشن کے لیے ہسپتال میں داخل کیے گ
اسی روز رات ایک آپریشن ہوا جو کامیاب رہا۔ آپ اچھے ہو گئے، سب کام خود سے کرتے، ۱۶ رنومبر کو سر میں شد
درد ہو کر بخار آگیا، ہسپتال میں زیر علاج رہے۔ دوا چل رہی تھی مگر بخار جاری تھا جو کبھی کبھی شدت اختیار کر
تھا۔ ۲۵ رنومبر ۱۹۸۹ء شنبہ کے دن صبح سے طبیعت کچھ بدلی لگ رہی تھی۔ مگر بات چیت سے سکون معلوم ہوتا تھا۔
۲½ بجے منہ گلا دھو کر کلی کی، ظہر کی نماز پڑھ چکے تھے، عصر کا وقت نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا عصر بھی پڑھ کر آرام کریں کو
وقت سے پہلے کیسے پڑھ لوں؟ پھر اس کے بعد شام، بج کر دس منٹ پر یکایک گلا صاف کر کے کلی کی، منہ دھویا، سا
بدل گئی اور آپ ہم سب کو سوگوار وہراساں چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ للہ ما اعطی وللہ ما اخذ۔ الد
تدمع والقلب یحزن ولا نقول الا مایرضی ربنا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

رب العلمین آپ کو غریق رحمت کرے۔ اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور ہم سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ وصلی اللہ تعالیٰ
رسولہ الکریم وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ ••

محترم ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید عبدالحق السلفیؒ

کی یاد میں

ڈاکٹر عبدالرحمان بن عبدالجبار الفریوائی

دین خیر خواہی کا نام ہے اسی وجہ سے اسلام کی ساری تعلیمات کا ماحصل انس وجن کی فلاح دارین ہے، یعنی دنیا میں صبر و شکر اور امن و آشتی اور صلح وسلم کی زندگی میسر ہو تاکہ انسان یکسوئی کے ساتھ آخرت کی کھیتی کر سکے، اور اخروی زندگی میں ابدی و سرمدی نعمت یعنی جنت الفردوس سے بہرہ ور اور فائز المرام ہو۔

موت وحیات کے بارے میں بھی اسلام ہماری رہنمائی اسی نقطۂ نظر سے کرتا ہے، اسلامی شریعت میں جان کنی کے وقت سے وفات اور مابعد وفات تک کے بارے میں بڑی واضح تعلیمات اور روشن ہدایات ہیں، عالم نزع سے قبر کی برزخی زندگی تک اور اس کے بعد عالم آخرت کے احوال پر کتاب وسنت میں جو معلومات ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کیسے کیسے سامان فراہم کئے ہیں۔

قبروں کی زیارت کی اجازت میں بھی یہی پہلو مدنظر رکھا گیا ہے کہ اس سے آخرت کی یاد میں مدد ملتی رہے، اور مردوں کے لئے دعائے مغفرت کا موقع فراہم ہو۔

آدمی کے وفات پاجانے کے بعد بالعموم اس کے اعزہ واقربا، اور متعارفین ومحبین اس کی موت پر غمزدہ ہوتے ہیں، خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اعزہ واقربا کی وفات پر غمگین ہوئے اور فطری انسانی جذبہ کو مدنظر رکھتے ہوئے اسلام نے اپنے ماننے والوں کو اظہار غم کی تین دن کی اجازت دی۔

دنیا میں آدمی اپنی صلاحیت، صالحیت، افادیت، اور حیثیت کے مطابق اپنا حلقۂ تعارف واثر رکھتا ہے، اور لوگوں کے خیالات اور تاثرات بھی اپنی معلومات اور عقائد وافکار کے تابع ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مقدس شخصیات سے لے کر معاشرہ کے بڑے لوگوں تک کے بارے میں لوگوں کے خیالات وجذبات میں تضارب وتناقض پایا جاتا ہے۔

محترم ناظم صاحب یعنی مولانا عبدالوحید بن عبدالحق جن کو اب وفات کے بعد " رحمۃ اللہ علیہ " کی دعا کے ساتھ ہم یاد کرتے ہیں، موصوف کی وفات سے بنارس ایک بہت ہی مؤثر اور اہم شخصیت سے محروم ہوگیا، مدنپورہ اور اس سے ملحقہ مسلم محلے ایک اچھے اور مخلص سرپرست سے محروم ہوگئے، ساڑی کی تجارت میں مشہور تاجا خاندان اپنے ایک اہم بزرگ سے محروم ہوگیا، مسجد طیب شاہ ایک خوش الحان امام سے محروم ہوگئی، کل ہند مومن کانفرنس ایک بڑے تجربہ کار وامین شخص کی سرپرستی سے محروم ہوگئی۔

ہندوستان کی بہت ساری کل ہند اور علاقائی اسلامی دینی اور تعلیمی تنظیمیں اور ادارں نے بھی محسوس کیا کہ ملک کا ایک محترم اور باوزن انسان انہیں داغ مفارقت دے گیا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ جمعیۃ اہل حدیث ہند اور اس کا مرکزی دارالعلوم جامعہ سلفیہ بادی النظر میں آپ کی وفات سے یتیم ہوگئے ہیں۔

فرحمة الله عليه رحمة واسعة وأمطر عليه شآبيب رحمته

ناظم صاحب کی وفات راقم الحروف کے لئے بھی ذاتی حادثہ سے کم نہ تھی، آپ سے تعلق کی ساری بنیاد تعلیم و تدریس اور جماعت وجامعہ رہی لیکن ربع صدی سے زیادہ کے عرصہ یعنی ۱۹۶۵ء سے اس وقت تک کی طویل مدت میں ناظم صاحب کو دیکھنے سمجھنے اور برتنے کے ایسے مسلسل مواقع ملے کہ اگر تمام تجربات کو قید تحریر میں لایا جائے تو جماعت وجامعہ کی بلکہ ہند و بیرون ہند کی اسلامی و دینی و تبلیغی تاریخ بالخصوص تحریک اہل حدیث کے اکثر گوشوں پر محیط ہوگی۔

جامعہ سلفیہ کے مؤسسین میں مولانا عبدالوہاب آروی رحمۃ اللہ سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا، بنارس میں مولانا نذیر احمد صاحب املوی رحمہ استاذ جامعہ رحمانیہ کو دارالاقامہ سے لے کر بنارس ہندو یونیورسٹی کے ہسپتال میں دیکھا، مولانا عبدالمجید حریری رحمۃ اللہ علیہ سے راقم الحروف کے اچھے مراسم تھے، یہ بات میرے لئے باعث سعادت تھی کہ مجھے اور برادرم ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری کو ان سے قربت وتعارف اور ان کی نیک دعاؤں کے لینے کا شرف حاصل ہوا، ان کے عصر کے بعد طیب شاہ کے درس میں حاضری نیز جامعہ سلفیہ کے بعض جلسوں کی تقاریر کی سماعت کا شرف بھی حاصل ہوا، اور موت کے بعد جنازہ میں بھی حاضر رہا۔ رحمة الله عليه رحمة واسعة۔

شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری حفظہ اللہ سے بھی مراسم ڈاکٹر حافظ عبدالعزیز صاحب کی معیت ومصاحبت سے اوائل طالب علمی سے رہے، اور بعد میں سند اجازہ بھی حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی (فالحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات) اور ان سے مسلسل اور بار بار شرف نیاز وملاقات حاصل کرکے بہت سے مسائل میں استفادہ بھی کرتا رہا

اور اس طرح کے مقامی اور غیر مقامی بہت سے خدامان جماعت وجامعہ سے نیاز حاصل رہا۔

لیکن جماعت وجامعہ کے تعلق سے ابتداء سے تا حین وفات ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو تعلق خاطر رہا اس تعلق سے آپ کی موت ہم سب کے لئے بہت بڑے خسارہ کی بات تھی۔ رہے نام اللہ کا۔

باتیں بہت ساری کہی اور لکھی جا سکتی ہیں لیکن چند باتیں جو میں نے ناظم صاحب کی زندگی میں دیکھیں اور جس سے یک گونہ متاثر بھی ہوا، وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ناظم صاحب انتہائی معروف ومشغول آدمی تھے، اور بایں ہمہ ایک ساتھ بہت سارے کام کرتے اور وہ متنوع اور پیچیدہ بھی ہوتے، ہمیشہ کاموں کی کثرت اور وقت کی قلت کے شاکی رہتے، لیکن ہمیشہ بڑی پابندی سے بہت سارے نجی اور جماعتی کام بالخصوص تجارت کے اور جو ٹالے نہ جا سکتے تھے ان کو نبھانے کی کوشش کرتے۔

۲۔ بایں ہمہ مشغولیت رات کو صبح صادق سے بہت پہلے اٹھتے اور انتہائی اہتمام سے فجر کی سنتیں پڑھتے، اور سنت کے مطابق اعتدال واطمینان سے فرائض ونوافل ادا کرتے، مجھے بچپن ہی سے نمازیں ناظم صاحب کی امامت میں ادا کرنے کا موقع ملا، بالخصوص نماز فجر کی پرسوز ودلنواز اور سحر کن قرأت کی لذت سے اب بھی کان آشنا ہیں، اسفار میں ریاض وغیرہ میں مسلسل آپ کی امامت میں نمازیں ادا کرنے کا موقع ملا۔

۳۔ شیریں دہنی، دائمی مسکراہٹ، پاکیزہ زبان، پاکیزہ لباس، خوبصورت اور بھاری بھر کم وجیہ شخصیت جس سے ہر آدمی متاثر ہو جائے، چنانچہ ناظم صاحب اپنی نستعلیق آواز، گفتار، نشست وبرخاست، وجیہ شکل وصورت، تجارت کی شہرت تجربہ پختہ عقل کی وجہ سے مجالس میں بہت سے لوگوں میں ہر حیثیت سے قدآور معلوم ہوتے تھے۔

۴۔ محترم ناظم صاحب کم گو تھے، مختصر گوئی میں مسکراہٹوں اور اشاروں اشاروں میں مخاطب تک اپنی بات پہونچا دینے کا آپ آپ کو ملکہ تھا۔

۵۔ سستی شہرت اور موقع پرستی کا مزاج نہ تھا، یہ اور بات ہے کہ ملی کاموں کی وجہ سے لوگوں کے مابین ابھری ہوئی شخصیت کے بھرم کے بچانے میں کہیں کوئی لغزش ہوگئی ہو، چونکہ انسان خطا ونسیان کا پتلا ہے، شیطان لعین رگوں میں دوڑ رہا ہے، نفس امارہ سے انکار نہیں، اس لئے کسی کو معصوم ثابت کرنے یا مطعون کرنے کے بجائے ہمارا شیوہ یہ ہو کہ اس طرح کے موقع پر ہم دعائے مغفرت کریں، اور جس صورت حال سے دل ودماغ میں خدشات پیدا ہوں اس سے اجتناب واحتیاط پر آدمی خود شدت سے عامل ہو۔

۶۔ ناظم صاحب کی سخاوت وفیاضی اور خویش نوازی بھی آپ کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے۔

۷ ۔ بال بچوں اور رشتہ داروں کے مسائل و معاملات سے گہری دلچسپی اور وابستگی جس کی کمی بالعموم مشغول سماجی، ملی شخصیتوں کے یہاں محسوس کی جاتی ہے، ناظم صاحب میں یہ کمی نہیں پائی جاتی تھی، چنانچہ حج وعمرہ وغیرہ کے اسفار میں آپ کے عائلی اور معاشرتی ذوق کے نمونے دیکھنے میں آئے۔

۸ ۔ ناظم صاحب کو جامعہ سلفیہ سے عہد تاسیس سے وفات تک اتنا گہرا ربط و تعلق ہو گیا تھا جس کو موت کے علاوہ کوئی چیز ختم یا کم نہیں کر سکتی تھی، یہ میرا ذاتی تاثر ہے، مدرسہ کے لئے جہاں اپنا تعاون دیا، دوسروں سے اپنی بیماریوں اور مصروفیتوں کے علی الرغم بھیک بھی مانگی، مدرسہ کے لئے دوسروں سے منت و سماجت تک کی، ہر طرح کے طعن و تشنیع اور نقد و تبصرہ کو برداشت کیا، فجزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیرا۔

۹ ۔ ناظم صاحب بڑے تجربہ کار آدمی تھے، مختلف ملی وجماعتی اور دنیاوی امور میں مشورہ طلب کرنے والوں کو مشورہ بھی دیتے تھے،

۱۰ ۔ حساب کتاب اور فن تعمیر میں تجربہ اور مہارت تامہ کی داد اہل فن بھی دیتے تھے۔

۱۱ ۔ جماعت وجامعہ کے بارے میں ناظم صاحب سے بہت سے لوگوں کو اتفاق یا اختلاف ہوگا، لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ اپنے طویل اور ہمہ جہت تجربے کی بنا پر لوگوں کے مشورے یا آراء سے استفادہ ضرور کرتے رہے ہوں گے، لیکن ترمیم واضافے کے بعد۔

۱۲ ۔ امانت و دیانت کا معاملہ قرب قیامت بہت خراب ہو جائے گا، اس لئے متاخرین میں اس طرح کی صفات کا ہونا بہت اہمیت کا حامل ہے، ناظم صاحب پر علی الجملہ لوگوں نے اعتماد کیا، اس وصف سے وہ مشہور بھی ہوئے، اللہ کرے کہ آپ لوگوں کے حسن ظن کے مطابق رہے ہوں، اور آخرت میں اللہ تعالیٰ آپ کی لغزشوں کو معاف کرے، مدارج کو بلند فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔

آپ کی زندگی میں روورشتہ تعلق خاطر کی بنا پر میں نے بیحد و شمار گستاخی کی ہوگی، حتی کہ کبھی کبھی آپ کو ناراض بھی کیا، لیکن بایں ہمہ ساری باتیں ملی مسائل اور جماعت وجامعہ سے متعلق ہوتی تھیں، اس لئے یہ اعتماد رہتا تھا کہ مرحوم کی ذات کا مسئلہ نہیں ملت اور ملی مسائل کے حال و مستقبل کا ہے، اور شاید اسی لئے وہ درگذر سے بھی کام لیتے تھے، اور بہت سے مسائل میں قائل بھی ہو جاتے تھے۔

آخری عمر میں جب مسلسل بیماریوں، کاموں کے ہجوم اور لاینحل مسائل پر صبر و تحمل کی پالیسی سے اتَّسَعَ الخَرقُ علَى الرَّاقِعِ کی مثل صادق آنے لگی تو آپ کا اضطراب قابل دید تھا، حتی کہ میں نے اس صبر و تحمل کے پتلے کو بھی بے صبر و شکیب دیکھا، اور دلاسہ و تسلی

لائی، بہرحال مؤمن کا ہر کام اس کے لئے سود مند ہوتا ہے، صبر و شکر اس کی اہم صفات ہیں، تبصرے، تنقیدیں، ہجو اور قدح سے
فید باتیں اگر آدمی اخذ کر کے بقیہ پر صبر کرے اور اصرار علی الباطل نہ کرے اور اپنی مہم میں لگا رہے تو یہ رفع درجات اور محو سیئات
سبب ہے۔ انشاء اللہ العزیز۔

انسانی تعلقات میں باہم ناخوشگوار امور کا پیش آنا عین متوقع ہوتا ہے، اسی لئے حدیث میں مردوں کی خوبیوں اور اچھائیوں
کے گنانے پر ان کی موت پر ان پر ترحم و استغفار کرنے، اور موت سے عبرت و موعظت کا حکم ہے، اس کے معائب و قبائح
صوص نجی اور ذاتی مسائل و معائب کے ذکر سے ممانعت آئی ہے، کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، حق گوئی، نصیحت اور خیرخواہی
تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی میں صاحب معاملہ سے آدمی تمام مسائل پر کھلے دل و دماغ سے بات کرے، تاکہ ایک دوسرے کے نقطۂ نظر
سمجھ کر عذر و معذرت تلاش کرے۔

لیکن اگر بات عقائد و اعمال کی ہو جس سے آئندہ کی اسلامی اور ملی کام سے متأثر ہونے کا خطرہ ہو تو اس سے بحث ناجائز
ہیں ہے، جیسا کہ علماء حدیث اور ائمہ فن رجال نے حدیث رسول کی حفاظت و خدمت کے لئے علم جرح و تعدیل میں روا رکھا۔
یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ محدثین نے حسب ضرورت رواۃ حدیث کے لئے جرحِ مفسَّر کو جائز قرار دیا ہے، جبکہ تعدیل و توثیق
ں اجمال پر اکتفاء کیا ہے، اور مردوں کے بارے میں شریعت معائب و مثالب کے نہ ذکر کرنے کی تلقین کرتی ہے، اور محاسن و
خوبیوں کو اجاگر کرنے پر ابھارتی ہے، تاکہ اچھے جذبات کے نتیجہ میں آدمی اپنے مردوں کے لئے دعائے مغفرت شرح صدر سے کرے۔

ربنا اغفرلنا ولإخواننا الذين سبقونا في الإيمان ولا تجعل في قلوبنا غلا للذين آمنوا -

حدیث میں آتا ہے کہ آدمی کے مرنے کے بعد اس کے لئے نفع بخش تین چیزیں ہوتی ہیں۔

۱۔ صالح اولاد جو اس کے لئے دعا گو رہیں۔ ۲۔ علم جس سے استفادہ کا سلسلہ جاری رہے۔ ۳۔ صدقہ جاریہ۔ (مسلم شریف)
ظم صاحب الحمد للہ اس حیثیت سے ان شاء اللہ آخرت میں غنی و مالدار رہیں گے کہ آپ نے صالح اولاد چھوڑی جو باقاعدہ علم دین کی نعمت سے
بہرہ ور ہیں، اور جن میں استقامت و تدین کے آثار ہویدا ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو دین پر چلنے اور اس کی مخلصانہ خدمت کی توفیق عطا فرمائے
ظم صاحب نے معروف معنوں میں تعلیم و تدریس کا کام تو نہیں کیا، لیکن پوری زندگی علم کتاب و سنت کی آبیاری اور رفاد حاملان علوم
کتاب و سنت کی خدمت کرتے رہے، اس لئے زمرۂ خدام علوم کتاب و سنت میں آپ یقینا داخل ہیں۔

رہ گیا صدقہ جاریہ تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو جمعیت و جامعہ اور دوسرے ملی و اسلامی اداروں کی مالی خدمت کی توفیق دی، آپ کی تحریک
پر جو ملی خدمات انجام پائیں گی وہ ان شاء اللہ آپ کے حق میں صدقۂ جاریہ ہوں گی، پھر ناظم محترم نے جن طلباء کرام اور طالبان علوم نبوت کی خدمت

کے نتیجہ میں دنیا میں شہرت ومحبوبیت حاصل کی وہ بھی آپ کے لئے دعا گو ہیں ، اللہ رب العزت آپ کو کروٹ کروٹ جنت عطا فرمائے ۔ ویرحم اللہ عبدا قال آمینا ۔

محترم ناظم صاحب کی زندگی میں ایک مومن صالح کے لئے بہت سی عبرت وموعظت کے پہلو ہیں ، ہمارے معاشرہ میں اچھے آدمیوں کی قلت ہوچکی ہے ، ہر طرح کے چھوٹے بڑے کام کے لئے فورا باعمل مخلص آدمی کی تلاش وتگ ودو شروع ہوجاتی ہے ، جماعت اہلحدیث کے اسی " قحط الرجال " کے عہد میں ناظم صاحب کو ملکی پیمانے کا جو ملی اعتماد حاصل ہوا ، اس کے پیچھے ناظم صاحب کی ذاتی خوبیاں ہی تھیں ، یہ اعتماد کسی خارجی کوشش یا تحریک کا رہین منت نہ تھا ، اسی وجہ سے آپ کی موت پر جو تاثرات جمعیت وجامعہ کو ملے اس میں شدت سے آپ کی مخلصانہ زندگی کے اہم گوشوں کی طرف اشارات موجود تھے ، اور صراحۃً لوگوں نے آپ کے بعد آنے والے مرحلوں کے بارے میں طرح طرح کے اندیشوں کا اظہار کیا ۔

قرآن وحدیث کی نشر واشاعت ، تعلیم وتربیت اور دینی مدارس کے نظام کی برکت سے علم دین کا حصول بہت آسان ہوگیا ہے ، اور عام اسلامی تعلیمات کو عام لوگ سمجھتے ہیں ، اخلاقیات کا درس دینے والے بہت ہیں ۔

لیکن عملی میدان میں ، عقائد معاملات ، اخلاقیات اور دوسرے سماجی مسائل میں مسلمانوں کی موجودہ جو تصویر ہے اس پر ہر حساس دل کو توحش اور ہر صاحب عقل وفکر کو تردد ہے ۔

محترم ناظم صاحب علیہ الرحمۃ عقائد کے اعتبار سے سلفی العقیدہ ہی نہیں تھے بلکہ " بابائے سلفیت " تھے ، معاملات کی دنیا میں بڑی اچھی شہرت کے حامل تھے ، بنارس کے لوگ اور باہر کے جن لوگوں کا تعلق آپ سے تھا وہ اس کی شہادت دیں گے ، آپ کے اخلاق کے گرویدہ بھی بکثرت لوگ نظر آئیں گے ، رہ گئے سماجی ومعاشرتی مسائل میں ناظم صاحب کی شرکت ودلچسپی اور کارکردگی تو اس کو وہی لوگ محسوس کرتے ہیں جو مدنپورہ اور بنارس شہر کی مجالس کو دیکھ چکے ہیں ۔

آخر میں ہم قارئین کرام سے مرحوم کے لئے دعاء مغفرت کی درخواست کرتے ہیں ، اور دعوت دیتے ہیں کہ وہ آپ کی سیرت کے مفید پہلوؤں سے استفادہ کریں ، اور آپ نے جن کاموں کو چھوڑا ہے اس کی تکمیل کی فکر کریں ۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم ۔

حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سلفیؒ

ناظم جامعہ سلفیہ بنارس

ڈاکٹر رضاء اللہ محمد ادریس مبارکپوری

یوں تو ہمیشہ ہی اس عالم رنگ و بو میں بے شمار نوابغ روزگار، اصحاب کمالات جنم لیتے ہیں اور اپنے علم و فضل اور کمالات سے لوگوں میں انقلاب برپا کرکے اس عالم فانی سے اس طرح کوچ کر جاتے ہیں کہ لوگ ان کی وفات کا کچھ عرصہ غم منا کر انھیں طاق نسیاں کے حوالے کر دیتے ہیں، یا اگر زمانہ ان کے ساتھ بہت زیادہ احسان کرتا ہے تو وہ تاریخ کا ایک باب بن کر رہ جاتے ہیں، لیکن ایسی ہستیاں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں جو اپنے بلند اخلاق و کردار، عمدہ کارکردگی اور دوسرے اوصاف حمیدہ کی وجہ سے موافق اور مخالف دونوں کے درمیان یکساں طور پر جانے اور مانے جاتے ہوں، یا جن کے کمالات دور رس اثرات اور جیود مفید نتائج کے حامل ہوتے ہیں اور ایک طویل مدت تک ان کی کمی کا شدت سے احساس کیا جاتا ہو۔

انہی نادر الوجود ہستیوں میں ہمارے ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ایک ہستی ہے جو اپنے اوصاف حسنہ اور اخلاق حمیدہ، اپنی تدبیر و تدبر اور بردباری کی وجہ سے مخالف و موافق دونوں کے یہاں نہایت عزت و احترام اور توقیر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، جامعہ اور جماعت کے لئے انہوں نے جو وقت دیا اور محنت کی اس کے اثرات کافی دور رس ہیں اور طویل عرصہ تک محسوس کئے جاسکتے ہیں، کم از کم جامعہ سلفیہ کی حد تک یہ بات بالکل وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جب تک یہ جامعہ اس کرۂ ارض پر قائم و دائم ہے (اللہ تعالیٰ اسے مزید اور ترقی سے نوازے) اس وقت تک ایک لمحہ کے لئے بھی موصوف کے اثرات اوجھل نہیں ہو سکتے، کیونکہ عالم تخیل سے نکل کر جیز الوجود جس مقام پر آج وہ کھڑا ہے وہاں تک پہونچانے میں ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی انتھک کوشش، حسن تدبیر و تدبر اور ان کے صبر و ضبط اور بردباری کا بہت زیادہ دخل ہے، متعدد آندھیاں آئیں، آکر گذر گئیں، لیکن جامعہ اپنی اسی آن بان اور شان کے

ساتھ قائم ودائم ہے۔

موصوف کے بارے میں بہت سی صفات حمیدہ خواص وعوام سے سننے میں آتی رہتی ہیں، ان کے ایام میں ناچیز کو جتنے دنوں بنارس رہنے کا موقعہ ملا وہ جامعہ رحمانیہ اور جامعہ سلفیہ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے تھا، اور ہم طلبہ کے دلوں پر موصوف کے احترام ومحبت اور رعب ودبدبہ کی ملی جلی کیفیت کا گہرا اثر تھا۔ اس لئے بوقت ضرورت بھی ان کے سامنے جانے سے کترایا کرتے تھے، جس کی وجہ سے قریب سے دیکھنے کا موقعہ کم ہی نصیب ہوا، اس کے باوجود ان کے بعض اوصاف سے ذاتی طور پر بہت زیادہ متاثر ہونا پڑا ہے۔ آپ کی جو صفات ناچیز کے دل ودماغ پر اثر انداز ہوئیں، ان میں سر فہرست آپ کی قرأت کا مسحور کن انداز ہے۔

مکتب کی تعلیم سے فراغت پاکر جامعہ رحمانیہ بنارس میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کا موقعہ ملا، مدرسہ مذکورہ کے بیرونی طلبہ کی رہائش اس کے مخصوص ہوسٹل دارالاقامہ میں تھی، پنجوقتہ نماز کے لئے طیب شاہ کی مسجد میں حاضری لازمی تھی، واضح رہے کہ موصوف مسجد مذکور کے پیش امام تھے، اس طرح ایک طویل مدت تک اکثر نمازیں اور خاص طور سے جہری نمازیں ان کے پیچھے ادا کرنے کا موقعہ نصیب ہوا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی آواز میں ایک عجیب قسم کا سوز ودیعت فرما رکھا تھا جب آپ قرأت کرتے خاص قسم کی کیفیت دل پر طاری ہوجاتی تھی، خصوصاً فجر کی نماز آپ کے پیچھے ادا کرنے میں ایک طرح کا لطف اور سرور ملتا تھا، ایک مدت تک آپ کے پیچھے جہری نمازیں ادا کرنے کی وجہ سے دل ودماغ آپ کی آواز سے اس قدر مانوس اور متأثر ہوچکے تھے کہ ایک عرصہ تک وہ کیفیت محو نہ ہوسکی، حقیقت تو یہ ہے کہ اب بھی اگر طیب شاہ جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو آنکھیں انھیں کو تلاش کرتی ہیں اور کان انہی قرأت کو سننے کے لئے بیتاب رہتے ہیں، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

دوسری جس صفت نے مجھ کو کافی متاثر کیا وہ آپ کی حسابی ذہانت تھی، پہلے ہی سے میں نے اس سے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا، لیکن جب اپنی آنکھ سے اس امر کا مشاہدہ کرلیا تو رشک کی حد تک متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اپنی ایک خاص علمی ضرورت کے تحت ایک دفعہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا، صبح کا وقت تھا آپ متعدد منیموں کے ساتھ حساب وکتاب کی تفتیش میں مصروف عمل تھے، مجھے انتظار کرنے کا حکم ملا، چنانچہ میں نے اپنی آنکھوں سے وہ بات دیکھی جو سن کر بمشکل تصدیق کی جاسکتی ہے، ہوا یوں کہ آپ ہر ایک کو حکم دیتے، وہ اپنا بہی کھاتہ کھول کر سامنے رکھتا اور آپ اس سے حساب وکتاب کی روداد سنتے، اور پھر زبانی طور پر اس کی غلطی پکڑتے، اور شدید محاسبہ کرتے۔ اور یہی عمل ہر ایک کے ساتھ پیش آیا، جبکہ ان کی تعداد پانچ یا چھ سے کم نہ رہی ہوگی، جب موصوف ان سے فارغ ہوکر اندر چلے گئے تو ہر ایک نے دوسرے کی جانب نہایت تھکے ہوئے انداز

میں مسکرا کر دیکھا اور اپنی پیشانی سے پسینہ پوچھنا شروع کیا۔

ایک تیسری چیز جس سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا، وہ آپ کی شدید خواہش اور حرص تھی کہ جامعہ سلفیہ کے طلبہ علم و عمل کے میدان میں مثالی ثابت ہوں، فراغت کے بعد بھی ان کی علمی و عملی ترقی کے لئے کوشاں رہتے تھے، چنانچہ آپ کے وہ تمام خطوط جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں مقیم ابنائے جامعہ سلفیہ کے نام گاہے بگاہے لکھا کرتے تھے اس امر کا بین ثبوت ہیں، یہی نہیں بلکہ بالمشافہ بھی اس کی تلقین کیا کرتے تھے، اور اگر کوئی نامناسب بات انھیں نظر آتی تو اسے نہایت محبت و احترام کے ساتھ دور کرنے کی نصیحت فرماتے تھے۔

اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ ——— ❊

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری؟ / احمد مجتبیٰ سلفی

بہت رونق ہے تیرے بعد...

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز

یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

فخرِ جماعت، اولین ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ، اور مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے امراء میں سب سے ممتاز امیر جناب مولانا عبدالوحید صاحب سلفی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مذکورہ دو شعر یوں ہی کوئی خطابت کی لفاظی نہیں، بلکہ یہ میرا حقیقی دلی تاثر ہے کہ مرحوم اس کے واقعی مصداق تھے۔

اس دورِ "قحط الرجال" میں (جو "فقط زیبِ داستان" نہیں) اور اس عہدِ فقدانِ اقدار و اخلاق میں اِس "فقید الجماعۃ" میں جتنا کچھ بھی موجود تھا، اس دور کے اعتبار سے بہت ہی زیادہ کہا جائے گا، (جو اب مفقود ہو گیا) میں اس کو ایک فرمان نبوی سے واضح کروں گا۔

حضرت عمر بن الخطاب، حضرت عمرو بن العاص، حضرت انس اور حضرت ابو جمعہ انصاری۔ رضی اللہ عنہم، سے اس مفہوم کی حدیث مروی ہے کہ "جن لوگوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا نہیں پھر بھی ان پر ایمان لائے، ان کے ایمان کی بڑی اہمیت ہے"[1]

اس حدیثِ نبوی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عہد نبوت کے بعد ایمان (مع جمیع شُعَبِہٖ) کی ایک خاص قدر و منزلت ہوگی۔ اس معنیٰ پر حضرت حذیفہؓ کی حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے، جس کو امام بخاری و مسلم نے اپنی صحیحین میں روایت کیا ہے[2]۔

---

[1] مجمع الزوائد (۱۰/۶۵) باب ما جاء فیمن آمن بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم ولم یرہ، والمشکاۃ مع تخریج الألبانی۔ رقم ۶۲۷۹، ۶۲۸۲ —

[2] صحیح بخاری کتاب الفتن باب ۱۳، وصحیح مسلم کتاب الإیمان باب ۶۴ —

" امانت لوگوں کے دلوں میں نازل کی گئی، قرآن نازل ہوا، لوگوں نے کتاب وسنت سے استفادہ کیا (پھر آپ نے امانت کے اٹھائے جانے کے متعلق بیان کیا، فرمایا) ۔ ۔ ۔ کوئی بھی امانت کو ادا کرتے ہوئے نہیں ملے گا، یہاں تک کہ کہا جانے لگے گا کہ "فلاں قوم میں ایک امانت دار آدمی پایا جاتا ہے"

یہ حدیث کئی طرح سے مرحوم ناظم اعلیٰ پر صادق آتی ہے ۔

۱۔ آخری زمانے میں خال خال لوگ امانت دار پائے جائیں گے، اور یہ حقیقت ہے کہ مرحوم انہی خال خال لوگوں میں سے تھے۔

۲۔ خاص طور پر خال خال امانت دار اُمناء (یعنی نُظَمَاء) میں سے تھے۔ (موجودہ دور میں نظماءِ مدارس کی امانتیں مخدوش ہو کر رہ گئی ہیں)

۳۔ پہلی حدیث کے معنیٰ پر اس حدیث سے یوں روشنی پڑتی ہے کہ جب خال خال امانت دار پائے جائیں گے تو ان کی قدر و منزلت اُس دور میں بہت زیادہ ہوگی، ٹھیک اسی طرح امانت داری کے علاوہ دیگر اخلاقی اقدار وروایات بھی آخری زمانہ میں جب خال خال پائی جائیں گی تو ان اخلاق واقدار کے حاملین کی چندگونہ اہمیت ہوگی :

آمدم برسرِ مطلب : ناظم صاحب مرحوم کی بلندیٔ نگاہ، دلنوازیٔ سخن، اور جاں پرسوزی کی اس دورِ فقدان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں چندگونہ اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ صرف "دور کے ڈھول سہانے" والی بات نہیں، بلکہ ان صفاتِ عالیہ کی ان کے اندر موجودگی کی گواہی ہر وہ شخص دے گا جس کا ان سے سابقہ پڑا ہو، اور جس شخص کو کسی اور ادارہ یا جمعیت کے ذمہ داروں سے سابقہ پڑا ہو (خواہ پہلے یا بعد میں) وہ اور زیادہ اسی کی بات کی تصدیق کرے گا، اور راقم انہی لوگوں میں سے ہے جن کو یہ سابقہ پڑ چکا ہے جامعہ کے طالب علم کی حیثیت سے بھی اور بحیثیت مدرسِ جامعہ بھی۔

میرا سب سے پہلا سابقہ مرحوم سے اس وقت پڑا تھا جب میں جامعہ سلفیہ کا طالب علم بنا، ایک نو وارد طالب علم کے ساتھ ناظم صاحب کا جو حسنِ برتاؤ سامنے آیا وہ پہلے کسی کی طرف سے میرے سامنے نہیں آیا تھا (الا ناظم احمد صاحب مرحوم ناظم جامعہ مفتاح العلوم کے) اس وقت بھی میں نے آپ کی زبان سے "تم" کا لفظ نہیں سنا، اور یہ بہت سے دیگر طلبہ سے بھی سنا ہے کہ ناظم صاحب ان کو "آپ" ہی کے لفظ سے مخاطب کرتے تھے، جبکہ عموماً طلبہ اور خاص طور پر نو وارد طلبہ کے ساتھ "دیگر" برتاؤ کیا جاتا ہے (الا ماشاء اللہ)۔

ناظم صاحب کے حسنِ اخلاق اور نرم گفتاری کے متعلق جامعہ کے قدیم ترین خادم جنہیں دفتری امور کے سلسلے میں برابر ہی آپ سے سابقہ پڑتا تھا، یعنی جناب ماسٹر عبدالمنان صاحب کا بیان ہے کہ : جہاں تک میرا علم ہے ناظم صاحب اساتذہ تو اساتذہ کسی معمولی چپراسی کے ساتھ بھی سخت کلامی کرتے ہوئے اور پھٹکارتے ہوئے نہیں دیکھے گئے۔

اساتذہ ہوں یا طلبہ، یا جامعہ کے دیگر غیر تدریسی اسٹاف سب کے ساتھ نرم گفتاری ہی سے پیش آتے، کسی کی کسی ضرورت کو اگر کسی وجہ سے پوری کرنے سے کوئی مانع ہوتا تب بھی نرم گفتاری سے معذرت کر دیتے، اس موقع پر عموماً مسکراتے اور فرماتے " فلاں وجہ سے ممکن نہیں " اس شکل سے معذرت پر طلب کنندہ کی اس طرح دل شکنی نہیں ہوتی جو عبوسا قمطریرا اور جھڑکار و دھتکار سے ہوتی ہے، حالانکہ ہر دو طرح سے معذرت کا ما حصل ایک ہی ہوتا ہے۔ ولکن اکثر الناس لا یشعرون ۔

طلبہ کو بیرونِ ملک جانے کے سلسلے میں جو مختلف قانونی پیچیدگیاں پیش آتیں ان کے حل میں ہر ممکن کوشش فرماتے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ہمارے ہم سبقوں میں سے سات طلبہ کو بیرونِ ملک بھیجنے کا فیصلہ کیا تو اس وقت پاسپورٹ بنوانے میں دو ضمانت داروں (یعنی چودہ ضمانت داروں) کا مسئلہ اپنی طرف سے اور اپنے برادران کی طرف سے ضمانتیں دے کر حل کیا تھا، جبکہ پاسپورٹ کے لئے ضمانت دینی کوئی معمولی خطرناک بات نہیں، کیونکہ بیرونِ ملک پاسپورٹ والے نے اگر کوئی ملک مخالف یا کسی طرح کا جرم کیا تو ــــ ضمانت دار ہی پکڑا جائے گا۔

اسی طرح بیرونی سفر کے سلسلے میں پیش آمدہ مالی مشکلات کو بھی حل کر دیتے تھے، کیونکہ بعض غریب طلبہ بر وقت اس بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، احقر کو بھی یہ مشکلات پیش آئے تھے جسے مرحوم نے حل کر دیا تھا۔

مرکزی جمعیتِ اہلحدیث ہند کے امیر ہونے سے پہلے بھی جماعت کے ہر طرح اور ہر طرف کے لوگ آپ کے پاس اپنی ذاتی جماعتی اور جامعاتی (مدارس سے متعلق) ضرورتیں لے کر آتے، آپ ان سے حسن اخلاق اور خندہ پیشانی سے پیش آتے، ان کی ضرورتیں سنتے، اور حتی الامکان ان کو پوری کرتے۔

اس سلسلے میں جماعت کے افراد کو یہ معلوم ہو جاتا کہ آپ سے اگر کسی اور وقت شدید مصروفیات کے باعث ملاقات کا موقع نہیں مل سکے گا تو نماز فجر کے بعد تو ضرور موقع مل سکتا ہے، کیونکہ فجر کی نماز بالالتزام آپ ہی پڑھاتے تھے، پاؤں کے عارضے کے بعد بھی یہ التزام جاری رہا، آپ کی قرأت اتنی مسحور کن ہوتی کہ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ " اگر ممکن ہوتا تو فجر کی نماز میں روزانہ آپ کے ہی پیچھے پڑھتا۔ نماز ختم ہوتے ہی ملاقاتی لوگ آپ سے ملتے، اور آپ ان سے کبھی تو گھنٹوں ان کے علاقہ سے متعلق جماعتی امور پر تبادلۂ خیال فرماتے، حتی کہ لوگ مدارس کے تعمیر و ترقی کے علاوہ تعمیری امور میں بھی آپ سے مشورہ لیتے کیونکہ آپ ایک ماہر تعمیری انجینئر کی طرح تعمیری واقفیت اور تجربہ رکھتے تھے۔ اور اگر تعاون کی بات ہوتی تو سر فہرست اپنا تعاون لکھ دیتے، اس طرح گویا حدیث نبوی :

" من سن سنة حسنة فله أجرها وأجر من عمل بها ــ

جس نے کوئی اچھا طریقہ رائج کیا تو اس کو اس پر عمل کرنے کا ثواب تو ملے گا ہی، اس کے علاوہ جو لوگ اس پر عمل کریں گے ان کا

ثواب بھی اس کو ملے گا۔ "

کے مصداق بعد کے تمام محسنین کے عطیات کے اجر کے بھی مستحق بن جاتے، کیونکہ آپ کا عطیہ دیکھ کر مذکورہ ادارہ اور بنارس کے دیگر محسنین دل کھول کر اپنا تعاون پیش کرتے تھے، بلکہ بعض تو آپ کی اتباع میں آپ کے ہی کے برابر تعاون دیتے تھے۔

آپ اپنا تعاون اپنے نام سے نہیں لکھتے تھے، بلکہ اپنے برادرِ مکرم الحاج عبدالرشید صاحب حفظہ اللہ کے نام سے لکھتے تھے، شاید اس میں دو باتوں کا لحاظ فرماتے تھے۔

۱۔ خواہ مخواہ نیکی کی تشہیر نہیں چاہتے تھے۔

۲۔ یہ ادب کے خلاف سمجھتے تھے کہ بڑے بھائی کے ہوتے اپنا نام استعمال کریں۔

دورِ اب : اساتذہ ہوں یا طلبہ، جامعہ کے دیگر متعلقین ہوں یا جماعتی مدارس کے ذمہ دار اور سفراء، یا عام ضرورت مند افراد سب آپ کی وفات حسرت آیات سے پیدا شدہ اس خلاء کو شدت سے محسوس کرتے ہیں، اور بزبانِ حال یہ مصرع دہراتے رہتے ہیں (بتصرف)۔ بہت روتی ہے تیرے بعد تیری شام تنہائی،

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ مرحوم ہر طرح کے عیوب سے پاک تھے کیونکہ " بے عیب ذات اللہ کی ہے " اور " معصوم صرف انبیاء علیہم السلام ہیں " مگر " لَاتَذْكُرُوْا هَلْكَاكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ " کے تحت یہ دعا کرتے ہیں

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں !

غفر الله له، ولنا ولجميع المؤمنين والمؤمنات ————

پیکرِ جمال و کمال

از، مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی
جامعہ فیض عام، مئوناتھ بھنجن

تاجا خاندان، اس کے جود وسخا اور علم وفضل کے تذکرے اور حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سلفی (ناظم جامعہ سلفیہ رحمۃ اللہ علیہ) کا ذکر خیر تو بچپن سے سن رکھا تھا، مگر ناظم صاحبؒ یا ان کے خانوادۂ نیک نام کی کسی شخصیت سے ملاقات اور زیارت کا شرف حاصل نہیں تھا یہ شرف سب سے پہلے اس وقت حاصل ہوا جب مرکزی دارالعلوم (جامعہ سلفیہ) کی تاسیس کے بعد اس کے لئے فراہمی چندہ اور حصول تعاون کی خاطر ناظم صاحب خود ایک وفد لے کر مئو تشریف لائے، غالباً کارخانہ دارالصحت ڈومن پورہ میں تشریف فرما تھے، میں نے ہمت کر کے قریب پہنچنے کی کوشش کی، اور ناظم صاحب سے مصافحہ وملاقات کی سعادت حاصل کی، اور ایک طرف خاموش کھڑا آپ کو دیکھتا اور سنتا رہا . . . پیکر وجاہت وتمکنت، دراز قد، کشادہ پیشانی، ہنستا مسکراتا چہرہ، سرخ وسفید رنگ، آنکھوں میں چمک ذہانت وفطانت کی غماز، گفتگو میں حد درجہ سنجیدگی ومتانت اور حسب موقع لطافت وظرافت بھی، غرض

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

یہ میری ناظم صاحب موصوف سے پہلی دید وشنید تھی، اس کے بعد جامعہ سلفیہ میں منعقد ہونے والی مختلف تقریبات اور کانفرنسوں نیز دیگر مواقع سے بھی ناظم صاحب ممدوح سے ملنے اُن کے ساتھ مٹنگوں اور مجلسوں میں شریک ہونے، آپ سے استفادہ اور تبادلۂ خیال کرنے کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔

ان مجلسوں اور ملاقاتوں اور جماعت وجامعہ کے لئے آپ کی مخلصانہ اور بے لوث خدمات اور نمایاں کارناموں (جو سب کے سامنے عیاں ہیں) کے مشاہدہ سے ناظم صاحب موصوف کے بارے میں میرے تاثرات کا حاصل یہ ہے کہ ممدوح صاحب جمال وکمال تھے، جمال صورت کے ساتھ حسن معنی کا بھی پیکر تھے، جسے کسی قلم کار اور مقالہ نگار کے مشاطگی کی ضرورت نہیں ؎

میری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو　٭　کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنابندی

ماہنامہ محدث حضرت مرحوم کی حیات اور کارنامے کو بیان کرنے اور یاد رکھنے کے لئے یہ خاص نمبر شائع کرتا یا نہ کرتا، مرحوم کی بلند و بالا شخصیت پر گرد نہیں پڑ سکتی تھی، ان کی سدا بہار پر وقار شخصیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ انشاء اللہ۔ یہ بنارس جسے درسگاہ کتاب وسنت جامعہ سلفیہ کے قیام اور مرکز کتاب وسنت حرمین شریفین سے اس کے گہرے مقدس تعلقات کی بنا پر کہنے والے نے آئینہ رخ حرم[1] کہا ہے۔ اس بنارس کے در و دیوار، یہ جامعہ رحمانیہ، یہ جامعہ سلفیہ، یہ جامعہ کی سادہ و شکوہ مسجد وغیرہ وغیرہ ..... اور یہ جماعت و جمعیۃ، اور یہ دہلی کی اہل حدیث منزل، کوئی ہزار ستم ظریفی کے باوجود بھی ان سب سے ناظم صاحبؒ کے والہانہ تعلق اور ان کے لئے مخلصانہ خدمات اور مساعی جمیلہ کو کیسے بھلادے گا، یا نظر انداز کردے گا:

ثبت است برجریدۂ عالم دوام ما!

ناظم صاحب مرحوم کی کن کن خوبیوں کو یاد کیا جائے اور بیان کیا جائے، فہم وفراست اور اصابتِ رائے سے معمور، حکمت و دور اندیشی اور انتظامی صلاحیت سے بھرپور، جفاکش اور محنت ومسلسل جہد وعمل کے عادی، خیر خواہی و ہمدردی کے خوگر، اہل علم کے قدرداں اور مرتبہ شناس، تمام مکاتب فکر میں یکساں احترام کے مالک، تواضع وخاکساری اور خوش مزاجی ان کی فطرت، وضع داری وبردباری اور صبر وضبط ان کا امتیازی وصف، غرض فضائل ومحاسن میں آپ کی ذات ایسی جامع تھی کہ اس پر میر کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

سراپا میں جس جا نظر کیجئے • وہیں عمر اپنی بسر کیجئے!

آپ کے اندر طمطراق اور دھوم دھڑاک تو نہیں تھا، لیکن ایک میر کارواں کے جو بنیادی اوصاف ہوتے ہیں، بلند نگاہی دلنوازی اور جاں سوزی وہ سب آپ کے اندر موجود تھے۔ ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کیلئے

انسان سے قصور وکوتاہی کا صدور اس کا خاصہ ہے، اور اس پر تنقید اور انگشت نمائی بھی ایک امر طبعی ہے، اس سلسلہ میں ناظم صاحب مرحوم کی شان یہ تھی کہ ناقدین کی تنقیدوں اور کچھ رفقاء واخوان کی آپ کے ساتھ گفتگو اور معاملات میں بے اعتدالیوں کے باوجود بھی آپ نے اپنی وضع داری ودلداری میں جہاں تک مجھے علم ہے کبھی فرق نہیں آنے دیا، اور ایسے لوگوں کے ساتھ بھی ہمیشہ عزت وتکریم کے ساتھ پیش آتے، اور دلنوازی ہی کا معاملہ کرتے رہے۔

---

[1] جامعہ سلفیہ کے ترانہ میں مفتی الرحمٰن فیضی صاحب کے ایک شعر کی جانب اشارہ ہے۔

جامعہ فیض عام ۔ جو ہندوستان میں جماعت اہل حدیث کا قدیم مرکزی ادارہ ہے ۔ اور جامعہ سلفیہ کے درمیان اول روز سے توافق اور باہمی تعاون کی خوشگوار فضا برابر قائم رہی ، جامعہ سلفیہ کے ناظم مولانا عبدالوحید صاحب رحمہ اللہ کو جامعہ فیض عام سے بھی گہرا تعلق خاطر تھا ، وہ اس کی خدمات کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے ، جامعہ فیض عام کے مرحوم ناظم حضرت مولانا محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۱۰ھ ۔ ۱۴۰۴ھ) جو ایک ممتاز عالم دین اور تعلیمی و انتظامی امور کے ماہر تھے ، اور جامعہ سلفیہ کی مجلس شوریٰ اور مجلس تعلیمی کے بھی رکن تھے ، مولانا عبدالوحید صاحبؒ کے ان سے بڑے گہرے روابط تھے ، ان کی صد درجہ تعظیم و تکریم کرتے اور تعلیمی و انتظامی امور و مسائل میں ان کی ماہرانہ صلاحیتوں سے استفادہ اور رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے ، ان کی وفات پر تعزیت نامہ میں اپنے قلبی تاثرات کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا تھا ،

> " محترم مولانا محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کی خبر وفات سے سخت صدمہ پہونچا ، جماعت کے لئے آپ کی شخصیت ایک قائد و سرپرست کی تھی ، جامعہ سلفیہ تو آغاز ہی سے آپ کی سرپرستی سے مشرف تھا ، اس کی پہلی تعلیمی کمیٹی کے تین ممبروں میں آپ کی شخصیت نمایاں تھی ، کسی ادارہ کے قیام کے وقت اس کے نظام اساسی اور نصاب تعلیم کی ترتیب بڑا اہم مرحلہ ہوتا ہے ، اس مرحلہ میں جامعہ کے ذمہ داران کو موصوف محترم سے بیش قیمت رہنمائی حاصل ہوئی ، جس سے ادارہ کو بڑی تقویت ملی ۔"

جامعہ سلفیہ کے قیام کے بعد اس کے شایان شان اساتذہ کی فراہمی سب سے اہم مسئلہ تھا ، جامعہ فیض عام میں ایسے متعدد اساتذہ موجود تھے جن کی خدمات سے جامعہ سلفیہ کو فائدہ پہونچا ۔

جامعہ کے موجودہ ناظم استاد گرامی حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمن صاحب فیضی حفظہ اللہ نے مولانا عبدالوحید صاحب رحمہ اللہ سے ایک موقع پر ازراہ بے تکلفی اس کا اظہار بھی کیا ، مولانا موصوف نے حسب عادت مسکرا کر بڑا معقول جواب دیا ، " جامعہ سلفیہ بھی آپ ہی کا ہے ، اس کے شایان شان اساتذہ فراہم کرنا سب کی ذمہ داری ہے ، ظاہر ہے کہ جہاں لائق اساتذہ ہوں گے وہیں سے آئیں گے ۔"

مولانا موصوف کی دولت و ثروت ، جود و کرم اور قلب و نظر کی وسعت کے واقعات اور دیگر عادات و معاملات کو ان کے سیرت نگار ان کے پس منظر کے ساتھ بیان کریں گے ، میں یہاں صرف ایک وصف کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں ، مولانا باقاعدہ حافظ قرآن نہیں تھے لیکن قرآن کریم کے ساتھ شغف اور کثرت تلاوت کی بنا پر بیشتر حصہ حفظ ہو گیا تھا گویا حافظ ہی تھے ، مسجد طیب شاہ میں نماز پنجگانہ خصوصاً نماز فجر کی امامت تقریباً تاحیات کرتے رہے ، اس مسجد میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں نماز تراویح آخر شب

ہوتی تھی، اور عموماً مولانا ہی پڑھاتے تھے، مجھے آپ کی امامت میں نماز فجر ہی پڑھنے کے مواقع ملے ہیں، آپ کی قرات میں ایسی حلاوت اور ایسا سوز اور زیر وبم ہوتا تھا کہ جی چاہتا تھا وہ پڑھتے رہیں اور سنتے رہیئے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کے اس سچے عاشق اور دین وملت کے خادم کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے، اور انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

وہ میرکارواں تھا ابھی کل کی بات ہے

از۔ محمد فاروق اعظمی ، جلگاؤں

کوئی پندرہ سولہ سال پہلے کی بات ہے ، میں وطن سے جلگاؤں آرہا تھا، جون کا ابتدائی عشرہ تھا، ٹکٹ ریزرو تھا، مگر سوءِ اتفاق کہ سفر کی طے شدہ تاریخ سے ایک دو روز قبل ہی کاشی ایکسپریس کی روانگی کے وقت میں تبدیلی کردی گئی تھی جس کا مجھ جیسے ہزاروں مسافروں کو علم نہیں تھا، جیسے ہی ہم پلیٹ فارم پر پہونچے معلوم ہوا گاڑی ابھی ابھی جاچکی ہے، سخت حیران وپریشان تھا، سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں، ساتھ ہی میرا بڑا لڑکا اور بڑی لڑکی بھی تھی ، بہرکیف پہلی فرصت میں ٹکٹ واپس کیا اور اگلے دن کے سفر کی فکر لاحق ہوئی، کئی کوششیں کرڈالیں مگر ریزرویشن کی کوئی صورت نہ نکلی، لمبی مسافت ، گرمی کا موسم اور بغیر ریزرویشن کے بال بچوں کے ساتھ سفر کی صعوبت کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے، انھیں تصورات میں گم تھا کہ جامعۃ السلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس پہونچ کر رات بھر قیام کرنے اور دوسرے دن عازم سفر ہونے کا خیال ذہن میں آیا۔ دارالعلوم گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے قریب قریب سنسان تھا، عین پریشانی میں ایک ملازم کے ذریعہ ناظم ادارہ مولانا عبدالوحید صاحب رحمانی کو فون کرایا اور ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی کچھ دیر بعد ناظم صاحب بنفس نفیس تشریف لے آئے، اپنے آفس میں فروکش ہوئے اور مجھے بلوایا، میری ناظم صاحب سے یہ پہلی بالمشافہ ملاقات تھی، میں نے اپنا تعارف کرایا اور اپنی افتاد بیان کی، انہوں نے اسی موقع پر میرے ساتھ جس خلوص ومحبت ، بلند اخلاق اور شریفانہ طبیعت کا مظاہرہ کیا، وہ میرے دل وجگر میں آج بھی " تیر نیم کش " کی طرح پیوست ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایسے خلیق اور خوش مزاج لوگوں سے کسی جماعت کا ضمیر تیار ہوا کرتا ہے، موصوف نے جامعہ کی ایک فعال شخصیت ماسٹر عبدالمنان صاحب کو بلوا کر ہدایت کی کہ وہ دوسرے دن صبح سویرے ریلوے اسٹیشن پہونچ کر اپنے خصوصی اثر ورسوخ سے میرے لئے تین ٹکٹ مع ریزرویشن کے حاصل کریں۔

آج جب میں اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو میرا سر شرم اور ندامت سے جھک جاتا ہے، اپنی کم عقلی اور شوریدہ سری پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے، ایک معمولی کام کے لئے میں نے ایسی عظیم المرتبت شخصیت کو زحمت دی تھی، جس کے منصب اور مرتبہ کے یہ قطعی شایان شان

نہ تھا، لیکن انہوں نے جس کسرِ نفسی، شرافت اور اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کیا وہ کچھ انھیں کا حصہ تھا۔

مولانا مرحوم سے جو لوگ قریب رہے ہیں، وہ ان کی شرافت، حسن اخلاق، تحمل و بردباری اور معاملہ فہمی کو اچھی طرح جانتے ہیں میری ملاقاتیں اکثر سرسری اور اتفاقی رہی ہیں، اکثر منصورہ (مالیگاؤں) بمبئی، بنگلور، بنارس اور مئو وغیرہ کے اجلاس میں ان سے نیاز حاصل ہوتا رہا، جب بھی ملے اور جہاں بھی ملے بڑی محبت اور اپنائیت کا اظہار فرمایا، جب بھی میرا کوئی مضمون " محدث " میں دیکھتے تو ملاقات کے وقت اس کا ذکر فرماتے، تحسین وآفرین کے کلمات کہتے، اور میری حوصلہ افزائی کرتے، میں ان کے اس سلیقۂ دلنوازی سے بڑی تقویت محسوس کرتا، یہ ان کے مسکراتے لبوں کا حسن تھا یا دل کی وسعت، گفتگو کا سحر تھا یا دلِ دردمند کا کرشمہ، محبت کا خلوص تھا یا بے نفسی وانکساری کا اعجاز کہ دل بے ساختہ ان کی طرف کھنچتا تھا، ان کی مجلس میں ایک بھائی کی محبت، ایک بزرگ کی شفقت اور ایک رفیق کی رفاقت کا لطف بیک وقت محسوس ہوتا تھا، ان کا خلوص بے پایاں ہر ایک کے لئے عام تھا، اپنی خوش مزاجی و دلنوازی سے ہر ایک کے دل میں گھر کر لیتے تھے، اور سامنے والا محسوس کرتا تھا کہ ان کا یہ التفات اس کے لئے خاص ہے۔

مولانا " تاجا بیوپاری " کے خاندان کے چشم وچراغ تھے، آج بھی قرب وجوار میں تاجا بیوپاری کا نام بکتا ہے، مولانا کو خاندانی عز و شرف کے ساتھ پیشۂ تجارت وراثت میں ملی تھی، ہر طرح کی خوشحالی اور مرفع الحالی ان کا مقدر تھی، قدرت جب کسی کو مال ومنال جاہ وجلال اور کسی فن میں کمال عطا کرتی ہے، تو اس کے اخلاق وکردار کی بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے، ان حالات میں فطری طور پر غرور وتکبر، رعونت وخساست، خودستائی وخودپرستی، انانیت وخودمرکزیت جیسی بری خصلتیں پیدا ہو جاتی ہیں، مگر مولانا سراپا ـــــ پیکرِ جمال ـــ تھے، ان کی سیرت میں ایک درویشانہ شان تھی، انھیں نہ نام ونمود کی تمنا تھی نہ اپنے کو نمایاں کرنے کی خواہش، نہ اپنی تعریفیں کرانے کا شوق تھا، نہ کسی قسم کی خودسری نہ کسی قسم کا غرور وتکبر تھا، نہ کسی قسم کے جاہ ومنصب کی ہوس، یہی وہ صفات تھیں جو ان کا امتیازی نشان تھیں، ان کی للّٰہیت وبے نفسی ہی کا اثر تھا کہ جماعت نے ملک کے سب سے بڑے سلفی ادارہ جامعہ السلفیہ (مرکزی دار العلوم) بنارس کی نظامت کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی یہی نہیں بلکہ جب ۱۹۷۹ء میں جمعیۃ اہل حدیث ہند کی صدارت (امارت) کا مسئلہ درپیش آیا تو اخوانِ جماعت کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی، اگرچہ آپ اپنے بعض عوارض، اور دیگر کاروباری مصروفیات نیز اس وقت کی جماعتی صورت حال کی بنا پر اس بارِ گراں کو اٹھانے سے گریزاں تھے، مگر جماعت کے اعتماد، خلوص اور عقیدت کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔

ادھر گذشتہ کچھ دنوں سے موصوف لنگ کھا کر بڑی مشکل سے چل پھر سکتے تھے، جب کبھی میں انھیں کسی کانفرنس یا جلسہ میں دیکھتا

قائد کی ہمت و حوصلہ اور جاں سوزی کو دیکھ کر اپنے قوائے عمل میں ارتعاش محسوس کرتا، موصوف اگرچہ نظامت و امارت کے مناصب جلیلہ پر فائز تھے، اور آخری سانس تک فائز رہے، مگر انہوں نے ہر اہم مسئلہ میں اپنے بڑوں، بزرگوں اور خوردوں کے مشوروں اور رایوں کا ہمیشہ احترام کیا، بالخصوص کسی اہم مسئلہ میں وہ محدث کبیر بقیۃ السلف حضرت مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی مبارکپوری رحفظہ اللہ تعالیٰ سے مشورہ اور رائے لینا اشد ضروری سمجھتے تھے، اس سلسلے میں وہ کبھی بنفس نفیس حضرت الشیخ کے دولت کدہ پر حاضر ہوتے، یا کبھی اپنے کسی خاص ایلچی کو روانہ کرتے، یا ضرورت ہوتی تو کار بھیج کر حضرت الشیخ کو بنارس آنے کی زحمت دیتے۔

فروری ۱۹۸۳ء میں جب مرکزی دارالعلوم بنارس کے طلبا نے " ہنگامہ " کھڑا کیا تھا، تو ادارہ کے نظم وضبط اور وقار کیلئے ایک سنگین مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، مشکل یہ تھی کہ اپنی ہی صفوں میں سے کچھ لوگ اس کو ہوا دے رہے تھے، اور " بیرونی ہاتھ " بھی اس سازش میں متحرک تھے، حسن اتفاق تھا کہ راقم الحروف ان دنوں اپنے وطن ہی میں تھا اور جس صبح جلگاؤں کے لئے عازم سفر ہونے والا تھا سفر کی سہولت اور حضرت الشیخ کا نیاز اور ان کی دعائیں لینے کے لئے رات میں ان کے دولت کدہ پر قیام پذیر تھا، لگ بھگ عشاء کے وقت ناظم صاحب کا ایک خصوصی ایلچی ہنگامہ سے متعلق ان کا ایک تفصیلی خط لے کر حضرت الشیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اسے پڑھ کر حسرت و یاس اور رنج والم کی کئی شکنیں ان کے ماتھے پر ابھر آئی تھیں، اپنے لڑکے مولوی عبدالرحمٰن صاحب کو لے کر گئی رات تک اس ہنگامہ کے عوامل وعواقب پر غور و فکر کرتے رہے، اور ایک مفصل خط املا کرا کر بنارس بھیجا۔

...... اور پھر ۹ و ۱۰ اپریل ۱۹۸۳ء کو اس مرکزی ادارہ جامعۃ السلفیہ میں ملک کے کونے کونے سے اخوان جماعت اہل حدیث کی ایک نمائندہ میٹنگ طلب کی گئی تھی، جس میں کشمیر سے کنیا کماری تک اور کلکتہ سے بمبئی تک کے بڑے بڑے علماء و زعماء شریک تھے، راقم کو بھی حاضری کا شرف حاصل ہوا، ناظم صاحب موصوف اس موقع پر آئے ہوئے مہمانوں کو قیام و طعام اور مختلف نشستوں اور میٹنگوں کے انتظام کی بنفس نفیس نگرانی فرما رہے تھے، چہرے پر درد و کرب کے آثار بھی تھے اور زیر لب مسکراہٹ بھی، ہر ایک کی زبان پر " ہنگامہ " کا موضوع تھا، معاملہ بڑا سنگین تھا، جب سے ہنگامہ ہوا تھا جامعہ مکمل طور سے بند کر دیا گیا تھا، جلد از جلد کوئی ایسا ٹھوس فیصلہ کرنا تھا جس سے جامعہ کا وقار اور اعتماد فوری طور پر بحال ہو سکے، اس موقع پر کسی بھی جذباتی یا غیر دانشمندانہ فیصلہ سے جامعہ شر و فساد کی جولانگاہ بن سکتا تھا، ناظم صاحب اس موقع پر انتہائی پر وقار اور پر سکون نظر آئے ہر معاملہ اور مسئلہ کی تہہ تک پہونچے، اس کے اسباب و علل کو جانتے، عمل اور رد عمل کو بھانپنے، اور صحیح نتیجہ اخذ کرنے میں انہوں نے اپنی خداداد صلاحیت کا مظاہرہ کیا، اتفاق رائے سے جو تجاویز پاس ہوئیں، انھیں مؤثر طور پر نافذ کرنے میں ناظم صاحب نے جس سنجیدگی، اعلیٰ ہمتی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ایک دن سکون واطمینان کے کچھ لمحات میسر تھے، کریں ناظم صاحب کا وہ خطبۂ صدارت پڑھ رہا تھا جو انہوں نے ۳۰ ستمبر
۱۹۸۸ء کو دہلی کے سپرہاؤس میں کل ہند شبان اہل حدیث کنونشن کے موقع پر پیش کیا تھا، مجھے اس کی ایک ایک لائن اپیل
ہی تھی، نفس مضمون سے مضمون ایسا مربوط تھا، اور جا بجا قرآنی آیات کے حوالے ایسے برجستہ اور برمحل دیئے گئے تھے کہ بیساختہ
ۓ والے کی ذہانت وذکاوت اور علمی صلاحیت کی داد دینے کو جی چاہتا تھا، اس وقت مولانا کا پورا سراپا آنکھوں کے سامنے گھوم رہا
، ان کا وہ جگمگاتا ہوا کتابی چہرہ، لب ولہجہ کی متانت وسنجیدگی، مزاج کی نرمی، محبت کی گرمی اور خیالات کی وسعت آنکھوں
سامنے فلمی تصویروں کی طرح گھوم رہی تھی۔

... اور دوسرے دن صبح سویرے برادر محترم مولانا عبدالرحمن صاحب مبارکپوری بمبئی کی کسی میٹنگ میں شرکت یا کسی نجی کام کے
بنگاؤں میرے مستقر پر پہونچے، تو سامان رکھتے ہی چارپائی پر دراز ہوگئے اور بولے " بڑا زبردست حادثہ ہوگیا "۔ میں نے پوچھا
ت؟ کہنے لگے مولانا عبدالوحید صاحب ناظم کا انتقال ہوگیا، میرا ذہن کسی " ریلوے حادثہ۔ یا۔ سفری حادثہ " کی طرف تھا،
اس دلدوز خبر کو سننے کے لئے ہرگز تیار نہ تھا، کہنے لگے۔ بذریعہ فون وہاں اطلاع پہونچی تھی، وہاں سے غائبانہ نماز جنازہ ادا کر کے
ہوں، میں دھک سے ہوگیا، ابھی کل ہی تو میں انھیں ایسا ٹوٹ کر یاد کر رہا تھا، ان کی تحریریں پڑھ رہا تھا، ان کی قرآن
ی کی داد دے رہا تھا، ان کے حسن اخلاق کی گرمی محسوس کر رہا تھا، میں یہ سوچ کر پریشان تھا کہ کیا یاد اور موت کا کوئی
مرا رشتہ ہے؟ ۔

آہ! امیر کاروانِ سلفؒ نہ رہا

مولانا عارف سراجی، سکریٹری ادارہ دعوت دین، کونڈرا گرانٹ بستی

"قومی آواز" مجریہ ۲۵ رنومبر ۱۹۸۹ء میں مولانا عبدالوہاب خلجی قائم مقام ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند کی شائع کردہ انتہائی اندوہ ناک اور الم ناک خبر نظر سے گذری، عزت مآب حضرت مولینا عبدالحمید سلفی امیر جمعیۃ اہل حدیث و ناظم جامعہ سلفیہ بنارس کا انتقال پر ملال ملک و ملت اور جماعت کے لئے ناقابل برداشت ہے، آپ کی وفات سے جماعت اہل حدیث یتیم و یسیر ہو کر رہ گئی ہے، اور نشاۃ جدیدہ کی انقلابی تاریخ کا خاتمہ ہو گیا۔ آپ کے دور امارت میں تحریک اہل حدیث کو بے پناہ عروج و فروغ حاصل ہوا، آپ کی امارت کی بدولت مذہبی مسلکی، اور سیاسی اعتبار سے ملک و بیرون ملک جماعت کا تعارف ہوا، اکابر جماعت کے زیر سایہ جماعت کے طبقوں میں ولولوں اور حوصلوں نے انگڑائی لی، اور "مرکزی جمعیۃ شبان اہل حدیث ہند" کا قیام ہوا، الغرض، امیر جماعت پیرانہ سالی میں عزم جوان رکھتے تھے، اور جوانوں سے کام لینے اور انھیں میدان حرکت و عمل میں آگے بڑھانے کا سلیقہ جانتے تھے، درحقیقت مرحوم علامہ اقبال کے اس معنی خیز کلام کے مصداق تھے ؎

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق ✽ جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے
موت کے آئینے میں تجھکو دکھا کر رخ دوست ✽ زندگی اور بھی تیرے لئے دشوار کرے

آہ تحریک سلف صالحین کا امیر کارواں ایسے وقت اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گیا جب کارواں کو اس کی شدید ضرورت تھی۔ لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرًا۔ اس دردناک خبر سے فضا سوگوار ہے، اور ماحول پر اندھیرا چھایا ہوا ہے، آنکھیں پرنم ہیں اور قلم ناتواں رنج و غم کا ساتھ دینے سے معذور ہے، میری دعا ہے کہ اللہ کریم مولانا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، پسماندگان کو صبر بخشے، اور مرکزی جمعیۃ اور جامعہ سلفیہ کو ان کا نعم البدل عنایت کرے۔ آمین! وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

دفترِ ہستی میں تھی زرّیں ورق تیری حیات

شنبہ و یکشنبہ ۲۵ و ۲۶ر نومبر ۱۹۸۹ء کی درمیانی رات میں جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس کے ناظم اعلیٰ اور مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے امیر مولانا عبدالوحید عبدالحق سلفی (رحمہ اللہ) اس دار فانی سے رحلت فرما گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اور اس طرح جامعہ سلفیہ اور ملت و جماعت اپنے ایک مخلص و بے نفس اور باحمیت و بصیرت رہنما سے محروم ہو گئی۔

اہل ایمان کی نظر میں موت ایک اٹل حقیقت ہے، اور ہر متنفس کے لئے اس کا ایک وقت مقرر ہے جس میں تقدیم و تاخیر نا ممکن ہے، اسی طرح اسلام کا حکم ہے کہ مسلمان اگر اپنے کسی عزیز و قریب یا محسن و متعارف کی موت کے صدمہ سے دو چار ہو تو صبر و صلوٰۃ کا سہارا لے، اور اللہ تعالیٰ سے جانے والے کے لئے مغفرت و رحمت اور پسماندگان کے لئے صبر و سکون کی دعا کرے۔

اسلام کے اس حکم میں بڑی معنویت ہے، اور غمہائے روزگار کے ہجوم میں سنبھلنے کا یہی سب سے بہتر سہارا ہے۔ اعزاء و متعلقین میں سے کسی کی جدائی بڑی شاق ہوتی ہے، اور رحلت کرنے والی شخصیت اگر زیادہ عظمت و اہمیت کی مالک ہوتی ہے تو صبر و شکیب کی تمام تدبیریں بے سود ہو جاتی ہیں، اور دل کو کسی بھی طرح سکون و قرار نہیں ملتا۔

جس ذات گرامی کی وفات پر یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں ان کی انفرادی حیثیت و اہمیت بھی کچھ کم نہیں، لیکن ان کی ملی و جماعتی فعالیت و تاثیر کو دیکھتے ہوئے جب ان کی موت کا خیال آتا ہے تو کلیجہ شق ہونے لگتا ہے، وہ خود ایک انجمن ہی نہیں بلکہ انجمن ساز تھے، جماعت کی تاریخ میں انہوں نے جس طرح رنگ آمیزی کی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں جس طرح بڑے بڑے کارنامے انجام دلوائے ان پر سب لوگ آج بھی رشک کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تدبیر سے کبھی خود کو سجانے کی کوشش نہیں کی، لیکن قدرت نے ہر میدان میں ان کو سربلندی سے نوازا، اور انکے قدم قدم کو جماعت کے لئے باعث خیر و برکت بنایا۔

جامعہ سلفیہ کی پچیس سالہ تاریخ میں جس طرح اخلاص وللہیت محنت وجانفشانی اور ایثار وقربانی سے انہوں نے اس شجر نورستہ کو سینچا اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے وسعت قلب اور دقت نظر کی ضرورت ہے۔ جامعہ کی یہ تاریخ ان کی ذات سے اس طرح وابستہ ہے کہ دونوں کو الگ کرکے صحیح حقیقت کا ادراک نہیں ہوسکتا، انہوں نے ادارہ کو، اور بعد کے دور میں مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کو بھی اپنا مرکز نگاہ بنالیا تھا، مصروف تجارتی زندگی سے وقت بچا بچا کر دونوں اداروں کی خدمت کرتے رہے، اور اس میں اس قدر انہماک دکھایا کہ صحت متاثر ہوگئی، ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا اور عمل کے اوقات میں کمی کی سخت تاکید کی، لیکن زندگی میں اس کا موقع نہ مل سکا۔

مدنپورہ بنارس کے جس خانوادہ سے مولانا عبدالوحید صاحب کا تعلق تھا اس کی ریاست وسیادت، کرم گستری وعلم نوازی اور جاہ وحشمت کا سب کو اعتراف ہے، اس خانوادہ کے بیشتر افراد ملی وجماعتی خدمات کی وجہ سے مقبول خاص وعام ہیں، اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بعد ان ہی کے ایثار وقربانی سے بنارس کی جماعت قلت تعداد کے باوجود ہمیشہ سربلند رہی، اور جامعہ سلفیہ کے قیام کے بعد افراد جماعت کا ربط اس خانوادہ سے اور زیادہ قوی ہوگیا، ہر طرف سے لوگ اپنے مالی وانتظامی مسائل لے کر یہاں پہونچتے تھے اور بیشتر حالات میں مقصد سے ہمکنار واپس جاتے تھے۔ جماعت کا مؤرخ یہاں کے احوال قلمبند کرنے بیٹھے گا تو اسے علم پروری وغربا نوازی کی بڑی انوکھی مثالیں نظر آئیں گی۔

اس خانوادہ کے عظیم احسانات میں سے ایک احسان یہ بھی ہے کہ اس نے اپنے عزم وہمت سے مرکزی دارالعلوم کی تاسیس کا کام آسان بنادیا، اور یہاں سے اس ادارہ کو ایسا باصلاحیت مخلص ناظم ملا جس نے اپنی دوررسی اور جانفشانی سے ادارہ کو چار چاند لگاکر بہت تھوڑی مدت میں اسے ملک وبیرون ملک میں معتبر بنادیا۔ جامعہ سلفیہ کا قیام عمل میں آیا تو ہمارے جماعتی ادارے ملکی سطح پر دعوت وتدریس کی خدمت انجام دے رہے تھے اور ان اداروں کے قائدین ومنتظمین کو بیرونی سطح پر کام کا تجربہ نہ تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور مخلصین جماعت کی

کوشش و توجہ سے بہت جلد جامعہ سلفیہ نے بیرونی اسلامی دنیا سے اپنے تعلقات استوار کرلئے، مدارس کی زندگی میں یہ ایک نیا تجربہ تھا، اسے تقویت دینے کے لئے بالغ نظری و معاملہ فہمی کی ضرورت تھی۔ محترم مولانا عبدالوحید صاحبؒ نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور گوناگوں اوصاف وکمالات سے کام لے کر جامعہ سلفیہ کے بیرونی علمی تعلقات کو مزید استوار بنایا، اور اس طرح ادارہ کے فارغین و متعلقین کے لئے علمی ترقی کے وسیع تر راستے سامنے آئے، متعدد تعلیمی اداروں سے استفادہ کے مواقع حاصل ہوئے اور علمی مذاکرات واجتماعات میں شرکت کا مرحلہ آسان ہوا، ساتھ ہی جامعہ سلفیہ کو بھی متعدد کانفرنسیں منعقد کرنے کا حوصلہ ملا جس سے جماعتی زندگی میں حرکت وسرگرمی پیدا ہوئی، جامعہ سے جن طلبہ کو بیرون ہند تعلیم کا موقع ملا ان میں سے بیشتر طلبہ نے اپنے اپنے مضامین میں نمایاں کامیابی حاصل کی، اور اس طرح علمی وتحقیقی کاموں میں قابل قدر پیش رفت ہوئی۔ عرب دنیا میں حالات کی ناہمواری کے باعث طلبہ کے داخلہ میں اس وقت کمی ہوگئی ہے، لیکن جو طلبہ بیرون ملک علمی خدمات میں مشغول ہیں ان سے بہتر توقعات وابستہ ہیں۔

انسان کی ذات میں بہت سے محاسن وکمالات ہوتے ہیں، لیکن ضروری نہیں کہ جملہ محاسن نمایاں طور پر لوگوں کے سامنے آجائیں، حالات کے مطابق آدمی کی شخصیت ابھرتی ہے اور اس کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ ملی وجماعتی زندگی میں داخل ہونے کے بعد مولانا عبدالوحید صاحبؒ کے جو محاسن ابھر کر سامنے آئے ان کی فہرست طویل ہے، جامعہ کی تاریخ اور مرحوم کے سوانح مرتب کرنیوالے حضرات ان خوبیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے، اور ان سے متعلق واقعات وحقائق کو شرح وبسط سے پیش کریں گے، اور اپنے اپنے نقطہ نظر اور تجربہ کے مطابق ان خوبیوں کے مابین ترتیب قائم کریں گے، لیکن مرحوم کے جو محاسن ان سے ملنے اور ان کو سننے والے ہر شخص کو نمایاں طور پر متاثر کرتے تھے ان میں ان کا تدین، تقویٰ شعاری، سنتِ رسولؐ پر فدائیت، صبر وتحمل، مردم شناسی وبالغ نظری، وقار ووضعداری، خوش خلقی وملنساری اور انتھک جد وجہد نمایاں ہیں، کبھی کبھی ان کی زندگی میں ان محاسن کی ایسی جلوہ گری ہوتی تھی کہ متعلق شخص

ششدر رہ جاتا تھا۔ تجارت کی دنیا سے باہر ان کا زیادہ تر سابقہ علماء و طلبہ سے رہتا تھا، وہ سب کی سنتے اور سہتے تھے، کبھی کسی کی دل شکنی نہیں کی، اور نہ ایسی صورت پیدا ہونے دی جس سے ان لوگوں میں سے کسی کو شرمساری ہو۔

جامعہ سلفیہ کے قیام سے پہلے مرحوم نے جامعہ رحمانیہ کی اپنی نظامت کے دور سے متعلق بعض واقعات ایک استفسار پر بیان کئے، ان کو سن کر اندازہ ہوا کہ علماء کی قدر و منزلت ان کے نزدیک کتنی تھی۔ مردم شناسی کا یہ حال تھا کہ آدمی کو پہلی نظر میں پوری طرح پڑھ لیتے تھے، لیکن تاثرات کے اظہار میں بے حد محتاط تھے تاکہ کسی کی دل شکنی نہ ہو، اس سے بعض لوگ یہ سمجھ لیتے تھے کہ حقیقت ان سے مخفی رہ گئی۔

بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ دو دو ماہنامے ان کی ماتحتی میں شائع ہوتے تھے لیکن کبھی اپنی کارگذاری کو نمایاں کرنے کے لئے کنایتہً بھی کوئی فرمائش نہ کی اور اگر کہیں کسی کارگذاری کے ضمن میں ان کا نام آگیا تو اس پر مسرت کے بجائے تکدر کا اظہار کیا، خاموشی کے ساتھ دین و علم کی خدمت ان کے اصول میں داخل تھی۔

راقم سطور نے ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہوئے بیس سال سے زائد کا عرصہ گذارا، اس مدت میں ان کی زندگی کے بہت سے پہلو نمایاں ہوئے، جماعتی میدان میں ان سے متعلق دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی دیکھنے کا اور پڑھنے کا موقع ملا، ان سب سے متعلق اپنے تاثرات کسی دوسری فرصت میں پیش کروں گا، فی الحال محدث کی کاپی پریس جانے کیلئے تیار ہے اور عجلت میں یہ سطریں تحریر کر رہا ہوں، مفصل سوانحی خاکہ انشاءاللہ کسی دوسری اشاعت میں پیش کروں گا۔

جامعہ سلفیہ و جمعیۃ اہل حدیث کے سربراہ کی حیثیت سے مرحوم کے تعلقات کا دائرہ بے حد وسیع تھا، باہم ایسے صورت پیش آسکتی ہے جس سے کسی طرح کا تکدر پیدا ہوا ہو، لیکن مرحوم اب اس دنیا میں نہیں رہے، تجربہ سے ثابت ہے کہ ان کا اختلاف بھی مثبت و مفید پہلو رکھتا تھا، جماعت پر چونکہ ان کا حق بہت بڑا ہے اسلئے میری گذارش

ہے کہ ہم مرحوم کے لئے اسلامی تعلیم کے مطابق دعائے خیر کریں، اور ان کے مخلص و صحیح جانشین کے لئے اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کریں۔

مرحوم کی موت اسپتال میں تقریباً ایک ماہ زیر علاج رہنے کے بعد ہوئی، پھر بھی اچانک حادثہ تھی، حالات کی ناہمواری کے باعث جملہ متعلقین و متعارفین کو بروقت خبر نہ دی جاسکی، جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے، اور ساتھ ہی ہم ان تمام حضرات کے تہہ دل سے شکر گذار ہیں جنہوں نے خبر سن کر جنازہ میں شرکت کی یا تعزیت و ہمدردی کے کلمات ارسال کئے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو سلامتی و عافیت سے نوازے، مرحوم کو جنت الفردوس اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے،

وصلی اللہ علی رسولہ الکریم، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(شریک غم: مقتدیٰ حسن ازہری)

قارئین محدث کی خدمت میں

ماہنامہ محدث ہر ماہ پابندی سے آپ کے نام ارسال کیا جاتا ہے اس لیے آپ سے مودبانہ گزارش ہے کہ پرچہ تاخیر سے پہنچنے یا نہ پہنچنے کے سلسلہ میں اولین فرصت میں ادارہ سے رجوع کریں۔

اگر آپ کے ذمہ ماہنامہ خریداری کی رقم باقی ہے تو براہ کرم پہلی فرصت میں بھیجنے کی زحمت فرمائیں۔

(ادارہ)

محمد سلیم بنولوی نیپالی
بونڈ، بجلی نیپال

حضرت مولانا عبدالوحید سلفی مرحوم کی

شخصیت، خدمات اور کارنامے

آفتاب عالمتاب آسمان پر ہر روز ایک نئے زاویئے پر طلوع ہوتا اور غروب ہوتا نظر آتا ہے، چاند سورج کی غیر حاضری میں رات کی تاریکی کو منور کرتا ہوا راہیٔ منزل کے راستہ کا پتہ دیتا ہے، اور شب تاریک میں ٹمٹماتے ہوئے ان گنت قمقمے رات کو حسین بناتے ہوئے بھٹکے ہوئے مسافروں کے لئے مٹتے ہوئے نقوش کا پتہ دیتے ہیں، ٹھیک اسی طرح آئے دن انسانی زندگی بھی ایک نیا موڑ لیتی ہوئی، اور کروٹیں بدلتی ہوئی عالم عقبیٰ کی طرف رواں دواں ہے، اس عالم ہاؤ ہو میں انسان حیات مستعار لے کر اپنی زندگی کی کتاب کے صفحات کو پلٹتا ہوا روپوش ہو جاتا ہے، اور اس منزل کو موت عالم عقبیٰ سے ملا دیتی ہے۔

گذشتہ چند سالوں کے دوران جماعت اہل حدیث کو اپنے کئی بھی خواہ خدمت حدیث اور اشاعت حدیث کی شخصیت سے محروم ہونا پڑا، اور آئے دن اس کے نامور فرزند پیوند خاک ہوتے چلے جا رہے ہیں، جہاں انفرادی طور پر علم و عمل، ریسرچ و تحقیق اور حکمت و دانش کی بے شمار شخصیتیں داغ مفارقت دے گئیں، وہیں منبر و محراب کے امام و خطیب، حق و باطل کے لئے بے نیام شمشیر براں کے اٹھ جانے سے جماعت اہل حدیث کی قیادت میں زبردست خلا پیدا ہو گیا۔

۲۳ رمارچ ۱۹۸۷ء کو لاہور میں دنیائے اسلام کا ایک عظیم ہیرو، اور پاکستان کی جمعیت اہل حدیث کا قائد، نڈر اور بے باک سپاہی " علامہ احسان الٰہی ظہیر " اور ان کے چند رفقاء شہید کر دیئے گئے، علامۃ العصر، ادیب دوراں ڈاکٹر محمد تقی الدین ہلالی ۲۷ رشوال ۱۴۰۷ھ کو الدار البیضاء میں سدھار گئے، فقیہ دوراں محدث کبیر حافظ محمد گوندلوی پاکستان، رابطہ سلفیان عالم حافظ فتح محمد مکہ مکرمہ، داعی حق میجر محمد اسلم امریکہ، مناظر اسلام مولانا حکیم محمد صادق سیالکوٹی، بیہقی دوراں

لامہ محمد حنیف ندوی، محدث عصر محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، ایسے صاحب فکر و بصیرت، جری و بہادر، مفکر و دانشمند، متحرک فعال، صاحب صدق و صفا اور متقی و پرہیز گار ہمارے یہاں انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

ساتھ ہی ۹ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کی شب میں مرکزی جمعیت اہل حدیث برطانیہ کا ایک متحرک و فعال ناظم اعلیٰ مولانا محمود احمد میرپوری ایک حادثہ میں ہم سے جدا ہو گئے، ۱۹۸۹ء کے آغاز میں ہندوستان کی جمعیت اہل حدیث کے نامور خطیب شعلہ بیان مقرر اور شیریں کلام "ڈاکٹر عبدالسلام اسلم کانپوری" اور جناب مولانا حافظ عبدالواجد صاحب شیخ الحدیث جامعہ دارالسلام عمرآباد ہم سے رخصت ہو گئے، صوبائی جمعیۃ مشرقی یوپی کے امیر اور مدرسہ شمس العلوم کے ناظم مولانا عبدالمبین منظر ۲۷ر اکتوبر ۱۹۸۹ء کو کوچ کر گئے، ان تمام بزرگوں کی داغ مفارقت حواس پر مسلط ہی تھے کہ ۲۵ر نومبر ۱۹۸۹ء بروز شنبہ مغرب کی نماز کے بعد مطابق ۲۴ر ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ کو نشاۃ ثالثہ کا سالار قافلہ مولانا عبدالوحید سلفی و ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ بنارس کی رحلت نے غموں کی چادر کو اور بھی دبیز بنا دیا۔

ان کی وفات سے جماعت اہل حدیث ایک مدبر قائد اور ملت اسلامیہ ایک مخلص اور ممتاز رہنما سے محروم ہو گئی۔ ان کی زندگی بچپن سے لے کر وفات تک صالحیت و بزرگیت اور صلاحیت و کارکردگی کے اعتبار سے قابل رشک رہی، ان کے غم میں ہر آنکھیں اشکبار ہو گئیں، اپنے ہوں یا غیر سبھی انھیں خراج تحسین پیش کر رہے تھے، اور انتقال کے بعد ان کی بے لوث خدمات اور غیر معمولی کارنامے کو قابل رشک شمار کر رہے تھے۔

ان کی شخصیت پر بعض اہم شخصیات کے تعزیتی پیغامات

- محترم بھائی عبدالوحید کی وفات کا صدمہ جماعت و ملت کے ہر فرد کو ہے، میں ان کے بہت قریب تھا، ان کے اخلاق و محبت کی یاد ہمیشہ آتی رہے گی۔　/ ڈاکٹر سید عبدالحفیظ سلفی سابق صدر
- مولانا سلفی جماعت اہل حدیث کے بہت بڑے ستون تھے۔ / پروفیسر ساجد میر، ناظم اعلیٰ جمعیۃ اہل حدیث پاکستان
- امیر جمعیۃ کی خدمات کو ہم خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔　/ رانا شفیق پسروری، صدر اہلحدیث یوتھ فورس۔
- امیر جمعیۃ اہل حدیث ہند کی خبر سن کر ہم بے حد مغموم محزون ہیں۔　/ عبدالہادی برمنگھم، ناظم اعلیٰ جمعیۃ اہل حدیث برطانیہ
- امیر محترم کی بابصیرت قیادت اور سربراہی نے جماعت کی تاریخ میں بلند مقام حاصل کیا۔

عبداللہ مدنی جھنڈانگری، سکریٹری (صفا)

- مولانا کی بارعب شخصیت سے "نصرت بالرعب" کی صفت کا اظہار رہوتا تھا۔ / عبدالحق سلفی، ناظم اعلیٰ جمعیۃ اہلحدیث نیپال
- جماعتی غیرت وحمیت ان کی قابل قدر اور امتیازی شان تھی۔ / رابنائے جامعہ سلفیہ، متحدہ عرب امارات۔
- امیر جمعیۃ اہل حدیث ہند کی وفات عالمی سلفی برادری کے لئے ایک عظیم نقصان ہے۔ / عبدالمالک مجاہد، ریاض۔

جامعہ سلفیہ کی تاسیس سے لے کر زندگی کے آخری لمحات تک ان کی نظامت کے دوران موصوف کی خدمت کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہے، مگر ساتھ ہی دینی، تعلیمی، ملی اور سماجی خدمات میں ان کے اثرات بھی معمولی نہ تھے، مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کی دس سالہ دورِ صدارت وامارت کے درمیان موصوف جماعت کے ہمہ صفت اداروں کے مربی ومحسن اور سرپرست رہے، پیش آمدہ مہمات مسائل کے حل میں موصوف کے تدبر وتفکر کا بہت بڑا دخل رہا ہے۔

جس ذات گرامی پر یہ سطریں لکھی جارہی ہیں، ان کی انفرادی اہمیت وحیثیت بھی غیر معمولی نہیں تھے، ساتھ ہی جب ہم ملی تاثیر اور جماعتی کارکردگی پر نظر دوڑاتے ہیں تو دل دہل جاتے ہیں، اور حواس باختہ ہوجاتے ہیں، موصوف کی شخصیت ایک انجمن ہی نہیں، بلکہ انجمن ساز تھی، جماعت کی تاریخ میں جس محنت ومشقت اور خوش اسلوبی سے رنگ آمیزی کی، ساتھ ہی دست قدرت نے ان کے ہاتھوں سے وہ بڑے بڑے امور سرانجام دلوائے کہ لوگ آج بھی رشک کناں ہیں، موصوف نے اپنی حسن تدبیر سے کبھی بھی خود کو بڑا سمجھنے اور سجانے کی کوشش نہیں کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر میدان میں ان کی سربلندی کی، اور ان کی پیش قدمی کو جماعت کے لئے باعث خیر وبرکت بنایا۔

پیدائش : حضرت مولانا عبدالوحید سلفی بن عبدالحق مرحوم کی پیدائش مدنپورہ بنارس میں ۱۴ رجمادی الآخر ۱۳۴۲ھ مطابق ۲۳ رجنوری ۱۹۲۴ء کو ہوئی، مرحوم اپنے چار (عبدالعلیم مرحوم، عبدالعظیم، عبدالرشید، عبدالقدیر) بھائیوں سے چھوٹے اور اپنے پانچ (حافظ عبدالبصیر، عبدالکبیر، محمد شعیب، محمد صالح اور محمد سلیم) بھائیوں سے بڑے تھے، اور پانچ بہنوں کے درمیان بھی موصوف ممتاز اور قابلِ تعظیم تھے۔

تعلیم : بنارس میں ابتدائی تعلیم پانے کے بعد موصوف اپنے محترم دادا جناب عبدالرحمٰن صاحب سے منسوب جامعہ رحمانیہ بنارس سے منسلک ہوگئے اور آپ نے جامعہ کے آخری درجہ تک تعلیم حاصل کی، آپکے خاص اساتذہ کرام میں مولانا منیر خان صاحب اور مولانا عبدالغفار حسن صاحب رحمانی حفظہ اللہ سابق استاذ حدیث اسلامی یونیورسٹی مدینہ منورہ تھے۔ جامعہ رحمانیہ کی تعلیم کے علاوہ موصوف نے مقامی کالج سے انٹر کیا اور حالات حاضرہ کے مطابق عصری علوم اور انگریزی زبان وتحریر میں مہارت حاصل کی وقت کے مشہور اساتذہ کرام کی تعلیم وتربیت خاندانی شرافت ونجابت اور نیک والدین کی دیکھ کا نتیجہ تھا کہ موصوف بچپن سے بہت ہی نیک صالح اور بردبار تھے، موصوف مدنپورہ بنارس کے ایک تجارت پیشہ سلفی عقیدہ، انتہائی دیندار اور غیرت وحمیت سے سرشار گھرانے کے چشم وچراغ تھے، اور اسی ماحول میں آپ کی تعلیم وتربیت ہوئی، نیک والدین کی تربیت خاندانی شرافت ونجابت اعلا

کردار کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔

جس خانوادہ سے مولانا کا تعلق تھا، اس کی امیری وسرداری، سخاوت وکرم فرمائی، غربا نوازی وعلم پروری اور جاہ وحشمت کا سب کو اعتراف تھا، اس خاندان کے زیادہ تر افراد دینی وجماعتی خدمتوں کی وجہ سے عوام وخواص میں مقبول رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور دست قدرت کی معیت کے بعد ان ہی خاندان کے ایثار وقربانی سے بنارس کی تھوڑی تعداد کے باوجود سربلندی رہی، اور جامعہ سلفیہ کی تاسیس وقیام کے بعد اس خانوادہ سے افراد جماعت کا ربط وضبط اور بڑھ گیا، چہار طرف سے لوگ اپنے مسائل مالی وانتظامی لے کر یہاں پہونچتے اور اکثر وبیشتر افراد اپنے مقاصد میں کامیاب ہوکر خوش وخرم واپس جاتے، ایسے خاندان میں جہاں دولت وثروت اور مال وجائداد کی فراوانی ہوتی ہے، ساتھ ہی کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہیں ہوتا ہے، ایسے حالات میں اکثر وبیشتر لڑکے بگڑ جاتے ہیں، مگر مولانا موصوف اپنی عاجزی وانکساری اور نرم خوئی کے ذریعہ سدا بہار شخصیت بنے رہے، مزاج حد درجہ شگفتہ، چہرہ پر مسکراہٹ، اور خاندانی شرافت ونجابت، گویا موصوف کی امتیازی شان تھے۔

موصوف ابتدا ہی سے مقامی طور پر دینی، جماعتی اور تبلیغی وملی کاموں میں حصہ لینے لگے، اور رفاہی کاموں میں ہاتھ بٹانے میں پیش پیش رہنے لگے۔

خدمات: جامعہ رحمانیہ میں تعلیم مکمل کرنے اور عصری علوم حاصل کرنے کے بعد مولانا موصوف نے اپنا آبائی پیشہ تجارت کو اختیار کیا، اور اس میدان میں کارکردگی اور خوش معاملگی کی وجہ سے خوب زیادہ ترقی کئے، بنارس جو تجارۃً ساڑیوں کی منڈی ہے، وقت امور میں ان کے خاندان کی فرموں کو ایک امتیازی خصوصیت حاصل رہی ہے، یہ حضرات بنارس کے نامی گرامی اور مشہور تاجروں کی فہرست میں شمار کئے جاتے تھے۔

اس خاندان کے عظیم احسانات میں سے ایک خدمت یہ بھی ہے، کہ اس نے اپنی بلند ہمتی، پر عزم حوصلہ اور دوراندیشی سے مرکزی دار العلوم کی تاسیس کا کام سہل کردیا، اور یہیں سے اس عظیم ادارہ کو وہ باصلاحیت مخلص کارکن اور خادم ملا کہ جس نے اپنی جانفشانی اور دوراندیشی سے ادارہ کو چار چاند لگاکر بہت ہی قلیل عرصے میں ملک کے علاوہ بیرون ملک میں شہرت دیا، جامعہ سلفیہ کا قیام عمل میں آیا تو جماعتی ادارے ملکی سطح پر درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہے تھے، اور ان اداروں کے قائدین ومنتظمین کو بیرونی سطح پر کام کے سرانجام دینے کا تجربہ نہ تھا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور مخلصین جماعت کی جدوجہد اور توجہ سے بہت جلد جامعہ سلفیہ نے بیرونی اسلامی دنیا سے روابط استوار کرلیا، اور اس کی زندگی میں یہ ایک نیا تجربہ تھا، اُسے

تقویت دینے کے لئے دوراندیشی، معاملہ فہمی اور بالغ نظری کی شدید ضرورت تھی، مولانا موصوف نے اپنی خداداد صلاحیتوں اور گوناگوں اوصاف و کمالات کو کام میں لاکر جامعہ سلفیہ کی بیرونی علمی تعلقات کو مزید استوار کیا، اور اس طرح فارغین طلبہ اور متعلقین کے لئے علمی ترقی کے وسیع راستے سامنے لائے، متعدد تعلیمی اداروں سے استفادہ کے مواقع اور علمی مذاکرات و اجتماعات میں شرکت کے مراحل کو آسان بنادیا، اسی کے ساتھ جامعہ کو متعدد کانفرنسیں منعقد کرنے کا حوصلہ ملا۔

ملک کے بٹ جانے کے بعد جماعت کو ایک اہل حدیث یونیورسٹی کی اشد ضرورت محسوس ہوئی، ۱۸ رنومبر ۱۹۶۱ء میں جماعت اہل حدیث نے اجلاس عام آل انڈیا اہل حدیث کانفرس کے بعد مرکزی دارالعلوم کے قیام کا فیصلہ کیا، جس کی تاسیس و قیام کے لئے شہر بنارس منتخب ہوا، جماعت کی امید اور ادارہ کی نظامت کا انتخاب آیا تو قرعۂ فال رجب ۱۳۸۳ھ میں مولانا عبدالوحید سلفی کا نام نکلا، محدث ہند فخر جماعت شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ مبارکپوری حفظہ اللہ کی امامت اور مولانا موصوف کی نظامت، دونوں شخصیتوں کی حسن تدبیر اور خوش انتظامی نے اس ادارہ کو وہ اعلیٰ مقام بخشا کہ کسی بھی فرد سے اس کی حقیقت و حیثیت مخفی و پوشیدہ نہیں رہی۔

انسان کی ذات میں بہت سے محاسن و کمالات رہتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جملہ محاسن نمایاں طور پر لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جائیں، حالات کے مطابق آدمی کی شخصیت ابھرتی ہے اور اس کے جوہر و خوبی نمایاں ہوتے ہیں۔

جامعہ سلفیہ کے میدان سے موصوف نے پوری جماعت کی نمائندگی کی، اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا، ملی و جماعتی زندگی میں داخل ہونے کے بعد مولانا عبدالوحید سلفی کے محاسن ان سے ملنے اور ان سے سننے والے ہر شخص کو نمایاں طور پر متأثر کرتے تھے، ان میں ان کا تدین، تقویٰ شعاری، سنت رسول پر فدائیت، صبر و تحمل، مردم شناسی اور بالغ نظری، وقار و وضع داری، خوش خلقی و ملنساری اور انتھک جدوجہد نمایاں نظر آتے ہیں، کبھی کبھی ان کی زندگی میں ان خدمات کی ایسی جلوہ گری معلوم ہوتی تھی کہ متعلق شخص دیکھ کر ششدر رہ جاتا تھا۔

مولانا کو تنظیمی امور اور جماعتی تنظیم سے گہری دلچسپی رہی، موصوف کا شمار ریاست کے ممتاز ذمہ داران جمعیت میں سے ہوتا تھا، اپنی حسن تدبیر، جماعتی وابستگی اور خدمات کے پیش نظر علامہ عبدالوہاب آروی کے دو صدارت میں ۱۵ رنومبر ۱۹۶۳ء کو مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی مجلس عاملہ کے رکن نامزد ہوئے، اس کے پیشتر آپ خصوصی مدعوئین کی حیثیت سے مجالس میں شریک ہوتے رہے، اور مجلس عاملہ میں آپ کی رائے اور مشورہ کو بہت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس درمیان میں موصوف مرکزی جمعیۃ کی دستور ساز کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔

اجلاس شوریٰ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند ۱۹۷۲ء میں جب نمونۂ سلف حضرت مولانا سید عبدالحفیظ سلفی حفظہ اللہ مرکزی جمعیۃ کے صدر منتخب ہوئے تو مولانا موصوف کو نائب صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا، اجلاس شوریٰ منعقدہ یکم و دو دسمبر ۱۹۷۹ء میں محترم ڈاکٹر صاحب کے استعفیٰ کے بعد مرکزی جمعیۃ کی ایڈھاک کمیٹی نے آپ کو صدر منتخب کیا، اور اجلاس شوریٰ منعقدہ ۱۹۸۰ء میں ۲۷ راپریل کو دہلی میں آپ مرکزی جمعیت کے صدر منتخب ہوئے اور اجلاس شوریٰ منعقدہ ۱۱رمئی ۱۹۸۵ء کو بنگلور میں موصوف کو دوبارہ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کا متفقہ طور پر امیر منتخب کیا گیا۔

موصوف کی ہی ذات غیر متنازعہ تھی، جس پر پوری جماعت متفق تھی، موصوف نے اپنی انتہائی مصالحانہ انداز میں پوری جماعت پر اپنا کنٹرول رکھا، اور پوری جماعت نے موصوف کا ساتھ دیا، انہوں نے مختلف صوبوں کے دورے کئے، اور جمعیۃ کو ایک متحرک اور فعال تنظیم بنانے میں اہم کردار ادا کیا، موصوف ہمہ گیر اوصاف و کمالات کے مالک تھے، زہد و تقویٰ، شرافت دپاکیزگی، حکمت و دانائی، علم و تدبر اور تواضع و انکساری میں وہ فقید المثال تھے، اور صبر و ضبط، تحمل و بردباری اور ثبات و استقامت میں وہ مستحکم چٹان تھے، کہ اس دور حاضر میں ان کی مثال بہت مشکل ہے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو فکر ارجمند کے ساتھ دردمند دل بھی عطا کیا تھا۔ آپ نازک و اہم حالات کو حکیمانہ طرز پر سلجھانے کا ملکہ رکھتے تھے، ۱۹۸۰ء میں جب ایک مسئلہ کی بنیاد پر طلبہ میں ایک ہیجان برپا ہوا تو اس وقت آپ نے انہیں دوراندیشی اور مومنانہ بصیرت سے راضی کیا، اور چشم نم کے ساتھ انہیں نصیحتوں سے نواز کر راضی برضا کیا۔ اس طرح نہایت خوش اسلوبی سے جامعہ کو ایک بڑے بحران سے نکال کر عربی مدارس کے منتظمین اور علم دین حاصل کرنے والے طلباء کے لئے ایک نادر اور اعلیٰ مثال قائم کر دیا، یہی اسباب تھے کہ طلباء اور اساتذۂ کرام جملہ وابستگان اور لواحقین و متعلقین کے دلوں میں آپ کی عزت و احترام دوبالا ہوگئی تھی۔

آپ ثروت و وجاہت، فکر و تدبر، دوراندیشی اور معاملہ فہمی میں ممتاز تھے، شرافت و نجابت، اخلاص و متانت، تقویٰ و پرہیزگاری، شفقت و محبت اور عنایت و رواداری میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے، جامعہ سلفیہ کی تاسیس سے لے کر تقریباً (۲۵ برس) ربع صدی تک مخلصانہ جدوجہد سے آپ نے علمی و تعلیمی دنیا میں شہرت دوام بخشا، آپ نے جامعہ کو عظمت و رفعت کے مقام پر پہونچانے میں اور مدارس کے مقابلہ میں اپنی پوری توانائی صرف کر دی۔

آپ دینی و دنیاوی دونوں نعمتوں سے مالا مال تھے، تجارت کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ دینی خدمات کی انجام دہی ہر کس و ناکس کی بات نہیں، یہ شرف و بزرگی انہیں خاصان خدا کے ہاتھوں وجود پذیر ہوتی ہیں، جن کے دل و جگر مذہب و ملت کے درد و غم سے آشنا ہوتے ہیں، اور جو دنیا کی محبت و لالچ سے اور اس کی آلائشوں سے اپنے آپ کو دور رکھتے ہیں۔

کارنامے : روشن اور بارعب چہرہ، عقل ودانش کا پتلا، صبر وتحمل کا پیکر، استقلال واخلاص کا مجموعہ، حسن انتظام کا ماہر، انسانیت کا دردمند دل اور ان سب سے بڑھ کر سلفیت کا شیدائی، قافلۂ کتاب وسنت کا سپہ سالار،

مرحوم اپنے حسن تدبیر اور جذبۂ اخلاص وعمل سے مادرعلمی جامعہ سلفیہ کو بام عروج پر پہونچایا، جامعہ کو عالمی شہرت حاصل کرنے میں آپ کی کاوشوں اور قربانیوں کا بڑا دخل ہے۔

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی نشاۃ ثالثہ میں ان کی جدوجہد کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، آپ کی ذات سے جمعیت نے تاریک حجروں اور زاویۂ خموں سے نکل کر دارالحکومت قلب دہلی میں اہل حدیث منزل کی شکل میں اپنا مستقر بنایا، اور برصغیر ہند وپاک سے نکلتے ہوئے عالمی سلفی قافلہ سے اپنا رشتہ استوار کرلیا، بے شک جمعیت وجماعت کی انگڑائی، نئی لگن، نئے حوصلے، اور نئے سفر میں آپ کی فکر وعمل کا بڑا دخل ہے، دس سال مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے امیر بھی رہے، موصوف نے اپنے اس دس سالہ دور صدارت وامارت میں جماعتی اختلافات اور تنظیمی انتشار کے مٹانے میں مخلصانہ کردار ادا کیا، اور اسے پوری طرح منظم اور فعال بنانے میں اپنی خداداد صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا۔

جماعتی وتنظیمی اور تعلیمی اداروں کی رکنیت وسرپرستی کے علاوہ موصوف متعدد دعوتی، تعلیمی، ملی، سماجی اور رفاہی اسلامی اسلامی اداروں سے بھی منسلک رہے۔ مسلم پرسنل لاء بورڈ کے تاسیسی اجلاس میں موصوف نے جامعہ سلفیہ کی نمائندگی کی، یوپی حج کمیٹی اور آل انڈیا مومن کانفرنس کے بھی موصوف رکن رکین رہے۔

موصوف نے سفر حج کے علاوہ جامعہ سلفیہ اور جماعتی تعارف کے سلسلہ میں سعودی عرب، قطر، متحدہ عرب امارات اور کویت کے غیر ملکی سفر بھی گئے، وہ صرف مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے امیر جامعہ سلفیہ کے ناظم اعلیٰ اور جماعت اہل حدیث کے قائد ہی نہ تھے، بلکہ وہ دیگر ملی اور سماجی تنظیموں سے بھی دلچسپی رکھتے تھے، بعض کے ارکان بھی تھے، اور ان کے مشوروں کو خاص اہمیت بھی حاصل رہتی تھی۔

عرصۂ دراز سے موصوف کے گھٹنے میں درد رہتا جو ایک مستقل مرض تھا، مگر اس کے باوجود موصوف اپنی تمام ذمہ داریوں کو نبھاتے اور سفر بھی کرتے رہے۔

اندرون ملک متعدد اہم جماعتی، دعوتی اور تبلیغی کانفرنسوں کے علاوہ موصوف علیہ الرحمہ نے رابطہ عالم اسلامی کے زیر اہتمام پہلی عالمی پیغام مساجد کانفرنس مکہ ۱۹۷۵ء جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے زیر اشراف " المؤتمر العالمی الاول لتوجیہ الدعوۃ واعداد الدعاۃ " فروری ۱۹۷۷ء، اور شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ کے زیر اہتمام منعقدہ " المؤتمر العالمی الاول للتعلیم

الاسلامی ۱۹۷۷ء میں شرکت کی ۔

جامعہ سلفیہ کی ۲۵ سالہ جس طرح اخلاص وللّٰہیت ، محنت وجانفشانی اور ایثار وقربانی سے انہوں نے اس شجر نورستہ کو سینچا ، اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے دقت نظر کی اشد ضرورت ہے ، جامعہ کی یہ تاریخ ان کی ذات سے اس طرح وابستہ ہے کہ دونوں کو الگ کرکے صحیح حقیقت کا ادراک نہیں کیا جاسکتا ، موصوف نے ادارہ کو اور بعد کے دور میں مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کو بھی اپنا محور اور مرکز نگاہ بنالیا ، تجارتی زندگی کی مصروفیت کے باوجود وقت بچا بچا کر دونوں اداروں کی خدمت کرتے رہے ، اور اس خدمت میں اس قدر منہمک ہوئے کہ آپ کی صحت متاثر ہوگئی ، ڈاکٹروں نے معائنہ کے بعد آرام کرنے کا مشورہ تفویض کیا ، اور عمل کے اوقات کو کم کرنے کی سخت تاکید کی ، لیکن زندگی میں اس کا موقع نہ مل سکا ۔

موصوف کے دور صدارت کا سب سے اہم کارنامہ اہل حدیث منزل کی خرید ہے ، جس کا پورا سہرا موصوف کی ذات اور ان کے دست راست حضرات پر جاتا ہے ۔

یکم اگست ۱۹۸۷ء کو حجاج کے قالب میں ایرانیوں نے حرمین کی عزت وعصمت کو تار تار کرنا چاہا ، اور اس کی تقدسیت پر کیچڑ اچھالنا چاہا ، اس افراتفری میں کتنے (حجاج کرام) اپنی جانیں بچانے کو راستہ ڈھونڈنے لگے جس کی بدولت کتنے حجاج کرام بیت اللہ اور حدود حرم میں شہید ہوگئے ، مولانا موصوف نے شاہ فہد عبدالعزیز آل سعود حفظہ اللہ سے اس کی حقیقت جاننی چاہی تو شاہ فہد نے موصوف کو ٹیلی گرام کے ذریعہ حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے عالم اسلام اور خصوصیت کے ساتھ حرمین شریفین کی حرمت وعزت کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھنے والوں کو حقیقت سے باخبر کیا ، موصوف ملک کے دانشور اور چیدہ علمائے کرام کو مدعو کئے ، تاکہ یہ علمائے کرام حرمین شریفین کی تقدیس کو مسلمانان ہند کے سامنے ظاہر کریں ، اور اس میں تخریب کاری کرنے والوں کو شریعت کے کٹہرے میں لاکھڑا کریں تاکہ دنیا جان لے کہ حجاج کے قالب میں ملبوس ایرانی شرپسند کیا گل کھلانے کا ارادہ رکھتے ہیں ، ۲۹ رنومبر ۱۹۸۷ء کو " حرمت حرمین شریفین کنونشن " ہونے والی کنونشن میں موصوف نے اپنی صدارت کی حیثیت سے حکومت سعودی پر عدم تحفظ کی لگائی گئی بے بنیاد الزام ، اور ایرانیوں کی پھیلائی شورش اور اس کے شکار ہونے والوں اور بے خبر انسانوں کو ان الفاظ میں تنبیہ کی ۔

دوران تقریر میں : " میں یہ بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ حرمین شریفین کو بین الاقوامی کنٹرول میں دینے کی بات کرتے ہیں ، وہ انتہائی ناعاقبت اندیشی کا ثبوت دے رہے ہیں ، ان کے ذہن میں یا تو خود کوئی فتنہ پرورش پا رہا ہے ، یا وہ سادگی میں کسی فتنہ کا شکار ہیں ، کون نہیں جانتا ہے کہ دنیا کی مسلم اقلیتیں بالعموم اپنے اپنے ملکوں میں

سرے درجہ کی شہری بن چکی ہیں، یا غلامی اور غلامی سے بھی بدتر حالات سے دوچار ہیں، پھر نمائندگی کے لئے ان کی باہمی کشمکش اس پر مستزاد، باقی رہے آزاد اسلامی ممالک تو صرف یہی نہیں کہ آپس میں ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں بلکہ بیشتر ممالک اندرونی طور پر بھی مختلف سیاسی پارٹیوں کی اتنی شدید رقابتوں اور کشمکش کا شکار ہیں کہ آئے دن قتل وخونریزی کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، پھر ان ممالک میں کہیں بھی اسلامی نظام حکومت رائج نہیں ہے، بلکہ بہت سی حکومتیں تو کھلم کھلا اسلامی نظام حکومت کی دشمن ہیں، اس لئے ہر ہوشمند آدمی سمجھ سکتا ہے کہ اگر ایسے لوگوں کو حرمین کی پاسبانی کا کام سونپ دیا گیا، تو یہاں اسلامی نظام کا باقی بچ جانا تو دور کی بات رہی، امن وامان بھی قائم نہ رہ سکے گا، بلکہ یہ دیار مقدس مسلمانوں کی باہمی کشمکش اور کشت وخون کا اکھاڑہ اور اسلام دشمن طاقتوں کی سازشوں کی آماجگاہ بن کر رہ جائیگا

اس لئے میں صاف صاف اعلان کرتا ہوں کہ سعودی حکومت جسے اللہ نے پاسبانیٔ حرم کا اعزاز بخشا ہے، تنہا بلا شرکت غیرے وہی حجاز مقدس کے نظام حکومت کی نگرانی وانصرام کی حقدار ہے، اور فریضۂ حج کی ادائیگی کا انتظام بھی اسی کے اختصاصات میں سے ہے، ہم اس میں کسی بھی دوسری طاقت اور دوسرے نظام کی دراندازی اور شمولیت کو قطعی غلط اور اس خطۂ پاک کے تقدس کے لئے خطرہ سمجھتے ہیں۔ (اقتباس)

موصوف کے دور امارت کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ "عالمی مقابلہ قرأت" میں جب امام حرم تشریف لائے تو جمعیت اہل حدیث میں بھی تشریف فرما ہوئے، جمعیۃ اہل حدیث منزل میں امام وخطیب مسجد حرام مکہ مکرمہ "محمد بن عبداللہ السبیل حفظہ اللہ" کا خطاب۔

دوران خطاب، "یہی وہ مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند ہے جس کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا جس کے موجودہ امیر حضرت مولانا عبدالوحید سلفی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، وہ اور ان کے آباء واجداد کبھی بھی سلفی دعوت ومنہج کی آبیاری کے لئے کسی سے پیچھے نہیں رہے، اور آج بھی یہ لوگ اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اہل حدیث مدارس کا تعلیمی جال، قریہ قریہ دعوتی اور تبلیغی سرگرمیاں، وعظ وارشاد، تعلیم وتربیت کی مجالس، دہلی، بنارس، مئو، بمبئی، مالیگاؤں مدراس اور کیرالا میں اس جماعت کے تعلیمی وتصنیفی ادارے اور جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم بنارس) کی تاسیس اور قیام جمعیۃ اہل حدیث کی مسلسل اور کارکردگی کا نتیجہ ہیں۔" (یکم نومبر ۱۹۸۸ء)

اور مہمان محترم کے ہاتھوں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ لائبریری اور شیر پنجاب علامہ ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری میٹنگ ہال کا افتتاح۔ یکم نومبر ۱۹۸۸ء۔

یکم و دو اکتوبر ۱۹۸۸ء کے اجلاس میں صبح ۹ بجے تا شب ۹ بجے کے دوران مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے فیصلے دفعہ ۷ کے تحت اہل حدیث ریلیف فنڈ اور ویلفیر فنڈ جس کے ذریعہ یتیموں اور بیواؤں کی مدد ہو سکے، اور ساتھ ہی دفعہ ۸ کے تحت پندرہ روزہ ترجمان کو ہفت روزہ بنانے اور دفعہ ۱۰ کے تحت ایک ہندی ماہنامہ کا اجراء، یہ سب اہم کارنامے آپ کے دور امارت کے فیصلے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد اس صدی کے پانچویں دھے کے شروع میں قائد جماعت حضرت علامہ مولانا عبدالوہاب آروی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں جب سلفیان کی صف بندی ہوئی، اور مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند (آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس) کے نئے دور کا آغاز ہوا، تو مسلک اہل حدیث کے داعی، کاروان سلف کے ترجمان، فکر محدثین کے علمبردار، سلفیان ہند کی متحدہ آواز اور مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند کے نقیب کی حیثیت سے ماہنامہ "ترجمان ہال جماعت" بن کر مطلع صحافت پر نمودار ہوا۔

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے آرگن کی حیثیت سے سب سے پہلے ترجمان ایک ماہنامہ کی شکل میں آیا، مگر ایک کل ہند جماعت کے لئے صرف ایک ماہنامہ ناکافی تھا، اس لئے اجلاس عاملہ جنوری ۱۹۵۷ء میں اسے پندرہ روزہ یا ہفتہ وار بنانے کی تجویز سامنے آئی، ماہنامہ سے ہفتہ وار کے بجائے پہلے پندرہ روزہ اشاعت کی ابتدا ہوئی۔

ستمبر ۱۹۶۲ء کے اجلاس عاملہ میں پھر ترجمان کی ہفتہ وار اشاعت کا مسئلہ زیر غور آیا، اور عاملہ نے اسے شوریٰ میں پیش کرنے کی سفارش کی، اور شوریٰ نے بھی اس کی ہفتہ وار اشاعت کی منظوری دے دی، مارچ ۱۹۶۳ء میں اس کے ہفتہ وار بنانے کے لئے ایک سات رکنی کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، جولائی ۱۹۶۳ء میں اجلاس عاملہ نے پندرہ روزہ اہل حدیث کو مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند کے تحت ہفت روزہ اور پندرہ روزہ ترجمان کو ایک علمی ماہنامہ کی شکل میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا، جون ۱۹۸۰ء میں جریدہ ترجمان، صراط مستقیم، منہاج اور تسنیم میں سے کسی ایک نام مرکزی جمعیۃ کے ہفتہ وار آرگن کے اشاعت تجویز منظور کی، مگر بعد میں پندرہ روزہ جریدہ ترجمان کا اجراء عمل میں آیا۔

پھر مئی ۱۹۸۳ء اور آخری بار دسمبر ۱۹۸۳ء میں جریدہ ترجمان کے ہفتہ وار بنانے اور اس کا نیا ڈیکلریشن داخل کرنے کی منظوری بھی مجلس عاملہ نے دی۔

لیکن ان تمام ادوار میں کسی نہ کسی رکاوٹ اور مشکلات کی وجہ سے جریدہ پندرہ روزہ ہی رہا، پھر بھی جمعیت کے احباب کا برابر اصرار رہا کہ جماعت کی آواز بلند کرنے اور اس میں حرکت و فعالیت اور تیزی لانے کے لئے جریدہ ترجمان کو ہفت روزہ بنانا بہت ضروری ہے۔ عاملہ کے فیصلہ کے مطابق یکم جولائی ۱۹۸۹ء سے اس کی ہفتہ واری اشاعت کی تیاری مکمل کر لی گئی تھی، مگر عین وقت پر

ایک قانونی رکاوٹ پیدا ہوجانے کی وجہ سے اسے ہفتہ وار شائع نہ کیا جاسکا، بلکہ مولانا مرحوم کے خواب کی تعبیر عیسوی سال ۱۹۹۰ء کے آغاز سے آپ کے ہمنشین اور خلیق الصدق حضرت مولانا مختار احمد ندوی حفظہ اللہ کی امارت سے ہوا، اور ہندی ماہنامہ —— "اصلاح سماج" ۔ مئی ۱۹۹۰ء سے جاری ہوا۔

اس مادی والحادی دور میں جبکہ قوم کا اثاثہ نوجوان بھی اپنی حیثیت کو کھو کر یورپ کی پھیلائی رذائل میں گم ہونا چاہتے تھے تو ان کی حقیقت کو اجاگر کرنے اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوکر راہ للہ اپنی جوانی کو لگا دینے میں موصوف کا اہم کارنامہ ہے۔

مولانا موصوف نے اپنے خطبۂ صدارت میں ملک کی حالت کا جائزہ لے کر نوجوان کو خطاب کرتے ہیں:۔

(دوران خطاب) " ملک کی آبادی کا ایک معتد بہ حصہ مختلف عوامل ومحرکات کے تحت اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے، اور اس کے احکام وتشریعات میں جو محاسن وکمالات مضمر ہیں ان کا تجربہ کرنا چاہتا ہے۔ خود مسلمانوں میں دعوت وتبلیغ کی ضرورت پہلے سے زیادہ ہے، ان کی ایک بڑی تعداد شرک وبدعت کے جال میں پھنسی ہوئی ہے، مغرب کی مادی تہذیب اور نت نئے نظریات وافکار نے بھی پڑھے لکھے مسلم طبقہ کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

شبان اہل حدیث کی داری بڑی ہے، ہم نظریۃً بالکتاب والسنۃ کے داعی ہیں، اور آج زمانہ کو اسی دعوت کی تلاش ہے، کیونکہ دیگر اصول ومقاصد زمانہ کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں، آج کا ذہن شخصیت پرستی وجانب داری کا قائل نہیں ہے، وہ چاہتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جن عقائد واحکام کی تعلیم دی تھی وہی اس کے سامنے پیش کیے جائیں اور انھیں کی سب کو دعوت دی جائے۔"

(اقتباس منعقدہ ۲۸، ۲۹ صفر ۱۴۱۰ھ، ۳۰ ستمبر ویکم اکتوبر ۱۹۸۹ء، سپرو ہاؤس نئی دہلی، (کل ہند شبان اہل حدیث کنونشن)۔

موصوف کی سوچ ہمیشہ مثبت وتعمیری رہی، اپنی زندگی کے آخری ایام میں اگرچہ موصوف کو سخت تکلیف رہی مگر دفتر پر مکمل اعتماد کے پیش نظر کام کو تیزی سے بڑھانے کے لئے ہدایات دیتے رہے، یہی وجہ ہے کہ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند دفتر آج ایک نئی شان میں ہے۔

ان کے بعض معاملات، اقدامات اور فیصلوں سے کسی کو اختلاف تو ہوسکتا ہے مگر اسے مسترد نہیں کیا جاتا ہے، فراغت کے بعد اگرچہ آپ مستقل طور پر خاندانی تجارتی پیشہ سے منسلک رہے مگر اس کے ساتھ ہی عدیم الفرصتی کے باوجود آپ نے نظامت کی ذمہ داری اور جمعیۃ کے کاز کو خوش اسلوبی سے انجام دیا، ساتھ ہی موصوف نے جوانی ۱۹۵۹ء سے لے کر آخری لمحات ۲۷/ اکتوبر ۱۹۹۸ء

کی نماز صبح تک مسلسل بنارس کی سب سے بڑی اہل حدیث جامع مسجد طیب شاہ مدنپورہ میں پنجوقتہ نمازوں کی امامت کے فرائض انجام دیتے رہے، زندگی کی آخری دس برسوں کے اندر پاؤں میں تکلیف کی زیادتی کے باوجود فجر نماز کی امامت آپ ہی کرتے رہے۔

۱۹۸۹ء کے اواخر میں موصوف کو دل کا دورہ پڑا جس کی وجہ سے آپ بہت کمزور ہوگئے، ۲۷ راکتوبر ۱۹۸۹ء کو اپینڈکس کا درد شروع ہوا، اور ۲۹ راکتوبر کو آپریشن ہوا، جو بہت حد تک کامیاب رہا جس کی وجہ سے کافی حد تک تندرستی آگئی تھی مگر مسلسل حوادث سے والدہ ماجدہ محترمہ بی بی خدیجہ کا بروز سہ شنبہ ۲۲ ربیع الاول ۱۴۱۰ھ م ۲۳ راکتوبر ۱۹۸۹ء انتقال، بعد میں خود اپنی صحت کی خرابی اور آپریشن، انھیں دنوں میں موصوف کی اہلیہ کا اسی اسپتال میں گردے کا آپریشن، وسط نومبر بنارس میں فرقہ وارانہ فساد کے ایام میں ان کے چھوٹے حقیقی بھائی کی وفات اور تجہیز وتکفین میں عدم شرکت کا غم اور جمعیۃ وجامعہ کے مسائل کے بوجھ سے دل ودماغ سخت متاثر ہوگئے، دل پر سخت چوٹ پڑا، موصوف کے ہوش وحواس آخر وقت تک درست تھے۔

جامعہ سلفیہ اور جمعیت اہل حدیث کے سربراہ کی حیثیت سے موصوف کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا، باہم ایسی صورت پیش آسکتی ہوگی جس سے کسی طرح کا تکدر پیدا ہوگیا ہو، لیکن مولانا موصوف اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ تجربہ نے ثابت کردیا کہ اختلاف کبھی ان کا مثبت ومنفی پہلو رکھتا تھا، جماعت پر چونکہ ان کا بہت بڑا حق ہے، اس لئے ہم مرحوم کے لئے اسلامی تعلیم کے مطابق دعائے خیر کریں، اور ان کے مخلصین اور صحیح جانشین کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعائے خیر کریں۔

وفات۔ مرحوم کی موت ۲۵ رنومبر ۱۹۸۹ء ہفتہ کی شام مغرب کی نماز کے بعد بنارس ہندو یونیورسٹی کے اسپتال میں (۶، ۱/۲) ساڑھے سات بجے ہوگئی، پس ماندگان میں بیوہ ۲ رصاحبزادے اور چار صاحبزادیاں اور ایک بڑے خاندان کے علاوہ پوری ملت سلفیہ کو سوگوار چھوڑا۔

بالآخر مولانا موصوف اپنی زندگی کی پینسٹھ بہاریں دیکھ کر ۲۶ رنومبر ۱۹۸۹ء کو منوں مٹی کے نیچے ابدی نیند سو گئے۔

اللہم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ وابدلہ واغسلہ بالماء والثلج والبرد۔

مولانا عبدالوحید سلفی کی دینی، مسلکی، جماعتی اور ملی خدمات کو خراج تحسین۔

" اہالیان دہلی کا تعزیتی اجلاس مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے امیر مولانا عبدالوحید صاحب سلفی کی وفات پر اپنے انتہائی قلبی رنج والم اور قلق کا اظہار کرتا ہے، ان کی وفات سے ہندوستان ہی کی جماعت اہل حدیث کو غیر معمولی نقصان نہیں پہونچا بلکہ پوری ملت سلفیہ شدید صدمہ سے دوچار رہے، حضرت مولانا عبدالوحید صاحب اپنی طبیعت کی سادگی اور خاندانی شرافت ونجابت کا نمونہ تھے، زہد وتقویٰ صبر وتحمل، عزیمت واستقامت اور اصابت رائے جیسی صفات نے انھیں ایک معزز اور ہر دل عزیز شخصیت بنا دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ انہیں صرف جماعتی حلقوں ہی میں نہیں بلکہ تمام اسلامی، ملی، سماجی اور سیاسی حلقوں میں انتہائی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

بلاشبہ ان کی وفات سے نہ صرف جامعہ سلفیہ بنارس کے اور جمعیۃ اہل حدیث ہند اپنے ایک مدبر قائد اور مخلص رہنما سے محروم ہوگئی، بلکہ ملت اسلامیہ ملک وملت کا ایک سپوت کھو بیٹھی ہے۔

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے دور امارت میں ان کی خدمات کو کسی طور پر بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے زیر سرپرستی جامعہ سلفیہ بنارس کے وہ معمار اول تھے، آج جامعہ انتہائی زیرک منتظم اور تجربہ کار ناظم سے محرومی کے باعث حزین وغمگسار ہے۔

آج یہ اجلاس تحریک اہل حدیث کی بالادستی جمعیۃ وجامعہ کی تعمیر وترقی اور ملک وملت کے لئے ان کی عظیم الشان خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اسے عالم اسلام کا ایک عظیم خسارہ تصور کرتا ہے۔ اور بارگاہ ایزدی میں دعا گو ہے کہ رب العالمین ان کی خدمات کو قبول فرمائے، نیز ان کے درجات کو بلند کرے، اور جمعیۃ وجامعہ کو ان کا نعم البدل عطا کرے، پوری ملت سلفیہ اور ... پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے آمین یارب العالمین "

(۲۷ نومبر ۱۹۸۹ء، اہل حدیث منزل دہلی، بعد عصر)

مولانا مختار احمد ندوی نے اجلاس کے آغاز میں اپنے ابتدائی کلمات میں امیر محترم مولانا عبدالوحید سلفی رحمۃ اللہ علیہ کی اجلاس میں عدم موجودگی پر اظہار غم کرتے ہوئے فرمایا: " آج ہم جس حادثہ سے دوچار ہوئے ہیں اور جو المناک گھڑی ہمارے سامنے آئی ہے وہ انتہائی تکلیف دہ ہے، ایک مومن قضائے الٰہی پر ایمان رکھتا ہے، ہم اللہ رب العزت کے اس فیصلے پر صابر وشاکر ہیں اور وہی ہم کو ہمت دے گا کہ ہم اس صدمہ کو برداشت کر سکیں۔

امیر جمعیۃ حضرت مولانا عبدالوحید سلفی کی رحلت بہت بڑا جماعتی خسارہ ہے، اور ہم ان کی کمی کو جلدی نہ بھول سکیں گے ان کی محبت کی یادیں تا دیر ہمارے دلوں میں باقی رہیں گی۔

موصوف نے امیر محترم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ پینتالیس سالہ پرانے روابط اور گہرے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کی جماعتی اور ملی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا، انہوں نے بتایا کہ ہمارے برسہا برس سے جگری اور قلبی تعلقات تھے، کئی دفعہ مختلف قسم کے حالات پیدا ہوئے اور بحرانی دور آیا مگر ہم لوگ اس کی پرواہ کئے بغیر باہم مربوط رہے۔

موصوف نے اپنے کلمات کو مختصر کرتے ہوئے اس بات کا اعادہ کیا کہ مولانا کے مشن کو جاری رکھیں گے اور جماعتی وتنظیمی کاموں کو شورائی انداز میں بڑھانے اور اس کی تکمیل کے لئے جدوجہد کرتے رہیں گے، انہوں نے اپنے رفقاء سے کہا کہ اس خسارہ کو پُر کرنے کے لئے ہمیں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہئے۔

آج پوری جماعت کی نظریں ہم پر لگی ہوئی ہیں، اور وہ ہمارے فیصلوں کی منتظر ہیں، انہوں نے انتہائی غمناک لہجہ میں مولانا سلفی کی کمی محسوس کرتے ہوئے ان کے لئے دعائے مغفرت کی۔

(۷ دسمبر ۱۹۸۹ء، مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی مجلس عاملہ کا ایک ہنگامی اجلاس، زیر صدارت مولانا ندوی)

"آج کی ہماری یہ ماہانہ نشست رنج والم اور فرحت ومسرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ منعقد ہو رہی ہے، ہم سب سے پہلے جمعیۃ اہل حدیث ہند کے امیر حضرت مولانا عبدالوحید سلفی کے سانحۂ ارتحال پر اپنے گہرے رنج والم کا اظہار کرتے ہیں۔

مرحوم بنارس کے ایک معروف دین دار، علم پرور، علماء نواز سلفی تاجر گھرانہ سے تعلق رکھتے تھے، ان کا قائم کردہ پرشکوہ ادارہ " الجامعة السلفية " ہندوستان کی جمعیۃ اہل حدیث کے لئے ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے جس کے مرحوم یوم تاسیس سے تاحیات ناظم اعلیٰ رہے، ہم ارکان جمعیۃ اس ناتلافی عظیم نقصان میں برابر کے شریک ہیں، اور دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو ان علمی ودینی ملی وجماعتی کارناموں کو شرف قبولیت عطا فرما کر مغفرت فرمائے، اور جنۃ الفردوس کا مستحق بنائے۔ ع

خدا بخشے بڑی ہی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

(۱۰ جنوری ۱۹۹۰ء، محمد عبدالرحمٰن ندوی کے استقبالیہ کلام سے، بمقام دوحہ قطر)

ہمارے ناظم صاحب
ایک تاثر

از، مولانا خورشید احمد سلفی،
استاذ حدیث جامعہ سراج العلوم جھنڈا نگر
نیپال۔

ادارۃ البحوث الاسلامیۃ کے ذمہ داران قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے فخر جماعت، محسن ملت، معمار قوم حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سلفی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات وخدمات، کمالات پر مشتمل ماہنامہ۔ محدث۔ بنارس کی خصوصی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے، اس سے ان کی زندگی کے حالات، جزئیات، کلیات، مادرعلمی جامعہ سلفیہ کے قیام وبنا، کی تاریخ نیز جماعت اہل حدیث ہند کے مدوجزر کے ایک حصہ یعنی کم ازکم آٹھویں نویں دہائی کی تاریخ دستاویزی شکل میں منصہ شہود پر آجائے گی،

اگر یہ بات صحیح ہے، اور یقیناً صحیح ہے کہ آنے والی نسلیں اپنے بزرگوں کے کارناموں اوران کے نقوش زندگی سے سبق حاصل کرتی ہیں، اور اپنے حال ومستقبل کے خطوط مرتب کرتی ہیں، تواس میں کوئی شک نہیں کہ اہل حدیثان ہند کی آئندہ نسلیں مرحوم کے کارناموں کو اپنے لئے سرمایۂ افتخار تصور کریں گی، اوراپنا مستقبل سنوارنے میں ان کی زندگی سے روشنی حاصل کریں گی۔ ان شاءاللہ

ہمارے ناظم صاحب کی شخصیت جامع کمالات ومجموعہ صفات تھی، ذہانت، بردباری، معاملہ فہمی تدبر ودوراندیشی ان تمام چیزوں میں قدرت نے آپ کو وافر حصہ عطا کیا تھا، آپ جماعت وجمعیۃ کی آبرو تھے، موصوف نے وہ روشن کارنامے انجام دیئے جس سے سلفیان ہند کا سر اونچا ہوا، اگر سرسید احمد نے ملت اسلامیہ ہندیہ پر عظیم احسان کیا کہ مسلمانوں کو پسماندگی وتنزل سے نکالنے کے لئے انتھک جدوجہد کرکے مسلم یونیورسٹی قائم کی، جس کا احسان مند ایک زمانہ ہے، توجماعت اہل حدیث کو فروغ واستحکام بخشنے اور انہیں ان کا کھویا ہوا مقام واپس دلانے کے لئے محترم ناظم صاحب نے جامعہ سلفیہ بنارس کی آبیاری وپاسبانی کرکے زریں کارنامہ انجام دیا، تقسیم ہند اور دارالحدیث رحمانیہ دہلی اجڑجانے کے بعد حلقہ دیوبند کے کسی مقتدر عالم نے کہا تھا کہ: "اب اہل حدیثوں کا محاذ ٹوٹ چکا ہے" جس وقت یہ بات کہی گئی حالات کچھ ایسے ہی تھے، جماعت کا سرمایہ لٹ چکا تھا، اساطین جماعت، تقسیم ملک کے نتیجہ میں جغرافیائی طور پر ہم سے جدا ہو چکے تھے، جماعت اہل حدیث تقسیم ہو چکی تھی، اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لئے اہل حدیث طلبہ دارالعلوم دیوبند کا رخ کر رہے تھے

لیکن ان پر اتباع سنت کا فرد جرم عائد کرکے حصول علم سے محروم کیا جا رہا تھا، جو ایک تاریخی حادثہ تھا، ان حالات میں مرکزی دارالعلوم کا قیام جماعت کی کشتی کو منجدھار بلا سے نکالنے کے مترادف تھا، اس عظیم اسلامی سلفی درسگاہ کے قیام سے جماعت میں خود اعتمادی پیدا ہوئی، افراد جماعت کے حوصلے بلند ہوئے، جامعہ کے فارغین عرب وعجم میں خدمات اسلام کا فریضہ انجام دیتے ہوئے، اور تمسک بالکتاب والسنۃ کے محاذ پر مسلح فوجیوں کی طرح ڈٹے ہوئے نظر آتے ہیں، آج طنز کسنے والی جماعت فقرۂ طنز کی بجائے حسرت ویاس کے ساتھ ان سلفی مجاہدین کو دیکھ رہی ہے کہ اہل حدیثوں کا محاذ ٹوٹا نہیں ہے، بلکہ ان کا محاذ اور مضبوط ہوا ہے، فوجیوں کی تعداد کئی گنا بڑھی ہے فللہ الحمد دراصل یہ فیض ہے، جامعہ سلفیہ بنارس اور اس کے اولوالعزم ناظم اور ان کے رفقاء کار کا۔

مادر علمی جامعہ سلفیہ بنارس کے منصوبہ قیام، تاسیس وتعمیر اور افتتاح سے لے کر اس کی ہمہ نوع ترقیاں، تعلیمی دھوم دھام تعمیری برق رفتاری، متعدد تصنیفی، تالیفی، دعوتی اور طباعتی شعبوں کا قیام، سیمنار وکانفرس کا اہتمام وانعقاد، ان تمام چیزوں کے انتظام وانصرام میں موصوف کی عالی دماغی، بلند ہمتی وچابکدستی کارفرما رہی، جس کی تعریف ہر چہار جانب سے ہوئی، فن تعمیر میں ان کی نقالی کی گئی، ان کے اصول پسندی کی مدارس میں مثالیں بیان کی گئیں اور نظم وڈسپلن پیدا کرنے کے لئے انہیں نمونہ بنانے کی سفارشیں کی گئیں ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

ان کی شخصیت جماعت وجمعیت کے حق میں نقطۂ اتحاد کی حیثیت رکھتی تھی، موصوف نے تنظیم کی لڑی میں سب کو پروئے رکھا، اپنی دانشمندی اور تدبر سے جماعت کو تحزب، دھڑے بندی اور انتشار کے ماحول سے پاک رکھا، نظامت کی قبا آپ کو خوب زیب دیتی تھی، معلوم ہوتا ہے قدرت نے آپ کو اسی کام کے لئے پیدا فرمایا تھا،

جامعہ رحمانیہ سے لے کر جامعہ سلفیہ بنارس کی نظامت تک ہر ایک میں آپ پورے کامیاب رہے، تملق، چاپلوسی، ریا ونمود کو آپ نے اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا، جامعہ میں تشریف لائے، سیدھے دفتر گئے ضروری امور سے فارغ ہو کر کار میں بیٹھے اور پھر روانہ ہو گئے طلبہ کو اپنے گرد جمع کرنے کا شوق، نہ ان سے خدمت لینے کا جذبہ، اساتذہ پر دھونس جمانے اور حکمرانی کا رعب غالب کرنے سے دور، ہر جگہ آپ کا یکساں احترام، یکساں قدرتی رعب۔ ؎

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مؤمن ✧ حوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مؤمن

مرحوم کے جملہ اوصاف حمیدہ کا ہم ادراک نہیں کر سکتے، تاہم ان کے جن کمالات کا مظاہرہ ہوا وہ نوع بنوع ہیں، لیکن ذوق تعمیر اور حسن انتظام دو بڑی خوبیوں کے سامنے سب کمالات دب گئے، ورنہ حقیقت ہے کہ آپ ایک اچھے عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ خوش الحان

قاری تھے، جب امامت کے لئے کھڑے ہوتے تو سماں بندھ جاتا، اور نمازی عجیب سُرور محسوس کرتے۔

زبان وبیان پر اچھی قدرت حاصل تھی، آپ کی تقریر خیر الکلام ماقل ودل کی مصداق ہوتی، مئی ۱۹۸۲ء میں ضلعی جمعیت اہل حدیث بستی نے ضلع کے مشہور قصبہ بانسی میں ایک دعوتی وتبلیغی کانفرنس منعقد کی، ارباب جمعیۃ کی خواہش پر آپ نے اجلاس کی صدارت منظور فرمائی تھی، پہلی شب کے اجلاس میں محترم نے صدارت کا فریضہ انجام دیا، راقم حروف کے ذمہ اناؤنسری تھی، احباب کے مشورے سے پروگرام مرتب کیا، مولانا سے تقریر کی درخواست کی، موصوف نے ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشا، اجلاس میں اپنی شرکت پر مسرت کا اظہار کیا، اور قصبہ بانسی کے ساتھ اپنے دیرینہ تعلقات کا اظہار کیا، بطور خاص قاری عبدالحق صاحب بانسوی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا، اوران کے ذکر جمیل سے اپنی تقریر کا آغاز فرمایا، تقریر مختصر تھی، لیکن ایمانی بصیرت سے بھرپور ان کی رحلت سے جماعت ایک عظیم مدبر عظیم مخلص رہنما عظیم غیرت مند سلفی عالم سے محروم ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ موصوف کی قبر کو نور سے بھر دے اوران کے لگائے ہوئے گلشن علمی پر ہمیشہ موسم بہار قائم ودائم رکھے۔ (آمین)

زندگانی تھی تیری مہتاب سے تابندہ تر خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو تیرا نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو تیرا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

وصلی اللہ علیٰ نبینا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم۔ تسلیما کثیرا۔

از مولانا محمد حنیف فیضی

مولانا عبدالوحید صاحبؒ

سابق ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ بنارس

جتنے لوگ اس دنیا میں آئے سب کی رحلت کا ایک وقت مقرر ہے، لیکن کسی کی وفات زیادہ باعث صدمہ ہوتی ہے کسی کی کم، کسی کے جانے سے عظیم پیمانے پر خلا محسوس ہوتا ہے، اور کسی کے جانے سے ایسا نہیں، اس کی وجہ دراصل یہ ہے کہ آدمی کی ذات جس قدر اوصاف حمیدہ کی حامل ہوتی ہے، اسی قدر اس کے انتقال پر ثمرہ بھی مرتب ہوتا ہے، چونکہ جناب ناظم اعلیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی جامع کمالات تھی، اسی لئے ان کی وفات سے ایک زبردست خلا محسوس ہو رہا ہے۔

آپ ایک معزز دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے، تعلیم و تربیت دینی ماحول میں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ اخیر وقت تک دینی کاموں سے کافی دل چسپی رہی۔

آپ نے اپنے گھریلو کاروبار انجام دینے کے ساتھ ساتھ خارجی ذمہ داریوں کو بھی بحسن وخوبی انجام دیا جن کا تعلق جماعت و ملت سے ہے، تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ جامع مسجد طیب شاہ، مدنپورہ، بنارس میں تیس سال تک امامت کا کام انجام دیا، اخیر عمر میں پیر میں تکلیف ہو جانے کی بنا پر جب پانچوں وقت مسجد میں آنا دشوار ہو گیا تو صرف فجر کی نماز میں آنے لگے، اور یہ سلسلہ آخری وقت تک جاری رہا، آپ کی آواز کافی دلکش اور شیریں تھی، فن تجوید سے بھی لگاؤ تھا، جب نماز میں خصوصاً فجر کی نماز میں قرأت کرتے تو بڑی بھلی معلوم ہوتی، اور سننے والے کے دل پر ایک عجیب رقت طاری ہوتی، راقم الحروف کو چند مرتبہ فجر کی نماز آپ کی امامت میں پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

۲۔ جامعہ رحمانیہ بنارس کے ایک عرصہ تک ناظم رہے، جب اس کے ناظم بنائے گئے تو اس کی مالی و انتظامی حالت لائق توجہ تھی، اس کی اصلاح و ترقی میں کافی دلچسپی لی، چنانچہ اس کی مرمت کرائی، اور اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ کیا، اور تعلیم پر

جہدی، یہاں تک کہ آپ کے دورِ نظامت میں اس کا تعلیمی معیار بہت بلند ہوگیا۔

۳۔ جامعہ سلفیہ (بنارس)، کے اس کے یوم تاسیس سے لے کر اپنی عمر کے آخری لمحہ تک ناظم اعلیٰ رہے، جامعہ کی نیک نامی اور ترقی کے لئے ہر ممکن کوشاں رہے، آپ کے وقت میں جامعہ نے ایسی ترقی کی جس کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا، اس نے تعلیم و تدریس کے علاوہ ترجمہ و تالیف کے میدان میں بھی اہم رول ادا کیا، مختلف موضوع پر کتنی کتابوں کے ترجمے ہوئے اور کتنی کتابیں تالیف کی گئیں۔ اس کے فضلاء دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں پھیل گئے، اور کتنا جلد یہ ادارہ عالمی شہرت کا حامل ہوگیا، آپ کو جامعہ سے کافی محبت تھی، اس کی فلاح و بہبود برابر نگاہوں کے سامنے ہوتی، اس کے مستقبل کے لئے ہمیشہ فکرمند رہا کرتے، اپنے آپ کو جامعہ سے بالکل مربوط کر رکھا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر فرمایا تھا " یہ در و دیوار اور میری زندگی یہ لازم ملزوم ہیں، ایک دوسرے سے اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ اس کو الگ نہیں کیا جا سکتا "

۴۔ جب جامعہ رحمانیہ کے ناظم تھے تو اس کی نظامت کے ساتھ ساتھ مقامی طور پر شہر جنوبی میں جماعت اہل حدیث کی تنظیم کا کام شروع کیا جہاں جماعتی تنظیم نہیں تھی، اس سلسلے میں نمایاں کارنامہ انجام دیا ہے، ایک عرصہ تک مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے ممبر رہے، پھر ۱۹۶۳ء میں اس کے نائب صدر منتخب ہوئے، اس کے بعد ستمبر ۱۹۷۹ء میں اس کے صدر بنائے گئے، اور اخیر عمر تک اس عہدہ پر فائز رہے، آپ کا اہم کارنامہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ آپ سے پہلے جمعیت کی اپنی عمارت نہیں تھی، لیکن جب آپ صدر ہوئے تو اس جانب توجہ مبذول کی اور ۱۹۸۱ء میں جامع مسجد دہلی کے علاقہ میں اس کے لئے مستقل بلڈنگ فراہم کیا۔

۵۔ آپ ۱۹۸۳ء میں یوپی حج کمیٹی کے ممبر بنے لیکن جلد ہی خود اس سے الگ ہوگئے، کیونکہ اس کے انتظامی امور سے مطمئن نہیں تھے۔

آپ کی زندگی انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیت سے لائق تعریف تھی، آپ سلفی العقیدہ اور متحمس اہل حدیث تھے، بڑے خلیق اور وسیع الظرف تھے، خندہ پیشانی کے ساتھ لوگوں سے ملتے جلتے تھے، جب کوئی آپ سے ملتا تو اسے احساس نہیں ہوتا کہ ہم اجنبی شخص سے بات کر رہے ہیں، ہر شخص آپ سے بے تکلفی سے ملتا اور فراخ دلی کے ساتھ بات چیت کرتا، اپنی ذمہ داریوں کا کافی احساس رکھتے اور بہت سوجھ بوجھ سے کام لیتے، اس سلسلے میں صرف ایک واقعہ ذکر کر دینا کافی ہوگا، وہ یہ کہ جب رحمانیہ کے ناظم بنائے گئے، تو مولانا نذیر احمد صاحب املوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے جامعہ رحمانیہ میں تدریسی خدمت انجام دینے میں متردد تھے، آپ کا بیان ہے کہ " مولانا مرحوم نے تعلیمی سال کے اختتام پر گھر سے جامعہ کے ناظم کے نام ایک مکتوب معذرت کے طور پر ارسال کیا، ادھر میں نے تنخواہوں پر غور کیا تو کمی کا احساس ہوا، اور اضافۂ تنخواہ کی خبر پر مشتمل میں نے ایک خط مولانا مرحوم کو لکھ دیا، عجیب اتفاق کہ ان کو

میرا خط اور مجھے ان کا خط ایک دو روز کے اندر ملا، چند روز بعد مولانا مرحوم کا دوسرا خط موصول ہوا، جس میں انہوں نے وضاحت فرمائی کہ ان کا عذر دور ہو گیا، اور آئندہ ماہ شوال میں وہ جامعہ آئیں گے۔"

اساتذہ اور طلبہ کے بڑے قدردان تھے، بڑوں کا نہایت احترام ملحوظ رکھتے، اور چھوٹوں پر کافی شفقت کرتے، ایک مرتبہ بماہ ذی قعدہ ۱۴۰۸ھ راقم الحروف نے کہا کہ مجھے اپنے بچوں کو گھر سے لاکر یہاں رکھنا ہے لہذا مکان چاہئے، جواب دیا کہ ماہ محرم ۱۴۰۹ھ میں انتظام ہو جائے گا، جب محرم آیا تو ایک مرتبہ اوائل محرم میں جب جامعہ تشریف لائے تھے بغیر یاددہانی خود ہی خاکسار کے کندھے پر نہایت شفقت کے ساتھ ہاتھ رکھ کر فرمایا " آپ سے وعدہ کیا تھا کہ محرم میں آپ کے لئے مکان کا انتظام ہو جائے گا، تو اس کا انتظام ہو گیا ہے، آپ گھر جاکر بچوں کو لے آیئے "

ذمہ داریوں کے معاملہ میں آپ کی ذات پر لوگوں کو کافی اطمینان رہتا تھا، اپنی کاروباری مشغولیت کے باوجود ذمہ داریوں کو نشاط کے ساتھ انجام دیا کرتے تھے، اندرون ملک دینی جلسوں میں شرکت کرتے رہے، اور بیرون ملک متعدد مؤتمرات میں شریک ہوئے، بڑے متحمل اور بردبار تھے، اللہ تعالیٰ نے مال و دولت سے نوازا تھا، مگر اس کی وجہ سے تواضع میں فرق نہیں آیا۔

خلاصہ یہ کہ آپ میں تقویٰ، توکل علی اللہ، اخلاص، ایثار، ہمدردی، ملنساری، صبر و تحمل، عزم محکم، عالی حوصلگی، جماعت و ملت کے کاموں سے دلچسپی، اصابت رائے وغیرہ کے اوصاف نمایاں تھے۔

بتاریخ ۲۵ر نومبر ۱۹۸۹ء بروز شنبہ بوقت شام آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون! ۔ اس طرح جماعت اہل حدیث ایک عظیم اور باکمال شخصیت سے خالی ہو گئی، اور جماعت اہل حدیث ہند میں زبردست خلا پیدا ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ اس خلا کو پُر کرے اور مرحوم کی لغزشوں کو معاف فرما کر جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے، آمین!۔

روشن ضمیر تھا نہ رہا

اصغر علی امام مہدی السلفی مدرس جامعہ سلفیہ بنارس

ناظم صاحب مرحوم مولانا عبدالوحید رحمانی کی شخصیت دینی حلقوں میں ایک معروف شخصیت تھی، آپ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے
تعالیٰ نے آپ کو مادی ومعنوی ہر لحاظ سے حظ وافر عطا فرمایا تھا، آپ کی ذات بہتوں کے لئے لائق رشک تھی، غربا پروری اور غربا نوازی آپ کا
ں وصف تھا، آپ کا دروازہ محتاج وغنی کے لئے وا رہتا، سخاوت وفیاضی آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، رمضان شریف میں تو
ہ دونوں ہاتھوں سے خرچ کرتے ہی تھے سال کے بقیہ گیارہ مہینے میں بھی آپ دینی، فلاحی اور رفاہی کاموں کے لئے باب سخاوت وا
تھے، آپ کی ثقاہت اپنوں اور غیروں میں مسلم تھی، آپ جس شخص، ادارے اور انجمن کی توثیق وتصدیق فرما دیتے، مذکورہ کوٹھی کے
ب اسے تسلیم کرتے، کیونکہ آپ نے اپنی زندگی انہی لوگوں کے درمیان گذاری تھی، لوگ سرد وگرم میں آپ کو بہتر پاتے تھے، بیرون بنارس
بھی آپ کی شخصیت مسلم سمجھی جاتی، مرکزی دارالعلوم بنارس جو سلفیان ہند کا عظیم مرکزی ادارہ ہے، اس علمی، دعوتی وتبلیغی مرکز کی
سرپرستی روز اول سے آپ کے سر تھی، آپ نے اسے جس خوش اسلوبی سے چار چاند لگایا وہ آپ کا ہی حصہ تھا، دارالعلوم حرسہا اللہ نے اتنی
مختصر عمر میں جن عظیم منازل کو طے کیا اس میں ناظم صاحب کی دور اندیش نگاہوں، بہترین تجربات، روشن ضمیری، عزم وہمت اور اخلاص
کا زیادہ دخل تھا، آپ مشکل سے مشکل مسائل کو اس خوبی سے حل فرما دیتے تھے کہ جسے دوسرے لوگ عقدۂ لاینحل تصور کرتے تھے، یہ اللہ تعالیٰ کی
جانب سے آپ پر خاص کرم تھا۔

علماء کی عزت وتوقیر آپ خوب فرمایا کرتے تھے، اہل علم کی قدردانی آپ کا شیوہ تھا، خاص طور پر اپنے جامعہ کے مدرسین سے عزت
وشفقت کا برتاؤ کرتے، ان کی دل شکنی انہیں گوارہ نہ تھی، ان کی عزت افزائی ودلجوئی میں کمی نہیں کرتے، راقم کے ساتھ چند مسائل
درپیش ہوئے تو راقم نے آپ سے عرض کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کی آپ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے حوصلہ افزائی کی اور ممکن تعاون
فرمایا۔

آپ نے مرض الموت میں مبتلا ہونے سے چند دن پہلے جب میرے والد کی علالت کی خبر سنی تو مفید مشورے دیئے اور اپنے ہونہار فرزند

مولانا عبداللہ مسعود صاحب سلفی کو بعض ڈاکٹروں کے پاس بھیجا جن سے ان کے تعلقات پہلے سے تھے، میرے والد محترم بفضل اللہ شفایاب ہوگئے، اب وہ ناظم صاحب کے پرخلوص توجہات اور ان کے حسن سلوک کو بہت سراہتے اور ان کا والہانہ ذکر خیر کرتے ہیں۔

ناظم صاحب رئیس کبیر ہونے کے باوجود تواضع وانکساری جیسے صفات سے متصف تھے، عجب وتکبر اور ترفع جو اس دور کے عام مالداروں اور عہدہ داروں کا وطیرہ ہے، اس سے پاک تھے، حجاز مقدس کے آخری سفر میں چند دنوں تک آپ کے ساتھ کچھ وقت گذارنے کا موقع ملا، اس وقت آپ کی تواضع وانکساری کا علم قریب سے ہوا، ایک مرتبہ بعض احباب کی وجہ سے آپ کو پریشانی لاحق ہوگئی اندیشہ تھا کہ آپ کافی برہم ہوں گے مگر آپ نے ہنس کر پریشانی کا سبب خود اپنے پروگرام میں عدم ارتباط کو بتایا، اور بڑی خوبصورتی سے چشم پوشی کرلی۔

جامعہ اسلامیہ سے راقم کی ابتعاث سے قبل آپ کی خواہش تھی کہ میں آپ کے نگرانی دہلی مرکز میں کام کروں، اس کے لئے آپ نے مجھ سے دو مرتبہ کہا، تیسری مرتبہ آپ نے بعض مدرسین کے ذریعے مجھے خبر بھجوائی، جب میں کچھ دنوں کے بعد حاضر خدمت ہوا۔ اسی دوران میرا پروانہ تقاقد آپ کو دستیاب ہوا تو آپ نے بڑی انکساری سے فرمایا کہ آپ کا تقاقد بحیثیت مدرس جامعہ سلفیہ میں ہوگیا ہے، مگر میری درخواست ہے کہ دہلی مرکز میں جانے سے انکار نہ کریں، درخواست کے لفظ سے میں شرم سے دوہرا ہوگیا اور جواباً عرض کیا کہ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ مگر چند ایام کے بعد آپ نے خود ہی فرمایا کہ آپ کو جامعہ سلفیہ میں ہی رہنا ہے۔

ناظم صاحب کی تنہا شخصیت اپنی ذات میں ایک انجمن تھی، بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ آپ علمی میدان میں بھی کافی تجربہ کار تھے آپ بسا اوقات بعض پیچیدہ مسائل کو نہایت حزم وتدبر سے حل کرتے جس سے آپ کی علمی صلاحیت کا اندازہ ہوتا۔

طیب شاہ مسجد اور اس کے مصلین آپ کی پرسوز اور خوش کن تلاوت کی حلاوت کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے، خصوصاً فجر کی نماز میں آپ کی امامت میں چند نمازیں پڑھنے کا موقع ملا، قرأت کی لذت وحلاوت اب تک محسوس کرتا ہوں،

ناظم صاحب مرحوم اپنے طلبا رکی ترقی کے لئے کوشاں رہتے، ان کی کسی بھی کامیابی کی خبر ان کے لئے مثردہ جانفزا ہوتی، اس کا تجربہ اس وقت ہوا جب آپ کے حجاز مقدس کے آخری سفر میں طلباء جامعہ سلفیہ کی سرگرمیوں اور ان کے احوال کے سلسلے میں بعض استفسار راقم سے فرمائے تھے، اور ان کی بعض کامیابی کے ذکر سے کافی مسرور نظر آئے تھے۔

الغرض ناظم صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک تھے، وہ اب ہم میں نہیں رہے، ان کی یادیں، ان کا اخلاص اور ان کی شفقتیں ہمارے ساتھ ہیں، جسے ہم فراموش نہیں کرسکتے، اور یہ چند سطور عقیدت اسی سلسلۂ ذکر خیر کی ایک کڑی ہے۔ آپ کی وفات سے ایسا محسوس ہوا کہ ہم سب کے سر سے ایک عظیم سایۂ شفقت اٹھ گیا، اللھم أجرنا فی مصیبتنا۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ سقی اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔ ؎

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اور ان کے اعزہ و متعلقین کو صبر و سکون سے نوازے، اور انہوں نے جس گلشنِ علم و حکمت کی آبیاری کو اپنا مشن بنایا تھا، جو سلفیانِ ہند کی دلوں کی دھڑکن ادارہ کی آرزؤں کا مرکز اور دیرینہ خوابوں کی تعبیر بھی ہے، اسے سرسبز و شاداب اور اس کو دن دونی رات چوگنی ترقی دینے کی ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

"میرِ کارواں نہ رہا"

عبد المتین سلفی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

غنچے خموش، پھول پریشاں، چمن اداس کیا کہہ گئی ہے موج صبا سوچنا پڑا

خلوص وللہیت، شفقت ومحبت، عقل وفراست، وقار ومنزلت، فہم وادراک، اخلاق وکردار، علم وتدبر، جود وکرم، صدق وصفا، خوش گفتاری ونیک کرداری، علم وعمل، ایثار پسندی، انسانیت پروری، دوراندیشی جوہر شناسی، جفاکشی، خوش انتظامی، شرافت، داعلیٰ ظرفی، مقبولیت وہر دلعزیزی، وسعت قلبی ووسعت نظری کا ایک درخشاں باب ایک ایسی شخصیت کے وفات پر ختم ہوا جو جماعت اہلحدیث کے لیے سرمایۂ افتخار ہے، یعنی امیر محترم مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند اور ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم بنارس عبدالوحید عبدالحق سلفی رحمہ اللہ تعالیٰ، آپ کی وفات کی خبر خرمنِ جماعت پر برق بنکر گری، جس نے جماعت کے سہاگ کو لوٹ لیا، "پتھروں" کو پگھلا دیا اور اس سے چشمے پھوٹ پڑے۔

کتنی آنکھوں نے عقیدت کے موتی برسائے، کتنے دلوں نے تڑپ تڑپ کر آپ کو الوداع کہا، کتنی زبانیں دعائے مغفرت میں ارق ہوئیں، خوش قسمت ہیں وہ جو اشکہائے عقیدت، وہ نوائے قلب اور وہ دعائے خیر سے امیر محترم کی وفات پر خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔

تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی ربنا واللہ انا بفراقک لمحزونون۔ آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں، دل حزیں ہوتا ہے اور ہم وہی کہتے ہیں جو ہمارے رب کو راضی کرے، بخدا ہم آپ کی جدائی پر مغموم ہیں۔ — موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس

امیر محترم کی ولادت آپ کے آبائی وطن بنارس کے ایک معزز اور علمی گھرانے میں ۱۴ رجمادی الآخرہ ۱۳۴۲ھ بموافق ۲۲ جنوری ۱۹۲۴ء میں ہوئی ؎

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

آپ کی تعلیم جامعہ رحمانیہ (بنارس) میں ہوئی۔ حدیث کا درس مولانا منیر خان (شاگرد سید نذیر حسین محدث دہلوی رحمہ اللہ) سے لیا۔ دیگر علوم و فنون کے لیے مولانا عبد الغفار حسن رحمانی کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

دینی سرگرمیوں میں آپ شروع ہی سے حصہ لیتے تھے۔ چنانچہ جب آپ کی عمر ۲۸ سال تھی آپ کی صلاحیتوں اور جوش ولگن کو دیکھتے ہوئے آپ کو جامعہ رحمانیہ (بنارس) کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ آپ اس ذمہ داری کو نہایت ہی حسن و خوبی سے انجام دیتے رہے کہ اسلاف کے دیرینہ خوابوں کی تعبیر کی شکل میں مرکزی دار العلوم جامعہ سلفیہ (بنارس) کی تاسیس ۱۲ رجب ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۳ء کو عمل میں آئی۔ آپ کی بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے دورِ تاسیس ہی سے آپ کو اس علمی گہوارہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

جامعہ سلفیہ (بنارس) نے اپنی حیاتِ چندروزہ میں ترقی کے جو مراحل طے کیے اور عزت و شہرت کی جس بلندی پر پہونچا، اس میں مرحوم کی بے پناہ صلاحیتوں اور پرخلوص کد و کاوش کا بہت بڑا دخل ہے۔ آپ اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس کے ناظم اعلیٰ رہے۔

چودہویں صدی ہجری کے اواخر میں مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند جو مختلف معلوم و نامعلوم اسباب کی بنا پر ہچکولے کھا رہی تھی اور زوال کے ایک بدترین دور سے گزرتے ہوئے ایک وحشت انگیز مستقبل کی طرف گامزن تھی۔ اس آزمائشی دور میں جماعت کی باگ ڈور شعبان ۱۳۹۹ھ میں آپ کے سپرد کی گئی، آپ نے اس میں زندگی کی نئی روح پھونک دی اور تمام مشکلات پر انتہائی حسن و خوبی سے قابو پاتے ہوئے اسے فعال اور سرگرم عمل کردیا۔ آپ کے انیس سالہ دورِ امارت میں تین مرتبہ جمعیۃ کا انتخاب ہوا اور ہر بار آپ کو باتفاق رائے جمعیۃ کا امیر منتخب کیا گیا۔ آپ کے دورِ امارت میں جمعیۃ نے ترقی کے بہت سارے مراحل طے کیے اور خصوصاً داخلی و خارجی رابطے استوار کیے۔

شعبان ۱۴۰۰ھ میں مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند کے زیر اہتمام شہر بنگلور (کرناٹک) میں ایک عظیم عالمی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں عرب و عجم کی مقتدر شخصیتوں نے شرکت کی، جس میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فضیلۃ الشیخ

محمد عمر فلاتہ حفظہ اللہ اور دارالافتاء والدعوۃ والافتاء والارشاد (ریاض) کے رئیس فضیلۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز کے مندوب خاص فضیلۃ الدکتور محمد لقمان سلفی شریک ہوئے۔ اس کانفرنس کی صدارت کے لیے بھی آپ ہی کو منتخب کیا گیا۔

۱-۳ اکتوبر ۱۹۸۹ء کو مرکزی جمعیۃ الشبان اہلحدیث کی عظیم کانفرنس دہلی میں آپ ہی کے ایما پر منعقد ہوئی اور اس کی صدارت بھی آپ ہی نے کی۔

آپ متعدد مدارس اور مختلف اسلامی تنظیموں کے صدر رہے۔ اصلاح المساجد بمبئی کے نائب مدیر اور انڈین حج کمیٹی کے ایک معزز رکن تھے۔

عرب دنیا میں بھی آپ کو خاص مقبولیت حاصل تھی۔ عرب مشائخ آپ کو بے حد قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے مؤتمر رسالۃ المساجد جو رمضان ۱۳۹۵ھ میں مکۃ المکرمۃ میں منعقد ہوا اس میں آپ مدعوئین کی حیثیت سے شریک تھے۔

المؤتمر العالمی لتوجیہ الدعوۃ والدعاۃ جو صفر ۱۳۹۶ھ میں جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں منعقد ہوئی، اس میں بھی آپ شریک رہے۔ نیز مؤتمر العالمی الاول لتعلیم الاسلامی جو ۱۳۹۷ھ میں جامعۃ الملک عبدالعزیز کے زیر اہتمام مکۃ المکرمہ میں منعقد ہوئی اس میں بھی آپ شریک تھے۔

صبر و عزیمت، حلم و بردباری کا یہ مثالی پیکر بمصداق فرمان باری: فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ سنیچر کی شام ۲۵ نومبر ۱۹۸۹ء مطابق ۲۵ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ کو ہم سے جدا ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نماز جنازہ بقیۃ السلف شیخ الحدیث سرپرست جامعہ سلفیہ حضرت مولانا عبیداللہ رحمانی حفظہ اللہ نے پڑھائی اور آبائی قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

عرب ممالک میں بھی خصوصاً مکۃ المکرمہ و مدینۃ المنورہ میں ابناء جامعہ و جمعیہ نے غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔

امیر محترم مرحوم کی جماعتی زندگی جس قدر درخشاں تھی، آپ کی گھریلو زندگی بھی اسی قدر تابناک تھی۔

اس لیے کہ میں آپ کو آپ کے خاندان کے ایک فرد ہونے کی وجہ سے بہت قریب سے دیکھا ہے۔

آپ خاندان کے سب سے باوقار اور معزز فرد تھے، خاندان کے تمام امور میں آپ کو بالادستی حاصل تھی، کوئی بھی اہم کام آپ کے مشورہ کے بغیر انجام نہ پاتا۔ تمام اختلافی امور میں آپ کی طرف رجوع کیا جاتا اور اکثر و بیشتر معاملات میں آپ کا حکم "قول فیصل" ہوتا۔

کسی منکر کے انکار کے لیے آپ کو زبان کھولنے کی ضرورت کم پیش آتی، صرف ایک ادنیٰ اشارہ کافی ہوتا۔

گھر میں خوشی کے مواقع پر آپ سب سے زیادہ خوش نظر آتے، اور اس قسم کی تقریبات میں نہ صرف شریک ہی رہتے بلکہ اس کے منتظم و سرپرست خود ہوتے۔ آپ کے مزاج میں تلون، آپ کی شخصیت میں ہمہ گیری، آپ کی طبیعت میں ٹھہراؤ آپ کے کلام میں اس قدر جاذبیت اور آپ کے اندر اسقدر تحمل و بردباری تھی کہ جب آپ کا دشمن بھی آپ سے ملتا تو آپ سے متاثر ہو کر آپ کا گرویدہ ہو جاتا، اور وہ لوگ جو درپردہ شعوری یا لاشعوری طور سے آپ پر لعن طعن کرتے، آپ سے مل کر آپ کے مداح بن جاتے۔

آپ گھر کے بچوں پر بے حد شفیق اور بچے آپ سے بے حد مانوس رہتے۔ آپ بچوں پر کسی قسم کے تشدد کے خلاف تھے، بچوں کے خالص اسلامی نام رکھنے اور اسلامی تعلیم دلانے کے قائل تھے۔

ایک موقع پر آپ نے مجھ سے فرمایا تھا "تحصیل علم کا مقصد حصول اسناد نہیں بلکہ شخصیت کی تکوین اور صلاحیت کا نکھار ہے۔"

آپ کی دینداری اور خدا ترسی مسلم تھی۔ جامع مسجد اہل حدیث (مدن پورہ) میں آپ فجر و عشاء کی نماز کے مستقل امام تھے اور قبل از مرض پابندی سے نماز پڑھاتے رہے۔ فجر کی نماز کے بعد اکثر و بیشتر مصلیٰ پر بیٹھے رہتے اور واقفین سے ملتے رہتے اور ان کے مسائل سنتے۔

لیلۃ القدر کی نماز میں بھی آپ ہی پڑھاتے، لوگ دور دراز سے آپ کی اقتدار میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل کرنے کے لیے آتے۔ آپ کی دعا اس قدر پرسوز اور موثر ہوتی کہ حاضرین کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔

آج جب مرحوم ہمارے درمیان نہیں ہیں، گھر، جامعہ اور جمعیۃ کا ہر فرد اپنے آپ کو یتیم سا محسوس کر رہا ہے اور جب بھی آپ کا ذکر خیر ہوتا ہے آنکھیں خلا کو گھورنے لگتی ہیں۔ گویا آپ کو تلاش کر رہی ہوں۔

رب کریم آپ کو جنت الفردوس میں انبیاء و شہداء کے ساتھ جگہ دے اور آپ کے تربت کدہ کو منور و معطر کر دے، اور آپ کے جملہ متعلقین کو صبر و استقامت کی توفیق دے۔ آمین ●●

مولانا عبدالوحید صاحب سلفی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر
چند تعزیتی پیغامات ومکتوبات

محترم امیر جمعیۃ اہل حدیث ہند جناب مولانا عبدالوحید صاحب سلفی کے انتقال پر ملک وبیرون ملک سے برقیات ٹیلیفون تعزیتی قراردادیں اور مکتوبات بڑی تعداد میں موصول ہوئے اس خلوص کے لئے ہم تمام حضرات کے شکر گذار ہیں، اور تمام حضرات کی صحت وعافیت کے متمنی ہیں، تمام پیغامات ومکتوبات کی اشاعت چونکہ بہت مشکل ہے اسلئے ذیل میں مرحوم سے متعلق ہم بعض تعزیتی پیغامات کو پیش کر رہے ہیں ۔ ادارۂ تحریر

شارقہ کے حاکم جناب سلطان بن محمد القاسمی تحریر فرماتے ہیں کہ :

۱۔ شیخ عبدالوحید کی خبر وفات بڑے رنج وغم سے سنی گئی، ہم اس موقع پر پر خلوص تعزیت پیش کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتے ہیں کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اور اعزا واقارب کو صبر وسکون بخشے۔

ہماری تمنا ہے کہ مرحوم کے بعد بھی جامعہ اپنے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے سرگرم کار رہے۔ والسلام!

دوحہ، قطر کے وزیر تعلیم وتربیت جناب عبدالعزیز بن عبداللہ ترکی تحریر فرماتے ہیں کہ :

۲۔ بذریعہ خط شیخ عبدالوحید کی وفات کی خبر معلوم ہوئی، مرحوم نے دین اسلام کی خدمت کے سلسلے میں گرانقدر کوشش کی، اور ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کے لئے سرگرم عمل رہے، اللہ تعالیٰ انہیں اس کا بہترین اجر عطا فرمائے، ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ جامعہ کے لئے مرحوم کا ایسا جانشین میسر کرے گا جو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں پورے طور پر سرگرم رہے گا،

حرم مکی کے امام وخطیب جناب شیخ محمد بن عبداللہ السبیل تحریر فرماتے ہیں کہ :

۳۔ مورخہ ۳ دسمبر ۸۹ء کے مکتوب سے شیخ عبدالوحید کی وفات کی معلوم ہوئی جس سے سخت صدمہ ہوا، اس موقع پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے، آپ اور ہم سب کو صبر کی توفیق بخشے، اور جامعہ سلفیہ کو مرحوم کا بہتر جانشین عطا فرمائے، والسلام!

مکہ مکرمہ سے رابطہ عالم اسلامی کے معاون جنرل سکریٹری جناب شیخ محمد بن ناصر عبودی فرماتے ہیں کہ :

۴۔ شیخ عبدالوحید کی خبر وفات سے سخت قلق ہوا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، ہم لوگوں کو صبر کی توفیق

تھے، اور اہل و عیال نیز جامعہ کو ان کا اچھا جانشین مرحمت فرمائے۔ والسلام!

مدینہ منورہ سے عالی جناب شیخ صالح حصین تحریر فرماتے ہیں کہ:

۵۔ شیخ عبدالوحید بن عبدالحق کی خبر وفات سے دل کو سخت صدمہ لاحق ہوا، ہم اس عظیم مصیبت پر "انا للہ وانا الیہ راجعون" کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے، میری طرف سے مرحوم کے اعزاء و اقارب کو اور جامعہ سلفیہ کے تمام متعلقین کو سلام و تعزیت پہونچا دیجئے، اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کو اجر عظیم سے نوازے۔ والسلام!

مکہ مکرمہ سے جناب شیخ عبداللہ بن سلیمان منیع تحریر فرماتے ہیں کہ:

۶۔ خط کے ذریعہ شیخ عبدالوحید کی خبر معلوم ہوئی، مجھے اس سے بہت صدمہ پہونچا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، ان کو جنت عطا فرمائے، غمزدگان کو اجر اور صبر کی توفیق بخشے، اور ہمیں ہر طرح کے فتنوں اور رنج وغم سے محفوظ رکھے۔ والسلام!

دار الافتاء ریاض سے شیخ محمد بن قعود تحریر فرماتے ہیں کہ:

۷۔ خط کے ذریعہ شیخ عبدالوحید کی خبر وفات معلوم کر کے صدمہ ہوا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے، اہل وعیال کو صبر کی توفیق سے نوازے، مرحوم کی دینی وعلمی خدمات قبول فرما کر ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اور ان کے جانشین کو اسلام کی خدمت جاری رکھنے کا حوصلہ بخشے، میری طرف سے اور دار الافتاء کے صدر شیخ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ کی طرف سے مرحوم کے اہل وعیال کو تعزیت پہونچا دیجئے۔ والسلام!

دبئی سے جمعیۃ الاصلاح والتوجیہ الاجتماعی کے جنرل سکریٹری جناب محمد صالح الرئیس تحریر فرماتے ہیں کہ:

۸ - شیخ عبدالوحید کی خبر وفات کو ایمان واحتساب سے سناگیا، ہر متنفس کا یہی انجام ہے، اللہ تعالیٰ سے ہماری دعا ہے کہ مرحوم کے برادران ومخلصین کے ذریعہ ان کے خلا کو پُر کرے، اور آئندہ ہمیں ان کے مقاصد کو پورا ہوتا دکھائے، مرحوم کیلئے ہم دعاگو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت مرحمت فرمائے۔　　والسلام!

دارالعلوم دیوبند ، سے جناب مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے فرمایا :

۹ / ۱۱ / ۱۹۸۹ء -

۹ - گرامی نامہ سے جناب مولانا عبدالوحید صاحب سلفی کے سانحۂ ارتحال کی خبر ہوئی جس سے قلبی رنج وصدمہ پہونچا، مرحوم نے جامعہ سلفیہ کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے دین وملت کی بڑی خدمات انجام دی ہیں جو فراموش نہیں کی جاسکتیں۔
خداوند کریم مرحوم کی مغفرت فرماتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، نیز پسماندگان کو صبر جمیل وجماعت وادارہ کے لئے نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

دارالعلوم دیوبند میں مرحوم کے لئے دعائے مغفرت وایصال ثواب کرایا گیا ہے، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔
بندہ کی طرف سے ارکان مدرسہ ومرحوم کے پسماندگان تک تعزیت مسنونہ کا پیغام پہونچا کر شکر گذار فرمائیں

ندوۃ العلماء لکھنؤ ، سے جناب مولانا سعید الاعظمی ندوی صاحب نے فرمایا :

۸ دسمبر ۱۹۸۹ء

۱ - یہ ہم سب اہل مدارس اور طبقۂ علماء کے لئے ایک بڑا حادثہ ہے، مولانا کی ذات سے بہت سے علمی اور دینی کام وابستہ تھے انہوں نے بہت سے عظیم الشان کاموں کی بنیاد ڈالی، جامعہ سلفیہ انہی کی کوششوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے، اس طرح اور بہت سے ادارے اور دینی کام ان کی خاموش کوششوں سے جاری تھے، اور ہیں۔ ان کی وفات سے ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا اس میدان کا ایک مجاہد چلا گیا، یہ اتنا بڑا خسارہ ہے جس کی تلافی بظاہر مشکل معلوم ہوتی ہے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ محض فضل وکرم سے کوئی سبیل پیدا فرمادیں۔
ندوہ سے تعزیت کا تار بھیجا گیا امید ہے کہ بروقت پہونچا ہوگا، ہم سب اس حادثہ سے غمگین ہیں، اور یہ تنہا آپ حضرات کا

غم نہیں بلکہ ہزاروں افراد ملت کا مشترک غم ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے زخموں پر مرہم رکھیں، اور اس خلا کو اپنے فضل سے پُر کریں، اور جامعہ سلفیہ جو ان کی اہم ترین یادگار ہے، اس کو ہر طرح کے شر و رو فتن سے محفوظ رکھ کر اس کو ہر طرح مزید برگ و بار آور بنائیں آمین
اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات کو بلند فرمائیں اور رحمت و مغفرت سے نوازیں، اور ان کی تمام دینی اور علمی کوششوں اور قربانیوں کو قبول فرمائیں، ہماری طرف سے تعزیت مسنونہ ان کے اہل خاندان اور قریبی رشتہ داروں اور تمام اساتذہ و طلبہ کی خدمت میں عرض ہے، قبول فرما کر ممنون کریں۔

(نوٹ) غائبانہ نماز جنازہ بھی مسجد ندوہ میں ادا کی گئی۔

دار المصنفین اعظم گڈھ : سے جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب نے فرمایا :

۱۷ر دسمبر ۱۹۸۹ء

۱۱۔ مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند کے امیر محترم مولانا عبد الوحید صاحب سلفی کے حادثۂ فاجعہ کی اطلاع ملی جس سے بڑا صدمہ ہوا، اس ناچیز کی مولانا سے دو ایک بار کی ملاقات تھی، ان کی پاکیزہ اور متواضع شخصیت کا ابھی تک دل پر اثر ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور وابستگان جماعت اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور جماعت کو ان کا نعم البدل نصیب کرے (آمین)!۔
دسمبر کا معارف مکمل ہو چکا اس لئے مولانا کے حادثہ کا ذکر اس میں ممکن نہیں تھا، جنوری میں تو بہت تاخیر ہو جائے گی، بہرحال مہربانی کر کے میری اور دار المصنفین کی جانب سے حضرت مولانا کے متعلقین کی تعزیت و تسلی فرما دیجئے، دار المصنفین اس غم میں ان کا شریک ہے۔

دھلی : سے جناب حکیم عبد الحمید صاحب نے فرمایا :

۶ر دسمبر ۱۹۸۹ء

۱۲۔ مولانا عبد الوحید صاحب سلفی کی رحلت کی اطلاع ملی، بڑا افسوس ہوا، انہوں نے جامعہ سلفیہ کی بڑی خدمت کی ہے دعا ہے خدا ان کی مغفرت فرمائے، اور متعلقین و پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق ہو، آمین!

۱۳۔ محترم ڈاکٹر سید عبدالحفیظ صاحب سلفی نے فرمایا کہ : "محترم رفیق جناب مولانا عبدالوحید سلفی کے انتقال پُر ملال کی خبر سہ روزہ دعوت اخبار کے ذریعہ ۲ دسمبر کو اس ناچیز کو ملی اور اسی وقت عجیب سکتہ کی کیفیت طاری ہوگئی ۔ مرحوم بھائی کی جدائی کا صدمہ اور خسارہ ایک خاندان کا نہیں بلکہ پوری جماعت اور ملت کا ہے ۔"

۱۴۔ محترم مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی جھنڈانگری نے فرمایا کہ : "یقیناً مرکزی دارالعلوم بنارس کے ناظم اعلیٰ، اور مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے امیر محترم مولانا عبدالوحید صاحب سلفی کی وفات حسرت آیات جماعت و ملت کے لیے ایک عظیم حادثہ ہے جس سے ہر فرد جماعت کو بے انتہا صدمہ و غم ہے ۔"

۱۵۔ ڈاکٹر مختارالدین احمد آرزو صاحب نے تحریر فرمایا:

"مولانا عبدالوحید سلفی کی رحلت کی اطلاع جامعۃ السلفیہ کے ناظم مولانا سالم محمد فاروق صاحب نے دی تھی، یاد آتا ہے کہ تعزیت کا خط انھیں لکھ دیا تھا۔ اب آپ کا رسالہ آیا تو اس سے ان کی علالت، عمل جراحی اور وفات کی خبر ملی، لیکن، بہت اختصار سے، ضرورت تھی کہ آپ کے عربی و اردو رسالوں میں زندگی اور ان کے کارناموں پر مفصل مضمون ہو۔

کیا کہوں ان کی وفات کا کس قدر صدمہ ہوا، ان کی رحلت ایسے وقت ہوئی جب ملت اسلامیہ جمعیۃ اہلحدیث اور جامعہ سلفیہ کو ان کی ضرورت تھی، انھوں نے اپنی جماعت کو مستحکم کیا اور بہت حد تک منظم اور جامعہ سلفیہ کو ترقی دے کر دین کی بڑی خدمت انجام دی ۔ اللہ انھیں اس کا اجر دے، ان کے گناہوں کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے ۔

آپ کو جو صدمہ پہنچا ہوگا، اس کا مجھے اعتراف ہے ۔ خدا آپ کو صبر جمیل عطا کرے، اور آپ سب لوگوں کو اس کی توفیق دے کہ ان کے شروع کیے ہوئے کاموں کو درجۂ تکمیل تک پہنچائیں ۔"

۱۶۔ محترم ڈاکٹر محمد ضیاءالرحمٰن اعظمی نے فرمایا : "ناظم جامعہ سلفیہ جناب عبدالوحید صاحب کے انتقال کی افسوسناک خبر سے دل کو بڑا صدمہ پہنچا، مرحوم کی دینی اور ملی خدمات کا ایک تسلسل ذہن میں گھومنے لگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کی ان خدمات کو قبول فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے ۔

۱۷۔ محترم شیخ عین الباری نے فرمایا: "مرحوم کی رحلت جماعت کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ اسے پُر کریں، اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائیں ۔"

جامعہ دارالہدیٰ یوسف پور سدھارتھ نگر، سے جناب مولانا محمد ابراہیم صاحب رحمانی نے فرمایا :

۵/دسمبر ۱۹۸۹ء

۱۸ ۔ ناظم صاحب جامعہ سلفیہ بنارس و امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند حضرت مولانا عبدالوحید عبدالحق صاحب السلفی البنارسی کی وفات حسرت آیات کی اطلاع ہم لوگوں کو بہت بعد میں ملی، اس خبر وحشت اثر سے پورا مدرسہ سوگوار ہوگیا، مولانا مرحوم کی یاد میں دارالہدیٰ کی عالیشان مسجد میں ایک مجلس تعزیت منعقد کی گئی، جس میں مرحوم کی جماعتی خدمات اور دیگر مثالی کارناموں کو سراہا گیا اور اعتراف کیا گیا کہ ان کا حادثۂ موت تنہا ایک فرد ایک خاندان کا حادثہ نہیں ہے، بلکہ پوری ملت وجماعت کا حادثۂ فاجعہ ہے ۔ ؎

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

انقلاب ۱۹۴۷ء کے بعد جبکہ پوری جماعت مایوسی کا شکار تھی، اور ایسا لگتا تھا کہ اہل حق کی یہ جماعت نہ صرف یہ کہ اپنی امتیازی حیثیت کھو بیٹھے گی بلکہ گمنامی کے غار میں بھی چلی جائے گی، لیکن نوگڈھ کانفرنس کے بعد جماعت نے کروٹ لی اور بیداری کی جو لہر آئی اس میں اہل بنارس پیش پیش تھے، اور نتیجۃً جامعہ سلفیہ کے قیام، اور احباب بنارس کی جماعتی غیرت وحمیت اور بے لوث خدمات اور خلوص نے جماعت کو ایک نیا رخ عطا کیا، اس لئے آج ہم فخر کے ساتھ بحیثیت جماعت ملک و بیرون ملک میں اپنا سر اونچا کر سکتے ہیں۔ مولانا مرحوم کے دور نظامت میں جامعہ سلفیہ نے جو ہمہ جہتی ترقی کی ہے وہ کسی ہوشمند آدمی سے پوشیدہ نہیں، ہم سب اہل مدرسہ نے مولانا مرحوم کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی، اور اب بھی دعا گو ہیں کہ بار الہا! مولانا مرحوم کی خطاؤں اور لغزشوں کو درگذر فرما، اور ان کی ملی وجماعتی خدمات اور دیگر تمام حسنات کو قبول فرما کر انہیں فردوس بریں میں جگہ عنایت فرما، اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے، آمین! اللهم اغفرله وارحمه واجعل الجنة مثواه ۔

جامعہ عالیہ عربیہ مئو، سے پیغام تعزیت :

۳/دسمبر ۱۹۸۹ء

۱۹ ۔ فروغ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک ۔ مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

بڑے اندوہ وغم کے ساتھ یہ جانکاہ خبر آئی اور سنی گئی کہ کاروان جماعت کے امیر اور دعوت سلفیت کے مرکزی ستون حضرت مولانا عبدالوحید صاحب ناظم جامعہ سلفیہ اور مرکزی جمعیۃ اہل حدیث کے امیر اللہ کو پیارے ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ خبر ملتے ہی پورے مئو میں

اور خصوصاً جامعہ عالیہ عربیہ میں ماحول سوگوار ہوگیا، اور بطور اظہار غم جامعہ میں تعطیل کردی گئی، ذمہ داران جامعہ اور اساتذہ کی کثیر تعداد تدفین میں شرکت کی غرض سے عازم بنارس گئی، مولانا مرحوم کو جامعہ عالیہ کے ساتھ قدیم زمانہ سے جو تعلق خاطر تھا اس کی بنا پر یہ کہنا بالکل درست ہوگا کہ اس سانحہ کو یہ جامعہ خود اپنا ہی المناک سانحہ تصور کرتا ہے۔

تقسیم ملک کے بعد جماعت کی تعلیمی و تنظیمی بساط درہم برہم ہوگئی تھی، اور خصوصیت سے کسی مرکزی درسگاہ کے فقدان سے طالبان علم پر انتشار و حیرانی کا وہ عالم تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا، طالبان علم گویا اس مصرع کا مصداق تھے۔ ؎

ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اس کشمکش کے عالم میں مرکزی دارالعلوم کے قیام نے امید کا ایک چراغ روشن کیا اور جن لوگوں نے اس قندیل رومانی کو فروزاں کیا ان میں مولانا عبدالوحید اور ان کے قریبی بزرگوں کا ہاتھ سب سے نمایاں رہا، مولینا نے اس مرکز کے قیام پر اکتفا نہ کیا، بلکہ اپنی پوری زندگی اس کی آبیاری میں صرف کردی، اور آج اس مرکز علم کو ہند و بیرون ہند میں نیک نامی اور تفوق حاصل ہے اس کا سہرا مولینا مرحوم کے سر ہے، مرحوم کے خلوص و للّٰہیت کا یہ ثمرہ ہے کہ اس ادارے نے اتنی قلیل مدت میں وہ مقام حاصل کرلیا، جس مقام پر پہونچنے کے لئے صدیاں درکار ہوا کرتی ہیں۔ مرحوم کی بے ریائی، خوش خلقی، معاملہ فہمی، علم دوستی اور عزیمت کے ساتھ ایثار و قربانی نے تمام لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا اور آج ہر شخص اس سانحہ پر مرحوم کے محاسن ایک ایک کرکے یاد کرتا ہے، اور زبان حال سے کہہ رہا ہے۔ ؎

جانے والے کا عجب انداز تھا ہر گام پر ٭ دیر تک اہل نظر نقش قدم دیکھا کریں

آپ کی ذات جمعیت اہل حدیث ہند کی امارت کے منصب پر رہ کر تنظیم جماعت کا مرکزی ستون تھی تو تعلیمی مرکزیت مرکزی دارالعلوم کی نظامت کے ذریعہ آپ کو حاصل تھی، ان دونوں ذمہ داریوں کو جس اولوالعزمی اور خلوص کے ساتھ ادا کیا، اس کا اعتراف ہر فرد جماعت کو ہے اور بقول ؎ آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

ہر فرد جماعت کی نمناک آنکھیں کہہ رہی ہیں کہ آج ہماری جماعت کا عظیم محسن ہم سے جدا ہوگیا ہے۔ ہم اراکین جامعہ اور تمام اساتذہ اللہ پاک سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی جملہ نیکیوں کو قبول فرمائے اور مغفرت و رضوان سے نوازے، ان کے خاندان اور پسماندگان کے زخمی دلوں کو صبر جمیل کا مرہم عطا فرمائے، اور مرکزی دارالعلوم بنارس و مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے لئے نعم البدل پیدا کرکے ان کی مشکلات کو آسان کردے۔ آمین!

امارت اہلحدیث صادق پور پٹنہ بہار سے جناب مولانا عبدالسمیع صاحب نے فرمایا :

۷ دسمبر ۱۹۸۹ء

۲۰ - مولینا عبدالوحید سلفی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال پر ملال کی اطلاع بذریعہ مؤقر جریدہ سہ روزہ " دعوت " مورخہ ۲ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۴۱۰ھ ملی، تعزیتی تار اور خطوط بحوالہ نمبر ۹۶ / ۵ / ۴۴۲ الف بتاریخ ۲ / ۵ / ۱۰ / ۱۴۱ ھ، مطابق یکم دسمبر ۱۹۸۹ء جامعہ سلفیہ بنارس و مولانا عبدالوہاب صاحب خلجی، مرکزی جمعیۃ اہل حدیث، اہل حدیث منزل دہلی کی خدمت میں روانہ کر دیئے گئے ہے ـــــ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس، ملت و جماعت کو نعم البدل اور متعلقین و پسماندگان کو صبر جمیل اور سکون عطا فرمائے۔ آمین !

جامعہ سراج العلوم بونڈھیار گونڈہ سے جناب مولانا عبدالسلام صاحب رحمانی نے فرمایا :

۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء

۲۱ - اللہ تعالیٰ مرحوم امیر محترم کی مغفرت فرمائے، ان کے حسنات کو قبول کرے، انھیں صدیقین وصلحائے امت کا مقام بلند عطا فرمائے، اور جملہ پسماندگان کو صبر و اجر دے، اور جماعت و ملت کو ان کا نعم البدل عطا کرے، یہ حادثہ نہ صرف متعلقین و پسماندگان کے لئے جانکاہ و دلدوز ہے بلکہ پوری جماعت و ملت کے لئے ایک حادثہ عظیم ہے، اور اس حادثہ پر پوری جماعت تعزیت کی مستحق ہے۔

جامعہ دارالسلام عمرآباد سے جناب مولانا جمیل الرحمٰن عمری صاحب نے فرمایا :

۴ دسمبر ۱۹۸۹ء

۲۲ پنجشنبہ کو مدراس سے اطلاع آئی کہ مولانا عبدالوحید سلفی جامعہ سلفیہ بنارس کا انتقال ہو گیا ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون ! یہ خبر بجلی کی طرح سارے جامعہ میں پھیل گئی، جامعہ کے ذمہ داران، اساتذہ اور طلبہ سب ہی لوگ اس خبر سے بے حد رنج و ملال محسوس کرتے رہے، جمعہ کے دن عمرآباد اور اطراف واکناف میں نماز جنازہ غائبانہ بھی ادا کی گئی،

مرحوم بڑے وسیع الظرف، سنجیدہ، متین اور صلح جو آدمی تھے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے، آمین !

جماعت اہلحدیث اور جامعہ سلفیہ کے لئے یہ عظیم نقصان ہے، اللہ تعالیٰ ان دونوں جگہوں پر ان کا نعم البدل عطا کرے،

جماعت کے شیرازہ کو منتشر ہونے اور جامعہ کی ترقی کو متاثر ہونے سے محفوظ رکھے ۔ آمین !

جامعہ محمدیہ رائیدرگ آندھرا پردیش ۔ جناب مولانا عبدالغنی سیفی عمری صاحب نے فرمایا :

۱۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء

۲۳۔

آپ کا مرسلہ ملفوف رنج وملال سے بھرپور دکھ درد کی المناک داستان وجماعت کا المیہ لے کر پہونچا ، ساری جماعت اہل حدیث رائیدرگ علماء وطلباء جامعہ کو بڑا صدمہ پہونچا ، چہروں پر غم والم کے آثار ظاہر ہونے لگے ، درد ودکھ سے زبانیں ساکت ہوگئیں ، بالکل ایک سکتہ کا عالم چھا گیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون !

جماعت اہل حدیث کو ٹکڑوں سے منتشر شیرازہ آپ کی پہلی امارت نے متحد ومتفق کردیا ، جماعت میں نظم وضبط پیدا ہوا ، دوسری امارت نے تو جماعت کو تبلیغی ودعوتی میدان میں بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھایا ۔

آہ ! یہ محبت واخلاص کا پیکر عظیم اس قدر عجلت سے ہم سب کو داغ مفارقت دے کر اپنے مولائے حقیقی سے جا ملا ، انا للہ ! اللّٰہم اغفرلہٗ ۔

اللہ پاک سے دعا ہے کہ رب العزت مرحوم کی حسنات وجماعتی خدمات کو قبول فرما کر ان کی لغزشوں کو معاف فرمادے ، آمین ! اور جماعت کے لئے ایک سچے ہمدرد مخلص رہنما نصیب فرما ، اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرما ، آمین !

جماعت اہل حدیث ہند اور مرکزی دار العلوم جامعہ سلفیہ بنارس ایک عظیم رہنما سے محروم ہوگیا ، انا للہ اللہم اجرنی فی مصیبتی واخلفنی خیرا منہ ۔

ڈمریا گنج سدھارتھ نگر ۔ جناب ڈاکٹر عبدالباری خان صاحب نے فرمایا :

۳۰ر نومبر ۱۹۸۰ء

۲۴۔ چار روز تاخیر کے بعد اچانک یہ خبر معلوم ہوئی کہ امیر جماعت اور ناظم جامعہ سلفیہ بنارس حضرت مولانا عبدالوحید صاحب سلفی مدظلہ العالی کا انتقال ہوگیا ہے ، اس خبر سے بے حد صدمہ ہوا ، ناظم صاحب کی عنایتیں اور ہمدردیاں جو ہمارے ساتھ تھیں اور جماعت

جامعہ سلفیہ کے لئے ان کی جو خدمات تھیں اس کو یاد کر کے بے حد کرب و تکلیف محسوس کر رہا ہوں، جس خلوص و محبت کے ساتھ ادارہ کی تعمیر میں اپنا قیمتی وقت دیتے رہے وہ لائق تعریف ہے، اور اس کا اجر صرف خدا ہی دے سکتا ہے، اس خادم کی دعا ہے کہ مولانا مرحوم کو جنت نعیم میں جگہ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، خدا سے مغفرت کی دعا ہے۔

مرکز العلوم الاسلامیہ چیذن بارہ بہار سے پیغام تعزیت :

۲۵ - کل من علیہا فان کی روشنی میں تشریف لانے والے ہر فرد بشر کے لئے فنا لازمی شئی ہے، اس میں چنداں شبہ نہیں کہ امیر محترم کی وفات اہل حدیثان ہند کے لئے ایک صدمۂ عظیم ہے، ہم جملہ اساتذہ اراکین اور طلبۂ مرکز العلوم الاسلامیہ اس وقت آپ کے دکھ و غم میں برابر کے شریک ہیں، لیکن دستور ازلی کو مدنظر رکھتے ہوئے صبر جمیل کے ساتھ ان کے تبلیغی دعوتی اور جماعتی سرگرمیوں سے وراثۃً دلچسپی ہی آپ کے لئے عین عقیدت و محبت ہے ــــ فاصبر صبراً جمیلا ۔

رب العالمین آپ کو صبر کی توفیق بخشے اور امیر محترم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین ثم آمین !

متحدہ عرب امارات سے ابنائے جامعہ سلفیہ نے فرمایا :

۲۶ - جامعہ سلفیہ کے ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید مرحوم کی سانحۂ وفات کی خبر ملک و بیرون ملک احباب جماعت نیز جماعت اور جامعہ سے علمی و فکری تعلق رکھنے والوں کے لئے باعث رنج و الم ہے، انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔ غفر اللّٰہ لہ وأعظم اجر الصابرین ۔

آپ کی وفات سے مرکزی جمعیۃ اہل حدیث اور جامعہ سلفیہ ایک بہت بڑے مخلص قائد سے محروم ہو گئی ہے، مرحوم کی شخصیت مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند اور جامعہ سلفیہ سے غیر معمولی وابستگی کے سبب عالم اسلام میں ایک محترم اور معتمد شخصیت کے طور پر متعارف تھی۔

اور یہ واقعہ ہے کہ مرحوم نے جامعہ سلفیہ کی تاسیس سے لے کر اس کی تعمیر و ترقی میں اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے فضل و کرم سے نہایت اہم رول ادا کیا ہے، عالمی سطح پر جامعہ کا علمی وقار بلند کرنے کی خاطر دامے درمے قدمے سخنے ہر ممکن قربانیاں دینے میں پیش پیش رہے برصغیر کے دینی اداروں میں جامعہ سلفیہ کا تعلیمی معیار بلند کر کے اسے امتیازی و مثالی حیثیت کا حامل ادارہ بنانے میں آپ نے بہت گہری دلچسپی لی۔

اس قدر عظیم ذمہ داریوں کے ساتھ گذشتہ کئی سالوں سے اعیان جماعت نے آپ کو جماعت کی امارت کی ذمہ داری بھی سونپ دی تھی، جسے مرحوم کثرت مشغولیت اور ذمہ داریوں کے تنوع اور ضخامت کے باوجود بحسن وخوبی نبھاتے رہے، اور یہ حقیقت ہے کہ جماعت ان دنوں جن حالات سے گذر رہی تھی اور آپ خود جن ظروف وحالات سے دوچار تھے اس کے پیش نظر آپ نے جماعت کی بہتری کے لئے بہت کچھ کیا، تقبل اللہ مساعیہ ۔

مرحوم کے اندر ایک بہت قابل قدر اور امتیازی شان یہ تھی کہ آپ غیر معمولی جماعتی، مسلکی غیرت وحمیت کے حامل تھے، اس کا اندازہ ان لوگوں کو اچھی طرح ہے جنہوں نے مرحوم کو قریب سے دیکھا ہے، یہی وجہ ہے مدۃ العمر، تمام مصلحتوں سے بالاتر، سلفیت کی حمایت اور اس سے دفاع اور اس سے مکمل وابستگی آپ کا نصب العین رہا، یہ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے مدعیان سلفیت کے قدم ڈگمگاتے دیکھے گئے ہیں، واہمانہ مصلحت پرستیوں سے تلون مزاجی اور ضعیف الاعتقادی کا شکار ہوگئے، فللہ درہ ۔

یہاں متحدہ عرب امارات میں مقیم تمام ابناء جامعہ سلفیہ نے خصوصاً اور ہندو بیرون ہند کے دیگر احباب جماعت نے مرحوم کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے اور جماعت وجامعہ کے لئے اپنی نیک تمناؤں کا بھی ۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمت ومغفرت کا مستحق بنائے، پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے، اور جماعت وجامعہ کو آپ کی جدائی سے جو خلا محسوس ہو رہا ہے اسے پُر کرنے کے لئے نعم البدل عطا کرے، وماذلک علی اللہ بعزیز ۔ ہم لوگوں کی ہمدردیاں اور نیک تمنائیں جماعت وجامعہ اور احباب جماعت کے ساتھ ہیں ۔

کلکتہ ؍ سے جناب مولانا محمد سلیمان میرٹھی صاحب نے فرمایا :

۲۷ ۔ مرحوم کے انتقال سے جماعت میں جو عظیم خلا پیدا ہوا ہے اور جامعہ اپنے یوم تاسیس ہی سے جس اجل جلیل کی رہنمائی واہتمام میں ترقی کے منازل طے کر رہا تھا اس سے محرومی ایک عظیم خلا ہے جسے آسانی سے پر نہیں کیا جا سکے گا ، وماذلک علی اللہ بعزیز ۔

انتقال کی خبر سے دل پر جو گذری وہ ناقابل تحریر ہے، موجودہ حالات میں جماعت اور جامعہ ہی کو نہیں بلکہ پوری قوم کو ایسے دور اندیش اور صاحب الرائے بزرگوں کی شدید ترین ضرورت ہے ۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں سے درگذر فرمائیں اور حسنات کو قبول کرتے ہوئے جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ، آمین ۔ میں اپنی اور جماعت اہل حدیث کلکتہ کی طرف سے یہ تعزیتی پیغام مرحوم کے ورثاء تک پہنچا رہا ہوں ، اللہ تعالیٰ ان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ہر طرح ان کا حامی وناصر ہو ۔

ـلگاؤں سے جناب فاروق اعظمی صاحب نے فرمایا:

۲۸۔ مولانا عبدالوحید صاحب سلفی امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند و ناظم جامعۃ السلفیہ بنارس کے انتقال پر ملال کی خبر بھی ... یہاں سے خبر ...لگاؤں پہونچی تو بجلی بن کر دل و دماغ کو ماؤف کر گئی، مرحوم سے بار بار دینی اجلاس واجتماعات اور جماعتی کانفرنسوں اور ...نگوں میں ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے، جب بھی ملے بڑے انشراح قلب، خلوص ومحبت اور خندہ پیشانی سے ملے، ہر ملاقات میں ...ے بھائی کی محبت، ایک بزرگ کی شفقت اور امیر کی امارت کا احساس بیک وقت بیدار ہو جاتا۔

موصوف انتہائی خلیق، ملنسار، متحمل مزاج، بردبار، متقی، پرہیزگار، شریف النفس اور معاملہ فہم انسان تھے، ان کی بے نفسی ...وضعداری سلف صالحین کی یاد تازہ کرتی تھی، یہی وہ اوصاف تھے جس کی وجہ سے اخوان اہل حدیث ہند نے انہیں جماعت کا امیر منتخب کیا تھا نیز ہندوستان کے سب سے بڑے سلفی ادارہ جامعۃ السلفیہ بنارس کی نظامت کا بوجھ بھی مرحوم ومغفور کے کاندھے پر ڈالا تھا، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات حسنہ کو قبول فرما کر ذخیرۂ آخرت بنائے، اور جماعت میں امارت اور نظامت کا جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا بہتر بدل عطا فرمائے، آمین!

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے، نیز ان کے پسماندگان اور متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ (آمین)۔

کرشنا نگر نیپال سے جناب مولانا عبداللہ مدنی صاحب نے فرمایا:

۱؍دسمبر ۱۹۸۹ء

۲۹۔ مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے امیر اور جامعہ سلفیہ کے ناظم اعلیٰ محترم مولانا عبدالوحید سلفی رحمہ اللہ کی وفات کی ولدوز اطلاع ملی، اس غمناک حادثہ نے ہم سب کو بے حد متاثر کیا، اس وقت جبکہ ان جیسے مخلص حساس اور دردمند دل رکھنے والے قائد کی زیادہ ضرورت تھی، وہ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے، اب ہمارے لئے قرآنی نقطۂ نظر کے مطابق "الذین اذا اصابتہم مصیبة قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون" کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہیں ہے، اللہ ہم سب کو صابرین میں سے بنائے۔

جامعہ سلفیہ کے قیام کے پہلے دن ربع صدی تک امانت عامہ کا بار عظیم جس ہمت لگن اور حوصلہ کے ساتھ اٹھایا وہ انہیں کا حصہ تھا

جامعات اسلامیہ کی تعلیمی تاریخ میں ان کی گرانقدر خدمات فراموش نہیں کی جاسکیں گی۔

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی امارت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد آپ نے جماعت کو بے حد منظم بنانے کی خاطر جو مخلصانہ کاوشیں کیں اس کے ثمرات سب کے سامنے ہیں، اور یہ ساری خدمات ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بنیں گی،

اللہ امیر رحمہ اللہ کو جنت الفردوس میں مقام بلند عطا فرمائے، اور جامعہ سلفیہ بنارس کے جملہ وابستگان، مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند سے تعلق رکھنے والے تمام افراد اور آپ کے اہل خاندان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے، اور جماعت اور جامعہ سلفیہ کو باوقار، مخلص اور باعمل قائد اور سربراہ عطا فرمائے۔ آمین!

پاکستان ؍ سے جناب مولانا حافظ صلاح الدین یوسف صاحب نے فرمایا:

۳۰۔ یہ خبر صاعقہ اثر برق خاطف بن کر گری، اور خرمن امن وسکون کو برباد کرگئی، حضرت مولانا مرحوم سے راقم کو ذاتی نیاز تو حاصل نہیں تھا، لیکن ان کے بارے میں جو تاثرات ہم تک پہنچے جو معلومات ہمیں حاصل ہوئیں، اور ان کے جو بعض فاضلانہ خطبہ ہائے صدارت نظر سے گذرے، ان سے اندازہ ہوتا تھا کہ موصوف خاندانی وجاہت وثروت کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی ایک عظیم شخصیت تھے جو علم وفضل کے اعتبار سے بھی نہایت ممتاز اور قیادت اور سیادت کی اعلیٰ صلاحیتوں سے بہرہ مند تھے۔

مولانا موصوف مرکزی دارالعلوم بنارس ہند کے بانی خاندان کے فرد ہی نہ تھے بلکہ اس عظیم ادارے کے ایسے ناظم تھے جن کو ادارے کے مفادات اور اس کی ترقی سے اسی طرح دلچسپی تھی جس طرح کسی شخص کو اپنے جگر پاروں سے محبت اور ان کے مفادات عزیز تر ہوتے ہیں، پھر اس سے بھی بڑھ کر وہ کل ہند سطح پر مرکزی جمعیت اہل حدیث کے امیر تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس منصب کے لئے بھی موزوں ترین آدمی تھے۔ گویا ؎ خلعتے ہست کہ بر قدِ او دوختہ اند۔

اس لحاظ سے بلاشبہ وہ دنیا ودین کی جامعیت کا ایک بہترین نمونہ، قدیم وجدید کا حسین امتزاج اور علم وفضل اور سیادت و قیادت کا ایک پیکر جمیل تھے۔

راقم کو سلفیان ہند کے جن موجودہ اکابر سے غایت درجہ عقیدت اور ان کی زیارت کی تمنا اور آرزو ہے، ان میں حضرت شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی حفظ اللہ صاحب مرعاۃ المفاتیح کے بعد مولانا عبدالوحید سلفی ہی دوسرے نمبر پر تھے جو اب ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے۔

۳۰ ستمبر و یکم اکتوبر ۱۹۸۹ء کو دہلی میں کل ہند شبان اہل حدیث کانفرنس کے لئے راقم کے نام بھی دعوت نامہ آیا تھا، لیکن اس وقت " تنقیح الرواۃ " جلد چہارم کی کتابت و تصحیح کا کام بالکل آخری مرحلے میں تھا، اسے اس لئے ادھورا چھوڑ کر جانا مناسب نہیں سمجھا۔

اب مولانا مرحوم کی خبر وفات کے بعد اپنے اس فیصلے پر بڑی ندامت ہو رہی ہے، کہ کاش دعوت نامے کے مطابق دہلی چلا جاتا تو مولانا مرحوم کی زیارت سے محرومی کا صدمہ تو نہ ہوتا، لیکن ۔ " ماشاء اللہ کان وما لم یشأ لم یکن " کے تحت مشیت الٰہی یہی کچھ تھی جو اب سامنے آئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، اور جماعت اہل حدیث کو ان کے نعم البدل سے نوازے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

المعہد الاسلامی نیپال ، سے جناب مولانا عبد المتین صاحب مدنی نے فرمایا:

۱۳۱ ۔ آپ کی وفات سے جامعہ اور جماعت کو جو صدمہ ہوا اور ان میں جو خلا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل نظر آتا ہے، محترم ناظم صاحب نے جس محنت وجانفشانی سے جامعہ سلفیہ کو تعلیمی و تعمیری میدان میں ترقی دی، ملک و بیرون ملک اس کا وقار بلند کیا، جس یکسوئی سے ایک چوتھائی صدی پر بے لوث اس کی خدمت کرتے رہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، اللہ تعالیٰ اسے قبول فرمائے، اور ان کے لئے توشۂ آخرت بنائے۔ آج جامعہ سلفیہ سے فیض یافتہ سبھی اشک بار ہیں، اور آپ کے لئے دعاء مغفرت کر رہے ہیں۔ اللّٰھم تقبل ۔

جماعت کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں اس وقت دی گئی جبکہ اس کی حالت بہت نازک تھی، آپ نے اپنی دانائی، دانشمندی، حکمت و بصیرت سے اسے جس مقام پر پہونچایا وہ سب پر عیاں ہے، ابھی کچھ دنوں قبل " کل شبان اہل حدیث کنونشن " کا انعقاد اور اس کا بحسن و خوبی اختتام اس کی زندہ مثال ہے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

وفات کی خبر پاکر بعد نماز عصر نماز جنازہ غائبانہ ادا کی گئی اور ایک تعزیتی اجلاس بھی منعقد کیا گیا، جس میں راقم الحروف اور مولانا عبد اللہ صاحب مدنی جھنڈانگری استاذ المعہد الاسلامی نے خطاب فرمایا، موصوف کی خدمات کو سراہتے ہوئے ان کی وفات کو برصغیر بلکہ دنیا بھر کے اہلحدیثوں کے لئے ایک عظیم سانحہ قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت کے لئے دعا کی، اور جماعت و جامعہ کے لئے اللہ تعالیٰ سے ان کا نعم البدل مانگا۔

تعزیتی اجلاس بر وفات حسرت آیات امیر جمعیۃ اہلحدیث ہند

امیر جمعیۃ اہل حدیث ہند و ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس جناب الحاج مولانا عبدالوحید عبدالحق صاحب سلفی کی وفات پر جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب رحمانی بن شیخ الحدیث علامہ عبیداللہ صاحب رحمانی مبارکپوری ناظم اعلیٰ مدرسہ عربیہ دارالتعلیم مبارکپور کی صدارت میں ایک تعزیتی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں مدرسہ کے اراکین، اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔

مولانا موصوف نے امیر جمعیۃ کے حیات، کارنامے اور خدمات پر مفصل روشنی ڈالی، اور آپ کی وفات کو نہ صرف جمعیۃ اہل حدیث ہند بلکہ پوری ملت اسلامیہ کا عظیم سانحہ قرار دیتے ہوئے فرمایا کہ مولانا کا وجود اس قحط الرجال کے دور میں ایک عظیم نعمت تھا، اور آپکی رحلت سے جماعت وملت بالخصوص جامعہ سلفیہ کو جو خسارہ لاحق ہوا ہے اس کی تلافی مشکل ہے۔

آخر میں صدر اجلاس نے انتہائی سوز و گداز کے ساتھ دعا کی کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں سے درگذر فرمائے اور انکی حسنات اور اجتماعی وملی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے اور انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ان کا حشر فرمائے، نیز ان کے اہل خانہ، اعزہ، اقرباء اور جملہ پسماندگان کو صبر جمیل اور ان کے اعمال صالحہ کو جاری رکھنے کی توفیق بخشے، اور جماعت و جامعہ سلفیہ کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

مدرسہ عربیہ دارالتعلیم، صوفی پورہ، مبارکپور۔ اعظم گڑھ

امیر جمعیۃ کی وفات پر

جامعہ محمدیہ میں تعزیتی اجلاس

محمد انور جامعی سلفی، جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں

۲۶ نومبر کی صبح محترم مولانا مختار احمد صاحب ندوی نائب امیر مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند و مدیر جامعہ محمدیہ منصورہ نے ٹیلی فون کے ذریعہ جمعیۃ اہلحدیث ہند کے امیر محترم، جامعہ سلفیہ بنارس کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا عبدالوحید عبدالحق السلفی کے انتقال پر ملال کی اندوہناک خبر دی اس خبر نے تمام اساتذہ کرام کو آبدیدہ کر دیا۔ اطلاع کے فوراً بعد جامعہ محمدیہ اور مدرسہ عائشہ صدیقہ میں تعطیل کردی گئی، طلبہ اور طالبات کو ہدایت کردی گئی کہ مرحوم کے حق میں دعائے خیر کریں، نیز بعد نماز ظہر مرحوم کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی گئی۔

بعد نماز عصر مسجد میں ہی تعزیتی مجلس منعقد ہوئی جس میں تمام اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔ قلت وقت کے باوجود اکثر اساتذہ نے مرحوم کی وفات پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

محترم مولانا عبیداللہ صاحب کشمیری نے موصوف کی وفات کو جمعیۃ اہلحدیث ہند، جامعہ سلفیہ بنارس اور تمام مسلمانان ہند کے لیے عظیم نقصان قرار دیا۔ آپ نے فرمایا ایسی شخصیتیں بار بار دنیا میں نہیں آتیں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

محترم مولانا نور العین صاحب سلفی نے فرمایا: دنیا میں جو بھی آتا ہے جانے کے لیے ہی آتا ہے، لیکن یہ المیہ بڑا ہے کہ جانے والے کی جگہ پر نہیں ہو پاتی۔ مرحوم بھی ایسی ہی عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کی کمی پوری نہیں کی جا سکتی۔
ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب سلفی نے ناظم صاحب رحمہ اللہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا: کہ موصوف اوصاف

حمیدہ اور خصائل جمیلہ کے مالک تھے، غنی اور استغنا، آپ کا نمایاں وصف تھا۔ آپ نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ سب کو ساتھ لے کر چلیں۔

مولانا عبدالقدوس صاحب سلفی نے کہا آپ اپنی خوبیوں کی وجہ سے طلبہ اور اساتذہ سب کے لیے پرکشش تھے، سب آپ کو دل وجان سے چاہتے اور آپ کا انتہائی احترام کرتے تھے۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب سلفی نے فرمایا: ہم اہلحدیثوں پر خصوصاً اور تمام مسلمانانِ ہند پر عموماً مصائب وآلام لامتناہی سلسلہ چل پڑا ہے۔ مولانا اسلم کا پنوری کی وفات، مولانا عبدالمبین صاحب منظر کی وفات، بدایوں اور بھاگلپور کے مسلمانوں کے قتل عام کے غموں سے ہم بوجھل تھے کہ اپنے امیر محترم اور ناظم عمومی جامعہ سلفیہ بنارس کی وفات کی خبر ہم پر بجلی بن کر گری۔ موصوف جن خوبیوں کے مالک تھے وہ بیک وقت ایک شخص میں مشکل ہی سے پائی جاتی ہیں۔ اللہ آپ کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند کرے۔

اخیر میں محترم شیخ انیس الرحمان صاحب اعظمی عمری (شیخ الجامعہ) نے اپنے خطاب میں فرمایا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ دنیا کو شھداء اللہ فی الأرض۔ زمین پر اللہ کے گواہ۔ فرمایا ہے۔ یہاں پر اتنے اساتذہ کرام کے مرحوم کے حق میں کلماتِ خیر واقعی اللہ کے گواہوں کی گواہی ہے ؂

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو!

آپ نے فرمایا: مرحوم سے میرا راست تعلق آٹھ سال (جامعہ سلفیہ میں تدریس کا زمانہ) تک رہا، اس بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ امانت ودیانت، اخلاص وللہیت، وقار وحلم، اخلاق وکردار، انتظام وانصرام کی ساری صلاحیتیں کسی شخصیت کے اندر بدرجہ اتم موجود تھیں تو وہ مرحوم کی ذاتِ گرامی تھی۔

آپ نے فرمایا: ایک مرتبہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے استاذ شیخ محمد مجذوب کی جامعہ سلفیہ آمد ہوئی جونہی آپ کی نگاہ ناظم صاحب مرحوم پر پڑی تو فرمایا: من هذا؟ وجه وجه أمين۔ یہ کون ہیں؟ ان کا چہرہ امانتدار کا لگتا ہے۔

آپ نے فرمایا: موصوف ایک عرصہ سے جمعیۃ اہلحدیث کے امیر تھے، اسی دوران آپ کی صحت روز بروز گرتی چلی گئی۔ جوں جوں علاج ہوتا رہا مرض بڑھتا ہی گیا۔ کئی مرتبہ آپریشن بھی ہوا۔ آخری عمر میں شدت کے ساتھ آپ کو اس کا احساس تھا کہ وہ جمعیۃ کی امارت کے متحمل نہیں ہیں۔ آپ نے بارہا کوشش فرمائی کہ اس بارِ گراں

سے سبکدوش ہوجائیں، لیکن اراکین کے اصرار نے آپ کو خاموش کردیا۔ اس پر جماعت کے چند احباب نے بڑا واویلا مچایا، آپ پر طنز کیا۔ طعنے دیے، ہر طرح سے آپ کو تکلیف پہونچائی۔ لیکن آپ نے اپنے خلاف محاذ بنانے والوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ بلکہ یہ اللہ کا بندہ سب کچھ سنتا اور برداشت کرتا ہوا اپنے خالق حقیقی سے جاملا: اللّٰھمّ اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ وادخلہ الجنۃ الفردوس۔

اخیر میں آپ نے فرمایا جامعہ سلفیہ بنارس اور جمعیۃ اہلحدیث ہند اس وقت نازک مرحلوں سے گزر رہے ہیں، بلکہ یتیم ہوچکے ہیں۔ ایسے عالم میں کوئی نظر نہیں آتا جو جامعہ اور جمعیۃ کے اس بارگراں اور قومی و جماعتی امانت کو اٹھاسکے۔ نظریں ہر چہار جانب اٹھتی ہیں اور مایوس ہوکر لوٹ آتی ہیں ؂

غنچے خموش، پھول پریشاں، چمن اداس
کیا کہہ گئی یہ بادِ صبا سوچنا پڑا!

اخیر میں آپ کی ہی رقت انگیز دعائے مغفرت پر یہ تعزیتی اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ ...

محمدیہ طبیہ کالج منصورہ میں تعزیتی اجلاس

۲۷ر نومبر صبح گیارہ بجے محمدیہ طبیہ کالج منصورہ میں جمعیت اہلحدیث ہند کے امیر محترم اور جامعہ سلفیہ بنارس کے ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید صاحب سلفی رحمہ اللہ کی وفات پر ایک تعزیتی اجلاس منعقد ہوا جس میں محترم مولانا عبید اللہ صاحب کشمیری اور کالج کے اساتذہ و ذمہ داران نے مولانا مرحوم کی وفات پر گہرے رنج وغم اور دکھ کا اظہار کیا۔ آپ کی وفات کو ملک و ملت کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان قرار دیا۔

محترم شیخ انیس الرحمان صاحب اعظمی عمری نے فرمایا: مولانا مرحوم کی ذات گرامی محمدیہ طبیہ کالج کے لیے نئی نہیں ہے۔ آپ کالج کے بانیوں میں سے تھے۔ سب سے پہلے ناظم صاحب مرحوم اور مولانا مختار احمد صاحب ندوی

ے جامعہ سلفیہ بنارس میں طبیہ کالج قائم کیا، لیکن نامساعد حالات، وجوہات اور دشواریوں کی بنا پر
ں کو مجبوراً بند کرنا پڑا۔ جامعہ محمدیہ منصورہ کے قیام کے بعد اس کے بانی مولانا ندوی صاحب نے مولانا مرحوم
ے مشورہ کرکے منصورہ میں طبیہ کالج قائم کیا۔

آپ نے فرمایا: مولانا مرحوم کے احسانات، ہمدردیاں اور مفید مشورے جامعہ محمدیہ کے ساتھ محمدیہ طبیہ
لج کے ساتھ بھی تادم زیست قائم رہے۔

اس تعزیتی مجلس کا اختتام آپ کی دعائے مغفرت پر ہوا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ ...

امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کی وفات پر

ریاض میں تعزیتی اجلاس

"مولانا عبدالوحید صاحب سلفی ناظم جامعہ سلفیہ بنارس و امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند آخرت کو سدھار گئے"۔ یہ تھے وہ غمناک الفاظ جو ۲۶ نومبر کی صبح سعودی عرب کے شہر ریاض میں مقیم سلفی اخوان کی سماعت پر بجلی بن کر گرے، اور چند گھنٹوں کے اندر شہر کے طول و عرض میں پھیلے اخوان کو سوگوار کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

یوں تو انسانی زندگی کے ساتھ غم و خوشی اور موت و حیات کے سلسلے جڑے ہوئے ہیں اور ذات الٰہی کے علاوہ بقا کسی کو حاصل نہیں، مگر انسانی معاشرہ کی بعض شخصیتیں ایسی زمانہ ساز ہوتی ہیں کہ وہ اپنی قائدانہ صلاحیتوں، بے پناہ لیاقتوں اور دوسرے اوصاف و محاسن کی بنا پر مدتوں یاد کی جاتی رہیں گی۔ ان کی موت صرف ایک فرد، ایک ذات کی موت نہیں ہوتی بلکہ ایک قوم ایک جماعت اور ایک عہد کی موت ہوتی ہے۔ برسوں کی ریاضت اور تدریب کے بعد قوم کی رہنمائی کیلیے اس طرح کے اولوالعزم قائد ملتے ہیں۔ ایسی شخصیتیں جب اچانک درمیان سے اٹھ جاتی ہیں تو نہ صرف یہ کہ رنج و غم اور صدمات و افسوس کی وجہ سے پوری قوم پریشان ہو جاتی ہے، بلکہ وقتی طور پر ایک ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے، جس میں دور تک تاریکی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر پھر مشیت الٰہی اپنے نظام کے مطابق اس خلا کو پُر کر دیتی ہے، اور انسانی معاشرہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔

مولانا عبدالوحید عبدالحق سلفی "تغمدہ اللہ برحمتہ واسکنہ فسیح جناتہ" بلاشبہ ان مخلص، باعزم و ہمت، امین اور خداداد صلاحیت سے متصف ان سلجھے ہوئے رہنماؤں میں سے تھے جو اپنی قائدانہ لیاقتوں اور مستحسن کارناموں کی بدولت عہد ساز ہوتے ہیں، جو اپنی اعلیٰ بصیرتوں اور صلاحیتوں کی بنیاد پر زندگی کے تمام گوشوں میں قوم و ملت کی رہنمائی فرماتے رہیں اور جن کا مقصد رضائے الٰہی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا، ان کے اخلاص اور حسن نیت کا ثمرہ ہوتا ہے

کہ وہ جن امور میں ملت کی قیادت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان میں خیر و برکت کا نزول فرماتا ہے اور پوری ملت اس سلسلے میں ان کی مساعدت کرتی ہے۔

مولانا کے خلوص اور شب و روز محنت و لگن کا نتیجہ جامعہ سلفیہ بنارس آج ہمارے سامنے ہے، جس کے بارے کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ اس کی آبیاری میں جہاں پوری سلفی جماعت ،،خواہ وہ داخل ہند کی ہو یا بیرونِ ہند کی،، شریک ہے وہیں ایک باغبان کی ذمہ داری کے جو فرائض مرحوم نے ادا کیے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند کے دس سالہ دور قیادت میں امیر مرکزی جمعیۃ کی حیثیت سے انھوں نے جس قدر توازن، دانشمندی اور دیانت و امانت کے ساتھ پوری سنجیدگی و بصیرت سے جماعت کے کاز کو آگے بڑھایا وہ بھی محتاج بیان نہیں۔

چنانچہ جب ناظم صاحب ،،رحمہ اللہ وغفرلہ وجعل الجنۃ مثواہ،، کی وفات کی اطلاع بذریعہ فون ۲۵ رنومبر کی شب ڈاکٹر محمد لقمان سلفی صاحب حفظہ اللہ کو ملی اور ۲۶ رنومبر کی صبح بنارس سے اس کی تصدیق ہوگئی تو علی الصباح یہاں کے تمام اخوان میں رنج و غم اور صدمات کی لہر دوڑ گئی اور دن بھر سارے لوگ سوگوار رہے۔ اسی وقت اس حادثۂ جانکاہ کی اطلاع سماحۃ الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز حفظہ اللہ رئیس ادارۃ البحوث العلمیۃ والافتاء والدعوۃ والارشاد کو دی گئی اور سماحۃ الشیخ حفظہ اللہ نے تعزیتی کلمات فرماتے ہوئے مرحوم کے لیے دعاء مغفرت کی اور اسی وقت اپنے سکریٹری کو دارالافتاء کی جانب سے مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند، جامعہ سلفیہ بنارس اور سوگوار خاندان کو تعزیتی ٹیلی گرام بھیجنے کا حکم صادر فرمایا۔

شام کو اخوان کا ایک تعزیتی اجلاس ڈاکٹر محمد لقمان سلفی صاحب حفظہ اللہ کے مکان پر منعقد ہوا، جس میں یہاں مقیم تمام اخوان نے شرکت کی اور مرحوم کے لیے اجتماعی دعاؤں کے علاوہ ان کے مختلف کارناموں کا ذکر کیا۔ شرکاء اجلاس میں ڈاکٹر صاحب موصوف کے علاوہ، مولانا عبدالقدوس نذیر احمد سلفی، مولانا عبدالرشید ازہری، حافظ محمد اسماعیل سلفی، مولانا محمد اسحاق محمد ابراہیم سلفی، حافظ محمد الیاس عبدالقادر سلفی، حافظ محمد طاہر سلفی، مولانا عبدالحی سلفی، مولانا عبدالصبور سلفی، مولانا عبدالقادر سلفی قابلِ ذکر ہیں۔ بعض احباب نے ٹرانسپورٹ کی دقت کے پیش نظر فون پر اپنے قلبی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کے لیے دعاء مغفرت کے ساتھ اجلاس میں شرکت سے معذوری

ظاہر کردی تھی ۔

اجلاس میں مرحوم کی دینی، ملی، جماعتی، ادارتی، سیاسی، انتظامی، رفاہی، تمام امور میں ان کی گہری بصیرت و دانشمندی اور بر وقت عملی اقدام کرنے کی خداداد لیاقت کا تذکرہ کیا گیا ۔ اور اللہ رب العالمین سے مرحوم کی مغفرت پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق اور مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند جامعہ سلفیہ بنارس اور جماعت کو ان کا نعم البدل اور صحیح جانشین عطا کرنے کی دعا کی گئی ، بلا شبہ ان کی جدائی سے جمعیۃ ، جامعہ اور جماعت کو جو ناقابل تلافی نقصان پہونچا ہے ۔ سوائے اس ذاتِ الٰہی کے کوئی دوسرا اس نقصان کو پورا نہیں کرسکتا ۔

اجلاس میں فوری طور پر دو تعزیتی ٹیلی گرام کا مسودہ تیار کیا گیا جو ۲۴ر نومبر کو ہندوستان بھیجدیا گیا ۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے ، ان کی لغزشوں کو معاف کرے اور جنت الفردوس میں ان کو جگہ عطا کرے ، اور ہم سب کو ان کا صحیح جانشین ، ان کے کاز پر عمل کرنے والا اور ان کی طرح توحید و سنت کا خادم بنائے ۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ وتغمدہ برحمتک وادخلہ الجنۃ مثواہ ، اللھم تقبل یارب العالمین ،

مرکزی جمعیۃ اہل حدیث ہند ، جامعہ سلفیہ بنارس اور برصغیر کی پوری جماعت اہلحدیث ہند کو اس وقت جو صدمہ پہونچا ہے ، ریاض اور سعودی عرب میں مقیم تمام اخوان ، جماعت کے اس غم میں شریک ہیں ۔ •••

منظوماتِ

از قلم ـــ محمد حبیب اللہ شہیم صدیقی، اترولہ گونڈہ

اظہارِ حقیقت

اے خوشا جمعیت بستی و گونڈہ مرحبا — دونوں کی کوشش سے تھا اجلاس نوگڈھ کا ہوا
آج تقریباً ہوئے اس واقعے کو تیس (۳۰) سال — جب ہوئے تھے عالمانِ عصرِ حاضر ایک جا
رہبرانِ دین و ملت ہند و بیرونِ ہند کے — زینتِ اجلاس سب تھے پورے شوق و ذوق سے
اک خصوصی میہماں بھی تھے سعودی کے سفیر — یعنی والا جاہ حضرت یوسف الفوزان تھے
اک طرف تو تین دن اجلاس بھی جاری رہا — سامعین وعظ پر اک کیف سا طاری رہا
اک طرف کچھ مسئلوں کے حل کی جدوجہد تھی — ہاں مگر اک مسئلہ تکمیل سے عاری رہا
اس سے ہٹ کر مدرسوں پر گفتگو ہونے لگی — یعنی ہے معیارِ تعلیمی پہ اک پژمردگی
گو پچاسوں مدرسے اس ملک میں موجود ہیں — ہے مگر ہر ایک میں معیارِ اعلیٰ کی کمی
اس لئے ایسے ادارے کی ضرورت آج ہے — جو کرے معیارِ تعلیمی کی ہر منزل کو طے
مختلف درجات ہوں تعلیم کے تحقیق کے — ہو ترقی کے مدارج کے لئے ہر ایک شئے
ہو گئی منظور یہ تجویز تو اٹھا سوال — شہر ہو گا کون سا اس کے مناسب حسبِ حال
بحث ہوتے ہوتے دہلی یا بنارس پر رکی — تو بنارس کے لئے نکلا بالآخر نیک فال
کچھ دنوں کے بعد آخر مدرسہ بن کر رہا — مرکزی دارالعلوم اس کا مقدم نام تھا
سلسلہ تعلیم و تربیت کا جب جاری ہوا — تو یہی پھر جامعہ سلفیہ کہلانے لگا
مرحبا وہ وقت تھا کس درجہ بابرکت سعید — ناظمِ اعلیٰ ہوئے جب حضرت عبدالوحید
تھوڑی مدت بعد آیا وہ بھی دن جب آپ کو — صدر جمعیت کا عہدہ بھی ملا اس پر مزید

دونوں عہدوں پر رہے اک شان محبوبی سے وہ
اور کار منصبی کرتے رہے خوبی سے وہ

ایک مدت تک رہے فائز بغیر اختلاف
مسئلے حل کرتے تھے پوری خوش اسلوبی سے وہ

چونکہ حق پہچاننے کی ان کو حاصل تھی تمیز
حق کو حق کہنے سے مانع تھی نہ ہر گز کوئی چیز

اس لئے تھا مبنی بر انصاف ان کا کام اور
صدر و ناظم دونوں حیثیت میں تھے ہر دلعزیز

اک زمانے تک رہا سب کچھ مناسب پاک صاف
ان کے بارے میں نہ تھا ہر چند کوئی اختلاف

ہاں مگر امراض جسمانی مخالف ہو گئے
پھر نہ آخر کر سکا پیک اجل ان کو معاف

اس طرح وہ ہو کے عاجز غمزدہ اندوہگیں
چھوڑ کر خویش و اقارب اہل خانہ کو غمیں

چل دیئے دار فنا سے سوئے فردوس بریں
رحم فرما ان پر اے رب رحیم الراحمین

تھے جناب عبدالوحید اہل خرد دانا عقیل
یہ بھی واضح ہے کہ تھے لاریب اک مرد جلیل

خاص نمبر ہے محدث کا شہیمؔ اس واسطے
تاکہ ہو تاریخ میں محفوظ یہ ذکر جمیل

نذرانۂ الفت و محبت

برائے حضرت العلام مولانا عبدالوحید صاحب سلفی رحمہ اللہ تعالیٰ

ازقلم ـــ حبیب اللہ شمیم صدیقی ۔

تھے زعیم قوم و ملت حضرت عبدالوحید
یعنی مولانائے عالی مرتبت عبدالوحید

ہے مرے قلب و نظر میں الفت عبدالوحید
فاش می بینم جمالِ صورتِ عبدالوحید

تازہ تر رکھنا اگر ہے ان کے ذکرِ خیر کو
تو پڑھو گاہے بگاہے سیرتِ عبدالوحید

یاد دل میں موجزن ہے عزت و توقیر سے
اور نظروں پر مسلّط الفتِ عبدالوحید

اس تعلق کو دوامی شکل دینے کے لئے
خاص نمبر کو ہے حاصل نسبتِ عبدالوحید

جامعہ کے بام و در میں صحنِ مسجد میں ہنوز
گشت کرتی پھر رہی ہے نکہتِ عبدالوحید

ذکر ان کا زینت قلب عزیز و اقربا
اور نظروں میں جمال صورتِ عبدالوحید

جامعہ کے ناظم اس پر صدر جمعیت بھی تھے
مجمع البحرین تھی شخصیتِ عبدالوحید

مبدءِ فیاض کی بے پایاں بخشش کے طفیل
بے نیاز غیرِ حق سے تھے حضرتِ عبدالوحید

مال و زر علم و عمل فکر و نظر کے تھے امیں
یوں بہر صورت غنی تھے حضرتِ عبدالوحید

تاجرانہ ذہن زیرِ سایۂ اسلام تھا
اس لئے تھی تاجروں میں وقعتِ عبدالوحید

صالحوں کے ساتھ ہو گا تاجرِ صادق امیں
کاش پائیں یہ قرابت حضرتِ عبدالوحید

اک مدبر اک مفکر دیدہ ور روشن ضمیر
نکتہ سنجی دور بینی فطرتِ عبدالوحید

اک کریم النفس عالم و مائل اعمال خیر
ہے دلیل خاص بہر عزتِ عبدالوحید

ترش روئی تلخ گوئی سے انھیں تھا اجتناب
خندہ روئی خوش کلامی خصلتِ عبدالوحید

جام دسنداں باختن سے واقف و آگاہ تھے
بادۂ وحدت کا ساغر راحتِ عبدالوحید

میں نہیں کہتا کہ تھے ہر چند ما فوق البشر
ہاں مگر ممتاز تھی بشریتِ عبدالوحید

امتیاز خیر و شر پر تھی بڑی گہری نظر
لائقِ تعریف تھی یہ خصلتِ عبدالوحید

نفس امّارہ پہ قابو ہو جسے وہ مرد ہے
دیدنی اس امر پہ ہے ہمتِ عبدالوحید

ہے جری جو نفس و شیطاں کو شکست فاش دے
ہے عیاں اس ضمن میں بھی جرأتِ عبدالوحید

جس جگہ پہونچے وہاں عزت ملی وقعت ملی
اور کی تسلیم سب نے عظمتِ عبدالوحید

وارد مکہ ہوئے جب تو ائمہ نے بشو ق
مؤمنانہ شان سے کی عزتِ عبدالوحید

ساری تحریراتِ نظم و نثر کا موضوع خاص
ہے پئے حسن عقیدت مدحتِ عبدالوحید

فکرِ دنیا سے بڑی حد تک رہے وہ بے نیاز
تھی مگر محشر کی بخشش حسرتِ عبدالوحید

ہے ضروری بعد رحلت اے عزیزانِ کرام
ہو دعائے مغفرت سے نصرتِ عبدالوحید

دو عدد زائد پہ لکھو عیسوی سن اے شمیم
بھولنا دشوار تر ہے رحلتِ عبدالوحید

۸۹+۲ + ۵۱۱ + ۶۱۵ + ۶۳۸ + ۱۳۵ =

۱۹۹۰ء

(حضرت شاکر گیاوی)

غم جو قدرت کی طرف سے آئے تم اسکو سہو
مرضیٔ مولا پہ راضی صابر و شاکر رہو

داغِ فرقت ملک و ملت کو اچانک دے گئے
وہ امیر مرکزی جو تھے نہایت صاف گو

دے گئے پیغام ہم کو اپنے حال و قال سے
کہہ دو ہر ہر فرد سے کروٹ بدل، اٹھو اٹھو

چاہئے دونوں پہ ہو تیری نگاہِ دُور بین
فکرِ دنیا میں رہ اور دین بھی دل میں سہو

صاف اور ستھری سی ہے تیری صراطِ مستقیم
ایسی سیدھی راہ میں لِلّٰہ تو کانٹے نہ بو

دین خالص کا شبانہ یوم ہو خدمت گزار
صفت اپنے قیمتی اوصاف کو ہرگز نہ کھو

عظمتِ رفتہ کی اپنی بازیابی کے لئے
رب کے آگے سرنگوں ہو رب کے آگے خوب رو

کیا بتاؤں کیا تھے وہ اہل حدیثوں کے امیر
کیا سناؤں کس قدر تھے ان میں اوصاف نکو

سالِ رحلت کی اگر شاکر ہو تم کو جستجو
"حضرت عبدالوحید راہبر ازکیٰ" کہو
— ۱۹۹۰ء — ۸۹

سایۂ افسردگی

(بر وفات مولانا عبدالوحید رحمۃ اللہ علیہ)

مجاز اعظمی

روح فرسا حادثے باچشم نم دیکھا کریں، ہم مشیت کا یہ اندازِ کرم دیکھا کریں،

سایۂ افسردگی عرب و عجم دیکھا کریں جس طرف نظریں اٹھیں تصویر غم دیکھا کریں

اوّلِ شب کون اس خاکِ عجم سے اٹھ چلا آبدیدہ رات بھر شمع حرم دیکھا کریں

بزم سے ناگاہ اٹھ جانا امیرِ بزم کا بے صدا سازِ قضا کا زیر و بم دیکھا کریں

جانے والے کا عجب انداز تھا ہر گام پر دیر تک اہلِ نظر نقش قدم دیکھا کریں

گفتگو میں دلنوازی تھی کہ ہر دل کی صدا وہ رہیں محو تکلم اور ہم دیکھا کریں

منصب عز و شرف پر وہ مثالی انکسار ایسے کم ہوں گے یہاں جو خود کو کم دیکھا کریں

اجتماعِ دین و دنیا تھا، مگر کس شان سے آستانِ دین پر دنیا کو خم دیکھا کریں

ایک سکتہ ہوگیا طاری جب آئی ہے خبر دم بخود قاصد ہمیں قاصد کو ہم دیکھا کریں

ختم ہے اک بابِ زریں خدمت و اخلاص کا ملک و ملت اس کو حسرت سے بہم دیکھا کریں

سرنگوں ہے جو جماعت کی قیادت کا علم کون بڑھ کر اب اٹھائے وہ علم دیکھا کریں

اے خدا ان پر ہوں تیری رحمتیں شام و سحر مرقدِ پرنور میں باغِ ارم دیکھا کریں

ان کے اوصافِ حمیدہ ضبط کرنے میں مجاز
ٹوٹ جائیں گے بہت سارے قلم دیکھا کریں

★

یادش بخیر

بر وفات مولانا عبدالوحید صاحب ناظم اعلیٰ سلفیہ

یادش بخیر شیخ جواں دل بخلد رفت — آمد خبر کہ میرِ افاضل بخلد رفت
عبدالوحید ناظمِ اعلیٰ وفات یافت — آں پختہ کار و جوہرِ قابل بخلد رفت
آں پیکرِ خلوص و وفا درجہاں نماند — آں صدرِ بزم رونقِ محفل بخلد رفت
آں پیشوائے خلق بہ سیرِ جناں رسید — آں مردِ پاک طینت و عاقل بخلد رفت
آں ناخدائے کشتیٔ اربابِ سلفیہ — کشتی رسید چوں لبِ ساحل بخلد رفت
آں صاحبِ کمال بہ یک ناخنِ ہنر — صدہا کشودہ عقدۂ مشکل بخلد رفت
تیرہ شد ند قلب و نظر از فراقِ اُو — آں نورِ چشم و روشنیٔ دل بخلد رفت
محروم گشت سلفیہ از نورِ فیضِ اُو — آں چرخِ علم را مہِ کامل بخلد رفت
چوں مژدۂ وصال رسید از قضائے حق — نغمہ سرائے ہمچو عنا دل بخلد رفت
ذاتش کہ بود مغتنم از بہرِ علمِ دیں — سیر آمدہ ز فرطِ مشاغل بخلد رفت
احباب را کہ از غمِ ہجرش قرار نیست — بگذاشتہ چو طائرِ بسمل بخلد رفت
روشن نمودہ درجہاں شمعِ علومِ دیں — دادہ نشانِ جادۂ منزل بخلد رفت
در بست و پنج ماہ نومبر بوقتِ شام — در روزِ شنبہ آں مہِ کامل بخلد رفت

شوقؔ از برائے سالِ وفاتش چو فکر کرد
آمد ندا ز غیب جواں دل بخلد رفت
۱۴۱۰ ھ

تہذیب کا ساغر

وفا صدیقی
بھوپال

حضرت مولانا عبدالوحید سلفیؒ امیر جمعیۃ اہلحدیث ہند کی وفات پر ایک تاثر

ویراں ہوئی بزم دیدہ وراں تہذیب کا ساغر ٹوٹ گیا
جو مرکز علم و دانش تھا افسوس وہی گھر ٹوٹ گیا

وہ شمع سحر بے نور ہوئی جس شمع سے محفل روشن تھی
وہ خوشبو فضاؤں میں گم ہے جو خوشبو سرو گلشن تھی

گلزار سلف شاداب ہے وہ نظم صباحت ڈھونڈتی ہیں
ارباب گلستاں کی نظریں گم گشتہ قیادت ڈھونڈتی ہیں

ہر گام اندھیرا چھایا ہے، ہر گام ہزاروں طوفاں ہیں
کس سمت چلیں کس موڑ رکیں اب قافلے والے حیراں ہیں

منزل کا پتہ جو دیتا تھا وہ میل کا پتھر ٹوٹ گیا
ویراں ہوئی بزم دیدہ وراں تہذیب کا ساغر ٹوٹ گیا

جس سمت بھی دیکھو جامعہ میں اک عالم گریاں طاری ہے
دروازوں پر دیواروں پر اک منظر حیراں طاری ہے

اخلاق و مروت تھے جس میں نظروں سے وہ صورت اوجھل ہے
بے کیف ہوئے منظر سارے ہر منظر ذہن پہ بوجھل ہے

جو عزم و عمل کا پیکر تھا صد حیف وہ پیکر ٹوٹ گیا
ویراں ہوئی بزم دیدہ وراں تہذیب کا ساغر ٹوٹ گیا

کب قائم و دائم دنیا ہے یہ دنیا عالم فانی ہے
دو لمحوں کا اک قصہ ہے دو لفظ کی ایک کہانی ہے

جو آتا ہے وہ جاتا ہے اور موت سبھی کو آتی ہے
پر موت جہاں میں عالم کی عالم کا زیاں بن جاتی ہے

ایسا ہی وفاؔ اک کوہِ الم، دل والوں کے دل پر ٹوٹ گیا
ویراں ہوئی بزم دیدہ وراں تہذیب کا ساغر ٹوٹ گیا

ایم، اے غفار خوشتر اصلاحی
مدیر اعلیٰ
"دعوت صادق" پٹنہ
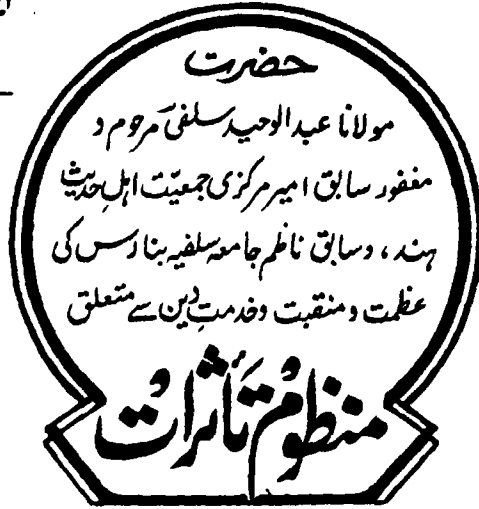
پیکرِ خلق واخلاص وشیریں بیاں		ان کی عظمت کا ہر سمت چرچا عیاں
ہر دلوں پہ محبت کا سکّہ رواں		آج ہے ان کی رحلت کا غم بیکراں

دین کے رہنما قوم کے پاسباں
کیوں نہ آنکھیں ہوں انکے لئے خونفشاں

ملتِ بیضا کے اک مجاہد تھے، وہ		اور "سلفی جمعیت" کے قائد تھے، وہ
نیرّ "آسمانِ عبادت" تھے، وہ		مردِ میدانِ ملکِ عدالت تھے، وہ

دین کے رہنما قوم کے پاسباں
کیوں نہ آنکھیں ہوں انکے لئے خونفشاں

زندگی ان کی دینی امانت رہی		خدمتِ دین میں عمر ان کی کٹی
جامعہ کو ملی ان سے تابندگی		ایک عالم کو ان سے ملی روشنی

دین کے رہنما قوم کے پاسباں
کیوں نہ آنکھیں ہوں انکے لئے خونفشاں

پھر ہے صحنِ چمن غمزدہ باغباں		پھول پژمردہ غنچے بھی ہیں خوں چکاں

دے رہا ہے خراج عقیدت یہاں سرنگوں ہو کے خامہ مرا بے گماں

دین کے رہنما قوم کے پاسباں
کیوں نہ آنکھیں ہوں انکیلئے خونفشاں

غم کو پاکر بھی وہ مسکراتے رہے "راہِ منزل" سبھوں کو بتاتے رہے
شمع طوفاں میں بھی وہ جلاتے رہے قلب مضطر کو خوشتر بناتے رہے

دین کے رہنما قوم کے پاسباں؛
کیوں نہ آنکھیں ہوں انکے لئے خونفشاں

ضروری اعلان

کاغذ کی گرانی اور طباعت کی شرح میں اضافہ کی وجہ سے محدث کا

مجبوراً یکم جنوری سنہ ۹۱ء سے سالانہ زر تعاون ۴۵ روپے اور

ایک شمارہ کی قیمت ۴ روپے کی جا رہی ہے۔

— اِدارہ محدث

عبدالوحید نازشِ ایمان چلا گیا

عبدالرؤف حیرت السلفی ، سدھارتھ نگری

افسوس اپنا محسن ذی شاں چلا گیا
دے کر نشاطِ روح کا ساماں چلا گیا

انسانیت کی زلف معطر سنوار کر
وہ باکمال ، محترم انساں چلا گیا

اس کی زباں سے پھول برستے تھے علم کے
رعنائی سخن کا گلستاں چلا گیا

وہ اک اداشناس تھا تعمیر دین کا
دارالعلوم جس پہ تھا نازاں چلا گیا

نغمات حرم صبح بنارس کی فضائیں
مہکا کے ایک مرد مسلماں چلا گیا

دانشوری کو دیدہ وری جس نے سکھائی
وہ عاشق محاسن قرآں چلا گیا

اسلام کا نقیب ، مبلغ حدیث کا
عبدالوحید نازش ایماں چلا گیا

ملت کا غم گسار ، مسیحائے وقت تھا
جو بانٹتا تھا درد کا درماں چلا گیا

حیرت کی یہ دعا ہے الٰہی تو بخش دے
وہ تھا بہارِ خلد کا خواہاں چلا گیا

اک آہ تو..

ازقلم، حمّاد انجم، ایڈوکیٹ

اکے تیری یاد میں کھوئی ہے جمعیت تری
دم بخود، نم دیدہ سب کو کرگئی رحلت تری

جانے کیوں رہ رہ کے مجھ کو یاد آتا ہے بہت
تو کہ دیکھی بھی نہ تھی میں نے کبھی صورت تری

ہاں! ترے چرچے سماعت میں ہیں رس گھولے ہوئے
ذہن ودل میں "بے غبار آئینہ" ہے سیرت تری

تیرے علم وفن کے احباب ومعاند معترف
تھی بہت مقبول خاص وعام شخصیت تری

خوئے درویشی وشانِ خسروانہ ہم کنار
آئینہ دارِ جلالت ہے جمالیت تری

تیرے در پر مطمئن جویائے اسرار ونکات
حرف آخر کی طرح بے لاگ ہے حجت تری

ہوگئے ہیں سیر تجھ سے تشنہ کامانِ علوم
"چشمۂ صُفّہ" کی صورت جاری علمیت تری

"جامعہ سلفیہ" اور "جمعیت اہل حدیث"
آبِ زر سے ہے رقم دونوں طرف خدمت تری

ہاتھ میں لی تونے اورنگِ سلیماں کی زمام
مسند نظم وقیادت کی صلاحیت تری

نسبتِ اسلاف تیرے نام کا اک جزو ہے
پوری آب وتاب سے واضح ہے سلفیت تری

دین ودنیا کی متاع بے بہا قدموں میں تھی
بارگاہِ ایزدی میں خم عبودیت تری

دیکھتے تھے دیکھنے والے تماشائے کرم
بے خبر بٹتی رہی ہاتھوں ترے دولت تری

پاک باز وپاک طینت، نیک نام ونیک کار
یوں بھی تو مشہور ہے "بے داغ ہے شہرت تری"

مصرعۂ طرح دعا حمّاد کے ہونٹوں پر ہے
"نور سے روشن رہے آٹھوں پہر تربت تری"

ثبت ہے تیرا بھی عالم کے جریدے میں دوام!
ہر زماں زندہ رہے گا تا قیامت تیرا نام!

سانحہ ہے جاں گسل صبر آزما

وحید العصر جناب مولینا عبد الوحید صاحب ناظم جامعہ سلفیہ بنارس و امیر جمعیۃ اہل حدیث ہند کی خبر وفات سے متاثر ہو کر ..

از، عبدالغنی عبدالرحمٰن فیضی سلفی رجامعہ فیض عام مئو۔

رونقوں کا شہر ہے حسرت بھرا — حلقۂ حق آشنا محزوں ہوا !
آہ ! مرگِ حضرت عبد الوحید — سانحہ ہے جاں گسل صبر آزما
علم کے شیریں کا وہ فرہاد تھے — معاملوں کے تھے عجب عقدہ کشا
شہر میں تھے مرجعِ اہل نظر — ملک میں تھے اہل حق کے مقتدیٰ
حاصلِ کشت عمل ہے سلفیہ — جس نے سلفیت کو پھر زندہ کیا
حاصل ذہن رسا عرضِ ہُنر — جامہ پوشِ بے نمود و بے ریا
ذات میں دریائے ناپیدا کنار — وصف میں مجموعہ صدق و صفا

چھن گیا جب سے مرا یارائے ضبط — آنسوؤں کا سلسلہ جاری رہا
رحمت حق سایہ افگن ہو دوام
ان کی تربت پر ہے فیضی کی دُعا

عبدالوحید نازشِ دوراں نہیں رہا

سالک بستوی

زخمِ غمِ حیات کا درماں نہیں رہا
نباضِ قوم عیسیٰ دوراں نہیں رہا

وہ رازدار محفلِ یاراں نہیں رہا
وہ غمگسار بزمِ عزیزاں نہیں رہا

وہ اسوۂ رسول کا شیدا چلا گیا
عبدالوحید نازشِ دوراں نہیں رہا

مغموم زندگی کی کرے کون دل دہی
وہ دل نواز محسنِ انساں نہیں رہا

دریائے اضطراب کی طغیانیاں نہ پوچھ
تسکین قلب و روح کا ساماں نہیں رہا

عالم تھا بے مثال مدبر تھا باکمال
دارالعلوم جس پہ تھا نازاں نہیں رہا

نغموں سے جس کی صبح بنارس تھی غیرتیاب
سازِ حرم کا اب وہ غزلخواں نہیں رہا

باچشم نم ہے آج زلیخائے کائنات
زنداں شکن وہ یوسف زنداں نہیں رہا

ہوش و خرد کے رخ پہ وہ تابندگی نہیں
علم و ادب کا آہ! نگہباں نہیں رہا

غنچوں کے لب پہ وہ حسیں مسکان اب کہاں
نازاں تھا جس پہ اپنا گلستاں نہیں رہا

ابھرے ہوئے ہیں چہروں پہ کیسے نقوش درد
وہ زندگی کے باب کا عنواں نہیں رہا

عبدالوحید سلفی جماعت کا تھا امیر
افسوس اب وہ جانِ بہاراں نہیں رہا

عالم کی موت، موت ہے عالم کی دوستو
اسلام کا وہ نیرِ تاباں نہیں رہا

دکھتی ہوئی رگوں کو سکوں بخشتا تھا وہ
سالک وہ چارہ سازِ مریضاں نہیں رہا

تاریخی مادّے

اور

قطعات

تاریخی مادے

بروفات
مولانا عبدالوحید صاحب سلفی
رحمۃ اللہ

نتیجۂ فکر
جناب شاکر گیاوی

(۱) تاریخ یا سال رحلت جناب مولانا عبدالوحید صاحبؒ
۸۹ ۱۹ء

(۲) پیر ہادی وحید طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ
۸۹ ۱۹ء

(۳) آہ مولانا عبدالوحید بھی فوت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون
۱۰ ۱۴ھ

(۴) غفرلہ اللہ الوحید
۱۰ ۱۴ھ

(۵) امیر مرکزی فغفر اللہ لہ
۱۰ ۱۴ھ

(۶) حیف امیر مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند بھی چل بسے بھائی
۱۰ ۱۴ھ

(۷) آہ ہادی بدا مولانا عبدالوحید بھی فوت ہوگئے، انا للہ وانا الیہ راجعون
۱۰ ۱۴ھ

(۸) مولانا عبدالوحید ازہر جنت الفردوس
۱۰ ۱۴ھ

(۹) حضرت مولانا عبدالوحید صاحب والسلفی
۸۹ ۱۹ء

(۱۰) مولانا عبدالوحید سلفی اب وحید جنت الفردوس
۱۰ ۱۴ھ

(۱۱) پیر ہادی وحید ادخل لہ اللہ الفردوس
۱۰ ۱۴ھ

قطعاتِ سنِ وفات

بر وفات حضرت آیات حضرۃ العلام مولانا الحاج عبد الوحید صاحب رحمہ اللہ

نتیجۂ فکر: محمد حبیب اللہ شہیم صدیقی گونڈوی

عالم بے مثل تھے عبد الوحید نکتہ بیں
دیدہ ور، بالغ نظر، سنجیدہ دل، اہلِ یقیں

ہاں مگر حکمِ خدا سے پی کے جامِ مرگ آج
اب ہوئے آخر کو وہ بھی راہیٔ خلدِ بریں

= ۸۹۶ + ۲۱۷ + ۲۳ + ۸۲۸ + ۲۵

۱۹۸۹ء

عمر بھر کرتے رہے تربیتِ اہلِ حدیث
ان کا مقصد تھا کہ ہو تقویتِ اہلِ حدیث

آہ لیکن کر گئے رحلت تو یوں لکھو شہیم!
ہے وفاتِ رہبرِ جمعیتِ اہلِ حدیث

= ۵۵۸ + ۵۲۳ + ۴۰۷ + ۵۰۲

۱۹۸۹ء

علمِ دیں، علمِ تجارت میں تھے یکتا اور طاق
جامعہ کی نصرت و وسعت میں تھے چوبند و چاق

اِس خصوصیت کے باعث لے جنابِ عبد الوحید
لگ اب ہے روح فرسا آپ کا داغِ فراق

= ۱۳۸۶ + ۲۵ + ۵۵۵ + ۲۳

۱۹۸۹ء

دین میں ہیں جتنے ارکان و فرائض یا وجوب
تاحدِ مقدور کرتے تھے عمل مرحوم خوب

صدرِ جمعیت بھی تھے لیکن کیا دنیا سے کوچ
اس طرح گویا ہوا اب بدرِ جمعیت غروب

= ۱۷۳۱ + ۲۰۶ + ۵۲

۱۹۸۹ء

اک زعیم قوم و ملت اور اک فرد فرید — جان نثار مسلک اسلاف اک مرد سعید
بندۂ مخلص تھا تیرا اے خداوند مجید — ہے دعا ہو آج حکم بخشش عبد الوحید

= ۱۳۵ ۱۲۰۲ + ۷۳

۱۴۱۰ھ

شرک و بدعت سے یقیناً صاف تھا ان کا نہج — اس بنا پر رکھ خدایا حامل سنت کی لاج
بخش دے ہر بھول نسیاں یا الٰہی اور پھر — ہو منور روح نور طلعت سے مرقد میں آج

= ۴۴۴ + ۴۴۵ + ۲۱۴ + ۳۱۷

۱۴۱۰ھ

لاریب تھے وہ دین و شریعت کے خیر خواہ — تھے جامعہ کے حسن تدبر سے سربراہ
اب جامعہ کو چھوڑ چلے تو کہو شہیم — لو غم فزدش جامعۂ سلفیہ ہے آہ

= ۲۲ + ۳۰۵ + ۵۸۲ + ۱۶۲

۱۹۸۹ء

رکھتے تھے جامعہ کو دل و جان سے وہ حبیب — پر آج اس سے دور ہوئے اب نہیں قریب
رب کریم تیرے کرم کے طفیل سے — ہو جائے اب بھی ناظم نعم البدل نصیب

= ۱۵۲ + ۲۲۶ + ۹۹۱ + ۱۵ + ۲۵

۱۴۱۰ھ

نظم

مستخرجہ سال وفات حضرت امیر مولانا عبدالوحید سلفی رح

حسن منظور حسن (بی۔ اے آنرز)
ایم، اے ۔ قدما جمشید پور

دارِ فانی سے گیا دے کر ہمیں رنجِ شدید
مسلک اسلاف کی تجدید کا فردِ وحید

یادگار اپنی بنام مرکزی دار العلوم
دے گیا جس سے ہوں اہل علم ودانش مستفید

دردمندِ ملک وملت مخلص و باحوصلہ
اور جانے خوبیاں کس قدر تھیں اس میں مزید

مال ودولت اپنی وہ کرتا تھا ملت پر نثار
اس کی ہوتی تھی سبق آموز ہر گفت وشنید

دوراندیش و وسیع القلب اور ہر دل عزیز
تاجرِ ممتاز تر جود وسخا میں وہ فرید

دعوت فکر وعمل وہ دیتا رہتا تھا سدا
بند ہو دروازۂ دین تو اس کا تھا کلید،

داستانِ ماسبق کی طرح اس کی داستاں
زندہ وپائندہ رہ جائے کہ جیسے ہو جدید

اس کی رحلت کا ہمیں جو غم ہے اکیں اے خدا
صبر دے ایسا کہ ہم سے ہو نہ بے صبری پدید

دین ودنیا دی جو چھوڑا ہے اس نے قیمتی
یاالٰہی اس کا وہ ترکہ ہو ہم سب کو مفید

تھا فدائی ملت بیضا کا جو ہے لازوال
اس سے روشن تھا چراغ سیدِ احمد شہید رح

یہ دعا ہے اے حسن دیگر مناہی کے ہوا
"شرک بھی معدوم کردے مرقدِ عبدالوحید رح"

خوشتر اصلاحی

تاریخ رحلت

جناب مولانا عبد الوحید صاحب سلفی رحمہ اللہ

گلستان سلفیہ[1] کے باغباں
ملت اسلامیہ[2] کے پاسباں
سیر کرنے جنت الفردوس کی
دار فانی سے گئے ہیں بے گماں

(۱)

ان کے افکار ملل اے ہوشمند
تھے مقامات تخیل سے بلند
خدمت دیں میں یہ انکا حال تھا
ڈالتے تھے وہ ثریا پر کمند

(۲)

شہرت و مقبولیت کے آفتاب
الفت خلق خدا کے ماہتاب
اللہ اللہ ان کی شان امتیاز
آفتاب آمد دلیل آفتاب

(۳)

ہر طرح سے تھی غنیمت انکی ذات
دے گئے وہ بھی ہیں داغ ممات
خوشتر بس تاریخ رحلت لکھ دو یہ
چودہ سو دس[۱۴۱۰] ہجری ہے سال وفات

(۴)

(۱) جامعہ سلفیہ بنارس۔ (۲) مرکزی جمعیت اہل حدیث ہند۔

ماہنامہ

بنارس

شمارہ ۳ مارچ ۱۹۹۱ء شعبان ۱۴۱۱ھ جلد ۱۰

مدیر

عبدالوہاب حجازی

پتہ

دارالتالیف والترجمہ

بی ۱۸/۱ جی ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰

بدلِ اشتراک

سالانہ ۴۵ روپے، فی پرچہ ۴ روپے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپکی مدت خریداری ختم ہوچکی ہے۔

اس شمارہ میں

افتتاحیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رمضان المبارک اور خلیجی بحران کی کڑی آزمائش

محدث کے انہیں صفحات میں سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کے اس ایک بے نوا غلام نے امت محمدیہ کو کویت قضیہ اور خلیجی بحران کے متعلق اس کا حقیقی فریضہ یاد دلایا تھا، لیکن ہمیں نہایت صفائی سے یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ہم اس فریضہ کی ادائگی میں کامیاب نہ ہو سکے اور نتیجۃً ہمیں اس سخت آزمائش سے دوچار ہونا پڑا، جس کے لئے پہلے خبردار کیا جاچکا تھا، مختلف النوع تباہیاں اور بربادیاں کس کس مقدار پر جاکر رکیں گی، اس کا حقیقی علم صرف رب العالمین کو ہے " وکل شیٔ عندہ بمقدار (۸/۱۳) وان من شیٔ إلا عندنا خزائنہ وما ننزلہ إلا بقدر معلوم، (۱۵/۲۱) " ہماری کوتاہی، غفلت، فرض ناشناسی دینی، ملی واجتماعی بے حسی کے سبب بحر و بر میں فساد عام ہو چکا ہے، معروف کے غلبہ اور منکر کے ازالہ کا مہندس وانجینئر خیر وصلاح کے محلات وقصور کہاں تعمیر کر رہا ہے، ہماری غفلت شعار اور معصیت اطوار نگاہیں اس کی کھوج نہیں لگا سکتیں، کلام ربانی نے تو بہت پہلے مجازات عمل کا ترازو ہمارے سامنے پیش فرمادیا تھا۔

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس لیذیقھم بعض الذی عملوا لعلھم یرجعون ۔ قل سیروا فی الارض فانظروا کیف	لوگوں کے برے اعمال کے سبب بر و بحر میں فساد پھیل گیا ہے تاکہ۔ قانون مجازات کے مطابق۔ اللہ لوگوں کو ان کے اعمال کا کچھ مزہ چکھا دے تاکہ وہ باز آجائیں ہے نبی کہو کہ زمین کی سیر کرد پھر دیکھو کہ پہلے کے لوگوں کا

كان عاقبة الذين من قبل، كان اكثرهم مشركين ۔ فاقم وجهك للدين القيم من قبل أن يأتي يوم لا مرد له من الله يومئذ يصدعون ۔ من كفر فعليه كفره ومن عمل صالحا فلأنفسهم يمهدون ۔ ليجزي الذين آمنوا وعملوا الصالحات من فضله، انه لا يحب الكٰفرين ۔ ومن آيته ان يرسل الريح مبشرات و ليذيقكم من رحمته ولتجري الفلك بامره ولتبتغوا من فضله ولعلكم تشكرون ۔ ولقد أرسلنا من قبلك رسلا إلىٰ قومهم فجاؤهم بالبيّنٰت فانتقمنا من الذين اجرموا وكان حقا علينا نصر المؤمنين ۔ (سورۃ الروم ۴۲، ۴۷)

کیا انجام ہوا، ان میں بیشتر مشرک تھے تو تم اپنا چہرہ درست دین کی طرف سیدھا رکھو اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جسے اللہ کی طرف سے ٹلنے کا حکم نہ ہوگا، اس روز لوگ ایک دوسرے سے جداجدا ہو جائیں گے، جس نے کفر کیا ہے تو اسی پر اس کے کفر کا وبال ہے، اور جس نے اچھا عمل کیا ایسے لوگ اپنے لئے سامان کر رہے ہیں، تاکہ اللہ ان لوگوں کو اپنے فضل سے بدلہ دے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کئے، یقیناً وہ انکار کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا، اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ بشارت دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے تاکہ تمہیں اپنی رحمت چکھائے اور اس کے حکم سے کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کی روزی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر گزار بنو، اور ہم نے یقیناً اے نبی تم سے پہلے بہت سے رسول ان کی قوم کی طرف بھیجے، وہ ان کے پاس واضح دلیلیں لائے؛ پھر ہم نے مجرموں سے انتقام لیا اور مؤمنوں کی مدد اور غلبہ ہمارے ذمہ ہے۔

سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی پیروکار امت محمدیہ کلام ربانی کی ان آیات میں چند امور پر غور فرمائے۔

- بحر و بر میں پھیلتا فساد انسانی اعمال بد کے سبب سے ہے، جب بداعمالیاں حد سے گذر جاتی ہیں تو رب العالمین لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے ان برے اعمال کی کچھ سزا کڑی آزمائشوں کی شکل میں دیتا ہے۔
- گذشتہ اقوام جن کے اکثر افراد شرک کرتے تھے، یعنی اللہ کے حقوق اپنی من پسند مخلوق کو دیتے تھے اسی انجام سے دوچار ہوئیں۔
- اس درست اور مضبوط دین پر ثابت قدم رہنا چاہیے جو توحید خالص اور رسالت محمدی کا دین ہے ورنہ قیامت آجانے پر

بداعمالیوں کی پوری سزا مل کر رہے گی ۔

- انکار اور کفر کرنے والوں کو اپنے کفر کے وبال میں گرفتار ہونا ہے ، اچھے اعمال کرنے والوں کو اللہ کے فضل سے اچھا بدلہ ملنا ہے ، اللہ کفر و انکار کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا ۔
- اللہ بشارت دینے والی ہوائیں اس لئے بھیجتا ہے تاکہ عام انسانوں کو اپنی رحمت سے نوازے ، اس کے حکم سے تجارتی کشتیاں اور بیڑے دریاؤں اور سمندروں میں چلیں ، اور لوگ روزی تلاش کریں اور اللہ کی شکر گذاری کریں ، ناشکری سے بچیں ورنہ تجارتی بیڑے جنگی بیڑوں میں تبدیل ہو جائیں گے ۔
- خاتم الأنبیاء والرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ نے ہر امت میں رسول بھیجے ہیں ، ان کی واضح ہدایات کو نہ مان کر جو لوگ مجرم بن گئے ، اللہ نے ہمیشہ ان سے بدلہ لیا ہے اور انھیں سزا دی ہے ، اور مومنوں کی مدد اور غلبہ کا ذمہ اللہ نے خود لیا ہے ۔

خلیجی بحران جیسی سخت آزمائش نے امت محمدیہ کو غم و اندوہ سے نڈھال کر دیا ہے ، جانی و مالی تباہیاں بے اندازہ ہیں ، اس نوع کی آزمائشوں میں ظالم اور غیر ظالم کی تمیز اٹھالی جاتی ہے اور ان کے قدر و مقدار کا حقیقی پیمانہ سود و زیاں صرف اللہ ہی کے پاس ہوتا ہے امت مسلمہ کی سیاسی گتھیاں جو سلجھتی نظر آرہی تھیں پھر سے الجھ گئیں ہیں ، اس کے اتحاد کی چولیں نہایت سختی سے ہل گئی ہیں ، مسلم عوام جذباتی ہیجان میں مبتلا ہو کر اپنے ہی بھائیوں کو سب و شتم ، لعن طعن اور جدال و قتال کا نشانہ بنا رہے ہیں ، حتی کہ ایک مسلم باپ نے اپنے گریجویٹ بیٹے کو اس بنا پر گلا دبا کر مار ڈالا کہ اس نے عراقی صدر کے حق میں کلمۂ خیر نہیں کہا ، یہ حال اس امت کا ہے جو ساری دنیا کے لئے نمونۂ خیر بنا کر بھیجی گئی ہے ، دنیا کی قیادت و سیادت اپنا فرض اور حق سمجھتی ہے ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی علمبردار ہے لیکن اقوام عالم کی نظر میں غفلتوں ، بداعمالیوں اور کوتاہ اندیشیوں کے سبب خود اپنے دام میں پھنسی ہوئی اور اس کے نتیجہ میں اللہ کی سخت آزمائش میں گرفتار غیر نافع اور نااہل سیادت و قیادت قوم ہے ، توحید الٰہ جو کائنات ارضی و سماوی کی سب سے بڑی طاقت اور سپر پاور ہے ، اس کڑی آزمائش میں بھی مسلمان اس کی قدر و قیمت پہچاننے سے قاصر ہے ، وہ اس عقیدہ پر فخر کر رہا ہے کہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی قبر کے پاس اتحادی کافروں کے ذریعہ جو اٹھارہ ٹن کا بم گرایا گیا ، شیخ نے اپنی ما فوق البشر قوت سے اسے بے اثر کر دیا ، یہ عقیدہ امت محمدیہ کے عقیدۂ توحید کے بالکل منافی ہے ، اگر شیخ میں فی الواقع یہ قوت ہوتی تو وہ نہ صرف اپنی قبر کو بلکہ بغداد اور پورے خلیجی خطہ کو اس حرب و ضرب سے بچا سکتے تھے ۔

امت محمدیہ آج اپنے ہاتھوں پیدا کئے ہوئے جس بھاری مرض میں گرفتار ہو چکی ہے اس کے علاج کے لئے آج بھی کچھ مسلمان اجمیر ، بغداد ، نجف اور کربلا کے شفاخانوں کے نسخے تلاش کر سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان نسخوں سے حاصل ہونے والا سکون

" لگے دم مٹے غم " کے سکون سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا، بعض مسلمان جنیوا، لندن اور واشنگٹن کے شفاخانوں کو اولیت دے سکتے ہیں، لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں سے حاصل ہونے والی خواب آور گولیاں امت محمدیہ جیسی موحد امت کی حقیقی صحت کے لئے مضر ہیں، اس مرض کا علاج وہی ہے جو ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا، امت فریضۂ صلوٰۃ کی پابندی سے اپنے الٰہ واحد سے رابطہ استوار کرے، مختلف پگڈنڈیوں پر بھٹکنے کے بجائے سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی شاہراہ مستقیم پر گامزن ہوجائے، فریضۂ حج اس خلوص وللٰہیت سے ادا کرے کہ پوری امت محمدیہ تنِ واحد بن جائے، زکوٰۃ کا فریضہ قائم کرکے غریب مسلمانوں کا درد بانٹ لے، اور فریضہ صیام رمضان قائم کرکے وہ خیر امت بن جائے کہ رب العالمین کی رحمت ومغفرت کے بادل جس پر ٹوٹ کر برسنے کے لئے بیتاب ہوتے ہیں۔

رمضان المبارک کا مہینہ حصول تقویٰ کا مہینہ ہے، اس میں ایک مسلمان اللہ سے ڈرتے رہنے اور ہر نشیب وفراز اور آزمائش وکشاکش میں اس کے احکام کی پابندی پر جمے رہنے کی عادت پیدا کرتا ہے اس مہینہ میں مسلمان اللہ کی بڑائی بیان کرتے رہنے کا خوگر بنتا رہتا ہے، اس مہینہ میں مسلمان اللہ کی عطا کردہ نعمتوں پر شکر گذاری کرتے رہنے کا شعار اپنالیتا ہے، یہ مہینہ اسے صبر واستقلال کی چٹان بنادیتا ہے، اور جود وسخا کی ملکوتی قبا پہنادیتا ہے، امت محمدیہ اگر خلیجی بحران کی اس کڑی آزمائش میں صیام رمضان کا فریضہ ان آداب کے ساتھ ادا کرلے جائے جو سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم نے روزوں کے تحفظ کے لئے سکھائے ہیں تو اس کے دل پر قرآن وسنت کی ساری تعلیمات نازل ہوجائیں، اور اس کے گوشت پوست میں رچ بس جائیں، اسی مہینہ میں آج سے چودہ سو سال پیشتر ہمارے سرکار پر کلام الٰہی قرآن مجید اور احادیث نازل ہوکر آپ کی نبوت کا سبب بنی تھیں، اور حضرت عیسیٰ وموسیٰ، داؤد اور ابراہیم علیہم السلام پر اسی مہینہ میں انجیل وتوراۃ زبور اور صحف ابراہیم کے نزول نے انھیں منصبِ نبوت سے سرفراز کیا تھا۔

خلیجی بحران کی کڑی آزمائش سے گھبرا کر امت محمدیہ کا ایک طبقہ جس طرح ہیجان وغضب میں مبتلا ہوگیا ہے اور خیر امت کے منصب سے ہٹ کر جس طرح کے کردار کا مظاہرہ کر رہا ہے، مجھے یقین ہے کہ اگر اس میں ایمان کی ادنیٰ رمق بھی باقی ہے تو صیام رمضان اور اس سے متعلق آداب نبوت اسے صحیح اور بھرپور اسلامی زندگی عطا کرسکتے ہیں، اور امت متحدہ سیادت وقیادت اتفاق واتحاد دعوت وارشاد اور ترقی وازدہار کی جس منزل تک پہونچ چکی تھی اس میں مزید خوشگوار پیش رفت کا سبب بن سکتے ہیں۔

صحیح بخاری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے " الصیام جُنۃ " روزہ ڈھال ہے جیسے جنگ کی ڈھال ہوتی ہے، جہنم سے بچنے، خواہشات نفسانی کی اذیتوں سے تحفظ اور حصول ثواب اور اضافۂ حسنات کے لئے ڈھال ہے، آپ نے فرمایا کہ جب روزہ کے ایام ہوں تو " لا یرفث ولا یصخب ولا یجهل " فحش کلامی، جماع، محرکات جماع، جاہلوں جیسے کام، جیسے چیخنا

چلانا اور بے عقلی وحماقت کا مظاہرہ کرنا تاکید کے ساتھ منع ہے، آپؐ نے فرمایا: " وان امرؤ قاتله او شاتمه فليقل انی امرؤ صائم "۔ اگر کوئی شخص روزہ کے دنوں میں لڑائی جھگڑا، لعن طعن اور گالی گلوج کرے تو اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ نہ کیا جائے بلکہ زبان اور دل سے کہا جائے کہ میں روزے سے ہوں، آپؐ نے فرمایا ہے: " من لم يدع قول الزور والعمل به فليس لله حاجة فی ان يدع طعامه وشرابه "۔ روزہ کے ایام میں جو شخص جھوٹ بولنا اور جھوٹ کے مقتضیٰ پر عمل کرنا نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو اس کی کوئی حاجت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑے رکھے، حبرالامت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں " كان اجود بالخير من الريح المرسلة " عام بارش برسانے والی ہوائے رحمت سے بڑھ کر جود وسخا اور بر واحسان کا معاملہ سبھی لوگوں کے ساتھ کرتے تھے، آپؐ نے فرمایا ہے: " من قام ليلة القدر ايمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه، ومن صام رمضان ايمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه "۔ جو شخص ایمان کے ساتھ اور طلبِ ثواب کے لئے شب قدر کی عبادت کریگا اس کے پہلے کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے اور جو شخص ایمان کے ساتھ اور طلبِ ثواب کے لئے رمضان کے روزے رکھے گا اس کے پہلے کے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔ قرآن مجید میں رب العالمین نے روزہ کا مقصد یہ بتایا ہے کہ آدمی تقویٰ شعار بن جائے، یعنی اللہ سے ڈرنے لگے، اور اس کے تمام احکام کی ہر حال میں پیروی کرے، يا ايها الذين آمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون۔ (البقرۃ/۱۸۳)۔ اے ایمان لانے والو! روزہ تم پر فرض کیا گیا ہے جیسے تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم لوگ تقویٰ شعار بن جاؤ، ایک مقصد روزہ کا یہ بتایا گیا: " ولتكبروا الله على ما هداكم ولعلكم تشكرون۔" (البقرہ/۱۸۵) اللہ نے جو ہدایت دی ہے اس پر اس کی بڑائی بیان کرتے رہو، اور ہر حال میں اس کا شکر ادا کرتے رہو۔

احادیثِ اشراط محمد رشید رضا کی نظر میں

ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری

اکثر لوگ یہ حقیقت بخوبی جانتے ہیں کہ عقیدۂ یوم آخرت کو اسلام کے بنیادی عقائد میں ایک خاص مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص دائرۂ اسلام میں مکمل طور سے داخل نہیں ہو سکتا، اسی طرح یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ اس یوم موعود کا صحیح علم اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خاص مصلحت اور حکمت کے پیش نظر اسے لوگوں سے صیغۂ راز میں رکھا ہے، صرف وہی جانتا ہے کہ یہ دن کب آئیگا۔ چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

قل إنما علمها عند ربي لا يجليها لوقتها إلا هو (۱)	کہہ دے یہ صرف میرے رب ہی کو معلوم ہے وہی اپنے وقت پر قیامت کو دکھلائے گا۔
يسئلونك عن الساعة أيان مرسٰها فيم أنت من ذكراها، إلى ربك منتهٰها (۲)	تجھ سے پوچھتے ہیں قیامت آخر کب آئے گی، بھلا تجھ کو اس کے ذکر سے کیا فائدہ؟ قیامت کا علم تیرے رب ہی پر جا کر ٹھہرتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی علامتوں اور نشانیوں کی تعیین فرما دی ہے جن سے قرب قیامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تاکہ لوگوں کو انابت إلی اللہ اور توبہ و استغفار کا موقع مل سکے (۳)

عام طور سے قرآن وحدیث میں ان نشانیوں کے لئے "اشراط الساعۃ" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اور لفظ "اشراط"

(۱) سورۃ الأعراف، آیۃ ۱۸۷ ۔ (۲) سورۃ النازعات: آیت ۴۲ ـ ۴۴۔

(۳) حافظ ابن حجر وغیرہ نے علامات قیامت کی یہی حکمت بیان کی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو: فتح الباری (۱۱/ ۳۵۰)۔

شرط کی جمع ہے، لغت میں شرط علامت کو کہتے ہیں، اسی سے "شرطی" (پولیس) کا لفظ مشتق ہوا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس دوسروں سے ممیز کرنے والی ایک خاص علامت ہوتی ہے (۱)۔

علامہ بیہقی رحمۃ اللہ علیہ "اشراط الساعۃ" کے معنی کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ "ای مایتقدمہا من العلامات الدالۃ علی قرب حینہا" قرب قیامت پر دلالت کرنے والی ان نشانیوں کو کہتے ہیں جو قیامت سے قبل رونما ہوں گی (۲) اسی طرح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ لفظ کے مقصود کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اشراط" ان علامات کو کہتے ہیں جن کے واقع ہونے کے بعد قیامت قائم ہوگی (۳)

ان نشانیوں کے لئے احادیث میں "علامات" "امارات" "آیات" کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں۔ قرآن کریم میں ایک جگہ اجمالی طور سے "اشراط الساعۃ" کا ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

فہل ینظرون إلا الساعۃ أن تاتیہم بغتۃ فقد جاء أشراطہا۔ (۴)	تو اے پیغمبر! یہ (مکہ کے) کافر کس بات کے منتظر ہیں، بس اسی کا راستہ دیکھ رہے ہیں کہ یکایک قیامت (ان کے سر پر) آن کھڑی ہو تو قیامت کی نشانیاں آچکی ہیں۔ ...

اور کہیں کہیں بعض متعین علامات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مثال کے طور پر خروج یاجوج ماجوج، نزول عیسیٰ علیہ السلام اور خروج دابۃ، لیکن قرآن کا شارح اور مبین ہونے کی حیثیت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بے شمار احادیث میں ان علامات کی مکمل طور سے وضاحت فرمادی ہے تاکہ لوگ قیامت سے غافل نہ رہیں، اور ایسا نہ ہو کہ غفلت ہی کی حالت میں قیامت برپا ہوجائے، توبہ واستغفار اور رجوع الی اللہ کی مہلت ان کو نصیب نہ ہوسکے، اور ہم جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کامل یقین رکھتے ہیں ہمارا فریضہ بنتا ہے کہ آپ کی تمام احادیث جو ہم تک صحیح سند سے پہونچی ہیں ان پر مکمل ایمان لائیں، ان میں کسی قسم کی تفریق یا تقسیم سے گریز کریں۔ اور اسی امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وما آتاکم الرسول فخذوہ، وما	اللہ کے رسول تمہیں جو حکم دیں اسے پکڑ لو، اور جس سے

---

(۱) دیکھو: النہایۃ فی غریب الحدیث (۲/۴۶۰)۔ (۲) البعث (ص ۹۹) تحقیق الصاعدی۔

(۳) فتح الباری (۱۳/۷۹) (۴) سورۂ محمد۔ آیت: ۱۸۔

نہاکم عنہ فانتہوا ۔(۱) روکیں اس سے باز آجاؤ ۔

اسی سے یہ حقیقت بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تمام علامات اور نشانیاں جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبل از قیامت واقع ہونے کی پیشین گوئی فرمادی ہے ان پر بغیر کسی تمیز اور تخصیص کے ہر مسلمان کا ایمان لانا واجب اور ضروری ہے ، اسی وجہ سے بہت سے علماء سلف نے اپنے دوٹوک الفاظ میں اس امر کی وضاحت فرمائی ہے ، چنانچہ فقہ اکبر میں بعض علامات کی نشاندہی کے بعد کہا گیا ہے کہ " اور وہ تمام علاماتِ قیامت جن کے بارے میں صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں برحق ہیں ، اور وہ واقع ہو کر رہیں گی ۔(۲)

امام موفق ابو محمد مقدسی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی تفصیل سے اس پر کلام کیا ہے ، وہ فرماتے ہیں کہ : وہ تمام امور جن کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خبر دی ہے ، اور ہم تک وہ صحیح سند سے پہونچی ہیں ۔ چاہے ان کا تعلق عالم مشہود سے ہو یا عالم غیب سے ، ان پر ایمان لانا اور ان کی صداقت وحقانیت کا اعتقاد رکھنا واجب اور ضروری ہے ، خواہ وہ ہماری عقل میں سما سکیں یا ہماری عقل سے بالاتر ہوں ، یا ہم ان کی حقیقت سے ناآشنا ہوں ... اسی قبیل سے علامات قیامت بھی ہیں ، مثال کے طور پر خروج یأجوج مأجوج ، خروج دجال ، نزول عیسیٰ علیہ السلام ، خروج دابہ ، مغرب سے سورج کا طلوع ہونا ، اسی طرح کی دوسری علامتیں جو صحیح سند سے منقول ہوں ۔(۳)

اس قسم کی تصریح دوسرے بہت سے علماء سے بھی منقول ہے ،(۴) لیکن اس کے باوجود مختلف ازمنہ میں ایسے لوگوں کا وجود رہا ہے جن کا رویہ علاماتِ قیامت اور ان سے متعلق احادیث کے بارے میں بالکل برعکس رہا ہے ، کچھ تو ایسے ہیں جو تمام کا یا بعض کا سرے سے انکار کرتے ہیں ، اور کچھ ایسے ہیں جو علامات قیامت سے متعلق احادیث کو قبول کرنے میں تردد محسوس کرتے ہیں ، آخر الذکر لوگوں میں سے علامہ سید محمد رشید رضا (ت ۱۳۵۴ھ) بھی ہیں ، انہوں نے اپنی تفسیر المنار میں مختلف مقامات پر احادیث اشراط کے سلسلے میں بعض شبہات کی بناء پر اپنی عدم اطمینانی کا اظہار کیا ہے ۔

ان کے شبہات یا تردد کا جائزہ لینے سے قبل دو باتیں واضح کر دینا چاہتا ہوں ۔

اولاً : علامہ محمد رشید رضا عصر حاضر میں ایک نہایت قابل قدر شخصیت کے مالک تھے ، ان کی علمی صلاحیت ولیاقت کا ہر

---

(۱) سورۂ حشر : آیۃ ۷ ۔ (۲) الفقہ الاکبر (ص ۱۶۸ مع شرحہ) (۳) لمعۃ الاعتقاد (۱۸ — ۱۹)
(۴) تفصیل کیلئے شرح العقیدۃ الطحاویۃ (۵۶۴) ولوامع الانوار (۲ / ۷۰) دیکھا جاسکتا ہے ۔

منصف مزاج شخص کو اعتراف ہے، انہوں نے اسلام کے دفاع میں بڑی خدمات انجام دی ہیں، خاص طور سے مستشرقین اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ہم وطنوں کا انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، پیش نظر مقالہ کے ذریعہ آپ کی شخصیت کو مجروح کرنا، یا آپ کی خدمات پر پردہ ڈالنا نہیں ہے، اور حقیقتاً میں ایسا کر بھی نہیں سکتا میرا مقصد علامات قیامت یا ان سے متعلق احادیث کے بارے میں موصوف کے موقف کو علم دوست حضرات کے سامنے پیش کر کے کتاب و سنت اور اقوال سلف کی روشنی میں یہ واضح کرنا ہے کہ موصوف سے اس سلسلے میں لغزش ہوئی ہے۔

ثانیاً: موصوف نے باوجودیکہ اسلامی علوم وفنون میں کافی وسیع النظر تھے، لیکن حدیث اور حجیت حدیث کے سلسلے میں تنگ نظری کا ثبوت دیا ہے، بڑی حد تک منکرین حدیث سے موافقت کی ہے، ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی صاحب نے اپنی کتاب "دراسات فی الحدیث النبوی" میں اس کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، اور آخر میں شیخ مصطفےٰ سباعی مصری کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ موصوف نے اپنی عمر کے آخری ایام میں مذکورہ موقف سے رجوع کر لیا تھا[1] اگر یہ بات صحیح طور سے ثابت ہے تو موصوف کی علمی جرأت وشہامت کی ایک بڑی دلیل ہے کیونکہ رجوع الی الحق کا جذبہ خال خال لوگوں میں ہی پایا جاتا ہے، لیکن اس کا مطلب میرے اپنے خیال میں ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہم ان امور کو لوگوں کے سامنے نہ لائیں جن میں آپ نے حق سے پہلوتہی کی ہے، اور خاص طریقے سے ایسی صورت میں جبکہ آپ کی تالیفات اور خصوصاً تفسیر المنار لوگوں میں عام ہوچکی ہے، اور ان میں اس طرح کی باتیں پائی جاتی ہیں۔

محترم موصوف نے علاماتِ قیامت سے متعلق احادیث پر اپنی عدم اطمینانی یا انہیں قابلِ حجت تسلیم کرنے میں اپنے تردد کی وجہ بتلاتے ہوئے بزعم خویش یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان احادیث میں حد سے زیادہ اضطراب اور تعارض پایا جاتا ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ قاعدہ "تعارضت فتساقطت" کی رو سے ان تمام احادیث کو دریا برد کردینا چاہیئے[2] اور اسی ضمن میں ضطر وتعارض کا سب سے بڑا سبب یہ بتلایا ہے کہ یہ سب حدیثیں بالمعنی روایت کی گئی ہیں، چنانچہ تفسیر المنار میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ہر مسلمان کو جسے اپنے دین سے پوری بصیرت وآگہی ہونی ضروری ہے، معلوم ہونا چاہیئے کہ فتن واشراط سے متعلق روایات میں ایسے تعارض ومشکلات پائے جاتے ہیں جنہیں اجمالی طور سے ہی سہی جاننا لازم ہے تاکہ وہ ایسے لوگوں کی تقلید سے محفوظ رہ سکے جو اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ تمام امور جن پر اصحاب نقل کا اعتماد ہے برحق ہیں، اسی طرح ان حضرات کی تقلید سے بھی اپنا دامن محفوظ رکھ سکے جو اس بات کا اعتقاد رکھتے ہیں کہ عقلی نظریات رکھنے والے لوگوں کی کہی ہوئی تمام باتیں مبنی برصداقت

(۱) ج ۱ ص ۲۶-۲۷ ط ۱۴۰۵ھ۔ (۲) دیکھو: تفسیر المنار (۹/ ۴۰۱ تا ۴۰۰)۔

ہیں[1]"

اسی طرح ایک دوسری جگہ بھی رقمطراز ہیں کہ " علاماتِ قیامت سے متعلق احادیث میں مشکلات بکثرت پائی جاتی ہیں " پھر کثرت کیوجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ " جو احادیث صحیح اسانید سے منقول ہیں اور ان کے متون میں کسی طرح کا اضطراب یا تعارض یا اشکال پایا جاتا ہے تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ بالمعنیٰ روایت کی گئی ہیں، چونکہ ان کا تعلق غیب سے ہوتا ہے ، اور ہر راوی ان کے معانی سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ، اس لئے ہر ایک کی تعبیر اختلاف فہم کی وجہ سے دوسرے سے مختلف ہوجاتی ہے "

پھر موصوف نے صحیحین کی چند مرفوع اَحادیث کے بارے میں اپنی اس خشیت کا اظہار کیا کہ وہ کعب الاُحبار، یا وہب بن منبہ یا ان جیسے دوسرے اسرائیلی روایتوں کے متخصصین کی روایات ہیں، لیکن راویوں نے کسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچا کر مرفوعًا روایت کر دیا ہے[2]

ان دونوں باتوں پر غور کرنے سے ناچیز اسی نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ نہایت خطرناک پہلو کی حامل ہیں۔

اوّلاً : موصوف نے اصحاب نقل (یعنی محدثین کرام) اور اصحاب عقل (یعنی متکلمین) دونوں کو ترازو کے ایک ہی پلڑے میں رکھ کر ناقابل اعتماد گردانا ہے ، یہ ایک غور طلب امر ہے یونان و ہند کے ملاحدہ ، اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے متکلمین جنہوں نے عقلی موشگافیوں میں اپنی ساری عمریں گنوادیں ، ان کو اعتماد یا عدم اعتماد کے سلسلے میں محدثین کرام کے برابر درجہ دیا جاتا ہے جنہوں نے سیدالأنبیاء والمرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک اور حیات طیبہ کو موضوع بنا کر احادیثِ شریفہ کی خدمت کو اپنا شیوہ بنایا ہو ،

ثانیاً : موصوف کے کلام سے حفاظ حدیث اور رواۃ کی توہین و تنقیص ہوتی ہے ، جنہوں نے اپنی ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے اور اپنے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا مصداق بنانے کی خاطر پوری امانت داری اور صدق دلی کے ساتھ احادیث کو حفظ کرنے اور آنے والی نسلوں تک پہونچانے میں اپنی پوری عمر صرف کر دیں ، اسی طرح ان فقہاء و ائمہ حدیث کی بھی تنقیص ہوتی ہے ، جنہوں نے رات دن ایک کر کے اور سخت سخت مشقتیں جھیل کر حدیث کی خدمت کی ہے ، انہیں کی محنتوں اور اخلاص کا ثمرہ ہے کہ آج ہمارے سامنے احادیث نبوی کا اتنا بڑا ذخیرہ اپنی واضح شکل میں موجود ہے جس میں کسی آمیزش یا اختلاط کا بہت ہی کم امکان ہے ، لیکن موصوف نے نوک قلم کی ہلکی سی جنبش کے ذریعہ ان کی تمام مساعی جمیلہ اور جہود مخلصہ کو اس طرح ڈائنامیٹ کر دیا کہ وہ

(۱) دیکھو : تفسیر المنار (۹ / ۴۹۴) (۲) تفسیر المنار (۸ / ۲۱۰ - ۲۱۱)

ہر بات میں قابل اعتماد نہیں رہ گئے بلکہ اس کے ساتھ انہیں فہم و ادراک اور علم و معرفت میں تنگ دامانی سے بھی متصف کر دیا، اگر موصوف کی باتیں صحیح فرض کر لی جائیں تو حدیث کی تمام کتابوں سے اعتماد ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ جن احتمالات کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ نے احادیث اشراط کو دریا برد کرنے کی دعوت دی ہے، وہ تمام احتمالات احادیث کے دوسرے ابواب میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔

خدارا ذرا یہ بتلایئے کہ قرون اولیٰ کے وہ علماء جن کے یہاں تقویٰ و پرہیزگاری اور صدق و امانت جیسے اوصاف بدرجۂ کمال پائے جاتے تھے، اور جن کو قرون مفضلہ سے قرب زمانی کا شرف حاصل تھا، اور جنہوں نے خدمت حدیث میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا وہ قابل اعتماد نہیں ہو سکتے، بلکہ اعتماد کے لائق وہ حضرات ہیں جنہوں نے قرون مفضلہ کے سینکڑوں سال بعد دنیا میں قدم رکھا، اور تقریباً جملہ اوصاف حسنہ میں ان متقدمین سے پیچھے رہے ـــــ یہ کہاں کی منطق اور کہاں کا قانون ہے۔

ہمیں اس حقیقت کا اعتراف ہے کہ رواۃ حدیث میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جن پر مختلف ناحیوں سے جرح کی گئی ہے بلکہ ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام تر وعید کے باوجود حدیثیں وضع کریں، اسی طرح علماء سلف میں ایسے لوگ ہیں جنہوں نے بعض امور میں کسی وجہ سے ضعیف احادیث یا ناقابل اعتبار احادیث کو اپنی حجت بنایا ہے، لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں نکلتا کہ سب کے سب ان اوصاف سے متصف ہیں، لہذا سب کو ایک ہی ڈنڈے سے ہانک دیا جائے۔

اسی طرح ہمیں اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ بعض صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم یا دوسرے لوگ جن کا شمار اسرائیلیات کے رواۃ میں ہوتا ہے، ان سے بعض ایسی موقوف یا مقطوع روایتیں منقول ہیں جن کو بعد کے رواۃ نے کسی بناء پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے مرفوعاً روایت کر دیا ہے، لیکن اس قسم کی روایتیں بہت کم ہیں، اور ساتھ ہی ماہرین حدیث نے پوری وضاحت کے ساتھ ان کی نشاندہی فرمادی ہے جس کے بعد کسی شک وشبہ یا احتمال کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، لہذا اس سلسلے میں مناسب اور معقول طریقہ یہ ہے کہ اور یہی علماء حدیث کا طریقہ بھی رہا ہے کہ پوری تعیین کے ساتھ اور مکمل بحث و تمحیص کے بعد کسی راوی یا کسی حدیث پر حکم لگایا جائے، صرف احتمال یا شک وشبہ کو بنیاد بنا کر تھوک کے حساب سے رواۃ یا احادیث پر حکم نہیں لگایا جا سکتا، اور صحیحین کی احادیث کے بارے میں اس قسم کا تصور ہی محال ہے۔

رہی تعارض کی بات تو یہ بھی صحیح ہے کہ اشراط سے متعلق بعض احادیث کے اندر بظاہر تعارض یا اضطراب پایا جاتا ہے، لیکن یہ چیز اشراط کے ساتھ خاص نہیں ہے جب کہ ماہرین حدیث نے اس باب میں بھی معاملہ کو پوری طرح واضح کر دیا ہے، چنانچہ انہوں نے مصطلح حدیث

کے قواعد کی روشنی میں مضطرب یا متعارض احادیث کے اضطراب یا تعارض کو تطبیق یا ترجیح وغیرہ کے ذریعہ دور کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، جیساکہ حدیث کے دوسرے ابواب میں کیا ہے۔

احادیث کو بالمعنی روایت کرنے کا دعویٰ موصوف نے ایک دوسری جگہ نزول عیسیٰ علیہ السلام پر بحث کرتے ہوئے دہرایا ہے۔[1]

ان کے اس دعویٰ کی سخت ترین لہجہ میں تردید کرتے ہوئے ایک مغربی عالم عبداللہ بن محمد صدیق غماری اپنی کتاب عقیدہ "اھل الإسلام فی نـزول عیسیٰ علیـہ السـلام" میں لکھتے ہیں: "خدا کی قسم روایت بالمعنیٰ کا احتمال سُہیٰ (بہت ہی چھوٹا ستارہ) سے بھی زیادہ مخفی اور پوشیدہ ہے، بلکہ اس طرح کی بات شیطان رجیم کے دل میں بھی نہیں کھٹک سکتی. کیا وہ سوچ سکتا ہے کہ ۳۱ افراد پر مشتمل صحابۂ کرام کی جماعت جس میں چھ اشخاص ایسے بھی ہیں جن کی قوت حفظ کی کافی شہرت تھی، سب کے سب حدیث کو بالمعنی روایت کرنے پر متفق ہو گئے ہوں گے، ان میں جو حفاظ تھے ان کی قوت حفظ کہاں سو گئی تھی ؛ ان میں جو لکھنے والے تھے ان کی کتابت، تحریریں کہاں چلی گئی تھیں ؛ ان کی وہ شدید خواہش کہاں ماند پڑ گئی تھی، جو ان کو چہرے کی تروتازگی اور ثواب عظیم کے حصول کی خاطر احادیث کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہوئے الفاظ کے ساتھ روایت کرنے کے سلسلے میں تھی، اور پھر یہ حقیقت بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہئے کہ نزول عیسیٰ علیہ السلام اور اس سے متعلق تمام واقعات و احداث کا تعلق غیب سے ہے، کسی موقف (یعنی باخبر شخص) کے بتائے بغیر استخراج یا استنباط کے ذریعہ ان کا ادراک ممکن نہیں ہے، لہذا اس بات کا امکان بالکل نہیں رہ جاتا کہ راوی نے اپنی سمجھ اور فہم کے مطابق ان احادیث کو بالمعنی روایت کیا ہے"۔[2]

اگر تھوڑی دیر کے لئے محمد رشید رضا کا روایت بالمعنی کا دعویٰ تسلیم کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس طرح کی بات صرف احادیث اشراط کے ساتھ ہی کیوں خاص ہے۔ دوسرے امور سے متعلق احادیث میں بھی تعارض، اضطراب یا اشکال پائے جاتے ہیں، ان کو بھی روایت بالمعنی کا احتمال پیدا کر کے پس پشت ڈال دینا چاہئے، اس طرح سنت کا دروازہ لوگوں پر خود بخود بند ہو جائے گا۔ جس کے لئے منکرین حدیث ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں۔

---

(۱) تفسیر المنار (۳۱۷/۳)۔

(۲) عقیدہ أہل الإسلام فی نزول عیسیٰ علیہ السلام (ص ۸۱)۔

از- ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری

مولانا ابوعلی اثری کی کرم فرمائی

مولینا ابوعلی اثری دارالمصنفین کے ساتھ وابستگی کے باعث علمی حلقوں میں احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اہل حدیث جماعت کے افراد موصوف کو الحدیث جان کر ان کے ساتھ عقیدت رکھتے ہیں، شاید اسی وجہ سے ماہنامہ آثار مئو کی مجلس ادارت میں موصوف کا نام شامل ہے، رجال اہل حدیث پر مولانا کی بعض تحریریں پاکستان کے ایک اہل حدیث صاحب خیر نے اپنے خرچ پر طبع کرکے مفت تقسیم بھی کی ہیں، ان ملابسات کی وجہ سے میں بھی مولانا کو اہل حدیث جماعت کا ایک فرد سمجھتا تھا، لیکن پچھلے دنوں موصوف کے ذاتی نوعیت کے دو خطوط دیکھ کر بڑی تکلیف ہوئی، مسئلہ کسی کے اہل حدیث ہونے یا نہ ہونے کا چنداں اہم نہیں، فکر و خیال کی آزادی کے اس دور میں معلوم نہیں لوگ کیسے کیسے نظریات اور مذاہب سے وابستہ ہیں، البتہ صدمہ اور افسوس اس بات کا ہے کہ بعض لوگ سیدھی سادی صورت رکھتے ہوئے نیش زنی کرتے ہیں اور اپنی بساط سے بڑی بات کہہ جاتے ہیں، مولانا ابوعلی اثری کے درج ذیل جملوں پر غور فرمائیے!

بنارس میں اپنے ایک شناسا کے نام خط میں مولانا فرماتے ہیں:

" میرا یہ خیال ہو رہا ہے کہ اہل حدیث مذہب کی تمام تر بنیاد مستحبات پہ ہے، جن کی شریعت میں کوئی اہمیت نہیں ہے، جن کے ترک پر انشاءاللہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مواخذہ نہیں ہوگا، جیسے اور مسلک کے لوگ اپنے کو ائمہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ اہل حدیث مسلک کے لوگ اپنے کو میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی کی طرف منسوب کرکے بجائے اپنے کو اہل حدیث لکھنے کے نذیریہ ہی لکھیں، اہلحدیث ایک اصلاحی (کذا) لفظ ہے، یہ آخر اہلحدیثوں تک محدود کیوں کر لیا گیا، اہل حدیث یا اہل قرآن تمام مسلمان ہیں " ــــــــــ دستخط۔ (ابوعلی اثری)

۷/مئی ۱۹۹۰ء

مئو میں اپنے ایک متعارف کے نام اثری صاحب تحریر فرماتے ہیں :

" مئی بازار (مجدوہی) اہل حدیث اکثریت کا بہت بڑا علاقہ ہے، مشکل سے ایک آدھ حنفی اور مقلد ہوں گے، لیکن یہاں مستحبات پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے، جس کو میں کھلی ہوئی بدعت سمجھتا ہوں، آمین اس زور سے بولتے ہیں کہ مسجد لرز جاتی ہے، اس مسلک پر یہاں اس شدت کے ساتھ عمل کیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ اس کی ٹریننگ کی جاتی ہے، میرا کچھ دنوں سے ایسا خیال ہوتا جا رہا ہے کہ اہل حدیث مسلک کی تمام تر بنیاد مستحبات پر ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے یہاں قطعی بازپرس نہیں ہو گی ارکان میں کوئی کوتاہی ہو جائے گی تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا شدید مواخذہ ہوگا، یہ اہل حدیث حضرات آخر مستحبات پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں، جن کی شریعت میں کوئی اہمیت نہیں ہے، میں اس کو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کے بعد پانچواں فقہی مسلک سمجھتا ہوں، جس کی بنیاد تمام تر مولانا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کے اجتہادات پر ہے، اس لئے ان کو بجائے اہل حدیث لکھنے کے نذیری ہی لکھنا چاہئے، یہ مسلک انہی کی ڈسکاؤ حدیث میں پیدا ہے، جس کے فروغ میں ان کے اجلۂ تلامذہ حافظ عبداللہ صاحب غازی پوری، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی اور ان سب سے بڑھ کر مولانا ثناء اللہ امرتسری کو دخل ہے، اور بعض فقہی سہولتوں کی وجہ سے روز بروز اس کو فروغ ہوتا چلا جاتا ہے، جس کا مظہر نوگڈھ کی اہل حدیث کانفرنس تھی۔"

دستخط (ابو علی اثری)

۱۲ر فروری ۱۹۹۰ء

مذکورہ دونوں خط اسی سال کے لکھے ہوئے ہیں، تحریر بالکل تازہ ہے، لہذا اس سے رجوع کا سوال نہیں پیدا ہوتا، بڑا تعجب ہے کہ اس طرح کا خیال رکھتے ہوئے کس طرح مولانا اثری صاحب ایک اہل حدیث ماہنامہ کی مجلس ادارت میں شریک ہیں، ادارہ کے لوگوں نے اس چیز کو کس طرح گوارا کیا، اور خود مولانا نے کس طرح یہ پسند فرمایا کہ جس جماعت کی بنیاد صرف مستحبات پر ہے اور جو مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے ہاتھوں وجود میں آئی ہے، اس کے ماہنامہ کی مجلس ادارت میں رونق افروز ہوں ؟

مولانا اثری نے اپنے خط میں مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ تعالیٰ کا نام لیا ہے، اگر ان کے رسالہ " اہلحدیث کا مذہب " پڑھ کر غور کر لیتے تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ جن مسائل کا مولانا نے تذکرہ فرمایا ہے وہ مستحبات ہیں یا دین کی اصل و بنیاد۔

مذکورہ رسالہ میں مولانا نے جماعت اہل حدیث کے جملہ بنیادی و امتیازی مسائل کے تذکرہ کا التزام نہیں فرمایا ہے، بلکہ صرف ان

ل کو تحریر فرمایا ہے جس کا نام لیکر جماعت اہل حدیث کو مطعون کیا جاتا تھا، اگر جماعت کی دعوت اس کے بنیادی مسائل اور
اض و مقاصد کو سمجھنے کی ضرورت محسوس ہو تو اس کے لئے اگر کچھ اور نہ دیکھا جا سکے تو خود اخبار اہلحدیث امرتسر کا صفحہ اول کافی ہے، اخبار
اغراض و مقاصد کو جن نقاط میں مولینا نے محصور فرمایا ہے کیا اثری صاحب کہہ سکتے ہیں کہ ان کا تعلق دین کے مستحبات سے ہے ؟ ۔

مولنا اثری صاحب بھدوہی کے اہل حدیث لوگوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ :

" یہاں مستحبات پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے، جس کو میں کھلی ہوئی بدعت سمجھتا ہوں "

دار المصنفین جیسے تحقیقی و متوازن ادارہ سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کے قلم سے ایسی تحریر دیکھ کر تعجب ہوتا ہے، شریعت سے
بات ثابت ہو اس پر زور دینے کو بدعت سمجھنا کس قدر جرأت بلکہ گستاخی ہے، بدعت ایسی کوئی چیز نہیں جس میں خفاء ہو، بدعت کی
ریف و تقسیم ائمہ دین نے بسط و تفصیل سے کی ہے، تنہا اسی موضوع پر مستقل تصنیفات موجود ہیں، کیا اثری صاحب بتا سکتے ہیں کہ
شریعت میں جس کام پر استحباب کا حکم لگ چکا ہے اس پر پھر بدعت کا حکم کس طرح لگ سکتا ہے ؟ ماہنامہ آثار مئو کے ذمہ داروں کو
بھی سوچنا چاہئے کہ جماعت اہل حدیث کے ایک امتیازی مسئلہ یعنی آمین بالجہر میں آواز تیز ہو جانے کو جو شخص بدعت قرار دے رہا ہو اس
سے مسلک کی کون سی خدمت کی انھیں توقع ہے ؟ آمین بالجہر کا تعلق ان چند مسائل سے ہے جن پر عمل کی وجہ سے اہلحدیث جماعت
کے علماء و عوام کو بڑی بڑی دشواریوں اور آزمائشوں بلکہ قاتلانہ حملوں تک کا سامنا کرنا پڑا، کیا اثری صاحب بتا سکتے ہیں کہ
اہل حدیث علماء ایک بدعت پر عمل کے لئے اتنی پریشانی برداشت کرتے تھے ؟

اثری صاحب اپنے مکتوب میں استنکار کے طور پر سوال کرتے ہیں :

" یہ اہل حدیث حضرات آخر مستحبات پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں جن کی شریعت میں کوئی اہمیت نہیں ہے ؟ "

اثری صاحب کو یہ سوال ہم سے نہیں بلکہ ان صحابہ کرام و بزرگان دین رضی اللہ عنہم سے کرنی چاہئے، جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی ایک ایک سنت کے لئے ایسی فدا کاری و وارفتگی کا مظاہرہ کیا ہے، جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، ان کی نظر میں احکام
کی فقہی تقسیم کا سوال نہ تھا، بلکہ شریعت نے جن اعمال کا حکم دیا ہے ان کی بجا آوری سے وہ اپنی شان بندگی و اطاعت کا مظاہرہ کرنا چاہتے
تھے، وہ اجلال و تکریم کے اس جذبہ سے مجبور تھے جو ان کے دلوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موجزن تھا ۔

۱ ۔ ابو سعید عبد اللہ بن مغفل نے اپنے ایک قریبی شخص کو کنکری چلاتے ہوئے دیکھا تو منع کیا اور حدیث سنائی کہ اس سے نہ تو شکار
ہو سکتا ہے نہ ہی دشمن کو نقصان پہونچ سکتا ہے، البتہ آنکھ پھوٹ سکتی ہے اور دانت ٹوٹ سکتا ہے ۔
اس شخص نے حدیث سننے کے بعد بھی کنکری پھینکنا بند نہ کیا، اس پر حضرت عبد اللہ نے کہا کہ میں تم سے کبھی بات نہ کرونگا۔ (متفق علیہا

۲۔ ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کے ہاتھ میں سونے کی انگوٹھی دیکھی تو اسے نکال کر پھینک دیا اور فرمایا کہ تم لوگ ہاتھ میں جہنم کی آگ کا شعلہ رکھ لیتے ہو! جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم وہاں سے چلے گئے تو لوگوں نے اس آدمی سے کہا کہ .. انگوٹھی اٹھالو، اس سے دوسرا کام لے سکتے ہو، اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں اس چیز کو کبھی نہیں اٹھا سکتا، جس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پھینک دیا ہو۔ (مسلم)

تقلید کو چھوڑ کر عمل بالکتاب والسنہ کی دعوت کو مولنا ابو علی اثری صاحب نے "مستحبات پر زور دینے" سے تعبیر کیا ہے، اس معاملہ میں وہ اپنے پیش رو مولینا مسعود عالم ندویؒ سے متاثر معلوم ہوتے ہیں، مگر دونوں کے تجزیہ میں بعض عجیب طرح کا تضاد نظر آتا ہے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ ندوہ ودار المصنفین کے حلقے اس تضاد کی کیا توجیہ کرتے ہیں؟

مولینا مسعود عالم صاحبؒ نے " جماعت اہل حدیث کے سرگروہ مولوی محمد حسین بٹالوی " کو قرار دیا ہے، جبکہ مولینا اثری صاحب جماعت اہل حدیث کو یہ تلقین کر رہے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو علامہ سید نذیر حسین دہلویؒ کی جانب منسوب کرے!

مولینا مسعود عالم صاحب نے اہل صادقپور کو چھوڑ کر اپنے دور کی بقیہ جماعت اہل حدیث پر یہ الزام لگایا ہے کہ اس کا عام رجحان فروعی مسئلوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، اثری صاحب نے اسی بات کو مستحبات کے نام سے دہرایا ہے۔

مولینا مسعود عالم صاحب " ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک " میں انکشاف فرماتے ہیں کہ " اہل حدیث ایک بالکل دوسری جماعت ہے جو باطنیوں اور شیعوں کے توڑ کے لئے پیدا ہوئی تھی، اور یہ کوئی نئی جماعت نہیں ہے، بنو عباس کے اوائل عہد (دوسری صدی ہجری) ہی میں محدثین اور اہل حدیث کا گروہ ممتاز و مشہور تھا "۔

مولینا مسعود عالم کی اس توضیح کی روشنی میں ہمارے مولینا ابو علی اثری کے اس ارشاد کا کیا ہوگا کہ:

" میں اس کو حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کے بعد پانچواں فقہی مسلک سمجھتا ہوں جس کی بنیاد تمام تر مولینا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلویؒ کے اجتہادات پر ہے۔"

یعنی جو جماعت بقول مولینا مسعود عالم دوسری صدی ہجری سے موجود ہے اس کی بنیاد چودھویں صدی میں آکر مولینا سید نذیر حسین کے یہاں فراہم ہوئی!

مولنا اثری نے اہل حدیث کو نذیری کہلانے کا جو مشورہ دیا ہے، مسعود عالم صاحب کی تصریح کے بعد اس کے سلسلے میں بھی سوال پیدا ہوگا کہ: سید نذیر حسین صاحب کے بعد کے اہل حدیث کو تو " نذیری " کہا جائیگا، لیکن اہل حدیث جماعت کے جو لوگ اس سے قبل گذرے ہیں (اور یقیناً گذرے ہیں) ان کو کس لقب سے یاد کیا جائے گا، کیا مذکورہ لقب کو پیشگی حاصل کرنا ہوگا؟

ایک سوال اور بھی ذہن میں آتا ہے ، بقول مولینا مسعود عالم جماعت اہل حدیث باطنیوں اور شیعوں کے توڑ کے لئے پیدا ہوئی تھی ، سوال یہ ہے کہ جو جماعت اپنی توجہ " فروع مستحبات " پر مرکوز رکھے ہوئے ہو ، وہ مذکورہ فرقوں کا توڑ کس طرح کر سکتی ہے ؟ کیا مذکورہ فرقوں کا منہج سلف اور اہل سنت سے جو اختلاف ہے ، وہ عقائد کا اختلاف ہے یا فروع کا ؟ اگر عقائد کا اختلاف ہے تو کیا جماعت اہل حدیث نے عقائد اصول پر توجہ اور ان سے واقفیت کے بغیر ہی مذکورہ فرقوں کے توڑ اور تردید کا بیڑا اٹھا لیا تھا ؟ ۔

مولینا ابو علی کی تحقیق میں دعوت عمل بالکتاب والسنہ پانچواں فقہی مسلک ہے جس کی بنیاد تمام تر مولانا سید نذیر حسین کے اجتہادات پر ہے ، اور یہ مسلک انہی کی درسگاہ حدیث میں پیدا ہوا ہے ۔

مولانا ابو علی اثری کا یہ مزعومہ اپنی بنیاد کے لحاظ سے نیا نہیں ہے ، لیکن اس میں کچھ نئے پہلو ضرور ہیں ، ایک دو باتیں تو جدت کے دائرہ سے نکل کر مضحکہ خیزی کی حد میں داخل ہو گئی ہیں ۔

جو لوگ مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کا ناقص مطالعہ رکھتے ہیں یا ذہن میں کسی فقہی مسلک کی حمایت وجانبداری کا تصور جاگزیں ہوتا ہے ، اور دوسروں کی تجریح جن کی نظر میں معیوب نہیں ہوتی وہ بڑی جلدی جماعت اہل حدیث پر " جدت " کا حکم لگا دیتے ہیں ، حالانکہ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فقہی مذاہب کے آغاز و ترقی پر جس انداز سے روشنی ڈالی ہے اس کو پڑھ کر ہر منصف مزاج انسان بڑی آسانی سے فقہی مذاہب کی عمر اور ان کے آغاز سے پہلے امت کے عقیدہ ومنہج کا اندازہ کر سکتا ہے ۔

اس مسئلہ کو اہل تقلید نے بار بار مختلف انداز سے اٹھایا ہے ، اس لئے مولینا اثری صاحب سے میری گذارش ہے کہ وہ گوجرانوالہ (پاکستان) کے معروف اہل حدیث عالم مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ کی کتاب " تحریک آزادی فکر اور شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی " کا ضرور مطالعہ فرمالیں ، اس سے " قدیم وجدید " کی الجھن دور ہو جائے گی ، اور اگر مذکورہ کتاب دستیاب نہ ہو تو مولانا ابو القاسم سیف بنارسی رحمہ اللہ کے درج ذیل دونوں رسالے : سواء الطریق ، اور ایضاح الطریق پڑھ لیں ، انشاء اللہ اس سے قدیم وجدید کا عقدہ حل ہو جائے گا ۔

کسی جماعت کے سلسلے میں علماء ومحققین کی توثیق وتائید پیش کرتے ہوئے ایک بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے ، اگر جماعت کے اصول ومقاصد کی صحت وسلامتی پر یقین ہو ، اور کتاب وسنت نیز مذہب سلف رضی اللہ عنہم سے اس کی تائید ہو رہی ہو تو پھر علماء کی آراء ، توثیق اور جدت وقدامت کے فیصلوں کی چنداں اہمیت نہیں ، کیونکہ جن علماء کی آراء ایسے معاملات میں پیش کی جاتی ہیں

ان کی انصاف پسندی و غیر جانبداری کا بھی سوال پیدا ہوتا ہے، عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ اس معاملہ میں علماء و محققین کے فیصلے محل غور ہوا کرتے ہیں، کیونکہ غیر جانبدارانہ رائے وہی دے سکتا ہے جو غیر جانبدار ہو، اگر کسی دوسری جماعت یا مخالف نظریہ سے اس کا تعلق ہوگا تو بہت مشکل ہے کہ دوسرے لوگوں کی بابت اس کی رائے اور فیصلہ غیر جانبدارانہ ہو، یہ مفروضہ صحیح نہیں کہ اہم معاملات و مسائل میں علماء غیر جانب داری کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ عصر نبوی اور صحابہ کرامؓ سے زیادہ اہم معاملہ کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن دیکھا گیا ہے کہ علماء و محققین اس اہم مسئلہ میں بھی بری طرح جانبداری کا شکار ہو گئے ہیں۔

اخیر میں یہ گذارش ہے کہ جماعت اہل حدیث پر حکم لگانے کے لئے ان اصول و مقاصد پر غور کرنے کی ضرورت ہے، جن کی پابندی کا اعلان یہ جماعت کرتی ہے، زید، عمرو، بکر کے ذہن میں اس جماعت کا جو خاکہ بنا ہوا ہے، اس کی بناء پر اگر حکم لگایا جائے گا تو بہت بڑا ظلم ہوگا، اور اگر اس طرح کا رویہ دیگر جماعتوں کے لئے بھی اپنایا جائے گا تو صورت حال بیحد بھونڈی ہو جائے گی، اس لئے لکھنے والوں کو اس پر غور کی ضرورت ہے۔

قسط ۲

محمد عزیر

کالا خضاب لگانا کیسا ہے؟

کالے خضاب سے ممانعت کے دلائل

سیاہ خضاب کی ممانعت کے سلسلے میں چھ حدیثیں بیان کی جاتی ہیں جن میں سے بعض ضعیف ہیں۔ استاد محترم نے ان سب کا ذکر کیا ہے (ص ۲۹ - ۳۰) ہم یہاں ان سے متعلق دو باتوں کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مانعین جو اس سلسلے میں جو ضعیف حدیثیں پیش کرتے ہیں انھیں قابل احتجاج و اعتماد و استناد سمجھ کر نہیں بلکہ بطور استیناس ضمناً ذکر کرتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح حدیثوں سے جو کچھ مستنبط ہوتا ہے وہ تو اپنی جگہ کافی ہے ہی، اس موضوع سے متعلق دیگر کچھ ضعیف روایتیں بھی وارد ہیں جن سے اصالۃً نہیں ضمناً اسی مفہوم کا استنباط ہوتا ہے جو صحیح حدیثوں سے نکلتا ہے۔ جن لوگوں نے محدثین کی کتابیں مختلف موضوعات پر پڑھی ہیں انہیں اس کا علم ہوگا کہ کسی موضوع پر صحیح اور حسن حدیثوں کے ساتھ ضعیف حدیثیں بھی محدثین ضمناً اور تبعاً بطور شواہد ذکر کرتے ہیں جو صحیح حدیثوں سے ثابت مسئلے کی مؤید ہوتی ہیں، اس سے ان کی مراد یہ نہیں ہوتی کہ انفرادی طور پر قابل احتجاج و استناد ہیں، بلکہ مقصد یہ بیان کرنا ہوتا ہے کہ بعض ضعیف حدیثیں بھی اس کے خلاف نہیں بلکہ ان سے صحیح حدیثوں میں وارد الفاظ یا معانی کی مزید تائید ہوتی ہے۔ اکثر محدثین (جنہوں نے اپنی کتابوں میں صحت کا التزام نہیں کیا ہے) ضعیف حدیثیں اسی مقصد کے پیش نظر یہ سند روایت کرتے ہیں جنہیں ان کا منہج معلوم نہیں، وہ ان حدیثوں کو قابل احتجاج سمجھ کر اصالۃً اور استقلالاً ذکر کر دیتے ہیں اور ان کی بنیاد پر کوئی مسئلہ ثابت کرنے لگتے ہیں عام طور پر فقہاء متاخرین اس مرض میں مبتلا ہیں، صحیح طریقہ یہ ہے کہ صرف صحیح حدیثوں پر اعتماد کیا ہے اور انھیں سے مسئلہ مستنبط کیا جائے، البتہ ضمناً اگر ضعیف حدیثیں اسی معنیٰ کی مؤید ذکر کی جائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن اس سلسلے میں تلبیس و تدلیس سے اجتناب کیا جائے اور ضعیف کو صحیح یا حسن بنا کر نہ پیش کیا جائے۔ تمام منصف مزاج اور محقق علماء کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے۔ بیہقی (م ۴۵۸ھ)

بغوی (م ۵۱۶ھ)، منذری (م ۶۵۶ھ)، نووی (م ۶۷۶ھ)، ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ)، ذہبی (م ۷۴۸ھ)، ابن قیم (م ۷۵۱)، زیلعی (م ۷۶۲)، ابن کثیر (م ۷۷۴ھ)، ابن رجب (م ۷۹۵ھ)، عراقی (م ۸۰۶ھ)، اور ابن حجر (م ۸۵۲ھ) وغیرہم کی تصانیف پڑھیئے تو اس کا اندازہ ہوگا۔

دوم یہ کہ ان میں سے بعض حدیثیں تو واقعی بہت ضعیف ہیں لیکن حضرت انس کی روایت جس میں ہے کہ "سفید بالوں کے رنگ بدل دو مگر کالے خضاب کے قریب نہ جاؤ" (مسند احمد ۳/ ۲۴۷) کی سند میں ابن لہیعہ ہیں جس کے بارے میں حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ "صدوق" تھے، اخیر عمر میں چونکہ ان کی کتابیں جل گئی تھیں اس لئے اختلاط کا شکار ہو گئے تھے یہ صحیح مسلم کے رواۃ میں سے ہیں، اس میں ان سے بعض روایتیں مقروناً پائی جاتی ہیں (تقریب) اس کی حدیثوں کے ردّ و قبول کے سلسلے میں بڑا اختلاف ہے (میزان الاعتدال ۲/ ۴۷۵-۴۸۳) سب سے معتدل قول حافظ ابن حجر کا ہے جس کی بنیاد پر بعض علماء اس کی روایتوں کی تحسین کرتے ہیں، یا کم از کم اس کی حدیثوں کو "قابل للاعتبار" سمجھتے ہیں۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت انس ہی سے ابو قحافہ والے قصے میں کالے خضاب سے اجتناب کی روایت بسند صحیح مروی ہے (مسند احمد ۳/ ۱۶۰، ابن حبان = موارد الظمآن رقم ۱۴۷۶ = مستدرک حاکم ۳/ ۲۴۴، ابویعلی، بزار، = مجمع الزوائد ۵/ ۱۶۰ =) اسلئے دوسری سند میں ابن لہیعہ کی موجودگی سے اصل حدیث کی تضعیف کے بجائے اس کی تائید و تحسین کا فائدہ حاصل ہوتا ہے ہیثمی نے ایک دوسرے سیاق سے وارد سیاہ خضاب سے اجتناب کی انس والی اس روایت کو (جو ابن لہیعہ کی طریق سے ہی مروی ہے) حسن بتایا ہے (مجمع الزوائد ۵/ ۱۶۰ روایت معجم اوسط للطبرانی) حافظ ابن حجر بھی اس پر کوئی کلام کرنے کے بجائے سکوت اختیار کرتے ہیں (فتح الباری ۱۰/ ۳۵۴) چونکہ انہوں نے مقدمہ (ہدی الساری ص ۴) میں لکھا ہے کہ وہ شرح کے اندر اس شرط کے ساتھ حدیثیں درج کریں گے کہ وہ صحیح یا حسن ہوں، بصورت دیگر اس کا بیان کریں گے! اس لئے حافظ ابن حجر کا رجحان بھی ابن لہیعہ کی حدیث کی تحسین کی طرف معلوم ہوتا ہے۔

(۲) حضرت انس کی اس روایت کے علاوہ ابو الدرداء کی حدیث جس میں ہے کہ "جس نے کالا خضاب لگایا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا چہرہ کالا کر دے گا" (طبرانی: مجمع الزوائد ۵/ ۱۶۳ =، ابن ابی عاصم = فتح الباری ۱۰/ ۳۵۵ =) کے بارے میں ہیثمی کہتے ہیں کہ اس کی سند میں الوضین بن عطاء ایک راوی ہے جس کی توثیق احمد، ابن معین اور ابن حبان نے کی ہے اور ان سے کم مرتبہ کے لوگوں نے اسے ضعیف بتایا ہے، سند کے باقی رجال سب ثقہ ہیں، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: "اسناده لین" اور اس راوی کو "صدوق سیئ الحفظ" بتاتے ہیں (تقریب)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت بھی شدید ضعیف نہیں، اور بطور شاہد اس کا اعتبار کیا جاسکتا ہے ــــــ۔

(۳) ابن عمر کی روایت جس میں ہے کہ "زرد خضاب مؤمن کا خضاب ہے، سرخ خضاب مسلم کا، اور سیاہ خضاب کافر کا خضاب ہے" (طبرانی = مجمع الزوائد ۵/۱۶۳، حاکم = تخریج الاحیاء ۱/۱۴۳) کے بارے میں ہیثمی کا بیان ہے کہ اس کی سند میں ایسا راوی ہے جس کے بارے میں مجھے علم نہیں، عراقی کہتے ہیں کہ ابن ابی حاتم نے اسے منکر بتایا ہے۔ اسی مفہوم کی ایک موقوف حدیث حضرت عمر سے بھی مروی ہے، مگر اس میں کالے خضاب کا کوئی ذکر نہیں (مسند احمد ۵/۶۷) ہیثمی (مجمع الزوائد ۵/۱۵۹) کہتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی عبد الصمد بن حبیب ہے جسے ابن معین نے ثقہ اور احمد نے ضعیف بتایا ہے۔ اس کے باقی رجال سب ثقہ ہیں۔

(۴) عمرو بن العاص سے کالے خضاب کے بارے میں دو روایتیں مروی ہیں، ایک میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کالے خضاب سے منع فرمایا ہے (ابن سعد ۱/۱۴۴) عراقی (تخریج الاحیاء ۱/۱۴۳) کہتے ہیں کہ اس کی سند منقطع ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جو سفیدی کو سیاہی سے بدلے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی طرف نظر نہیں کرے گا (الحارث بن ابی اسامہ (المطالب العالیہ ۲/۲۷۴)، ابوالفتح الازدی = لسان المیزان ۵/۳۸۰) یہ روایت سخت ضعیف ہے، اس کی سند میں محمد بن العرزمی متروک (میزان الاعتدال ۳/۴۹۳) اور محمد بن مسلم العنبری ضعیف ہیں (میزان الاعتدال ۴/۳۶، لسان المیزان ۵/۳۸۰)۔

ان چاروں حدیثوں سے ہم صرف نظر کرلیں تب بھی اصل مسئلہ سے متعلق وارد دو صحیح حدیثیں اور محدثین وفقہاء کی تصریحات کالے خضاب کے جواز اور عدم جواز کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

(۱) پہلی حدیث جس میں ہے کہ حضرت ابوبکر کے والد ابوقحافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے گئے ان کے سر اور داڑھی کے بال ثغامہ کی طرح بالکل سفید ہوچکے تھے آپ نے حکم دیا کہ "ان کے سفید بالوں کا رنگ بدل دو، البتہ انھیں کالے خضاب سے بچانا"۔ یہ حدیث متعدد صحابہ سے مروی ہے: جابرؓ (مسلم ۳/۱۶۶۳، ابوداؤد ۴/۸۵، نسائی ۸/۱۳۸، ۱۸۵، ابن ماجہ ۲/۱۱۹۷، مصنف عبدالرزاق ۱۱/۱۵۴، ابن سعد ۵/۴۵۱-۴۵۲، ابن ابی شیبہ ۸/۴۳۲، مسند احمد ۳/۳۱۶، ۳۲۲، ۳۳۸، مسند ابی عوانہ ۵/۵۱۲-۵۱۴، شعب الایمان ۲/۱۷۳ الف، الآداب للبیہقی ۷۷، ۳-۸، ۳، شرح السنۃ ۱۲/۹۲) انسؓ (مسند احمد ۳/۱۶۰، ابویعلی وبزار = مجمع الزوائد ۵/۱۶۰، ابن حبان = موارد الظمآن رقم ۱۴۷۱، مستدرک حاکم ۳/۲۴۴)، اسماء بنت ابی بکرؓ (ابن سعد ۵/۴۵۱، مسند احمد ۶/۳۴۹، ابن حبان = موارد الظمآن

تم ۱۷۰۰ھ) ابوہریرہؓ (معجم اوسط للطبرانی = مجمع الزوائد ۵/۱۶۱ = بسند ضعیف) تین مرسل روایتیں بھی اس سلسلے میں اردہیں ۔ قتادہؒ (ابن ابی شیبہ = الوسائل الی معرفۃ الاوائل للسیوطی ص ۲۲ = کنز العمال ۶/۶۸۹ = ، زہری (الحارث بن ابی اسامہ = کنز العمال ۶/۲۸۸ =) عکرمہ بن ابی خالد (ابن سعد ۵/۳۵۲) ۔

اس حدیث میں " ثغامہ " ایک نہایت سفید پھولوں والا پودا ہے ، متعدد شاعروں نے اس سے سفید بالوں کی تشبیہ دی ہے (غریب الحدیث لابی عبید ۲/۲۷۸ ، غریب الحدیث للحربی ۵/۲/۱۰۷ ، لسان العرب ۱۴/۳۴۵)۔

(۲) دوسری حدیث ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : آخری زمانے میں ایک قوم ہوگی وہ لوگ کبوتر کے سینے کے بالوں کی طرح سیاہ خضاب لگائیں گے ، وہ جنت کی مہک نہ پائیں گے (ابن سعد ۱/۴۴۱ ، مسند احمد ۱/۲۷۳ ، ابوداؤد ۴/۸۷ ، نسائی ۸/۱۳۸ ، شعب الایمان ۲/۱۷۳ الف ، الآداب للبیہقی ص ۲۷۸ ، شرح السنہ ۱۲/۹۱ ، الاحادیث المختارۃ للضیاء المقدسی ورق ۲۳۴ - ۲۳۵) ۔

یہ حدیثیں اتنی واضح اور صریح ہیں کہ عربی زبان کے اسالیب سے واقف کوئی شخص ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہی سمجھے گا کہ کالا خضاب لگانا ٹھیک نہیں ، چنانچہ تمام محدثین نے اپنی کتابوں میں سیاہ خضاب کی کراہت کے بیان میں حدیثیں درج کی ہیں ، اس کے جواز یا استحسان کے لئے نہیں ۔ (دیکھئے : ابن سعد ۱/۴۳۹ - ۴۴۲ ، نسائی ۸/۱۳۸ ، مسند احمد عوانہ ۵/۵۱۱ - ۵۱۵ ، شعب الایمان للبیہقی ۲/۱۷۲ ب - ۱۷۳ الف ، شرح السنہ للبغوی ۱۲/۹۱ - ۹۲ ، منتقی الاخبار = مع نیل الاوطار = لمجد الدین ابن تیمیہ ۱/۱۴۴ - ۱۴۹ ، الترغیب والترہیب للمنذری ۴/۱۸۵ ، شرح صحیح مسلم للنووی ۱۴/۷۹ ، تہذیب السنن لابن القیم ۶/۱۰۳ - ۱۰۴) فقہائے مذاہب اربعہ نے بھی عموماً ان سے کراہت پر استدلال کیا ہے (الاحکام السلطانیہ للماوردی ص ۲۵۸ ، احیاء علوم الدین للغزالی ۱/۱۴۳ ، المغنی لابن قدامہ ۱/۹۱ - ۹۲ ، المجموع شرح المہذب للنووی ۱/۲۹۴ ، الدر المختار مع حاشیہ ابن عابدین ۵/۲۷۱ ، ۴۸۲ (طبع بولاق) ، المعیار المعرب للونشریسی ۱۲/۳۶۷ - ۳۶۸) پرانے علماء میں صرف ابن ابی عاصم (م ۲۸۷ھ) اور ابن الجوزی (م ۵۹۷ھ) ۔ عصر حاضر میں (ان ہی دونوں پر تکیہ کرتے ہوئے) سید سابق (فقہ السنۃ ۱/۳۹ - ۴۰) اور یوسف القرضاوی (الحلال والحرام فی الاسلام ص ۹۰ - ۹۱) ان احادیث کی تاویل کرتے ہیں اور ان کو نظر میں رکھتے ہوئے بھی کالے خضاب کے جواز کے قائل ہیں ۔ جن تابعین اور تبع تابعین کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کالا خضاب لگاتے تھے ان کے سلسلے میں یہ ثابت نہیں کہ ان تک ممانعت کی حدیث پہنچی تھی ۔ صحابۂ کرام کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ ان سے کالا خضاب لگانا ثابت نہیں اس کا

اج خلافت راشدہ کے بعد ہوا ہے، عہد نبوی اور خلافت راشدہ میں سیاہ خضاب کو سخت کراہت کی نگاہ سے دیکھا جاتا
تھا اس لئے ممانعت کی یہ حدیثیں بلاشبہ اپنے ظاہر پر محمول کی جائیں گی۔ امت کے تمام علماء و فقہاء کا یہی مسلک ہے۔
بن ابی عاصم اور ابن الجوزی کی توجیہ وتاویل اور صرف عن الظاہر کی کوشش اس سلسلے میں غیر مستحسن ہے یہ تو ایک مجمل بیان
ہوا، اب آیئے ہم ان دونوں کی تاویلات کا جائزہ لیں، مگر آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ ضروری ہے وہ یہ کہ
بن لوگوں نے زادالمعاد (۴/۳۶۷، ۳۶۸) پڑھ کر یہ سمجھا ہے کہ علامہ ابن قیم بھی ان احادیث کی تاویل کرتے ہیں یا بعض
صورتوں میں کالے خضاب کے جواز کے قائل ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ابن قیم کی رائے بھی جمہور علماء کے موافق ہے وہ بھی
اس کی ممانعت کے قائل ہیں اور مانعین کے مسلک کو ان دلائل کی بناء پر بلاشک وشبہ صحیح سمجھتے ہیں "وھوالصواب بلاریب
لما تقدم" (تہذیب سنن ابوداؤد ۶/۱۰۴) اس لئے زادالمعاد دیکھ کر مجوزین خوش نہ ہوں۔ اس میں انہوں نے جو تاویلیں ذکر
کی ہیں وہ دوسروں کی ہیں۔ خود ان کی صریح رائے "تہذیب السنن" میں مذکور ہے۔

ابوقحافہ والی حدیث کے سلسلے میں مجوزین دو باتیں کہتے ہیں :—

(۱) ایک یہ کہ اس حدیث میں "جنبوہ السواد" (انھیں کالا خضاب نہ لگانا) کا ٹکڑا مدرج ہے، یعنی فرمودۂ رسول
نہیں۔ اس لئے کہ ابوخیثمہ یہ حدیث جابر کے شاگرد ابوالزبیر سے روایت کرتے ہیں اور اس میں یہ ٹکڑا نہیں ہے (مسلم ۳/۱۶۶۳)
مسند احمد (۳/۳۳۸) میں ہے کہ زہیر (ابوخیثمہ) نے ابوالزبیر سے پوچھا کہ کیا جابر نے "جنبوہ السواد" کہا ہے؟ ابوالزبیر
نے کہا کہ نہیں۔

(۲) دوم یہ کہ اس حدیث سے تو یہ مفہوم نکلتا ہے کہ اس زمانے میں عموماً کالا خضاب لگایا جاتا تھا اگر یہ ممنوع ہوتا تو
وہ لوگ خود ہی انھیں کالا خضاب نہ لگاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منع فرمانے کی ضرورت کیوں ہوتی؟ ابوقحافہ اتنے
بوڑھے تھے کہ انہیں کالا خضاب لگانا کسی طرح مناسب نہ تھا اس لئے یہ نہی ان ہی کے ساتھ خاص ہے۔ اس ایک واقعہ سے عموم پر
استدلال نہیں کیا جاسکتا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ نہی ایسے شخص کے لئے ہے جس کا چہرہ اور سر کے بال زیادہ بڑھاپے کی وجہ
سے بدنما ہوگئے ہوں، اگر یہ نہی سب لوگوں کے لئے ہوتی تو اس حدیث کے راوی ابن جریج خود کالا خضاب کیوں لگاتے؟

پہلی بات کا جواب ایک تو یہ ہے کہ ابن جریج، لیث، عزرۃ بن ثابت اور دیگر ثقہ رواۃ نے ابوالزبیر سے یہ ٹکڑا مرفوعاً نقل
کیا ہے (مسلم ۳/۱۶۶۳، مسند ابوعوانہ ۵/۵۱۲ - ۵۱۴ اور دیگر مآخذ جن کا ذکر گذر چکا ہے) اس لئے صرف ابوخیثمہ کے نہ
روایت کرنے، اور ابوالزبیر کے بھول جانے سے یہ ٹکڑا مدرج نہیں ہوگا۔

دوم یہ کہ جابر کے علاوہ یہ حدیث انس، اسماء، ابوہریرہ سے بھی مروی ہے، بلکہ بعض مرسل روایتیں بھی اس سلسلے میں وارد ہیں (جن کا ذکر مع حوالہ کیا جا چکا ہے) ان سب میں " جنبوہ السواد " کا ٹکڑا مرفوعاً موجود ہے لہذا اسے مدرج کہنا صحیح نہیں۔

دوسری تاویل کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ فتح مکہ کے وقت (۸ھ) کا ہے، اور ابو قحافہ پہلے مسلمان ہیں جنہیں خضاب لگایا گیا تھا۔ جیسا کہ قتادہ نے تصریح کی ہے (ابن ابی شیبہ = الوسائل الی معرفۃ الاوائل للسیوطی ص ۲۲، کنز العمال ۶/۶۸۹ =)۔ ابو قحافہ چونکہ زندگی بھر مکہ ہی میں رہے (ابن سعد ۵/۲۵۸) اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں عبد المطلب سب سے پہلے جب یمن سے کالا خضاب لگا کر آئے تو ان کی دیکھا دیکھی مکہ والے سیاہ خضاب لگانے لگے تھے (ابن سعد ۱/۸۶ - ۸۷ = الوسائل ص ۲۱ - ۲۲)
اس لئے یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کالے خضاب سے منع فرمایا تو اس سے مشرکین مکہ کی اسی عادت قبیحہ کی مخالفت مقصود تھی، قتادہ کی صریح روایت کے بعد یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ عام طور پر مسلمان اس زمانے میں کالا خضاب لگایا کرتے تھے۔ ایسا کہنا حقیقت کے خلاف اور تاریخی روایات سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ یہیں سے یہ بات بھی رد ہو جاتی ہے کہ یہ حکم ابو قحافہ کے لئے خاص تھا کیونکہ کسی امر یا نہی کی تخصیص کی جب تک کوئی صحیح اسے نہ ہو اسے عموم پر محمول کرنا ضروری ہے۔ یہی صحیح مسلک ہے (دیکھئے: الاحکام فی اصول الاحکام لابن حزم ۳/۸۸ - ۸۹، اصول الفقہ لمحمد الخضری ص ۲۰۸ - ۲۰۹)
پھر یہ اسلامی دور میں خضاب لگانے کا پہلا واقعہ اور اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پہلا فرمان تھا، اگر اس سے صحابۂ کرام نے تخصیص سمجھا ہوتا تو خود کیوں سب لوگ سیاہ خضاب سے بچنے لگے۔ صرف زرد یا سرخ خضاب کا استعمال ان کے ہاں کیوں عام ہو گیا، اور سیاہ خضاب سے نفرت اور کراہت کی فضا کیسے پیدا ہو گئی؟ (جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔)
میں سمجھتا ہوں کہ مجوزین اس حدیث میں " غیروا الشیب وجنبوہ السواد " کے الفاظ سے جو یہ استدلال کرتے ہیں کہ اس سے خاص ابو قحافہ کو سیاہ خضاب سے بچانا مقصود ہے۔ عربی زبان کے اسالیب کے خلاف ہے، یہاں " جنبوہ " میں " ہ " کی ضمیر ابو قحافہ کے بجائے " الشَّیْب " (بالوں کی سفیدی) کی طرف لوٹتی ہے۔ اور ظاہر ہے جب سفید بالوں کو سیاہ خضاب سے بچانے کا حکم دیا گیا ہے تو یہ حکم صرف ابو قحافہ کے سفید بالوں کے ساتھ خاص نہیں رہا۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اس حدیث کے بعض الفاظ میں " واجتنبوا السواد " کے الفاظ ملتے ہیں جو اگر لفظ رسول نہ بھی ہوں تو صحابہ وتابعین حدیث سے جو کچھ سمجھا اس کی غمازی کرتی ہیں۔ اگر حدیث میں " جنبوہ " کے بجائے " جنبوا ہذا الشیخ السواد " کے الفاظ ہوتے تو ممکن تھا کہ اس سے صرف ابو قحافہ مراد ہوتے۔ لیکن ایسا کسی روایت میں نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر نے اسی لئے ابن ابی عاصم کی مذکورہ بالا تاویل

کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ سیاق سے متبادر ہے اس کے خلاف ہے (فتح الباری ۱۰/ ۳۵۵) اس مفہوم کی تائید کے لئے زہری کے جس قول کا سہارا لیا جاتا ہے کہ "ہم سیاہ خضاب لگاتے تھے جب چہرہ نیا تھا، جب چہرہ اور دانت بے رونق ہوگئے تو چھوڑ دیا۔" (ابن ابی عاصم = فتح الباری ۱۰/ ۳۵۵ =) یہ مقطوع ہے اور زہری تک اس کی سند کا پتہ نہیں کہ اس کی صحت کا جائزہ لیا جا سکے۔ اس لئے اسے ایک صحیح اور عام حدیث کی تخصیص کے لئے پیش کرنا درست نہیں (دیکھئے: تمام المنۃ للالبانی ص ۸۴، غایۃ المرام للالبانی ص ۸۳ - ۸۴) اگر یہ ان سے ثابت بھی ہو تو ان کی ذاتی رائے ہے جو حدیث کا مفہوم متعین کرنے کے لئے کارآمد نہیں۔

ابن جریج کے سلسلے میں جو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اس حدیث کی روایت کے باوجود سیاہ خضاب لگاتے تھے، گویا انہوں نے اس سے سب کے لئے سیاہ خضاب کی ممانعت نہیں سمجھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابن جریج کا سیاہ خضاب لگانا صرف ابن الجوزی نے بیان کیا ہے اور ان ہی سے ابن قیم نے نقل کیا ہے (زاد المعاد ۴/ ۳۶۸) اس کی سند کا کوئی پتہ نہیں کہ تحقیق کی جا سکے، کسی دوسرے ماخذ میں ابن جریج کا سیاہ خضاب لگانا نہیں ملتا، مجھے ابن الجوزی کے نقل پر اعتماد نہیں، اس لئے کہ انہوں نے جن دس گیارہ آدمیوں کے سیاہ خضاب لگانے کا ذکر کیا ہے (زاد المعاد ۴/ ۳۶۸) ان میں سے دو = ابن ابی لیلی (سیر اعلام النبلاء ۶/ ۳۱۲) اور نافع بن جبیر (ابن سعد ۵/ ۲۰۶) سیر اعلام النبلاء ۴/ ۵۴۲) = کے علاوہ کسی کے سیاہ خضاب لگانے کا ذکر کسی ماخذ میں نہیں ملتا بلکہ اس کے برخلاف بعض کا سرخ خضاب لگانا منقول ہے، جیسے ابو عبید القاسم بن سلام (الفہرست لابن الندیم ص۱۱۳ طبع قاہرہ، انباہ الرواۃ للقفطی ۳/ ۲۳، وفیات الاعیان ۴/ ۶۱، سیر اعلام النبلاء ۱۰/ ۵۰۴ وغیرہ) اس لئے جب تک ابن جریج کا سیاہ خضاب لگانا ثابت نہیں ہوتا اسے حدیث کا مفہوم سمجھنے کے لئے پیش کرنا لغو ہے، اگر بالفرض ان سے سیاہ خضاب لگانا مروی بھی ہو تو ان کے عمل سے صحیح حدیث پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، راوی کا حدیث کے خلاف عمل محدثین کے نزدیک حدیث کی صحت یا دلالت میں قادح نہیں۔

ان تمام تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ پہلی حدیث کی تاویل و توجیہ میں مجوزین نے جو کچھ کہا ہے وہ ناقابل التفات ہے حدیث اپنی جگہ صحیح اور کالے خضاب کی ممانعت کی صریح دلیل ہے۔

(باقی آئندہ شمارہ میں)

خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

عبدالسمیع محمد ہارون سلفی، مدرسہ اسلامیہ بھوارہ

نیلگوں افق پر شبِ دیجور کی گھٹا ٹوپ تاریکی کے بعد سپیدہ سحر کی کرن اس وقت طلوع ہوتی ہے جب آسمان پر جگمگاتے جھلملاتے خوبصورت ستارے فنا کی نذر ہو جاتے ہیں۔ سیاہ رات کے دلآویز ستاروں کے قمقموں کو اپنی رعنائی اور حسن کو خون کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر چہار دانگ عالم میں روشنی کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں اور بنی نوع انسان بلا امتیاز مذہب وملت از طلوع سحر تا غروب آفتاب اس روشنی سے فیضیاب اور مستفیض ہوتا ہے۔ مہندی کے خشک پتے اور معمولی تنکے کی کیا قدر وقیمت ہے۔ مگر وہ کسی دست نازنیں اور سرخ مرمریں ہاتھوں کی زینت اسی وقت بنتے ہیں جب ان خشک پتوں کو پتھر کے دو پاٹوں کے بیچ کی سختی سے گزرنا پڑتا ہے، یہ معمولی پتے اپنے لالۂ حنا سے دست حنائی میں اسی وقت حسن اور دلآویزگی پیدا کرتے ہیں جب یہ اپنے وجود کو فنا کر کے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں کوئی "سونا" اس وقت تک "کندن" نہیں بنتا جب تک اسے آگ کے جھلسنے اور تپتے ہوئے شعلوں سے نہ گزرنا پڑے، آگ سے گزرے بغیر سونا "سونا" نہیں مٹی کا ایک معمولی سا ڈلہ ہے۔ تپتے ہوئے شعلوں سے گزرنے کے بعد ہی سونا کندن بنتا اور کسی دلربا نازنین کی زینت وآرائش کا سامان بنتا ہے۔

یہی قدرت کا محکم دائمی اور مبنی بر عدل وحکمت اصول ہے کہ کچھ بننے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا، کچھ حاصل کرنے کے لیے کچھ کھونا پڑے گا۔ کچھ آسائش وراحت کی خاطر کچھ کلفت وغم کے کانٹوں کی چبھن برداشت کرنی ہوگی۔ قدرت کا یہ ازلی وابدی اصول ہے۔ مناظر فطرت ہو یا مناظر تاریخ جس نا حیے میں تلاش کریں۔ آپ دیکھیں گے کہ خواہ مناظر فطرت کا کوئی حسین گوشہ ہو یا دنیا کے عظیم تمدن اور بڑے بڑے انقلاب، کسی ملک کی خوشحال قوم ہو یا دنیا کی عظیم اور قدآور شخصیتیں ہر کسی کی کامرانی ومقصد براری کے پیچھے یہ علت ضرور کارفرما ہوگی کہ انھیں کچھ حاصل کرنے کے لیے

کچھ کھونا پڑا، کچھ بننے کے لیے کچھ قربان کرنا پڑا۔
تاریخ کا یہ ایک تابناک پہلو ہے کہ دنیا میں کوئی نیا تمدن یا کوئی نیا انقلاب اسی وقت آیا ہے جب تمدن اور انقلاب کے فداکاروں نے اپنا تن من دھن تمام چیزوں کو داؤ پر لگادیا ہے۔ کسی قوم کی خوشحالی و مرفہ الحالی ان کے پیہم و مسلسل محنتوں اور بہت کچھ قربانیوں کی مرہون منت ہوتی ہے۔ دنیا کی عظیم اور قدآور شخصیتیں عزت و نیک نامی کے آسمان پر اسی وقت چمکیں، جب انھوں نے معمولی سے معمولی اور بڑی سے بڑی قربانی کو پیش کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ اور انسانی تاریخ اس کی معمولی سے معمولی مثال بھی پیش نہیں کرتی کہ کسی قوم اور ملک نے اپنا مقصود اور گوہر مطلوب پالیا ہو اور اس کے نعم البدل اسے کچھ قربان نہ کرنا پڑا ہو۔ دنیا کے کسی انسان نے کچھ پالیا ہو اور اس کے عوض اسے کچھ کھونا نہ پڑا ہو۔
یہ نہ صرف قدرت کا محکم اصول ہے بلکہ تاریخ بھی اس کی گواہ ہے کہ اس عالم آب و گل کے اندر رہنے والی تمام مخلوقات کی مقصد براری کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کی خاطر کچھ قربان کرے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے

معلوم ہوا کہ انسان کا اپنا کوئی انفرادی مطلوب و مقصود ہو یا اجتماعی بحیثیت مجموعی ہم اپنا گوہر مقصود اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتے جب تک ہم اس کے لیے ہر ممکن چیز کو قربان کرنے کے لیے تیار نہ رہیں اور وقت آنے پر بلا دریغ اسے قربان نہ کردیں۔ ہم اگر ایک داعی ہیں تو ہمیں اپنی مقصد براری کے لے بہت سی چیزوں کی قربانی دینا پڑے گی۔ کبھی دھن کی کبھی من کی اور کبھی تن کی۔ ہم اگر ایک طالبعلم ہیں تو ہمیں اپنی آسائشوں، راحتوں اور بہت کچھ کی قربانیاں دینا ہوں گی تبھی ہم ایک کامیاب اور لائق طالبعلم بن سکتے ہیں، ہم اگر ایک تاجر ہیں تو اپنی تجارت کے فروغ و ارتقار کے لیے انتھک محنتیں کرنا ہوں گی، وقت کی قربانیاں، آرام و آسائش کی قربانیاں اور کئی قربانیاں دینا ہوں گی۔
ہم اگر چاہتے ہیں کہ ہم اپنے کسی انفرادی یا اجتماعی مقصود میں کامیابی حاصل کریں تو ہمیں اس کے لیے کبھی من کی، کبھی دھن کی اور کبھی تن کی بھی قربانی دینی پڑے گی، تبھی ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوسکتے ہیں ورنہ ہرگز نہیں اور بقول مولانا آزاد؟:
" اس بزم سود و زیاں میں کامرانی کا جام کبھی کوتاہ دستوں کے لیے نہیں بھرا گیا، وہ ہمیشہ انھی کے حصہ میں آیا جو خود بڑھ کر اٹھانے کی جرات رکھتے تھے۔

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

ہندوستان کی نامور و قدآور اور مہتم بالشان شخصیتوں میں سے ایک شخصیت فیروز بخت محی الدین مولانا ابو الکلام آزاد کی بھی ہے، یہ نام ہے اس شخص کا جو زبان و قلم کے شہسوار، ادارت و صحافت کے بے تاج بادشاہ، علم و ادب کی تصویر کمال، عزیمت و استقامت کے پیکر، ہمت و جرأت کی مثال، سیاست اور تدبر و تفکر کا انمٹ نقش، فکر و دانش کے آسمان، ایمان و عقیدہ کی مجسم داستان، ایک عجیب و غریب انسان اور قدرت کا شاہکار تھا، بولتے تو الفاظ ہاتھ جوڑے کھڑے ہو جاتے، اور لکھتے تو قلم شمشیر براں بن جاتا، مولانا آزاد نے جس زمین پر قدم رکھا اسے آسمان بنا دیا اور اپنے ہم عصروں کو حیران کر دیا، ایک موقع سے رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ:

"مولانا زبان و قلم کے ایسے دھنی تھے کہ الفاظ کو ربوبیت اور نبوت کا جامہ پہنا دیتے "

شورش کاشمیری نے اعتراف کیا تھا کہ:

"مولانا کے اسلوب تحریر کا آستانہ میرے قلم کی سجدہ گاہ ہے " آپ کی نثر میں جو بات ہے اس کے پیش نظر حسرت موہانی نے کہا تھا کہ

؎ جب سے دیکھی ہے آزاد کی نثر — نظم حسرت میں مزہ نہ رہا

قدرت نے مولانا آزاد کو بے شمار میزات و خصائص سے نوازا تھا، اور وہ ایک عجوبہ بنے دنیا میں رہے اور گذر گئے، ماننا پڑے گا کہ ؎

ہم جہاں تیری تصویر لئے پھرتے ہیں
کسی تصویر سے ملتی نہیں تیری تصویر

مولانا آزاد کی پیدائش اور پرورش و پرداخت ایک ایسے خاندان میں ہوئی جو مذہبی رہبانیت اور پیشوائی رکھتا تھا، اس کے پیش نظر مولانا آزاد نے خود ایک موقع سے فرمایا تھا کہ: اس رہبانیت و پیشوائی کے خلاف خیالات میں تزلزل آرہا تھا اور میں عقیدت کی

ں معیبت سے نجات پانا چاہتا تھا جو پیری مریدی کا خاصہ ہے ،

المختصر دماغ مذہب سے متعلق منفی و مثبت خیالات کی گذرگاہ تھا ، اور جو چیز گھر میں ممنوع تھی وہ دماغ میں داخل ہوگئی (آزاد کہانی خود ان کی زبانی) مولانا آزاد ایک ایسے ذہنی اضطراب کے شکار تھے کہ عقیدہ و عمل کی کوئی ایسی راہ متعین نہیں ہو پا رہی تھی ، وہ چاہتے مل نہیں پا رہا تھا ، اور جس کی تمنا تھی وہ یکسر مفقود تھا ۔ مولانا آزاد خود رقمطراز ہیں کہ :

پیدائش اور خاندانی ورثے میں سے جو مذہب ملا تھا میں اس پر قانع نہیں رہا ، اور جونہی مجھ میں اتنی طاقت پیدا ہوئی کہ کسی چیز کو پنے سے الگ کر سکوں ، میں نے اسے الگ کر دیا ، اور پھر ایک خالی دل و دماغ نے کر طلب و جستجو میں نکلا ، جلوت سے گریزاں اور خلوت کے خواہاں مولانا آزاد " حق و حقیقت " کی تلاش و جستجو میں شب و روز ایک کر دیئے ، اور اس سلسلے میں انہوں نے سب کچھ قرآن ہی کو سمجھا ، بالآخر ان کو اپنی منزل مل گئی ، اور تشکیک و الحاد کا غبار خاطر و دماغ صاف ہوگیا ؎

عقل کو تنقید سے فرصت کہاں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

مولانا آزاد نے جب عقل کو الگ کئے ، مذہب کا مطالعہ کرنا شروع کیا تو ان کے لاینحل سوالوں کے تمام جواب خود بخود واضح ہوگئے ، اور " الہلال " کے ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء کے شمارہ میں اداریہ لکھا کہ : ہمارے پاس اگر کچھ ہے تو صرف قرآن ہی ہے ، اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے : اور لکھا کہ : ہر وہ خیال جو قرآن کے سوا اور کسی تعلیم گاہ سے حاصل کیا گیا ہو کفر صریح ہے ، " شاہراہ مقصود " (۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء) میں لکھا کہ : خدا قرآن اور رسول وحدہٗ لاشریک ہیں ، ان کی صفات و خصائص میں کوئی ان کا شریک نہیں ، قرآن اور مذہب سے متعلق یہ اس آدمی کے خیالات ہیں جو کبھی تشکیک و الحاد کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے ، شورش کاشمیری اپنی کتاب " ابوالکلام آزاد " سوانح و افکار صفحہ ۶۳) میں رقمطراز ہیں کہ : ایک دفعہ ہم لوگ راقم الحروف ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ، سید عطاء اللہ شاہ بخاری ، شو شلسٹ لیڈر منشی احمد ، شیخ حسام الدین مولوی عزیز الرحمان مولانا کی خدمت میں حاضر تھے ، ملاقات کی روداد میری یادداشتوں میں درج ہے ، تاریخ مرقوم نہیں ، اس گفتگو کے ارشادات بڑے قیمتی تھے ، کسی نے سوال کیا " حضرت آپ انکار و الحاد کے بیابان سے کیونکر نکلے " مسکراتے ہوئے فرمایا : اس کا جواب تو ترجمان القرآن کی دونوں جلدیں ہیں ، تیسری جلد میں بھی اس کے باقیات آ رہے ہیں ، البیان کا موقع ملا تو انشاء اللہ ان سوالوں کی مختلف نوعیتوں کا جواب اس میں ہوگا ، سورۂ فاتحہ کے مباحث بجائے خود بتاتے ہیں کہ دماغی سفر کی وادیاں کتنی سنگلاخ تھیں ، یہ ایک دور دراز کا سفر تھا جو میں نے بفضلہ تعالیٰ عمر کی دوسری دہائی کے آخری ثلث میں طے کر لیا ورنہ اس قسم کی منزلیں کئی ہی دہائیوں میں طے نہیں ہوتیں ، قرآن نام ہے ایک عالمگیر سچائی کا ، اس کی سب سے بڑی

خوبی یہ ہے کہ تمام مذاہب ربانی کی سچائیاں جو ان کے پیروں نے گم کر دی تھیں، اس میں مجتمع ہو گئی ہیں، اس کی دعوت میں کوئی شک
مولانا نے فرمایا کہ: لوگ قرآن کے مطالعے سے سیرت کی طرف آتے ہیں، میں سیرت کے مطالعے سے قرآن کی طرف لوٹا تو میرے دل و دماغ
ہر کانٹا صاف ہو گیا، اور میں بفضلہ تعالیٰ انکار و الحاد کے بیابان سے نکل آیا، جس کے عقیدہ و عمل کی کوئی راہ متعین نہیں تھی،
تشکیک و الحاد کی دلدل میں جو پھنسا رہا، اس نے جب بنظر غائر قرآن کا مطالعہ کیا تو غبار ذہن بالکل صاف ہو گیا، قرآن کو ہی س
کچھ سمجھا، اور اس درسگاہ کے سوا کسی اور تعلیم گاہ سے حاصل کئے ہوئے خیال کو کفر صریح جانا۔

اس خیال سے قرآن کی بابت مولانا آزاد کے عقیدہ و یقین اور اس ذہنی و قلبی اطمینان کا ثبوت ملتا ہے، جس کے وہ متا
تھے اور سنگلاخ وادیوں سے گذرنے کے بعد وہ انہیں حاصل ہوا، قرآن کو انہوں نے اس قدر سمجھا کہ دل و دماغ اور دین و دنیا
سب کچھ اسی میں پا گئے۔ پھر اس کے بعد "ترجمان القرآن" جیسی ایک عظیم الشان کتاب لکھی کہ علم و ادب کی دنیا میں دھوم مچ گئی، ا
اس عظیم الشان کتاب کو اس آدمی کی طرف منسوب کر دیا جو قندھارے رانچی پیدل چل کے مولانا آزاد سے قرآن مجید کے بعض مقامات
سمجھنے آیا: قرآن مجید سے مولانا آزاد کو وہ عقیدت و محبت تھی، اس کا پتہ ان کی مختلف تصنیفات اور "الہلال۔ البلاغ"
بخوبی چلتا ہے، اور اس کا بھی ثبوت مہیا ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے قرآن کو کس طرح پڑھا اور سمجھا، پھر اس کے ذریعہ اپنے عقیدہ و ع
کی راہ متعین کرتے ہوئے فخریہ فرمایا کہ: قرآن نام ہے ایک عالمگیر سچائی کا:

وہ اگر اپنی توجہ "قرآن" پر ہی صرف کرتے تو بلا شبہ ایک بہت بڑے مفسر قرآن ہوتے، لیکن حالات و مصروفیات نے ج
"ترجمان القرآن" کی تکمیل سے باز رکھا اور دنیائے علم کو تشنہ چھوڑ گئے۔

انسانی کرامت واعضاء کی پیوند کاری

تحریر: ڈاکٹر محمد فوزی فیض اللہ
استاذ الشریعۃ الاسلامیہ، کویت یونیورسٹی، کویت

ترجمہ عبدالمنان محمد شفیق السلفی
اجمل خان طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا » (سورۃ الاسراء/۷۰)

ترجمہ: یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

انسان کی تکریم کا سبب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق خود اپنے ہاتھوں سے کی اور اسے ایک تناسب اور اچھی شکل وصورت عطا کی، آنکھ کان، ناک اور دوسری صلاحیتوں سے بہرہ ور فرمایا، اور عقل جیسی نعمت، علم جیسی دولت اور گویائی جیسی صلاحیت سے نواز کر اسے دنیا کی تمام مخلوقات پر فضیلت و برتری عطا فرمائی اور اس کی فطرت میں گوناگوں صلاحیتیں ودیعت فرمائیں اور فرشتوں کو اس کے آگے سربسجود ہونے کا حکم دیا۔ اور کائنات کو اس کے تابع بنایا۔ زمین میں اسے اپنا نائب و خلیفہ مقرر کیا اور اپنے دین کی اشاعت، شریعت کی تبلیغ اور احکام کی بجاآوری اس کے ذمہ ڈالی۔

اس تکریم کا تقاضہ یہ ہے کہ نسل انسانی کی حفاظت و بقا کی کوشش کی جائے لیکن اس کے لیے صرف صحیح اور

شرعی طریقہ ہی اپنایا جائے اور دیگر تمام طریقوں سے بچا جائے اور ساتھ ہی ان تمام وسائل وذرائع سے
مل احتراز کیا جائے جو ایک طرف اس کی تکلیف کا سبب یا اس کی کمزوری کا باعث ہیں اور دوسری طرف
اس کو موت یا اس کے اعضاء میں قطع وبرید تک لے جانے والی ہیں، کیونکہ کسی نفس کا ناحق قتل کسی بھی صورت میں
جائز نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولا تقتلوا انفسکم إن اللہ کان بکم رحیما (سورۃ النساء/۲۹)

ترجمہ: اے مسلمانو! تم خود سے اپنی جانوں کو ہلاک مت کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے۔

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو خودکشی کرنے سے یا ایک دوسرے کو قتل کرنے سے روک دیا ہے اوران
تمام چیزوں سے دور رہنے کا حکم دیا ہے جو قتل اور ہلاکت کا موجب ہیں۔ مثلاً ہیروئن، اسمیک اور دیگر نشہ آور
ادویات اور انسانی جسم کے لیے نقصان دہ زہروں کا استعمال اور اس قبیل کی دیگر چیزیں اس کے اندر شامل ہیں،
اس کی دلیل حضرت عمرو بن عاص کی روایت ہے:

ففی حدیث «عمرو بن العاص أنہ لما بعث فی غزوۃ ذات السلاسل قال
احتلمت فی لیلۃ باردۃ شدیدۃ البرد، فاشفقت إن اغتسلت ان اھلک فتیممت
ثم صلیت باصحابی صلاۃ الصبح، فلما قدمنا علی رسول اللہ ﷺ ذکروا ذلک لہ فقال:
یا عمرو صلیت باصحابک وانت جنب؟ فقلت ذکرت قول اللہ تعالیٰ ولا تقتلوا ا
نفسکم ان اللہ کان بکم رحیما فتیممت ثم صلیت فضحک رسول اللہ ﷺ ولم یقل
شیئاً۔ (رواہ احمد وابوداؤد)

ترجمہ: عمرو بن عاص کی روایت ہے وہ غزوہ ذات السلاسل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک
رات کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی اور مجھے احتلام ہو گیا، یہ سوچ کر کہ اگر میں غسل کروں گا تو موت کا خطرہ ہے، میں نے
تیمم کر لیا اور اپنے ساتھیوں کو صبح کی نماز پڑھائی، جب ہم وہاں سے واپس ہوئے اور اس کا تذکرہ نبی کریم ﷺ کی خدمت
میں کیا گیا تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ اے عمرو! کیا تو نے اپنے ساتھیوں کو حالت جنابت میں نماز پڑھائی تھی، میں نے فرمایا کہ
اے اللہ کے رسول ﷺ مجھے اس موقع پر اللہ تعالیٰ کا یہ کلام: «ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیماً»
یاد آ گیا تھا لہٰذا میں نے تیمم کیا اور نماز ادا کی، اس پر نبی کریم ﷺ مسکرائے اور کچھ نہیں کہا۔

اس طرح شریعت نے قطعاً اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے کو عمداً قتل کرے کیونکہ کوئی بھی فرد جو حلقۂ اسلام میں داخل ہوجاتا ہے، اسلام اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے، البتہ کچھ صورتیں ایسی ہیں جب ایک مسلمان کا خون حلال ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

ومن یقتل مومناً متعمداً فجزاءه جهنم خالداً فیها (سورۃ النساء /۹۳)

ترجمہ :۔ وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا : ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ إلا بالحق » (الفرقان/۶۸)

ترجمہ : اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے۔

اور اللہ کے رسول نے ایک دوسرے کو قتل کرنے کو کفر سے تعبیر کیا ہے، جیسا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا : « لا ترجعوا بعد کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض »

ترجمہ :۔ میری وفات کے بعد کافر مت ہوجانا کہ تم ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ (بخاری)

اور ایک دوسری روایت میں ہے : وفی الصحیح عن أنس بن مالک عن النبی قال اکبر الکبائر الاشراک باللہ وقتل النفس وعقوق الوالدین » (رواه البخاری)

ترجمہ : صحیح بخاری میں حضرت انس کی روایت ہے کہ نبی کریم نے ارشاد فرمایا : کبیرہ گناہوں میں بڑے گناہ یہ ہیں، خدا کی الوہیت میں کسی کو شریک ٹھہرانا، مسلمان کا قتل کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔

لیکن مذکورہ بالا حکم کے اندر دو صورتیں شامل نہیں ہیں :

(۱) قتل خطا : یعنی وہ قتل جو کسی غلط فہمی کے نتیجہ میں ہوگیا ہو، ایسی صورت میں قاتل کے ذمہ صرف کفارہ اور دیت کی ادائیگی لازم ہوگی، اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

(۲) قتل حق :۔ اسلام کی نگاہ میں جو امور موجب قتل ہیں اگر کوئی مسلمان ان کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اس کا قتل کرنا شرعاً درست ہے، اس کی دلیل حسب ذیل روایت ہے :

عن عبد اللہ مسعودؓ قال قال رسول اللہ لا یحل دم امرئ مسلم یشهد ان لا إله إلا اللہ و أنی رسول اللہ إلا باحدى ثلاث النفس بالنفس، والثیب الزانی والمارق من الدین التارک للجماعۃ » (رواه البخاری)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مسعود کی روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ایک مسلمان جو شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں اس کا رسول ہوں تو اس کا خون حلال نہیں ہے، مگر صرف تین باتوں میں:

(۱) اس نے کسی مسلمان کا قتل کیا ہو تو قصاص میں اسے بھی قتل کر دیا جائے گا۔

(۲) اس نے شادی شدہ ہونے کے بعد کسی عورت کے ساتھ زنا کیا ہو۔

(۳) وہ اسلام لانے کے بعد مرتد ہو جائے۔

ظلم و زیادتی کی تمام صورتیں خواہ اس کا ارتکاب مسلمان کے ساتھ ہو یا غیر مسلم کے ساتھ، یکساں طور پر حرام ہے اور فریق مخالف کے ساتھ اس سلسلے میں امتیاز برتنا کسی بھی صورت میں صحیح نہیں خواہ جہاد کا ہی زمانہ کیوں نہ ہو اور دونوں آپس میں برسر پیکار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا۔ (سورۃ البقرۃ/۱۹۰)

ترجمہ: اور راہِ خدا میں ان لوگوں کے خلاف قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں، لیکن حدِ اعتدال سے آگے مت بڑھو۔

اس کا مطلب ہے کہ کفار سے قتال ضرور کرو لیکن کفار سے جنگ میں اعتدال سے آگے مت بڑھو، ان کی لاشوں کا مثلہ مت کرو، عورتوں، معصوم بچوں اور بے کار و ناکارہ بوڑھوں کو قتل کرنے سے گریز کرو، پادریوں، گرجھتیوں اور سادھوؤں کو ہلاک مت کرو اور صرف انھیں سے جنگ کرو جو تمھارے مقابلے میں آتے ہیں ففی حدیث بریدۃ ان رسول اللہ کان یقول "اغزوا فی سبیل اللہ، قاتلوا من کفر باللہ، اغزوا ولا تغلوا ولا تمثلوا ولا تقتلوا الولید ولا اصحاب الصوامع" (رواہ مسلم)

ترجمہ:۔ بریدہ کی روایت ہے کہ نبی کریمؐ فرماتے تھے "اللہ کے راستہ میں غزوہ کرو، منکرین خدا سے قتال کرو، جہاد کرو لیکن بدعہدی و خیانت سے بچو اور بچوں کو قتل مت کرو، نہ پادریوں، گرجھتیوں اور سادھوؤں کو۔ (مسلم)

زمانۂ جنگ میں جب اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دورانِ جنگ فریق مخالف کے ساتھ تجاوز مت کرنا، بوڑھوں بچوں کو قتل مت کرنا وغیرہ تو اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امن و آشتی کے زمانے میں اس کی تعلیمات کیا ہوں گی۔ اور اس نے مسلمانوں کو کس طرح کی رہنمائی کی ہوگی۔

اہل عرب کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول "ولا تعتدوا" میں مفعول یا متعلق محذوف ہے جو کہ اس بات کی علامت ہے کہ نہی عام ہے اور علی الاطلاق حد سے تجاوز کرنے سے روکا گیا ہے، یعنی کسی پر بھی حد سے تجاوز نہ کرو

درا اعتدار کا معنی یہ ہے کہ جس چیز پر اکتفا کیا جا سکتا ہے اس سے آگے بڑھ جانا اور عدوان خواہ نفس کے ساتھ ہو یا غیر نفس کے ساتھ، کم ہو یا زیادہ سب کا حکم یکساں ہے اور سب حرمت میں برابر ہیں، مثلا بنا کسی مصلحت کے جاندار کا قتل کرنا، درختوں کا کاٹنا یا نذر آتش کرنا وغیرہ۔

اور جب اسلام نے غیر مسلم کافر کے ساتھ ظلم و زیادتی کو سخت ناپسند کیا ہے اور اس کو حرام قرار دیا ہے تو پھر کسی مسلمان کے ساتھ ظلم و زیادتی کسی کافر کی بہ نسبت عظیم تر گناہ ہے بلکہ اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے کو قول فعل یا نظر سے تکلیف پہنچائے۔ حدیث شریف میں ہے :

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ویده - (متفق علیہ)

ترجمہ: کامل مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے :

لا یحل لمسلم ان ینظر الی اخیه بنظر یؤذیه - " رواہ ابن المبارک مرسلاً "

ترجمہ: ایک مسلمان کے لیے ناجائز ہے کہ وہ اپنے بھائی کو تکلیف دہ نظروں سے دیکھے۔

ایک اور روایت میں ہے :

لا یحل لمسلم ان یروع مسلما - (رواہ احمد و ابوداؤد والطبرانی)

ترجمہ: کسی مسلمان کو ڈرانا دھمکانا اور خوف دلانا کسی مسلمان کے لیے درست نہیں ہے۔

احادیث کے اندر بے شمار روایتیں اس سلسلے کی ملتی ہیں جو کسی مسلمان کو تکلیف پہونچانے کی حرمت پر دلالت کرتی ہیں چہ جائے کہ اس کے کسی عضو کو شریعت نے کاٹنے یا نکالنے کی اجازت دی ہو اور یہاں ہماری بحث کا موضوع بھی یہی ہے،

شریعت نے انسان کے اندر کسی بھی طرح کے تصرف کی اجازت نہیں دی ہے، خواہ تصرف کا عمل اس کی زندگی میں ہو یا موت کے بعد۔ تصرف جسم انسان کو فروخت کرنے کی صورت میں ہو یا اس کے کسی عضو کو فروخت کرنے کی شکل میں۔ غرضیکہ تصرف کی کوئی بھی قسم کسی طرح عمل میں لائی جائے بہر حال ناجائز و حرام ہے اور اس طرح کی کوئی بھی بیع شرعاً منعقد نہیں ہوگی بلکہ وہ سراسر باطل ہے۔ دلیل مندرجہ ذیل روایت ہے :

عن ابی هریرة عن النبیؐ قال : قال الله تعالی ثلاثة انا خصمهم یوم القیامة:

رجل اعطی بی ثم غدر ، رجل باع حرا فاکل ثمنہ ، ورجل استاجر اجیرا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ ، (رواہ احمد والبخاری)

ترجمہ : ابوہریرہ کی روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا " اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : تین طرح کے لوگ ہیں کہ بروز قیامت میں ان کا فریق مخالف ہوں گا ۔ ایک آدمی جس نے میری اطاعت قبول کی پھر بدعہدی کر گیا ، دوسرا وہ آدمی جس نے کسی آزاد شخص کو بیچا پھر اس کی قیمت کھا گیا ، تیسرا وہ آدمی جس نے کسی شخص کو اجرت پر رکھا ، پھر اس سے پورا کام لیا ، اور اسے اس کی اجرت نہ دی (احمد ، بخاری)

دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد انسان کو فروخت کر دیا اور اس کی قیمت کو اپنے کام میں استعمال کر لیا ۔ تیسرا وہ شخص

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آزاد کی بیع و شراء حرام ہے اور آزاد کا فروخت کنندہ ایک عظیم گناہ کا ارتکاب کرتا ہے ۔ کیوں کہ تمام آزاد انسان خدا کی ملکیت ہیں اور آزاد کا فروخت کرنے والا غاصب کے مثل ہے جو اللہ کے ایک ایسے بندہ کو غصب کرنے کا سزاوار ہوتا ہے جس کے اوپر خدا کے سوا کسی کا کوئی حق نہیں ہے ، لہٰذا اللہ تعالیٰ روز قیامت غاصب کے خلاف ہوگا ۔

یہی وجہ ہے کہ آزاد کی بیع کے عدم جواز کے سلسلہ میں فقہاء کے مابین کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ۔ ابن منذر کا کہنا ہے کہ تمام فقہاء کا اجماع ہے کہ آزاد کی بیع و شراء باطل ہے ۔

اور بیع کے ناجائز ہونے کی وجہ فقہاء یہ بتلاتے ہیں کہ آزاد یا اس کا عضو مال نہیں ہوتا ہے ۔ جبکہ تمام فقہاء کے نزدیک متفقہ طور پر بیع کے صحیح ہونے کے لیے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ محل بیع تعاقد کو قبول کرتا ہو ، جس کا مطلب ہے کہ بیع مال ہو ، اس کی قیمت ہو اور اس سے انتفاع جائز ہو ۔

اس کے برخلاف ہم بخوبی واقف ہیں کہ انسان من حیث المجموع کسی کی ملکیت نہیں ہوتا ہے ، کیونکہ صرف اموال اور اشیاء ہی حقوق اور بیع و شراء کا محل ہوتی ہیں اور ان کے اوپر ملکیت وغیرہ کے احکام جاری ہوتے ہیں ۔ اور انسان بقول سرخسی مال کا مالک ہوتا ہے ، مملوک نہیں ہوا کرتا اور اس کے مال و مالکِ مال ہونے کے مابین مغائرت پایا جانا ہے ۔ "

کاسانی کے کہنے کے مطابق اگرچہ حنفیہ نے اطرافِ انسان ہاتھ ، پاؤں ، آنکھ ، کان ، ناک اور اسی طرح کے دیگر اعضاء کو مال کے مشابہ بتلایا ہے ، یعنی ان کے ساتھ مال جیسا معاملہ کیا جا سکتا ہے (بدائع الصنائع) لیکن

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ درحقیقت وہ مال ہیں یا مالیت کے درجہ میں ہیں، بلکہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ اگر کسی سبب خاص قصاص کا حکم ساقط ہو جاتا ہے تو اس کا تاوان مال اور دیت کے ذریعہ ادا کیا جائے گا جیسا کہ مقتول کے اولیا قاتل کو معاف کردیں، یا جب ہاتھ کاٹنے کا حکم ہو اور قاطع طبیب کے علاوہ کوئی غیر ہو تو قصاص کے بجائے دیت ادا کی جائے گی۔ کیونکہ یہاں قطع ید کے حکم میں ایک شبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس صورت میں شبہ حقیقت کے درجہ کو پہونچ جاتا ہے لہذا قصاص ساقط ہو جائے گا لیکن تاوان بہرحال واجب ہوگا، کیونکہ شبہ کی بنیاد پر قصاص کا سقوط مال کے وجوب سے مانع نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان اور اس کا کوئی بھی عضو خرید و فروخت کا محل نہیں ہو سکتا اور یہ چیز تمام فقہاء کے نزدیک ثابت و مسلم بھی ہے، لیکن اس حکم سے مرضعہ (دایہ) کے دودھ کو مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اسے بھی شرعاً درست نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ دودھ بھی مرضعہ کا جزء ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود عقد رضاعت جائز ہے اور اس کی بیع و شراء کی جا سکتی ہے اور اس کا سبب جواز بچہ کی ضرورت استحسان ہے کیونکہ اس بچہ کو بھی دنیا میں رہنے کا حق حاصل ہے، جس کا حصول محض دودھ کی غذا سے ہی ممکن ہے اور اس کا یہ حق انسان کی کرامت و عظمت سے کہیں زیادہ اہم و ضروری ہے اور کسی انسانی زندگی کی حفاظت معنوی اعتبار سے بھی مقدم ہوا کرتی ہے، کیونکہ اس سے ایک ذات کا مسئلہ وابستہ ہوتا ہے اور اس سے بعض ایک ذات کی تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت میں ضرورت کے تحت عقد رضاعت جائز ہے۔

فقہاء کے یہاں رضاعت اجارہ کی طرح ہے جس میں مرضعہ بچہ کو دودھ پلانے کے بدلہ اجرت کی مستحق ہوتی ہے فقہی قیاس کا تقاضہ ہے کہ یہ بیع ناجائز ہو کیونکہ بیع ایک شئی دودھ کے استہلاک (صرف) کرنے کی ہو رہی ہے اور اجرت شے کے بجائے منفعت کی دی جا رہی ہے، لیکن فقہاء نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ بیع کا اصل مقصد استھلاک لبن (دودھ کا خرچ کرنا) نہیں ہوتا بلکہ مقصد بچہ کی خدمت اور اس کو دودھ پلانا ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ دودھ کا استہلاک ہے لہذا یہ خدمت کے تابع ہے، اس لیے جائز ہے۔ بہت سے ایسے امور ہیں جو اصلاً جائز نہیں ہوتے لیکن کسی چیز کے تابع ہو کر ان کی بیع درست ہو جاتی ہے۔ یہی حال یہاں مرضعہ کے دودھ کا بھی ہے کہ اس کا مستقلاً بیع کرنا درست نہیں ہے لیکن تبعاً جائز ہے۔

یہ استثناء بطور استحسان ہے جس کی دلیل مندرجہ ذیل آیت ہے۔

فان ارضعن لکم فاتوھن اجورھن ۔ (سورۃ الطلاق /۶)

ترجمہ: اگر وہ تمھارے لیے (بچے کو) دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انھیں دو ۔

مردہ انسان کے اعضاء سے علاج

انسانی کرامت و عظمت اور تقدس کی بنیاد پر صرف حنفی فقہاء کا ہی نہیں بلکہ جمہور فقہاء کا کہنا ہے کہ انسان خواہ زندہ ہو یا مردہ، ضرورت علاج کی ہو یا کوئی اور، بہر حال کسی بھی صورت میں اعضاء انسان سے انتفاع جائز نہیں ہے ۔ جبکہ اگر ضرورت ہو تو فقہاء نے اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ ایک انسان علاج و معالجہ کے لیے دیگر حیوانات کے اعضاء اور ہڈیوں کا استعمال کر سکتا ہے، شریعت کی نظر میں اس میں کوئی قباحت نہیں ہے قطع نظر اس کے کہ جانور زندہ ہو یا مردہ مذبوح ہو یا غیر مذبوح ۔ لیکن خنزیر اس حکم کے اندر نہیں آتا کیونکہ وہ نجس عین ہوتا ہے (الفتاوی الہندیہ الطبعۃ الثالثۃ)

فقہاء نے "ضرورت" کی تعریف یہ کی ہے کہ آدمی کسی ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے، جس سے بچ نکلنا اس وقت تک ممکن نہ ہو جب تک کہ وہ کسی حرام شئی کا استعمال نہ کرے ۔

لیکن ملحوظ رہے کہ حنفی فقہاء نے علاج و معالجہ میں مردہ حیوان کے اعضاء سے انتفاع کو مطلق طور پر نہیں جائز قرار دیا ہے بلکہ اس کی چند شرائط ہیں :۔

۱۔ مسلمان طبیب اس کی ضرورت محسوس کرے ۔

۲۔ اسے یقین ہو کہ مرض کی شفا صرف اسی سے ہو سکتی ہے ۔

۳۔ حلال شئی کے اندر اس کا بدل موجود نہ ہو ۔ (الدر المختار)

رہے شوافع تو اس سلسلہ میں ان کے یہاں کافی وسعت پائی جاتی ہے ۔ ان کے یہاں اضطراری صورت میں مردہ آدمی کا گوشت استعمال کرنا حلال ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے ۔ امام نووی نے اس کی علت یہ بتائی ہے کہ چونکہ ایک زندہ انسان تقدس و عظمت میں مردہ سے بڑھا ہوتا ہے ۔ (المجموع للنووی)

لہذا زندہ کی حرمت و عظمت کو باقی رکھنا بہ نسبت مردہ کے زیادہ ضروری ہے ۔ لہذا اس کے لیے مردہ گوشت جائز اور حلال ہے ۔ اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے کہ ایک مضطر انسان ہے جس کے سامنے مردہ پڑا ہوا ہے

ب اس کے پاس صرف دو صورتیں ہیں، یا تو وہ مردہ کا گوشت استعمال کرکے اپنی جان بچالے، یا پھر اس کی
لت کے لحاظ میں اس کا گوشت استعمال نہ کرے اور اپنے آپ کو ہلاک کردے، دونوں ہی صورتیں برازفساد ہیں
لمن چونکہ موت سے پیداشدہ فساد گوشت کے استعمال سے پیدا ہونے والے فساد سے بڑھ کر ہے اور جہاں یہ
ورت ہو وہاں کم فساد والی چیز کو نظر انداز کردینا ہی اولی ہے تاکہ فساد اکبر سے بچا جاسکے۔

شیرازی اور جمہور شافعیہ سے بالجزم منقول ہے کہ ان کا یہی مسلک ہے جبکہ دارمی کا مسلک اس سلسلے میں مسلم
غیر مسلم کے مابین تفریق پر مبنی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مردہ اگر کافر ہے تو اس کا کھانا حلال ہے، لیکن اگر وہ مسلمان ہے
و اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اس کا کھانا جائز ہے اور دوسری یہ کہ اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔

اور اگر کبھی ایسی صورت پیش آجائے کہ مضطر ذمی ہے اور مردہ مسلمان ہے تو کیا ذمی کے لیے مسلمان میت کا
گوشت کھانا حلال ہوگا؟ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت میں کھانا حلال ہوگا اور دوسری صورت میں حرام
ہوگا۔ جبکہ نووی کا کہنا ہے کہ مسلمان کی عظمت اور تقدس کی بنیاد پر قیاس یہی کہتا ہے کہ مردہ مسلمان کا گوشت ذمی
کے لیے حرام ہے۔

ظاہر ہے کہ دونوں ضرورتیں (یعنی علاج یا مردہ کا گوشت کھانا) ہم مثل اور یکساں ہیں اور ان کے مابین
کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اول الذکر موخرالذکر کی بہ نسبت زیادہ اہم اور بہتر ہے، کیونکہ دوسری صورت میں مضطر انسان
اپنی زندگی کو باقی رکھنے کے لیے مردہ کا گوشت کھاتا ہے اور اس طرح سے اس کو ضائع و برباد کرتا ہے، گویا اپنی زندگی
کی بقا کی خاطر غیر کو ضائع کرتا ہے جو مستحسن نہیں ہے۔ جبکہ پہلی صورت میں مردہ کا عضو کسی ضرورت مند انسان کے
جسم میں جوڑ دیا جاتا ہے، جس سے اس کو ایک نئی زندگی مل جاتی ہے، اس طرح مردہ کے عضو سے قریب المرگ کا
نئی زندگی حاصل کرلینا گویا خود مردہ کا زندہ ہوجانا ہے اور اس کو باقی رکھنا ہے، لہذا یہ زیادہ بہتر ہے۔

زندہ انسان کے اعضاء سے انتفاع کا حکم

شوافع کا اس سلسلہ میں کہنا ہے کہ اس کی چار شکلیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وہ شخص جس عضو یا گوشت قطع کیا جارہا ہے، مباح الدم ہو، مثلاً حربی اور مرتد۔
ایسی صورت میں مضطر کے لیے ان دونوں کا قتل کرنا اور ان کے گوشت کا استعمال کرنا جائز ہے اور بلا اختلاف تمام فقہاء

کا یہی مسلک ہے۔
۲۔ دوسری شکل یہ ہوسکتی ہے کہ وہ شخص جس کا عضو یا گوشت قطع کیا جارہا ہے، فی نفسہ معصوم ہو، لیکن اس نے کسی ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہو جس کی سزا شریعت نے قتل مقرر کی ہو، لہٰذا اس کا خون حلال ہوگیا ہو، شادی شدہ زانی، محارب (وہ شخص جو امام عادل کے خلاف بغاوت کرے) اور تارکِ نماز، ان کا کیا حکم ہے؟ کیا مضطر کے لیے ان کا قتل کرنا اور ان کا گوشت کھانا جائز ہے؟ نووی نے لکھا ہے کہ اس کی دو صورتیں ہیں، ایک جواز کی اور دوسری حرمت کی لیکن صحیح یہی ہے کہ ان کا قتل کرنا اور گوشت کھانا درست ہے کیونکہ انھیں قتل نہ کرنے اور سلطان کو حوالہ کردینے کا حکم محض اس لیے ہے تاکہ اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے اور اس کی اطلاع و اذن کے بغیر حد نہ جاری کی جائے لیکن درحقیقت یہ کوئی عذر نہیں ہے اور نہ اس سے حرمت ثابت ہوگی، خصوصاً جبکہ اضطرار ثابت ہوچکی ہو، لہٰذا ان کا قتل کرنا اور گوشت کھانا حلال ہے۔
۳۔ تیسری شکل یہ ہے کہ وہ شخص جس کا گوشت یا کوئی عضو قطع کیا جارہا ہے وہ عمداً کسی کا قاتل ہے، جس سے اس کا خون حلال ہوگیا ہے اور عضو قطع کرنے والا مقتول کا ولی ہے۔ اس طرح سے قاطع کا اس شخص کے اوپر حق بھی ہے۔ ایسی صورت میں نووی کا کہنا ہے کہ بطور قصاص اس کا قتل جائز ہے اور اس کے گوشت کا استعمال بھی درست ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ حاکم وقت وہاں پر وقتِ قتل موجود ہو۔
۴۔ چوتھی صورت اس کی یہ بنتی ہے کہ وہ شخص جس کا عضو یا گوشت قطع کیا جارہا ہے علی الاطلاق معصوم ہو اس کے اوپر کسی طرح کا کوئی جرم بھی ثابت نہ ہو، مثلاً ذمی، معاہد اور مستامن، ان کا قتل کرنا بلا اختلاف فقہاء سب کے نزدیک حرام ہے۔
ان مذکورہ بالا چاروں صورتوں کا تعلق محض مضطر کی ذات تک محدود تھا، اب ان کا تجزیہ ایک دوسری حیثیت سے کرتے ہیں کہ اگر ضرورت گوشت کھانے کی طرح علاج کی درپیش ہو اور دونوں کی نوعیتیں ایک ہوں تو کیا ان کا حکم وہی باقی رہتا ہے جو اوپر مذکور ہوا یا کوئی دوسرا؟
پہلی صورت: اس قسم کے تحت جتنے افراد مختلف نوعیت کے آتے ہیں، ان کے سلسلہ میں فقہاء کا کہنا ہے کہ ان میں سے صرف حربی اور مرتد ہی کے اجسام سے کسی عضو کا نکالنا جائز ہوگا، اس کی وجہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی دشمنی ہے، چونکہ حربی ہمیشہ قتل و غارتگری میں مشغول رہتا ہے اور شر و فساد کا ذریعہ ہوتا ہے، جبکہ مرتد اسلام و مسلمانوں

اعت سے نکل جاتا ہے اور دشمنان اسلام کی صفوں میں مل جاتا ہے، لہٰذا ضرورت علاج کے تحت صرف انھیں کا
ِ نکالا جاسکتا ہے، جبکہ اس صورت کے اندر شامل اور دیگر اقسام کے افراد اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔
دوسری صورت: اس سلسلے میں فقہار کا کہنا ہے کہ اس کے اندر شامل افراد یعنی شادی شدہ زانی، محارب،
تارک نماز کے اجسام سے عضو کا نکالنا جائز نہیں ہے، اس کی وجہ انھوں نے یہ بتلائی ہے کہ چونکہ ان کی سزا اور
قتل ہے، جو کہ شریعت کی عائد کردہ ہے لہٰذا ان کا قتل شریعت کا حق ہے، اس کے برعکس ان کے اجسام میں سے
عضو کا نکالنا حق شریعت یا حد کے ساتھ زیادتی ہے، لہٰذا ان کے جسم سے کسی عضو کا نکالنا درست نہیں،
ان کی اجازت سے جواز کی صورت نکل سکتی ہے۔
تیسری شکل: اس سلسلے میں فقہار کی رائے یہ ہے کہ عمداً قتل کرنے والے کے جسم سے مطلق طور پر عضو کا
نا درست نہیں ہے۔ البتہ اگر عضو کے نکالنے سے اس کے جسم کا مثلہ نہیں ہوتا ہے تو نکالنے کی اجازت دی جاسکتی
، اس کی وجہ یہ ہے مثلہ شریعت کے اندر ممنوع ہے اور نیز مشروع صرف اس کا قتل کرنا ہے۔ مزید برآں
ارع نے قتل میں احسان کا حکم بھی دیا ہے، حدیث میں ہے:

إنّ اللّٰه كتب عليكم الاحسان على كل شيئ فاذا قتلتم فاحسنوا القتلة (رواه الامام احمد مسلم)

ترجمہ:۔ بلاشبہ اللہ نے احسان کو ہر چیز پر واجب کیا ہے، لہٰذا جب تمھارا ارادہ کسی چیز کو قتل کرنا ہو تو تم
حسان سے کام لو۔
لہٰذا اگر اس کے عضو کے نکالنے سے مثلہ نہ ہوتا ہو تو اس کے عضو کے نکالنے اور اس سے انتفاع میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مضطر کا انتفاع اپنی ذات سے

کیا مضطر کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ خود اپنے بدن سے نکالے ہوئے کسی عضو کا استعمال اپنی بقا کے لیے کرے؟
س مسئلہ کی بابت امام نووی فرماتے ہیں کہ اس کی دو صورتیں ہیں:
پہلی صورت: جواز کی ہے اور یہ قول ابواسحاق کا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اپنے جسم کا کوئی
عضو استعمال کرتا ہے اور اسے دوبارہ زندگی مل جاتی ہے تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اس کی اجازت
ہے اور اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جب کسی انسان کے جسم کا کوئی عضو سڑ جاتا ہے، جس سے اس کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی

ہے ، ایسی صورت میں اس عضو کو جسم سے نکال دیا جاتا ہے اور ایسا مریض کی زندگی کو بچانے کے لیے کیا جاتا ہے
ہذا ایک مضطر کے لیے بھی یہ جائز ہے کہ وہ اپنے جز بدن کا استعمال کر کے اپنے آپ کو ہلاکت سے بچائے۔

دوسری صورت عدم جواز کی ہے ، اس کے قائل بعض شافعیہ ہیں ، ان کا کہنا ہے کہ مضطر اپنے جسم کا عضو
ٹ کر جس چیز سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اس سے چھٹکارا کی امید تو نہیں ہے ، البتہ مزید اس کے خطرہ میں پڑجانے
اندیشہ ہے اور اس کی یہ تدبیر الٹے اس کے گلے کا پھندا بن سکتی ہے لہذا ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں سے قطع نظر اس نوعیت سے غور کرنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ نکالے جانے والے
عضو کی جسم کے اندر کیا پوزیشن ہے اور اس کی جسم انسانی میں کیا حیثیت ہے۔ اگر اس کے بغیر انسان کا زندہ رہنا
شکل ہے اور اس کے نکالنے سے موت کا وقوع یقینی ہے یا اگر انسان مرتا نہیں ہے لیکن بمثل مردہ ہو جاتا ہے ایسی
ورت میں اس طرح کے عضو کا نکالنا درست نہیں ہے ، کیونکہ یہ مانند خودکشی ہے ، جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔
یث میں ہے : من تردی من جبل فقتل نفسه فهو نار جهنم خالدا مخلدا فيها ابدا
ن تحسی سما فقتل نفسه فسمه فی یده یتحساه فی نار جهنم خالدا فیها ابدا ومن
ل نفسه بحدیدة فهو یتوجأ بها فی بطنه ، فی نار جهنم خالداً فیها ابدا۔
(واہ الامام احمد ، ومسلم ، والترمذی والنسائی والدارمی ،)

ترجمہ : جس نے کسی پہاڑ سے گر کر خودکشی کر لی تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ اپنے نفس کو یونہی
ے کرتا رہے گا ، اور جس نے زہر پی کر اپنی جان خود دیدی تو ایسا شخص جہنم میں ہوگا ، اس حال میں کہ زہر کا پیالہ
اکے ہاتھ میں ہوگا جس سے وہ پی رہا ہوگا اور جس نے کسی آلے کے ذریعہ اپنے کو ہلاک کر لیا تو وہ بھی ہمیشہ کے لیے
م میں ہوگا اور اس آلے کے ذریعہ اپنے پیٹ کو کوٹ رہا ہوگا۔

لیکن اگر نکالے جانے والے عضو کی حیثیت یہ نہیں ہے ، بلکہ انسان اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اور
ہ بتلاتا ہے کہ اس کے نکالنے سے انسان قطعی طور پر موت کا شکار نہیں ہوگا ، یا ماہر طبیب کا کہنا ہے کہ اس سے
نہیں ہوگی ، جیسا کہ اگر انسانی جسم سے ہاتھ ، انگلیاں اور گردے کو نکال دیا جائے تو انسان کی موت نہیں ہوتی ہے
صورت میں اس طرح کے عضو نکالنے میں کوئی حرج نہیں ہے ، لیکن ایسا کرنا صرف دو صورتوں میں صحیح ہوگا۔
(۱) اس کے علاوہ کوئی دوسری شئ اس کی جگہ کام نہ دے سکتی ہو۔

(۲) اس سے ہلاکت کا اندیشہ ہو۔

دوسرے کے علاج کے لیے زندہ انسان کے اعضاء کا استعمال

اس سلسلے میں امام نووی نے صراحت کی ہے کہ

(۱) کسی انسان کے لیے اپنی بقاء زیست کی خاطر کسی دوسرے معصوم انسان کے عضو کو استعمال کرنا بالاتفاق جائز نہیں ہے۔

(۲) کسی دوسرے شخص کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے جسم کا کوئی عضو کاٹ کر مضطر کو دیدے، اس میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اس کی صراحت امام الحرمین اور اصحاب نے کی ہے۔ (المجموع)

جس طرح کہ حنفیہ کا کہنا ہے کہ ایک مضطر کے لیے دوسرے مضطر کا کھانا (طعام) یا اس کے بدن کا کوئی حصہ کھانا جائز نہیں ہے۔ اس کی علت انھوں نے یہ بتلائی ہے کہ ایک ضرر کا ازالہ دوسرے ضرر سے جائز نہیں ہے۔

(الاشباہ والنظائر لابن نجیم)

زندہ انسان کا اپنے کسی عضو کو دوسرے کے علاج کے لیے دینا

یہ ایثار واحسان کی ایک صورت ہے جس کی ترغیب قرآن میں دی گئی ہے، ارشاد باری ہے: وَمَنْ احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً۔ (سورہ المائدہ /۳۲)

ترجمہ:۔ اور جو کسی نفس کے لیے زندگی کا باعث بنا تو گویا اس نے پوری کائنات انسانیت کو زندگی عطا کردی۔

اس کے برعکس حنفیہ کے ظاہری نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ اگر عضو کو نکال کر خود اسی شخص کا علاج مقصود ہو تو جائز ہے لیکن اگر مقصد اس کے سوا کچھ اور مثلاً مضطر کا کھانا ہے تو درست نہیں ہوگا۔ (رد المحتار علی الدر المختار)

اور ابن عابدین کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص دوسرے سے کہے کہ میرا ہاتھ کاٹو اور کھاؤ تو دوسرے شخص کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ انسان بہرحال مکرم ومعظم ہے اور اس کا گوشت بہرصورت مباح نہیں ہے خواہ اضطرار ہی کی صورت کیوں نہ ہو۔ (رد المحتار علی الدر المختار)

یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں بوقت اضطرار انسان کے گوشت کا استعمال مطلق طور پر حرام ہے۔ ایک انسان نہ خود اپنا گوشت استعمال کرسکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے اور اس کی وجہ انسان کی کرامت وعظمت ہے۔

اور اسی طرح ان کے یہاں علاج کے سوا کسی اور مقصد کی خاطر انسانی اعضاء میں سے کسی عضو کا نکالنا درست نہیں ہے اور اس کی وجہ بھی کرامت ہے۔

لیکن اگر کسی فرد کے علاج کے لیے خود اس کے عضو کا نکالا جانا ضروری ہے تو حنفیہ نے بوقت ضرورت اس کی اجازت دی ہے جیسا کہ اس سے قبل ان کی دلیل میں یہ بات گزر چکی ہے، کیونکہ ایسا نہ کرنے میں اس کی ہلاکت و موت کا اندیشہ ہے، اس کا واضح مطلب ہے کہ کسی بیمار انسان کے لیے کسی دوسرے صحتمند انسان کے عضو کو نکالنا صحیح نہیں، کیونکہ جس ضرورت کے تحت اور وہ بیمار کے ہلاک ہونے کا خوف تھا عضو کو نکالا گیا تھا وہ یہاں اس صورت میں نہیں پائی جاتی ہے بلکہ مزید معطی کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتا ہے۔ لہٰذا دوسرے کی خاطر عضو کا نکالنا جائز نہیں ہے۔ لیکن اس کا جواب اس طرح سے دیا جاسکتا ہے کہ آپ نے علاج کے واسطے ہی عضو نکالنے کی اجازت دی ہے اور یہی اصل نقطہ بھی ہے کہ علاج کی خاطر عضو کا نکالا جانا درست ہے۔ اب اگر آپ کسی انسان سے اس کے علاج کی خاطر عضو نکالے جانے کو حق بجانب و درست قرار دیتے ہیں اور اس کی ہلاکت کا آپ کو اندیشہ ہے تو پھر ایک انسان کے علاج کے لیے کسی غیر کے عضو کو نکالنے کی اجازت آپ کیوں نہیں دیتے جبکہ اس کے بھی ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے اور دونوں کی ہلاکت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مزید برآں حنفیہ اور غیر حنفیہ کا یہ بھی قول ہے کہ اگر کوئی شخص ڈوب رہا ہے اور ہلاکت کے بالکل قریب ہے اور جائے وقوع پر کوئی ایسا شخص موجود ہے جو اس کے بچانے پر قادر ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زندگی کی حفاظت کرے لیکن اگر قادر شخص اپنی ذمہ داری سے غفلت برتتا ہے اور ڈوبنے والا شخص ہلاک ہو جاتا ہے تو اس کا گناہ اس کو ملے گا بلکہ بعض حنابلہ کا یہاں تک کہنا ہے کہ اس پر دیت کی ادائیگی لازم ہے۔

پھر آخر کون سی چیز ہے جو معطی سے دوسرے کے علاج کی خاطر عضو کے نکالنے کو جائز قرار دینے میں حارج و مانع ہے، جبکہ اسے معطی کی مرضی سے نکالا جارہا ہو مثلاً وہ اپنی زندگی ہی میں ہبہ کر دے یا بعد وفات اس کے نکالنے کی وصیت کر دی ہو اور وہ معاوضہ کا طالب بھی نہیں ہے اور وہ تمام شروط بھی پائی جاتی ہیں جن کا ذکر آگے آرہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حنفیہ نے انسان کا گوشت کھانا اس کی کرامت کی وجہ سے اضطرار کی صورت میں بھی حلال نہیں قرار دیا ہے تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ حنفیہ نے عدم جواز کا فتویٰ اضطرار کی حالت میں بھی اس بنیاد پر دیا ہے کیونکہ گوشت کھانے سے تقطیع اور اتلاف لازم آتا ہے جو کہ انسان کی اہانت ہے، لیکن جہاں تک دوسرے کے لیے عضو

ے نکالنے کا مسئلہ ہے تو اس کے اندر انسانی اعضاء کا اتلاف ہے اور نہ ہی اس کی توہین ہے پھر کس بنیاد پر اس کو ناجائز کہا جاسکتا ہے بلکہ نکالے ہوئے عضو کے بقاء کا ذریعہ ہے۔ جب تک اس کے ذریعہ علاج کردہ شخص زندہ رہتا ہے، اور یہ کام اہانت کا نہیں ہے، بلکہ یہ دوسرے کی مدد اس کا تعاون ہے اور اس کے ذریعہ دوسرے شخص کو نئی زندگی حاصل ہوتی ہے اور شریعت میں کہیں بھی اس سے منع نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کی رغبت دلائی گئی ہے۔ اور اس کو مستحسن فعل قرار دیا گیا ہے۔

اس کے باوجود ضروری ہے کہ عضو نکالتے وقت مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں۔

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ معطی نے مطلق طور پر اپنے عضو کو نکالنے کی اجازت دیدی ہو۔ بغیر اجازت عضو کا نکالنا حرام ہے اور عضو نکالنے کی صورت میں اس کی وفات ہوجاتی ہے یا اس کا کوئی عضو بیکار ہوجاتا ہے، ایسی صورت میں عضو نکالنے والے پر ضروری ہوگا کہ وہ دیت ادا کرے اور اگر بالقصد اس نے ایسا کیا ہے تو قصاص واجب ہوگا۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ معطی عاقل، بالغ ہو، فیصلہ کرنے میں خود مختار ہو اور اس کا اپنا فیصلہ ہو، کوئی باہری دباؤ اس کے اوپر نہ ہو اور اس سلسلے میں اسے تصرف کا حق بھی حاصل ہے کیونکہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے جو اس کی اپنی ذات تک محدود ہے اور اسے اپنی ذات کے اندر شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے مکمل تصرف کا اختیار ہے۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ معطی کی نیت خالص ہو اور اس کا مقصد محض راہ خدا میں اپنے عضو کو صدقہ کردینا ہو، اس کا بدل اسے مطلوب نہ ہو، کیونکہ تمام فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ انسان اور اس کے جسم کی بیع و شراء جائز نہیں ہے، کیونکہ انسان ایک محترم و مکرم ہستی ہے جبکہ خرید و فروخت اشیاء کے توہین کی علامت ہیں، جیسا کہ کاسانی کا کہنا ہے کہ "سراپا انسان بشمول اپنے تمام اجزاء و اعضاء مکرم و محترم ہے اور بیع و شراء اس کی کرامت کے منافی ہے اور اس کی تذلیل و تحقیر ہے" (بدائع الصنائع)

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ عضو ایسا ہو جس کے نکالنے سے معطی ہلاک نہ ہو یا اس کی وجہ سے فالج زدہ اور معطل نہ ہو، اس کی دنیوی و دینی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں مانع نہ ہو۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ عضو کے نکالنے کی اجازت خود معطی نے اپنی زندگی میں یا اس کے ورثاء نے اس کی وفات کے بعد دی ہو۔

(۶) چھٹی شرط یہ ہے کہ عضو نکالنے سے نعش کی ہیئت مثلہ جیسی نہ ہو جاتی ہو، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے مثلہ کرنے سے روکا ہے اور آپ کا فرمان ہے: (انکم ستجدون مثلة لم آمر بها (رواه احمد والبخاری) بے شک تم لوگ

مثلہ کی ہوئی لاشوں کو دیکھو گے جس سے میں نے منع کیا ہے۔

(۷) ساتویں شرط یہ ہے کہ عضو کا نکالنا اسی وقت عمل میں لایا جائے جب پوری طرح متحقق ہو جائے کہ معطی کی وفات ہو چکی ہے، خصوصاً اس صورت میں جبکہ عضو کا نکالنا ہی اس کی دائمی و حتمی موت کا سبب ہو مثلاً دل اور پھیپھڑے کا نکال لینا اور اس کا حکم اس لیے لگایا گیا ہے تاکہ ایک انسان جس کے اندر ابھی زندگی کی رمق باقی ہے، اس کو جلدی قتل ہونے سے بچایا جا سکے۔

اور اگر کسی کی حالت بہت نازک ہے اور اس کے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے، ڈاکٹروں کا بھی یہی کہنا ہے لیکن فی الواقع ابھی اس کی موت نہیں ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے کسی بھی عضو کا نکالنا جائز نہیں ہے۔ ایسی حالت میں معطی اگر اپنا عضو نکالنے کی اجازت دے دیتا ہے اور اس کی وفات ہو جاتی ہے تو یہ خودکشی ہے اور اگر اس کی اجازت کے بغیر عضو کو نکالا گیا ہے تو یہ ایک نفس کو ناحق قتل کرنے کے مترادف ہے اور دونوں ہی صورتیں ناجائز و حرام ہیں جبکہ آخری صورت میں فقہاء کے نزدیک تاوان ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

(۸) آٹھویں شرط یہ ہے کہ غیر کو بچانے کے لیے معطی کا عضو اسی صورت میں نکالا جائے جبکہ اس کی جگہ کوئی بھی حیوانی یا مصنوعی عضو کام نہ دے سکتا ہو اور اس کے بغیر ضرورت کی تکمیل ممکن نہ ہو اور اس کی اجازت محض ضرورت کے ثابت ہونے پر دی گئی ہے، کیونکہ اصلاً یہ شئی حرام ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔

انسانی اعضاء کی خرید و فروخت

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ آزاد انسان محل بیع نہیں ہوتا، اس لیے اس کی بیع ناجائز ہے لہٰذا اگر انسان یا اس کے کسی بھی عضو کی بیع کی جاتی ہے تو تمام فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ایسی بیع منعقد نہیں ہوگی۔

لیکن اگر کوئی مریض انسانی عضو کا سخت حاجتمند ہے اور مطلوبہ عضو اسے بغیر عوض کے نہیں مل پا رہا ہے اور اس کا مصنوعی بدل بھی موجود نہیں ہے۔ اس حالت میں مریض کے لیے عضو کا خریدنا سابقہ شرائط کے ساتھ جن کا تذکرہ ابھی معطی سے عضو کے نکالنے کے تحت کیا گیا ہے اور اس کی ضرورت محض ضرورت کی رعایت کرتے ہوئے دی گئی ہے اور مشتری کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے بلکہ تمام تر ذمہ داری بائع کی ہے اور وہی گنہگار ہوگا۔

اسی اور انھیں جیسی حالتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَقَدْ فَصَّلَ لَكُم مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُم

لا ما اضطررتم الیه » (الانعام/۱۱۹)

ترجمہ: حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالتِ اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کردیا ہے انھیں وہ تمھیں بتا چکا ہے۔

اور فروعات سے خریدنے کے جواز کا پتہ چلتا ہے گرچہ بیچنے کی حرمت ہے۔ بلکہ حنبلیہ کا یہاں تک کہنا ہے کہ مصحف کی بیع حرام ہے، اگرچہ اس کا مقصد دین کی کسی ضرورت کی تکمیل ہی کیوں نہ ہو۔

امام احمد کا قول ہے: لا نعلم فی بیع المصحف رخصة» کہ مصحف کی بیع کے سلسلے میں مجھے کسی رخصت کا علم نہیں ہے۔ اور عبداللہ بن عمر کا کہنا ہے « وددت ان الایدی تقطع فی بیعه» کہ میرے ہاتھ قطع کردیجیے، مجھے یہ پسند ہے اگر میں قرآن کی بیع کرتا ہوں۔»

حنبلیہ نے ابن عمر کے مذکورہ قول کی توجیہہ یہ کی ہے کہ قرآن کی تعظیم اور اس کی تکریم تمام مسلمانوں پر واجب ہے اور قرآن بیع و شراء سے کہیں بالا و بلند تر ہے۔ اب اگر ایک مسلمان اس کی بیع کرتا ہے تو اس کا واضح مطلب ہے کہ اس کی تعظیم کا قائل وہ نہیں ہے اور بیع کے ذریعہ قرآن کے رتبہ و مرتبہ کو گھٹا رہا ہے، اس کی توہین و تقصیر کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن عمر نے قرآن کی بیع پر ہاتھ کاٹنے کو ترجیح دی ہے۔

اما شراء المصحف فقد نصوا علیٰ انه لا یکره لان الشراء بمثابة استنقاذ له کشراء الاسیر من المحاربین۔

ترجمہ: البتہ مصحف کے خریدنے کے متعلق علماء کے اقوال ہیں کہ مکروہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ خریدنا اسے نافذ کرنے کے منزلہ میں ہے، جیسے کہ محاربوں سے قیدیوں کا خریدنا۔

•••

ماہنامہ

بنارس

شمارہ ۴ | اپریل ۱۹۹۱ء | رمضان ۱۴۱۱ھ | جلد ۱۱

اِس شمارہ میں

مدیر

عبدالوہاب حجازی

پتہ

دارالتالیف والترجمہ

بی ۱۸/۱ جی ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰

بدلِ اشتراک

سالانہ ۴۵ روپئے، فی پرچہ ۴ روپئے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوچکی ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ

ام المعارک ام الہزائم، یا حسین فتح

۲ر اگست ۱۹۹۰ء کو عراق کے بعثی صدر صدام بن حسین نے بلا کسی وجہ جواز کے اپنے برادر اسلامی ملک کویت پر ظالمانہ قبضہ کرلیا جس نے آٹھ سالہ ایران عراق جنگ میں اربوں ڈالر کا اسے تعاون دیا تھا، صدام نے کویت کے مرکزی بینک سمیت اس کی ساری جائدادیں لوٹ کر عراق منتقل کردیں، اور کویتیوں کی جان اور عزت و آبرو کو بھی پامال کیا، برطانیہ نے اسے انسانی تاریخ کا سب سے بڑا ڈاکہ قرار دیا، عالم اسلام کے قائدین اور اس کی تنظیمات نے صدام سے مسلسل درخواستیں کیں کہ وہ کویت کو خالی کردے، لیکن اس نے نہ صرف تمام درخواستیں رد کردیں، بلکہ اپنے دوسرے سب سے بڑے محسن ملک سعودیہ عربیہ اور حرمین شریفین پر بھی قبضہ کرنے کا مکمل ارادہ ظاہر کیا، اقوام متحدہ سمیت تمام بین الاقوامی تنظیموں اور دنیا کے تمام ممالک نے بھی اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی، لیکن اس نے ایک نہ سنی، ساڑھے پانچ مہینے تک اس پر اقوام متحدہ کی طرف سے مختلف پابندیوں کا سلسلہ بھی چلا، لیکن صدام پر کسی بات کا اثر نہ ہوا، اور اس نے چھ سال تک لڑی جانے والی ام المعارک کا اعلان کردیا۔

۱۷ر جنوری ۱۹۹۱ء کو اسلامی ممالک سمیت اٹھائیس ملکوں کی اتحادی افواج نے آخری چارۂ کار کے بطور عراق پر حملہ کردیا، اور ایک ماہ نو دن کے عرصہ میں کم وبیش ایک لاکھ فضائی حملے کرکے عراق کی بیشتر فوجی تنصیبات اور مواصلاتی نظام کو درہم برہم کردیا، اور نوبت بایں جا رسید کہ کویت میں برسرپیکار پانچ لاکھ عراقی فوج مکمل طور پر عراق سے کٹ کر رہ گئی، اس پورے عرصہ میں صدام نے صرف ناکام دفاع کیا، ایک طرف حرب النجوم کے سپاہی تھے جو کمپیوٹر کی مدد سے فضا کی انتہائی بلندی سے نہایت درست نشانوں کے ساتھ ان پر حملہ کر رہے تھے، دوسری طرف ام المعارک کا یہ ہیرو بربادیوں کے ملبے اپنے دامن میں

سمیٹ رہا تھا، سعودیہ عربیہ کے ریاض اور ظہران وغیرہ شہروں پر اس نے متعدد اسکڈ میزائل بھی داغے لیکن امریکہ کے پٹریات میزائلوں نے انھیں فضا ہی میں غبار کی طرح بکھیر دیا، سعودیہ کے ساحلی شہر الخفجی پر اس نے اقدامی حملہ کیا لیکن بری طرح پسپا کر دیا گیا، اور تین ہزار سے زائد عراقی فوجی گرفتار ہو گئے۔

۲۴ر فروری کو آخر بری جنگ شروع کر دی گئی، اور سو گھنٹے میں ام المعارک کے ہیرو نے کویت خالی کر دیا، تقریباً دو لاکھ فوجی گرفتار ہوئے، گرفتاری دیتے ہوئے بہت سے فوجیوں نے خوشی سے سعودی فوجیوں کی پیشانیاں چوم لیں، ایک لاکھ سے بھی زائد عراقی فوجی قتل ہوئے، بچے کھچے فوجی عراق سے عدم رابطہ کے سبب آوارہ گردوں کی طرح بے نشان ومنزل پھر رہے تھے اس اثناء میں فرانسیسی فوج جنوبی عراق میں ڈیڑھ سو کلو میٹر اندر جا کر قابض ہو گئی، کویت اب آزاد ہو کر اس کے حق داروں کو مل چکا ہے، اور صدام کی ام المعارک اب سول وار میں تبدیل ہو چکی ہے، یعنی عراقی شہری صدام سے بغاوت کر کے اس کی بعثی حکومت سے برسر پیکار ہیں، اور اس کا تختہ پلٹنے کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں، ایک اطلاع کے مطابق تادم تحریر اس خانہ جنگی میں پینتیس ہزار آدمی مر چکے ہیں، ام المعارک کے ہیرو نے اس ام الہزیمت کے ساتھ اقوام متحدہ کی تمام شرائط بے چون وچرا تسلیم کر لیں ہیں اور ساتھ ہی کویت کے تمام نقصانات کا معاوضہ کھربوں ڈالر کی شکل میں ادا کرنا بھی منظور کر لیا ہے، البتہ صدام نے کویت کی بچی کھچی دولت تیل کے سات سو سے زائد چشموں میں آگ لگا کر جب کویت کو خالی کیا تو اس موقع پر کہا تھا کہ ہم حسین فتح سے ہمکنار ہو چکے ہیں۔

کویت آزاد ہو گیا، یہ اس کا حق تھا، صدام کے ظلم وبربریت کے مقابلہ میں اسلامی ممالک سمیت دنیا کی جن قوتوں نے پامردی دکھائی ہے، انہوں نے عدل وانصاف کی عالمی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل کیا ہے، لیکن اس بے مثال ذلت آمیز شکست کے باوجود صدام نے اسے حسین فتح سے کیوں تعبیر کیا ہے، یہ ملت اسلامیہ کے لئے نہایت قابل غور بات ہے، صدام کمیونزم اور اشتراکیت کے ملحدانہ نظریات کا حامل ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر ہے، اسے اللہ، محمدؐ، اسلام اور شریعت سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن بدقسمتی سے اسے جس خطہ ارضی کی حکمرانی ملی ہے، وہ مذہب اسلام کا گہوارہ ہے، عرصے تک اس کے ظلم وجور کی چکی میں پسنے کے باوجود اس کے باشندے اپنے دین سے دست بردار نہیں ہوئے، اس طرح کے مواقع پر کمیونسٹ اور اشتراکی ہلاکت خیز جنگوں کے ذریعہ دین وملت کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کی آخری تدبیر کرتے ہیں، یہ ام المعارک ذلت آمیز شکست کے باوجود حسین فتح اسی معنی میں ہے۔

صدام نے اشتراکیت کی یہ آخری تدبیر ام المعارک کی شکل میں اسلام کے اصل گہوارے میں اختیار کی ہے، اس کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اس سے تمام اسلام دشمن طاقتیں اس خطے میں در آئیں گی، اور اپنا اثر ونفوذ بڑھا کر اسلام کا خاتمہ کر دیں گی

جنگ کے دوران صدام نے اسرائیل پر اسکڈ میزائیل پھینک کر مغربی طاقتوں کے ذریعہ اسے اتنا مضبوط کر دینے کا بہانہ فراہم کر دیا ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کو اپنے خونخوار چنگل میں گرفتار کر لے جائے، داخلی طور پر یہ جنگ چھیڑ کر صدام نے عالم اسلام کو دو حریف ٹکڑوں میں بانٹ دیا، جس سے لازماً اسلام کی طاقت کمزور پڑے گی، اور تخریبی طاقتوں کو انھیں دبوچ لینے کا موقع ملے گا، فلسطین کی آزادی کا پُر فریب نعرہ دے کر اس نے دنیا بھر کے تمام مسلم عوام کو مسلم زعماء کے خلاف بدگمان کیا، اور مملکت سعودیہ عربیہ جیسی موحد حکومت کے خلاف پرانے کینے کی آگ کو بھڑکایا جس کے سبب پورے عالم اسلام کا مسلم معاشرہ پھر سے نئے انتشار کا شکار ہو گیا، سادہ لوح مسلم عوام کی نظر میں صلاح الدین ایوبی کا روپ دھار کر اور اپنے جھنڈوں پر اللہ اکبر کا نعرہ لکھ کر بقول خویش حق کی جنگ لڑنے والا یہ عراقی ڈکٹیٹر اسلام کی ایک تعلیم پر بھی عمل کر کے نہ دکھا سکا۔

اپنے برادر اور محسن اسلامی ملک پر ڈاکہ ڈال کر اس کے مسلم باشندوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو حلال کر لینا کمیونسٹ روس کے چھ نکاتی امن منصوبہ کا اشارہ پا کر فلسطین کی آزادی کے مطالبے سے دست کش ہو جانا مسلم زعماء کے ساتھ کئے گئے عہود و مواثیق سے پھر جانا، اور بین الاقوامی اصول و ضوابط کی پوری ڈھٹائی سے خلاف ورزی کرنا، ایک اسلامی ملک کے اشتراکی حکمراں کے ذریعہ ساری دنیا میں اسلام کو بے اعتبار ٹھہرانا، اور کمیونزم، اشتراکیت یا مغربیت کو حسین فتح سے ہمکنار کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے دین کا اور اپنے دین پر جوش جہاد کے ساتھ عمل کرنے والے مؤمنین کا حامی و ناصر ہو،

آمین!

فتنوں سے نجات کا راستہ

اور خلیجی بحران اور عراقی فتنہ سے عبرت و موعظت کے پہلو

تحریر ـ علامہ کبیر شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز حفظہ اللہ
ترجمہ ـ ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبدالجبار الفریوائی

فضیلۃ الشیخ علامہ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ صدر عمومی ادارات بحوث علمیہ وافتاء ودعوت وارشاد ریاض نے محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی کے طلبہ واساتذہ اور ذمہ داروں سے موجودہ خلیجی بحران کے تناظر میں فتنہ وفساد اور اس سے راہ نجات کے موضوع پر ایک بصیرت افروز خطاب فرمایا جس میں صدام حسین اور اس کے برپا کئے ہوئے فتنے پر روشنی ڈالی، اور بوقت ضرورت غیر مسلموں سے امداد کے جواز کے مسئلہ پر بھی اظہار خیال فرمایا، اس خطاب کو سعودی خبر رساں ایجنسی (واس) نے نشر کیا، روزنامہ الجزیرہ کے شکریہ کے ساتھ ہم اس کو اردو میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے۔

الحمد للہ رب العالمین والعاقبہ للمتقین، وصلی اللہ علی محمد عبدہ ورسولہ وعلی ازواجہ وذریتہ کما صلی علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم، ونسألہ عزوجل ان یبارک علی محمد وعلی ازواجہ وذریتہ کما بارک علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم، انہ سبحانہ حمید مجید، اللھم صل وسلم علی عبدک ورسولک محمد۔

ہر طرح کی حمد وثنا اور تعریف وتوصیف کا مستحق وسزاوار صرف اللہ رب العالمین ہے، نیک انجام اور حسن خاتمہ کے مستحق صرف صحاب تقویٰ ہیں، اللہ کے بندے اور اس کے رسول محمد بن عبداللہ آپ کی ازواج مطہرات اور آل واولاد پر اس طرح سے اللہ کا درود ہو جس طرح سے اس نے ابراہیم علیہ السلام اور اولاد ابراہیم پر درود بھیجا،

ہم اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ وہ نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہرات اور آل واولاد کو اس طرح

کی برکت سے نوازے جیسا کہ اس نے ابراہیم علیہ السلام اور اولاد ابراہیم کو خیر و برکت سے نوازا ۔

ہر طرح کی حمد و ثنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے لئے ہے ، وہ بزرگ و برتر ذات ہے ۔

اے اللہ! اپنے بندے اور رسول محمد پر درود و سلام بھیج .. امابعد !

میں اللہ رب العزت کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے ہمیں برادران اسلام اور عزیزان ملت سے ملاقات کی نعمت سے بہرہ ور کیا ، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ اس ملاقات کو خیر و برکت اور سعادت کا باعث بنائے ، ہمیں جو کچھ سکھایا ہے اس کو ہمارے لئے مفید اور نفع بخش بنائے ، ہمارے دل و دماغ کی اصلاح فرمادے ، ہمارے اعمال و کردار کو درست کردے ، ہمیں اپنی برائیوں اور بداعمالیوں اور سیاہ کاریوں سے اپنی پناہ میں لے لے ، اپنے دین کی مدد فرمائے ، اسلام کا کلمہ بلند کرے ، اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے حالات کو درست فرمائے ، اور صلحاء و اتقیا کو ان پر حکمراں بنائے ، بروں اور خراب لوگوں سے ان کو اپنی پناہ میں لے لے ، اللہ رب العزت بڑا ہی سخی ، داتا اور بڑا ہی کریم ہے ۔

پھر میں جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں ، جنہوں نے اس ملاقات کی دعوت دی ، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ارباب جامعہ کے اجر و ثواب کو دوگنا کردے ، اور ہم سب کو ان تمام امور کی توفیق عطا فرمائے جس میں ہمارے دین اور ہماری دنیا ، نیز ساری امت اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور خیر ہو ، اللہ عزوجل بڑا ہی سخی اور بڑا ہی کریم ہے ۔

فتنوں کے بارے میں مسلمان کا موقف

برادران ملت عزیزان گرامی ! فتنوں کے شر و فساد سے ہم اللہ رب العزت کی پناہ چاہتے ہیں ، ان فتنوں کے بارے میں مؤمن کو کیا رویہ اور کونسا موقف اپنانا چاہئے ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مضرات و خطرات اور مفاسد کو واضح فرمایا ہے ، اور ہمیں اس کے بارے میں کیا موقف اختیار کرنا چاہئے اس کو بھی بتا دیا ہے ۔

فتنہ ایک عام لفظ اور مشترک کلمہ ہے ، جس کا اطلاق بہت سے معانی پر ہوتا ہے ۔

شرک سب سے بڑا فتنہ ہے

شرک کو فتنہ کہا گیا ہے ، اور یہ سب سے بڑا فتنہ ہے ۔
ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ،	اور تم ان سے اس حد تک لڑو کہ ان میں فساد عقیدہ
ویکون الدین کلہ للہ ۔	(یعنی شرک) نہ رہے ، اور دین (خالص) اللہ ہی کا
(الأنفال / ۳۹)	ہو جائے ، یعنی شرک نہ واقع ہو ۔

نیز ارشاد باری ہے:

يسئلونك عن الشهر الحرام قتال فيه، قل قتال فيه كبير وصد عن سبيل الله، وكفر به والمسجد الحرام وإخراج أهله منه أكبر عند الله، والفتنة أكبر من القتل.

(البقرة/۲۱۷)

لوگ آپ سے شہر حرام میں قتال کرنے سے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ فرمادیجئے کہ اس میں خاص طور پر قتال کرنا جرم عظیم ہے، اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روک ٹوک کرنا اور اللہ کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام کے ساتھ اور جو لوگ مسجد حرام کے اہل تھے ان کو اس سے خارج کر دینا جرم عظیم ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک اور فتنہ پردازی کرنا قتل سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔

فتنہ بمعنی تعذیب اور آگ سے جلانا

فتنہ کا اطلاق تعذیب اور آگ سے جلانے پر بھی ہوتا ہے۔

ارشاد باری ہے:

ذوقوا فتنتكم هذا الذى كنتم به تستعجلون. (الذاريات/۱۴)

اپنی اس سزا کا مزا چکھو یہی ہے جس کی تم جلدی مچایا کرتے تھے۔

إن الذين فتنوا المؤمنين والمؤمنات ثم لم يتوبوا فلهم عذاب جهنم ولهم عذاب الحريق. (البروج/۱۰)

تحقیق جن لوگوں نے کہ ایمان والوں کو اور ایمان والیوں کو تکلیف پہونچائی اور پھر توبہ نہیں کی تو ان کے لئے جہنم کا عذاب ہے اور ان کے لئے جلنے کا عذاب ہے۔

فتنہ سے آیت میں مراد عذاب اور آگ سے جلانا یعنی ان کو عذاب دینا ہے۔

فتنہ بامتحان، آزمائش اور ابتلاء کے معنی میں

فتنہ کا اطلاق، امتحان، ابتلاء اور آزمائش پر بھی ہوتا ہے۔

ونبلوكم بالشر والخير فتنة.

(الأنبياء/۳۵)

اور ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں۔

یہاں فتنہ سے مراد امتحان، ابتلاء اور آزمائش ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إنما أموالكم وأولادكم فتنة ۔ ۔ ۔ تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے ۔ (التغابن /۱۵)

یعنی تمہارے مال، تمہاری اولاد تمہارے لئے ابتلاء اور آزمائش ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مال و دولت اور آل و اولاد سے اللہ کی اطاعت و بندگی میں کون مدد حاصل کر رہا ہے، حقوق اللہ کا کون قائل ہے، محرمات سے کون پرہیز کر رہا ہے، اللہ کی حدود سے کون تجاوز نہیں کرتا، اور کون ان حدوں کو پھلانگ جاتا ہے اور کون اپنے نفس کی پیروی کر رہا ہے ۔

فتنہ مصائب و عقوبات اور سزاؤں کے مفہوم میں

ہر طرح کے مصائب و ابتلاءات اور عقوبات اور سزاؤں پر فتنہ کا اطلاق ہوتا ہے ۔ ارشاد باری ہے :

واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة ۔ (انفال /۲۵)

اور تم ایسے وبال سے بچو کہ جو خاص انہیں لوگوں پر واقع نہ ہو گا جو تم میں ان گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں ۔ (یعنی فتنہ و فساد عام ہو جائیگا)

ایک باطل شبہہ اور اس کی تردید

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور سلف کی جماعت سے فتنہ کے بارے میں یہ منقول ہے کہ ہمیں اس بات کا گمان نہیں تھا کہ ہمارے مابین فتنہ کا وقوع ہوگا حتیٰ کہ وہ واقع ہو گیا ۔

یہ فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل و شہادت کی وجہ سے پیدا ہوا، جاہلوں اور ظالموں کی ایک جماعت جن میں سے بعض لوگوں نے تاویلات کا بھی سہارا لیا، ان لوگوں پر حق پوشیدہ رہا، معاملات ان پر مشتبہ ہو گئے، باطل شبہات اور فاسد تاویلات کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ قتل کر دیئے گئے، پھر یہ فتنہ عام ہو گیا، اور بڑھتا گیا، اور ان لوگوں تک آپہونچا جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، نہ ہی وہ ظالموں کے زمرے میں تھے، اس فتنے کے باعث حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین ناخوشگوار واقعات رونما ہوئے، جنگ جمل اور صفین میں جو کچھ پیش آیا وہ سب اسی کا شاخسانہ تھا، ظالموں کی ایک جماعت نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بدسلوکی کی، ایک گروہ نے جس کے سرکردہ حضرت معاویہؓ تھے، قاتلین عثمان سے قصاص کا مطالبہ کیا، مسلمان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر جو تھے خلیفہ راشد کی حیثیت سے بیعت خلافت کر چکے تھے، خلیفہ سے ان لوگوں نے قاتلان عثمان کو سونپ دینے کا مطالبہ کیا، حضرت علیؓ نے انہیں سمجھایا کہ موجودہ صورت حال میں قاتلوں کو ان کو سونپنا یا قصاص لینا ممکن نہیں ہے، اور ان سے خیر کا وعدہ کر لیا اور کہا کہ اس مسئلہ پر بعد میں غور و خوض کیا جائے گا لیکن فی الحال ان سے قصاص لینے پر وہ قادر نہیں ہیں ۔

صفین اور جمل کے فتنوں اور جنگوں میں پیش آنے والے واقعات وحوادث مشہور ہیں، سلف صالحین رضی اللہ عنہم کے ایک گروہ جس میں حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ نے یہاں تک کہہ دیا کہ یہ آیت اسی بارے میں نازل ہوئی ہے اس لئے یہ اس معنی کو شامل ہے، اور آیت شریفہ میں مذکورہ پہلا فتنہ ہے جس سے یہ امت دوچار ہوئی۔

واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة واعلموا أن الله شديد العقاب ۔ (انفال رکوع ۳)	اور ڈرو تم ایسے وبال سے جو خاص انھیں لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں ان گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے

صحابہ وتابعین کے ایک جم غفیر کو اس فتنے سے دوچار ہونا پڑا، اس میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ اور عشرہ مبشرہ میں سے طلحہ بن عبید اللہ اور زبیر بن عوام قتل کر دیئے گئے، اور اسی فتنہ کے باعث جنگ جمل وصفین میں صحابہ وتابعین کی ایک بڑی جماعت قتل ہوئی۔

فتنوں سے نجات کا راستہ

شکوک وشبہات اور خواہشات وشہوات کے ذریعہ بھی فتنے واقع ہوتے ہیں، بے بنیاد شبہات سے لوگ فتنوں میں مبتلا ہوئے، بدعی فرقوں میں جہمیہ، معتزلہ اور مرجیہ وغیرہم شکوک وشبہات ہی کے باعث راہ ہدایت اور اہل سنت وجماعت کے منہاج وطریقہ سے ہٹ گئے، اور اپنے لئے اور غیروں کے لئے فتنہ بن گئے، إلا من رحم اللہ۔

فتنوں سے سلامتی اور نجات کا راستہ صرف کتاب وسنت سے تمسک ہے۔ حضرت علیؓ سے مرفوعاً مروی ہے۔

تكون فتن، قيل: ما المخرج منها يارسول الله، قال: كتاب الله، فيه نبأ ما قبلكم وخبر ما بعدكم وفصل ما بينكم ۔	فتنے واقع ہوں گے، کہا گیا کہ یا رسول اللہ اس سے بچنے کا کیا راستہ ہے؟ فرمایا: اللہ کی کتاب، جس میں تم سے پہلے کے لوگوں کی خبریں ہیں، اور تم سے بعد میں آنے والے لوگوں کے حالات ہیں، اور تمہارے مابین ہونے والے مسائل ومشکلات کا فیصلہ اور حل ہے۔

مقصد یہ ہے کہ فتنے مختلف اور متنوع ہیں، شہوات وخواہشات کا فتنہ، شکوک وشبہات کا فتنہ، قتل وغارت گری کا فتنہ، بدعات وخرافات کا فتنہ، ان تمام فتنوں سے چھٹکارے اور نجات کا صرف ایک راستہ ہے، اور وہ ہے کتاب وسنت میں تفقہ بصیرت اور صحابہ کرام اور ان کی روش پر چلنے والے ائمہ اسلام وداعیان حق وہدایت سلف صالحین کے منہج اور طریقہ کی معرفت۔

انسان کی ساری باتیں، اس کے سارے شکوک وشبہات، امن وجنگ کے سارے مسائل ومعاملات، غرضیکہ دنیا کے دوسرے

امور و معاملات کو کتاب و سنت پر پیش کرنا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یاأیہا الذین آمنوا أطیعوا اللہ	اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت اور رسول کی
وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم	اطاعت کرو، اور تم میں جو لوگ اولوالأمر ہیں ان کا
فإن تنازعتم فی شیئ فردوہ إلی اللہ	بھی کہنا مانو پھر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو
والرسول إن کنتم تومنون باللہ و	اس امر کو اللہ اور اس کے حوالے کر دیا کرو اگر تم اللہ
الیوم الآخر ذلک خیر و أحسن	پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہ امور سب
تأویلا۔ (سورۃ النساء / ۵۹)	بہتر ہیں اور ان کا انجام خوشتر ہے۔

یعنی انجام کے اعتبار سے یہی راستہ سب سے اچھا اور بہتر ہے۔

پس کتاب اللہ کی طرف لوٹانا قرآن کریم کی طرف لوٹانا ہے، اور رسول کی طرف آپ کی حیات مبارکہ میں آپ کی طرف لوٹانا ہے اور آپ کے وصال کے بعد آپ کی صحیح احادیث و سنن کی طرف لوٹانا ہے۔

قرآن مجید کی تحکیم

قرآن مجید کو حکم بنانے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے:

فلا وربک لایؤمنون	قسم ہے آپ کے رب کی، یہ لوگ ایماندار نہ ہوں گے
حتی یحکموک فیما شجر بینہم ثم لا	جب تک یہ بات نہ ہو کہ ان کے آپس میں جو جھگڑا واقع
یجدوا فی أنفسہم حرجا مما قضیت	ہو اس میں یہ لوگ آپ سے تصفیہ کرا دیں، پھر آپ کے
ویسلموا تسلیما۔	اس فیصلے سے اپنے دلوں میں تنگی نہ محسوس کریں اور پورے
(سورۃ النساء / ۶۵)	طور پر تسلیم کر لیں۔

رسول کی تحکیم کتاب و سنت کی تحکیم ہے۔

أفحکم الجاھلیۃ یبغون ومن	کیا یہ لوگ پھر زمانہ جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں
أحسن من اللہ حکما لقوم	اور فیصلہ کرنے میں اللہ سے اچھا کون ہوگا یقین
یوقنون۔ (سورۃ المائدہ / ۵۰)	رکھنے والوں کے نزدیک۔

اللہ کے حکم کے ماسوا سب جاہلیت کے احکام ہیں۔

ومن لم یحکم بما أنزل اللہ	اور جو شخص اللہ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے

فأولئك هم الكافرون ـ	سو ایسے لوگ کافر ہیں ۔
(المائدہ/۴۴)	
ومن لم يحكم بما أنزل الله	اور جو شخص اللہ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے
فأولئك هم الظالمون ۔	سو ایسے لوگ ظالم ہیں ۔
(المائدہ/۴۵)	
ومن لم يحكم بما أنزل الله	اور جو اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے
فأولئك هم الفاسقون ۔	تو ایسے لوگ فاسق ہیں ۔
(المائدہ/۴۷)	

فتنوں سے نجات اور اس سے بچاؤ کا راستہ کتاب وسنت کی تحکیم ہے، اور یہ علماء حدیث وسنت کی طرف رجوع سے ہوگا جو لوگ کتاب وسنت میں تفقہ اور بصیرت کی نعمت سے بہرہ ور ہیں جنہوں نے کتاب وسنت میں مہارت تامہ حاصل کی ہے، اس کے احکام کی معرفت حاصل کی ہے اور اس کے راستہ پر گامزن ہیں ۔

انس وجن، عرب وعجم، مرد وعورت غرضیکہ پوری ملت اسلامیہ پر واجب ہے کہ وہ کتاب وسنت کو اپنا حکم بنائیں، صحابۂ کرام، تابعین عظام اور سلف صالحین کے طریقہ پر امن وجنگ اور عبادات ومعاملات میں اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات جس میں لوگوں نے افتراق وتشتت کی راہ اختیار کی، حشر ونشر، معاد جسمانی، جنت جہنم غرضیکہ ہر چیز میں کتاب وسنت کو اپنا حکم بنائیں اور اسلاف کے طریقہ پر چلیں ۔

انھیں امور ومعاملات میں سے جنگ وجدال اور لڑائی جھگڑا کا معاملہ ہے، جسے بعض لوگ چھیڑتے رہتے ہیں، اس باب میں بھی ضروری ہے کہ اللہ رب العزت کی شریعت کو حکم بنایا جائے ۔

اسی طریقے سے جنگ کی تیاری اور اس میں اعداء سے تعاون کے جواز اور عدم جواز کے مسئلہ کو بھی کتاب وسنت پر پیش کیا جائے ۔

حاکم عراق کا فتنہ مذکورہ مسائل ومعاملات میں سے سال رواں ۱۱/محرم الحرام کو عراق کے حاکم صدر صدام حسین کی فتنہ انگیزی ہے جس نے حکومت کویت پر جارحانہ کارروائی کرکے اپنا قبضہ جمالیا، اللہ تعالیٰ اس کو اس جرم پر جب سزا کا مستحق ہے دے ۔

کویت اور خلیجی ریاستوں کو اس فتنہ انگیزی اور شرارت سے جو خطرات لاحق ہوگئے ہیں ضروری ہے کہ اس کو بھی کتاب وسنت کی

رازو میں تول لیا جائے۔

ارباب علم و ایمان کے یہاں بلا ریب و شک حاکم عراق کا یہ اقدام ایک بڑا منکر و عظیم گناہ اور کھلم کھلا جارحیت اور دشمنی ہے جس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں، اگر یہ شخص اسلام کا داعی اور شریعت کو نافذ کرنے والا ہوتا تو کویت یا اس کے علاوہ کسی دوسرے ملک کے لوگوں پر اتمام حجت، تبلیغ دعوت اور ان کے خلاف پیش کی جانے والی مشتبہ دلیلوں کے جاننے اور نفاذ شریعت کی کمیت و کیفیت جاننے سے پہلے وہ لوگوں کے خلاف جارحیت اور لشکر کشی پر آمادہ نہ ہوتا۔

جس شخص کے یہاں ذرہ برابر بھی عقل، دین، اخلاق و مروت اور شرم و حیا ہو وہ ایسا اقدام نہیں کر سکتا کہ شہروں کو روند ڈالے، لوگوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دے۔ ان کا مال و اسباب لوٹ لے، انہیں اپنا قیدی اور غلام بنالے، اور ان امور میں کسی شرعی اور اخلاقی قدر کا خیال نہ کرے۔

پھر اس کے بعد اسلام کا لبادہ اوڑھ کر منافقت کی روش اختیار کر کے یہ دعویٰ کرے کہ وہ جہاد کر رہا ہے، یا حرمین شریفین اور مقدسات اسلامیہ کا تحفظ کر رہا ہے۔ نفاق، کفر صریح، دجل و فریب اور تلبیس اسی کو کہتے ہیں۔

یہ بات معلوم ہے کہ اسلام کے مخالف سارے ملحدانہ مذاہب جیسے قبوریت، سیکولرزم وغیرہ سب کے سب اسلام کی ضد ہیں۔ یہود و نصاریٰ کا ذبیحہ، اور ان کا کھانا مباح ہے لیکن ملاحدہ و زنادقہ کا نہ تو کھانا حلال ہے اور نہ تو ان کی عورتیں حلال ہیں، اسی طریقہ سے ان کے ہم مثل بت پرستوں کی نہ عورتیں حلال ہیں اور نہ ان کے کھانے، ایسے ہی بتوں کو پوجنے والے قبروں کا سجدہ اور طواف کرنے والے اور درختوں اور پتھروں کے آگے جھکنے والوں کا معاملہ ہے۔

اسی لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ان کے احکام کے مابین فرق و امتیاز کیا ہے، گرچہ کفر و ضلال میں سب ایک ہیں اور وہ ان میں قدر مشترک ہے، اور سب کا انجام جہنم ہے، لیکن کفر و ضلال میں اجتماع کے علی الرغم ان کے کفر و ضلال کے مابین تفاوت ہے، سب کا انجام کار آگ کا عذاب ہے لیکن ان کی انواع و اقسام میں فرق ہے۔

پھر اگر یہ خبیث دشمن حاکم عراق صدام حسین دوبارہ دائرۂ اسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے اور اپنے اعمال بد سے توبہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی روش بیجا سے باز آجائے اور وسائل سے کنارہ کش ہو کر اپنے اسلام کا اعلان و اظہار کرے، کویت کو اہالیان کویت کو واپس کر دے، اور جس کا جو ہڑپ لیا ہے اس کے مالک کو واپس کر دے، اپنی ان مذموم حرکات سے تائب ہو کر اس کا اعلان کرے کویت سے اپنی فوجیں واپس بلالے اور علی الاعلان توبہ کرے اور اپنے سارے اقدامات میں کتاب و سنت اور شریعت کو اپنا حکم و فیصل بنائے تاکہ اس کی سچائی کو جانا جائے، اور اسے چاہئے کہ دعوت اسلامی کی اصلاح اور فلاح و بہبود کے بارے میں غور و فکر کرے۔

مقصد یہ ہے کہ حاکم عراق کے خلاف جہاد اور صف آرائی کی بڑی اہمیت ہے، کھلے دشمن سے جہاد بڑا اور افضل جہاد ہے۔ تاکہ اس سے انتقام لیا جا سکے، حقوق حق داروں کو لوٹا دیا جائے تاکہ جس فتنہ کو اس نے ابھارا اور پھیلایا ہے وہ سرد پڑ جائے، اسلامی ملکوں کا اس کے خلاف جہاد شرعی جہاد ہے، اور یہ اسلامی حکومت سعودی عرب اور اس کا تعاون کرنے والے ممالک ہیں، اس جہاد میں نیت کی شرط کے ساتھ قتل ہو جانے کی صورت میں مجاہدین کی شہادت کی توقع و امید ہے، اگر مجاہد مسلمان ہو اور زندہ بچ جائے تو اس کے لئے بڑا اجر و ثواب متوقع ہے۔

غیر مسلموں سے استعانت

جنگ و قتال میں غیر مسلموں سے تعاون کی بحث اہل علم کے یہاں معروف و مشہور ہے جس کے جواز و اباحت کے بہت سارے دلائل ہیں۔ اور درست اور صحیح وہی ہے جو ہیئۃ کبار العلماء کے فتوی میں آپ سن چکے ہیں۔

بوقت ضرورت و احتیاج غیر مسلموں سے استعانت جائز ہے، ظالم دشمن کا رخ موڑ دینے، اس کا خاتمہ کر دینے اور اس کے شر سے ملک کو محفوظ کرنے کے لئے، اور اس کی پیش قدمی کو روک دینے کے لئے اگر مسلح طاقت ناکافی ہو تو ایسے غیر مسلموں سے تعاون لینا جائز ہے جن کے بارے میں توقع ہو کہ وہ دشمن کے شر و فساد سے روک دینے اور اس کے تمرد و سرکشی پر قابو پانے میں ممد معاون ہوں گے، چاہے یہ لوگ یہودی ہوں، یا نصرانی یا بت پرست یا کسی اور مذہب و دین کے ماننے والے، اور یہ اس صورت میں جبکہ اسلامی حکومت کو یہ معلوم ہو کہ مشترک دشمن کے عدوان و تمرد کو روک دینے میں یہ اقدام مؤثر ہوگا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مکی میں اس طرح کے واقعات پیش آ چکے ہیں، آپ نے طائف سے واپسی پر مطعم بن عدی سے تعاون حاصل کیا، اپنے چچا ابو طالب کے انتقال کے بعد جب آپ اہل مکہ سے خائف ہو گئے تو دوسروں سے آپ نے مدد طلب کی لیکن کسی نے آپ کی طرف دست تعاون دراز نہیں کیا، صرف مطعم بن عدی نے جو کفار میں بڑی حیثیت کے مالک تھے آپ کا تعاون کیا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین کے منی کے پڑاؤ اور خیموں میں جا کر اپنے اور اپنی دعوت کو پیش فرماتے، ان سے کفر کے تنوع اور ضلالت کے باوجود پیغام ربانی کی تبلیغ کے لئے مدد چاہتے۔

عبد اللہ بن اریقط سے آپ نے اپنے مدینہ کی طرف سفر ہجرت میں اس وقت تعاون حاصل کیا، جب آپ کو اس کے بارے میں یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ اس مہم کے لئے مناسب آدمی ہے، اور رہنمائی میں اس سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ایک دن آپ نے عرض کیا: " لا أستعين بمشرك " (میں کسی مشرک سے تعاون نہیں لوں گا) آپ نے تعاون سے روکا نہیں، اور " لاتستعينوا " نہیں فرمایا، آپ نے " لا أستعين " اس لئے کہا کہ اس وقت آپ مشرکین

کے تعاون کے محتاج نہیں تھے، بحمداللہ آپ کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت تھی، اور یہ فرمان نبوی اس شخص کی ہدایت کا سبب بن گیا، جس نے آپ کا راستہ روکا تھا، حتی کہ وہ دائرۂ اسلام میں داخل ہوگیا۔

فتح مکہ کے دن آپ نے صفوان بن امیہ (جو اپنی قوم کے مذہب پر تھا) سے زرہیں مانگی، اس نے کہا: اے محمد! کیا آپ غصب کرلوگے؟ آپ نے فرمایا: نہیں، یہ تو عاریۃً ہے، اس کو واپس لوٹا دینے کی ضمانت میں دیتا ہوں۔

بدترین اور کمینہ دشمن

مسلمانوں کا سابقہ جب کسی ایسے دشمن سے پڑ جائے جس کا شر دوسرے دشمن کے شر سے کم ہو، اور ان سے دوسرے بدترین دشمن کے خلاف استعانت ممکن ہو تو اس تعاون کے حصول میں کوئی حرج نہیں

ہمیں اس بات کا علم ہے کہ ملاحدہ اور زنادقہ کا شر عظیم ہے اسلئے مشرکین کے مختلف گروہوں سے وقتی اور عارضی تعاون، بدبخت اور بدترین دشمن کے عدوان و تمرد اور سرکشی پر قدغن لگانے، ان کا دفعیہ کرنے اور ان کو ختم کرنے اور مسلمانوں کو ان کے شر سے تحفظ فراہم کرنے کے لئے شرعی قواعد کی روشنی میں جائز اور مباح ہے۔

اہل علم کے مابین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فتنوں اور اس سے دور رہنے کے بارے میں جو ہدایات موجود ہیں، معروف ومشہور ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

انہا ستکون فتن، القاعد فیہا خیر من القائم، والقائم خیر من الماشی، والماشی خیر من الساعی من یستشرف لہا تستشرفہ فمن استطاع أن یعوذہ ملجاء أو معاذ فلیفعل۔	عنقریب فتنوں کا وقوع ہوگا، اس میں بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہے، اور چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہے جو اس کی طرف لپکے گا فتنہ اسے پالیگا جسے کوئی ٹھکانا مل سکے تو اس کو اس پناہ گاہ میں چلا جانا چاہئے۔

یہ وہ فتنے ہیں جن کے اسباب ظاہر نہیں ہوتے، اور جن میں راہ حق کا پتہ نہیں چلتا، معاملات گڈمڈ ہوجاتے ہیں، ان فتنوں سے مومن کو بچنا چاہئے، ان سے دور رہ کر کسی بھی جائے پناہ کو تلاش کرنا چاہئے، اسی قبیل سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد گرامی ہے

یوشک ان یکون خیر مال المرء المسلم غنم یتبع بہا شعف الجبال ومواقع القطر یفر بدینہ	عنقریب مومن کی سب سے قیمتی متاع بکریاں ہوں گی جنہیں لے کر وہ پہاڑوں کی چوٹیوں اور پہاڑی وادیوں میں فتنوں سے راہ فرار

من الفتن ۔ (صحیح بخاری) اختیار کرکے اپنے دین کو بچالے گا۔

اسی قبیل سے آپ کا یہ فرمان:

لما سئل ای الناس أفضل ؟ قال: مؤمن فی شعب من الشعاب یعبد اللہ ویدع الناس من شرہ۔

آپ سے جب سوال کیا گیا کہ کون سے لوگ افضل ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: وہ مؤمن افضل ہے جو کسی گھاٹی میں چلا جائے، وہاں اللہ کی عبادت کرے، اور اپنے شر سے لوگوں کو محفوظ رکھے۔

ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی مدد

فتنوں سے کنارہ کشی اور اجتناب اس وقت ہوگا جب امور و معاملات میں التباس اور خفا رہو، مؤمن جب اپنے نفس کے بارے میں خائف ہو تو ایسی صورت میں وہ اپنے آپ کو فتنوں سے دور رکھے، لیکن جب ظالم و مظلوم، حق پرست اور باطل پرست کے مابین فرق و امتیاز واضح ہوجائے تو اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ظالم اور باطل کے مقابلے میں حق پرست اور مظلوم کا ساتھ دے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

أنصر أخاك ظالماً أو مظلوماً قیل یا رسول اللہ! کیف أنصرہ ظالماً؟ قال: تحجزہ عن الظلم فذلك نصرہ۔

تم اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو، اور چاہے مظلوم، کہا گیا کہ یارسول اللہ! ظالم کی مدد کیسے کی جائے گی؟ آپ نے فرمایا: کہ تم اس کو ظلم سے روک دو یہی اس کی مدد ہے۔

یعنی ظالم کو ظلم سے باز رکھنا ہی اس کے ساتھ تعاون ہے۔

عہد صحابہ میں جب فتنہ بپا ہوا تو بعض لوگ شکوک و شبہات کا شکار ہوگئے، سعد بن ابی وقاص، محمد بن مسلمہ، اور صحابہ کی ایک جماعت، فتنہ کی احادیث کے پیش نظر اس سے کنارہ کش رہی، لیکن فقہائے صحابہ نے جو پوری بصیرت اور علم سے بہرہ ور تھے، جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیا، اس لئے کہ آپ فریقین کے حق میں قریب تر تھے، خوارج اور شام کے باغیوں کے خلاف آپ کی مدد کی، کیونکہ یہ لوگ حق سے واقف تھے، انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مظلومیت کا یقین تھا جن کی مدد اور تعاون واجب تھا اور جو واجب الاتباع امام اور خلیفہ تھے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور آپ کے ساتھیوں نے قتل عثمان کے شبہ کی بنیاد پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ارشاد باری ہے:

وان طائفتان من المؤمنين اقتتلوا فأصلحوا بينهما، فإن بغت احداهما على الاخرى. فقاتلوا التي تبغي حتى تفئ إلى امر الله ۔	اور اگر مسلمانوں میں دوگروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان اصلاح کر دو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے ۔
فإن فاءت فأصلحوا بينهما بالعدل، وأقسطوا ان الله يحب المقسطين ۔	پھر اگر رجوع ہو جائے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کر دو اور انصاف کا خیال رکھو، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ۔
(سورۂ حجرات / ۹)	

آیت میں قتال کا حکم دیا اس لئے " فقاتلوا " کہا، " فاعتزلوا " نہیں کہا یعنی کنارہ کشی کا حکم نہیں دیا ۔
جب ظالم کا پتہ چل جائے تو مظلوم کا تعاون ضروری ہے، اس لئے کہ آیت میں حکم ہے " فقاتلوا التی تبغی حتی تفئ إلی امر الله " (اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے)
عہد صحابہ میں باغی گروہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور آپ کے انصار و معاونین کا تھا، اور اعتدال پسند گروہ حضرت علیؓ اور آپ کے اصحاب کا، اس لئے اعیان صحابہ رضی اللہ عنہم نے حضرت علی کی مدد کی اور ان کا ساتھ دیا ۔

معرفت حق کی جدوجہد

اس مفہوم پر خوارج کے قصہ سے متعلق صحیح حدیث میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے :

تمرق مارقة على حين فرقة من المسلمين تقتلهم أولى الطائفتين بالحق ۔	مسلمانوں کے مابین افتراق وانتشار کے موقع پر ایک گروہ خروج کرے گا، دو گروہوں میں سے حق سے قریب تر گروہ ان کو قتل کرے گا ۔

حدیث عمار میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

تقتل عمارا الفئة الباغية	عمار کو باغی ٹولہ ہلاک کرے گا ۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور آپ کے اصحاب نے عمار کا قتل کیا، یہ لوگ باغی تھے، لیکن انہوں نے اجتہاد سے کام لیا، اور خوا

عثمان کے قصاص کے اپنے مطالبہ کو صحیح سمجھا۔

اسی طرح سے جنگ جمل میں طلحہ و زبیر نیز حضرت عائشہ کا خیال تھا لیکن یہ لوگ راہ ثواب پر نہیں تھے، یہ اپنے اجتہاد پر ایک اجر کے مستحق ہوئے، لیکن اصابت رائے کے ثواب سے محروم رہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اجتہاد اور اصابت رائے دونوں کا ثواب ملا، قاعدہ یہ ہے کہ کسی قاضی، مصلح، جنگ جو طالب حق مجتہد نے جب حق کی معرفت میں اجتہاد کیا تو حق پاجانے کی صورت میں مع دونوں اجر کا مستحق ہوگا، اور اگر حق میں غلطی کی تو صرف اجتہاد کے اجر کا مستحق ہوگا۔ ارشاد نبوی ہے۔

إذا حكم الحاكم فاجتهد فأصاب	حاکم نے جب فیصلہ کرنے میں اجتہاد کیا اور حق پاگیا
فله أجران، وإذا حكم فاجتهد	تو وہ دو اجر کا مستحق ہوا، اور جب فیصلہ کرنے میں
وأخطأ فله أجر۔	اجتہاد کیا اور غلطی ہوگئی تو اس کو ایک ہی اجر ملے گا۔

ہر فتنہ و فساد، لڑائی اور جنگ وجدال کے بارے میں غور کیا جائے گا، مسلمانوں اور اہل بدعت اور کفار کے برپا کئے ہوئے فتنوں کے بارے میں سوچا جائے گا، اور ظالم اور باطل پرست کے مقابلہ میں مظلوم اور حق پرست کا ساتھ دیا جائے گا، اس سے حق کی مدد اور تائید ہوگی مسلمانوں کے امور و معاملات درست ہوں گے، ظالم اپنے ظلم سے باز آجائے گا۔

ظالم کو ظلم سے روکنا

اس بات کا علم ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کے سامنے ایسے واضح نصوص شرعیہ ہیں جن کی بنا پر اس کو حق کا ساتھ دینا چاہئے۔ ارشاد باری ہے:

وتعاونوا على البر والتقوىٰ ولا	نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت
تعاونوا على الإثم والعدوان۔	کیا کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے
(سورۃ المائدۃ / ۲)	کی اعانت مت کرو۔

باغی، مسلمانوں کے مخالف کفار، اور مسلمانوں پر ظلم و تعدی کرنے والوں سے جنگ وجدال حق و صواب اور نیکی کا کام مظلوم کی دادرسی اور تعاون ہے، نیز یہ ظالم کے لئے زجر و توبیخ ہے، پس مسلمانوں کا صدام حسین اور اس قماش کے شرپسندوں اور ظالم کے خلاف جنگ، نیکی، بھلائی اور ہدایت کا کام ہے، مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ ہر ممکن کوشش کریں، اور جہاں سے بھی تعاون ہو سکے تعاون حاصل کریں، غرضیکہ ظلم کو بے دست و پا کرنے، اس کا سر کچلنے اور اس کا خاتمہ، اور مسلمانوں کو اس کے شر سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں، مسلمانوں کے لئے یہ ناجائز ہے کہ وہ مظلوموں اور بے کسوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیں تاکہ ان ظالموں اور جابروں کے وہ نوالہ تر بن جائیں

اور ان سے جیسے چاہیں پچھلواڑے کریں، چھوٹے بڑے سارے معاملات میں مظلوموں کی حمایت کریں۔

اہل اسلام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں یا جن چیزوں سے کنارہ کش رہتے ہیں، ان امور کے بارے میں انہیں بصیرت حاصل ہو، ہر معاملہ میں اسلامی شریعت اور کتاب وسنت کو اپنا حکم بنائیں، کتاب وسنت کا ایسا مطالعہ کریں جیسا حق کا طالب، اللہ کی رضا اور آخرت کا خواہاں کرتا ہے، جو اللہ کے بندوں پر اللہ کے احکام کا نفاذ چاہتا ہو۔

اہل اسلام کو چاہیئے کہ وہ خواہشات نفس کی پیروی سے پرہیز کریں، کیونکہ وہ خواہشات نفس انسان کو واصل جہنم کر دیتی ہے۔ ارشاد باری ہے:

ولا تتبع الھوی فیضلک عن سبیل اللہ۔ (سورہ ص/۲۶)

نفسانی خواہش کی پیروی مت کرو (اگر ایسا کروگے تو) وہ اللہ کے راستہ سے تم کو بھٹکا دے گی۔

فان لم یستجیبوا لک فاعلم انما یتبعون أھواءھم۔ (القصص/۵۰)

پھر (اس احتجاج کے بعد) اگر یہ لوگ آپ کا (یہ) کہنا نہ کرسکیں تو آپ سمجھ لیجئے کہ یہ لوگ محض اپنی نفسانی خواہشوں پر چلتے ہیں۔

صدام حسین کی کمینگی اور خبث باطن

ارباب عقل وبصیرت کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے کہ اگر صدام حسین کو جزیرہ عربیہ میں فتنہ وفساد کی کھلی چھوٹ مل جاتی اور اس کو اپنے ناپاک عزائم اور منصوبوں کی تکمیل کے لئے بے لگام چھوڑ دیا جاتا، اور اس باطل اور ظالم تمر دپر اس کے معاونین اس کا تعاون کرتے تو اس کے نتیجہ میں جزیرہ عربیہ پر کتنے عظیم حادثات ومصائب اور بدترین شر وفساد رونما ہوتا، یہ تو اللہ رب العزت کا فضل ہوا کہ مسلمانوں کے سربراہ اس کی کمینگی اور خفیہ کی ناپاک عزائم سے آگاہ ہوگئے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنے ناپاک منصوبوں کی تکمیل میں ناکام بنا دیا۔

ہم اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ انجام کو بہتر بنائے، صدام وغیرہ کے شر وفساد سے ہمیں محفوظ رکھے، مسلم افواج کے مابین صلح کرائے، انہیں حق پر مدد دے، دین میں تفقہ اور بصیرت کی نعمت سے بہرہ ور کرے، ہمارے گناہوں اور کوتاہیوں کے شر سے وہ ہمارے لئے کافی ہو، عراق کی حکمرانی وسیادت کے لئے ایسا نیک اور صالح قائد منتخب کرے جو وہاں پر شریعت اسلامیہ کا نفاذ کرے۔

ہم اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ عراق اور سارے مسلمانوں پر ایسے لوگوں کو حکمراں بنائے جو اللہ کی شریعت کا نفاذ کریں کتاب وسنت کی روشنی میں ان کی حکمرانی کریں، شریعت مطہرہ کی مخالفت کرنے والے مسلم حکمرانوں کے شر وفساد سے اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے کافی ہو۔

ہم اللہ تبارک وتعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے حکمرانوں اور قائدین کی اصلاح فرمائے، انہیں صراط مستقیم پر چلائے، ہر جگہ مسلمانوں کے حالات درست فرمادے، مسلمان جہاں کہیں ہوں ان کو اور ہم سب کو ہر جگہ کے دشمنوں کے شر وفساد سے بچائے، دشمنوں کی چالوں کو ناکام بنادے، ہمیں ان کے اور اپنے گناہوں کے شر سے محفوظ رکھے، توبۂ نصوح اور استغفار کی توفیق دے، کویت میں جو بلا نازل ہوئی ہے، اور اس کے نتیجہ میں جس عظیم فتنوں اور آزمائشوں کا سامنا ہے،

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ان امور کو تمام لوگوں کے لئے عبرت وموعظت کا سامان بنائے، اس حادثۂ فاجعہ کو تمام لوگوں کی اصلاح اور بیداری کا سبب بنادے، ہماری حکومت کو ہر خیر، اور بھلائی کی توفیق عطا فرمائے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں ان کا معین ومددگار ہو۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہم دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے تمام پڑوسیوں کو کتاب وسنت سے تمسک، اور اسے مشعل راہ بنانے کی توفیق عطا کرے، انہیں حق وہدایت پر جمع کردے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر ان کی مدد فرمائے، ان کے مابین اللہ اور رسول کے خلاف جنگ کرنے والوں اور کتاب وسنت کے خلاف دعوت دینے والے بدبختوں اور کمینوں سے اپنی پناہ میں لے لے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے دشمنوں کے مکر وفریب کو باطل کردے، اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کردے داعیان حق کو ان امور کی توفیق دے جس سے وہ خوش ہوتا ہے، ہر جگہ کے مسلمانوں کی حالات کی اصلاح فرمادے، حق وہدایت پر ہم مسلمانوں کو متحد کردے، اعداء کے شر سے چاہے وہ جہاں ہوں، ہمیں اپنی حفاظت میں رکھ، اللہ رب العزت کی ذات بہت سخی اور بہت کریم ہے۔

وصلی اللہ وسلم وبارک علیٰ رسولہ ونبینا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ واتباعہ باحسان۔

موجودہ خلیجی بحران اور ہماری ذمہ داریاں

تحریر
ڈاکٹر عبداللہ عبدالمحسن الترکی / مدیر جامعۃ الامام
محمد بن سعود الاسلامیہ، ریاض

ترجمہ
ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبدالجبار الفریوائی / استاذ
جامعہ سلفیہ، بنارس

ہر طرح کی حمد و ثنا کی مستحق صرف اللہ رب العزت کی ذات اقدس ہے، جس نے اطلاع دی ہے کہ وہ اہل ایمان کے دلوں کو اطمینان و سکون، ان کے قدموں کو ثبات و استقلال کی نعمت سے بہرہ ور کرتا ہے، اور ان پر سکینت و اطمینان کا نزول فرماتا ہے، ان کے خلاف بغاوت کرنے والوں پر ان کو غلبہ عطا فرماتا ہے۔

صلاۃ و سلام ہو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جس نے ہمیں بتلایا ہے کہ طاقتور مسلمان کمزور مسلمان سے زیادہ اللہ کے نزدیک محبوب ہے، اور دونوں میں خیر ہے صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم۔

کویت پر عراقی حملہ ۲/اگست کی مکروہ صبح کو ہمارا علاقہ ایک خونریز فتنہ کی آزمائش میں مبتلا ہوا، جس نے خلیج اور ساری دنیا کے اہل اسلام بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کو کرب و غم اور اذیت کے سیلاب میں غرق کر دیا، اس دن عراقی فوج نے کویت پر یلغار کر کے اس پر قبضہ کر لیا، ظلم و بغاوت اور طغیان و سرکشی کا یہ ننگا ناچ تھا، اس ظلم و تعدی کا ہر ممکن طریقہ سے جواب دینا ضروری تھا، پانچ ماہ کی مدت میں متعدد مخلصانہ کوششیں اس میں صرف ہو گئیں کہ عراق کویت چھوڑ دے اور علاقہ کو جنگ سے بچائے۔

لیکن عراقی قیادت نے اپنے کان میں انگلیاں ٹھونس لیں، اور بے جا اصرار، تکبر کی روش اختیار کی، اس لئے اس ظلم و تعدی کے لئے قوت کا استعمال ناگزیر ہو گیا، مثل ہے " آخر الدواء الکی "، آخری علاج داغنا ہوتا ہے۔

اب جنگ چھڑ چکی ہے جس کی ذمہ دار عراقی قیادت ہے، جنگ شروع ہونے سے چند دن قبل مکہ مکرمہ میں علماء اسلام نے اپنے ہنگامی اجلاس میں امت کے نام شائع کئے جانے والے منشور میں اس جنگ اور اس کے نتائج کی ذمہ داری عراقی قیادت پر ڈالی تھی۔

اعلان مکہ ہمارے اس اعلامیہ کا مقصد یہ ہے کہ ہم امت اسلامیہ کو ایک ایسی تباہ کن جنگ سے بچائے جائیں جس کے چھڑ جانے

سے نسلیں ہلاک، اور کھیتیاں تباہ و برباد ہوجائیں گی، جنگ سے بچنے کا ارادہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ شجاعت وصراحت کے ساتھ عراقی تعنت وسرکشی کا مقابلہ کیا جائے جو اس مہلک اور تباہ کن جنگ کا اساسی سبب ہے۔

مکہ مکرمہ میں اکٹھا ہونے والے علماء اسلام کو صورت حال کی خطرناکی کا شعور اور جنگ کے زلزلوں اور جھٹکوں کی ہولناکیوں کا ادراک ہے، انھیں معلوم ہے کہ اگر احتیاط نہیں برتی گئی۔ اور امت بیدار نہیں ہوئی اور صدام حسین کو نفسیاتی عزلت، اور فکری و اعلامی حصار اور شجاعت و بہادری کے بول سے اگر دبا نہ دیا گیا تو امت اسلامیہ پر بڑا مشکل دور آنے والا ہے۔

جرأتمندانہ اقدام یہ ہے کہ ہم کہیں کہ:

صدام حسین کویت سے نکل جاؤ! کل نہیں ابھی اور آج نکلو!!

نکل جاؤ۔ قوم ثمود کے بدبخت انسان کی طرح نہ ہوجاؤ جس نے اپنی قوم پر اپنے عمل و کردار کی وجہ سے ایسا شر مسلط کیا جو کوئی آدمی اپنی قوم پر مسلط کر سکتا ہے۔

نکل جاؤ! ورنہ موجودہ اور آنے والی ملت تمہارے اور تمہارے اعوان وانصار کو ایک ایک قطرہ بہنے والے خون کا ذمہ دار ٹھہرائے گی، اور عراق اور عراق کے باہر برباد ہونے والے ہر گھر کی بربادی کا ذمہ دار تم لوگوں کو ٹھہرائے گی۔

جنگ کا انتخاب یا خودکشی

اس نصیحت اور خیرخواہی کے علی الرغم عراقی قیادت نے جنگ کا انتخاب کیا، ذمہ داری کے عدم احساس اور فقدان کی بناء پر آدمی سمجھتا ہے کہ جنگ کھیل اور تفریح ہے، چاہے اس کا انجام خسارہ ہی کیوں نہ ہو، اور سیر و تفریح کا شعور و احساس، حرماں نصیبی، تلخی اور غم و آلام میں کیوں نہ تبدیل ہوجائے۔

الحرب اول ما تکون فتیۃ — تسعیٰ بزینتہا لکل جہول

حتی اذا اشتعلت دشب ضرامہا — ولت عجوزا غیر ذات حلیل

لڑائی شروع میں جوان لڑکی نظر آتی ہے جو اپنی زیب و زینت سے ہر نادان کو رجھانے کی کوشش کرتی ہے، پھر جب اس میں تیزی آتی ہے اور اس کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں تو بوڑھی بے فائدہ عورت کی طرح رخصت ہوجاتی ہے۔

جنگ کا نقارہ بج چکا ہے جس کا سعودی عرب نہ خواہاں تھا اور نہ اس کی کوشش کی تھی، لیکن اہل ایمان کی شان یہ ہوتی ہے کہ جب اعلان جنگ ہوجائے تو وہ ثابت قدم ہوجائیں۔

وَاللّٰہِ لَوْلَا اللّٰہُ مَا اھْتَدَیْنَا — وَلَا تَصَدَّقْنَا وَلَا صَلَّیْنَا

فَاَنْزِلَنْ سَکِیْنَۃً عَلَیْنَا — وَثَبِّتِ الْاَقْدَامَ اِنْ لَاقَیْنَا

إنَّ الأُولى قد بغوا علينا إذا أرادوا فتنة أبينا

- اللہ کی قسم! اگر اللہ رب العزت کا فضل واحسان نہ ہوتا، تو ہم نہ ہدایت یاب ہوتے، اور نہ زکوٰۃ دیتے، اور نہ روزہ رکھتے۔
- اے اللہ دشمن سے ملاقات کے وقت ہم پر سکینت نازل فرما، اور ہمارے پاؤں کو ثابت قدم رکھ۔
- ان لوگوں نے ہمارے خلاف بغاوت کردی ہے، اور فتنہ وفساد کے وہ متمنی ہیں، حالانکہ ہم ایسا نہیں چاہتے تھے۔

موجودہ حالات کا تقاضا

اس وقت کے حالات عام دنوں کے حالات سے مختلف ہیں، کیونکہ جنگ کا ایک خاص ماحول ہوتا ہے، اور اس کے کچھ تقاضے اور مطالبات ہوتے ہیں، ان حالات میں ذمہ داریاں اور واجبات دوچند ہوجاتے ہیں۔

۱- انابت وتوکل الی اللہ

پہلا فریضہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت کی طاقت وقوت کی پناہ مانگی جائے، اور اس پر بھرپور اور توکل اعتماد کیا جائے، اس کی تعظیم وتکریم اور شکر وتمجید سے ہماری زبانیں تر ہوں، موت وحیات کی باگ ڈور اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہے۔ فاللہ ھو الولیّ وھو یحیی الموتی وھو علی کل شیٔ قدیر۔ (سورۃ الشوریٰ / ۹)

" سو اللہ ہی کارساز ہے، اور وہی مردوں کو زندہ کرے گا، اور وہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، قضا وقدر کا معاملہ بھی اللہ ہی ہاتھ میں ہے۔

اَلَّذِیْ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا، وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ وَخَلَقَ کُلَّ شَیْئٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا (الفرقان / ۲)

ایسی ذات جس کے لئے آسمان وزمین کی حکومت حاصل ہے اور اس نے کسی کو اپنی اولاد قرار نہیں دیا اور نہ کوئی اس کا شریک ہے، حکومت میں اور اسکے (مملکت) میں ہے ہر (وجود) چیز کو پیدا کیا، پھر سب کا الگ الگ انداز رکھا۔

اور نصرت وتائید بھی من جانب اللہ ہے:

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ۔ (سورۃ انفال / ۱۰)

اور (واقع میں) نصرت اور (غلبہ) صرف اللہ کی طرف سے ہے بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں حکمت والے ہیں۔

مذکورہ بالا امور پر یقین و اعتماد کا تقاضہ یہ ہے کہ ہم حرکت و اقدام میں اخلاص و نیت کی طرف سبقت کریں، صبح و شام بکثرت ذکر الٰہی کریں۔

یا ایہا الذین آمنوا اذا لقیتم	اے ایمان والو! جب تم کو کسی جماعت سے (جہاد میں)
فئۃ فاثبتوا واذکروا اللہ کثیرا	مقابلہ کا اتفاق ہو تو (ان آداب کا لحاظ رکھو)
لعلکم تفلحون۔	۱۔ ثابت قدم رہو، ۲۔ اللہ تعالیٰ کا خوب کثرت سے
(سورۃ الانفال ر ۴۵)	ذکر کرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔

۲۔ اتحاد

دوسرا فریضہ یہ ہے کہ ہم ایک جھنڈے تلے صف بستہ ہو کر منظم ہو جائیں، قیادت کے زیر سایہ اتحاد و اجماع ہر وقت ضروری ہے، لیکن بحرانوں اور لڑائیوں کے وقت اس کی فرضیت اور اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ عظیم حکمت کے پیش نظر جنگ و جدال اور لڑائی کے سیاق و پس منظر میں وحدت و تضامن کے نصوص بکثرت وارد ہوئے ہیں:

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی	اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو (خاص طور پر) پسند کرتا ہے
سبیلہ صفا کأنہم بنیان	جو اس کے راستہ میں اسطرح مل کر لڑتے ہیں کہ گویا وہ
مرصوص۔ (سورۃ الصف ر ۴)	ایک عمارت ہے کہ جس میں سیسہ پلایا گیا ہے۔

غزوۂ بدر کے سلسلہ میں ارشاد باری ہے:

یسئلونک عن الأنفال قل الأنفال	یہ لوگ آپ سے (خاص) غنیمتوں کا حکم دریافت کرتے
للہ والرسول فاتقوا اللہ وأصلحوا	ہیں، آپ فرما دیجئے کہ یہ غنیمتیں اللہ کی ہیں اور رسول
ذات بینکم واطیعوا اللہ ورسولہ	کی ہیں، سو تم اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات
إن کنتم مؤمنین۔	کی اصلاح کرو، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو
(سورۃ الأنفال ر ۱)	اگر تم ایمان والے ہو۔

اور غزوۂ احد کے بیان میں ہے:

یا أیہا الذین آمنوا اتقوا اللہ	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرا کرو جس طرح ڈرنے کا حق
حق تقاتہ ولا تموتن إلا وأنتم	ہے، اور بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا
مسلمون، واعتصموا بحبل اللہ	اور مضبوط پکڑے رہو اللہ کے سلسلہ کو اس طور پر کہ

جمیعا ولا تفرقوا واذکروا نعمة الله علیکم اذ کنتم اعداءً فألف بین قلوبکم فأصبحتم بنعمته إخوانا وکنتم علی شفا حفرة من النار فأنقذکم منها کذلك یبین الله لکم آیاته لعلکم تهتدون ۔ (سورۂ آل عمران ر ۱۰۳)

(تم سب) باہم متفق بھی رہو، اور باہم نااتفاقی نہ کرو اور تم پر اللہ کا جو اکرام ہے اس کو یاد کرو جبکہ تم دشمن تھے پس اللہ نے تمہارے قلوب میں الفت ڈال دی، سو تم اللہ کے انعام سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، اس سے اللہ نے تمہاری جان بچائی، اس طرح اللہ تم کو اپنے احکام بیان کر کے بتلاتے رہتے ہیں تاکہ تم لوگ راہ پر رہو ۔

اس وقت ملک پر عسکری اور جنگی ماحول سایہ فگن ہے، جس کے بارے میں ربانی ہدایات ہیں کہ ہم صف بستہ ہو کر لڑائی کریں، گویا کہ ہم سیسہ پلائی دیوار ہیں، اسی ایمانی ہدایت یافتہ سلوک اور روش کو اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے، اور ہم سب کو چاہیئے کہ ہم اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیں، اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک کہ ہم اپنی قیادت کے زیر سایہ منتظم و متحد نہ ہو جائیں

یا أیها الذین آمنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم ۔ (النساء/۵۹)

اے ایمان والو! تم اللہ کا کہنا مانو اور رسول کا کہنا مانو، اور تم میں جو لوگ اہل حکومت ہیں ان کا بھی ۔

اس وصیت میں پروئی ہوئی صف بستہ جماعت میں ہر ایک آدمی پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ۔

علمائے اسلام اور داعیان حق کی ذمہ داریاں

علمائے اسلام اور داعیان حق کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ امت کو موجودہ صورت حال میں شرعی احکام، مناسب احوال اور صحیح مفاہیم سے آگاہ کریں ۔

ماضی میں علماء اسلام اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی ادا کرتے تھے، انھیں علماء میں سے شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہیں، جنہوں نے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے حق کے اظہار و تبلیغ کا فریضہ ادا کیا اور جنگ و مصیبت کے بارے میں شرعی حکم اور صحیح افکار و مفاہیم کی توضیح فرمائی، جہاد کے مسئلہ پر گفتگو فرماتے ہوئے آپ فرماتے ہیں :

" ہم نے تاتاریوں کی افواج کا معائنہ کیا تو ہم نے دیکھا کہ ان کے جمہور نماز نہیں پڑھتے، ہم نے ان کے لشکر میں مؤذن دیکھا نہ امام، ان لوگوں نے مسلمانوں کے اموال اور اولاد سلب کر لئے، اور ان کے دیار اور علاقوں کو اتنا برباد کیا جس کا علم اللہ کے علاوہ اور

کسی کو نہیں ہے،

" وہ اپنے بادشاہ چنگیز خاں کے لئے جنگ کرتے ہیں، جو ان کا مطیع ہو جاتا ہے، اس کو اپنا دوست اور ولی بنالیتے ہیں، چاہے وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، اور جو ان کی اطاعت نہیں کرتا اس کو وہ اپنا دشمن بنالیتے ہیں، چاہے وہ آدمی اچھے مسلمانوں میں کیوں نہ ہو، یہ لوگ اسلام کے لئے جنگ نہیں کرتے ۔

علماء کرام کی یہ ذمہ داری ہے کہ معاشرہ میں اتحاد و ربط کی بنیادوں کو مضبوط کریں، اور جماعت کے تعلقات کو تقویت پہنچائیں ان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی یاد دلائیں، ان کو توبہ صادقہ کی طرف بلائیں ۔

مسلح افواج کی ذمہ داریاں

ہماری مسلح افواج، اور جنگجوؤں پر بڑی اور دوہری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، مسلح افواج کے لئے کچھ منفرد اور خاص دلچسپی اور اہتمام کی باتیں ہیں جو ان کو سچے دفاع اور مخلصانہ جہاد پر ابھارتی ہیں ۔

یہاں موقع و محل کی خصوصیت اور امتیاز ہے، مقدسات اسلامیہ کی خصوصیت ہے، ہمارا ملک منتخب ملک ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے اختیار و پسند سے مہبط وحی بنایا، نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی ملک میں مبعوث فرمایا، اور اسی ملک کی زبان کو کتاب و سنت کی زبان منتخب کیا ۔

اسی ملک میں ہر اسلامی چیز کی ابتدا ہوئی، یہیں اس کا اتمام ہوا، یہیں اس کی تطبیق و تکمیل ہوئی ۔

عقیدہ ہو، دعوت ہو قضا و فیصلہ ہو، سوسائٹی اور حکومت کے مسائل ہوں، سب کچھ یہیں پروان چڑھے ۔

اسلام کی اولین جنگیں اور غزوات یہیں پیش آئے، جہاد کس سرزمین میں فرض ہوا ؟ اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہاں نازل ہوا ؟

۱ - كتب عليكم القتال وهو كره لكم وعسىٰ أن تكرهوا شيئا وهو خير لكم وعسىٰ ان تحبوا شيئا وهو شر لكم ، والله يعلم وانتم لاتعلمون

(سورۃ البقرۃ / ۲۱۶)

جہاد کرنا تم پر فرض کیا گیا ہے، اور وہ تم کو (طبعاً) گراں معلوم ہوتا ہے اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو، اور یہ (بھی) ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے حق میں (باعث) خرابی ہو، اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں اور تم (پورا پورا) نہیں جانتے ۔

۲- وقاتلوا فى سبيل الله الذين

اور (بے تکلف) تم لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں کے

یقاتلونکم ولا تعتدوا، إن الله لا یحب المعتدین۔ (سورۃ البقرۃ/ ۱۹۰)	ساتھ جو (نقض عہد کرکے) تمہارے ساتھ لڑنے لگیں اور (از خود) حد (معاہدہ) سے نہ نکلو، واقعی اللہ تعالیٰ حد (قانون شکنی) سے نکلنے والے کو پسند نہیں کرتے،
۳۔ یاأیہا الذین آمنوا خذوا حذرکم فانفروا ثبات أو انفروا جمیعا۔ (النساء/ ۷۱)	اے ایمان والو اپنی تو احتیاط رکھو، پھر متفرق طور پر یا مجتمع طور پر نکلو۔

جہاد اسی سرزمین پر فرض ہوا۔

اسلامی جہاد کے اولین معرکے اور غزوات کہاں واقع ہوئے؟ ہماری اسی سرزمین پر واقع ہوئے، غزوہ بدر، غزوۂ احد، غزوۂ احزاب (خندق)، غزوۂ حنین، غزوۂ تبوک، یہ سب فیصلہ کن اسلامی جنگوں کے نام ہیں، یہ سب جغرافیائی مقامات کا رمز ہیں، یہ سارے مقامات سعودی عرب میں واقع ہیں۔

ہماری اسی سرزمین میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان غزوات کی قیادت فرماتے تھے، اور ہماری اسی سرزمین پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے مقدس گروہ ان جنگوں کے مجاہد اور غازی تھے۔

سعودی مجاہدین کے دل و دماغ میں ان مواقع اور تابندہ تاریخ کی یاد سے بڑے اور اہم معانی مرتسم رہیں گے یہ ذہن میں رہے گا کہ جہاد کے اولین اسباق اسی سرزمین پر دیئے گئے، جہاد کی عملی تطبیق بھی اسی زمین پر کی گئی۔

آج کا فوجی ماضی کے فوجی کا اسی زمین اور جگہ پر امتداد ہے، اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ سعودی مجاہد مقدسات اسلامیہ کے دفاع و تحفظ کی جنگ لڑ رہا ہے۔

روئے زمین پر مسلمانوں کے نماز پڑھنے کے لئے صرف ایک ہی قبلہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی اعلیٰ مشیت سے اسی زمین میں بنایا ہے۔

قد نری تقلب وجہک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضاھا، فول وجہک شطر المسجد الحرام، وحیثما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ۔ (سورۃ البقرۃ/ ۱۴۴)	ہم آپ کے منہ کا (یہ) بار بار آسمان کیطرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، اسی لئے ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کردیں گے جس کے لئے آپ کی مرضی ہے، (لو) پھر اپنا چہرہ (نماز میں) مسجد حرام (کعبہ) کیطرف کیا کیجئے، اور تم سب لوگ جہاں کہیں بھی موجود ہو اپنے چہروں کو اسی (مسجد حرام) کیطرف کیا کرو۔

اور اسی سرزمین میں صرف ایک گھر ہے، جس کا مسلمان طواف کرتے ہیں، یہ اللہ کا پہلا گھر ہے جسے باری تعالیٰ نے صرف اپنی لاشریک عبادت کے لئے بنایا ہے۔

إن أول بيت وضع للناس للذي ببكة مباركا وهدى للعالمين، فيه آيات بينات، مقام ابراهيم ومن دخله كان آمنا۔	یقیناً وہ مکان جو سب سے پہلے لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا وہ مکان ہے جو کہ مکہ میں ہے جس کی حالت یہ ہے کہ وہ برکت والا ہے اور جہاں بھر کے لوگوں کا رہنما ہے اس میں کھلی نشانیاں ہیں (منجملہ ان کے) ایک مقام ابراہیم ہے، اور جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امن والا ہو جاتا ہے۔
(آل عمران / ۹۶، ۹۷)	

اسی سرزمین میں ایک عرفات ہے جہاں مسلمان وقوف کرتے ہیں، اور وہ جگہ ہماری اسی مقدس سرزمین پر واقع ہے۔

فإذا أفضتم من عرفات فاذكروا الله عند المشعر الحرام، واذكروا كما هداكم، وإن كنتم من قبله لمن الضالين۔	پھر جب تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر حرام کے پاس (مزدلفہ میں شب کو قیام کرکے) اللہ تعالیٰ کی یاد کرو اور اس طرح یاد کرو جس طرح تم کو بتلا رکھا ہے (نہ یہ کہ اپنی رائے کو دخل دو) اور حقیقت میں قبل اس کے تم محض ناواقف ہی تھے۔
(سورۃ البقرۃ / ۱۹۸)	

ان مقدسات اسلامیہ کو دائمی طور پر اسلامی مقدسات ہی باقی رہنا چاہئے۔ بیت اللہ الحرام کے لئے ضروری ہے کہ وہ امن و سلامتی کا گہوارہ رہے۔ شعائر اللہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ واجب التعظیم رہیں، حرم محترم کے لئے ضروری ہے کہ وہ الحاد سے پاک رہے۔

ان مقدسات اسلامیہ اور شعائر اسلام کے دفاع اور تحفظ کی ذمہ داری ہماری مسلح افواج پر ہے، ہماری یہ افواج مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی محافظ ہیں، اور یہی حرمین شریفین سے متصل سعودی عرب کے دوسرے شہروں اور علاقوں اور بستیوں کی محافظ ہیں جو خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز أیدہ اللہ ونصرہ کے زیر قیادت ہیں۔

ان مقدسات اسلامیہ کا تحفظ و دفاع ایسی خصوصیت ہے جس میں ہماری سعودی افواج ساری دنیا کی افواج سے منفرد و ممتاز ہیں، اور بلاشک وشبہ صرف یہی ایک خصوصیت و امتیاز جہاد اور دفاع میں بڑا خاص اور منفرد داعیہ ہے، جو چیز جتنی عظیم ہوگی اس کے دفاع اور تحفظ کی ذمہ داری بھی اتنی ہی عظیم اور اہمیت کی حامل ہوگی۔

عام شہریوں کی ذمہ داری

شہری شعبوں کی بڑی عظیم اور بھاری ذمہ داریاں ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

مَن جهز غازيا في سبيل الله فقد غزا ۔ (متفق علیہ)

اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے غازی کو جس نے لیس کیا اس نے غزوہ کیا۔

اس حدیث سے ہم بہت وسیع اور علمی مفاہیم و معانی استنباط کرتے ہیں اور وہ اپنے سارے مواقع، اعمال اور معیاروں کے ساتھ عام شہری خدمات ہیں، مقاتلین اور غازیوں کو مسلح کرنے کی ذمہ داری انہیں کے سر ہے۔

عام اداروں کے فرائض

مختلف مقامات کے عام اداروں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اخلاص، ہمت اور جہد مسلسل کے ساتھ منظم طور پر اپنے کاموں کو انجام دیں اور مصالح کو پورا کریں اور عام معاملات کو اچھی طرح سے انجام دیں۔

شہری شعبوں کی خدمت میں مصروف صاحب ضمیر اور صاحب مروت آدمی جب عمل میں کوتاہی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے پھر اپنے نفس سے حیا کرتا ہے، اور اس کو اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ اس کا ایک بھائی فوجی محاذ پر اس کی اور اس کے عزت و آبرو کے دفاع میں لگا ہوا ہے

معالج کی ذمہ داری

معالج اور طبیب کی ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے جذبات اور امنگوں اور حوصلوں کے ساتھ اپنی ذمہ داری بجا لائے۔

اسپتالوں میں مریضوں کا علاج و معالجہ جہاد ہے، زخمیوں کے مقامات میں جانا جہاد ہے، زخمی مجاہد کا علاج تاکہ وہ دوبارہ جہاد میں شریک ہو سکے جہاد ہے۔

تاجر کی ذمہ داری

تاجر کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو سامان تجارت مناسب بھاؤ سے دے، کیونکہ ذاتی اور خصوصی مصالح کو عام مصالح پر قربان کردینے کا یہ وقت ہے۔ یہ ایثار و قربانی ہر لحظ مطلوب و واجب ہے، لیکن اس طرح کے حالات جنگ میں اس کی فرضیت اور اہمیت زیادہ ہو جاتی ہے۔

نشریاتی اداروں کے فرائض

نشریاتی اداروں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ایسی خبروں، رپورٹوں اور جائزوں کو شائع جس میں امت میں عمل و کردار کی عزیمت کو تقویت پہونچے، اور جس سے امت کو طمانیت سکون اور امید کا تحفہ ملے۔

اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ مخالف دشمن، ذرائع ابلاغ کا مقابلہ، دلائل کی قوت اور ردّ و ابطال کی قدرت کرے ۔

مسلمانانِ عالم سے

ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم اپنے باہر کے مسلمان بھائیوں، بالخصوص داعیانِ حق، اور منکرینِ اسلام سے مخاطب ہوں اور یہ عرض کریں کہ : حکومتِ سعودی عرب کا ہر مسلمان کی گردن پر حق ہے کیونکہ سعودی عرب میں مسلمانوں کا قبلہ اور ان کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد ہے، یہی ملک ان کے حج، ان کے عمرے اور ان کی زیارت کی جائے عبادات ہے ۔

سعودی عرب بڑی مدت سے، اور اس وقت بھی اسلامی تضامن و اتحاد، اسلامی دعوت کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کے مسائل و مشکلات کے حل کرنے اور امت اسلامیہ کی ہر ممکن مادی اور معنوی خدمت کا کام انجام دے رہا ہے ۔

اربابِ فضل کے فضل کا اعتراف اصحابِ فضل کے علاوہ دوسرے نہیں کرتے، اس وقت، وقت آگیا ہے کہ مسلمان سعودی عرب کے ساتھ کھڑے ہو جائیں جو سخت مشکل حالات سے دوچار ہے، لوگوں کی قدر و قیمت اس طرح کے نازک حالات میں پہچانی جاتی اور دوستیوں اور تعلقات کا امتحان بڑے بڑے حوادث و واقعات ہی میں ہوتا ہے ۔

جب مسلمان سعودی عرب کے ساتھ کھڑے ہوں گے تو وہ حق و صداقت اور عدل و انصاف اور معروف و خیر کے ساتھ کھڑے ہونگے

والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض، يامرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويقيمون الصلاة ويؤتون الزكاة ويطيعون الله ورسوله أولئك سيرحمهم الله، إن الله عزيز حكيم ۔ (التوبہ/۷۱)

اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دینی رفیق ہیں، نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کا کہنا مانتے ہیں ان لوگوں پر ضرور اللہ تعالیٰ رحمت کریگا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ قادر (مطلق) ہے حکمت والا ہے ۔

یہ حقیقت ہے، مذاق نہیں اس وقت دوست اور دشمن کو پہچان لینا چاہیئے، ہم لوگ یعنی یہاں کی قیادت فوج اور عوام اللہ قیوم السموات والارض کی ذات پر اعتماد کامل کرلیا ہے اور اپنی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا عہد و پیمان کرلیا ہے ۔

قل هو الرحمٰن آمنا به وعليه توكلنا فستعلمون من هو في ضلال مبين ۔ (الملک/۲۹)

آپ (ان سے یہ بھی) کہئے کہ وہ بڑا مہربان ہے ہم اس پر ایمان لائے اور ہم اس پر توکل کرتے ہیں، سو عنقریب تمکو معلوم ہو جائیگا کہ صریح گمراہی میں کون ہے ۔ •

یک لمحۂ فکریہ —

از ڈاکٹر مقتدیٰ حسن بن محمد یٰسین ازہری

خلیجی بحران اور مسلمانوں کا ذہنی انتشار

کائنات کا تغیر اور اس کا ضابطہ

کائنات کی بوقلمونی اور حیات کی نیرنگی اپنے اندر عبرتوں کی ایک دنیا سمیٹے ہوئے ہے ، انسانی زندگی کی تغیر پذیری کوئی شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ ایک ایسی اٹل بنیقت ہے جو سُنت الٰہی کا ایک ایسا سبق آموز مظہر ہے جس سے ارباب بصیرت بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں ، کائنات کی ہر چھوٹی بڑی یز کسی نہ کسی حیثیت سے تغیر پذیر ہوتی رہتی ہے ، اور اسی طرح انسانی زندگی میں بھی نشیب و فراز آتے رہتے ہیں ، نشیب و فراز کا یہ سلسلہ انسان کی فکر و عمل دونوں کو محیط ہے ، اسی لئے انسانی تاریخ میں گوناگوں افکار و نظریات کی حامل جماعتیں اور افراد نظر تے ہیں ، جن کی زندگیاں خود تغیر و ارتقار کا مرقع نظر آتی ہیں ۔

اسلام نے جس طرح کائنات اور انسانی زندگی دونوں میں اس تغیر کا پتہ دیا ہے ، اسی طرح اس نے اس تغیر کی ضابطہ بندی بھی کی ہے ، اس کی رہنمائی یہ ہے کہ زندگی کا جو رخ شریعت کے احکام کے دائرہ میں آچکا ہے ، اس میں تغیر و تبدیلی نہ تو ممکن ہے نہ مفید ، لیکن جس رخ کو شرعی احکام کی تفصیلات سے آزاد رکھا گیا ہے ، اس میں تغیر و ترقی کی کوشش مستحسن ہے ۔

ہر چند کہ یہ ضابطہ بندی بے حد واضح اور مقاصد شریعت سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے ، لیکن عام انسانی عقل اس کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے ، اور اسی وجہ سے انسان کے اندر فکر و عمل کے انحراف کی بڑی گھناؤنی مثالیں نظر آتی ہیں ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس حدیث شریف میں یہ فرمایا ہے کہ امت مسلمہ انحراف و گمراہی میں یہود و نصاریٰ کی پیروی کرے گی ، اس میں بعض ایسے افعال کا بھی ذکر ہے جن کے تصور ہی سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ، اور انسان کی شقاوت و بدبختی پر سر پیٹنا پڑتا ہے ۔

فکر و عمل کا انتشار

انسانی معاشرہ کی ہدایت و رہنمائی کے لئے جس عظیم امت کو خلعت وجود سے سرفراز کیا گیا تھا اسکی

تاریخ پر نظر ڈالئے تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی اس پر صادق آتی رہی ہے ! امت میں فکر و عمل کا یہ انحراف کسی کسی دور میں اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ حق و صداقت کی ضیا باریاں مدھم پڑتی نظر آنے لگی ہیں، ہماری بات کی تصدیق کے لئے ایک نظر موجودہ انسانی معاشرہ پر ڈالئے، فکر و عمل کے تغیر و انتشار کی واضح مثالیں سامنے آئیں گی، انسان چونکہ شریعت کی رہنمائی سے بے گانہ ہوگیا ہے اس لئے فکر و عمل کے میدان میں اپنی راہ متعین کرنے میں اسے سخت دشواریوں کا سامنا ہے، تھوڑی دور کسی راہ نما کے ساتھ چل کر اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ اس کی منزل کا راستہ نہیں ہے، جب وہ دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے تو اس میں بھی اسے اسی الجھن سے سابقہ پڑتا ہے، اور اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تاآنکہ زندگی کا یہ سفر ختم ہوجاتا ہے۔ ہندوستان میں جنگ آزادی کے دوران اور آزادی کے بعد کی مذہبی و فکری تاریخ پر نظر ڈالئے تو صاف طور پر معلوم ہوگا کہ مسلمان اس الجھن میں کس طرح گرفتار ہے، اور صحیح راہ تک پہونچنے کے لئے اسے کتنی دشواریوں کا سامنا ہے۔

تربیت میں عقیدہ کی اہمیت

پچھلے دس پندرہ برس امت مسلمہ کے لئے بڑے صبر آزما ثابت ہوئے۔ اس مدت میں عالم اسلام میں ایسے واقعات رونما ہوئے جن کی وجہ سے امت سخت آزمائش سے دوچار ہوئی، چونکہ عام لوگوں کی نظر اسلام کے اصول و مقاصد پر گہری نہ تھی، اس لئے ان کی الجھن کا سلسلہ آج تک قائم ہے، اور اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں اعتقادی پہلو کو جو اہمیت دی گئی ہے اس کا سبب کیا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوری مکی زندگی میں عقیدہ کی تعلیم پر توجہ فرمائی، صحابہ کرامؓ جب اس پہلو سے پختہ ہوگئے تو پھر دیگر احکام و اعمال کی بجاآوری آسان ہوگئی، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا یہ کمال تھا کہ حاملینِ اسلام کا یہ مقدس گروہ دین و سیاست اور تہذیب و ثقافت کے معاملات میں پوری انسانیت کا معلم و رہنما بن گیا، اور اس کی رہنمائی آج تک ضرب المثل ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء اور اسلامی شریعت کو دیگر شریعتوں کا ناسخ قرار دے کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، کہ انسان کے جسمانی و روحانی عروج و کمال کے لئے جس تعلیم اور اسوہ کی ضرورت تھی اسے اسلام نے سب سے بہتر صورت میں پیش کر دیا ہے، اب نہ کسی ایجاد کی ضرورت ہے نہ کسی اضافہ کی، اس عروج و کمال کی جن لوگوں کو تمنا ہے ان کا فرض صرف ہے کہ اس اسوہ کی مخلصانہ پیروی کریں اور ان تمام راہوں سے اپنا دامن بچائیں جو اس اسوہ سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

اسلام کا غلبہ و برتری

اسلام کو جملہ ادیان کا ناسخ بنا کر اللہ تعالیٰ نے اس کی سیادت و برتری کا اعلان فرمایا ہے، بعض آیات قرآنیہ میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ اس دین کو غلبہ حاصل ہوگا، اور بعض آیات میں اس غلبہ کے لئے امت سے جہاد و کوشش اور جنگ و قتال کا مطالبہ ہے، یہ بھی ارشاد ہے کہ اس غلبہ کو اہل کفر و شرک

پسند نہیں کریں گے، بلکہ ان کی کوشش ہوگی کہ اس غلبہ کو دشوار بنا دیا جائے۔ دین کے غلبہ و سیادت کا یہ وعدہ الٰہی تاریخ کے مختلف ادوار میں پورا ہوا، اور ان شاء اللہ آئندہ بھی پورا ہوگا، لیکن اس سلسلہ میں جس بات پر سب سے زیادہ غور و فکر کی ضرورت ہے وہ یہ کہ امت مسلمہ کے اندر غالب ہونے کے لئے کن اوصاف و خصائص کا وجود ضروری ہے؟ قرآن کریم کی متعدد آیات میں ایمان و عمل صالح کو دین و دنیا میں ہر طرح کی کامیابی کا ضامن قرار دیا گیا ہے، بعض آیات میں زمین کی حکومت و اقتدار کے لئے ایمان و عمل صالح کو شرط قرار دیا گیا ہے، سورۂ نور کی آیت ۵۵ میں خلافت ارضی کے لئے ایمان و عمل صالح کے ساتھ ہی شرک سے اجتناب کا بھی ذکر کیا گیا ہے، سورۂ العصر میں اُمر بالمعروف و نہی عن المنکر اور صبر کی ضرورت کا بھی بیان ہے۔ اس طرح کی آیات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارکہ اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی پر مجموعی حیثیت سے غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زمین کی خلافت اور دین کی برتری و غلبہ کے لئے مذکورہ فضائل و محاسن سے امت کا متصف ہونا ضروری ہے، اس کے بغیر نہ تو مسلمانوں کو زمین کی خلافت حاصل ہوگی نہ دین کی سیادت و غلبہ کا تصور صحیح ہوگا لیکن موجودہ دور میں امت کا المیہ یہ ہے کہ اہلیت و صلاحیت کے بغیر وہ دین کے غلبہ کی متمنی ہے، اس غلبہ کے لئے کوشاں نظر آتی ہے، اور جب یہ مدعا حاصل نہیں ہوتا تو اس پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے، اور بعض اوقات اس کے اندر دین بیزاری اور بددلی پیدا ہو جاتی ہے۔ امت اپنی کوتاہ نظری اور بدعملی کی وجہ سے اس صورت حال سے دوچار ہوتی ہے، لیکن اس راز کو سمجھنے کے لئے وہ عمل کی اصلاح کے بجائے کسی اور طرف مڑ جاتی ہے، اور پھر فکر و عمل کے انحراف کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

مسئلۂ فلسطین کا حل

امت مسلمہ کو ۱۹۴۸ء سے مسئلۂ فلسطین کا سامنا ہے، اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کئی مرتبہ مسلح کوششیں ہو چکی ہیں، لیکن اب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکا، اسرائیل کی پشت پناہی میں دنیا کی بڑی طاقتیں شریک ہیں، کیونکہ اسرائیل کی بقا ہی میں ان کا مفاد پوشیدہ ہے، چھوٹے ممالک عربوں کا ساتھ دے رہے ہیں، لیکن ان کی تائید غیر مؤثر ہے، بلکہ کبھی کبھی ان کی تائید کے باعث اس مسئلہ کی معنویت مجروح ہوتی ہے، حسرت و نا امیدی کے ماحول میں فلسطینی عوام کی جو نسل تیار ہوئی ہے اس پر تشدد کا غلبہ ہے جو اس طرح کے ماحول کا لازمی نتیجہ ہے۔

آغاز سے اب تک اس مسئلہ میں جو تغیرات رونما ہوئے ہیں ان کے پیش نظر یہ فیصلہ مشکل نہیں کہ امت مسلمہ اپنے موجودہ عسکری وسائل سے اس مسئلہ کو فی الحال حل نہیں کر سکتی۔ امریکہ اور اس کے ہمنوا ممالک اسرائیل کی بقاء کے ضامن ہیں،

کے پاس جب تک طاقت تھی وہ اسرائیل کے ساتھ تھا، اور اب اس کے حالات ایسے نہیں ہیں کہ وہ عربوں کے مفاد کے لئے امریکہ اور اس کے معاون ملکوں سے ٹکر لے سکے، مسئلہ فلسطین کو حل کرنے کے لئے عربوں نے روس پر پوری طرح اعتماد کیا، لیکن اس کا کوئی فائدہ شاید مسئلہ فلسطین کو نہ پہونچ سکا، البتہ اس طرح عرب دنیا میں روس کو کمیونزم کی اشاعت کا بہترین موقع ہاتھ آگیا اشتراکی نظریہ نے آج جس طرح عرب دنیا کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے اس سے مذکورہ خیال کی تصدیق ہوتی ہے، خود فلسطینی رہنماؤں کی زندگی اور افکار ونظریات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشتراکی نظریہ ان پر پوری طرح مسلط ہے، اور انھیں اس نظریہ سے پوری عقیدت ہے، بعض عرب ملکوں میں مدارس اور گذرگاہوں کے نام تک لینن واسٹالن کے ناموں سے موسوم نظر آتے ہیں۔

اسرائیل نے شروع سے ہی اپنے لئے حصول وطن کے مسئلہ کی بنیاد مذہب پر رکھی ہے، اور جن عرب علاقوں پر اس نے قبضہ کا منصوبہ بنایا ہے، انھیں " ارض میعاد " سے تعبیر کرتا ہے، لیکن عربوں کا حال اس سے مختلف ہے، انہوں نے اس مسئلہ کو مذہبی رنگ دینے سے ہمیشہ گریز کیا، البتہ اس کے لیڈروں نے مذہب پرست حلقہ سے استفادہ ضرور کیا، مذہب سے اس معاملہ کو بچانے کی ایک توجیہ یہ کی گئی کہ اس طرح بہت سے حامی ممالک کی حمایت سے عرب محروم ہو جائیں گے، یہ عذر اس وقت صحیح ہو سکتا تھا جب فلسطینی عوام اسلامی عقائد واعمال سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے، سیرت کی تعمیر میں اسی سرچشمہ سے سیرابی حاصل کرتے، اور کم ازکم نظریاتی طور پر ان اوصاف سے اتفاق کرتے جنہیں قرآن کریم نے خلافت ارضی کے لئے ضروری قرار دیا ہے، لیکن افسوس ہے کہ نظریاتی طور پر ان کی قربت کمیونزم سے زیادہ ہے۔

نظریۂ قومیت واشتراکیت اور فلسطین

مسئلہ فلسطین کو اسلامی رنگ دینے سے گریز کے بعد اگر اسے اس کی انسانی حیثیت پر باقی رکھا جاتا تو یہ بات کسی حد تک قابل قبول ہوتی لیکن اسے اشتراکیت یا قومیت کے تنگ دائرہ میں محصور کرنے کی کوشش کی گئی جس سے اس مسئلہ کو زبردست ٹھیس پہونچی، اور اس کے بید خراب نتائج سامنے آئے، اس مسئلہ کی سمت اور رخ کو متعین کرنے میں جو بنیادی غلطی ہوئی تھی اسی کا نتیجہ تھا، کہ ایران عراق جنگ میں بعض لیڈروں نے اس مسئلہ کو عرب دنیا میں اپنی مقبولیت کے لئے پورے طور پر استعمال کیا، اور سرکردہ فلسطینی لیڈروں نے ان کا بڑی شدومد سے ساتھ دیا، لیکن آہستہ آہستہ جب ایرانی انقلاب کے اصلی خدوخال سامنے آگئے، تو پتہ چلا کہ آل نقلاب کے ہاتھوں اس مسئلہ کا حل ممکن نہیں، فلسطینی رہنما اگر مسئلہ فلسطین کی صحیح بنیاد سے واقف ہوتے تو کم ازکم اس مسئلہ کے حل کے لئے عقیدہ تشیع سے کسی طرح کی توقع وابستہ نہ کرتے، مگر جیسا کہ ہم نے تمہیدی سطور میں اشارہ کیا، ملت کے افراد اعتقادی مسائل میں ایسی بصیرت کے مالک نہیں ہیں جس سے روشنی حاصل کرکے وہ اپنی راہ متعین کریں، بلکہ اس کے برعکس وہ کسی راہ

سفر شروع کرنے کے بعد اس کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں، یا کسی دوسرے کے فیصلے اس راہ کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں۔

خلیجی بحران اور فلسطین

مسئلہ فلسطین کی بنیاد و سمت متعین کرنے کے سلسلہ میں ذمہ دار لیڈروں سے جو غلطی ہوئی اس کا ایک واضح نتیجہ ہمیں خلیجی بحران کے موقع پر نظر آیا، جب عراق نے انتہائی جارحانہ طور پر کویت پر قبضہ کر لیا اور مختلف مسلم وغیر مسلم ملکوں کی طرف سے کویت کی آزادی کا مطالبہ شروع ہوا تو عراقی صدر نے کویت کی آزادی کے مسئلہ کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ جب تک اسرائیل مقبوضہ عرب علاقوں کو واگذار نہ کرے گا اس وقت تک کویت خالی نہ کیا جائے گا۔

عراقی صدر کی اس وضاحت پر فلسطینی لیڈر بے حد خوش ہوئے، اور کھلے طور پر ان کی تائید شروع کر دی، فلسطینی لیڈر اور فلسطینی عوام دونوں کو عراقی صدر سے امید تھی کہ ان کے قدیم اور الجھے ہوئے مسئلہ کو وہ حل کرا دیں گے، اردن کے شاہ حسین اپنے ملک کی جغرافیائی حیثیت یا اقتصادی و عسکری مجبوری کی وجہ سے عراقی صدر کے ساتھ ہو گئے، جبکہ تقریباً بیس سال قبل انہوں نے اپنے ملک میں فلسطینی عوام کو زبردست نقصان پہونچایا تھا۔ عراقی صدر کی تائید میں بعض معروف مسلم جماعتیں بھی سرگرم ہو گئیں، اور شاید یہ سمجھ لیا کہ اب فلسطین کی آزادی اور امت اسلامیہ کے دیگر پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کا وقت آگیا ہے، اور اس کے لئے جس مخلص و عظیم لیڈر کی ضرورت تھی وہ امت کو مل گیا ہے۔ فلسطین کے مسئلہ میں وہاں کے عوام اور پوری دنیا کے مسلمانوں کو انتظار کے جس شدید کرب سے دوچار ہونا پڑا، اور جس طرح سے امریکہ، روس اور دیگر متعلقہ مغربی و مشرقی ممالک نے ظالمانہ طور پر اس مسئلہ کو معلق رکھا اس کے پیش نظر امت کے ایک طبقہ نے جس عجلت پسندی و بے صبری کا مظاہرہ کیا وہ قرین قیاس ہے، جب انسان کسی مسئلہ پر سوچتے سوچتے تھک جاتا ہے، اور وہ حل نہیں ہوتا تو اس کے لئے وہ کبھی نامناسب راہ بھی اختیار کر لیتا ہے، فلسطینی عوام کے ساتھ یہی صورت پیش آئی، لیکن یہ مسئلہ فلسطینی لیڈروں کے غور کرنے کا تھا، اسی طرح جن مسلم جماعتوں نے عراقی موقف کی تائید کی ان کے تدبر و اسلام پسندی کی بھی یہ آزمائش تھی۔ فلسطین جیسے اہم مسئلہ کو اگر اس طرح کے غیر دانشمندانہ اور جذباتی اقدام سے حل کیا جا سکتا تھا تو پھر اس کے لئے اس قدر طویل انتظار کی ضرورت کیا تھی؟

جہاد کا نعرہ

عراقی صدر نے کویت پر قبضہ کے بعد جب فلسطین کی آزادی اور یہودیت و نصرانیت کے خلاف اسلامی جہاد کا نعرہ بلند کیا تو بالکل منطقی طور پر یہ سوال پیدا ہوا کہ مذکورہ دونوں مسئلے کویت پر قبضہ سے کیسے مربوط ہو گئے؟ اگر ہم اسلامی شریعت کی پابندی کرتے ہوئے یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف جنگ میں کود رہے ہیں، اور فلسطینی عوام

کے وطن کی آزادی بھی ہمارا مدعا ہے، تو پھر کویت جیسے مسلم پڑوسی ملک کے سلسلہ میں ہم اپنے آپ کو اسلامی شریعت کی پابندی سے کیوں آزاد کر رہے ہیں؟

اسلامی شریعت کی پابندی کا تقاضا بلکہ اسلام کا واضح مطالبہ تو یہ ہے کہ حق و صداقت اور عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے خواہ معاملہ اپنوں کے ساتھ ہو یا بیگانوں کے ساتھ، اور ایسا کرنے میں خواہ فائدہ ہو یا نقصان، ملاحظہ ہو سورۂ مائدہ آیت نمبر ۸ ۔

مسئلہ فلسطین یا یہودیت و نصرانیت کے خلاف جہاد کا اسلامی شریعت کی رو سے کویت پر قبضہ سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں، نہ کسی طرح کی سیاسی و جنگی حکمت عملی اس نوعیت کے کسی تعلق کی متقاضی ہے، لہٰذا امت اسلامیہ اگر عراقی نظام حکومت کے مذکورہ اقدام کو مسترد نہیں کرتی تو اس کا یہ موقف اسلامی احکام سے ناواقفیت کی کھلی دلیل ہے، اور جو لوگ اس طرح کے کسی اقدام کا ساتھ دیتے ہیں وہ بھی اسلام کے اصول انصاف کو مجروح کر رہے ہیں ۔

عراقی نظام نے کویت پر اپنے قبضہ کو اسلامی رنگ دینے کی جو کوشش کی اسے خود عراقی عوام کی جانب سے سہارا نہ مل سکا، یہ اقدام اگر اسلامی جذبہ کے نتیجہ میں سامنے آیا ہوتا تو عراقی حکومت اپنے عوام کے ساتھ بھی اسی جذبہ کی بنیاد پر معاملہ کرتی لیکن جنگ میں عراق کی شکست کے بعد جو صورت حال سامنے آئی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عراقی عوام اسلام کے سلسلہ میں خود اپنی حکومت سے مطمئن نہ تھے، اسی لئے اُمراز عراقی حکومت کی گرفت جونہی کچھ ڈھیلی ہوئی انہوں نے بغاوت کا سلسلہ شروع کر دیا، اس صورت حال سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامیت کا نعرہ کسی سوچے سمجھے منصوبہ یا سچے جذبہ کی پیداوار نہ تھا، بلکہ اس نام کے ذریعہ جارحیت کے لئے وجہ جواز پیدا کرنا مقصود تھا، لیکن اس میں کامیابی نہ ہو سکی ۔

اَمریکہ کا جابرانہ رویّہ

مسئلہ فلسطین کے ساتھ بالخصوص اور کمزور مسلم و غیر مسلم ممالک کے ساتھ بالعموم امریکہ کا جابرانہ رویہ کسی ثبوت کا محتاج نہیں، اس نے اسرائیل کی بقا کا ذمہ لیا ہے، اور اس کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے پر آمادہ ہے، فلسطین کے مجبور و مقہور عوام کے مقابلہ میں اسے اسرائیل کی غاصبانہ حکومت اور اس کے جارحانہ عزائم کا زیادہ لحاظ ہے، اس سلسلہ میں وہ بسا اوقات عدل و انصاف کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے ۔ اس طرح کی جابر و جانبدار حکومت کو اگر مسلم ممالک اپنی طاقت و بصیرت سے زیر کر سکیں تو یہ نہایت خوش کن امر ہوگا، لیکن اگر اس طرح کے طاقت ور اور جابر ملک کو صرف للکار کر پیچھے ہٹنے کی پالیسی اختیار کی جائے تو اس میں نقصان ہی نقصان ہوگا، خلیجی بحران کے موقع پر اس بات کو سب نے محسوس کیا کہ عراقی نظام نے اپنے اسلامی مقاصد کے حصول کے لئے کوشش کا آغاز مسلم ممالک

مابین تفریق اور ایک مسلم ملک پر غاصبانہ قبضہ سے کیا، جب کہ امریکہ نے عراق سے زیادہ طاقت ور ہوتے ہوئے بھی اپنے ساتھ
پیاتیس مسلم و غیر مسلم ملکوں کو شامل کیا، فریقین کی حکمت عملی ہمارے سامنے ہے، اس کی روشنی میں ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ مسلم
یر مسلم حکمرانوں کے مابین کس نوعیت کا فرق ہے، اور عوام پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

خلیجی بحران کے موقع پر مسلم رائے عامہ کے امریکہ کے خلاف ہونے کا تجزیہ کرتے ہوئے اس پہلو کو سامنے رکھنا ضروری
، کہ تیسری دنیا کے بیشتر ملکوں میں کمیونزم کا نمایاں اثر ہے، اور جو لوگ کمیونزم سے متأثر ہیں ان کو امریکہ کے مقابل میں روس
ہمدردی ہے، اس لئے جب کسی معاملہ میں امریکی فوجی طاقت کا مظاہرہ ہوتا ہے تو اشتراکیت پسند طبقہ میں امریکہ خلاف
جانات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں، لیکن جب کسی معاملہ میں روس کی زبردستی اور جارحیت غالب آتی ہے تو اس کے خلاف
رت کے جذبات ہلکے ہوتے ہیں، ایشیا میں بنگلہ دیش اور افغانستان کے واقعات کو سامنے رکھ کر اس بات کی صداقت کا اندازہ
یا جا سکتا ہے۔

ان سطور کے اختتام پر ہم اس بات کا اعادہ ضروری سمجھتے ہیں، مسلمانوں کو اپنے جملہ مسائل حل کرتے ہوئے اپنے
ین و شریعت کا احترام ضروری ہے، اگر اسلامی شریعت سے آزاد ہو کر اپنے کسی مسئلہ کا کتنا ہی خوبصورت حل ہم تلاش کریں
س کے نتائج ہمارے حق میں بہتر نہ ہوں گے ــــــــــــ

۲۶ رشعبان ۱۴۱۱ھ

قارئین محدث کی خدمت میں

ماہنامہ محدث ہر ماہ پابندی سے آپ کے نام ارسال کیا جاتا ہے
اس لئے آپ سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اگر آپ کے ذمہ ماہنامہ
خریداری کی رقم باقی ہے تو براہ کرم پہلی فرصت
میں بھیجنے کی زحمت کریں۔

(ادارہ محدث)

ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبدالجبار الفریوائی

اسلامی علاقہ کو عراقی نظام کے شر و فساد سے نجات دلائیں

عراقی اسلامی مزاحمتی تحریک کی اپیل

صدام حسین کے ذرائع ابلاغ نے ایک مدت سے جہاد کا پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے۔ نام نہاد مؤتمر اسلامی کا انعقاد بھی ہوا ہے۔ ں پروپیگنڈہ کے توڑ کے لئے عراق کی اسلامی حزب مخالف نے ایک اپیل جاری کی ہے، اور بعثی کمیونسٹ عراقی نظام کے اسلام کے جھوٹے لووں اور مسلمانوں کے مصالح و مفادات کے جھوٹے پروپیگنڈے کا پول کھولا ہے۔

اسلامی حزب اختلاف نے عراق کے صدر صدام حسین کے علمارِ دین اور مفکرین اسلام کے تختۂ دار پر چڑھا دینے، اور ان کے خون ے ہولی کھیلنے کے مجرمانہ اقدامات سے بھی پردہ اٹھایا ہے، عالمی طاقتوں کے خلاف صدام کے اعلانات و اتہامات کی بھی قلعی کھولی ہے، ر واضح کیا ہے کہ عالمی اتحادی طاقتوں کو خلیجی خطہ میں در اندازی کی دعوت دراصل عراق ہی نے دی ہے، ذیل میں اسلامی حزب اختلاف بیان درج کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسلمانانِ عالم! بغداد میں ایک نام نہاد قومی اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی ہے، جس میں صدام حسین کی دعوت پر بعض ماراور اسلامی جماعتوں نے شرکت کی ہے، یہ کانفرنس خلیجی خطہ میں غیر مسلم افواج کے اجتماع کے خلاف بلائی گئی ہے، اس کانفرنس کا نعقاد اسلام دشمن صلیبی میشائیل عفلق کی بنائی ہوئی اسلام دشمن عراقی بعثی (اشتراکی) پارٹی کی حکومت نے بلائی ہے، جب سے اس رٹی کے ہاتھ میں عراق کی زمام اقتدار آئی ہے، اس نے اسلام، علماء اسلام، اسلامی تحریکوں و جماعتوں، اور دوسری مسلم تنظیموں اور اہب کے خلاف کھلم کھلا جنگ چھیڑ رکھی ہے، اس حکومت نے ایران کے خلاف جنگ چھیڑ کر نسلوں کو تباہ کیا، فصلوں اور کھیتوں کو ہس نہس کیا، دس لاکھ انسانی جانوں کے ضیاع، عالمی صہیونیت اور عالمی صلیبیت سے پنجہ آزمائی کرنے والی امت مسلمہ کی امکانی

طاقت کو برباد کرنے کے بعد اب اس حکومت کے صدر صدام حسین نے محرم الحرام ۱۴۱۱ھ کو اپنے پڑوسی اسلامی عربی محسن ملک کویت پر قبضہ کرکے ایک دوسری جنگ کا آغاز کر دیا ہے، کویت کے مسلمانوں کے خلاف اس یلغار میں لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری، مارپیٹ، خانماں بربادی اور غصب کے جرائم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔

ہم آپ کے سامنے اس عراقی بعثی حکومت کے جرائم کا ایک اجمالی خاکہ پیش کر رہے ہیں جس کا دائرہ صرف عراقی مسلمانوں تک محدود نہیں، بلکہ پورے اس علاقہ کے مسلمانوں اور انسانوں پر محیط ہے۔

۱۔ ۱۹۶۸ء کے انقلاب کے نتیجہ میں صدام کے ہاتھ میں جب عراق کی زمام اقتدار آئی تو اسی وقت سے اسلامی اور دینی کتابوں کے پڑھنے، اور اس کی نشر و اشاعت پر پابندی لگادی گئی، اور دین کو سیاست سے جدا کرنے کا نعرہ دیا گیا۔ خود صدام نے دین اسلام میں مداخلت کی، اور اسلامی روح اور اسلامی عقیدہ کے خلاف آرار و افکار کا اظہار کیا۔

۲۔ عراقی اشتراکی حکومت نے علمار دین اور مفکرین اسلام کے خلاف اعلان جنگ کر دیا، سیکڑوں علمار کو پھانسی دیدی گئی، یہ سلسلہ عراق تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ عراق سے باہر بھی عراق کے جاسوسی اداروں نے اپنے مجرمانہ ہاتھ پھیلائے اور بیروت میں سید حسن شیرازی کو، اور خرطوم (لیبیا) میں مہدی الحکیم کو، اور امارات عربیہ متحدہ خلیج میں الحاج سہل محمد حلبون اور دوسرے نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس وقت بھی ہزاروں علمار، مسلم نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اور بچے عراقی جیلوں میں موت و حیات کی کشمکش میں زندگی گذار رہے ہیں۔

۳۔ عراقی حکومت نے اب تک ۵ لاکھ عراقی مسلمانوں کو اس دلیل سے ملک بدر کر دیا ہے کہ وہ ایرانی نژاد ہیں، اور ان کے مال و جائیداد کو سلب کر لیا اور ان کے بچوں کو گرفتار کر لیا ہے جن کے بارے میں اب تک کچھ نہیں معلوم ہو سکا ہے۔

اس نظام حکومت نے اپنے ظلم و جور اور دہشت گردی سے ۱۰ لاکھ عراقی مسلمانوں کو دنیا کے مختلف علاقوں میں رفوجیوں کی طرح رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔

۴۔ صدام حسین نے عراقی کردستان اور جنوب اہواز کے سنی مسلمانوں پر کیمیاوی اسلحے کا استعمال کیا، جس کے نتیجے میں کم از کم دس ہزار مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔

۵۔ صدام اور اس کے نظام حکومت نے فوجی، سیاسی اور ذرائع ابلاغ ہر طریقے سے لبنان میں مسلمانان بیروت کے خلاف صہیونی نظام (اسرائیل) کی حلیف صلیبی مارونی سیاسی قوت کا ساتھ دیا۔

۶ ۔ صدام کی حکومت نے عراق کے اندر فتنہ وفساد اور بداخلاقی وبے حیائی کی اشاعت کی، شراب کی فیکٹریاں بنائیں، اور ہر جگہ شراب کی دکانیں کھولیں، ان شراب خانوں کی تعداد مساجد کی تعداد سے زیادہ ہے ۔

اسی طرح سے اس حکومت نے دین سے تعلق رکھنے والے مسلم خاندانوں کو منتشر کیا، اور اسلام سے دور نسلی بنیادوں پر ایک قانون صادر کیا جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے وہ اپنی مطلقہ بیوی کے نان نفقہ کا ذمہ دار ہوگا ۔

بستر ادر ان اسلام ! عراقی نظام حکومت جب کسی مشکل میں پھنستا ہے تو اس طرح کی اسلامی کانفرنسوں کے انعقاد میں اپنی پناہ ڈھونڈتا ہے ، ماہ محرم الحرام میں اس دفعہ جو اس نے اسلامی کویت کو ہڑپ کر لینے کا مجرمانہ اقدام کیا ہے اس جرم سے اسلامی اقوام کو غافل کرنے اور صرف نظر کرنے کے لئے اس کانفرس کا سوانگ رچا ہے ۔

اجنبی طاقتوں کے خلاف نام نہاد حملہ کو یہ بات جھٹلا دیتی ہے کہ حقیقی معنوں میں عراق خود ان طاقتوں کے خلیج میں در آنے کا سبب ہے خود عراق نے تین سال قبل عراق اور خارج عراق میں اسلامی رو کے مقابل اپنے نظام حکومت کو سقوط سے بچانے کے لئے باہری طاقتوں کا سہارا لیا تھا، اس کانفرنس سے قبل صدام حسین مسلم ایران کے خلاف اپنی جنگ کے جواز کے اثبات کے لئے اس طرح کی کانفرنسیں منعقد کر چکے ہیں، اس وقت دوبارہ کویت کے ہڑپ لینے اور اس کے اہالیان کو قتل کرنے کے بعد اس کے جواز کے لئے اس کانفرنس کا ڈھونگ رچا رہے ہیں ۔

ہم اس وقت بڑی سخت ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ایک اسلامی کانفرنس کا انعقاد کیا جائے، جس میں اسلام کے حقیقی علماء ومفکرین حاضر ہوں اور اسلام اور مسلمانوں کے خلاف صدام حسین کے مجرمانہ کارناموں کا محاکمہ کریں، اور اسلامی علاقہ کو اس کے فتنہ وفساد اور شر سے بچانے کی تدبیر کریں، اور عراقی قوم اور اس کی اسلامی طاقتوں اور تحریکوں کو اس موجودہ نظام اور کویت پر اس کے قبضہ اور ساری دنیا میں اس کے جرائم کے خاتمہ کے لئے ان اسلامی تحریکات کو تعاون دیں، اور صہیونی دشمن اور اس کے حلیف عالمی صلیبیت کے خلاف اسلامی طاقتوں کے اتحاد کی سعی کریں ۔

(اسلامی حزب مخالف عراق)

۔ بشکریہ ہفت روزہ دعوت ۲۴ جنوری ۱۹۹۱ء ۔

: ترجمہ :

(ڈاکٹر عبدالرحمان بن عبدالجبار الفریوائی)

مجلسِ مذاکرہ

منعقدہ جامعہ سلفیہ بنارس

آج مورخہ ۲۴ شعبان المعظم ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۹۹۱ء بعد نماز عشاء جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب میں ایک عظیم الشان مجلس مذاکرہ کا انعقاد زیر صدارت جناب مولانا عبدالوحید صاحب رحمانی شیخ الجامعہ منعقد ہوا، جس میں جامعہ کے اساتذہ وطلبہ اور ذمہ داران، نیز جامعہ کی شاخوں کے اساتذہ اور طلبہ وذمہ داران، اور اہل بنارس ومضافات بنارس کی ایک بھاری تعداد نے شرکت کی۔

جلسہ کی کارروائی مولوی محفوظ الرحمن سلفی مئوی کی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوئی، تمہیدی اور تعارفی تقریر جناب ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری وکیل الجامعہ نے مذاکرہ کے انعقاد پر روشنی ڈالتے ہوئے مسئلہ خلیج کے اہم نکات پر روشنی ڈالی۔

اس مجلسِ مذاکرہ میں جناب مولانا عبدالوہاب حجازی (ایڈیٹر ماہنامہ محدث اور استاذ جامعہ) نے ام المعارک (ام الہزائم) یا حسین فتح کے موضوع پر اس جنگ کے منظر اور پس منظر اور مستقبل پر روشنی ڈالتے ہوئے برے اثرات کا فکر انگیز جائزہ لیا۔

پھر مہمان خصوصی جناب مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی جھنڈانگری ناظم اعلیٰ جامعہ سراج العلوم وممبر رابطہ عالم اسلامی نے " ایمان وتقویٰ " کے موضوع پر بڑی مؤثر اور پرمغز تقریر فرمائی۔

ان کے بعد جناب مولانا عبدالسلام مدنی استاذ جامعہ سلفیہ نے " ایمان اور آزمائش " کے موضوع پر خطاب فرمایا، اور موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کتاب وسنت کی روشنی میں اپنی زندگی استوار کرنے کی ہدایت کی۔

ان کے بعد جناب مولانا محمد رئیس صاحب ندوی استاذ جامعہ سلفیہ بنارس نے کفار سے موالات وترک موالات، اور اضطراری صورت میں متنوع تعاون کے موضوع پر کتاب وسنت، آثار خلفاء وصحابہ وتابعین کی روشنی میں مفصل تقریر کی اور موضوع کے نئے اور اہم گوشوں کی طرف اشارہ کیا۔

آخر میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن صاحب نے مسئلہ فلسطین کی اہمیت اور اس کے سلسلے صحیح موقف اختیار کئے جانے کی بابت
مزید چند معروضات پیش کیں ۔ اور اختتام اجلاس سے قبل ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی استاذ جامعہ نے قرارداد و تجاویز
پڑھ کر سنائی جن کو مختصراً یہاں درج کیا جاتا ہے ۔

۱ ۔ یہ اجتماع خلیجی بحران کی اس المناک صورت حال کا ذمہ دار عراقی نظام حکومت کو ٹھہراتا ہے ، جس سے ملت اسلامیہ کے عظیم
مقاصد اور اسلامی تعلیمات و اخلاق کو ٹھیس پہونچی ہے ۔

۲ ۔ عراق کی حکمراں بعث پارٹی اور اس کے صدر کو ملت اسلامیہ کے مقاصد سے اپنے طویل دور حکومت میں کوئی دلچسپی نہ تھی ، اسلئے
آزادی فلسطین اور دولت کی مساویانہ تقسیم کے جو نعرے بلند کئے گئے ان کا مقصد اپنی جارحیت کو چھپانا تھا ۔

۳ ۔ سعودی عرب نے حرمین شریفین میں قیام امن ، حجاج کرام کیلئے سہولتوں کی فراہمی اور اسلامی شریعت کے نفاذ ، اور ساری دنیا
میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں جو زبردست خدمات انجام دی ہیں ، اسی طرح کویت کی حکومت اور عوام نے جو نمایاں خدمات انجام
دی ہیں ، اور جس کے ساری دنیا میں اثرات نمایاں ہیں ، یہ اجتماع امید کرتا ہے کہ مستقبل میں یہ دونوں ممالک ، اور دوسرے اسلامی و عربی ممالک
دعوت و تبلیغ کو اہمیت دیں گے ، اور اس کو وقت کی سب سے اہم ضرورت تصور کرتے ہوئے اس پر توجہ صرف کریں گے ۔

۴ ۔ یہ اجتماع اسلامی ملکوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اسلامی شریعت کے نفاذ اور اسلامی تہذیب و تمدن کی بالادستی ، نیز
اسلامی عدل و انصاف کے قیام کے لئے غیر معمولی کوشش کریں تاکہ موجودہ انسانی معاشرہ کی بے چینی و بدامنی ختم ہو ۔

۵ ۔ خلیجی بحران سے امت اسلامیہ کا جو ذہن سامنے آیا ہے اس کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ اجتماع ضروری سمجھتا ہے کہ سعودی عرب
اور کویت کی حکومتیں اپنے ذرائع ابلاغ کو کام میں لاکر مسلم عوام کو صحیح صورت حال سے باخبر کریں ۔

۶ ۔ خلیجی بحران پر امت اسلامیہ کے ردعمل کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ اجتماع پوری مسلم برادری سے توقع رکھتا ہے کہ وہ مسرت
و مصیبت کے مواقع پر اپنے رویے میں ایسی سنجیدگی پیدا کریں جس سے اسلامی اخلاق و تہذیب کی عکاسی ہو ۔

۷ ۔ یہ اجتماع جنگ کے اختتام پر مغربی فوجوں کے خلیجی خطہ سے انخلاء کا مطالبہ کرتا ہے ، نیز مشترکہ اسلامی افواج کی تشکیل
کی ضرورت پر زور دیتا ہے ۔

۸ ۔ یہ اجتماع مطالبہ کرتا ہے کہ تمام مسلمان اسلامی تعلیمات و احکام کی سختی سے پابندی کریں ، اور توبہ و انابت کریں ،
صبر و ضبط سے کام لیں ، اور اسلامی اخلاق و آداب کا مظاہرہ کریں ۔

۹ ۔ جنگ کی زبردست تباہی و بربادی کے پیش نظر یہ اجتماع ضروری سمجھتا ہے کہ تمام مسلم ممالک اسلامی اخوت

ہمدردی اور ایثار و قربانی کے جذبہ سے کام لیتے ہوئے علاقہ کے عوام کی بازآبادکاری کے لئے ممکنہ وسائل کو کام میں لائیں، تاکہ مصیبت زدہ عوام کی دل جوئی ہو سکے۔

۱۰۔ یہ اجتماع کویت کی آزادی اور جنگ کے خاتمہ پر خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز اور امیر کویت کو مبارکباد پیش کرتا ہے، اور یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ مسلم امت کے بارے میں اپنی سابقہ روایات پر برقرار رہیں گے۔

۱۱۔ بابری مسجد سے خلیجی بحران تک ملکی صحافت نیز اردو صحافت نے جس غیر ذمہ دارانہ رویئے کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے پیش نظر یہ اجتماع ملکی ذرائع ابلاغ، اور بالخصوص اردو صحافت کے ذمہ داروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ جملہ ملکی و ملی مسائل میں عوام کی صحیح رہنمائی کا فرض انجام دیں۔

۱۲۔ یہ اجتماع مطالبہ کرتا ہے کہ ملک کے اہل اقتدار، و اہل انصاف بابری مسجد کے مسئلہ کو صحیح تاریخی شواہد کی روشنی میں حل کرنے کی یقین دہانی کرائیں، اور مسلمانوں کو جمہوری دستور پر مبنی تمام حقوق سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں، نیز امن و امان کی ایسی فضا قائم کریں جس کی ہندوستان جیسے عظیم جمہوری ملک میں توقع کی جاسکتی ہے۔

قرارداد و تجاویز

مجلس مذاکرہ منعقدہ جامعہ سلفیہ بنارس!

بتاریخ ۲۲ شعبان ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۰ مارچ ۱۹۹۱ء

الحمد للہ رب العالمین ، والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم ، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین ، أمّا بعد !

اسلامی اخوت کے جس زریں اصول کی جانب قرآن کریم نے ہماری رہنمائی کی ہے اس کے پیش نظر عالم اسلام کے ہر واقعہ سے ملت کے تمام افراد کا خواہ وہ دنیا کے کسی بھی حصہ میں سکونت پذیر ہوں ، متاثر ہونا ضروری ہے ، حرمین شریفین کی مقدس سرزمین دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے جان سے زیادہ عزیز ہے ، اس لئے اس سرزمین کا تقدس اور امن وامان ہر قیمت پر انھیں مطلوب ہے ۔

لیکن بدقسمتی سے عراق کے جابر نظام حکومت نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے کویت پر ۲ راگست ۱۹۹۰ء کو قبضہ کرنے کے بعد سرزمین حرمین کی محافظ حکومتِ سعودی عرب کے لئے بھی خطرات پیدا کردیئے ، اور کھلے طور پر اس بات کی دھمکی دی کہ اس کا اگلا نشانہ سعودی سرزمین ہے ، اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے خلیجی ممالک مختلف مسلم ممالک اور مغربی ممالک سے امداد حاصل کرنے پر مجبور ہوگئے اس پیچیدہ صورت حال میں مسلمانوں کی رہنمائی اور عراقی جارحیت سے پیدا ہونے والے خطرناک اثرات ونتائج سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے کے لئے جامعہ سلفیہ نے اپنے عربی و اردو ماہناموں میں متعدد مقالات ، اور مستقل رسائل شائع کئے ، اور ساتھ ہی متعدد اجتماعات منعقد کئے ، آج کا یہ اجتماع بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے ، اس نوعیت کی کوششوں سے خلیجی بحران کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد ملی ، اور ان پروپیگنڈے کا سدباب ہوا جو عراقی جارحیت کے خلاف آواز بلند کرنے والے ممالک اور افراد کے خلاف پھیلائے جارہے تھے ۔

کویت پر عراقی قبضہ کو جس طرح پوری دنیا کی مسلم وغیر مسلم حکومتوں اور انصاف پسند عوام نے کھلی جارحیت قرار دیا ، اسی طرح انہوں نے سعودی عرب کی امن پسند ، ومقبول عوام حکومت کے خلاف عراق کے جارحانہ عزائم کی بھی بھرپور مذمت کی ساتھ ہی طمانی

بین الاقوامی سطح پر اس بات کی انتھک کوشش کی گئی کہ کویت سے عراق کا جارحانہ قبضہ ختم ہو جائے، اور سعودی عرب کی سرحدوں سے عراقی فوجیں واپس چلی جائیں، لیکن ان تمام کوششوں کا الٹا اثر ہوا، اور عراقی نظام حکومت نے ضد اور عناد کی پالیسی جاری رکھی اور اپنے جارحانہ عزائم کو صحیح ثابت کرنے کے لئے غلط دلائل اور کھوکھلے نعروں کا سہارا لینے کی کوشش کی۔

عراقی نظام حکومت کویت سے تخلیہ پر جب کسی بھی طرح راضی نہ ہوا تو خلیجی ممالک اور ان کے معاون ملکوں نے عراق کو ۱۵ر جنوری ۹۱ء تک کی مہلت دی کہ وہ اس تاریخ تک کویت سے اپنی فوجیں واپس بلالے، اسی دوران مسئلہ کو پر امن طور حل کرنے کے لئے اعلیٰ سطح پر کوششوں کا سلسلہ بھی جاری رہا، لیکن عراقی نظام حکومت نے پہلے سے زیادہ ضد اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے خلیجی ممالک اور ان کے معاونین کو جنگ کی دعوت دینا شروع کر دیا۔

جب تمام مصالحانہ کوششیں ناکام ہو گئیں تو مجبوراً جنگ شروع ہوئی، جنگ کے ابتدائی ایام میں عراقی نظام حکومت نے اپنے خلاف صف آرا مسلم و غیر مسلم فوجوں کو شدید قسم کی دھمکیاں دیں، اور اپنی برتری و کامیابی کے کھوکھلے دعووں کے ذریعہ پوری دنیا اور بالخصوص عراقی عوام کو زبردست دھوکے میں رکھا، تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد عراق کی شکست پر جنگ کا اختتام ہوا، اور عراقی نظام نے کویت و عراق کی زبردست تباہی، اور شدید جانی، مالی نقصان کے بعد ان تمام شرائط کو تسلیم کر لیا، جنہیں جنگ سے قبل مسترد کرنے پر وہ اڑا ہوا تھا۔

۱۔ خلیجی بحران کی اس المناک صورت حال پر نظر ڈالتے ہوئے جامعہ سلفیہ کا یہ اجتماع محسوس کرتا ہے کہ عراقی نظام حکومت نے اپنے جارحانہ و غیر دانشمندانہ اقدام سے ملت اسلامیہ کے عظیم مقاصد، اور اسلامی تعلیمات و اخلاق کو زبردست ٹھیس پہونچائی ہے اور خود عراقی عوام کے لئے بھی مشکلات و مصائب کا ایک غیر متناہی سلسلہ پیدا کر دیا ہے۔

۲۔ تاریخ بتاتی ہے کہ عراق کی حکمراں "بعث پارٹی" اور عراقی صدر صدام حسین کو ملت اسلامیہ کے مقاصد سے اپنے طویل دور حکومت میں کوئی دلچسپی نہ تھی، اور نہ ہی اس سلسلہ میں انہوں نے کبھی کوئی اقدام کیا تھا۔

اس لئے اجتماع محسوس کر رہا ہے کہ کویت پر جارحانہ قبضہ کے بعد عراقی نظام نے فلسطین کی آزادی، اور دولت کی مساویانہ تقسیم کے جو نعرے بلند کئے تھے، ان سے ان کا صرف یہ مقصد تھا کہ ان خوبصورت نعروں کے پردہ میں اپنی جارحیت کو چھپالیں۔

عراقی صدر کے اس غیر دانشمندانہ اقدام سے مسئلہ فلسطین کو جو شدید نقصان پہونچا ہے، اس پر یہ اجتماع اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے مسلم عوام سے امید رکھتا ہے کہ وہ اس طرح کے کھوکھلے نعروں سے ہوشیار رہیں گے۔

۳۔ سعودی عرب اور دیگر مسلم و عرب ممالک تمام دنیا کے مسلم عوام کی امیدوں اور تمناؤں کا مرکز ہیں، اس لئے یہ اجتماع ضروری

سمجھتا ہے کہ یہ ممالک مسئلۂ فلسطین و آزادیٔ بیت المقدس اور دیگر ملی مسائل کو حل کرنے کے لئے پوری توجہ اور کوشش صرف کر دیں، اور اقتصادی وعسکری لحاظ سے ایسی قوت پیدا کریں جس سے مسلم عوام کی تمنائیں پوری ہو سکیں۔

۴۔ سعودی عرب نے سرزمین حرمین میں قیام امن، حجاج کرام کے لئے سہولتوں کی فراہمی اسلامی شریعت کی تطبیق و تنفیذ اور دنیا میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کے سلسلہ میں زبردست خدمات انجام دی ہیں، اسی طرح کویت کی حکومت و عوام نے بھی اسلام کی خدمت واشاعت کے سلسلہ میں بڑی اعلیٰ مثال قائم کی ہے، ان ملکوں کی تبلیغی کوششوں کے اثرات اس وقت براعظم، ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکہ ہر جگہ محسوس کئے جا سکتے ہیں، خلیجی بحران کے بعد حالات یقیناً ناہموار ہو گئے ہیں، لیکن یہ اجتماع امید کرتا ہے کہ مذکورہ دونوں ملک اور اسی طرح دوسرے اسلامی ممالک بھی، اپنے پروگراموں میں دعوت وتبلیغ کے پروگرام کو سب سے زیادہ اہمیت دیں، اور اسے وقت کی سب سے اہم ضرورت تصور کرتے ہوئے اس پر توجہ صرف کریں۔

اسی طرح اجتماع یہ مطالبہ کرتا ہے کہ تمام مسلم ممالک اپنے اپنے علاقوں میں اسلامی شریعت کی تطبیق وتنفیذ اور اسلامی تہذیب وتمدن کی بالادستی، نیز سماجی عدل وانصاف کے قیام کے لئے غیر معمولی کوشش کریں تاکہ موجودہ انسانی معاشرہ کی بے چینی وبدامنی ختم ہو، اور لوگوں کو امن واطمینان کی زندگی میسر آئے۔

۵۔ خلیجی بحران کی پوری مدت میں، اور جنگ کے اختتام تک مسلمانوں کا ایک طبقہ کسی غلط فہمی، یا عناد و دشمنی کی بنیاد پر عراقی جارحیت کی زبردست حمایت کرتا رہا، اور اسلامی آداب واخلاق کا لحاظ کئے بغیر سعودی عرب اور دیگر مسلم ملکوں کے خلاف الزام تراشیوں میں لگا رہا، جس کی وجہ سے ایک طرف مسلمان خوش فہمی کا اور دوسری طرف انتشار وافتراق کا شکار ہوئے، مذکورہ طبقہ کے اس رویہ کی مذمت کرتے ہوئے یہ اجتماع ضروری سمجھتا ہے، کہ سعودی عرب اور کویت کی حکومتیں اپنے ذرائع ابلاغ کو کام میں لاکر مسلم عوام کو صحیح صورت حال سے باخبر کریں، اور ان کی بے بنیاد غلط فہمیوں کو دور کریں، اور تمام لوگوں کو یہ باور کرائیں کہ ان کا اقدام شریعت وقانون دونوں کے مطابق تھا۔

۶۔ خلیجی بحران کے دوران ملت اسلامیہ کے ایک معتدبہ طبقہ نے بعض مسلم ملکوں کے تئیں جس طرح نامناسب رویہ اختیار کیا، اسی طرح وہ مذکورہ بحران اور اس کے نتیجہ میں رونما ہونے والی جنگ سے متعلق خوش فہمیوں اور غلط اندیشیوں کا شکار رہا، عراقی نظام حکومت کے بلند بانگ دعووں نے اس کے لئے راستہ ہموار کیا، لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد یہ تمام خوش فہمیاں کالعدم ثابت ہوئیں، اور بڑا بول بولنے والوں کا سر نیچا ہو گیا، کسی مسلمان ملک یا فرد کے لئے ایسی صورت حال شرم وخفت کا باعث ہے، اس لئے اجتماع پوری مسلم برادری سے توقع رکھتا ہے کہ وہ مسرت ومصیبت کے تمام مواقع پر واقعیت پسندی کا ثبوت

یا، کسی طرح کے غلط پروپیگنڈے کا شکار نہ ہوں، حالات کا اندازہ لگانے میں فہم و بصیرت کا ثبوت دیں، اور اپنے رویئے سے ایسی سنجیدگی پیدا کریں جس سے اسلامی اخلاق و تہذیب کی عکاسی ہو۔

۷۔ عراقی جارحیت کے خاتمہ اور کویت کی آزادی کے بعد چونکہ مغربی فوجوں کی ضرورت باقی نہیں رہی، اس لئے یہ اجتماع ظاہر کرتا ہے کہ علاقہ سے تمام مغربی فوجیں اولین فرصت میں واپس چلی جائیں، اور علاقہ کے عوام اور حکومتوں کو یہ موقع فراہم رہے کہ وہ اپنی صوابدید سے اپنا نظام چلا سکیں، اور اگر علاقہ کے مسلم ممالک ضرورت محسوس کریں تو اپنی مشترکہ فوج تیار کرلیں جو علاقہ میں امن و امان کے تحفظ کے لئے کوشش کرے، تاکہ آئندہ ایسی صورت پیش نہ ہوسکے جس سے غیر علاقائی مداخلت کے لئے راستہ ہموار ہو۔

۸۔ موجودہ دور میں امت اسلامیہ کے احوال پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ مختلف علاقوں میں اس امت کے افراد کو گوناگوں مسائل و مشکلات کا سامنا ہے، اپنے اور بیگانے دونوں کی روش امت کے لئے سخت آزمائش کا سبب بن جایا کرتی ہے۔

ان مصائب سے نجات کے لئے یہ اجتماع ضروری سمجھتا ہے کہ تمام مسلمان اسلامی تعلیمات و احکام کی سچی پابندی کریں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ و انابت کے بعد اسلام کی مخلصانہ پیروی کا عہد کریں، صبر و ضبط سے کام لیں، اور ہمیشہ اسلامی اخلاق و آداب کا مظاہرہ کریں، اس کے بغیر مصائب و مشکلات کو دور کرنے کا کوئی دوسرا طریقہ نہیں۔

۹۔ خلیجی ممالک میں مسلم عوام کو اگست ۹۰ء سے فروری ۹۱ء تک سخت قسم کی ذہنی الجھنوں اور اندیشوں سے سابقہ رہا، اور عراقی نظام حکومت کی ناعاقبت اندیشی سے علاقہ میں زبردست تباہی و بربادی ہوئی، اب جب کہ جنگ بند ہو چکی ہے اور قیام امن کے امکانات روشن ہوگئے ہیں، یہ اجتماع ضروری سمجھتا ہے کہ تمام مسلم ممالک اسلامی اخوت و ہمدردی اور ایثار و قربانی کے جذبہ سے کام لیتے ہوئے علاقہ کے عوام کی بازآبادکاری کے لئے پوری کوشش کریں، اور اس مقصد کے لئے تمام ممکنہ وسائل کو کام میں لائیں تاکہ مصیبت زدہ عوام کی دل جوئی ہو سکے، اور علاقہ میں ہونے والی تباہی و بربادی کی تلافی ممکن ہو۔

۱۰۔ کویت کی آزادی اور عراقی جارحیت کے خاتمہ پر یہ اجتماع خادم الحرمین الشریفین ملک فہد بن عبدالعزیز اور امیر کویت شیخ جابر الاحمد الصباح کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے یہ توقع رکھتا ہے کہ دونوں حکمراں اپنی سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے دینی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی تمام میدانوں میں تعمیری کوششوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے، اور عوام کو اسلامی شریعت سے قریب لانے کے لئے ہر طرح کا جتن کریں گے۔

۱۱ ۔ موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ کی اہمیت و تاثیر مسلم ہے، چھوٹے بڑے تمام مسائل انھیں ذرائع کے سہارے ابھرتے اور ڈوبتے ہیں، بلکہ بعض اوقات یہ ذرائع حق کو باطل اور باطل کو حق بنادیا کرتے ہیں، جس سے عوام میں ذہنی انتشار اور گمراہی پیدا ہو جاتی ہے، ملک میں جب سے بابری مسجد کا مسئلہ پیدا ہوا ہے، اور خلیج کے علاقہ میں جب سے حالیہ بحران رونما ہوا ہے، ملکی صحافت کا رویہ افسوس ناک حد تک غیر ذمہ دارانہ بلکہ جانبدارانہ رہا ہے، اس لئے یہ اجتماع ملکی ذرائع ابلاغ بالخصوص اردو صحافت کے ذمہ داروں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ جملہ ملکی و ملی مسائل میں عوام کی صحیح رہنمائی کا فرض انجام دیں، اور کسی ایک طبقہ کے رجحان سے متاثر ہو کر حقائق کی پردہ پوشی نہ کریں تاکہ صحافت صحیح طور پر اپنے فرائض انجام دے سکے۔

۱۲ ۔ ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل، آزادی کے بعد برابر الجھتے جا رہے ہیں، ماضی قریب میں بابری مسجد کے مسئلہ کو شرپسند عناصر نے دوبارہ زندہ کر دیا ہے، جس کی وجہ سے ملت اسلامیہ کو شدید الجھنوں اور خطرات کا سامنا ہے، فرقہ پرست عناصر ملک کے جمہوری دستور کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمانوں کو ان کے بنیادی شہری حقوق سے محروم کرنے کے لئے کوشاں ہیں، ایسی صورت حال میں یہ اجتماع ملک کے اہل اقتدار و اہل انصاف سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ وہ بابری مسجد کے مسئلہ کو صحیح تاریخی شواہد کی روشنی میں حل کرنے کی یقین دہانی کرائیں، اور مسلمانوں کو جمہوری دستور پر مبنی تمام حقوق سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کریں، نیز امن وامان کی ایسی فضا قائم کریں جس کی ہندوستان جیسے عظیم جمہوری ملک میں توقع کی جا سکتی ہے۔

خلیجی بحران سے پیدا ہونیوالا ہوشربا مالی خسارہ

ڈاکٹر عبدالرحمان عبدالجبار الفریوائی

کویت پر عراقی قبضہ کے نتیجہ میں عربی اور اسلامی دنیا کو جس ہوشربا مالی خسارہ سے دوچار ہونا پڑا ہے اس سے متعلق
ـ عالمی ادارے نے جو رپورٹ شائع کی ہے اس کے دیکھتے ہی میرے ہوش اڑ گئے، اور میں پکار اٹھا کہ کاش صدام نے یہ جو کچھ کیا،
ں کو جنون اور پاگل پن کے علاوہ کیا اور کوئی نام دیا جاسکتا ہے، کیا دشمنان اسلام اس بحران سے سب سے زیادہ فائدہ نہیں
اٹھائیں گے، کیا صرف ہم عرب اور مسلمان ہی اس کا خسارہ اٹھائیں گے۔

رپورٹ میں ہے کہ اس وقت تک عراقی حملے سے کویت ۲۰ ملیار ڈالر سے زیادہ کا نقصان اٹھا چکا ہے، اور ان شاء
اللہ جب کویت کویتیوں کو مل جائیگا تو اس کی دوبارہ آبادکاری کے لیے اور عراق نے جن چیزوں کو برباد کر دیا ہے اس کی
صلاح کے لیے سو ملیار ڈالر سے زیادہ درکار ہوں گے۔

خود عراقیوں کا خسارہ کویتیوں سے کم کا نہیں ہوگا، پاکستان اور بنگلہ دیش بھی ۲ سے تین ملیار ڈالر تک کا خسارہ اٹھا چکے ہیں
مصر و سوڈان وغیرہ کی اسلامی اور عربی حکومتوں کا پاکستان و بنگلہ دیش سے کم نقصان نہیں ہوا ہے۔

بلکہ سارے غریب ممالک کو پٹرول کی قیمت بڑھ جانے کے سبب سخت خسارہ کا سامنا ہے، جس سے ان تمام
چیزوں کے دام خود بخود بڑھ جائیں گے جس کو ترقی پذیر ممالک ترقی یافتہ ممالک سے منگاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ساری دنیا میں بسنے والی مسلم اقلیتوں کو جو نقصانات ہوئے اور مادی و معنوی فوائد و تعاون کا جو سلسلہ
بند ہوا یہ سب صدام حسین کی مجنونانہ اور بچکانہ حرکات کی وجہ سے ہوا ہے۔ رپورٹ میں ہے کہ عراق نے جب سے پٹرول نکالنا
شروع کیا ہے اس وقت سے اب تک کی اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کا نصف حصہ ایران سے آٹھ سالہ جنگ میں ضائع کر چکا ہے،
اور اس کے بعد ان تمام دعوؤں سے تنازل کر لیا ہے جس کے سبب اسنے ایران کیخلاف جنگ چھیڑی تھی، اور عراق و ایران کے
مابین جزائر اتفاقیہ پر بالخصوص شط العرب کے پانی کی تقسیم پر اتفاق کر لیا ہے۔

کیا ان آسمان سے باتیں کرنے والے مالی اعداد و شمار کا حقدار مسلمانوں سے زیادہ کوئی اور تھا، کیا ہماری مسلم
اقوام اپنی ضروریات کو پورا کرنے کی اس سے زیادہ مستحق نہیں تھی، کہ اس عظیم سرمایہ کو مجنونانہ جنگوں کی نذر کر دیا جائے؟

تعجب کی بات یہ ہے کہ جس صدام حسین کے ذریعہ اتنا بڑا سرمایا ضائع ہو گیا وہ آج عالمی پٹرول کے سرمایہ کی تقسیم کا مطالبہ فرما رہے
ہیں۔ یہ کس طرح کا تناقض ہے؟ عراقی قوم سب سے زیادہ مستحق ہے کہ وہ اپنے صدر کو سزا دے، اسکا محاسبہ کرے کیونکہ اس نے اسکا مال ۱۲ سال سے
ضائع کیا، اور ایسی جنگوں اور کشمکشوں کے جال میں اسکو پھنسا دیا جس میں عراق کا کوئی فائدہ نہیں۔

ماہنامہ

محدث

بنارس

شمارہ ۵ ☆ مئی ۱۹۹۱ء ☆ شوال ۱۴۱۱ھ ☆ جلد ۱۲

اس شمارہ میں

مدیر
عبدالوہاب حجازی

پتہ
دار التالیف والترجمہ
بی ۱۸/۱ جی ریوڑی تالاب وارانسی ۔ ۲۲۱۰۱۰

بدل اشتراک
سالانہ ۴۵ روپئے ۔ فی پرچہ ۴ روپئے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے
کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے۔

جنگ میں غیر اسلامی فوجوں سے استعانت کا شرعی حکم

تحریر۔ علامہ شیخ صالح اللحیدان چیف جسٹس سعودی عرب　　ترجمہ۔ ڈاکٹر عبدالرحمان بن عبدالجبار الفریوائی

سامعین کرام! میں آپ کے سامنے اپنے اس اسلامی اور عربی علاقہ میں پیش آنے والے تلخ حادثات اور افسوسناک واقعات سے متعلق اظہار خیال کر رہا ہوں، جس سے ہر سننے اور دیکھنے والے شخص کے دل و دماغ میں اضطراب و توحش پایا جا رہا ہے اور دنیا کے سارے مسلمان مضطرب اور بے چین ہیں۔

ہمارے بہت سے بھائی یقیناً متوقع شر و فتن سے مدافعت و تحفظ کے لیے لوگوں میں استعداد و اہلیت پیدا کرنے کے باب میں مؤثر رول ادا کر سکتے ہیں، حالیہ دنوں میں عراق کے کویت پر جارحانہ یلغار و قبضہ اور سعودی سرحدوں پر عراقی فوجوں کے اجتماع کو ہمیں نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

ان حالات میں اہل علم کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو موجودہ حالات کے بارے میں شرعی حکم بتلائیں تاکہ عام و خاص سبھی اس مسئلہ کو شریعت اسلامیہ کے نقطۂ نظر سے سمجھ لیں۔

اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کی اصلاح حال، امن و اماں کے استقرار اور کرم و شرافت اور جان و مال کے تحفظ کے لیے اپنے رحم و کرم اور احسان سے ہمارے لیے شریعت بنائی۔ بندوں کو حکم دیا کہ وہ ہر طرح کے مکر و کید اور شر و فتنہ سے نمٹنے کی تیاری کریں، مسلمانوں کی عزت و احترام کی پامالی، ان کی جان و مال کی بربادی اور رسوائی سے ہماری امت اسلامیہ ناواقف اور بے خبر نہیں ہے۔

اس لیے سعودی حکومت اور اس کے ارباب حل و عقد نے اللہ سے استعانت و استعداد، پھر اپنے اسلامی عربی دوست۔ یا غیر اسلامی حلفاء سے جو تعاون طلب کیا ہے، یہ ایک حتمی ضرورت، واقعی صورت حال اور وقت کا تقاضا تھا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ جو اپنے اعمال وافعال میں امت محمدیہ کے لیے مشروع ومسنون ہیں، آپ کے جنگ اور امن کے حالات وواقعات امت محمدیہ کے لیے جنگ اور امن کے حالات کے لیے شریعت وقانون ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے مدینہ منورہ پر کسی بھی طرح کے تمرد وعدوان کو روکنے کے لیے یہودیوں سے معاہدہ کیا کہ مدینہ منورہ کو کسی بھی نقصان اور گزند سے بچانے کیلئے دفاعی جنگ لڑی جائے گی۔

نیز آپ نے بعض کفار ومشرکین سے ان کے اسلام قبول کرنے سے پہلے حالت کفر میں، بعض جنگوں میں تعاون حاصل کیا، حالانکہ اس وقت آپ کو ان کی ضرورت نہ تھی۔

اہل مدینہ سے معاہدہ یقینا اضطراری صورت حال کے پیش نظر اس لئے ہوا تھا کہ یہ مکہ دشمنوں کی کثرت اور مشرکین کا جمگھٹا تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو واقعات پیش آئے اور ان کے آپ نے جو حل نکالے وہ سب کے سب من جانب اللہ آپ کی زبان مبارک سے شریعت ہے۔

اس لیے سعودی عرب نے عربی اور اسلامی فوجوں اور غیر اسلامی فوجوں سے جو موجودہ صورت حال میں تعاون کی اپیل کی ہے وہ مجرم جابروں اور ناعاقبت اندیشوں کے اقدام کو پسپا کرنے کے لئے ہے۔

پھر ہماری امت مسلمہ کو یہ بات جان لینی چاہیئے کہ اس وقت جو جہاد کا نعرہ لگایا جارہا ہے تو جہاد کی بات وہ شخص نہیں کرسکتا جو خون خرابہ اور مار دھاڑ کرے، عزتوں کو لوٹے، نہتوں یا نہتوں کی مانند لوگوں پر اپنی طاقت کا استعمال کرے اور ان پر جام غضب ڈھائے۔

جہاد کی دعوت اور دین کی بلندی اور کلمۂ اسلام کی اشاعت کی بات ان کو زیبا دیتی ہے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکاۃ دیتے ہیں، اور وہ خشوع وخضوع کی صفات سے متصف ہیں۔

اللہ رب العزت نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اگر کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو ہم اس کی تحقیق کریں، پس جب ان مجرم بڑے ہولناک مصائب ومشکلات لے کر آجائے تو ہمیں اس کے بارے میں کیا موقف اختیار کرنا چاہیئے؟

دنیا کے مسلمان بھائیو! حکومت سعودیہ نے جو حفاظتی اقدامات کئے ہیں اور عراقی فوجیوں کے ظلم وشر اور دسے نپٹنے کے لئے جن فوجوں سے تعاون کی اپیل کی ہے، وہ اسلامی شریعت کے اصول وقواعد کے تقاضے اور مطالبات کے عین مطابق ہے، شریعت کے عمومی دلائل سے یہی پتہ چلتا ہے۔ استعداد اور احتیاط کا یہی تقاضا ہے۔

سعودی عرب میں رہنے والے اور باہر کے بھائیوں کی خدمت میں یہ کلمات اس مسئلہ میں شرعی حکم کی وضاحت کے لیے
پیش خدمت ہیں۔

امت اسلامیہ کے تمام ذمہ داروں کا فریضہ ہے کہ امت کو شر و فساد سے محفوظ رکھنے کی ممکنہ تدابیر اختیار کریں، اور
شر کے پہنچ جانے اور دشمن کے گھات میں لگے رہنے کی صورت میں کسی بھی جہت سے تعاون کی اپیل عین حکمت کا تقاضا ہے، اور دشمنوں
سے سلامتی کے لیے ایسا کرنا واجب اور ضروری ہے۔

برادران اسلام! جھوٹے پروپیگنڈہ، مشتبہ نعرے، اتہامات و افتراءات مسلمانوں کے ذہن و دماغ سے گذر
جائیں اور مسلمان ان پر نقد و نظر نہ کرے، اس کو عقل و فکر کی کسوٹی پر نہ پرکھے، فریقین کے اقوال کا تقابلی مطالعہ نہ کرے،
یہ ناممکن ہے، تقابلی مطالعہ اور نقد و نظر کی کسوٹی پر جانچنے سے ان کے اقوال بے قیمت اور بے وزن ہو جائیں گے۔

اللہ اور رسول نے ہمیں بتا دیا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں وہ حلال
ہیں، اور جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا ہے وہ حرام ہیں۔

اسی لیے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ حلال اور حرام کے مابین مشتبہ امور ہیں، جنہیں بہت
سارے لوگ نہیں جانتے، اس لئے جب کوئی مشکل مسئلہ درپیش آئے، اور آدمی امت محمدیہ کے حقیقی پوزیشن کے بارے میں جھوٹے
پروپیگنڈے کا شکار ہو جائے۔ تو ایسی صورت میں مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ اہل علم سے حقیقت حال کے بارے میں سوال کریں،
ہمارے ملک کے بعض اہل علم نفسانی خواہشات کے مارے لیڈروں کے پروپیگنڈہ کا شکار ہو گئے ہیں، یا ان لیڈروں کے جھوٹ
کے پھیلانے والوں کی پروپیگنڈہ مہم کا شکار ہو کر بلا کسی غور و فکر اور بصیرت کے موجودہ صورت حال سے نپٹنے کے لیے اختیا
کی گئی تدابیر پر زبان طعن دراز کر رہے ہیں، ہم ان کی سرزنش کرتے ہیں، مسلمان کا فریضہ ہے کہ جب اس کے پاس کوئی
خبر آئے تو اس پر نقد و نظر کرے، اگر وہ ٹھیک اور طعن و تنقید سے پاک بھی ہو تو احکام صادر کرنے سے پہلے اس کے بارے
میں مزید غور و فکر اور تدبر و احتیاط کرنا چاہئے۔ انسان اکثر خبروں ہی سے دھوکا کھاتا ہے، بالخصوص جب یہ خبریں سیاست
کاروں اور طالع آزماؤں کی ٹکسال سے ڈھل کر آئی ہوں، اس لیے اس طرح کی بے سر وپا خبروں، اور پروپیگنڈوں
متأثر ہونے اور اس پر رائے قائم کرنے والے اہل علم عام لوگوں سے زیادہ قابل عتاب و سرزنش ہیں۔ کیونکہ اہل علم اور طلباء
کو تحقیق و تمحیص اور بحث و نظر کے بغیر اور خبر کی حقیقت تک پہنچے بغیر کوئی رائے ظاہر نہیں کرنی چاہئے۔

اس لیے کہ اقوال و اخبار کو اگر فکر و نظر اور تحقیق و تلاش کے مرحلے سے گذارا جائے اور موافق و مخالف

ابلی تجزیہ کیا جائے، تو ان کا بطلان و فساد ظاہر ہو جاتا ہے، بالخصوص ایسی صورت میں جب یہ خبریں ایسے لوگوں نے
ری ہوں جن کی نظر میں محرمات و اقدار کا کوئی تقدس و احترام نہیں، جو انسانوں کے بارے میں کسی عہد کا پاس و لحاظ
ں رکھتے، ایسے لوگوں کی خبروں کی تصدیق تو جاہل کے لئے بھی درست نہیں ہے، عقل مند اور طالب علم کے لئے ایسا
ممکن ہو سکتا ہے ؟

جن لوگوں نے کویت پر زبردستی یلغار کر کے قبضہ کر لیا ہے اور اس کے شہریوں کو بے خانماں و برباد کر دیا
ں کی وجہ سے سعودی عرب کے مشرقی، مغربی اور درمیانی شہر اور گاؤں میں پناہ گزینوں کا ایک جم غفیر ہو گیا ہے،
طرح کے ناجائز اقدام کرنے والے درحقیقت مجرم، باغی اور ظالم و دشمن ہیں۔

پھر ان لوگوں کے یہاں اسلامی شعائر کی اقامت، اسلامی فضائل کی اشاعت اور حق کی دعوت کا کیا حال ہے؟
یہ کب جہاد کے داعی تھے ؟ کب اسلام کے مبلغ تھے ؟ کب یہ صلح و امن اور اصلاح و ہدایت کے داعی تھے ؟

اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں مسلمانوں کو اختلافی اور نزاعی امور میں یہ حکم دیا ہے کہ وہ کتاب اللہ اور
ت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف رجوع کریں۔ جب کوئی مضبوط اور طاقتور کسی کمزور و ناتواں سے اختلاف کرلے
لہ نے اسے یہ حکم نہیں دیا ہے کہ وہ کمزور کے خلاف اپنی قوت و طاقت کا استعمال کرے، اور ظالموں اور فسادیوں
کر چڑھ دوڑے، یہ تو ان لوگوں کا کام ہے جنہیں اللہ سے کوئی ڈر نہیں، جو اپنی امت اور اپنے باشندوں اور
سیوں کے بارے میں اللہ سے نہیں ڈرتے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے پڑوسیوں کی حفاظت کا حکم دیا ہے، اس پر ہمیں ابھارا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ
م نے پڑوسی کے معاملہ میں بڑی تاکید فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دیا ہے، اور بندوں کے
ربھی اسے حرام ٹھہرا دیا ہے، اور لوگوں کو باہم ظلم و زیادتی سے روک دیا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد
ی ہے:

اتقوا الظلم فان الظلم ظلمات یوم القیامۃ.	ظلم سے ڈرو، اور اجتناب کرو، ظلم قیامت کے روز ظلمات بن جائے گا

ریں آتا ہے کہ:

لو بغی جبل علی جبل لدکّ اللہ عزوجل: (اگر ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کے خلاف

بغاوت کردے تو اللہ تعالیٰ اس باغی پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔

یعنی اگر پہاڑ مکلف ہوتا تو اس کا بوجھ اٹھاتا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ باغی اور دشمن کو جتنی مدت شر و فساد پھیلانے کی مل جائے۔ لیکن اس پر سزا عنقریب اور عذاب جلدی ہی ہوگا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

إن الله ليمهل الظالم حتى إذا أخذه لم يفلته ثم تلا النبي صلى الله عليه وسلم قول الله جل وعلا: وكذلك أخذ ربك إذ أخذ القرى وهي ظالمة إن أخذه أليم شديد۔

کہ اللہ تعالیٰ ظالم کو مہلت دیتا ہے، لیکن جب اس کا مواخذہ کرتا ہے تو پھر فرصت نہیں دیتا، تو پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

برادران اسلام پوری امت کا فریضہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرے، میں امت اسلامیہ سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے رات کی تاریکی میں غداروں، ظالموں اور دشمنوں پر غلبہ کی دعائیں کریں۔

مظلوم انسان مستجاب الدعوات ہوتا ہے صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجا تو آپ نے وصیت فرمائی کہ مظلوم کی بددعا سے بچنا کیونکہ اس کی دعا اور اللہ کے درمیان پردہ نہیں رہتا۔

انسان جب مظلوم ہوتا ہے تو چاہے وہ کافر ہو، یا فاسق و فاجر اور گیا گذرا مسلمان، اللہ تعالیٰ ظالموں سے انتقام لیتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ ظالموں کو کچھ وقت کے لئے مہلت دے دیتا ہے تو وہ اس کو عنقریب اپنی گرفت میں لے گا۔

برادران اسلام ہم امن وچین اور آرام وسکون اور اطمینان کی زندگی گذار رہے ہیں، ہم اللہ کی اس امر پر حمد وثنا کرتے ہیں کہ ہماری قوم کو کسی طرح کا کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے، ہمارے ارباب حکومت وسیاست پوری طرح تیار ہیں، اللہ نے ملک کے کسی حصہ میں متوقع مصیبت کے نزول سے پہلے اس کے فوری تدارک کی ان لوگوں کو توفیق عطا فرمائی ہے. لیکن مسلسل جدوجہد اور محنت اور ہمارے اور ہمارے اعداء کے خون بہانے کے بعد ممکن ہے کہ ہم اپنے ملک کو دشمنوں کی یلغار سے بچا لے جائیں، اللہ تعالیٰ نے ہمارے حکمرانوں کو اس صورت حال سے نبرد آزما ہونے کے لئے توفیق عطا فرمائی وہ حیلوں اور دھوکہ کا شکار نہیں ہوئے۔

اگر وعدوں اور معاہدوں میں صداقت ہوتی تو پڑوسی ملکوں کو ان کے خلاف صورت حال سے نہ دو چار ہونا پڑتا، لیکن لوگ وہ کہتے ہیں جس پر عمل پیرا نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ نے وعدہ کرنے والوں اور نہ کرنے والوں کو ان لفظوں

میں شدید وعید فرمائی ہے:۔

کبر مقتا عند اللہ أن تقولوا مالا تفعلون ۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین غداروں اور خائنوں کی یہ نشانی بتائی ہے کہ جب وہ معاہدہ کرتے ہیں تو غداری کرتے ہیں، اور جب جھگڑا کرتے ہیں تو فسق وفجور کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ منافقین کی صفات ہیں، اگر اللہ کا لطف وکرم نہ ہوا تو جو شخص ان صفات کا جامع ہے وہ خالص منافق ہو گیا، اور اس کا ٹھکانہ جہنم کا گڑھا ہے۔

عمومی طور پر ہم اپنے عراقی بھائیوں کے بارے میں کسی بدظنی کا شکار نہیں ہیں، اور نہ ہی ہم ان کو فاسق و فاجر سمجھتے ہیں، لیکن ان کو دھوکہ دیا گیا، وہ اس دھوکے کا شکار ہو گئے ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ انہیں بصیرت وعقل عطا فرمائے انہیں راہ صواب پر لوٹا دے، کویت کو ان لوگوں کے پنجہ سے چھڑا دے، جنہوں نے ان کو خون اور آگ کی جنگ میں جھونک دیا ہے، جن کی وجہ سے کویتیوں کی شرافت وعزت پامال کیا گیا، جس قیادت نے ان کی جان ومال، عزت وآبرو سب کو مباح کر دیا ہے، ان کی عورتیں بیوہ ہو گئی ہیں، بچے یتیم، نادار اور فقیر در بے گھر ہو گئے ہیں، اور یہ سب اس تہور کا نتیجہ ہے کہ ایک ایسی حکومت کی طاقت ان کے خلاف صف آرا ہو گئی ہے جس سے نبرد آزما ہونا اللہ کی طرف رجوع کے بغیر ناممکن ہے، اور جو راتوں رات ان کے پاس آ پہنچی ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خلاصۂ انسانیت تھے، آپ مشرکین وکفار کے خلاف جنگ کرتے تھے لیکن آپ شب خون نہیں مارتے تھے، صبح ہوتی تو اس وقت تک حملہ آور نہ ہوتے جب تک اذان کی آواز نہ سن لیتے، جب اذان نہ سنتے تو اس صورت میں حملہ آور ہوتے کہ پہلے ان کو اسلام کی دعوت پہنچا چکے ہوتے صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان لوگوں نے جو یہ نازیبا اقدام کیا ہے اس کا کیا حال ہے؟ لوگ اپنے زعم میں اعلان جہاد کر رہے ہیں، یہ کس جہاد کا اعلان کر رہے ہیں کیا یہ کا مریڈوں کی طرف دعوت ہے یا ان کی یہ دعوت ان کے اپنے کامریڈ میشائیل عفلق کی طرف ہے؟ یا کوئی اور پکار ہے؟ کیا یہ کتاب اللہ کی طرف دعوت ہے؟ ایسا ہرگز نہیں کیونکہ کتاب اللہ کا داعی وہ شخص نہیں ہو سکتا جو لوگوں کا خون بہائے، عزتیں لوٹے، لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال کر بے گھر کر دے، اور ان پر رات کی تاریکی میں حملہ کر دے۔ مسلمان کا فریضہ ہے کہ جب اس کے پاس کہیں سے کوئی نعرہ یا پروپیگنڈہ آئے تو وہ لوگوں کے اعمال و کردار پر غور کرے، تاکہ اسے پتہ چل جائے کہ اس نعرہ لگانے والوں اور پروپیگنڈہ بازوں کے کون سے کارنامے ہیں، انہوں نے اپنے وطن اور اپنے ملک کے باشندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، اور دوسروں کے ساتھ وہ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف صف آرا ہے تاکہ دوسرے پر غلبہ حاصل کرلے اور جنگیں چلتی رہیں، شر وفساد اور گناہ کی کاشت ہوتی رہے

خیر وصلاح اور تقوی وللہیت کا داعی جنگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کرنے، فتنہ وفساد کی آگ اور اختلاف وفرقت کے اسباب وعوامل کو ختم کرنے کی دعوت دیتا ہے، نہ کہ وہ اختلاف وتشتت کا داعی ہوتا ہے اور بے بس ونہتے امن پسند قوم کے خلاف صف آرا ہوتا ہے۔

برادران اسلام یہ یقین سے جان لیں کہ آپ کے ملک کے علماء کا یہ اعلان ہے کہ حکومت سعودی عرب نے اس عراقی فتنہ کی سرکوبی کے لئے جو اقدامات کئے ہیں وہ اس حکومت کا شرعی فریضہ تھا۔ وصلی اللہ علیہ وسلم۔

＝

قارئین محدث کی خدمت میں

ماہنامہ محدث ہر ماہ پابندی سے آپ کے نام ارسال کیا جاتا ہے اس لئے آپ سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اگر آپ کے ذمہ ماہنامہ خریداری کی رقم باقی ہے تو براہ کرم پہلی فرصت میں بھیجنے کی زحمت فرمائیں۔

(ادارہ)

کویت پر عراقی قبضہ دشمنانِ اسلام کی منصوبہ بند سازشوں کا نتیجہ

اصغر علی امام مہدی السلفی

مسلمانانِ عالم پر یہ مخفی نہیں کہ اس وقت عالم اسلام اور اقلیت مسلمہ پوری دنیا میں خاص حالات سے دوچار ہے خلیج کا موجودہ بحران بھی اس سلسلہ کی اہم ترین کڑی ہے، اس بحران کے پیچھے سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ پوشیدہ ہے جسے اہلِ خرد اور حالات وواقعات پر گہری نظر رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں۔

عالم اسلام خصوصاً سعودی عرب اور کویت وغیرہ میں نوجوانوں کے اندر ایک نئی بیداری پیدا ہوئی ہے، صحیح اسلامی تعلیمات سے لوگوں کو روشناس کرانے کا بھرپور جذبہ اور صلاحیت ان کے اندر موجود ہے، وہ اپنے وسیع تر وسائل سے قرآن وسنت کی تعلیم عام کرکے جہالت میں بھٹکتے مسلمانوں کو راہ راست پر لاکر عالم اسلام میں غیر اسلامی عقائد ونظریات اور اس کے نتیجے میں پیدا شدہ پستی سے عالم اسلام کو نکالنا چاہتے ہیں، اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔

دوسری جانب سعودی حکومت اور اس کی عوام اور اسی کے شانہ بشانہ کویت کے سلفی خصوصاً اور وہاں کے عوام حکمراں عموماً عالم اسلام اور پوری دنیا میں پھیلی ہوئی مسلم اقلیت کے درد کا مداوی تھے، افغانستان کا جہاد ہو، یا فلسطین کا استغاثہ، فلپین میں مسلمانوں کی آزادی کی جنگ ہو یا ایریٹریا کی جنگ، روس میں اسلامی بیداری ہو یا پورے افریقہ ویورپ میں بڑی تیزی سے اسلام کی نشر واشاعت ہو، غرضیکہ دنیا کا کوئی ایسا خطہ نہیں ہے جہاں سعودی عرب نے بے دریغ اموال خرچ کرکے وہاں اسلامی بیداری کی روح نہ پھونک دی ہو۔

یہ سب چیزیں یکمونزم کے لئے خصوصاً اور عام اسلام دشمن طاقتوں کو عموماً برابر کھٹکتی رہی ہیں، روس کے پیشو عالم اسلام

بعض خطوں میں ڈکٹیٹر اس لئے بنائے گئے تھے کہ وہ مسلمانوں میں آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ کھڑا کرتے رہیں جس سے روس کو فلسطین
ں، افغانستان میں اور اسی طرح خود روس میں کھل کھیلنے کا موقع ملتا رہے، لیکن ان تمام کے باوجود جب سعودی عرب اور کویت کے
فرماں روا اور عوام نے نہ یہ کہ روسی امداد کو عراق اور دوسری کمیونسٹ حکومتوں کے ذریعہ اپنے ملکوں میں پہنچنے نہیں دیا بلکہ افغانستان میں روسی
پلٹنوں کے لئے مستقل دردِ سر بن گئے، اور انتفاضہ فلسطین کے نتیجے میں روسی یہودی فلسطین میں پوری آزادی سے اپنی آبادکاری کو
پایۂ تکمیل تک نہیں پہونچا سکتے تھے، تو ایسے وقت میں روس کو اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنے آلۂ کار صدام کمیونسٹ کو افغانی
اور فلسطینی مجاہدین کے حامیوں پر جارحیت کا حکم دے، چنانچہ عراق نے کویت پر حملہ کردیا، اس حملہ کے فوراً بعد ہر دو جہاد میں غیر معمولی
تغیر آگیا بلکہ چند ہی دن کے بعد تمام ذرائع ابلاغ نے اعلان شروع کردیا کہ فلسطینی مجاہدین کمزور پڑتے جارہے ہیں، اور روسی بہت
تیزی سے فلسطین میں بسائے جارہے ہیں۔

عقل و فکر سے سرفراز شخصیات نے اسی وقت احساس کرلیا تھا جب کہ عراق نے کویت پر قبضہ کرنے سے قبل اسرائیل کو دھمکی
دینا شروع کی یک بیک عراق کی جانب سے اسرائیل کو دھمکی دینا ایک عجیب مسئلہ ضرور تھا، لیکن اکثر لوگ بلکہ پورا عالم اسلام صدام کے
تمام گذشتہ مظالم اور اسلام دشمنی کو بھول گیا، اور سب کی ہمدردی عراق کے ساتھ بڑھنے لگی، سب عراق کی حمایت پر متفق ہونے لگے، لیکن
سمجھنے والے سمجھتے تھے کہ صدام قدیم دشمن اسلام جو آٹھ ہزار روسی مشیرین اور طارق عزیز یوحنا عیسائی وزیر خارجہ اور وہاں کے اکثر یہودی
و عیسائی برسر آوردہ ارباب اقتدار کے گرد رہتے ہوئے اسرائیل کو کیونکر دھمکی دے سکتا ہے، جس اسلام دشمنی کے لئے اسے عیسائیوں، اور
صہیونیوں نے عالم اسلام کے قلب میں اپنا آلۂ کار بنایا، وہی صدام کیونکر فلسطینی مسلمانوں کا اتنا بہی خواہ ہوگیا، جس کو مسلم عبادت
گاہوں سے ابدی بیر ہو، اس کو بیت المقدس کی آزادی سے کیونکر دلچسپی ہوگئی، جس نے صلاح الدین ایوبی کے خاندان کردوں پر تیغ
کیمیاوی اسلحے استعمال کئے ہوں، جس نے علماء عراق کو قید و بند اور قتل و غارت گری کے ذریعہ فنا کے گھاٹ اتار دیا ہو، وہ صدام بھلا
اسلام کا حامی کیسے ہوسکتا ہے، خدا کی قسم جب میں نے جامعہ صدام الاسلامیہ کی تاسیس کا ذکر سنا اور پھر اسرائیل کے خلاف صدام کے گمراہ کن
ڈائیلاگ سنے تو اسی وقت میں نے کہا کہ ہو نہ ہو صدام اس وقت کوئی نیا گل کھلائے، لیکن اس بات کو میں نے اس لئے ضبط صدر رکھا کہ یہ بات
وقت سے پہلے ہوگی، نیز اللہ تعالیٰ جو مصرف القلوب ہے تو عین ممکن ہے کہ لاکھوں انسانوں کے قتل کے بعد اس طاغوت کو اپنے گناہوں
کی یاد آگئی ہو مگر تھوڑی دیر کے لئے جو حسن ظن پیدا ہونے لگا تھا وہ عراق کی اس مجرمانہ حرکت کے بعد یک دم کافور ہوگیا، جب اس نے
دھمکی اسرائیل کو دی اور کویت کو پامال کردیا، گرجا کہیں اور برسا کہیں اور، اور مزید ہوس رانی، طمع و حرص اور اپنے توسیع پسندانہ
جنون میں مبتلا ہوکر اپنی توپوں کا رخ بجائے اسرائیل کی طرف کرنے کے اپنے دوسرے مسلم احسان کنندہ بلکہ نجات دہندہ حرم کی پاسبانی

کرنے والے پڑوسی کی طرف کردی، اور تمام عہود و مواثیق اور احسانات کو بھول کر خادم حرمین شریفین کو تہدید آمیز کھلے خط میں للکارنے لگا، اور یہ دشمن اسلام مسلمانوں کی بیخ کنی کے بعد غلط پروپیگنڈہ کے ذریعے عوام الناس کو اصل مسئلے سے دور کرنے لگا، اور اسرائیل جس کی خاطر اتنا بڑا بحران عالم اسلام کے قلب میں پیدا کردیا، اس کی دشمنی کا راگ آلاپ کر عالم اسلام کو گمراہ کر رہا ہے، لیکن جس کے دل ودماغ اور رگ وریشہ میں اسلام دشمنی سرایت کر گئی ہو، جس کی زندگی کا مشن ہی اسلام دشمنی ہو، جس کا مقصود اصلی لادینیت اباحیت اور الحاد ہو وہ اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی کا جب بھی ڈھونگ رچے گا تو اس میں ان کو ناقابل تلافی نقصان پہونچائیگا ور حاکم بغداد نے یہی کیا۔

اس بات سے پوری دنیا واقف ہے کہ اسرائیل نے بغیر کسی وجہ کے عراق کے ایٹمی پلان کو نیست ونابود کر دیا تھا، اس کے برباد کرنے میں عراق کے اندر روسی مشیروں اور وہاں کے بڑے بڑے یہودی اور عیسائی وزراء اور ارباب اقتدار کا بڑا ہاتھ تھا، سرائیل کے محکمۂ جاسوسی وخفیہ ایجنسی نے ایٹمی پلان کو تباہ کرنے کی جس سراغ رسانی کا ذکر کیا ہے وہ بہت حد تک تفصیل ہے، درحقیقت ہے کہ عراق میں بیٹھے یہودی وعیسائی اور کمیونسٹ تمام مصالح کو صہیونیوں کے کھاتے میں ڈالنے کے چکر میں رہتے ہیں جس کا بہت کم لوگ ادراک کر پاتے ہیں، عالم عرب میں عراق کی جانب سے بحران اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

پوری دنیا خصوصاً مسلمان اس انتظار میں تھے کہ عراق اپنے عوام کو کسمپرسی کے عالم میں رکھ کر اپنے تمام وسائل کو جنگی تیاری اس لئے صرف کر رہا ہے کہ وہ اسرائیل سے اپنے ایٹمی پلان کی بربادی کا بدلہ لے، مگر اس دشمن خدا نے اپنی قوت کو مجتمع کرکے پہلے تو اپنے سی ایران پر حملہ کیا، وہاں برابر کی چوٹ پڑی اور اندازہ غلط ثابت ہوا، تو پھر اپنے ایک دوسرے محسن پڑوسی پر غاصبانہ قبضہ جما ، درحقیقت اس نے یہ سب کچھ اپنے آقائے نامدار روس کو خوش کرنے کے لئے کیا ہے، تاکہ روس کے ایجنٹ اور صدام کے دوست ب اللہ افغان مجاہدین اور مسلمانوں کو آسانی سے ختم کرکے وہاں کمیونزم کا مکمل نفاذ کر سکیں۔

سعودی عرب اور کویت سے مادی، معنوی اور نفری امداد جو افغان مجاہدین کو پہونچتی تھی، وہ اب بہت حد تک رک گئی ہے فغانی جہاد سے پورے عالم اسلام کی توجہات پھر کر صدامی بحران کی طرف ہو گئی ہے، اور دشمنان اسلام کو یہی مقصود تھا، جسے م نے پورا کر دیا۔

افغانی مسلمانوں پر روس کی جانب سے لرزہ خیز مظالم ڈھانے پر پورا عالم اسلام چیخ اٹھا، لیکن یہی صدام ہے کہ جب اس تن کے چند صد طلبہ سے متعلق یہ اطلاع ملی کہ وہ افغانی مجاہدین کے لئے چندہ کی تحریک کر رہے ہیں تو اس نے ان کو ایک صف میں ر کے اپنی ظالم گولیوں سے بھون ڈالا۔

فلسطین میں اب تک جو یہود آباد کئے گئے ہیں، وہ سب روس سے لائے گئے ان کی آبادکاری کا سلسلہ سلطان عبد الحمید کی معزولی سے لے کر اب تک جاری ہے، ادھر انتفاضہ فلسطین کی وجہ سے جس کے تمام اخراجات سعودی عرب اور کویت برداشت کرتے تھے یہودیوں کی آبادکاری تیزی سے نہیں ہو پا رہی تھی، تو صدام نے مسلمانوں کو دوسرے مسئلہ میں الجھا دیا کہ روسی یہودی وسیع پیمانے پر اطمینان سے فلسطین میں بسائے جا سکیں، چنانچہ چند ماہ قبل اسرائیلی صہیونی حکمراں نے فلسطین کی مملکت کی توسیع کا کیا تاکہ یہودی زیادہ سے زیادہ آباد ہو سکیں جس کے لئے عراق نے کویت پر حملہ کر دیا اور فلسطینی انتفاضہ سرد پڑ گیا، اور چند ہفتوں میں ایک لاکھ یہودی روس سے اسرائیل میں آباد ہونے کے لئے پہنچ گئے، اور اس طرح صہیونی عزائم پورے ہونے لگے، اور عراق نے اپنے آقاؤں کی خاطر خواہ خدمت انجام دی، جس کے نتیجے میں فلسطین کا مسئلہ صدیوں پیچھے چلا گیا، آج مائیکل عفلق صلیبی زندہ ہوتا تو اپنے شاگرد صدام کے ذریعے کئے گئے اس اسرائیلی خدمت کو دیکھ کر بہت شاباشی دیتا۔

عراق نے اسرائیل کو امن وچین سے فلسطین پر قابض رہنے اور اس کے اندر توسیع کرنے ہی کی غرض سے کویت کے مسلمانوں کو جلاوطنی پر مجبور کر کے اعلان کیا کہ ہم کویت میں فلسطینیوں کو بسائیں گے، تاکہ فلسطینی عوام جہاد ختم کر کے کویت چلے آئیں، اور اسرائیل اپنے توسیع پسندانہ عزائم کی بآسانی تکمیل کر سکے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو حقائق کو سمجھنے کی توفیق دے، اور دشمنان اسلام کی سازشوں کو سمجھ کر ان سے بچنے کی سوجھ بوجھ عطا فرمائے۔ آمین!

ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبدالجبار الفریوائی

خلیجی بحران سے متعلق

کردستان عراق کی اسلامی تحریک کا بیان

مغربی صحافت نے مسلمان کرد قوم کو " ایتام عالم " کا نام دیا ہے، جن پر صدام حسین نے مشق ستم ڈھائے، انھیں سخت سزائیں دیں، اور یہ مظالم صرف اس واسطے ڈھائے گئے کہ یہ مسلمان قوم تھی، فاتح بیت المقدس اور فاتح صلیبیت سلطان صلاح الدین کو جنم دینے والی قوم تھی، کردوں نے عراق سے مکمل علیحدگی کا مطالبہ کبھی نہیں کیا تھا، انہوں نے خود مختاری کا صرف اس واسطے مطالبہ کیا تھا تاکہ ان کو صدام حسین کے ایجنٹوں کے مظالم سے کچھ نجات مل جائے۔

کردستان کی تحریک اسلامی کو سال گذشتہ کے آخر میں جیسے ہی مکہ مکرمہ میں منعقد ہونے والی عالمی اسلامی کانفرس کی اطلاع ہوئی اس نے فوراً علماء اسلام اور عام مسلمانوں کو حقیقی صورت حال سے مطلع کرنے کے لئے اپنے قائدین کا بیان بھیجا۔

جریدہ الدعوۃ کو ایک خاص بیان ملا جو ابھی شائع نہیں ہوا تھا، اس پر کردستان عراق کی تحریک اسلامی کے مرشد عام شیخ عثمان بن عبدالعزیز کا دستخط ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر ہم اسے شائع کر رہے ہیں، اس میں ایسے بیانات اور معلومات ہیں جس سے خلیج میں ہونے والے واقعات کے سلسلے میں کردوں کا نقطۂ نظر اور موقف معلوم ہوگا، اور اس سے طاغوت عراق کے مواقف اور رویوں پر بھی روشنی پڑے گی۔

کردستان عراق کی اسلامی تحریک کا بیان

خلیج کے موجودہ بحران سے متعلق عالمی اسلامی کانفرس مکہ مکرمہ کے نام:

الحمد للہ والصلاۃ والسلام علی رسول اللہ وعلی آلہ ومن والاہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

برادران اسلام! دنیا کے مختلف علاقوں میں بے خانماں و برباد آپ کے لاکھوں بھائیوں، معذوروں، بیوگان، اور یتیموں

نام سے جن کے شہروں اور دیہاتوں کو صدام اور اس کی فوج نے مسمار کر دیا ہے، اور جن پر زہریلی گیسیں صرف اس جرم میں پھینکی گئیں
وہ مسلمان اور فاتح صلیبیت سلطان صلاح الدین ایوبی کی اولاد ہیں۔

ان تمام لوگوں کے نام سے، اور پسی ہوئی عراقی قوم کے نام سے جو اپنی آواز کو آپ کی کانفرنس تک نہیں پہونچا سکتی، میں
آپ لوگوں کی خدمت میں یہ خط بھیج رہا ہوں، اور اللہ رب العزت سے یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کو اپنی رضا و خوشنودگی کے کاموں
کی توفیق دے، علاقہ کو صدام اور اس کے شر و فساد سے محفوظ رکھے، اور روئے زمین کے سب سے بڑے طاغوت کو پیارے ملک عراق
اور پورے خطہ میں سانحہ جنگ پیش آجانے سے پہلے زوال و سقوط نصیب کرے۔ آمین!

برادران اسلام: میری خواہش تھی کہ میں آپ کی اس کانفرنس میں شریک ہوں، اور ایک ایسی مسلم قوم کی ٹریجڈی کی تفصیل
سے آگاہ کروں جس نے مسلمانوں کے مقدسات اور ان کے قلعوں کے دفاع و تحفظ میں اسلامی تاریخ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، یہ
صلاح الدین ایوبی کی اولاد کرد مسلم قوم ہے، لیکن خلیجی علاقہ میں بڑی اہم اور تیزی سے واقع ہونے والی تبدیلیوں اور دوستی و تعلقات
کی تبدیلیوں کے باعث بیت اللہ الحرام کے جوار کی آپ کی اس کانفرنس میں شرکت سے معذور ہوں۔

محترم بھائیو! برادر کویت پر صدام اور اس کی فوجیوں کی یلغار اور کویتوں کے خانماں برباد کرنے ان کے مال و متاع کو
لوٹنے، اور ان کی عزتوں سے کھیلنے کے بعد کردی مسلم قوم کو اس سانحہ کے حجم و ضخامت کا ادراک ہے جس سے خلیجی خطہ عنقریب دوچار
ہوگا، اسی لئے یہ قوم اپنے پورے احساسات و جذبات کے ساتھ مظلوم مسلم کویتی قوم کے ساتھ ہے، صدام اور اس کے ایجنٹوں نے کویتی
بھائیوں کے ساتھ جو جارحانہ رویہ اپنایا ہے اس سے پہلے اس کے کئی گنا مجبور و مقہور کرد مسلمانوں اور عراقی قوم کے ساتھ وہ کر چکے ہیں۔

عراق میں بعثی عربی اشتراکی پارٹی کو ۱۹۶۸ء میں عراق کی قیادت اسی واسطے دی گئی تھی کہ وہ عراق پر حکومت کرے، عراقیوں کو
ذلیل کرے، ان کے عظیم امکانات کو تباہ کرے، اور ان کے بچوں کو بے خانماں و برباد کرے، پھر خطہ کو نذر آتش کر دے۔

اس دشمن پارٹی کو اسی واسطے بنایا گیا تھا کہ وہ اسلام کے لئے ناسور بن جائے، یہ عراق پر بیس سال سے حکمرانی کر رہی ہے، اس
مدت میں اس نے عراقیوں کو ذلیل و خوار کیا، اس کے لیڈروں کو تہ تیغ کیا، قائدین کو پھانسیاں دیں، ملک کے بہترین افراد کو بے گھر
کر دیا، دنیا میں ہر جگہ عراقی پناہ گزیں نظر آئیں گے جو اس طاغوت عراق اور اس کے مجرم ایجنٹوں کے زوال و سقوط کے بعد اپنے وطن
عراق واپس آنا چاہتے ہیں۔

بعض لوگ یہ سوال کریں گے کہ عراقی قوم کی خلیجی بحران اور اس خطہ میں ہونے والے حادثات و وقائع کے بارے میں کیا رائے
ہے؟ یہ لوگ اس طاغوت اور اس کے ٹولے کے خلاف کیوں علم بغاوت نہیں بلند کر دیتے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات معروف ہے کہ عراقی قوم ظلم پر صبر نہیں کرتی، اور اپنے پڑوسیوں اور بھائیوں پر ظلم و زیادتی کو پسند نہیں کرتی، وہ ایک شریف وغیور قوم ہے جس کے پاس اقدار و قیم اور شجاعت و شہامت ہے لیکن جو لوگ صدام اور اس کی حکومت کو جانتے اور عراقی قیادت کو راستہ سے ہٹانے کے اس کے مجرمانہ اسالیب سے واقف ہیں، اور انھیں مقتولین اور نظربند ہونے والے اور جیل جانے والوں کی تعداد کا علم ہے، اور اس جاسوسی کے نظام پر جو بے دریغ دولت صرف ہوئی ہے اس کا انہیں اندازہ ہے، اور ان سی آئی ڈی گروہ کو جانتے ہیں جو صدام کی حکومت کا تحفظ کرتے ہیں، ان کو عراقیوں کے سانحہ کی حقیقت کا ادراک ہوگا، اور ذلت و پستی کی جس سطح پر پہونچ گئے ہیں اس کا اندازہ ہوگا۔

عراقی قوم پر حقیقی سانحہ ایران کے ساتھ آٹھ سال کی ظالمانہ جنگ ہے جس نے عراقیوں کے عہد شباب کو لوٹ لیا، اس کے مادی اور بشری امکانات کو تباہ کر دیا، اس کی دولت ختم کر دی، اور اس کی بہترین نسل کو بے خانماں و برباد کر دیا ۔

یہ ظالمانہ جنگ جس کا منصوبہ دشمنان اسلام نے بنایا تھا اور جس کو عملی جامہ صدام حسین نے قادسیہ صدام کے نام سے پہنایا جس کا شعار تھا "لا الٰه والعزة للعرب"

کوئی معبود نہیں، اور عزت وغلبہ عربوں کے لئے ہے۔

اور جس کا نعرہ تھا:

آمنت بالبعث ربا لا شريك له ✦ وبالعروبة دينا ماله ثان

"میں بعث کو ایسا رب مان کر ایمان لے آیا جس کا کوئی شریک نہیں، اور عروبہ کو دین سمجھ کر ایمان لے آیا جس کا کوئی ثانی نہیں ہے"

هبوني عيدا يجعل العرب أمة ✦ وسيروا بجثماني على دين برهم

سلام على كفر يوحد بيننا ✦ وأهلا وسهلا بعده بجهنم

"مجھ کو ایسی عید عطا کرو جو عربوں کو ایک قوم بنادے، اور میرے جسم کو برہمی دین پر لے چلو، یعنی مرنے کے بعد مجھے جلا دو۔"

"وہ کفر سلامت رہے جو ہمیں متحد کرے، اور اس کے بعد ہم جہنم کو بھی خوش آمدید کہنے کے لئے تیار ہیں۔"

اس تباہ کن اور ہلاکت آفریں جنگ نے پورے خطۂ خلیج پر کاری ضرب لگائی ہے، اس کے ثروات کو نگل لیا ہے، جس کے بارے میں صدام نے دعوی کیا ہے کہ اس کا سبب صدام اور شاہ ایران کے مابین جزائر میں ہونے والا ۱۹۷۵ء کا معاہدہ ہے جو دونوں ملکوں کی سرحدوں کی تحدید کے لئے تھا۔

اس وقت یہ جنگ مذکورہ معاہدہ کے دوبارہ اعتراف و توثیق اور صدام کے اپنے ہر طرح کے دعووں اور نعروں سے مکمل مراجعت

کے بعد ختم ہوئی، یہ جنگ ایک کارعبث، تخریب کاری اور جرم کے علاوہ اور کچھ نہ تھی، یہ ایک ایسی امت کی ٹریجڈی اور سانحہ ہے جس کو یہ علم نہیں کہ اس کے بارے میں کیا کیا منصوبے بنائے، اور سازشیں رچی جارہی ہیں۔

برادران گرامی! صدام کی خواہشات اور امنگیں، اس کی حرص وطمع اور اس کے منصوبے جن کی تنفیذ وتکمیل میں وہ لگا ہوا ہے، اس سے پہلا خطہ ایک سانحہ میں تبدیل ہوجائے گا، اگر سیاسی پردے سے یہ طاغوت ہٹا نہیں تو اس خطہ خلیج کے مسائل مشکلات دوچند اور گمبھیر ہوجائیں گے، صورت حال بڑی دھماکہ خیز ہوگی اور نتیجہ خطہ خلیج کی تباہی ہوگا۔

خطہ خلیج کا کوئی بھی حل اس کے بغیر ناممکن ہے کہ اس طاغوت اور اس کے ایجنٹوں کا سقوط ہو، اور عراق کی باگ ڈور اس کے مخلص سپوتوں، مسلم نوجوانوں اور اسلامی قیادت کے ہاتھ میں ہو، عراقی اقوام، عربی، کردی، سنی، شیعہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ بعثی ٹولے سے نجات حاصل کی جائے، اور اسے تاریخ کے کوڑے خانے کی نذر کردیا جائے، ان کا اس امر پر اجماع ہے، اور وہ شدید خواہشمند ہیں کہ کسی بھی طریقہ سے متوقع جنگ کو ٹالا جاسکے، سب سے زیادہ آپ کے عراقی بھائیوں کو اس بات کا خوف دامن دامنگیر ہے کہ کہیں عراق کی اقتصادی پوزیشن پر ضرب نہ لگادی جائے، اور عراقیوں کا خاتمہ نہ کردیا جائے۔

برادران گرامی! کردستان عراق کی تحریک اسلامی مظلوم کویتی بھائیوں کے شانہ بشانہ کھڑی ہے، اور مقدسات اسلام کے دفاع وتحفظ کے لئے وہ مسلح کارروائی کے لئے مستعد ہے، حتیٰ کہ صدام کی حکومت کو گرادیا جائے، اور کویت اس کے ابناء کو واپس مل جائے، اور عراقی بے خانماں وبرباد پناہ گزیں اپنے وطن واپس آجائیں۔

عراق کی مسلم قوم جس کو بعثی نظام کے سقوط وزوال سے سب سے زیادہ فائدہ پہونچے گا، وہ صدام اور اس کے نظام کے زوال اور عراق اور خطہ خلیج کو فتنہ وفساد سے نجات دلانے کے لئے اسلامی مساعی کے ساتھ تعاون اور مشارکت پر آمادہ ہے، لیکن عراق کے قضیہ کو حل کرنے کے لئے باہر سے جو حل مسلط کیا جائے گا اس کی خطرناکی دوچند ہوسکتی ہے، اور عراق کے امن وحدود دسرحدات اور خلیجی خطہ کو نئے خطرات سے دوچار ہونا پڑسکتا ہے۔

کردستان عراق کی اسلامی تحریک تمام مخلص لوگوں کے مکمل تعاون اور جہاد کے لئے پوری طرح اس وقت تک کے لئے تیار ہے جب تک کہ۔ ان شاء اللہ۔ صدام کا سقوط نہ ہوجائے، اس کانفرنس کے انعقاد کی مناسبت سے جس میں ساری دنیا سے علماء اسلام کی ایک بڑی تعداد شریک ہے، ہم آپ تک اور سارے مسلمانوں تک کردی مسلم قوم کا پیغام پہونچانا نہیں بھولیں گے، اسکی طرف سے اس امانت کے فرض کو ہم ادا کررہے ہیں۔

یہ قوم اسلامی اقوام کے ساتھ ہے، خوشحالی وتنگدستی اور نرم وگرم ماحول میں پوری اسلامی تاریخ میں یہ قوم اسلامی اقوام

وشعوب کے ساتھ رہی ہے، اس نے امت اسلامیہ سے خطرات کا دفعیہ کیا ہے، یہاں ہم صرف قائد سلطان صلاح الدین ایوبی کو یاد دلائیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس کو آزاد کرانے والی اسلامی افواج کی قیادت کا شرف بخشا تھا۔

برادران گرامی! ہمیں بڑی مسرت ہے کہ اس وقت لوگوں کی زبانیں اور قلم صدام حسین کے جرائم سے پردہ اٹھانے کے لئے متحرک ہیں، جس پر بیس سال سے زیادہ کی خاموشی چھائی رہی، بالخصوص کرد مسلم قوم کے خلاف صدام کا زہریلی کیمیاوی گیسوں کے استعمال کے معاملہ پر تو مکمل سکوت رہا۔

ہم نے لوگوں پر نکیر کی تھی، اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا کہ یہ صدام کے جرائم کے خلاف لکھنے اور بولنے سے عاجز ودرماندہ رہے اور وہ کرد مسلم قوم اور عام عراقی قوم پر مظالم کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔

کویتی مسلمانوں پر جو برے ایام گذرے ہیں، کرد اقوام پر اس کی طرح سیکڑوں سے متجاوز ایام بدگزر چکے ہیں، بیس برس سے زیادہ جو آواز ہمارے سینے میں محبوس تھی، اس وقت ہم ان لوگوں کی طرف سے آپ کی خدمت میں پہنچانے کی پوزیشن میں ہیں، یہ ان لوگوں کی آواز ہے جو صدام حسین کے اس کیمیاوی اسلحوں کے استعمال کے نتیجہ میں بیوہ، یتیم، معذور، اپاہج بے خانماں و برباد ہو گئے ہیں، جس سے اسرائیل کو نیست ونابود کرنے کی صدام دھمکیاں دیتا تھا اور جس سے کردی مسلمانوں کو برباد کر دیا، ہم آپ کی خدمت میں آپ کے عراقی بھائیوں کی آواز کے پہنچانے کا فریضہ ادا کر رہے ہیں، اور اللہ رب العزت کی خدمت میں اپنا عذر پیش کر رہے ہیں، اے اللہ! میں نے پیغام پہنچا دیا ہے، اے اللہ گواہ رہنا!

عثمان بن عبد العزیز

(مرشد عام تحریک اسلامی، کردستان عراق)

(بشکریہ ہفت روزہ "دعوت" ۸ / ۳ / ۱۴۱۱ھ)

(عدد ۱۲۵۹)

عربی سے ترجمہ

صدام حسین کی بربریت

بین الاقوامی ادارہ ایمنسٹی کی نظر میں

ڈاکٹر رضاء اللہ محمد ادریس مبارکپوری

بین الاقوامی تنظیم ایمنسٹی نے ایک تازہ ترین رپورٹ لندن سے شائع کی ہے، اور اسے دنیا بھر میں اپنی شاخوں کو ارسال کی ہے، اس رپورٹ میں عراقی اور کردی عوام پر صدام حکومت کی جانب سے ڈھائے جانے والے انسانیت سوز مظالم سے پردہ فاش کیا گیا ہے، رپورٹ کے مطابق حاکم عراق صدام حسین نے عراقی شہریوں کی انسانی عزت وکرامت اور خودداری کو پامال کرنے کے لئے ظلم زیادتی، جبر وتشدد کے تمام وسائل وذرائع کو بروئے کار لاتے ہوئے ایذا رسانی اور تعذیب کے جدید ترین آلات واسلحوں کا استعمال کیا ہے۔ اور اس طرح انہوں نے عالمی تنظیم برائے انسانی حقوق کے تمام معاہدوں اور دستاویزات کی خلاف ورزی ہی نہیں بلکہ انہیں اپنے پیروں تلے روند ڈالا ہے۔

رپورٹ میں ان اجتماعی قبرستانوں کی نشاندہی کی گئی ہے جنہیں صدام نے اپنے مخالفین یا رائے کا اظہار کرنے والوں کے لئے تیار کروایا تھا، صدام کے ظلم وتشدد اور ان کی گرفت سے ۶ سال سے کم عمر کے بچے بھی نہ بچ سکے، بلکہ انہیں حکومت کے نزدیک مطلوب اپنے اعزہ واقربا کے روپوش ہوجانے پر یرغمال بنا کر رکھا گیا ہے۔

رپورٹ میں اس بات کا بھی اشارہ ملتا ہے کہ انٹرنیشنل ایمنسٹی نے صدام حسین کے پاس متعدد رپورٹیں ارسال کرکے عراق کے اندر انسانی حقوق کی خطرناک شکل میں پامالی، عراقی عوام کے اجتماعی قتل عام اور ان کی انسانیت سوز تعذیب پر اپنے غم وافسوس کا اظہار کیا تھا، اور ساتھ ہی صدام حسین سے ان معلومات وحقائق کی فوری توجیہ وتفسیر طلب کیا تھا، مگر صدام نے ان رپورٹوں کا جواب دینے کے بجائے عراقی باشندوں کے خلاف اپنی وحشیانہ حرکتیں جاری رکھیں۔

مذکورہ رپورٹ ایسے حقائق سے بھری پڑی ہے جن سے صدام حکومت کی بربریت وچنگیزیت اور اس کے نزدیک انسانیت

عدم احترام کا واضح ثبوت ملتا ہے، بلکہ اس میں ان تاریخوں کو بھی پوری تعیین و تحدید کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جن میں لوگوں کو پھانسی
ا سزا دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے، عراق کی سرکاری افواج نے کردوں اور صدام مخالفین کی ایک بڑی تعداد کو بغیر مقدمہ چلائے
پھانسی کی سزا دے کر اجتماعی طور پر ہلاک کیا ہے، ان میں بچوں سمیت کئی مکمل خاندان شامل ہیں، اور ابھی تک ہزاروں کی تعداد
ں لوگ ایک طویل عرصے سے جیلوں میں پڑے سڑ رہے ہیں، نہ تو ان کے جرم کی نشاندہی کی گئی ہے، اور نہ ہی ان کو عدالت کے روبرو
ں کیا گیا ہے بلکہ انہیں مسلسل ہر قسم کی انسانیت سوز ایذا رسانی اور تعذیب کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ تنظیم کے پاس ایسی متحقق معلومات ہیں جن سے ان ناموں کا پتہ چلتا ہے جنہیں عراق کی حکومت نے
مقدمہ چلائے بغیر، یا صرف فرضی مقدمہ چلا کر پھانسی دیدی ہے، ایران عراق جنگ کے چند مہینے بعد گذشتہ جنوری میں صدام
راق سے مفرور کرد عراقیوں کے لئے عام معافی کا اعلان کیا تھا، اور ان کو عراق واپس آنے کی دعوت دی تھی۔

اعلان میں اس بات کی صراحت کر دی گئی تھی کہ جو ۶ ستمبر ۱۹۸۸ء سے قبل مطلوب تھے. ان تمام لوگوں کو معافی نامہ شامل
، اور جب کچھ لوگ صدام کے وعدوں اور اعلانات کو سچ سمجھ کر عراق واپس لوٹے تو انہیں ایرپورٹ سے ہی سیدھے جیل بھیج دیا گیا،
ن میں بیشتر کو پھانسی دیدی گئی، اور کچھ قید تاحیات کی سزا مختلف ایذا رسانیوں کے ساتھ جھیل رہے ہیں۔

تنظیم کو جو معلومات موصول ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ۱۹۸۷ء میں پانچ ہزار سے زائد افراد جن کی اکثریت شہری
سرکاری افواج نے، اور سیکڑوں اشخاص کو صدام نے بغیر مقدمہ چلائے قصداً قتل کیا ہے، ان میں اکثر و بیشتر کا تعلق کرد قوم
، بے شمار کردی خاندانوں کو اس طرح نیست و نابود کر دیا گیا ہے کہ بعض خاندان کا کوئی فرد زندہ نہیں بچ سکا۔

رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ تنظیم کی نظر میں قتل و غارت اور عام تباہی و ہلاکت کی جو کارروائی عراقی حکومت انجام دے
ہے، یہ اس کی جانب سے صدام پارٹی کی مخالفت کرنے والے کرد مسلمانوں کو بطور سزا کے مکمل طریقے سے ختم کرنے کے لئے ایک سوچی سمجھی
اسکیم کا جزء ہے۔

۶ اپریل کو صدام نے سلیمانیہ صوبے میں عورتوں اور بچوں سمیت ۴۰۰ سے زائد افراد کو اجتماعی شکل میں موت کے گھاٹ اتارا تھا
صوبہ میں خاص طور سے کرداغ کے علاقے میں کیمیاوی ہتھیاروں کا برملا استعمال کیا تھا،

گذشتہ مارچ میں سیکڑوں شہری جو کیمیاوی ہتھیاروں سے زخمی ہو جانے کی بنا پر علاج و معالجہ کے لئے سلیمانیہ جا رہے تھے،
فتار کر لیا گیا، اسی طرح ۳۶۰ اشخاص کو شیخ وسنان گاؤں میں گرفتار کیا گیا تھا جو کیمیاوی حملوں میں زخمی ہو جانے کی وجہ
کے لئے اربیل پہنچے تھے، بعد میں عراقی حکومت نے ان تمام لوگوں کے روپوش ہونے کا اعلان کر دیا جس سے یہی بات سمجھ میں آتی ہے

لہ سب کے سب جیل کے اندر تہ تیغ کر دیئے گئے۔

۱۶ر۱۷ر مارچ کو عراقی افواج نے سلیمانیہ کے قریب کیمیاوی ہتھیاروں سے حملہ کر کے ۵۰۰ سے زائد اشخاص کو قتل اور زخمی کر دیا تھا، ان حملوں کا شکار ہونے والے اکثر شہری خاص طور سے بچے اور عورتیں تھیں۔

اگست میں عراقی فوج نے شمال میں واقع کردی قصبوں اور گاؤں پر حملہ کر کے سیکڑوں افراد کو موت کی نیند سلا دیا تھا، اور ہزاروں افراد کو گرفتار کر لیا تھا، تلاشی اور حکومت مخالفین کو گرفتار کرنے کے بہانے سے عراقی فوجیوں نے ٹینکوں، ہوائی جہازوں اور کیمیاوی بموں سے لیس ہو کر موصل، کرکوک اور اربیل کے شہری آبادی والے علاقوں پر حملہ کر کے چنگیزیت و بربریت کے ننگے ناچ کا مظاہرہ کیا تھا۔

۲۸ر اگست ۱۹۸۹ء کو عراقی افواج نے کرکوک شہر میں داخل ہو کر ایک ہزار سے زائد افراد کو گرفتار کیا، جبکہ ان میں بعض ایسے افراد بھی تھے جو کیمیاوی بمباری کی وجہ سے پہلے ہی سے زخمی ہو گئے تھے، عراقی ذرائع کے مطابق ان تمام قیدیوں پر سرسری مقدمہ چلا کر ان کو سزا دی گئی تھی، اور پاس ہی ایک اجتماعی قبرستان میں دفن کر دیا گیا تھا۔

ستمبر ۱۹۸۹ء میں کرد دیہاتوں اور قصبوں پر کیمیاوی ہتھیاروں سے اندھا دھند بمباری کی گئی تھی، جس کی وجہ سے لوگوں کو اپنے گاؤں اور دیہاتوں کو چھوڑ کر بھاگنا پڑا، دسیوں ہزار کی تعداد میں لوگوں نے ترکی اور ایران میں جا کر پناہ لی، ترکی نے اس وقت یہ اعلان کیا تھا کہ انسانیت کے ناطے وہ پچھتر (۷۵) ہزار کرد شہریوں کو وقتی طور سے پناہ دینے کے لئے تیار ہے، جب اقوام متحدہ کو اطلاع ملی کہ صدام نے کرد عراقیوں کے خلاف کیمیاوی اسلحوں کا استعمال کیا ہے تو تحقیق کے لئے اپنی ایک ٹیم بغداد بھیجنا چاہا لیکن صدام نے اس ٹیم کو بغداد آنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

جنوری ۱۹۸۹ء میں عراقی تحریک مزاحمت کے ایک لیڈر سید مہدی حکیم کو خرطوم کے ہوٹل ہلٹن میں قتل کر دیا گیا، ان تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہونچ چکی ہے کہ جو موٹر اس حادثہ میں استعمال کی گئی تھی، وہ خرطوم میں عراقی سفارتخانہ کی ملکیہ تھی، اور عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ جس شخص نے حکیم پر گولی چلائی تھی وہ عراقی سفارتخانہ کا ایک سفارت کار تھا۔

رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ قتل اور پھانسی کی کارروائی نہایت منظم طریقے سے ۱۹۸۹ء کے دوران بھی برابر جاری رہی بعض لاشیں جنہیں صدام نے قتل کیا تھا کرکوک، موصل، سلیمانیہ اور اربیل کی عام شاہراہوں پر پڑی پائی گئی تھیں۔

رپورٹ میں مکمل نام کے ساتھ قیدیوں کی ایک فہرست منسلک ہے، اس میں دو بچوں مرزا و مردان راشو کا ذکر خاص سے کیا گیا ہے، یہ دونوں سگے بھائی ہیں جن کی عمریں بالترتیب ۶ اور ۱۳ سال ہے، ۱۹۸۵ء میں ان کو شیخان کے علاقے سے گم

لیا تھا، چونکہ ان کے والد حکومت کے یہاں مطلوب تھے، اور وہ روپوش ہو گئے تھے، اس لئے ان دونوں بچوں کو گرفتار کر کے یرغمال بنالیا گیا تھا، جن لوگوں نے جیلوں سے راہ فرار اختیار کر کے کسی طرح اپنی جان بچالی ہے ان کا بیان ہے کہ عام شہری جنہیں قیدی بنا کر رکھا گیا ہے نہایت وحشیانہ طریقے سے ان کی لگاتار ایذا رسانی کی جاتی ہے، اس کام کے لئے عراقی سیکیورٹی سے سلق رکھنے والی خاص ٹیمیں ہوتی ہیں جنہیں ایذا رسانی کے جدید اسالیب و فنون میں مکمل مہارت حاصل ہوتی ہے، اور وہ نئے آلات و وسائل سے مسلح ہوتے ہیں ایذا رسانی کے خاص اور اہم طریقوں میں بجلی کے شاک کے ذریعہ جسم کے مختلف اور نازک حصوں کو تکلیف پہونچانا، لگاتار کھانے پینے سے محروم رکھنا، مرد اور عورتوں کی آبرو ریزی کرنا ہیں۔

ایک قیدی نے تنظیم کے پاس اپنا یہ بیان درج کرایا ہے کہ صرف مشتبہ ہونے کی بنا پر اس نے مکمل ۱۸ مہینے تک ایک جیل میں سخت ایذا رسانی کا سامنا کیا ہے۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ عراق کے ایک جیل خانہ سے ۱۷۸ اشخاص سال رواں کے درمیان لاپتہ ہو گئے ہیں، ان کا انجام ابھی تک مجہول ہے، غالب گمان یہی ہے کہ وہ جیل کے اندر ہی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہوں گے۔

سلیمانیہ کی ایک جیل میں ۸۰۰ کرد قید تھے جن میں ۳۱۵ بچے بھی شامل تھے، وہ ابھی تک لاپتہ ہیں، ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے، بغداد کی حکومت نے اخیر میں ایک ایسا آلہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے جو انسان کو چند لمحوں کے اندر بالکل راکھ بنا کر رکھ دیتا ہے، اس طرح لاشوں کے تعلق سے انہیں کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ تنظیم کو موثق ذرائع سے ایسی معلومات موصول ہوئی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ صدام حسین کی فوج نے سیاسی مخالفین کے خلاف ایک خاص زہر کا استعمال کیا ہے، تنظیم نے حکومت عراق سے ان معلومات کے متعلق وضاحت طلب کیا تھا، واشنگٹن میں عراقی سفیر نے ان کو مغربی دنیا کی گپ کہہ کر ٹال دیا تھا جب کہ عراقی حکومت نے مکمل سکوت اختیار کر کے تنظیم کی طلبی وضاحت کا کوئی جواب نہیں دیا، تنظیم نے عراقی حکومت سے ان ۳۶۰ بچوں کے متعلق بھی وضاحت طلب کیا ہے جنہیں جیلوں میں ٹھونس دیا گیا تھا، اور آج وہ لاپتہ ہیں، ان کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہے، حکومت عراق نے اس بارے میں بھی خاموشی اختیار کر کے جواب دینے سے گریز کیا ہے۔

رپورٹ میں ایمنسٹی کے اس وفد کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، جس نے کرد علاقوں، عراق اور ترکی کے مابین حدود پر بنے کرد کیمپوں اور عراقی، ایرانی سرحدوں کا دورہ کیا تھا، بلکہ ایران اور ترکی کے اندر جا کر لوگوں سے ملاقاتیں کی تھی اس وفد نے جو رپورٹ تیار کی ہے اس میں صدام حکومت کی جانب سے کرد باشندوں کے اوپر وحشیانہ مظالم کے جو پہاڑ ڈھائے جا رہے ہیں ان کا ذکر کیا گیا ہے، اور یہ کہ عراقی

حکومت کردوں کو برابر دھمکی دے رہی ہے کہ انہیں قوت وطاقت کے ذریعہ عراق واپس لایا جائیگا، ورنہ ان کو اجتماعی طور سے ہلاک اور نیست ونابود کردیا جائیگا۔

گذشتہ مئی میں تنظیم نے اعلان کیا تھا کہ وہ عراق کے معاملات پر پوری توجہ صرف کررہی ہے اور یہ کہ اس نے عراق میں انسا حقوق کی پامالی کے اسالیب وذرائع کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد جو رپورٹ تیار کی ہے، اس کی ایک کاپی عراقی حکومت کے ذمہ دارو کو ارسال کیا ہے لیکن عراقی حکومت نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، اور نہ ہی اس نے تنظیم کی ان اپیلوں کا کوئی نوٹس لیا جو عام لو اور بالخصوص عراقی شہریوں کی انسانیت وکرامت کا احترام کرنے کے لئے کی گئی تھیں۔

تنظیم کی رپورٹ میں خبردار کیا گیا ہے کہ عراق اندرونی طور سے جن حالات سے گذر رہا ہے وہ نہایت ہی خطرناک اور بھیانک ہیں اور یہ کہ عراق کی مسلم رعایا کے خلاف ظلم وتشدد، اور کیمیاوی ہتھیاروں کے ذریعہ ان کی اجتماعی وانفرادی تباہی وہلاکت جو نتائج سامنے آرہے ہیں وہ نہایت سنگین اور افسوس ناک ہیں، تنظیم نے اس بات کی بھی صراحت کردی ہے کہ ابھی تک اس اس طرح کے جرائم کا عراق کے علاوہ کسی دوسرے ملک میں نہیں مشاہدہ کیا ہے۔

یہ ہے انسانی حقوق کے میدان میں کام کرنے والی ایک بین الاقوامی تنظیم کی شہادت جس میں اعداد وشمار تاریخ اور ظلم وبربریت کے شکار عراقی شہروں اور دیہاتوں کے ناموں کے ساتھ حقائق کو اجاگر کیا گیا ہے، اور یہ ہے صدام کے کالے کرتوتو کی فائل، اور اس کے کارنامے جو منظر عام پر نہیں آسکے وہ اس سے کہیں بڑھ کر ہیں۔

عربی سے ترجمہ

ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبدالجبار الفریوائی

سنی مسلمانوں کا شہر "حلبچہ"

عراقی جارحیت اور تشدد کا منہ بولتا اور جیتا جاگتا ثبوت

ستر ہزار مسلمانوں کو ایک دن بلکہ منٹوں میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے تو کیا اس کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس دلسوز تاریخ کے لکھنے والے کے قلم میں ارتعاش نہ ہو جائے، زبان و بیان کی وہ کون سی صنف ہے جو اجتماعی قتل عام کی حقیقی تصویر کشی کر سکے، مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کی صرف صدام جیسا ملحد اور منکر دین طاغوت، سفاک مجرم ہی جرأت کر سکتا ہے۔

حلبچہ کا عظیم سانحہ امتداد زمانہ کے ساتھ ہلاکو عراق کے ظلم و طغیان اور سرکشی کی داستان سناتا رہے گا۔

سبعون ألفا كأسكاد الشرى　　　نضجت جلودهم قبل نضج التين والعنب

(انگور اور انجیر کی فصل پکنے سے پہلے ہی ستر ہزار بہادر شیروں کے چمڑے پک گئے۔)

مندرجہ بالا شعر فتح عموریہ کے موقع پر کہا گیا تھا، شیطان کی راہ کے مجاہد اکبر صدام کے ہاتھوں ستر ہزار مسلمانوں کے قتل و تباہی پر آج اس شعر کو پڑھ رہے ہیں۔

یہ سب باتیں حیرت و استعجاب کی ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت و استعجاب کی بات یہ ہے کہ لوگ ایسے مجرموں کی تصدیق اور ان کی تقلید کرتے ہیں۔

اسلامی شہر حلبچہ کے سانحہ پر مجرمانہ سکوت ہی کی امت عربیہ آج فصل کاٹ رہی ہے، صدام کی آتش پیاس کو جب اس کی قوم کا خون نہیں بجھا سکا تو وہ دوسری اقوام کے خون کا پیاسا ہو گیا۔

مسلمانان عالم کی نگاہوں کے سامنے صدام ستر ہزار مسلمانوں کو زہریلے کیمیاوی ہتھیاروں سے کیڑے مکوڑے کی طرح فنا کے

گھاٹ اتارتا اور انہیں تباہ و برباد کر دیتا ہے، لیکن کہیں سے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھتی ہے برخلاف اس کے دوسری طرف دنیا میں صرف ایک آدمی کے قتل پر قیامت مچ جاتی ہے، اگر ان کے ہزاروں آدمی قتل کر دیئے جائیں تو اضطراب و بے چینی کا کیا عالم ہوگا، لیکن عربوں کا معاملہ بڑا عجیب و غریب ہوتا ہے، اس قوم کو جس وقت بولنا ضروری ہوتا ہے تو خاموش رہتی ہے، اور جب ضروری طور پر حرکت و عمل اور اقدام کی بات آتی ہے تو صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا کرتی ہے۔

ہٹلر نے ہزاروں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ہزاروں کو اجتماعی نذر آتش کر دیا، تاکہ ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکے، اسی طرح سے اجتماعی طور پر مسولینی نے ہزاروں اٹلیوں کو ہلاک کر دیا۔

صدام حسین نے سیکڑوں افراد کو تختۂ دار پر انفرادی طور پر لٹکانے پر اکتفاء نہ کرکے اجتماعی طور پر حلبچہ کے ہزاروں افراد کو جدید ترین کیمیاوی ہتھیاروں اور زہریلی گیسوں کے ذریعے ختم کر دیا، اس طرح کا خوفناک اسلحہ اس قوم مسلم کے خلاف استعمال کیا جو نہتی تھی۔

حلبچہ کو جرم کی ابدی داستان کے طور پہ یاد کیا جائے گا، حلبچہ کی قوم کا تعارف کیا ہے؟ صدام نے ان کو تباہ و برباد کرنے کی مجرمانہ کارروائی کس طرح کی؟۔

جرم کا موقع و محل

حلبچہ کو " قضاء حلبچہ " یعنی چھوٹا حلب کہا جاتا ہے، مؤرخین کے بقول حلب شام (دمشق) سے محبت کی بناء پر اس شہر کا نام حلبچہ پڑا، یہ بغداد کے شمال مشرق میں ۲۶۰ کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، صدام کی کیمیاوی بمباری اور زہریلی گیس کے حملے سے پہلے اس شہر کی آبادی ستر ہزار کی تھی، شہر کے اکثر لوگ کھیتی باڑی اور مویشیوں کی تربیت کا کام کرتے تھے، بعض کے پاس ہلکی پھلکی صنعتیں بھی تھیں، حلبچہ اپنی مساجد کی کثرت اور معہد شرعی کی بناء پر مشہور تھا جہاں سے دعاۃ و مبلغین فارغ ہوتے تھے۔

حلبچہ کے تابع متعدد اہم شہر تھے، شہر " ناحیہ حلبچہ " تقریباً اسّی سال پہلے آباد ہوا تھا، یہ حلبچہ سے دس کیلومیٹر دور بحیرۂ دربندیخان کے مشرق میں واقع ہے، کیمیاوی بمباری سے پہلے اس کی آبادی بیس ہزار تھی، سرکاری مدارس کے علاوہ چار بڑی جامع مسجدیں، ایک اسلامی مدرسہ جس میں چھ سو طلبہ دینی علوم پڑھتے تھے، صدام نے جس دن حلبچہ پر کیمیاوی اسلحوں سے بمباری کی تھی اسی کے ساتھ اس کو بھی برباد کر دیا تھا۔

خورمال

یہ اس علاقہ کا اہم شہر ہے جو حلبچہ کے شمال مشرق میں واقع ہے، ۱۹۸۶ء میں صدام نے اس شہر کے سارے پرانے محلوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا، اس کے باشندے ہجرت کر گئے تھے، پھر نئے محلے بسائے گئے جس میں کیمیاوی

بمباری سے قبل پندرہ ہزار لوگ آباد تھے، سانحہ حلبچہ کے دن اسکو بھی تباہ کردیا گیا۔

حلبچہ کے قرب وجوار میں مختلف قصبات اور گاؤں تھے جس میں چالیس ہزار سے زیادہ لوگ رہتے تھے، پورے علاقہ کو حلبچہ کے ساتھ کیمیاوی ہتھیاروں اور زہریلی گیسوں سے تباہ و برباد کردیا گیا۔

حلبچہ میں اسلامی بیداری

حلبچہ اور اس کے مضافاتی علاقے اپنی دینی بیداری میں مشہور تھے، حلبچہ والوں کی اسلام سے محبت وشغف کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی، حتی کہ جس وقت عراق میں لادینی اور الحادی نظام حکومت نافذ کیا گیا تھا اس وقت بھی اس علاقہ میں اس الحادی نظام کا نفاذ بڑا مشکل مسئلہ تھا، اور جس وقت کمیونزم جیسے بعض باطل افکار اور الحادی مذاہب قرداغ اور دربندیخان جیسے کردشہروں میں پھیلنا شروع ہوگئے تھے، حلبچہ وغیرہ کے علاقوں میں ان کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں تھا، یہ الحادی تحریکیں وہاں پوری طرح ناکام تھیں۔

تعلیم یافتہ طبقہ، مسلم نوجوانوں اور الحادی افکار و مذاہب کے مابین منظم اسلامی عمل ایک مضبوط دیوار بن گیا، حتی کہ سرکاری اداروں کے (جو کہ عراقی نظام کے تابع تھے) سارے ملازمین دیندار، اور صدامی بعثی مذہب کے منکر تھے، حلبچہ اور اس کے مضافات میں عام اسلامی بیداری کی ایک وجہ یہ بھی کہ یہاں کے مدارس کے ذمہ دار دین پسند اور دین کے لئے کام کرنے والے نوجوان تھے۔

حلبچہ اپنے علماء وفقہاء کی وجہ سے مشہور وممتاز تھا جو اللہ کے بارے میں کسی لعنت وملامت کا خوف نہیں کھاتے تھے، یہاں کا معہد اسلامی (جس کے ناظم ومربی سید نجم الدین تھے) عراق کا اہم دینی ادارہ تھا جہاں سے علماء ومبلغین فارغ ہوتے اور علاقہ میں دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پھر علماء وفضلاء اور پرجوش مسلم نوجوانوں کی جدوجہد اور مساعی سے اسلامی دعوت کا کام برابر پھیلتا رہا حتی کہ حلبچہ سیروان، سید صادق کے تقریباً سارے گاؤں کی مساجد کا انتظام وانصرام مسلم نوجوانوں بالخصوص معہد اسلامی حلبچہ، اور کلیۃ الشریعۃ بغداد کے ہاتھوں میں چلا آیا، اس لئے ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۲ء میں جو شدید قومی مظاہرے اور جلوسوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، تو یہ کوئی قابل تعجب بات نہ تھی، ان مظاہروں کی قیادت علماء نے کی، ان لوگوں نے نفاذ شریعت کا مطالبہ کیا اور ہر طرح کے الحادی مذاہب کو۔ جن کا مقصد شریعت اسلامیہ کے نفاذ اور شرعی واسلامی قوانین پر عمل کے مقصد سے دور کرنا تھا۔ رد کردیا۔

کردستان علاقہ بالخصوص حلبچہ اور اس کے مضافاتی شہروں اور قصبوں میں اسلامی بیداری کی لہر کا نزول ظالم صدامی نظام حکومت کے لئے سب سے بڑا دردسر بن گئی، وہاں کی ۸۱ مسجدوں کو اس کافرانہ نظام حکومت نے حقد وکینہ اور تمرد وسرکشی کی نظر سے

دیکھنا شروع کردیا، اور اس فکر میں پڑ گیا کہ جس طرح سے عراق کے دوسرے شہروں میں علماء اسلام اور نوجوانان ملت کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے، حلبچہ کے علماء اور نوجوانوں کے خاتمہ کا موقع مل جائے۔

ارباب کفروالحاد کے اجتماعات

صدام اور اس کی ملحد "بعث" پارٹی کی میٹنگوں کا سلسلہ شروع ہوگیا تاکہ اسلامی شہر حلبچہ کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا جائے، سب سے پہلے ان لوگوں نے حلبچہ کے باشندوں کو اپنے شہروں، قصبات اور گاؤں سے منتشر کرنے اور باہر نکال دینے کا پروگرام بنایا، چنانچہ ۸۰ سے زیادہ گاؤں اور قصبات حلبچہ کے ایک چھوٹے شہر کے لوگوں کو باہر نکال دیا گیا، حلبچہ میں مسلمانوں کے مابین سرگوشیاں شروع ہوگئیں، اسطرح ۱۴ / رمضان المبارک ۱۴۰۸ھ کو ایک زبردست اسلامی قومی مظاہرہ ہوا جس کا استقبال صدام کے نظام حکومت اور اس کی فوجوں نے نہتے مظاہرین پر گولی چلاکر کیا، پھر ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں نے شہر کو گھیر لیا اور بموں اور گولوں نے حلبچہ کے باشندوں کو بھون کر رکھ دیا،

لیکن جلوس اور مظاہروں کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس میں شدت آتی گئی، عراقی فوج میں سے دو ہزار کرد فوجی بھی ان مظاہرات میں شریک ہوگئے، سید صادق، سیروان عرب شہروں میں پرتشدد انتفاضہ پھوٹ پڑا، صدام کی حکومت نے آدھے گھنٹے میں پورا علاقہ خالی کردینے کا اعلان کیا، ورنہ بمباری شروع ہوجائے گی، چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے صدام کے ٹینکوں نے محلہ "کانی" کو برباد کردیا، اور علاقہ کے شہروں اور دیہاتوں میں مسلم نوجوانوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاری کا سلسلہ شروع ہوگیا، علماء اور فقہاء کو چن چن کر گرفتار کیا گیا، اور ان سے بغداد اور بصرہ کی جیلوں کو بھر دیا، سیکڑوں افراد کو فوراً تہ تیغ کردیا گیا، مساجد میں جو نوجوان امامت کے فرائض انجام دیتے تھے ان کو دھمکیاں دی گئیں، لیکن صدام کا نظام اس میں بھی ناکام رہا۔

مجرمانہ حرکت

حلبچہ کی مجوزہ تباہی و بربادی میں ٹینکوں کی ناکامی کے بعد شہریوں نے سوچا کہ اب جنگی جہازوں سے حملہ ہوگا چنانچہ ۱۶ / فروری ۱۹۸۸ء کی صبح کو ٹھیک ۱۰ بج کر ۴۰ منٹ پر حلبچہ کی فضاؤں میں عراقی لڑاکا جہازوں کی ایک قطار نظر آئی جس نے گھنی آبادی والے علاقوں پر بمباری شروع کردی، لوگوں نے سوچا کہ صدام کی بعث پارٹی کی یہ کارروائی ہے سو پچاس لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار کر اور کچھ گھروں کو تباہ کرکے یہ سلسلہ ختم ہوجائے گا، لیکن مسلسل چار گھنٹے تک یہ بمباری جاری رہی، مشاہدین کا بیان ہے کہ آٹھ آٹھ جہاز بمباری کرتے، جب وہ بمباری کرچکتے تو دوسرے جہاز پہنچ آتے، یہی سلسلہ دو بجے دن تک جاری رہا، ہزاروں آدمی ہلاک ہوگئے، لوگ غاروں اور پناہ گاہوں میں جا چھپے، شہر کے اکثر مکانات تباہ و برباد ہوگئے، اس اندھا دھند بمباری کے ایک گھنٹے کے بعد لوگوں نے سوچا کہ عراقی فضائیہ کی مہم اب ختم ہوچکی ہے، کیونکہ شہر کو تباہ و برباد کیا جاچکا ہے۔

لیکن تین بجے دن میں ٹھیک ایک گھنٹہ بعد " میراج ف ۱/ " جہازوں نے زہریلی کیمیائی گیسوں کا چھڑکاؤ شروع کر دیا۔ اور میدان میں اکٹھا لوگوں پر بھی ان زہریلی گیسوں کی بمباری کی گئی، زرد اور سفید بادل شہر پر چھا گئے، اس سے لہسن اور سڑے کھیرے کی بدبو نکل رہی تھی، لوگوں نے یہ سمجھا کہ جلے درختوں اور نباتات کی بدبو ہے، اس لئے اپنے گھروں اور پناہ گاہوں اور غاروں سے باہر نہیں نکلے، اور دیکھتے ہی دیکھتے ضیق تنفس کا شکار ہونے لگے، آنکھیں سرخ ہونے لگیں، اور بینائی جاتی رہی، قے آنے لگی، اور بے ہوشی طاری ہونے لگی، جو لوگ باہر نکل سکے نکل بھاگے، جو لوگ زندہ رہ گئے، انہوں نے بڑے عجیب وغریب اور ہولناک مناظر دیکھے، بہت بڑے جرم بلکہ سب سے بڑے جرم کا مشاہدہ کیا۔

جو لوگ پہاڑوں پر چڑھ سکتے تھے وہ پہاڑوں پر جا چڑھے، لیکن ان لوگوں پر بھی صدام کے جہازوں نے زہریلی گیسیں پھینکیں اور کیمیاوی بم برسائے، سیکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ مردہ ٹڈی کی طرح زمین پر گرے نظر آئے۔

دنیا والوں نے ایسے ہولناک مناظر کا مشاہدہ نہ کیا ہوگا، اور نہ تاریخ ہی میں اس طرح کا جرم وقوع پذیر ہوا ہوگا، صدام اپنے جرائم میں دنیا کے مشہور مجرموں سے بھی آگے چلا گیا، ہٹلر، مسولینی، چاؤ چیکو میں کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی اس طرح کا بھیانک جرم نہیں آیا ہوگا۔

قیامت خیز منظر ملاحظہ کیجئے:۔

یہ ماں کی گود میں ایک چھوٹا بچہ ہے، جس کی جان بچانے کے لئے ماں اس کو سینے کو چمٹائے ہوئے ہے، لیکن دونوں موت کی آغوش میں سوئے پڑے ہیں، یہ ایک عورت ہے، اپنے کندھے پر ایک بچہ کو اٹھائے ہوئے ہے پیچھے ایک بچہ اور ہے، راستے میں سب کے سب مرے پڑے ہیں، ایک پیاسی بڑھیا پانی مانگ رہی ہے، لیکن کوئی پانی دینے والا نہیں، زخمی باپ حیران وپریشان ہے کہ وہ جاں بلب بیوی کو پانی پلائے یا اپنی پیاسی بیٹیوں کی پیاس بجھائے۔

یہ ایک چھوٹی بچی ہے، ماں اس کو زندگی کی تلاش میں گھر سے باہر نکال دیتی ہے، لیکن راستے میں پھیلی زہریلی گیس سے دونوں مر جاتے ہیں۔

ہزاروں لوگ پہاڑوں کی طرف بھاگ رہے ہیں، ہوائی جہاز ان کا تعاقب کر رہے ہیں، جہازوں کی ایک قطار ان نہروں اور تالابوں پر زہریلی گیسوں کا چھڑکاؤ کر رہی ہے جن کی طرف لوگ بھگے جا رہے ہیں، زہر آلود پانی پینے سے سیکڑوں لوگ فوراً موت کی ابدی نیند سو جاتے ہیں، لاشوں کا انبار لگ جاتا ہے۔

کتنا بڑا ہے یہ سانحہ! اور کتنا عظیم ہے یہ حادثہ! کتنا ہولناک ہے یہ جرم! سیکڑوں لاشیں غاروں میں، سیکڑوں

ندقوں میں، سیکڑوں سڑکوں پر، سیکڑوں نہروں کے کنارے، سیکڑوں پہاڑوں پر، بچوں، بوڑھوں، عورتوں کی لاشیں ہی لاشیں
کتنا بڑا ہولناک حادثۂ فاجعہ ہے :

شام سایہ فگن ہوتی ہے، زندہ باقی رہ جانے والے لوگوں کو توقع ہوتی ہے کہ وہ لوگ شہروں سے بھاگ جانے میں کامیاب ہوجائیں گے لیکن صدام کے جہاز آکر رات کی تاریکی کو روشنی میں بدلنے والے بم برساتے ہیں، تاکہ اندھیری رات دن کی روشنی میں بدل جائے، اور مجرمانہ وگناہ آلود بمباری جاری رہے، شہروں اور دیہاتوں پر دھواں چھاگیا، ہرگھر میں زہریلی گیسیں پھیل گئیں حادثہ کا سلسلہ جاری رہا، زخم گہرے ہوتے گئے، ۱۲ ربجکر ۱۰ رمنٹ پر بمباری رک گئی، جرم کا سلسلہ بند ہوگیا، مجرموں کو اپنی مجرمانہ کارروائیاں روکنی پڑیں، سارے لوگوں کو ہلاک کیا جاچکا ہے، گھر برباد کردیئے گئے ہیں، پہاڑ کی چوٹیوں پر بھی جرم کی کاشت ہوئی ہے، کھیت اور باغات اور سبزیوں کو بھی ملوث کردیا گیا ہے، آسمان ان صدامی مجرمانہ حرکات پر گواہ ہے :

ہواباز صدام کو مبارکبادی کا پیغام دیتے ہیں، جو لحظہ بہ لحظہ اس کارروائی کی نگرانی کررہا ہے، فضا میں صدام کا قہقہہ بلند ہوتا ہے، حلبچہ کا کام تمام ہوگیا، لوگ مرگئے، نسلیں تباہ وبرباد ہوگئیں، کھیتیاں اجڑ گئیں! (رہے نام اللہ کا)

سب لوگ چلے گئے، جہاز، ہواباز جن کی زندگی باقی تھی، باقی رہ گئے، حادثہ کے اثرات باقی ہیں، چند دن گذرجانے کے بعد کچھ لوگ مسمار وبرباد علاقوں میں گئے، شیخ عبداللطیف برزنجی، شیخ محمود آزادی، شیخ ابوبکر صدیقی، شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز یہ لوگ وہاں اس واسطے گئے کہ گھروں، غاروں اور سڑکوں پر پڑی لاشوں کے دفنانے کا انتظام کریں، علماء اور نوجوانوں نے سڑکوں اور راستوں اور گلیوں میں (۵۰۴۰) لاشوں کو شمار کیا، ان کو دفنایا، باقی لوگوں کا علم صرف اللہ رب العزت کو ہے، ان لوگوں نے مجبوراً اجتماعی قبروں میں ان مردوں کو دفنایا، راکٹوں کے پھٹنے سے زمین میں جو گڑھے ہوگئے تھے اکثر لاشوں کو انہیں میں دفنا دیا گیا مردوں کے اعضاء اور ہڈیوں کو جمع نہیں کیا جاسکا!

شیخ محمود آزادی کا بیان ہے کہ انہوں نے ۱۵۱ر لاشیں صرف ایک غارے برآمد کیں، اور ۱۲۰ ر قدم کی مسافت (۱۰۱۳) لاشیں دیکھیں۔

۲۵ر ہزار مسلمان جو باقی بچے وہ دائمی معذوری اور مختلف بیماریوں کا شکار ہوگئے، ان کے علاج ومعالجہ کا معاملہ بڑا اہم ہے۔

مغربی ممالک میں سے سویڈن، ناروے، سوئزرلینڈ، مغربی جرمنی، امریکہ، جاپان نے اپنے ہسپتالوں میں سیکڑوں افراد کا علاج کیا۔

حلبچہ اور اس کے مضافات کے شہروں اور دیہاتوں سے ۷۰؍ہزار مسلمان ہجرت کر کے کہاں گئے؟ ایک ایسے گمنام علاقے میں جہاں جاڑے میں برف باری اور گرمی میں سخت دھوپ اور تیز و تند ہواؤں سے ان کو پالا پڑا ہے، ان کے پاس کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں، موسم کی خرابی کے باعث اور زہریلی گیسوں اور کیمیاوی ہتھیاروں کے سبب پھیلے مزمن امراض سے ان مہاجرین میں سے ۱۴؍ہزار سے زیادہ لوگ لقمۂ اجل بن گئے، مرنے والوں کی تعداد (۱۱۵۴۰) ہوگئی، جاڑے اور بھوک سے جو لوگ مر گئے وہ اس کے علاوہ ہیں۔

بعض لوگوں نے آنکھوں دیکھا حال بتایا کہ دسمبر ۱۹۸۸ء میں "بلوہ خیمہ" میں ۷۵؍حلبچی مہاجرین کا انتقال ہوا، یتیموں کی تعداد میں اور اضافہ ہوگیا، صلیب احمر کے اعداد و شمار کے مطابق (۷۶۹۹) یتیم صرف ۵؍خیموں میں ملے، اور سات خیموں میں (۱۲۳۴۳) محتاج و فقیر، کرد مسلم قوم کے ۷۰؍ہزار افراد بے گھر ہوگئے، اس طرح سے صلاح الدین ایوبی کی بے گھر، خانماں برباد اولاد صدام کی مجرمانہ کارروائیوں کے نتیجہ میں اب ۲؍لاکھ ۱۷؍ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔

امریکی ٹیلی ویژن نے حلبچہ اور اس کے مضافات کے گاؤں کی بڑی خوفناک فلم بنائی ہے، گلیوں، سڑکوں اور غاروں میں بڑی لاشوں، ہزاروں زخمیوں اور زہریلی گیسوں اور کیمیاوی بمباری سے پیدا ہونے والے امراض کو فلمایا، نیز ان شہروں اور دیہاتوں کے مکانات کس طرح تباہ و برباد کر کے زمین بوس کر دیئے گئے، کس طرح کھیتیاں برباد کی گئیں، نسلوں کو تباہ کیا گیا، یہ ساری چیزیں امریکی ٹیلی ویژن نے فلمائیں۔

بین الاقوامی ادارہ حقوق انسانی نے سانحۂ حلبچہ کی ایک مفصل رپورٹ تیار کی، ۷۰؍ہزار مسلمانوں کے خلاف کس طرح صدام حسین نے یہ مجرمانہ اقدام کیا ہے، اس سے پردہ اٹھایا، اس تنظیم نے عالمی ادارہ صحت سے کیمیاوی ہتھیاروں سے متاثر مریضوں اور زخمیوں کے علاج کا مطالبہ کیا، نیز پناہ گزینی و آبادکاری کی تنظیموں سے پہاڑوں میں پناہ گزین افراد کے لئے تعاون کی اپیل کی، اقوام متحدہ نے جرائم کے آثار کے مشاہدہ کے لئے اپنا مندوب ارسال کیا، مندوب نے جو رپورٹ پیش کی اس سے اس حادثہ کے حجم و ضخامت کا اندازہ ہوتا ہے، امریکی کانگریس نے حلبچہ کے علاقے کی زیارت کے لئے ایک وفد بھیجا، وفد نے صدام کی مجرمانہ کارروائیوں کا مشاہدہ کیا اور لوگوں کے بیانات لئے۔

صدام نے کس طرح لوگوں کو ہلاک کیا، ہوائی جہازوں نے کس طرح شہروں اور دیہاتوں کو اپنی دہشت کا نشانہ بنایا، انسانیت کے ساتھ زہریلی کیمیاوی گیسوں نے کیا سلوک کیا، تمام لوگوں نے صدام کے اس جرم پر اس کو سزا دینے کا مطالبہ کیا، کیونکہ اس نے قانون کی خلاف ورزی کی تھی اور منہی کرد قوم پر ممنوع اسلحوں کا استعمال کیا تھا۔

عالمی اور عرب انسانی حقوق کی تنظیموں نے حلبچہ کے حادثۂ فاجعہ کی تحقیق وتفتیش کا مطالبہ کیا، لیکن سانحہ باقی رہا، جرم زندہ رہا، مجرم صدام بھی زندہ و باقی رہا، جس نے ہٹلر، مسولینی اور چاؤ چیکو کو بھی پیچھے چھوڑ دیا، صدام بغیر کسی محاسبہ اور سزا کے باقی رہا، حتیٰ کہ حلبچہ کی مسلم قوم کے خلاف صدام کے اس مجرمانہ فعل کی مذمت کی قرارداد بھی نہ پاس کی جا سکی ؛ سارے لوگوں نے اس کے جرم سے تجاہل برتا، پھر صدام نے دوبارہ مسلم کویتی قوم کو اپنے مجرمانہ کارروائی کا نشانہ بنایا، اور کویت کو دوسرا حلبچہ بنانا چاہا، ہم یہ بات ببانگ دہل اور بزدر کہہ سکتے ہیں، کہ اگر صدام حسین پر ہم نے بندش نہیں لگائی، اور انسانیت کے خلاف جس منطق کا اس نے استعمال کیا اس کا جواب نہ دیا تو ہم دسیوں " حلبچہ " کا مشاہدہ کریں گے، خونخوار صدام صرف کویت کو اپنی دہشت گردی کا نشانہ بنا کر خاموش نہیں ہو جائے گا بلکہ اس کی دہشت گردی کا دائرہ وسیع ہو جائے گا۔ (فاعتبروا یا اُولی الأبصار)

اس وقت ہم عصر جدید کے سب سے بڑے جرم کے سامنے کھڑے ہیں، جس کا ارتکاب صدام نے کیا ہے، یہ مجرمانہ اقدام اسلام اور انسان کے خلاف ہے، بلکہ ساری انسانیت کے خلاف ہے، مسلم قوم کے اجتماعی قتل و ہلاکت کا جرم، ایک ایسی قوم کی ہلاکت کا جرم جو اسلام پر مضبوطی سے جمی ہوئی تھی، اور جو صدام کے الحادی مذہب کے خلاف تھی، ایک ایسی مسلمان قوم کے خلاف اجتماعی قتل کا جرم جس نے ہمارے لئے صلاح الدین ایوبی کو جنم دیا تھا اس لئے کہ صدام کو خوف تھا کہ حلبچہ سے اس کا کہیں منہ توڑ جواب دینے کے لئے کوئی دوسرا صلاح الدین نہ پیدا ہو جائے !

فروری ۱۹۸۸ء میں صدام نے جس جرم کا ارتکاب کیا تھا، کیا مسلمانانِ عالم اس کو جانتے ہیں ؟

وہ داعیانِ اسلام ؟ جو صدام کے کھوکھلے نعروں، جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈوں اور اس کے اسلام کے جھوٹے اور پرفریب دعووں سے دھوکہ کھا گئے ہیں، اور اس کی مقدس جہاد کی باطل دعوت کے چکر میں پھنس گئے ہیں، کیا انہیں صدام کے جرائم اور حلبچہ کی مسلم قوم کے حادثۂ فاجعہ کے بارے میں کچھ معلوم ہے ؟ ۔

بشکریہ ہفت روزہ
" الدعوۃ "
(۱۷/۲/۱۱/۱۴۱۱ھ)

مئو میں خلیج کے موضوع پر اہم اجتماع

مورخہ ۲۴ر فروری ۱۹۹۱ء جامع مسجد فیض عام مئو ناتھ بھنجن میں خلیج کی موجودہ نازک صورت حال پر ایک اہم اجتماع زیر صدارت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن فیضی ناظم جامعہ فیض عام مئو، منعقد ہوا، جس میں مدارس اہل حدیث مئو کے ذمہ داران اساتذہ وطلبہ، اور برادران جماعت اہل حدیث نے بڑی تعداد میں شرکت کی، محترم ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن صاحب ازہری وکیل الجامعۃ السلفیہ بنارس رحفظہ اللہ خاص اسی اجتماع کے لئے بنارس سے مئو تشریف لائے، اجتماع میں شرکت فرمائی، اور حاضرین کو مفصل خطاب فرمایا۔

پہلے صدر اجلاس مولینا حبیب الرحمٰن فیضی نے تقریر کی، فرمایا: کویت جیسے امن پسند مسلم ملک پر صدام کے جارحانہ حملہ اور غاصبانہ قبضہ کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے، صدام نے کھلی جارحیت اور ظلم و بربریت کا ارتکاب کیا ہے، اس ظالم نے ایک ایسا فتنہ برپا کیا ہے کہ عراق اور عراقی قوم ہی نہیں پوری عرب قوم بلکہ امت مسلمہ جس کی زد میں ہے، جو لوگ ایسے ظالم کی حمایت کرتے ہیں وہ عقل سے کورے ہیں، ظالم کی حمایت ہرگز درست نہیں ہے، نہ عقلاً نہ شرعاً، صدام ظالم ہونے کے ساتھ اسلام دشمن بھی ہے۔ انہوں نے کبھی بھی اسلام کی، مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کی ہے، بلکہ اپنے ملحدانہ نظریات کے ذریعہ اسلام کو بہت نقصان پہونچاتے رہے ہیں۔ انہوں نے عراق کو ایک دین و مذہب سے بیگانہ سماج میں تبدیل کر دینے کی کوشش کی ہے۔ ... ان سب کے برخلاف کویت مظلوم ہے اور سعودیہ اس مظلوم کی مدد کے لئے پوری عزیمت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوگیا ہے، نیز کویت اور سعودی عرب نے ان کے حکمرانوں اور رعایا سبھی نے ہمیشہ اپنے کو اسلام سے وابستہ رکھا ہے، اور اسلام کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت کے لئے پوری دنیا میں ہر سطح پر بیش بہا خدمات انجام دیتے رہے ہیں، ہم انہی وجوہ سے سعودی عرب و کویت اور خادم الحرمین الشریفین ملک فہد آل سعود اور امیر جابر احمد الصباح (ایدھما اللہ بنصرہ) کی حمایت کرتے آئے ہیں، اور خلیج کے موجودہ قضیۂ نامرضیہ میں ان کے موقف اور تمام تدابیر و مساعی کی بھرپور تائید و حمایت کرتے ہیں، ہماری یہ تائید ہرگز کسی مادی اور دنیاوی غرض کے لئے نہیں ہے، ایسا کچھ دوسرے لوگ کر رہے ہوں گے، ہندوستان میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی دعوت اور آل سعود کی حکومت

کی اول روز سے جو لوگ حمایت کر رہے ہیں وہ صرف اہل حدیث ہی ہیں۔ پٹرو ڈالر تو بہت بعد کی چیز ہے جس کی بنا پر کچھ قدیم معاند جماعتیں بھی آج سعودیہ کی حمایت کرنے لگی ہیں، ہماری حمایت ہرگز ایسی مفاد پرستانہ نہیں ہے، ہماری تائید عقیدہ و دین کی بنا پر ہے۔ بہرحال صدام کو کویت بالکل کسی شرط کے بغیر خالی کر کے اسکی مکمل آزادی بحال کرنی چاہئے، ورنہ " سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون "

صدر محترم کی تقریر کے بعد محترم ڈاکٹر حافظ مقتدیٰ حسن ازہری وکیل الجامعۃ السلفیہ بنارس حفظہ اللہ نے حاضرین کو خطاب فرمایا، موصوف نے اپنی تقریر کا آغاز علامہ اقبال اور رفعنا ابن فیضی کے مندرجہ ذیل اشعار سے کیا :

دل بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک ٭ نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری (اقبال)

کفر عصیاں کے لئے اسکا وجود ایندھن ہے ٭ ملت ختم رسل شعلہ بہ پیراہن ہے (رفعنا)

یہ ہوا بن کے چراغوں سے رہا گرم ستیز ٭ اس کے آغوش میں پلتے رہے کتنے چنگیز

گمرہی کو مری خود اس نے دکھائے ہیں چراغ ٭ میں نے خود اسکے چراغوں سے جلائے ہیں چراغ

بجھ چلے تھے مری رنگین سیاست کے دیئے ٭ اس نے خود کوششیں کیں میرے مقاصد کے لئے

غم دنیا سے فراغت نہیں ہر چند مجھے ٭ پھر بھی آدم نے دیا ذوق سکوں مند مجھے

موصوف کی تقریر کا خلاصہ آگے درج کیا جا رہا ہے، فرمایا :

کوئی مسئلہ جس قدر زیادہ نازک ہو اسے اتنی ہی نزاکت سے لینا چاہئے، ہوٹل اور سڑک کی ہلڑ بازی سے ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا، فلسطین کا مسئلہ ہمارے نزدیک سیاسی نہیں بلکہ دین کا مسئلہ ہے، ہر مسلمان کو اس کے لئے کوشش کرنی چاہئے، یہ مسئلہ سیاست بازی اور محض ہیرو بننے کے لئے جذباتی پروپیگنڈہ اور انجام سے بے خبر ہو کر طالع آزمائی کرنے سے حل نہیں ہوگا، ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں جو صاحب عرب لیڈر بنے ہوئے تھے اور جو صاحب آج لیڈر بنے ہوئے ہیں، دونوں کا سیاسی واقتصادی نظریہ ایک رہا ہے۔ اسلام سے نہ انھیں مطلب تھا نہ انھیں مطلب ہے، محض اسلام کا نام لے کر جذبات کو مشتعل کیا جا رہا ہے اور اپنا بھرم بنایا جا رہا ہے، وہ بھی ڈینگیں مارتے تھے، یہ بھی ویسی ہی ڈینگیں مار رہے ہیں۔ مگر حکمت وعزیمت سے بیگانہ، نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت بھی مسلمانوں کو ادبار اور رسوائی کا سامنا کرنا پڑا، اور آج بھی موجودہ نام نہاد لیڈر کی بے بصیرتی سے یہی خطرہ لاحق ہے۔

محض اسلام کا نام لینے اور دعویٰ کرنے سے ہمارے مسائل حل نہیں ہو سکتے، ایمان واسلام میں خلوص اور صدق دلی

دعزیمت کے ساتھ پورے دین پر عمل ہونا چاہیئے، تب ہماری غیب سے مدد ہوگی، نصرت الٰہی نازل ہوگی یہی سنت اللہ رہی ہے اس قانون میں ہمارے لئے کوئی تبدیلی نہیں ممکن ہے کہ ہم محض دعویٰ اسلام کریں، اور ہمارے مسائل چٹکی بجاتے حل ہو جائیں، ہم فاتح وغالب ہو جائیں، ہرگز ایسا نہیں ہے۔ فرمان خداوندی ہے: (وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم» الآیۃ)

دین دعویٰ اور پروپیگنڈہ کا نام نہیں ہے، اسلام اول سے آخر تک کاروبار حیات اور دستور زندگی ہے، اور ہر معاملہ میں ہمارے لئے وہی معیار ہے، اسی معیار کو ہمیں ہر جگہ اختیار کرنا چاہیئے، خلیج کے مسئلہ میں بھی اسی معیار کو پیش نظر رکھنا ہوگا، جب یہ حقیقت پوری دنیا کو تسلیم ہے اور پوری بین الاقوامی برادری ہے کہ صدام جارح ہے، بے گناہ کویتیوں کے خلاف اس نے گھناؤنے ظلم کا ارتکاب کیا ہے۔ نیز وہ عملاً اسلام سے بیگانہ بھی ہیں، انہوں نے آج تک اسلام کی اور امت مسلمہ کی کوئی خدمت نہیں کی ہے تو پھر اس کی حمایت اور ایسے ظالم وجابر اور ننگ اسلام کو " اسلامی ہیرو " قرار دینے کے کیا معنیٰ؟ کیا اسلامی قائد ایسے ہی ہوتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ صدام نے اپنی دہشت گردی کے لئے اسلام اور جہاد کا نام استعمال کر کے اسلام کی تصویر مسخ کر دی ہے۔

۱۹۸۳ء میں یورپ والوں نے ایک انٹرنیشنل مذہب بنانے کی تحریک چلائی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہر مذہب سے اچھی اچھی باتیں لے کر ایک مذہب بنا لیا جائے، علماء اسلام نے کہا، ٹھیک ہے، آپ لوگ اپنے اپنے مذہب کی اچھی اچھی باتیں جمع کر کے لائیں، ہم بھی دین اسلام کی باتیں پیش کرتے ہیں موازنہ کر کے دیکھ لیا جائے، جس میں زیادہ اچھائی اور خوبی ہو اسے قبول کر لیا جائے، دین اسلام جو تمام تر خوبیوں کا مجموعہ ہے، جو ایک مکمل نظام زندگی ہے، یورپ والوں نے خطرہ محسوس کیا کہ یہ اسلام غلبہ حاصل کرلے گا، اور اس لئے انہوں نے یہ تحریک ترک کر دی۔ ہمارے مصری استاذ علامہ شیخ غزالی نے اپنی مشہور کتاب — حقوق الإنسان بين تعاليم الإسلام وإعلان الأمم المتحدة — میں اقوام متحدہ کے مرتب کردہ انسانی حقوق اور اسلامی پیش کردہ انسانی حقوق کے درمیان موازنہ کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اقوام متحدہ کا چارٹر ناقص ہے، اسلام سے بہتر کوئی مجموعہ مرتب نہیں کیا جا سکتا، وہ مقبول اور پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

اگر اسلام کا غلبہ مقصود ہے تو وہ اسلامی نظام کو اختیار کر کے اور سچائی کے ساتھ اس پر عمل کر کے ہوگا، اشتراکیت اور بعثیت کا نام اسلام نہیں ہے، اس کے ذریعہ اسلام کو غلبہ حاصل نہیں ہوگا، صدام جو عرب قومیت اور بعثیت کے علم بردار ہیں ان سے اسلام کو نہ کبھی فائدہ پہونچا ہے نہ پہونچے گا، حنفی اہل حدیث کے چکر میں پڑ کر حق وناحق کی تمیز ختم نہیں کرنا چاہیئے، ہندوستانی مسلمانوں کا عجیب حال ہے خواہ مخواہ کے لئے ہر معاملہ میں ٹانگ اڑانا ضروری سمجھتے ہیں۔

۱۹۶۷ء کے بعد ہمارے مسائل بڑھتے ہی جا رہے ہیں، کوئی مسئلہ کم نہیں ہوا ہے خلیج کے مسئلہ میں ہم نے اپنے کو ملوث کر دیا تو کیا ہمارے اپنے مسائل حل ہو چکے ہیں، کیا ہم ان سے فارغ ہو چکے ہیں؟ ــــ علامہ ابن خلدون کے بیان کردہ قوموں کے عروج و زوال کے فلسفہ کی تشریح کرنے کے بعد فرمایا: اسلام میں بادشاہی ناجائز نہیں ہے، ذرائع نہیں مقاصد اصل ہیں اسلامی شریعت کا نفاذ اور زندگی میں اسکی تطبیق اور کتاب وسنت کی حکمرانی اسلامی حکومت کا مقصد ہے، یہ حاصل ہو تو وہ حکومت اسلامی ہے، جمہوری ہو یا موروثی یا کوئی اور، موجودہ سعودی حکومت توحید کی علمبردار، قرآن وحدیث کی پیروکار ہے، شریعت اسلامیہ ہی اس کا دستوری قانون ہے جسکا پوری پابندی کے ساتھ نفاذ کیا جاتا ہے۔

سعودی حکومت بدعات وخرافات سے مملکت کو پاک رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہے ورنہ وہاں بھی کچھ بدعت پسند ہیں، انہوں نے ایک بار اسکی کوشش کی کہ "میلاد نبوی" منانے کی اجازت دی جائے لیکن سعودی حکمرانوں نے یہ مطالبہ سختی کے ساتھ رد کر دیا، سعودی حکومت نے آج تک امریکہ وغیرہ کی دین کے معاملہ میں کوئی تائید نہیں کی ہے ــــ سعودی حکومت کے خلاف آج جو مظاہرے کئے جا رہے ہیں اور جو تیزی دکھائی جا رہی ہے اسکا اصل منشاء امریکہ، برطانیہ، اور اسرائیل نہیں ہیں بلکہ ان ممالک کے پردہ میں سعودیہ مخالف عناصر اپنی قدیم دشمنی کے جذبات کو تسکین دینا چاہتے ہیں، وہ حرم میں پھر چار مصلوں کی بدعت کو قائم کرنکے اپنے خواب کو پورا کرنا چاہتے ہیں، مگر.. انشاء اللہ یہ سب کچھ بھی نہیں ہوگا، فتح حق وانصاف کی ہوگی ــــ حجاز اور حرمین شریفین کو بین الاسلامی تحویل میں دینے کے لئے عرصہ سے جو نعرہ بلند کیا جا رہا ہے اسکے پیچھے بھی درحقیقت وہابیت دشمنی ہی کارفرما ہے، مکہ ومدینہ کی حرمت وتعظیم مقصود نہیں ہے، یہ معاندین ان مقامات مقدسہ کو پھر بدعات وخرافات کی گندگی سے ملوث کرنا اور سیاست بازی کی آماجگاہ بنا دینا چاہتے ہیں، ہم اہلحدیث کبھی بھی اسکی اجازت نہیں دے سکتے ــــ سعودیہ کی مخالفت ودشمنی اگر اسکی وہابیت وسلفیت کی بناء پر نہیں ہے، "سامراجیت" کی بناء پر ہے تو پھر یہ لوگ علماء صادق پور کی تعریف کیوں نہیں کرتے، جو انگریزی سامراج کے خلاف مسلسل برسرپیکار اور معرکہ آرا رہے ــــ وطن اور جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت کے لئے کسی سے بھی مدد لی جاسکتی ہے، تحفظ وطن کے لئے پہلا معاہدہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے کیا تھا، یہ سیاست نبوی آج تک چل رہی ہے، مسلمانوں سے دشمنی وعداوت میں نصاریٰ کا درجہ تیسرا ہے۔ قرآن پڑھئے وہ کہتا ہے۔ لتجدن اشد الناس عداوۃ الخ۔

اسرائیل کی شکست کی تمنا ہر دل مسلم میں ہے لیکن محض آرزوں سے، بلند بانگ نعرہ بازی سے یہ میدان سر نہیں کیا جاسکتا، اسکے لئے سب سے زیادہ اور اولین ضرورت باہمی اتحاد کو قائم رکھنے اور مضبوط بنانے کی ہے، مگر صدام نے اسی بنیاد کو ڈھا دیا ہے، وہ اسلام کے اور فلسطینیوں کے ہمدرد ہوتے تو باہمی اتحاد کو مستحکم کرنے کی کوشش کرتے اور متحدہ قوت کے ساتھ اسرائیل پر حملہ آور ہوتے۔

محفوظ الرحمن فیضی
جامعہ فیض عام مئو ناتھ بھنجن، یوپی،

مدرسہ عربیہ دارالتعلیم مبارکپور میں

خلیجی بحران پر ایک اجتماع

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم

حضرۃ الشیخ علامہ عبیداللہ صاحب رحمانی مبارکپوری حفظہ اللہ کی رہنمائی میں حرمین شریفین کے تقدس اور حاکم عراق صدام حسین کے فتنہ کی بابت ہندوستانی مسلمانوں کے موقف کے تعلق سے مدرسہ عربیہ دارالتعلیم مبارکپور کے زیر اہتمام ایک عظیم اجلاس مورخہ ۱۹؍۲؍۹۱ء کو منعقد ہوا، جس میں قصبہ مبارکپور کے علاوہ مضافات کی بستیوں سے کثیر افراد نے شرکت کی، جامعہ سلفیہ بنارس سے مولانا عبدالوہاب حجازی، ڈاکٹر عبدالرحمن عبدالجبار الفریوائی، اور ڈاکٹر رضاء اللہ مبارکپوری نے شرکت کی۔

جلسہ کا آغاز مولانا عبدالرحمن صاحب مبارکپوری کی زیر صدارت مدرسہ مذکورہ کے ایک طالب علم کی تلاوت کلام پاک سے ہوا، صدر جلسہ نے اجلاس کے مقاصد اور اس کی اہمیت، نیز صدام حسین حاکم عراق کی ضد اور ہٹ دھرمی کے نتیجہ میں خلیج کی تباہ کن جنگ اور اس کے اسلامی دعوت پر مرتب ہونے والے برے اثرات کی طرف مختصر مگر جامع اشارہ کیا۔

اس جلسہ کو سب سے پہلے مولانا مطیع اللہ صاحب سلفی استاذ مدرسہ عربیہ دارالتعلیم نے خطاب کیا، موصوف نے سعودی حکومت اور وہاں کے اہل خیر کی پوری دنیا میں اسلام کے فروغ اور حرمین شریفین کی تعمیر و ترقی، عقیدۂ توحید کی اشاعت اور دینی و علمی کتب کی بڑے پیمانہ پر بلا قیمت تقسیم کا تفصیل سے ذکر کیا، اور عراقی نظام حکومت کے ظالمانہ رویہ اور گمراہ کن پروپیگنڈے کا پردہ چاک کیا۔

اس کے بعد مدرسہ مذکورہ کے دوسرے استاذ مولانا عتیق الرحمن سلفی نے سعودی حکومت کی بابت عراقی حکومت کے گماشتوں کے گمراہ کن جھوٹے پروپیگنڈے کا رد اپنے مشاہدات کی روشنی میں تفصیل سے کیا، اور بتایا کہ سعودی حکومت کا نظام کتاب و سنت پر مبنی ہے اور یہ کہ حرمین شریفین مواقع جنگ سے ہزاروں کیلومیٹر دور اور ہر طرح کے جنگی اثرات سے مامون و محفوظ ہیں۔

اس کے بعد مولینا عبدالوہاب حجازی استاذ جامعہ سلفیہ وایڈیٹر ماہنامہ محدث بنارس نے جامع تقریر فرمائی، اور مسلمانوں اتحاد واتفاق اور کتاب وسنت پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی، اور قرآنی آیات واحادیث نبویہ کی روشنی میں اسلامی وحدت اور ہم آہنگی کی اہمیت کی تشریح فرمائی، اور اس سلسلہ میں سعودی حکومت کی مساعی کا ذکر کرتے ہوئے عراق، کویت، اور عالم اسلام میں عراقیوں کے گھناؤنے جرائم کی مذمت کی، اور مسلمانوں کو اتحاد واتفاق اور دین اسلام کے ساتھ پوری قوت سے وابستگی کے ساتھ ساتھ بے دین، ملحد اور اہل نفاق کے گمراہ کن پروپیگنڈے (جن کا شکار حقیقت حال سے بے خبر سادہ لوح مسلمان ہو رہے ہیں) کی طرف کان نہ دھرنے کی تلقین کی۔

مقرر موصوف نے کویت سے عراقیوں کے بلاکسی قید وشرط کے مکمل انخلاء کا مطالبہ کیا تاکہ خلیج میں پائیدار امن کی راہ ہموار ہوسکے، موصوف نے امریکہ اور اتحادیوں سے بھی مطالبہ کیا کہ عراقی فوجوں کے کویت سے مکمل انخلاء اور کویتی حکومت کی بحالی اور اس کی دائمی سلامتی کے بندوبست کے بعد اتحادی فوجیں بھی اس علاقے سے بلا تاخیر واپس ہوجائیں۔

موصوف کی اس معلوماتی اور مدلل تقریر کا حاضرین پر بڑا اچھا اثر مرتب ہوا، آخر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب فریوائی استاذ جامعہ سلفیہ بنارس، وصدر دارالدعوۃ الہ آباد نے ایک طویل اور جاذب توجہ تقریر فرمائی اور عراقی ڈکٹیٹر صدام حسین کے اپنے مخالف عراقی عوام بالخصوص سنیوں صلیبیوں سے بیت المقدس کو آزاد کرانے والے اسلامی ہیرو سلطان صلاح الدین ایوبی کی بہادر، دین اسلام کی فدائی قوم کردیوں کے خلاف جنگی جرائم سے پردہ ہٹایا، اور بتایا کہ صدام حسین کے ان مجرمانہ اقدام کا ڈانڈا کمیونسٹ نظام کے خونی یلغار سے ملتا ہے جس نے ایشیا اور مشرقی یورپ کی ۳۵ اسلامی حکومتوں کو ہڑپ کرلیا، اور اس کی پوری کوشش اب اسلامی حکومتوں تک رسائی کی جارہی ہے، چنانچہ عراق، مصر، یمن، شام، تحریک آزادی فلسطین کے مسلم عوام کو عرب اشتراکی نظام کا نشانہ بنانے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوگیا، اور اس کی تگ ودو مراکش، جزائر، لیبیا، تونس، ترکی، افغانستان اور برصغیر ہندوپاک تک پھیل گئی، اور اسلامی نظام حکومت کی جگہ اشتراکیت کے خالص مادہ پرستانہ وملحدانہ نظام کو نافذ کرانے کے مقصد میں اسے بڑی حد تک کامیابی بھی ملی۔

اللہ کا صد شکر ہے کہ اس نے سعودی حکومت کو شرک وکفر، الحاد ونفاق اور فسق وفجور کے فتنوں سے دور رکھا، اور اس کی بھرپور اسلامی کوشش سے مسلم اور عرب ممالک بالخصوص خلیج ریاستوں اور کویت پر بڑا مثبت اثر مرتب ہوا۔

عراق کا ایک مسلم وصلح جو حکومت کویت پر قبضہ کرکے اسے تباہ وبرباد کرنا اور وہاں کے عوام کو بے دریغ فنا کے گھاٹ اتارنا اور اپنی مسلح افواج کو سعودی حکومت کی سرحدوں پر لا کھڑا کرکے اس پر جنگ مسلط کردینا، دیار مقدسہ اور حرمین شریفین کے مسلم ہزار امن

شہریوں کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کرنا ایسا بھیانک جرم ہے جس کی نہ تو اسلام اجازت دیتا ہے، اور نہ ہی عربوں کی قدیم روایات اور نہ ہی بین الاقوامی قوانین میں اس کی کوئی گنجائش ہے۔

اُعداد و شمار اور بین الاقوامی رپورٹوں کی روشنی میں اسلام کے مرد مجاہد سلطان صلاح الدین ایوبی رحمہ اللہ کی جانباز کرد قوم کے خلاف عراقی ڈکٹیٹر کے جرائم کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا۔

فاضل مقرر نے اس ضمن میں موجودہ صحافت کے اس رویہ کی بھی مذمت کی جو وہ اس بارے میں ہر قسم کے جھوٹ و ظلم کو حق بجانب ثابت کرنے میں مصروف ہے، اور بتایا کہ مسلم صحافی بدعات و خرافات اور الحادی پروپیگنڈے کے زیر اثر ایسا کر رہے ہیں اس سے خلیجی جنگ اور کویت و عراق کے جھگڑے کی بابت جو عراقی بعثی حکومت کا پیدا کردہ ہے، رائے عامہ کو صحیح خطوط پر چلانے اور ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے سے متعلق کسی اچھے طرز عمل کی امید نہیں کی جاسکتی، اسی لئے ان کی غلط بیانیاں اور افترا پردازیاں لائق توجہ نہیں ہیں۔ ٹھوس دلائل کی روشنی میں سامعین کو صحیح معلومات کے مآخذ کی طرف رہنمائی کی جس سے ان کی غلط فہمیاں دور ہوسکیں، اور مسلمانوں کو موجودہ حالات سے عبرت اندوز ہونے، باہمی اتحاد و اتفاق اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ سے تمسک، توبہ اور رجوع إلی اللہ کی تلقین کی۔

اُخیر میں خلیجی بحران کے بارے میں منظور کردہ تجاویز پڑھ کر سنائی گئیں، اور اس فتنہ کے خاتمہ اور مسلمانان عالم کی سلامتی کی دعاء پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

عبد الرحمن الرحمانی

رپورٹ دورۂ مشرقی و مغربی چمپارن (بہار)
برائے تشریح مسئلہ خلیج

مورخہ ۱۲ر فروری ۱۹۹۱ء کو جامعہ سلفیہ بنارس کے اساتذہ کرام کی ایک ہنگامی میٹنگ میں یہ طے پایا کہ خلیج کے مسئلہ میں عوام کی صحیح رہنمائی کے لئے جامعہ کے اساتذہ کو اہم کردار ادا کرنا چاہئے۔ اس تحریک پر احقر اور شیخ اصغر اپنی ریاست بہار کے دو اضلاع (مغربی و مشرقی چمپارن) کے ہنگامی دورہ پر مورخہ ۱۷ر فروری کو نکل پڑے اور دونوں اضلاع (بشمول نیپال) کے دس مقامات پر عوام سے خطاب کیا، نیز مجلسوں میں بھی لوگوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا، مندرجہ ذیل مقامات پر باضابطہ جلسۂ عام کا انعقاد کیا گیا۔

۱۸ر فروری ۱۹۹۱ء موضع کنوداں مشرقی چمپارن۔ حاضرین کی تعداد تیس کے قریب تھی مگر بہت سے لوگ اور خواتین گھروں سے بذریعہ مائک سن رہی تھیں، یہاں پر میں نے ڈیڑھ گھنٹہ تک خطاب کیا جس میں مسئلہ خلیج کے تمام حقائق پر روشنی ڈالی۔

۱۹ر فروری ۱۹۹۱ء مرکز العلوم الاسلامیہ چند نبارہ، مشرقی چمپارن۔

حاضرین کی تعداد لگ بھگ دو سو تھی۔ خواتین کے علاوہ جو گھروں سے سن رہی تھیں، پہلے مولانا شکیل احمد اثری استاذ مرکز العلوم نے تعارفی و تمہیدی تقریر کی، پھر میری تقریر ڈیڑھ گھنٹہ تک ہوئی جس میں خلیجی مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی، اخیر میں صدر محترم جناب مولانا رفیق سلفی استاذ مدرسہ کریمیہ ڈھاکہ کی صدارتی تقریر اور دعا پر اجلاس کا تمام ہوا۔

۲۰ر فروری ۱۹۹۱ء قصبہ گھوڑاصحن، مشرقی چمپارن۔

یہاں باضابطہ اجلاس نہیں ہو سکا، چند لوگوں سے گفتگو ہوئی جس میں ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔

۲۱ر فروری ۱۹۹۱ء موضع بسنت پور، ضلع مغربی چمپارن (میری بستی)

حاضرین کی تعداد سو کے قریب تھی۔ لیکن بہت سے لوگ اور خواتین گھروں سے سن رہی تھیں، جیسا کہ صبح کو پتہ چلا۔ سب سے پہلے مولانا محمد ہاشم سلفی ناظم اعلیٰ ضلعی جمعیت مغربی چمپارن نے تمہیدی و تعارفی تقریر کی، ان کے بعد ضلعی جمعیت کے امیر مولانا محمد علی مدنی استاذ مدرسہ منظر العلوم بلی راجپور نے آدھا گھنٹہ تک مسئلہ پر کتاب و سنت کی نصوص کے ذریعہ روشنی ڈالی، یعنی پڑوسی خصوصا

مسلم پڑوسی کے کیا حقوق ہیں، اور دوسرے کے مال و دولت اور عزت و آبرو کی حرمت شریعت اسلامیہ میں کتنی زبردست ہے۔ لیکن صدام نے کسی کا پاس و لحاظ نہ کر کے مسلم اور محسن پڑوسی کی مال و دولت اور عزت و آبرو پر حملہ کر دیا۔ یہ کیسے اسلام کا مجاہد اور ہیرو ہو سکتا ہے۔

ان کے بعد احقر نے گاؤں کی تلخ فضا کے پس منظر میں نہایت غیظ و غضب کے عالم میں ڈیڑھ گھنٹہ تک خطاب کیا جس میں مسئلہ خلیج کے تمام پہلوؤں پر کتاب و سنت، تاریخ و حقائق کی روشنی میں خطاب کیا، درمیان خطاب نعرہ بازی کی گئی ہنگامہ کی کوشش کی گئی، اور اخیر میں مسجد کے مائک پر کسی بریلوی مقرر کی تقریر لگا دی گئی۔ مگر تمام سے قطع نظر ہمارا پروگرام ساڑھے سات سے دس بجے تک بخیر و خوبی چلتا رہا۔ وللہ الحمد۔

۲۲ر فروری ۱۹۹۱ء خطبہ جمعہ موضع جھمکا و موضع بھیڑ پہاڑی، مغربی چمپارن۔

یہ دونوں جماعت کی بڑی بستیاں شمار ہوتی ہیں، مگر یہاں کے عوام کا زیادہ ہی دماغ خراب کر دیا گیا تھا۔ جھمکا میں احقر نے خطبہ دیا، اور بھیڑ پہاڑی میں شیخ اصغر علی نے بہرحال پچاس فیصد سے زیادہ لوگوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

۲۲ر فروری ۱۹۹۱ء مدرسہ سلفیہ منظر العلوم بلی رامپور، مغربی چمپارن۔

یہ حضرت مولانا منظور الحق بلی رامپوری مرحوم کا مدرسہ ہے، اس بستی کے لوگ حقیقت حال سے آگاہ تھے، اور بتوفیق الٰہی صدامی فتنہ سے متنفر۔ یہاں سب سے پہلے مولانا محمد ہاشم نے تمہیدی تقریر کی۔ پھر شیخ اصغر نے آدھا گھنٹہ تک موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، اخیر میں احقر نے ایک گھنٹہ خطاب کیا، صدارت مولوی فیاض الدین بن مولانا منظور الحق بلی رامپوری نے فرمائی۔

۲۳ر فروری ۱۹۹۱ء مدرسہ سلفیہ کنز العلوم رنگ پور، کلیا، (نیپال)

یہ مدرسہ بھی مولانا منظور الحق بلی رامپوری کا قائم کردہ ہے، یہاں سب سے پہلے مدرس کے صدر مدرس مولانا عبدالحق اثری نے تعارفی و تمہیدی تقریر کی، ان کے بعد شیخ محمد شعیب عالم مدنی استاذ مبعوث مدرسہ ہذا نے ایک گھنٹہ تک جوشیلا خطاب کیا، جس میں مسئلہ خلیج کے اسباب و عوامل پر تاریخ وار روشنی ڈالی، اخیر میں احقر نے ایک گھنٹہ تقریر کی، بارہ بجے دعا پر اجلاس کا خاتمہ ہوا۔

۲۵ر فروری ۱۹۹۱ء موضع گدیانی، ضلع مغربی چمپارن۔

یہاں ظہر کی نماز کے بعد ایک صاحب کی بیٹھک میں آدھا گھنٹہ میں نے موضوع کے صرف چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی، کیونکہ اس بستی کے لوگ صدام سے متنفر پہلے ہی سے تھے۔

۲۵ر فروری ۱۹۹۱ء موضع برندابن، ضلع مغربی چمپارن (شیخ اصغر کی بستی)

یہاں مغرب کے بعد اجلاس عام شروع ہوا، سب سے پہلے ضلعی جمعیت کے امیر مولانا محمد علی مدنی نے آدھا گھنٹہ تقریر کی، پھر مولانا اصغر علی نے ۱۵ر ۲۰ منٹ خطاب کیا۔ ان کے بعد احقر نے ایک گھنٹہ خطاب کیا اور مسئلہ خلیج پر کتاب وسنت اور تاریخ کی روسے روشنی ڈالی۔

۲۶ر فروری ۹۱ء معہد احیاء السنہ معرولی کلک، مغربی چمپارن۔

یہ ضلعی جمعیت کا تعلیمی ادارہ ہے، یہاں مولانا محمد علی مدنی امیر ضلعی جمعیت کی صدارت میں اجلاس عام ہوا۔ حاضرین میں معہد کے اساتذہ وطلبہ (۵۰ افراد) کے علاوہ قریبی بستیوں کے معتد بہ حضرات شریک ہوئے، نیز مالک کے دو ساؤنڈ بکسوں کا رخ قریبی بستیوں کی طرف کردیا گیا۔ سب سے پہلے مولانا محمد ہاشم ناظم اعلیٰ ضلعی جمعیت نے تعارفی وتمہیدی کلمات کہے۔ ان کے بعد شیخ اصغر نے ایک گھنٹہ تک مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی، ان کے بعد احقر نے بھی ایک گھنٹہ تک کتاب وسنت اور تاریخ کی روشنی میں مسئلہ خلیج کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اخیر میں صدر جلسہ کی صدارتی تقریر اور دعا پر اجلاس کا خاتمہ ہوا۔

نوٹ:۔ ان تمام اجلاسوں میں کہیں مفصلاً اور کہیں مختصراً مندرجہ ذیل موضوعات پر روشنی ڈالی گئی۔

وہابی تحریک، تحریک شہیدین، دونوں تحریکوں سے قبوری اور بدعتی پارٹی کی دشمنی اور ان کے بارے میں غلط پروپگنڈہ بعث پارٹی اور صدام کی سیاہ تاریخ اور سیاہ کارنامے، موجودہ جنگ کے اسباب وعوامل، اختلاف بین المسلمین کی صورت میں قرآنی ہدایت، پڑوسی خصوصی مسلم اور محسن پڑوسی کے حقوق، موجودہ عراقی قبضہ اور قبضہ کے بعد کویت میں عراقی فوجوں کے ہاتھوں کویتیوں نیز غیر کویتیوں پر ظلم وبربریت، لوٹ مار، آبرو ریزی، مسئلہ فلسطین کی تاریخ، فلسطین کی آزادی میں سعودیہ اور کویت کے کارنامے اور صدام کا عدم تعاون، ساری دنیا میں اسلام کی نشر واشاعت اور اسلامی مراکز اور عام مسلمانوں کے لئے سعودیہ کی اور کویت کی مدد، عیسائی مشنریوں کی تگ ودو کے جواب میں سعودیہ کے تبلیغی کارنامے، موجودہ جنگ میں سعودیہ کا موقف از روئے شریعت، جنگ وجہاد میں غیر مسلموں سے تعاون، کویت پر عراقی قبضہ سے آئندہ اسلامی خدمات پر براثر، کویت پر عراقی قبضہ کو صحیح قرار دینے کے لئے صدام اور صدام نوازوں کی بکواس کا جواب، وغیرہ وغیرہ۔

اور باضابطہ جلسوں کے علاوہ بھی ہر مجلس میں ان موضوعات پر روشنی ڈالی گئی۔

احمد مجتبیٰ سلفی مدنی

استاذ جامعہ سلفیہ بنارس و

سرپرست ضلعی جمعیت مغربی چمپارن (بہار)

اجتماع بابت خلیجی بحران

منعقدہ زیر اہتمام جمعیت اہلحدیث پریوا نارائن پور ضلع پرتاپ گڈھ، یوپی،

آج مورخہ ۲۸ رجب مطابق ۱۴ر فروری بروز جمعرات ایک اجتماع عام تحفظ حرمین اور خلیجی بحران کے
موضوع پر زیر صدارت مولانا ابونسیم گیاوی منعقد ہوا، تلاوت کلام پاک مولانا عبدالکریم عمری استاد مدرسہ دارالدعوۃ لا
گوپال گنج سے اجلاس کی ابتدا ۹ بجے رات میں ہوئی، اجلاس کو سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی نے خ
کیا، اور اس اجلاس کے اہداف و مقاصد پر روشنی ڈالی، اور بتایا کہ اس وقت عالم اسلام پر بہت بڑی مصیبت آپڑی
کہ دشمنوں کے اہداف و مقاصد کی تکمیل کے لیے جارح عراق کی کھلم کھلا جارحیت اور کویت پر یلغار اور اس پر قبضہ، اور دنیا
دنیا کی رائے کے علی الرغم کویت کو نہ خالی کرنا ایک فوری اور مؤثر سبب بن گیا ہے، اور امن و امان کے گہوارے کو عظیم خط
اور نقصانات کا سامنا ہے، موصوف نے اس جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے عام مسائل و مشکلات کا کتاب و سنت
کی روشنی میں جائزہ لیکر یہ بتایا کہ جنگ و جدال کی اس بھٹی میں کھرے اور کھوٹے کا پتہ چل جائیگا، یہ صرف خلیجی ممالک
کے حکمرانوں اور وہاں کے باشندوں کا امتحان نہیں ہے بلکہ اس وقت اس جنگ کے تناظر میں اہل ایمان کے گرو
میں کھرے کھوٹے کا پتہ چل گیا ہے، اسلامی یا مسلم تحریکوں کے دبیز اور تہ در تہ سیاست کا بھی پردہ چاک ہو گیا ہے
اس وقت صرف اہلحدیث منجملہ جماعتوں اور تحریکوں میں ایک ایسی جماعت ہے جس سے بجا طور پر یہ توقع تھی کہ اسلام
کے نازک لمحات میں مؤمنانہ بصیرت کا مظاہرہ کریگی، اس اجلاس کے انعقاد کا مقصد اسی مؤمنانہ بصیرت کی تذکیر
جس کے لیے جامعہ سلفیہ مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اپنے اساتذہ و طلباء کو میدان میں اتار دیا ہے۔ موصوف نے بتایا کہ
میں جب سلطان عبدالعزیز آل سعود کو اللہ تعالیٰ نے حرمین شریفین کی سیادت و قیادت اور خدمت کے اعزاز سے مشرف

اور استحکام نصیب ہوا تو ساری دنیا کے اہل بدعت نے آپ اور آپ کی حکومت اور آپکی وہابی دعوت کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ مہم کا سلسلہ شروع کیا، پرپوا میں منعقد ریاستی جمعیۃ اہلحدیث یوپی کے اجلاس میں سلطان عبدالعزیز کی تائید میں قرارداد اس گاؤں سے منظور ہوئی، اور اخبار اہلحدیث امرتسر اور اخبار محمدی دہلی میں یہ قرارداد تائید شائع ہوئی۔

اس کے بعد مولانا اصغر علی امام مہدی سلفی مدنی استاذ جامعہ سلفیہ بنارس نے خلیج کے مسئلہ پر کئے جانے والے غلط پروپیگنڈہ کے موضوع پر خطاب کرکے یہ بتایا کہ ہندوستان میں بہت زمانے سے سعودی عرب اور دوسرے عرب ملکوں کے مسلمانوں کے بارے میں علمی اور دینی حلقوں میں پروپیگنڈہ مہم جاری ہے، کچھ ماضی کی مثالیں دیتے ہوئے اپنے سعودی عرب کے تجربات کی مثالیں دیں، اور سعودی عرب کے نوجوانوں میں تحقیقی اسلامی لہر کے موضوع پر بڑی وقیع معلومات فراہم کیں، اور صدام حسین کی اسلامیت اور مسلمانوں سے ہمدردی کو دوسرے عرب حکام اور عوام کے حقیقی کرداروں سے مقابلہ کرکے اس بھیانک سازش کا پول کھولا۔

اس کے بعد مولانا عبدالوہاب حجازی استاذ جامعہ سلفیہ و ایڈیٹر محدث نے خلیجی خطہ میں پیدا ہونے والے اس عظیم اور پرخطر ماحول کے سلسلہ میں کتاب و سنت کی روشنی میں عام مسلمانوں کے فرائض پر بحث و گفتگو کی اور مومنین و صالحین اور کفار و فاسقین کی زندگیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بتایا کہ صدام اپنی پوری ذاتی اور حکومتی زندگی میں کبھی بھی اسلام کا ہمدرد نہیں رہا، اور اس کی یہ نئی تاریخ ظلم و بربریت پچھلی تاریخ کے عین مطابق ہے، اسلیے مسلمانوں کو کسی کی تائید یا مذمت میں پہلے صحیح حالات کا پتہ لگانا چاہئے، اس کے بعد اسلامی عقیدہ و شریعت کی روشنی میں، اور اپنے ثقات علماء حق کی آراء کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔

آخر میں قرارداد و تجاویز پڑھکر سنائی گئیں، نیز مختلف نمازوں کے اوقات میں گاؤں کی مختلف مساجد و مجالس میں اساتذہ جامعہ سلفیہ نے اس موضوع پر روشنی ڈالی۔

صلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

محمد حسان سلفی

امیر جمعیۃ اہلحدیث پرپوا نارائن پور ضلع پرتاپگڈھ، یوپی

ومدیر دارالدعوۃ۔

جمعیۃ الشبان المسلمین بنارس کے زیر اہتمام خلیجی بحران کے سلسلہ میں ایک اجلاس عام

مورخہ ۲۳ ؍فروری ۱۹۹۱ء بمقام جامع مسجد اہلحدیث مدنپورہ منعقد ہوا جس میں جامعہ سلفیہ کے فاضل اساتذہ نے اس بحران کے حقائق و مضمرات کا جائزہ لیا، نیز اس سلسلہ میں کئے جانے والے جھوٹے اور غلط پروپیگنڈہ کی حقیقت بیان کی۔

تلاوت کلام پاک کے بعد مولانا عبدالوہاب صاحب حجازی نے اس مسئلہ پر ایک مختصر لیکن جامع تقریر کی۔ آپ نے بتلایا کہ اس بحران کی ابتداء مورخہ ۲ ؍اگست ۱۹۹۰ء کو کویت پر عراق کے غاصبانہ قبضہ سے ہوئی، اور یہ قبضہ اس وقت کیا گیا جب کہ کویت اور عراق کے مابین پیدا شدہ اختلافات کو دور کرنے کی برابر کوششیں کی جارہی تھیں اور عراق کے زیادہ تر مطالبات تسلیم کر لئے گئے تھے۔ لیکن اسی درمیان عراق کی ظالمانہ قیادت نے اپنے پڑوسی مسلم ملک پر غاصبانہ قبضہ کر کے اپنے ظلم وعدوان کی ابتداء کی اور اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے اس مسئلہ کو مسئلہ فلسطین سے جوڑنے کی کوشش کی۔ نیز غلط اور جھوٹے پروپیگنڈوں کے ذریعہ مسلم عوام کے جذبات کو بھڑکایا گیا تاکہ ان کی ہمدردی حاصل کی جاسکے۔ اور اخیر میں آپ نے اس ظلم وعدوان کے دفاع کے لئے سعودی حکام بالخصوص خادم الحرمین الشریفین شاہ فہد کی طرف سے اٹھائے جانے والے اقدام کی بھرپور حمایت کی اور کتاب وسنت کی روشنی میں اسے بالکل درست قرار دیا۔

اس کے بعد مولانا عبدالسلام صاحب مدنی اس مسئلہ کی مزید وضاحت کرتے ہوئے عوام کو حقیقت پسندی کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔ نیز آپ نے ظلم وعدوان کو دفع کرنے کے لئے غیر مسلم طاقت سے تعاون لینے کے مسئلہ پر پورے شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی اور کتاب وسنت کی روشنی میں اس مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے بتلایا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر غیر مسلموں سے مدد لی ہے اور اخیر میں آپ نے بھی سعودی موقف کی بھرپور تائید کی۔ اور آپ کے دعائیہ کلمات پر پروگرام اختتام پذیر ہوا۔

خلیجی بحران کے سلسلہ میں دوسرا پروگرام مورخہ ۲۶ ؍فروری ۱۹۹۱ء بمقام رحمانیہ مسجد جلالی پورہ منعقد ہوا جس میں علماء کرام نے اس بحران کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی اور اس سے کئے جانے والے غلط اور جھوٹے پروپیگنڈوں کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لوگوں کو واقعیت پسندی کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی اور اخیر میں سعودی موقف اور حکومت سعودیہ کی طرف سے اٹھائے جانے والے اقدامات کی بھرپور تائید کی

خلیجی بحران سے متعلق جامعہ سلفیہ کے وفد کی اعیان ہند سے ملاقات ، بتاریخ ۲۷ رجب ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۳ فروری ۱۹۹۱ء

ہندوستانی مسلمانوں میں خلیجی بحران سے پیدا ہونے والی بے چینی اور ناخوشگوار صورت حال کے جائزہ کے لیے جامعہ سلفیہ بنارس نے ۱۳ فروری کو ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبدالجبار الفریوائی اور مولانا احمد مجتبیٰ سلفی پر مشتمل ایک وفد بعد دہلی بھیجا جس نے وہاں کے ارباب حل وعقد ، نیز جامعہ اسلامیہ عربیہ قاضی پور کے اساتذہ وطلبہ اور منتظمین سے ملاقات اور گفتگو کے ذریعہ اس مسئلہ پر مسلمانوں کے ذہن کو صاف کرنے ، ان کو غلط پروپیگنڈہ سے بچانے اور موجودہ صورتحال میں امت مسلمہ کی ذمہ داری کو ادا کرنے پر لوگوں کو ابھارا ، اور ان سے اس سلسلہ میں تبادلۂ خیالات کیا ، ان کی باتیں سنیں ، اور حتی المقدور ان کی الجھنوں کو دور کرنے اور ان کے سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی ، اور اس بات پر زور دیا کہ اہل علم اس مسئلہ میں اپنا مؤثر رول ادا کریں ، اس لیے کہ امت کی اصلاح و توجیہ کا کام علماء کا ہے ، اگر علماء نے وقت کے دھارے کو نہ پہچانا اور اپنی ذمہ داری کا احساس نہیں کیا تو عوام پر ان کی گرفت مزید ڈھیلی ہو جائے گی ۔

ان ملاقاتوں کا اچھا اثر رہا اور غلط پروپیگنڈہ کے دام تزویر میں پھنسے علماء وطلبہ میں سے صالح نفوس نے اپنی تقصیر اور غلطی کا اعتراف کیا ، اور بعض لوگوں نے بوجوہ چند اپنے کو " اردو اخبارات وجرائد " کے حصار میں مقید رہنے " بعض جماعتوں " کی پالیسی سے باہر نہ سوچنے کا موقف اختیار کیا ، فالی اللہ المشتکی ۔

ان ملاقاتوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ دینی مدارس اور ان میں پرورش پانے والے علماء بدترین غفلت اور جہالت کے شکار ہیں ، اور مدارس میں اسلامی ثقافت اور کتاب وسنت کی سچی تعلیمات سے جو بیگانگی ہے وہ قابل عبرت ہے ، ہمارے علماء اور مفکرین کو ان مسائل پر غور کرنا چاہئے ۔ دین کے نام پر ان مدارس میں جو پڑھایا جاتا ہے اس پر بہت سی باتیں کہی جا سکتی ہیں ، دینی مدارس کے مسائل پر گفتگو کرتے وقت اس طرح کے مسائل کی طرف اہل قلم اشارہ بھی کرتے رہتے ہیں ۔

وفد نے اپنی رپورٹ میں ارباب جامعہ سے یہ سفارش کی کہ ضرورت ہے کہ جامعہ کے اساتذۂ کرام اس سلسلے میں اپنی جدوجہد کو تیز کریں ، اور امت مسلمہ کی اس نازک موقع پر حقیقی رہنمائی کا فریضہ انجام دیں ۔ الحمدللہ جامعہ پہلے ہی اس طرح کے مسائل میں حساس ہے اور اس کا ایک مؤثر رول رہا ہے ، خلیجی بحران پر بھی جامعہ نے بھرپور انداز میں خیرخواہی ونصیحت کے فرائض انجام دیے اور تقریر وتحریر اور صحافت واشاعت کے ذریعہ ممکنہ دعوت وتبلیغ اور رہنمائی کا کام کیا ۔ واللہ ہو ولی التوفیق ۔

میرے پیارے دوست، میرے غم گسار جناب حق صاحب / مکتبہ سلفیہ بنارس

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

کچھ بھی لکھنے سے قبل بروقت " محدث " کی دستیابی پر آپ کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں، یہ پہلا پرچہ ہے جس سے میری روح کو سیرابی کا احساس ہوتا ہے، اور میں اسے بیحد انہماک سے پڑھتا ہوں، میرے کلینک (Clinic) میں آنے والے سیکڑوں آدمی " مرد اور عورت " بھی اس کو پڑھتے ہیں، آپ جانتے ہیں کہ اس شہر میں بندہ واحد اہلحدیث ہے اس لئے میرے پاس آنیوالوں اور میرے ملنے جلنے والوں میں حلوہ خور مسلمانوں (بدعتیوں) کی اکثریت ہے، پھر بھی اس پرچہ " محدث " کو پڑھ کر کئی نوجوان جماعت اہلحدیث سے کافی حد تک متاثر ہوئے، ساتھ ہی یہ بھی بتاتا چلوں کہ اکثر لوگ اسے پڑھ کر طرح طرح کی تنقیدیں کیا کرتے ہیں اور بعض تو طنز بھی کرتے ہیں، چونکہ یہ لوگ (اہل بدعت) ہم اہل حدیث کی کتابیں پڑھنا معیوب سمجھتے ہیں کہ کہیں واقعی مسلمان نہ بننا پڑ جائے۔ یوں تو محدث کا ہر شمارہ بیحد مفید ثابت ہوا ہے، خصوصاً ماہ نومبر، دسمبر ۹۰ء کا شمارہ "خلیجی بحران نمبر" تو میرے حلقہ احباب میں کافی مؤثر ثابت ہوا ہے، یہ شمارہ حقیقی معنوں میں قابل صد ستائش ہے، اور آپ لوگ (جامعہ سلفیہ کے تمام ذمہ داران) کی حق گوئی اور بے لاگ تبصرے اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ اس شیطانی رقص گاہ میں ابھی ایسے لوگ ہیں جو حق وصداقت کا پرچم لہرا سکتے ہیں، ابھی اسلام کی خمیر میں تازگی ہے اور اسلام کا چہرہ اتنا مسخ نہیں ہوا کہ پہچانا نہ جا سکے، ہم محدث کے جملہ مضمون نگاروں خصوصاً ایڈیٹر صاحب کے بیحد شکر گذار ہیں کہ انہوں نے خلیجی بحران کے سلسلے میں اپنا سیاسی موقف بڑی صداقت اور حق گوئی کے ساتھ پیش کیا، جو وقت کی اہم ترین ذمہ داری تھی۔

ویسے تمام اہل علم ودانش کا یہ ایک اہم فریضہ تھا کہ وہ اس معاملہ میں بڑھ چڑھ کر امت مسلمہ کی صحیح رہنمائی فرمائیں، لیکن حیف صد حیف ایسے وقت میں ان دانشوروں نے اپنی صحافت اور خطابت اور صلاحیت پر عصبیت کا پردہ لگا کر اسے غلط طریقے سے

استعمال کرکے امت مسلمہ کو صحیح موقف اختیار کرنے سے باز رکھنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے، یہی نہیں بلکہ جماعت کے اکثر و بیشتر رہنماوں نے اس سلسلہ میں کوئی خاص رول ادا نہیں کیا جو غیر ذمہ داری اور دین میں مداہنت پسندی کا ثبوت ہے لیکن بفضلہ اس کے جامعہ سلفیہ نے اس مسئلہ میں جو اہم کارنامہ انجام دیا ہے وہ قابل ستائش ہے، یقیناً امت مسلمہ کو اس کارنامے سے حقیقی رہنمائی ملی ہے، اور ہم یہ امید کرتے ہیں کہ جامعہ سلفیہ ہمیشہ اس طرح کے مسائل حق کو پیش کرنے اور باطل کا پردہ فاش کرنے میں دریغ نہیں کریگا، اللہ تعالی اس اسلامی ادارہ کو ترقی کی راہ پر گامزن کرے، اور اس کے ذمہ داروں کو دین کے خدمت کی توفیق بخشے اور مزید خلوص پیدا کرے۔ آمین!

کتنی شرم و افسوس کی بات ہیکہ آج مسلمانوں کی اکثریت ایک غاصب کو مرد مجاہد، مجاہد اعظم، مسلمانوں کا قائد، شیر عرب اور نہ جانے کن کن القابوں سے نواز رہی ہے، دوسری قوموں کی نظر میں اسلام کا وقار کیا رہجائے گا؟ اسلام کے پیروکاروں کو ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ دوسری قومیں ہم مسلمانوں کی طرز رہائش اور طرز عمل کو دیکھ کر ہی اسلام کے متعلق اپنی رائے قائم کرتی ہیں نہ کہ اسلام کا دستور پڑھ کر۔

کسی بھی مذہب کی کسوٹی اس کی قوم ہوتی ہے، اور جب قوم کی نمائندگی غلط رو پر جاتی ہے تو مذہب بھی دم توڑتا نظر آتا ہے۔ عیسائیوں کا مذہب برا نہیں تھا، اس کا منی فیسٹو (Mani FesTo) بھی نہایت عمدہ اور پاکیزہ تھا، لیکن اس کے ماننے والے جب کج روی کا شکار ہوئے تو خدا کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلام کا ایک نئی شریعت دے کر خدمت کے سامنے پیش کرنا پڑا، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی تبلیغ غلط تھی یا ان کا مذہب برا تھا؟ (نعوذ باللہ) کم سے کم ایک مسلمان تو ایسا کبھی نہیں کہہ سکتا یا سوچ سکتا، کیونکہ ان کا مذہب بھی اللہ ہی کا فرمان تھا، بائبل بھی خدا کا کلام تھا، لیکن اس کے ماننے والے جب اپنے مذہب کی تعلیمات سے پھرنے لگے تو اللہ تعالی کو آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجنا پڑا، آج جب ہم اپنی قوم کا گہری نظروں سے جائزہ لیتے ہیں تو حالات اتنے خستہ نظر آتے ہیں کہ الاماں! آج ہماری اکثریت (خاص کر ہندو پاک اور بنگلہ دیش کی) شرک و بدعت میں اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ قوم نوح اور دیگر بھٹکی ہوئی قوموں کی روحیں بھی شرمندہ ہونگی، آج وہ کونسی ضلالت ہے جو ہمارے بدعتی بھائیوں کے یہاں رائج نہیں ہے، اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ جو اس ضلالت سے بچنا چاہتا ہے، وہی کافر اور بددین ٹھہرایا جاتا ہے، ہمارے بدعتی بھائیوں کے یہاں قبر پرستی شباب پر ہے اور پیر پرستی عروج پہنچی ہوئی ہے، اب تو نہروں اور ندیوں کی پوجا بھی شروع ہو چکی ہے۔ غرض کہ ؎

مگر مومنوں پر کشادہ ہیں راہیں پرستش کریں شوق سے جسکی چاہیں۔ (حالی)

انتہا تو یہ ہے کہ ہماری اکثریت مرغ خور علماء کے دام فریب میں اس بری طرح پھنسی ہوئی ہے کہ عقل تک کو گروی رکھ چکی ہے، اور وہ لمحہ بھر کو سوچنا سمجھنا نہیں چاہتے کہ وہ کیا کر رہے ہیں، کیا کرنے جا رہے ہیں، (ے اشتعال دلاؤ اور کام نکال لو، (پیروں اور مرغ خور علماء کا دستور ہے)

آج یہ حضرات عقل سے اس قدر کورے ہو چکے ہیں، غور و فکر سے اس قدر پیدل ہو چکے ہیں کہ وہ اپنی ہی باتوں کو اپنی باتوں سے رد کرتے ہیں، کبھی تو حضرت حسینؓ ان کے لئے شہید اعظم ہوتے ہیں، کبھی بھٹو جیسا راندۂ درگاہ شرابی، عیاش مرد مجاہد نظر آتا ہے، تو آج صدام حسین جیسا غاصب، بد دین، کمیونسٹ، بہروپیا، سلطان صلاح الدین نظر آرہا ہے، سچ ہے ان کے کانوں پر آنکھوں پر، عقل اور دلوں پر مہر لگ چکی ہے، نہ تو ان کو حقیقت نظر آسکتی ہے نہ یہ حقیقت سننا چاہیں گے۔

ستم تو یہ ہے کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے منحرف ہو سکتے ہیں لیکن اپنے پیر و مرشد کے غلط اصولوں اور بھٹکے ہوئے ضابطوں سے انحراف ان کی ذات اقدس سے ممکن نہیں، یہ خدا کے فرمان کو بالائے طاق رکھ سکتے ہیں لیکن اپنے پیروں کی باتوں کو نظر انداز کرنا گناہ عظیم سمجھتے ہیں، اور ان کے پیر میاں اور علماء (اللہ بچائے ان کے فتنوں اور دروغ گوئی سے) وہ اس قدر دروغ گو اور من گھڑت باتوں کے خالق ہوتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بھی ان کی کرتوتوں کے آگے طفل مکتب نظر آتے ہیں۔ ؎

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

یہ کم بخت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قبر مبارک پر میزائیل پھینکا جانا پسند کرتے ہیں لیکن حضرت جیلانیؒ کے مزار پر حملے کو باعث جہاد تصور کرتے ہیں، یہ خانۂ کعبہ کی بے حرمتی کے لئے آمادہ ہیں لیکن پیران پیر کی خانقاہ ارض مقدس کی توہین برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔ ان کے یہاں گنگا ہی الٹی بہتی ہے، ان کی نظر میں ایک دیندار، نمازی، اہل سنت (شاہ سعود کے اہل خاندان) سے صلح ممکن نہیں، لیکن بے نمازی، ریاکار، دغا باز، کمیونسٹ (صدام) کا ہر گناہ صرف قابل معافی ہی نہیں بلکہ قابل صد ستائش ہے، کیونکہ ان کی نگاہوں میں اس نے امریکہ کو للکارا ہے، اسرائیل کو خبردار کرکے جو جوانمردی کا ثبوت پیش کیا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ (یہ بات الگ ہے کہ سب کو للکار کر خود اٹھارہ میٹر زمین کے اندر جا چھپا ہے، اور اپنی قوم کے بے سہارا لوگوں کو مرنے کے لئے زمین کے اوپر چھوڑ دیا ہے۔

میرے خیال میں آنے والی نسل اور مستقبل کے حق پسند مورخ اسے چوہا کا خطاب دیں گے، کیونکہ چوہے بھی بہت دادیلا مچاتے ہیں، لیکن جب دوڑائیے تو زمین کے اندر جا چھپتے ہیں، مگر کبھی کبھی ضدی آدمی مل جاتے ہیں تو بل میں پانی ڈال کر اور مرچا کا دھواں دے کر انہیں بل کے اندر ہی ذلت کی موت مرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر صرف فضائی حملہ سے فتح حاصل نہیں ہوتی تو کیا ایک دو میزائیل چھوڑ دینے سے فتح ہوجائے گی یہ مسلمان اس قدر جذبات رکھتے ہیں کہ اس کے رو میں کچھ بھی کر گذرتے ہیں، یہ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ عراق کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ بس "نئی دنیا" اور اسی طرح کے دیگر گمراہ کن اخباروں کے چھٹکتے اور جذباتی حاشیے اور تصاویر دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ بازی صدام کے ہاتھ نہیں بلکہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔

آہ! یہ کم ظرف کتنے تنگ نظر ہوگئے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے حقیقت ہے، لیکن یہ دیکھ نہیں سکتے، یہ جہلاء حسین رضی اللہ عنہ کو شہید اعظم بھی کہتے ہیں، ان کی یاد میں ہر سال ۱۰/۱۱ روز تک طوفان بدتمیزی بھی برپا کرتے ہیں۔ (اور نہ برپا کرنے والوں کو کافر کہنے سے باز نہیں آتے) اور ان کے قاتل خاندان والوں کی پرستش بھی کرتے ہیں، سلطان صلاح الدین ایوبی کے اہل خاندان کے قاتل کو سلطان صلاح الدین ایوبی قرار دے رہے ہیں، یقین جانئے ان اندھوں کی حالت ایسی ہوگئی ہے کہ صدام "نعوذ باللہ" اگر مرتد ہونے کا حکم دے تو شاید یہ سب کے سب مرتد ہوجائیں، (غیر محسوس طور پر تو یہ مرتد ہو ہی چکے ہیں) ان کے اندر عصبیت تو اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہے جس کی نظیر ملنا محال ہے، اگر دوسری قوم یا دوسری جماعت کا آدمی دن کو دن کہے اور ان کے مرشد اعلیٰ دن کو رات کہہ دیں تو یہ سب کی باتوں پر اور حقیقت پر اپنے مرشد اعظم کی جھوٹی بات کو ہی ترجیح دیں گے کیونکہ مرشد جھوٹ نہیں بول سکتا، ان کی نگاہیں جھوٹ ہو سکتی ہیں، آنکھوں کا دیکھا جھوٹا ہو سکتا ہے لیکن مرشد سے شدہ جھوٹ نہیں ہو سکتا۔

غرض ان کی جہالت کا رونا کہاں تک رویا جائے، بس ان کے حق میں اللہ سے یہی دعا ہے کہ وہ ان کو عقل سلیم عطا فرمائے، سچ اور جھوٹ میں تمیز کرنے کی صلاحیت عطا کرے اور ہدایت عطا فرمائے۔ آمین!

آپ کا خیر اندیش

ڈاکٹر جہانگیر انجم

اورنگ آباد۔

(بہار) ••

ماہنامہ بنارس

شمارہ ۶	جون ۱۹۹۱ء	ذیقعدہ ۱۴۱۱ھ	جلد ۱۳

اِس شمارہ میں

مـــدیـــر

عبدالوہاب حجازی

پــتــہ

دارالتالیف والترجمۃ

بی ۱۸/۱ جی ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰

بدلِ اشتراک

سالانہ ۴۵ روپئے۔ فی پرچہ ۴ روپئے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِفتِتاحیہ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

یہ دین اسلام کا نہایت مہتم بالشان حکم ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابیں اسی لئے نازل فرمائیں اور اپنے انبیاء و رسل اسی مقصد سے مبعوث فرمائے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ آسمانی رسالت کو سب تک پہنچایا جائے، خاتم الانبیاء والرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

یأمرهم بالمعروف وينهاهم عن المنكر ويحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث (الأعراف ۱۵۷)

رسول انہیں تمام بھلی باتوں کا حکم دیتا ہے اور انہیں تمام بری باتوں سے روکتا ہے، تمام پاکیزہ چیزوں کی ان کیلئے حلال ٹھہراتا ہے اور تمام گندی چیزوں کو ان کے لئے حرام ٹھہراتا ہے۔

اس آیت میں آپؐ کی رسالت کے کامل و مکمل ہونے کا بیان کیا گیا ہے، خاتم الأنبیاء والرسل ہی کی وہ ذات بابرکات ہے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ہر معروف کا حکم دیا ہے ہر منکر سے منع فرمایا ہے، ہر طیب و پاکیزہ چیز کو حلال کیا ہے اور ہر خبیث اور گندی چیز کو حرام ٹھہرایا ہے، اسی لئے حدیث میں آپ نے فرمایا ہے:

إنما بعثت لاتمم مكارم الأخلاق۔

میں اسی لئے مبعوث کیا گیا ہوں کہ تمام فضائل اخلاق کی تکمیل کردوں

اور ایک متفق علیہ حدیث ہے، آپؐ فرماتے ہیں:

مثلي ومثل الأنبياء كمثل رجل

میری اور تمام انبیاء کی مثال ایسے ہے جیسے کسی آدمی نے

بنی داراد اکملہا إلا موضع لبنۃ وکان الناس یطیفون بہا و یعجبون من حسنہا، و یقولون لولا موضع اللبنۃ فأنا تلک اللبنۃ۔

گھر بنایا اور اسے مکمل کر دیا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی، لوگ کثرت سے وہاں آتے جاتے اور اس کی خوبصورتی کو بیان کرتے، اور کہتے اگر ایک اینٹ کا نقص نہ ہوتا تو گھر بالکل کامل ہوتا میں وہی اینٹ ہوں۔

اسی پر اللہ کا دین جو ہر معروف کے حکم ہر منکر کی ممانعت ہر طیب و پاکیزہ چیز کی حلت اور ہر خبیث اور گندی چیز کی حرمت پر مشتمل ہے، مکمل ہو گیا۔

آپ سے پہلے جو رسول گذرے ہیں ان کی امتوں پر بعض طیب اور پاکیزہ چیزیں حرام قرار دے دی جاتی تھیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا:

فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیہم طیبات احلت لہم۔ (النساء ۱۶۰)

یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں جو ان کے لئے حلال کی گئی تھیں، ان پر حرام کر دیں۔

بسا اوقات ان پر تمام خبیث اور گندی چیزیں حرام نہیں قرار دی جاتی تھیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے:

کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل إلا ما حرم اسرائیل علیٰ نفسہ من قبل ان تنزل التوراۃ (آل عمران ۹۳)

تمام چیزیں بنی اسرائیل کے لئے حلال تھیں سوا ان چیزوں کے جنہیں اسرائیل نے توراۃ نازل ہونے سے پہلے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔

خبیث اور گندی چیزوں کو حرام ٹھہرانا نہی عن المنکر میں اور طیب اور پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھہرانا امر بالمعروف میں داخل ہے، اس لئے کہ طیب اشیاء کو حرام ٹھہرانا ان امور میں سے ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، اسی طرح تمام معروف اور اچھائیوں کے حکم اور ہر منکر اور برائی سے ممانعت کی تکمیل ہمارے رسول ہی کے لئے ہوئی ہے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے تمام مکارم اخلاق کی تکمیل فرمائی جو سب کے سب معروف میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

الیوم اکملت لکم دینکم و أتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الإسلام

آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی ہے، اور تمہارے لئے دین اسلام

دینا۔ (المائدہ ۳) کو پسند کیا ہے ۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء والرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو وصف بیان فرمایا ہے، وہی وصف امت محمدیہ مسلمہ کا بھی بیان فرمایا ہے، ارشاد ربانی ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف، وتنہون عن المنکر وتومنون باللہ۔ (آل عمران ۱۱۰)	مسلمانو! تم بہتر امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لئے پیدا کی گئی ہے، تم لوگ تمام بھلی باتوں کا حکم دیتے ہو، اور تمام بری باتوں سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اور فرمایا:

والمؤمنون والمؤمنات بعضہم اولیاء بعض، یأمرون بالمعروف وینہون عن المنکر (التوبہ ۷۱)	مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں، تمام بھلے کاموں کا حکم دیتے ہیں، اور تمام برے کاموں سے روکتے ہیں۔

اسی لئے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

کنتم خیر الناس للناس تاتون بہم فی الاقیاد و السلاسل حتی تدخلوھم الجنۃ۔	مسلمانو! لوگوں کو فائدہ پہونچانے کے لئے تم سب لوگوں سے بہتر ہو، تم انھیں رسیوں اور زنجیروں میں بندھا ہوا لاؤگے، یہاں تک کہ ان کو جنت میں داخل کردوگے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آیت بالا میں بیان فرمایا ہے کہ امت مسلمہ لوگوں کے لئے دیگر تمام امتوں سے بہتر ہے، لوگوں کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہے، لوگوں کی بھلائی اور خیر خواہی میں سب امتوں سے بڑھ کر ہے، کیونکہ امت مسلمہ نے وصف اور قدر دونوں پہلوؤں سے لوگوں کو بھلائیوں کے حکم و برائیوں سے ممانعت کی تکمیل کی ہے، امت مسلمہ نے ہر معروف کا حکم دیا ہے اور ہر منکر سے روکا ہے اور یہ امر و نہی ہر ایک شخص کے لئے ہے، امت مسلمہ نے اپنی جانوں اور مالوں کے ذریعہ جہاد فی سبیل اللہ کرکے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ قائم کیا ہے، اور یہ خلق کے لئے نفع رسانی کی حد کمال ہے۔

اور بقیہ تمام امتوں نے ہر معروف کا حکم ہر شخص کو نہیں دیا ہے، اور نہ ہی ہر منکر کی ممانعت ہر شخص کو کی ہے، اور نہ ہی اس کے

لئے جہاد کیا ہے، اور جنہوں نے جہاد کیا بھی ہے جیسے بنی اسرائیل تو ان کا بیشتر جہاد اپنی سرزمین سے دشمن کو دفع کرنے کے لئے تھا، مجاہدین کی دعوت ان کے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے نہ تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے کہ موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا:

یاقوم! ادخلوا الارض المقدسة التی کتب اللہ لکم ولا ترتدوا علی ادبارکم فتنقلبوا خاسرین قالوا یاموسیٰ ان فیہا قوما جبارین، وانا لن ندخلہا حتی یخرجوا منہا، فان یخرجوا منہا فانا داخلون۔ (المائدہ ۲۱-۲۲)

اے میری قوم کے لوگو! کنعان کی مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ، جسے اللہ نے تمہارے لئے مقدر کر رکھا ہے اور پیٹھ پھیر کر نہ بھاگو ورنہ خسارہ اٹھاؤ گے، وہ لوگ کہنے لگے اے موسیٰ اس سرزمین میں بڑے زبردست لوگ بستے ہیں، اور ہم اس میں داخل نہ ہوں گے جب تک وہ اس سے نکل نہ جائیں، اگر وہ اس سے نکل جائیں تو ہم داخل ہو جائیں گے۔

آگے مذکور ہے:

قالوا یاموسیٰ انا لن ندخلہا ابدًا مادامو افیہا فاذہب انت وربک فقاتلا انا ہہنا قاعدون

وہ لوگ کہنے لگے اے موسیٰ جب تک یہ لوگ اس میں رہیں گے ہم اس میں داخل نہ ہوں گے تو تم اور تمہارا رب جاؤ جنگ کرو، ہم تو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مزید بیان فرمایا:

الم تر الی الملاء من بنی اسرائیل من بعد موسیٰ اذ قالوا لنبی لہم ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل اللہ، قال ھل عسیتم ان کتب علیکم القتال ان لا تقاتلوا قالوا ومالنا الا نقاتل فی سبیل اللہ وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا۔ (البقرۃ ۲۴۶)

کیا تم نے موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کا حال نہیں دیکھا جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا تھا ہمارے لئے کوئی بادشاہ مقرر کرو کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں نبی نے کہا اگر تم پر جنگ فرض کر دی گئی تو امید نہیں کہ تم جنگ کرو گے، وہ کہنے لگے ہم اللہ کی راہ میں کیوں نہیں لڑیں گے حالانکہ ہم اپنے وطن سے نکال دیئے گئے، اور اپنی آل اولاد سے دور کر دیئے گئے ہیں۔

ان لوگوں نے قتال کی علت اس بات کو قرار دیا کہ انہیں ان کے گھروں سے نکال دیا گیا اور ان کی آل اولاد سے جدا کر دیا گیا ہے، اسی کے

ساتھ انہیں اس سے متعلق جو حکم دیا گیا اس سے بزدلی کے ساتھ پیچھے ہٹ جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے لئے غنیمت کے اموال حلال نہیں، اور نہ ہی یہ لونڈیوں سے وطی کرتے تھے۔

امت مسلمہ کا اجماع اسی لئے حجت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ اس کے افراد ہر معروف کا حکم دیتے ہیں اور ہر منکر سے روکتے ہیں، اگر حرام چیز کے مباح ٹھہرانے، واجب کے ساقط کر دینے یا حلال کے حرام ٹھہرانے یا اللہ تعالیٰ یا اس کے خلق کی طرف سے کسی باطل بات کے بیان کرنے پر اتفاق کرلیں تو منکر کے حکم دینے اور معروف سے روکنے کے وصف سے متصف ہو جائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ وصف کے خلاف ہے، بلکہ آیت قرآنی تو اس بات کی مقتضی ہے کہ امت مسلمہ نے جس بات کا حکم نہیں دیا وہ معروف ہی نہیں ہے اور جس سے منع نہیں کیا وہ منکر ہی نہیں ہے، اور امت جب ہر معروف کا حکم دینے والی ہر منکر سے منع کرنے والی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پوری امت منکر کا حکم دے اور پوری امت معروف سے روکے، اور اللہ تعالیٰ نے جیسا کہ بتایا کہ امت مسلمہ معروف کا حکم دیتی اور منکر سے روکتی ہے تو اسے امت کی طرف سے بطور فرض کفایہ واجب قرار دیا ہے، جیساکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولتكن منكم امة يدعون إلى الخير، ويامرون بالمعروف وينهون عن المنكر، واولئك هم المفلحون۔ (آل عمران ۱۰۴)	تم میں ایک جماعت ایسی رہنی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف دعوت دیں، نیکیوں کا حکم دیں اور برائیوں سے منع کریں اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

یہ بات بتا دینے کے ساتھ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ امت مسلمہ کیطرف سے قائم ہوگا، یہ بات شرط نہیں ہے کہ امت مسلمہ کے حکم دینے والے کا حکم اور منع کرنیوالے کی ممانعت دنیا کے ہر مکلف کو پہونچ جائے اسلئے کہ جب یہ تبلیغ رسالت میں شرط نہیں ہے تو اس کے توابع میں کسطرح شرط قرار دی جائے گی، بلکہ شرط یہ ہے کہ مکلف خود وہ قدرت پیدا کریں کہ ہر امر و نہی ان تک پہونچ جائے، پھر اگر وہ کوتاہی کریں اور ان تک ہر امر و نہی کے پہونچنے کی سعی نہ کریں جب کہ فاعل اپنا فریضہ ادا کر رہا ہو تو کوتاہی ان لوگوں کی طرف سے ہے نہ کہ اس کی طرف سے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر شخص پر بعینہ فرض نہیں ہے بلکہ یہ کفایۃً فرض ہے جیساکہ قرآن مجید میں مذکور ہے اور جہاد چونکہ اس فریضہ کی تکمیل ہے اس لئے جہاد کا فریضہ بھی اسی کی طرح ہے، لہذا جب اس فریضہ کو ادا کرنیوالا اس پر قائم نہ ہوا تو ہر قدرت رکھنے والا اپنی قدرت کے حساب سے اس کی تکمیل کریگا، کیونکہ یہ ہر انسان پر اس کی قدرت کے حساب سے فرض ہے۔ جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فان لم يستطع فبلسانه، فان لم يستطع فبقلبه وذلك اضعف الايمان۔ (فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ)	تم میں سے اگر کسی نے کوئی برائی دیکھی تو اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے اگر اس کی قدرت نہ رکھے تو اپنی زبان کو کام میں لائے پھر اگر اس کی بھی قدرت نہ رکھے تو اپنے دل سے اس سے نفرت کرے، اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے •••

قسط ۲

خروج مہدی علیہ السلام و خروج دجال لعنہ اللہ

ڈاکٹر رضاء اللہ بن محمد ادریس
مبارکپوری

سورہ اعراف کی آیت / ۱۸۷ - " یسئلونك عن الساعة ایان مرسٰھا ، قل انما علمها عند ربی "
کی تفسیر کرتے وقت علامات قیامت سے متعلق دو مسائل پر موصوف نے مفصل بحث کی ہے ، ایک خروج دجال - لعنہ اللہ - کا مسئلہ ہے ، دوسرا خروج مہدی - علیہ السلام - کا ہے ، اور ان دو مسئلوں کے بارے میں وارد شدہ احادیث کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے ، خاص طور سے حدیث جساسہ جس کو امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کے اندر روایت کیا ہے[1] - تقریباً ۹ وجہوں سے اس کو مطعون کرنے کی کوشش کی ہے ، جس سے دونوں مسئلوں میں ان کے تمام انتقادات و اشکالات کا استیعاب کرکے ہر ایک کا جائزہ لینا قدرے مشکل کام ہے ، اور مقام بھی اس کا متحمل نہیں ہے ، اس لئے صرف اہم اشکالات یا انتقادات کو ذکر کرکے ان کا جائزہ لینے کی کوشش کرونگا ، قبل ازیں ایک بات قارئین کرام کے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ موصوف نے احادیث اشراط کی تنقید میں جو منہج اور اسلوب اختیار کیا ہے میری اپنی سمجھ میں وہ نہایت غیر ذمہ دارانہ اور غیر علمی اسلوب معلوم ہوتا ہے ، کیونکہ انہوں نے احادیث میں تعارض دکھلانے یا اشکال ظاہر کرنے کے لئے ضعیف روایتوں اور مقطوع[2] آثار کا سہارا لیا ہے ، بلکہ بعض آثار ایسے بھی ہیں جن کا اسرائیلی ہونا اظہر من الشمس ہے ، چنانچہ اپنی تفسیر میں ایک جگہ مغرب سے طلوع شمس کے بعد ایمان کی عدم قبولیت پر کلام کیا ہے ، اور اس سلسلے میں انہوں نے ایک اشکال کا ذکر کیا ہے جس کی بنیاد دو روایتوں پر رکھی ہے ، ایک روایت یہ ہے " ان الشمس والقمر یکسیان النور بعد کسوف وظلمة ... " سورج اور چاند سے روشنی سلب کر لینے کے بعد دوبارہ انہیں روشنی عطا ہوگی ، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک لمبی حدیث کا جزء ہے ، جس کو سیوطی نے ابن مردویہ کے حوالے سے نقل کیا ہے

---

(۱) دیکھو صحیح مسلم کتاب الفتن باب قصة الجساسة (۴/ ۲۶۱۴ - ۲۲۶۴ حدیث نمبر ۱۱۹)
(۲) مقطوع اس اثر کو کہتے ہیں جس کی سند کسی تابعی پر جاکر ختم ہوجاتی ہو۔

اور اس کی سند کو واہی یعنی کمزور بتلایا ہے(۱)۔

اور دوسری روایت یہ ہے: "تبقی الناس بعد طلوع الشمس من مغربها عشرين ومائة سنة" یعنی لوگ مغرب سے طلوع شمس کے بعد ۱۲۰ سال تک باقی رہیں گے، یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمرو سے مرفوعا وموقوفا مروی ہے حافظ ابن حجر نے مرفوع روایت کو غیر ثابت کہہ کر موقوف روایت کی سند کو جید قرار دیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ان سے اس کے معارض روایت بھی نقل کی گئی ہے(۲)۔

اس سے زیادہ عجیب وغریب بات یہ ہے کہ خروج مہدی علیہ السلام کے تعلق سے جو احادیث روایت کی جاتی ہیں، ان میں اضطراب اور تعارض ظاہر کرنے کے لئے مہدی کے نام اور وصف کی تعیین میں مختلف لوگوں کے اقوال کا سہارا لے کر شیعہ اور اسی طرح کے دوسرے باطل فرقوں کی آراء تک کو نقل کیا ہے(۳)، اس قسم کی حرکت معمولی درجہ کی معلومات رکھنے والا کوئی آدمی بھی نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ کوڑا کرکٹ کا لعل وگوہر سے مقابلہ کرنے کے مترادف ہے، باطل فرقوں اور گمراہ جماعتوں کی آراء حدیث نبوی کے سامنے کیا درجہ رکھتی ہیں یا اسرائیلی روایتوں اور مقطوع آثار کی کیا حیثیت ہے، اور ایسے ہی صحیح احادیث کے بالمقابل ضعیف احادیث کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے کہ ان کو ذکر کرکے احادیث کے اندر تعارض یا اضطراب کا دعویٰ کیا جائے، اور "تعارضت فتساقطت" کی رو سے سب کو دریا برد کردینے کی دعوت دی جائے، یہ کون سا ضابطہ اور کہاں کی منطق ہے؟۔

بخدا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی باتوں کے درمیان اس طرح کا تعارض کبھی بھی نہیں ہو سکتا، ہاں اتنا ضرور ہے کہ بعض صحیح احادیث میں ہمیں بظاہر تعارض یا اشکال نظر آئے گا، لیکن ان کے معانی اور اسباب وظروف جن کے تحت ان کا ورود ہوا ہے پر غور کرنے سے ہمیں پتہ چلے گا کہ واقع امر میں ان میں کوئی تعارض نہیں ہے اور پھر یہ کوئی معقول اور مناسب طریقہ بھی نہیں ہے اگر بعض احادیث میں تعارض یا اضطراب کی کوئی شکل نظر آگئی تو انہیں ناقابل اعتبار قرار دے کر فورا کوڑی کا ایک کردیں، بلکہ ایسی صورت میں ہمارا فریضہ بنتا ہے کہ ماہرین فن کی طرف ہم رجوع کریں اور دیکھیں کہ کس طرح انہوں نے تعارض یا اضطراب کو دفع کرنے کی کوشش کی ہے، رہی باطل آراء یا اسرائیلی روایتیں تو ان کی کوئی حیثیت واہمیت نہیں ہے کہ ان کے ذریعہ احادیث میں ٹکراؤ کی شکل پیدا ہو، اسی طرح ضعیف حدیثیں یا مقطوع آثار قابل حجت نہیں ہیں کہ ان کے اور صحیح احادیث کے درمیان تعارض کا

---

(۱) الدرالمنثور (۲/۶۰ - ۶۱)۔ (۲) فتح الباری (۱۱/۳۵٤) اور دیکھو تفسیر المنار (۸/۲۱۱)۔
(۳) تفسیر المنار (۹/٤٦۱ ومابعدها)۔

دعویٰ کیا جائے، اس لئے کہ تعارض یا اضطراب متساوی درجہ کی صحیح احادیث کے درمیان ہوتا ہے، اگر ان کے درجۂ صحت میں تفاوت یا فرق ہوگا تو جو حدیث صحت میں مقدم ہوگی اسے دوسری حدیث پر فوقیت دیدی جائے گی، اس طرح کے حالات میں کون سا طریقہ اپنایا جائے گا؟ اس کے لئے علمائے حدیث نے کچھ اصول مرتب کئے ہیں، حافظ ابن حجر ان کو ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ- احادیث کے درمیان تعارض کو مندرجہ ذیل ترتیب پر رفع کیا جائے گا۔

۱۔ پہلے ان کے درمیان تطبیق کی شکل نکالی جائے گی اگر یہ ممکن نہ ہوا تو۔

۲۔ ایک کو ناسخ اور دوسرے کو منسوخ سمجھا جائے گا، لیکن اس کے لئے مختلف شرائط ہیں، اگر یہ شرائط ناپید ہوں تو۔

۳۔ ان کے درمیان ترجیح کی شکل نکالی جائے گی اگر یہ صورت بھی ممکن نہ ہو تو۔

۴۔ کسی ایک حدیث پر عمل سے توقف اختیار کیا جائے گا، اور توقف کی تعبیر ساقط ہوجانے کی تعبیر سے اُولیٰ اور بہتر ہے(۱)۔

محمد رشید رضا نے خروج دجال و خروج مہدی کی بابت جن امور پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھی ہے، ان میں میرے اپنے خیال کے مطابق سب سے اہم نقطہ یہ ہے کہ دجال لعنہ اللہ یا مہدی علیہ السلام کی جانب منسوب کئے گئے خوارق عادات میں اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ طبعی قوانین اور کونی اصول کی مخالفت اور تبدیلی نظر آتی ہے جبکہ قرآن کریم کے قطعی نصوص سے یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان مقرر کردہ قوانین و نوامیس میں کسی طرح کی تبدیلی یا تغییر کی گنجائش نہیں ہے، چنانچہ قرآن کریم میں ارشاد ہے "فلن تجد لسنة الله تبديلا، ولن تجد لسنة الله تحويلا" (ترجمہ)(۲) تو اے پیغمبر، اللہ تعالیٰ کا برتاؤ (اس کا طریقہ قاعدہ) ہرگز بدلتا ہوا نہ پائے گا، اور تو ہرگز اس کا برتاؤ ٹلتا ہوا نہ پائے گا،

اسی طرح دجال کی طرف منسوب کئے گئے امور میں ان معجزات سے مشابہت یا برتری ثابت ہوتی ہے، جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اولو العزم پیغمبروں کی تائید فرمائی تھی(۳)۔

پہلے شبہ کے جواب میں عرض ہے کہ مذکورہ آیت کا مفہوم اگر وہی ہے جو موصوف نے سمجھا ہے، یعنی سنن کونیہ میں کوئی تبدیلی یا مخالفت ممکن نہیں تو یہ بات ان معجزات کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے جو اولو العزم پیغمبروں کو عطا کئے گئے تھے، مثال کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے ولادت، اسی طرح وہ سارے معجزات جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوئے تھے، حالانکہ صحیح بات

(۱) نزہۃ النظر شرح نخبۃ الفکر (ص ۳۷-۳۹) -

(۲) سورۃ فاطر، آیت ۴۳ھ

(۳) تفسیر المنار (۹/ ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۶۰) -

یہ ہے کہ خوارق و معجزات کا اثبات درحقیقت اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا اعتراف ہے، اور یہ کہ صرف اسی کی ذات اس کارخانۂ عالم میں تصرف حقیقی کی مالک ہے، جس طرح اس نے ہر چیز کے لئے قواعد و ضوابط متعین کئے ہیں بالکل اسی طرح وہ اس بات پر پوری طرح قادر ہے کہ اسے قاعدے اور ضابطے کے برعکس جاری کر دے۔

اور درحقیقت آیت مذکورہ کا منشا، وہ نہیں ہے جو موصوف نے سمجھا ہے کیونکہ آیت کا تعلق طبعی قوانین اور کونی نوامیس سے ہے ہی نہیں، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے اپنے اطاعت شعار اور نافرمان بندوں کے حق میں فیصلے اور حکم سے ہے، جیسا کہ مفسرین کی باتوں سے واضح ہوتا ہے[1]۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے مذکورہ آیت کی تفسیر پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے کہ "اس آیت کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت (طریقے) میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا، اور اللہ کی سنت سے مراد اس کی وہ عادت اور طریقہ ہے جس کے مطابق وہ کسی چیز اور اس کی سابقہ نظیر کے درمیان یکساں فیصلہ کرتا ہے اور یہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک جیسے امور میں ایک جیسا حکم نافذ کرتا ہے"[2]

جس زمانے میں مہدی علیہ السلام یا دجال کا خروج ہوگا اس وقت خوارق عادات کی کثرت ہوگی، خود موصوف نے اس بات کا اعتراف کیا ہے[3] لہذا اس میں کسی چنبھے یا تعجب کی بات نہیں ہونی چاہئے، ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ مہدی علیہ السلام کی بابت کسی صحیح حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں آئی ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ یہ سنن کونیہ یا طبعی قوانین کے مخالف ہے، زیادہ سے زیادہ ان کے بارے میں یہی آتا ہے کہ ان کے زمانے میں عدل و انصاف کا بول بالا ہوگا، لوگ معاشی اعتبار سے کافی خوشحال ہوں گے، دین اسلام کا غلبہ ہوگا، یہ تمام چیزیں یا اس سے قریب بعض گذشتہ زمانوں میں وقوع پذیر ہو چکی ہیں، مثال کے طور پر حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا زمانہ لے لیجئے، اور یہی وجہ ہے کہ بعض علماء سلف اس طرف گئے ہیں کہ وہی مہدی تھے۔

اور دجال کا سب سے بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کے ہاتھوں بعض اشخاص کو موت کے بعد زندگی نصیب ہوگی، یہ چیز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھی، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے بعض مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔

اور دوسرے شبہ کے جواب میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اسی سے ملتا جلتا شبہ رئیس معتزلہ ابو ہاشم جبائی (ت ۳۲۱ھ) نے بھی

---

(۱) دیکھو تفسیر الماوردی (۳/۳۴۰) وتفسیر البغوی (۳/۵۴۴، ۵۷۵) وتفسیر ابن کثیر (۳/۵۱۹، ۵۶۲)

(۲) مجموع الفتاوی (۱۳/۲۰)۔ (۳) تفسیر المنار (۹/۴۹۰) ۔

ظاہر کیا تھا، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر علماء متقدمین نے جو جواب دیا ہے اس پر اکتفا کیا جائے، چنانچہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ دجال نے نبوت کا دعویٰ نہیں کریگا کہ اس کے خوارق عادات دعویٰ نبوت کی صداقت کی دلیل بن سکیں، بلکہ وہ تو الوہیت کا دعویٰ کرے گا، دعویٰ الوہیت بشریت کے بالکل منافی چیز ہے، اس لئے دعویٰ الوہیت کی صورت میں خوارق کا صدور مانع نہیں ہوسکتا، اور نہ اس سے کسی اشتباہ کی گنجائش ہی پیدا ہوسکتی ہے۔[1]

علامہ قرطبی اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہما نے بھی یہی جواب دیا ہے۔[2]

حدیث جساسہ جس کو موصوف نے مختلف طرق سے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے آخر میں اپنی طول طویل بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"حدیث جساسہ کے سلسلے میں خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس حدیث کے اندر موجود علتوں، اختلافات اور اشکالات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ حدیث مصنوع (گھڑی ہوئی) ہے اگر اس کو صحیح فرض بھی کرلیں تو اس کے تمام حصے کو مرفوع کا حکم حاصل نہیں ہوسکتا۔"[3]

یہ بات کہہ کر موصوف نے ایک ایسی حدیث کو مطعون کرنے کی کوشش کی ہے جو صحیح مسلم میں موجود ہے۔ جیسا کہ پچھلی سطروں میں واضح کیا جاچکا ہے اور صحیح مسلم کو علماء امت نے صحیح بخاری کی طرح قبولیت کا درجہ دیا ہے، تمام مسلمانوں کو اس امر پر اتفاق ہے کہ صحیحین کی تمام حدیثیں درجۂ صحت کو پہونچی ہوئی ہیں، چند احادیث کو چھوڑ کر جن پر ماہرین حدیث نے فنی اعتبار سے کچھ کلام کیا ہے، لیکن ان کو مصنوع کہنا کبھی بھی درست نہیں ہوسکتا، چنانچہ سیوطی نے امام نووی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ "صحیح بخاری و صحیح مسلم کی جن احادیث پر کلام کیا گیا ہے، ان میں ایسی علتیں نہیں پائی جاتی ہیں جو حدیث کو بالکل ساقط الاعتبار کردیتی ہیں۔"[4]

لہٰذا مذکورہ حدیث کو مصنوع قرار دینا بہت بڑی جرأت ہے، جن علتوں کو بنیاد بناکر موصوف نے زیر مطالعہ حدیث کو مطعون کرنے کی کوشش کی ہے، شاید ان میں سب سے اہم اور بڑی علت یہ ہے کہ اس حدیث کو ہم تک تواتر کے ساتھ پہونچنا چاہیئے تھا، کیونکہ اپنے موضوع کے اعتبار سے نادر اور عجیب و غریب حدیث ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بڑے اہتمام کا مظاہرہ کیا تھا، ایسی حالت میں یہ بات نہایت غیر معقول لگتی ہے کہ یہ ہم تک آحاد کی شکل میں پہونچے، اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ جو کافی عرق ریزی اور دقت بحث

---

(1) دیکھئے النہایۃ لابن کثیر (1/164)

(2) دیکھئے التذکرۃ للقرطبی (ص 666) و فتح الباری (13/105)

(3) تفسیر المنار (9/497)

(4) تدریب الراوی (1/133-134)

سے کام لیتے تھے ، انہوں نے مذکورہ حدیث کو اپنی صحیح میں جگہ نہیں دیا جس سے سابقہ کلام کی تائید ہوتی ہے[۱]۔

اس طرح کی تنقید پہلے بھی کی جاچکی ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے بعض لوگوں کے حوالے سے اسے نقل کیا ہے ، اور اس کا جواب بھی بڑی تفصیل سے دیا ہے ، چنانچہ وہ فرماتے ہیں " بعض لوگوں کو اس حدیث کی بابت غرابت اور تفرد کا وہم ہوگیا ہے ، حالانکہ ایسی بات نہیں ہے ، کیونکہ اس کو (حضرت) فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کے ساتھ (حضرت) ابوہریرۃ ، و (حضرت) عائشہ ، و (حضرت) جابر ؛ رضی اللہ عنہم نے بھی روایت کیا ہے " اور پھر ہر ایک کی حدیث کو محدثین میں سے کس کس نے اپنی کتاب میں روایت کیا ہے اور ہر حدیث کے کتنے طرق اور اسانید ہیں ، اور صحت کے اعتبار سے ان کا کیا درجہ ہے ۔ ان تمام امور پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[۲] جس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ حدیث جساسہ کو تفرد اور غرابت سے متصف کرنا بالکل غلط ہے کیونکہ مشارالیہ اسانید وطرق اگرچہ اپنے متن کے اعتبار سے مختصر ہیں لیکن ان سے اصل قصہ کے ثبوت کا پتہ چلتا ہے ، اور وہ سب فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث کے لئے شواہد کا درجہ رکھتی ہیں ۔ ان میں بعض طرق ایسے ہیں جن پر کلام کیا گیا ہے لیکن اس حد کو نہیں پہونچتے کہ انہیں مرفوض قرار دیا جائے ، مصطلح حدیث کا ایک قاعدہ ہے کہ اگر کسی حدیث کی سند میں تھوڑا سا ضعف ہو اور اس کے متعدد طرق ہوں تو ہر ایک طریق کو دوسرے طریق سے تقویت مل جاتی ہے ، اور اس حدیث سے وہ ضعف ختم ہوجاتا ہے[۳]۔

لیکن موصوف کے نزدیک اس قاعدے کا کوئی اعتبار یا اہمیت نہیں ہے ، انہوں نے حافظ ابن حجر کی مذکورہ تفصیل سے عدم قناعت کا اظہار کرتے ہوئے حدیث کی آحادیث بزور منوانے کی کوشش کی ہے ، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں کہ " حافظ ابن حجر کے کلام سے حدیث کے آحاد ہونے کی نفی نہیں ہوتی ہے ۔ اور مقام اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ تواتر کے ساتھ نقل کی جائے اسی طرح ان کے کلام سے حدیث کے غریب ہونے کی بھی نفی نہیں ہوتی ہے ، اگر اسے تفرد سے پاک مان لیا جائے ۔ کیونکہ تمام اسانید امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت فاطمہ بنت قیس میں جاکر منحصر ہوجاتی ہیں "

پھر انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث (جس کو امام ابوداؤد رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے[۴]) کو ضعیف قرار دینے کی پوری کوشش کی ہے ۔

---

(۱) تفسیر المنار (۹/ ۴۵۳) ۔ (۲) فتح الباری (۱۳/ ۳۲۹)

(۳) علوم الحدیث لابن الصلاح (ص ۲۹ - ۳۱)

(۴) سنن ابی داؤد (۴/ ۵۰۲ حدیث نمبر ۴۳۲۴)

اس حدیث کی سند میں " الولید بن عبداللہ بن جمیع " نامی ایک راوی ہیں جن کو ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی کتاب الضعفاء میں ذکر کیا ہے، اور ان کے بارے میں یہ کہا ہے کہ وہ ثقہ لوگوں سے ایسی حدیثیں روایت کرنے میں منفرد نظر آتے ہیں جو ثقہ لوگوں کی حدیثوں سے مشابہت نہیں رکھتی ہیں، اور ان سے یہ چیز بکثرت صادر ہونے لگی، جس کی بنا پر وہ قابل احتجاج نہ رہ سکے امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں یہ کہا ہے کہ " اگر امام مسلم رحمہ اللہ نے ان کی حدیثوں کی تخریج نہ کی ہوتی تو زیادہ بہتر تھا "

اس طرح موصوف نے مذکورہ راوی کی تضعیف علماء سے نقل کرلی، اور ان علماء کے اقوال سے چشم پوشی کرلی جنہوں نے اس کی توثیق کی ہے، حالانکہ توثیق کرنے والے علماء میں امام جرح وتعدیل ابن معین وابوحاتم رازی رحمۃ اللہ علیہما جیسی عظیم شخصیتیں بھی ہیں[1]۔ موصوف کا یہ طریقہ نامناسب اور اصول بحث کے منافی ہے۔ رہی ابن ابن حبان کی تجریح تو ان کے یہاں مذکورہ راوی کی بابت تناقض پایا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے اس راوی کو اپنی کتاب الثقات میں بھی ذکر کیا ہے[2]۔

حافظ ابن حجر راوی کے بارے میں جس نتیجے پر پہونچے ہیں، اس کا خلاصہ اپنی مشہور ومعروف کتاب تقریب التہذیب میں " صدوق یہم، رمی بالتشیع " کہہ کر بیان کردیا ہے، یعنی وہ سچے ہیں، لیکن ان سے وہم ہوجاتا ہے۔ اور انہیں تشیع کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اسی وجہ سے حافظ ابن حجر نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث کو صحیح نہ کہہ کر حسن قرار دیا ہے، کیونکہ اس کے دوسرے طرق بھی ہیں۔

اور موصوف کا یہ کہنا کہ زیر بحث حدیث کی تمام اسانید (امام شعبی اور حضرت فاطمہ بنت قیس میں منحصر ہے، تو کیا یہ انحصار حدیث کی صحت اور عدم صحت میں اثر انداز ہوسکتا ہے۔ جبکہ امام شعبی ایک جلیل القدر ثقہ راوی ہیں، ان کے اس مرتبے کا خود موصوف کو بھی اعتراف ہے، اور اس کے باوجود وہ حدیث کی روایت میں منفرد بھی نہیں ہیں، کیونکہ ابو سلمہ بن عبدالرحمن نے بھی اس حدیث کو حضرت فاطمہ بنت قیس سے روایت کیا ہے[3]۔ اور موصوف کا یہ اصرار کہ حدیث آحاد ہے، موقعہ ومحل کے اعتبار سے تواتر کے ساتھ اس کو ہم تک پہونچنا چاہئے تھا، تو سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تواتر کسی حدیث کی قبولیت کے لئے شرط نہیں ہے، دوسری بات یہ کہ منبر پر اور صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کے سامنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حدیث بیان کرنا اس بات کا متقاضی نہیں ہے کہ

(۱) دیکھئے تہذیب التہذیب (۱۱/۱۳۸ - ۱۳۹)

(۲) الثقات (۵/۴۹۲)

(۳) دیکھئے سنن ابی داؤد (۴/۴۹۹ حدیث نمبر ۴۳۲۵)

اس کو تواتر کے ساتھ ہی نقل کیا جائے، کیونکہ بہتیرے خطبے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر اور صحابہ کرام کی ایک جم غفیر کے سامنے دیئے ہیں، لیکن ان خطبوں کے رواۃ کی تعداد تواتر کے حد تک نہیں پہونچتی ہے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کا خطبہ جسے آپ نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے مجمع کے سامنے دیا، اس کے روایت کرنے والے چند ہی صحابہ ہیں[1]۔

موصوف کا اس بات سے استدلال کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے زیر بحث حدیث کو اپنی کتاب میں جگہ نہیں دیا ہے، غلط ہے۔ کیونکہ انہوں نے کہیں اس بات کی وضاحت نہیں کی ہے کہ مذکورہ حدیث کو اس کے ضعف کی وجہ سے نہیں روایت کیا ہے، اور نہ ہی ان کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام صحیح احادیث کو انہوں نے اپنی کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے بلکہ اس کے برخلاف ان سے یہ نقل کیا جاتا ہے کہ "میں نے اس کتاب کے اندر صرف صحیح حدیثوں کی روایت کی ہے اور جو صحیح حدیثیں میں نے ترک کر دی ہیں وہ بہت زیادہ ہیں[2]"

اور موصوف نے صحیح بخاری کی حدیثوں کو کب اہمیت دی ہے۔ وہی تو ہیں جو اپنے استاذ محمد عبدہ سے دجال کے متعلق یہ نقل کرتے ہیں کہ "دجال درحقیقت خرافات، دجل و فریب اور قباحتوں کا رمز ہے، اس سے مقصود فتنہ و فساد کا انتشار، اور ضلالت و گمراہی کا بول بالا ہے، یعنی ان کی نظر میں دجال کی کوئی شخصیت نہیں ہے۔

موصوف نے اس قول کو نقل کرنے کے بعد سکوت اختیار کیا ہے، جس سے ان کی رضامندی کا پتہ چلتا ہے، حالانکہ یہ رائے احادیث صحیحہ کی صریحاً مخالف ہے، اور ان میں سے اکثر و بیشتر صحیح بخاری و صحیح مسلم کی حدیثیں ہیں، اس سے عجیب و غریب بات تو یہ ہے کہ موصوف نے محمد عبدہ سے نقل کیا ہے کہ نزول عیسیٰ سے مراد ان کی روح اور ان کی رسالت کے اسرار کا غلبہ ہے، لوگوں میں ان کی تعلیمات جن میں باہم صلح و آشتی اور محبت و رحمدلی کا پہلو غالب ہے لوگوں میں عام ہوں گی[3]۔ یہ تاویل بھی صحیح احادیث کی سراسر مخالف ہے اور ان میں سے اکثر و بیشتر صحیحین میں موجود ہیں، موصوف مخالفت کا اعتراف بھی کرتے ہیں، لیکن برا ہو اندھی تقلید کا۔ کہ اس کے فوراً بعد ہی روایت بالمعنی کا احتمال پیدا کر کے تمام احادیث کو بے معنی کر دیتے ہیں، ایک طرف صحیح بخاری کی حدیثوں کے ساتھ ان کا یہ سلوک، اور دوسری طرف حدیث جساسہ کو ضعیف قرار دینے کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ کی عدم روایت کو اپنی حجت بناتے ہیں۔

یہ تھے سید محمد رشید رضا کی اس تنقید کے چند اہم نقاط، جس میں انہوں نے احادیث اشراط کو نشانہ بنایا ہے، اور ان کا سرسری جائزہ؛ اس سے شاید قارئین حضرات موصوف کے غلط موقف کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

---

(۱) دیکھئے اتحاف الجماعۃ للتویجری (۲/۶۰-۶۱) (۲) ہدی الساری (ص ۷)

(۳) تفسیر المنار (۳/۳۱۷)۔

قسط ۳

محمد عزیر

کالا خضاب لگانا کیسا ہے؟

دوسری حدیث کی تاویل و توجیہ میں مجوزین نے جو کچھ کہا ہے (الموضوعات لابن الجوزی ۲/۵۵) ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ اس حدیث کے مرفوع اور موقوف ہونے میں اختلاف ہے ۔

۲۔ یہ حدیث صحیح نہیں، اس کی سند میں عبدالکریم بن ابی المخارق ابو امیہ البصری ہے جو متروک ہے، اسی نے یہ حدیث بنائی ہے

۳۔ صحابہ کی ایک جماعت اور تابعین میں سے خلق کثیر نے کالا خضاب لگایا ہے، اس کی کراہت جن لوگوں سے منقول ہے وہ اس صورت میں ہے جب کہ تدلیس کی نیت سے لگایا جائے۔ لیکن نیت تدلیس کی نہ ہو اس کے باوجود حرام ہو اور لگانے والا ایسی زبردست وعید کا مستحق ہو، اس کا کوئی قائل نہیں ۔ تلبیس و تدلیس کی شرط لگانا اس لئے ضروری ہے کہ کالا خضاب لگانے کی بابت مختلف و متضاد روایتیں مروی ہیں، یہ شرط لگا دینے سے ان متضاد روایات کے درمیان تطبیق کی صورت نکل آتی ہے ۔

۴۔ اس حدیث کو صحیح ماننے کی صورت میں جواب یہ ہے کہ ممکن ہے اس سے مراد آخری زمانے کی ایک قوم ہو جو اپنے غلط اعمال و عقائد کی وجہ سے جنت کی مہک تک نہ پائے گی، کالا خضاب لگانے کی وجہ سے نہیں بلکہ کالا خضاب لگانا اس قوم کی نشانی ہوگا جس طرح کہ آپ نے خوارج کی نشانی سر منڈانا بتایا ہے، حالانکہ سر منڈانا حرام نہیں ۔ اس تاویل کی تائید (بقول ابن ابی عاصم) اس سے بھی ہوتی ہے کہ اول زمانے ہی میں بہت سے صحابہ و تابعین سیاہ خضاب لگانے لگے تھے، اگر یہ جنت کی مہک تک نہ پانے کا موجب ہوتا تو پھر " آخر زمانے " کی قید لگانے کا کیا مطلب ؟ لہذا وعید کا تعلق اس قوم کے کفر و شرک سے ماننا پڑے گا، سیاہ خضاب لگانے سے نہیں ۔

ان میں سے پہلی اور دوسری بات تو بالکل ہی ناقابل التفات ہے، یہ حدیث اکثر مآخذ میں مرفوعاً مروی ہے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں ۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ: اس کے مرفوع اور موقوف ہونے میں اختلاف بیان کیا گیا ہے ۔ اگر موقوف ہونا راجح مان لیا جائے تب بھی یہ مرفوع کے حکم میں ہے، اس لئے کہ ایسی بات اپنی رائے سے نہیں کہی جا سکتی ۔ (فتح الباری ۶/۴۹۹)

اس حدیث کی صحت پر ابن الجوزی نے جو اعتراض کیا ہے اور اسے "موضوعات" میں درج کیا ہے۔ اس پر بعد کے تمام متین نے نکیر کی ہے، اس کی سند میں ایک راوی "عبدالکریم" کو ابن الجوزی نے "ابن ابی المخارق ابوامیہ البصری" سمجھا ہے۔ متروک ہے، جب کہ وہ فی الواقع "بن مالک الجزری" ہے جو ثقہ ہے، بعض ماخذ میں اس حدیث کی سند کے اندر "الجزری" مذکور ہے۔ (شعب الایمان ۴/۱۷۲ الف، الآداب للبیہقی ص ۳۷۸، شرح السنہ ۱۲/۹۲) منذری (مختصر السنن ۶/۱۰۸، ترغیب والترھیب ۳/۱۸۵) ذہبی (تلخیص الموضوعات) صلاح الدین علائی (النقد الصحیح لما اعترض علیہ من احادیث مصابیح ص ۲۷-۲۸ تحقیق محمد صالح بنارسی، ابن حجر (القول المسدد ص ۴۸-۴۹، اجوبۃ عن احادیث المصابیح ۱۷۸۳ [مع المشکوٰۃ]) ابن العراق الکنانی (تنزیہ الشریعۃ ۲/۲۷۵) وغیرہم نے ابن الجوزی اور ابو حفص قزوینی پر تعاقب کیا ہے، اور بتایا ہے کہ اس حدیث کو موضوع یا ضعیف کہنا غلط ہے، ابن حجر نے اس کی سند کو "قوی" کہا ہے (فتح الباری ۶/۴۹۹) دیگر محدثین اور نقاد کی بھی یہی رائے ہے۔

تیسری بات کا جواب یہ ہے کہ جن صحابہ کی طرف کالا خضاب لگانا منسوب کیا جاتا ہے ان سے اس کا ثبوت نہیں جیسا کہ پہلے بحث کی جا چکی ہے، تابعین کی بھی کثیر تعداد نہیں بلکہ صرف چند حضرات سے کالا خضاب لگانا منقول ہے: یعنی عمرو بن عثمان بن عفان (ابن سعد ۵/۱۵۱)، علی بن عبداللہ بن عباس (سیر اعلام النبلاء ۵/۲۵۲، ۲۵۲، ۲۸۴) ابو سلمہ بن عبدالرحمن بن عوف (ابن سعد ۵/۱۵۶، ابن ابی شیبہ ۸/۴۳۷، شرح السنۃ ۱۲/۹۴، سیر اعلام النبلاء ۴/۲۸۸) موسیٰ بن طلحہ بن عبیداللہ (ابن سعد ۵/۱۶۳، ۶/۲۱۲، ابن ابی شیبہ ۸/۴۳۷، سیر اعلام النبلاء ۴/۳۶۶) نافع بن جبیر بن مطعم (ابن سعد ۵/۲۰۶، ابن ابی شیبہ ۸/۴۳۷، سیر اعلام النبلاء ۴/۵۴۲) محمد بن علی بن الحنفیہ (ابن سعد ۵/۲۳۷، ابن ابی شیبہ ۸/۴۳۸، شرح السنۃ ۱۲/۹۴) زہری (ان کے بارے میں تفصیل گذر چکی ہے) محمد بن اسحاق (سیر اعلام النبلاء ۷/۳۵)۔

باقی جن لوگوں کا نام اس سلسلے میں لیا جاتا ہے ان کے بارے میں کوئی روایت نہیں ملتی، بلکہ ان میں سے بعض سے سیاہ کے بجائے سرخ یا زرد خضاب لگانا منقول ہے۔ جیسے: عبدالرحمٰن بن الاسود (ابن ابی شیبہ ۸/۴۴۳) ایوب السختیانی (ابن سعد ۷/۲۵۱) جب حقیقت حال یہ ہے تو پھر یہ دعویٰ کہ صحابہ و تابعین کی ایک بہت بڑی جماعت اور کثیر تعداد نے کالا خضاب لگایا کوئی وزن نہیں رکھتا۔

اموی دور میں مکہ، مدینہ اور دمشق کے سماجی اور معاشی حالات پر جن کی نظر ہے، انہیں ایسے ماحول اور معاشرے میں بعض

اولاد صحابہ اور دیگر تابعین کے سیاہ خضاب لگانے پر کوئی حیرت نہیں ہوگی، فتوحات کے باعث جب مال و دولت کی فراوانی ہوئی تو مدینہ اور مکہ جیسے مقدس مقامات میں عیش و عشرت کے آثار ظاہر ہونے لگے، غنا و موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتیں، مرد ریشمی کپڑے پہنتے، سونے کی انگوٹھیاں استعمال کرتے، محلوں کی تزئین و آرائش پر توجہ صرف ہوتی، سونے، چاندی، ہیرے، جواہرات کی اتنی زیادتی ہوئی کہ سونے چاندی کے برتن استعمال ہونے لگے، لونڈیوں اور غلاموں کی کثرت لوگوں کو رقص و طرب، لہو و لعب، عاشقی اور غزل گوئی کی طرف لے گئی۔

ایسے عیش و تنعم کے ماحول میں صحابہ کی بعض اولاد اور دوسرے متدین حضرات کا بھی تھوڑا بہت اس سے متاثر ہو جانا فطری بات ہے، اگر ہم ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے غنا و موسیقی سے شغف، سونے کی انگوٹھی پہننے اور ریشمی کپڑے استعمال کرنے کی وجہ سے ان چیزوں کو شریعت میں جائز اور حلال نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح ان میں بعض لوگوں کے سیاہ خضاب لگانے سے شریعت میں اس کے جواز کی راہ نہیں نکلتی، شریعت کا حکم ان تمام امور میں اپنی جگہ باقی رہے گا، کسی کے اس کے خلاف عمل سے حقیقت بدل نہیں سکتی، جو لوگ ان امور کے اندر نصوص کتاب و سنت کے مقابلے میں دوسروں کا عمل پیش کرتے ہیں، ان کی نگاہ میں وہ معاشی اور سماجی پس منظر نہیں ہوتا جس کی ہم نے پچھلے سطور میں تھوڑی سی عکاسی کی ہے، تفصیل کے لئے دور اول کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

ایسے ماحول میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ و تابعین کی ایک معتدبہ تعداد ان امور پہ نکیر کرتی ہے، اور شریعت کے احکام پر عمل پیرا ہے تو ہمیں یقین ہوتا ہے کہ دوسروں کا رویہ ان کے مقابلے میں قطعاً درست نہیں تھا خواہ انہوں نے کسی بھی مجبوری لاعلمی یا تاویل کے پیش نظر ایسا کیا ہو۔

سیاہ خضاب کے بارے میں ہم پہلے ہی ذکر کر چکے ہیں کہ متعدد صحابہ و تابعین نے اس سے شدید کراہت کا اظہار کیا ہے، اور ان کی ایک کثیر تعداد نے زرد یا سرخ خضاب لگایا ہے، میرے پاس ایسے پچاس سے زیادہ مشہور صحابہ و تابعین کی فہرست مع حوالہ جات موجود ہے، اگر مطلوب ہو تو پیش کی جاسکتی ہے فی الحال طوالت کی وجہ سے اسے قلم انداز کیا جاتا ہے، اس فہرست کا موازنہ ان اٹھارہ دس آدمیوں کی فہرست سے کیجئے جن سے سیاہ خضاب لگانا منقول ہے، تو اندازہ ہوگا کہ پہلے مجموعے میں اکثر مشاہیر صحابہ و تابعین شامل ہیں اور دوسرے میں صرف بعض اولاد صحابہ ہیں جن کی نشو و نما حجاز کے عیش و تنعم کے ماحول میں ہوئی تھی، چنانچہ بوڑھے ہو کر بھی انہوں نے اپنے آپ کو جوان دکھانے کی کوشش کی تھی کیا ان ہی کے عمل کو بنیاد بنا کر ہم احادیث میں تاویل کریں گے؟ میرے خیال میں یہ سعی محمود نہیں۔

اس سلسلے میں جو یہ کہا جاتا ہے کہ "کالے خضاب کی کراہت اس صورت میں ہے جب کہ تدلیس کی نیت سے لگایا جائے"

درست نہیں، جن لوگوں سے کراہت منقول ہے وہ بلا تقیید ہے، جیسا کہ ہم ذکر کرآئے ہیں۔ صرف ابن سیرین سے اس طرح کی ایک روایت ملتی ہے (بلا سند در شرح السنۃ ۱۲/۹۴) مگر وہ بھی ابن ابی شیبہ (۸/۴۳۷) میں بغیر اس قید کے مذکور ہے۔
مجوزین کا یہ کہنا کہ اس کا کوئی قائل نہیں کہ بغیر تدلیس کے سیاہ خضاب لگانے والا ایسی شدید وعید کا مستحق ہے، بھی صحیح نہیں۔
اس وعید کا مفہوم یہ ہے کہ سیاہ خضاب سخت منع ہے، لوگ اس کے قریب نہ جائیں، یہ اس کی تحریم اور شدتِ کراہیت بیان کرنے اور لوگوں کو اس سے نفرت دلانے کا ایک بلیغ اسلوب ہے جو لوگوں کو اس عادتِ قبیحہ سے باز رکھنے میں بڑا مفید ثابت ہوا، ساتھ ہی یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اگر کوئی اس شدید ممانعت کے باوجود اور ان حدیثوں کے معلوم ہوتے ہوئے اپنے خواہش نفس کی پیروی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر اصرار کرتا ہے، اور تجمل و تزیّن کے نام پر سیاہ خضاب کو اپنے لئے حلال سمجھتا ہے اس کے لئے کیا یہ وعید مبنی بر حقیقت نہیں؟ فليحذر الذين يخالفون عن أمره أن تصيبهم فتنة أو يصيبهم عذاب أليم۔

مجوزین کہتے ہیں کہ "تلبیس و تدلیس کی شرط لگا دینے سے کالے خضاب کی بابت مختلف و متضاد روایتوں کے درمیان تطبیق کی صورت نکل آتی ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون سی حدیثیں ہیں جو کالے خضاب کے جواز پر دلالت کرتی ہیں؟ کیا وہ دونوں موضوع اور ضعیف روایتیں جن کی حقیقت بیان کی جا چکی ہے؟ "یا حناء دکتم" والی روایت جس کا مطلب غلط سمجھا جاتا ہے اس سے سیاہ خضاب کے جواز پر استدلال کرنا لغو ہے (جیسا کہ مفصل گذر چکا ہے)

"تغییر الشیب" سے متعلق مطلق روایتیں جیسے:

۱۔ ابوہریرہؓ کی حدیث: "یہود و نصاریٰ اپنے بالوں کا رنگ نہیں بدلتے، تم ان کی مخالفت کرو" (بخاری (مع فتح الباری) ۶/۴۹۶، ۱۰/۳۵۴، مسلم ۳/۱۶۶۳، ابوداؤد ۴/۸۵، نسائی ۸/۱۳۷، مصنف عبدالرزاق ۱۱/۱۵۴، ابن سعد ۱/۴۳۹، ۴۴۰، ابن ابی شیبہ ۸/۴۳۱، مسند احمد ۲/۲۴۰، ۲۶۰، ۳۰۹، ۴۰۱، مسند ابی عوانہ ۵/۵۱۴-۵۱۵، شعب الایمان ۲/۱۷۲ الف، الآداب للبیہقی ص ۲۷۷)

۲۔ ابوہریرہؓ ہی کی دوسری حدیث: سفید بالوں کے رنگ بدل ڈالو، اور یہود (نصاریٰ) سے مشابہت مت اختیار کرو (مسند احمد ۲/۲۶۱، ۳۵۶، ۴۹۹، ابن سعد ۱/۴۳۹، ترمذی ۴/۲۰۳، شعب الایمان ۲/۱۷۲ الف) اسی معنی کی حدیث زبیر (ابن سعد ۱/۴۳۹، مسند احمد ۱/۱۶۵، نسائی ۸/۱۳۸، حلیۃ الأولیاء ۲/۱۸۰، تاریخ بغداد ۵/۴۰۴)

ابن عمر (نسائی ۸/۱۳۷، تاریخ بغداد ۴/۷۷) عائشہ (معجم اوسط طبرانی : مجمع الزوائد ۵/۱۶۰، فتح الباری ۱۰/۳۵۵) عتبہ تاریخ بغداد ۵/۴۰۹، ۹/۸، ۳۰۸)، عروہ (مرسلاً در : ابن سعد ۱/۴۳۹) اور نافع بن جبیر (ابن سعد ۳/۱۹۱) سے بھی مروی ہے ۔

۳۔ عتبہ بن عبد کی روایت : " رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عجمیوں کی مخالفت میں سفید بالوں کا رنگ بدلنے کا حکم دیتے تھے " (طبرانی : مجمع الزوائد ۵/۱۶۲، فتح الباری ۱۰/۳۵۴)

کیا ان روایات سے کسی بھی رنگ (خواہ سیاہ ہی کیوں نہ ہو) کا خضاب لگانے کا جواز نکلتا ہے ؟ اور کیا ایسا کسی صحابی نے فرمانِ رسول سے سمجھا تھا ؟ مضمون کے شروع میں ہم صحابہ کا موقف بیان کرچکے ہیں، اور انہوں نے اس حدیث سے کیا سمجھا تھا؟ اس کا ذکر دلائل کے ساتھ کر آئے ہیں، یہاں اتنی یاد دہانی کرادوں کہ اسود بن یزید کی روایت (ابن سعد ۱/۴۴۰) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار سفید بالوں کا رنگ بدلنے کا حکم دیا تو سب لوگوں نے سرخ یا زرد خضاب لگالئے ، اور نافع بن جبیر کی روایت (ابن سعد ۳/۱۹۱) میں اسی طرح کا ایک مطلق حکم دینے کا ذکر ہے، جس کے بعد حضرت ابوبکر نے حنا اور کتم کا ، حضرت عمر نے گہرے رنگ کا (سرخ)، اور حضرت عثمان نے زرد رنگ کا خضاب لگایا۔ کسی ایک شخص سے بھی ثابت نہیں کہ اس نے اس فرمان کے سننے کے بعد سیاہ خضاب لگالیا ہو، کیونکہ صحابۂ کرام نے بار بار مکہ اور مدینہ میں کالے خضاب سے نہی کی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی تھی، چنانچہ وہ جب مطلق خضاب لگانے کا حکم دیتے تب بھی ان کا منشا صحابہ اسی طرح سمجھتے تھے ۔

اس موضوع کی تمام حدیثیں جمع کرنے کے بعد کوئی شخص اس مطلق فرمان سے کالے خضاب کا جواز مستنبط نہیں کرسکتا، کیونکہ اس سے ممانعت صاف طور پر دوسری احادیث میں مذکور ہیں ۔ کیا یہ کہنا ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو عام حکم دے کر سیاہ خضاب لگانا جائز کہہ رہے تھے مگر صحابۂ کرام پر یہ حقیقت منکشف نہ ہوسکی، اور وہ کبھی سیاہ خضاب لگا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ واضح نہ کرسکے کہ ہم نے آپ کے فرمان پر پورے طور پر عمل کرلیا ہے ۔

آخر اس وقت مسلمانوں کے یہاں صرف ورس ، زعفران، حنا، اور کتم سے خضاب لگانے کا ذکر کیوں آتا ہے، سیاہ خضاب کا تذکرہ کیوں نہیں، جب کہ مشرکین مکہ کے درمیان اس کا کافی رواج عبد المطلب کے زمانے سے ہوگیا تھا؟ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہ فرمایا ہوتا تو کیا سیاہ خضاب مسلمانوں کے اندر اس طرح ناپید ہوتا ؟

اب تک ہم نے مجوزین کی تیسری تاویل سے بحث کی ، اب آخری تاویل کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ سیاہ خضاب

لگانا جنت کی مہک نہ پانے کی علت نہیں، بلکہ وہ قوم اپنے دیگر بداعمالیوں کے نتیجہ میں اس وعید کی مستحق ہوگی، سیاہ خضاب لگانا اس کی ایک نشانی ہوگی جو فی نفسہ غلط نہیں، جیسے خوارج کی نشانی سر منڈانا بیان کیا گیا ہے، حالانکہ یہ حرام نہیں، اس کے جواب میں حافظ ابن حجر (فتح الباری ۱۰/۳۵۵) فرماتے ہیں کہ "یہ حدیث کے سیاق سے جو متبادر ہوتا ہے اس کے خلاف ہے۔" اس کی توضیح یہ ہے کہ اس حدیث میں سیاہ خضاب لگانے کے علاوہ ان لوگوں کے کسی دوسرے وصف کا ذکر نہیں، لہٰذا علت مذکورہ وصف کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ دیگر احادیث اور آثار صحابہ وتابعین میں بھی سیاہ خضاب کی سخت مذمت آئی ہے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، قیامت کے دن اس کے مرتکب کا چہرا سیاہ کرنے، اس کی طرف اللہ کے نظر نہ کرنے اس کے بالوں میں آگ کے شعلے بلند ہونے ... وغیرہ کا ذکر ہے، جس کے بعد اس تاویل میں کوئی جان نہیں رہ جاتی کہ سیاہ خضاب پر مذکورہ وعید نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق دیگر بداعمالیوں سے ہے۔

خوارج کے بارے میں جس حدیث کے اندر سر منڈانے کو ان کی نشانی بتایا گیا ہے، اس میں ان کے دیگر کئی مذموم اوصاف کا بیان ہے، یہ حدیث امام بخاری نے دس جگہ ذکر کی ہے (صحیح بخاری رقم ۳۳۴۴، ۳۶۱۰، ۴۳۵۱، ۴۶۶۷، ۵۰۵۸، ۶۱۶۳، ۶۹۳۱، ۶۹۳۳، ۷۴۳۲، ۵۷۶۲)

صرف آخری جگہ یہ ہے کہ لوگوں نے جب ان کے یہ اوصاف سنے تو انھیں پہچاننے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی ظاہری کوئی نشانی دریافت کی، تب آپ نے فرمایا کہ ان کی نشانی سر منڈانا ہے۔

یہاں صاف ظاہر ہے کہ ذم کا تعلق اس نشانی سے نہیں بلکہ ان اوصاف سے ہے جن کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا، اس کے برخلاف سیاہ خضاب سے متعلق حدیث میں کہیں بھی اس وعید کو کسی دوسرے وصف سے متعلق نہیں کیا گیا ہے۔ اس حدیث کے سیاق سباق اور اس کے مختلف طرق میں کہیں بھی ادنی اشارہ اس قوم کی دیگر بداعمالیوں کی طرف نہیں ہے۔ لہٰذا وعید کا تعلق کالے خضاب کے سوا کسی دوسرے مذموم وصف سے ماننا عربی زبان کے اسالیب کے خلاف ہے۔

ابن ابی عاصم کے اس قول میں بھی کوئی وزن نہیں کہ " کالے خضاب کا ظہور تو صحابہ وتابعین کے دور میں ہو گیا تھا، پھر اس کے متعلق حدیث میں "آخر زمانہ" کی قید کا کیا مطلب ہے؟ اس سے ظاہر ہے کہ وعید کا تعلق سیاہ خضاب لگانے سے نہیں بلکہ دیگر مذموم عقائد واعمال سے ہے جو آخر زمانے میں ان لوگوں کے اندر پائے جائیں گے۔"

اس حدیث کا یہ مطلب نہیں جو انہوں نے سمجھا ہے، بلکہ آخر زمانے کی قید سے کالے خضاب کے استعمال کی کثرت اور اس کا بدرجہ اتم ظہور اور شیوع مراد ہے۔ اس سے یہ مستنبط نہیں ہوتا کہ دوسرے زمانوں میں اس کا استعمال نہیں ہوگا، یا ہوگا تو وہ قابل مذمت

نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اسلوب میں اور بھی بہت سے مذموم اعمال وافعال کی خبر دی ہے جن کا بدرجۂ اتم ظہور وشیوع آخری زمانے میں ہوگا، اور صحابۂ کرام کو ان سے بچنے کی تلقین کی ہے۔

ان کا وجود دور اول سے آج تک ہمیشہ رہا ہے، ذیل کی احادیث ملاحظہ فرمائیں:۔

۱۔ معاذ بن جبل کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آخر زمانے میں بہت سے لوگ ہوں گے جو ظاہر میں دوست باطن میں دشمن ہوں گے (مسند احمد ۵/۲۳۵)

۲۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آخر زمانے میں بہت سے جھوٹے دھوکے باز ہوں گے، جو تمہارے پاس ایسی حدیثیں بیان کریں گے جنہیں نہ تم نے کبھی سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء و اجداد نے، تم ان سے بچ کر رہنا، تمہیں وہ گمراہ نہ کردیں » (مسلم ۱/۱۲)

۳۔ ابن مسعود کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "آخری زمانے میں ایسے لوگ ہوں گے جو مسجدوں میں حلقے بنا بنا کر بیٹھیں گے، ان کا مقصود دنیا ہوگا، تم لوگ ان کے ساتھ نہ بیٹھنا، اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی مطلب نہ ہوگا » (ابن حبان (موارد الظمآن رقم [۳۱۱])

۴۔ ابو امامہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آخری زمانے میں اس امت کے اندر ایسے لوگ (پولیس والے) ہوں گے، ان کے پاس گائے کی دم کی طرح لمبے سونٹے (کوڑے) ہوں گے، اللہ کے غضب میں وہ صبح شام آئیں گے جائیں گے۔" (مسند احمد ۵/۲۵۰، مستدرک حاکم ۴/۴۳۶)

یہ اور ان جیسی بعض احادیث میں جن مذموم باتوں کے آخری زمانے میں ظہور کی پیشین گوئی کی گئی ہے ان کا وجود دور اول ہی میں ہوگیا تھا، صحابۂ کرام ان سے سخت اجتناب کرتے تھے، اور ان اوصاف کے حامل لوگوں پر نکیر کرتے ہوئے یہ حدیثیں بیان کرتے تھے، انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن باتوں کے ظہور وشیوع کو آخری زمانے سے متعلق قرار دیا ہے ان کی ابتداء اور شروعات قرن اول ہی میں ہوجانا خطرے کی گھنٹی ہے، وہ اس زعم میں مبتلا نہیں کہ ان کا ظہور وشیوع تو قیامت کے قریب بعض اقوام میں ہوگا، اس لئے اپنے زمانے میں موجود لوگوں پر نکیر نہ کی جائے۔

سیاہ خضاب لگانے سے متعلق اس صریح حدیث کے بارے میں ابن ابی عاصم کا یہ قول بالکل ہی ناقابل التفات ہے، اس پر اب مزید بحث کی ضرورت نہیں، ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ آج کل مغربی تہذیب سے متاثر ہوکر خود مسلمان مردوں کے اندر سیاہ خضاب لگانے، سونے کی انگوٹھی پہننے، ریشمی کپڑے استعمال کرنے، سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے، اور اسی طرح دیگر امور

کا اس کثرت کے ساتھ ظہور ہو گیا ہے کہ اب انہیں اسلامی تعلیمات بتانی پڑتی ہے، اور بڑی مشکل سے وہ اپنی عادتوں سے باز آتے ہیں، ان میں سے ہر ایک منکر اور شریعت میں ممنوع ہے، علماء دین کو چاہیئے کہ اس سلسلے میں تساہل کی روش اختیار نہ کریں اور ان میں سے بعض امور کے لئے زبردستی وجہ جواز فراہم کرنے کے بجائے ان سے عام مسلمانوں کو بچانے کی تدبیر سوچیں، آج ان منکرات میں سے کسی ایک کے بھی قائل اور فاعل عموماً جذبۂ اتباع سنت سے کلی یا جزوی طور پر محروم اور حلاوت ایمان سے ناآشنا ہیں، ان کی وعید سے متعلق جو کچھ حدیثوں میں وارد ہے، وہ بالکل صحیح ہے۔ اس سلسلے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

کالے خضاب کے بارے میں فقہاء کا مسلک

تمام حنفی شافعی، مالکی حنبلی علماء کالے خضاب کی کراہت پر متفق ہیں، بلکہ ان میں سے بعض تو ان کی حرمت کے بھی قائل ہیں۔ علامہ نووی فرماتے ہیں:

" علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ داڑھی یا سر کے بال میں سیاہ خضاب لگانا مذموم ہے "

غزالی احیاء العلوم میں اور بغوی " تہذیب " میں اور ان کے علاوہ دیگر شافعی علماء کہتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے، ان کی عبارتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کراہت تنزیہی کے قائل ہیں، مگر صحیح اور صواب قول یہ ہے کہ یہ حرام ہے، اس کی حرمت کی تصریح ماوردی نے " الحاوی " اور " الاحکام السلطانیہ " میں کی ہے، اس کی حرمت کی دلیل جابر اور ابن عباس کی حدیثیں ہیں، یہی ہمارا مذہب ہے۔ (المجموع شرح المہذب ۱/۲۹۴، نیز دیکھئے: شرح صحیح مسلم ۱۴/۸۰، المعیار المعرب للونشریسی ۱۲/ ۳۶۷-۳۶۸)

امام احمد سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ سیاہ خضاب ناپسند کرتے ہیں؟ انہوں نے فرمایا: ہاں قسم بخدا (المغنی لابن قدامہ ۱/۹۲، تہذیب سنن ابی داؤد ۶/۱۰۴)

امام مالک کو ممانعت کی حدیث نہیں پہونچی تھی، پھر بھی انہوں نے سیاہ کے علاوہ دوسرے رنگ کا خضاب لگانا بہتر سمجھا (شرح السنۃ ۱۲/۹۴، شرح صحیح مسلم ۱۴/۸۰، فتح الباری ۶/۴۹۹)

احناف میں صرف امام ابو یوسف سے اس کا جواز منقول ہے، وہ کہتے تھے: " کہ جسطرح بیوی میرے لئے زیب و زینت کرتی ہے، مجھے بھی اس کے لئے تزیین پسند ہے " باقی عام حنفی علماء ومشائخ اس کی کراہت کے قائل ہیں (حاشیہ ابن عابدین ۵/ ۲۷۱، ۴۸۱ [طبع بولاق])

البتہ اس سلسلے میں فقہاء یہ تصریح کرتے ہیں کہ اگر میدان جہاد میں دشمنوں کو مرعوب کرنے کے لئے سیاہ خضاب لگایا جائے تو کوئی

حرج نہیں ۔ ماوردی (الاحکام السلطانیہ ص ۲۵۸)، غزالی (احیاء علوم الدین ۱/۱۴۳)، نووی (المجموع ۱/۲۹۴) ابن حجر (فتح الباری ۶/۴۹۹، ۱۰/۳۵۴) ونشریسی (المعیار المعرب ۱۲/۳۶۷) اور ابن عابدین (حاشیہ علی الدر المختار ۵/۲۷۱، ۵۸۲) وغیرہم نے اس کی صراحت کی ہے اور اس سلسلے میں دوسرے علماء کے بھی اقوال نقل کئے ہیں ۔

غالباً اس کے لئے "الحرب خدعۃ" والی دلیل کافی ہوگی ۔ جو حدیث یا آثار اس بارے میں وارد ہیں وہ صحیح نہیں ۔ صہیب الخیر کی روایت (ابن ماجہ ۲/۱۱۹۷) کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ وہ ضعیف ہے، حضرت عمر کا ایک اثر (عیون الاخبار لابن قتیبہ ۲/۳۲۶) اور جعفر بن محمد کا ایک قول جس میں مطلق خضاب کا ذکر ہے (شعب الایمان ۲/۱۷۲ ب) اس سلسلے میں مروی ہے لیکن پہلے کی سند منقطع اور رجالِ سند مجہول ہیں، دوسرے کے بارے میں بیہقی فرماتے ہیں کہ: جعفر بن محمد کی مراد اگر اس سے سیاہ کے علاوہ دوسرے رنگ کا خضاب ہے تب تو یہ صحیح ہے، ورنہ سیاہ خضاب سے نہی وارد ہے (شعب الایمان ۲/۱۷۲ ب) ۔

کچھ علماء نے اس سلسلے میں مرد اور عورت کے درمیان تفریق کی ہے، عورت کے لئے اپنے شوہر کے سامنے سیاہ خضاب لگانا جائز اور مرد کے لئے ناجائز بتایا ہے ۔ قتادہ (مصنف عبد الرزاق ۱۱/۱۵۵، شرح السنۃ ۱۲/۹۴) اسحق بن راہویہ (المغنی ۱/۹۲، المجموع ۱/۲۹۴، تہذیب سنن ابو داؤد ۶/۱۰۴) اور حلیمی (فتح الباری ۶/۴۹۹، ۱۰/۳۵۵) کی رائے یہی ہے ۔ انہوں نے احادیث نہی سے صرف مردوں کو سیاہ خضاب لگانے کی ممانعت سمجھی ہے، اور چونکہ عورتوں کے لئے ہاتھ اور پاؤں میں زیب و زینت کے لئے خضاب لگانا مشروع ہے، اس لئے ان کے لئے سیاہ خضاب لگانے کو بھی انہوں نے اسی پر قیاس کرلیا، مگر یہ رائے صحیح نہیں، احادیثِ نہی کے اندر کہیں کوئی تفریق مذکور نہیں ہے ۔

اس سلسلے میں ایک قول ام المؤمنین عائشہ رضؓ سے منقول ہے وہ فرماتی ہیں:

"میں چاہتی تھی کہ میرے پاس کوئی چیز ہوتی جس سے میں اپنے بال سیاہ کرلیتی" (شرح السنۃ ۱۲/۹۴) لیکن یہ روایت بلا سند ہے سند کے ساتھ مجھے کہیں یہ روایت نہیں ملی کہ اس کی صحت کی تحقیق کی جاسکے ۔

ایک دوسرا اثر فاطمہ بنت المنذر سے بھی مروی ہے، وہ کہتی ہیں کہ: ہم عورتیں اسماء بنت ابی بکر کے ساتھ احرام باندھنے سے پہلے کنگھی کرتی، اور مکتومہ کا تیل استعمال کرتی تھیں، (مسند اسحاق بن راہویہ ورق ۲۵۸ ب، غریب الحدیث للخطابی ۲/۵۹۳) ۔

اس روایت میں مکتومہ سے ایک تیل مراد ہے جسے عرب استعمال کرتے تھے ۔ اس کا رنگ کیسا ہوتا تھا اس کے بارے میں

اسحق بن محمد عملی کہتے ہیں کہ: وہ سرخ ہوتا تھا، اس میں زعفران ڈالا جاتا تھا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس میں "کتم" یا "وسمہ" ڈالا جاتا تھا (غریب الحدیث ۵۹۳/۲)

اس اختلاف کے پیش نظر قطعی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے بال سیاہ ہوجاتے رہے ہوں گے، لہٰذا یہ دلیل کافی نہیں۔

خاتمۂ کلام

پچھلے صفحات میں ہم نے تمام روایات کی چھان بین کے بعد جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کالا خضاب ممنوع ہے، صحابہ و تابعین کی کثیر تعداد کا جو حوالہ دیا جاتا ہے کہ وہ استعمال کرتے تھے، صحیح نہیں۔

مجوزین نے جو دلیلیں پیش کی ہیں ان سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہوتا، اور احادیث نہی کی جو تاویلیں کرتے ہیں قابل قبول نہیں۔ ••

بقیہ: مسلمان، ماضی و حال کے آئینے میں

... جو دیندار اور اسلامی اخلاق سے مزین ہوں اور ہر فرد بشر خواہ وہ سرپرست ہو یا رعایا حسب طاقت مذکورہ کاز کے فروغ میں جد وجہد کرے اور حتی المقدور عقائد صحیحہ اور اخلاق فاضلہ کی تبلیغ و اشاعت میں سعی پیہم کرے کہ امت کا کوئی فرد صالح نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے ذمہ دار اور فرد اول میں صالحیت نہ ہو، اللہ تعالیٰ ہی راہ استقامت کی ہدایت دینے والا ہے۔ •••

فضیلتِ دعائے ختمِ قرآن کی حقیقت

بتحقیق، غازی عزیز، ص ب ۸۷۰۰ م، الخبر ۳۱۹۵۲، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ

عموماً دیکھا گیا ہے کہ پاک و ہند میں قرآن کریم کے ختم کی تقریبات بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہیں، خواہ وہ مدارس میں منعقد ہوں یا مساجد میں، جائے تقریب کو رنگ برنگے برقی قمقموں سے سجایا جاتا ہے، ان تقریبات میں شرکت کو باعث سعادت سمجھتے ہوئے لوگ زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہوتے ہیں، ختم قرآن کے بعد اجتماعی طور پر دعائیں مانگی جاتی ہیں، خاتم قرآن سے پانی بھری بوتلوں پر دم کروایا جاتا ہے، مساجد کے باہر محلہ بھر کی عورتیں اپنے کمسن بچوں کو گودوں میں اٹھائے شرکائے تقریب سے ان پر پھونکوانے کے لئے جمع ہوتی ہیں پھر تمام شرکاء کے درمیان خاتم قرآن کی دم شدہ شیرینی کی تقسیم کے ساتھ یہ تقریب اختتام کو پہونچتی ہے۔

اس امر میں یقیناً کوئی اختلاف نہیں کہ مکمل قرآن کریم کی صرف تلاوت کرنا بھی قاری کے لئے ایک بڑی سعادت، باعث فخر اور موجب خیر و برکت ہے، لیکن اس موقع کو ایک تقریب بنا کر لوگوں کا پرہجوم اجتماع نہ خود کوئی سعادت کی بات ہے اور نہ ہی ان مجالس میں اجتماعی طور پر مانگی گئی دعاؤں کی کوئی خاص تاثیر سنت مطہرہ سے ثابت ہے، پھر وہ کون سی منطق ہے جس کے تحت یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ خاتم قرآن جن پانی بھری بوتلوں پر پھونک مارتا ہے وہ محض اس کی ایک " چھو " سے " اکسیر " یا " تبرک " بن جاتی ہیں، یا اسی طرح تمام شرکائے تقریب کی ہر پھونک میں یہ خصوصی صفت پیدا ہو جاتی ہے کہ جس کے لئے مساجد یا مدارس کے باہر قطار در قطار بچوں کو گودوں میں اٹھائی خواتین منتظر نظر آتی ہیں، اکثر و بیشتر خاتم قرآن سے شیرینی کے خوانوں پر بھی پھونک مارنے کی استدعا کی جاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ حلوائی کی دوکان سے خریدی ہوئی وہ مٹھائی اس کی ایک پھونک سے " تبرک " بن جاتی ہے، اگر بغور دیکھا جائے تو ان تمام عجمی رسموں یا تصورات کی شرع میں کوئی اصل موجود نہیں ہے، اسے محض بعض شکم پرور مولویوں کی اختراع کہنا ہی درست ہوگا، ختم قرآن کے وقت دعا کے مقبول ہونے کی جس مشہور روایت سے مولویوں کا یہ طبقہ عموماً استدلال کرتا ہے وہ اس طرح ہے " عِنْدَ کُلِّ خَتْمَۃٍ لِلْقُرْآنِ دَعْوَۃٌ مُسْتَجَابَۃٌ "

اس روایت کو ابو الفرج اسفرائنیؒ نے "جزء أحادیث یغنم بن سالم"[1]، تب ابو نعیم اصبہانیؒ نے "حلیۃ الأولیاء"[2] میں اور ابن عساکرؒ نے "تہذیب تاریخ دمشق"[3] میں بطریق یحیی بن ہاشم قال حدثنا مسعر بن کدام عن قتادہ عن انس مرفوعاً بہ تخریج کیا ہے، اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اپنی مشہور کتاب "جامع الصغیر"[4] میں وارد کرکے گویا اس کی صحت کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لیکن اس روایت کے متعلق ابو نعیم اصبہانی فرماتے ہیں: "مجھے علم نہیں کہ یحیی بن ہاشم کے علاوہ اسے کوئی اور مسعر سے روایت کرتا ہو" علامہ ذہبیؒ نے اس حدیث کو "میزان الاعتدال"[5] میں، اور امام ابن حبانؒ نے کتاب "المجروحین"[6] میں یحیی بن ہاشم السمسار کے ترجمہ میں اس کی "بلایا" کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ علامہ مناوی نے بھی "جامع الصغیر" کی اپنی "شرح" میں علامہ سیوطیؒ پر تعقب کرتے ہوئے یحیی بن ہاشم کی سند میں موجودگی کی طرف نشاندہی فرمائی ہے۔

اس طریق کے مجروح راوی یحیی بن ہاشم السمسار کے متعلق علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں "ابن معین نے اس کی تکذیب فرمائی ہے۔ امام نسائی اور امام بیہقی اسے "متروک الحدیث" اور یحیی "اس امت کا دجال" بیان کرتے ہیں۔ ابن عدی کا قول ہے، "یحیی بن ہاشم بغداد میں تھا، حدیث گھڑتا اور ان کا سرقہ کرتا تھا" صالح الجزرۃ بیان کرتے ہیں: "میں نے یحیی بن ہاشم کو دیکھا ہے، وہ حدیث میں کذب بیانی کیا کرتا ہے" ابو علی الحفظؒ کا قول ہے "جھوٹ بولتا تھا" محمد بن عبدالرحیم فرماتے ہیں "حدیث گھڑتا تھا" امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں "اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی"، اور امام ابن حبان بیان فرماتے ہیں: "یہ ان لوگوں میں سے تھا جو ثقات کی طرف سے حدیث گھڑتے، اور اثبات کی طرف سے معضلات روایت کرتے ہیں، اس کی حدیث کا لکھنا جائز نہیں ہے إلّا یہ کہ اہل الصناعۃ کے لئے علی جہۃ التعجب ہو، اس سے کسی بھی حالت میں حدیث کی روایت جائز نہیں ہے" یحیی بن ہاشم کے تفصیلی ترجمہ کے لئے حاشیہ[7] میں مذکور کتب کا مطالعہ فرمائیں۔

سند روایت میں یحیی بن ہاشم السمسار کذاب کی موجودگی کے باعث یہ حدیث "موضوع" قرار پائی، علامہ شیخ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ نے اس روایت کو "سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ" میں "موضوع" بتایا ہے۔[8]

---

[1] جزء أحادیث یغنم بن سالم لابو الفرج الاسفرائینیؒ ج ۱ ص ۲۷، [2] حلیۃ الاولیاء لأبو نعیمؒ ج ۷ ص ۲۶۰، [3] تہذیب تاریخ دمشق لابن عساکرؒ ج ۵ ص ۲۹، [4] جامع الصغیر للسیوطیؒ ج ۱ ص ۹۵، [5] میزان الاعتدال للذہبیؒ ج ۴ ص ۴۱۲، [6] مجروحین لابن حبانؒ ج ۳ ص ۱۲۵، [7] کشف الحثیث عمن بوضع الحدیث للحلبیؒ ص ۴۶۱، قانون الضعفاء للفتنیؒ ص ۳۰۶، ضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج ۳ ص ۲۰۴، ضعفاء والمتروکون للنسائیؒ ترجمہ ص ۶۳۵، ضعفاء والمتروکون للدارقطنیؒ ترجمہ ص ۵۸۲، ضعفاء الکبیر للعقیلی ج ۲ ص ۴۳۲، کامل فی الضعفاء لابن عدی ج ۷ ص ۲۷۰، مجروحین لابن حبان ج ۳ ص ۱۲۵، جرح والتعدیل لابن حاتم ج ۴ ص ۱۹۵، میزان الاعتدال للذہبی ج ۴ ص ۴۱۲، تنزیہ الشریعۃ لابن عراق ج ۱ ص ۱۲۵، نصب الرایۃ للزیلعی ج ۴ ص ۷، سنن الکبری للبیہقی ج ۱ ص ۴۳، [8] سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ للالبانی ج ۳ ص ۳۶۹۔

اسی مضمون کی ایک دوسری حدیث بطریق ابورجاء محمد بن حمدویہ قال نا رتاد بن ابراہیم قال انا ابوعصمۃ قال نا یزید الرقاشی عن انس بن مالک مرفوعاً اس طرح مروی ہے: " ان لصاحب القرآن عند کل ختمۃ دعوۃ مستجابۃ وشجرۃ فی الجنۃ أو أن غراباً طار من أصلہا لم ینتہ إلی فروعہا حتی یدرکہ الہرم "

اس روایت کا ذکر خطیب بغدادیؒ نے اپنی " تاریخ "[9] میں، امام ابن الجوزی حنبلی بغدادیؒ نے اپنی کتاب " علل المتناھیۃ فی الأحادیث الواھیۃ"[10] کے باب " ما لخاتم القرآن عند کل ختمۃ " میں، اور امام ابن حبان نے اپنی کتاب " المجروحین "[11] میں اشارۃً کیا ہے۔ امام ابن الجوزیؒ فرماتے ہیں کہ: " اس حدیث کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنا صحیح نہیں ہے "

اس طریق کے مجروح راوی یزید بن ابان الرقاشی کے متعلق ابن المدینیؒ فرماتے ہیں " ضعیف تھا " امام بخاریؒ فرماتے ہیں " شعبہ اس کے بارے میں کلام کیا کرتے تھے " امام احمد فرماتے تھے " وہ منکر الحدیث تھا، اس کی کوئی حدیث لکھی نہیں جاتی " یحییٰؒ کا قول ہے " صالح شخص تھا لیکن اس کی حدیثیں کچھ بھی نہیں ہوتیں " دارقطنی نے " ضعیف " اور نسائی نے " متروک " بتایا ہے، ابن عدی کا قول ہے " اس کے اندر کوئی حرج نہیں ہے " ابن دورقی نے ابن معین سے روایت کی ہے کہ " اس کی حدیث میں ضعف ہوتا ہے " ابن حجر عسقلانی بیان کرتے ہیں " زاہد قصاص مگر ضعیف تھا " اور امام ابن حبان فرماتے ہیں " اللہ کے نیک بندوں میں سے تھا، رات کی تنہائیوں میں نوافل پڑھتا اور آہ وزاری کرتا تھا مگر حدیث کے حفظ وغیرہ میں غفلت برتتا تھا، یہاں تک کہ حسن کلام از خود بنالیتا اور اس کو نادانستہ طور پر عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم روایت کر دیتا تھا، جب اس کی روایت میں ثقات مثلاً حضرت انس وغیرہ کی طرف منسوب کردہ ایسی چیزوں کی کثرت ہوگئی جو اصلاً ان کی حدیثیں نہ تھیں، تو اس کے ساتھ احتجاج باطل ہوا، لہٰذا اس سے روایت کرنا جائز نہیں ہے سوائے اس کے کہ جو علی سبیل التعجب ہو " — تفصیلی ترجمہ کے لئے حاشیہ [12] میں مذکور کتب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

---

[9] تاریخ بغداد للخطیب ج ۹ ص ۲۹۰، [10] علل المتناھیۃ فی الاحادیث الواھیۃ لابن الجوزی ج ۱ ص ۱۰۷-۱۰۸، [11] مجروحین لابن حبان ج ۳ ص ۱۲۵،

[12] علل لابن حنبل ج ۳ ص ۲۶۷، میزان الاعتدال للذہبی ج ۴ ص ۴۱۸، تہذیب التہذیب لابن حجرؒ ج ۱۱ ص ۳۱۰، تقریب التہذیب لابن حجر ج ۲ ص ۳۶۱، معرفۃ والتاریخ للبسوی ج ۲ ص ۱۲۷-۱۴۴-۱۴۷، سؤالات محمد بن عثمان ص ۴۸، اللباب ج ۲ ص ۳۳، تاریخ الکبیر للبخاری ج ۴ ص ۳۲۰، تاریخ الصغیر للبخاری ج ۱ ص ۳۰۸، تاریخ یحییٰ بن معین ج ۴ ص ۲۹۷، ضعفاء والمتروکون للنسائی ترجمہ ص ۶۴۲، ضعفاء والمتروکون للدارقطنی ترجمہ ۵۹۳، کامل فی الضعفاء لابن عدی ج ۷ ص ۲۷۱۳، ضعفاء الکبیر للعقیلی ج ۴ ص ۳۷۳، ضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج ۳ ص ۲۰۶، قانون الضعفاء للفتنی ص ۳۰۹، مجروحین لابن حبان ج ۳ ص ۹۸، جرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج ۴ ص ۲۵۱، فتح الباری لابن حجر ج ۴ ص ۵۹ ج ۱۱ ص ۲۴۸ ج ۱۲ ص ۳۳۲، تحفۃ الاحوذی

اس حدیث کا دوسرا مجروح راوی "ابو عصمہ" ہے، جس کا اصل نام نوح بن یزید ابی مریم الجامع ہے، ابو عصمہ نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور ابن ابی لیلیٰؒ سے فقہ، حجاج بن ارطاۃ سے حدیث، کلبی و مقاتل سے تفسیر اور ابن اسحاق سے مغازی کے علوم حاصل کئے تھے مگر اس کے باوجود روایت حدیث کے معاملہ اس کا درجہ بہت پست ہے، امام احمد اور ابن حمادؒ فرماتے ہیں "منکرات روایت کرتا ہے"، یحییٰؒ کا قول ہے "کچھ بھی نہیں ہے، اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی" ابن حمادؒ، مسلم بن الحجاجؒ، رازیؒ اور دارقطنیؒ نے اسے "متروک" قرار دیا ہے، ابو عبداللہ حاکم بیان کرتے ہیں، "ابو عصمہ نے فضائل قرآن کے باب میں طویل حدیث گھڑی ہے" امام احمدؒ کا ایک اور قول ہے "لم یکن بذاک فی الحدیث وکان شدیدا علی الجہمیہ" ابن عدی فرماتے ہیں: "میں نے اس کی جو روایات وارد کی ہے عام طور پر ان کی متابعت نہیں ملتی، یہ وہ شخص ہے جس کے ضعف کے باوجود اس کی حدیث لکھی جاتی ہے" امام بخاریؒ نے اسے "منکر الحدیث" اور علامہ ابن عراق الکنانیؒ نے "کذاب وضاع" قرار دیا ہے، امام بخاریؒ بیان کرتے ہیں کہ ابن مبارکؒ وکیعؒ سے فرمایا: "ہمارے نزدیک ایک شیخ ابو عصمہ نوح بن ابی مریم ہے، وہ حدیث گھڑتا ہے جس طرح کہ معلی بن ہلال حدیث گھڑتا تھا" اور امام ابن حبان فرماتے ہیں: "یہ ان لوگوں میں ایک ہے جو اسانید از خود بنالیتے ہیں، اور ثقات کی طرف سے ایسی حدیثیں روایت کرتے ہیں جو اثبات کی حدیثوں میں سے نہیں ہوتیں، اس کے ساتھ کسی بھی حال میں احتجاج درست نہیں ہے، نوح بن یزید کے تفصیلی ترجمہ کے لئے حاشیہ ۱۳ میں مذکور کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔

ختم قرآن کے وقت کی دعاء کے متعلق یہ دوسری حدیث بھی سند میں ابو عصمہ کی موجودگی کے باعث "موضوع" ہے اس سلسلہ کی ایک تیسری حدیث حضرت عرباض بن ساریہ سے مرفوعاً یوں مروی ہے: "من صلی صلاۃ فریضۃ فلہ دعوۃ مستجابۃ ومن ختم القرآن فلہ دعوۃ مستجابۃ۔"

للمبارکفوری ج ۳ ص ۳۰۷، مجمع الزوائد للہیثمیؒ ج ۱ ص ۱۰۷، ۱۳۲ ج ۳ ص ۲۲۰، ۲۲۰ ج ۶ ص ۲۲۶ ج ۱۰ ص ۱۴۲ ج ۴ ص ۲۸۔

۱۳ علل لابن حنبلؒ ج ۱ ص ۲۲۰، میزان الاعتدال للذہبی ج ۴ ص ۲۷۹، جرح والتعدیل لابن ابی حاتمؒ ج ۴ / ۱ ص ۴۸۴، تاریخ الکبیر للبخاریؒ ج ۴ / ۲ ص ۱۲-۱۱، تہذیب التہذیب لابن حجرؒ ج ۱۰ ص ۴۸۷، ۴۸۸، تقریب التہذیب لابن حجرؒ ج ۲ ص ۳۰۹، تاریخ الصغیر للبخاریؒ ج ۲ ص ۱۷۹، ۲۳۰، ضعفاء والمتروکون للدارقطنی ترجمہ ۵۳۹، ضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج ۳ ص ۱۶۷، ضعفاء الکبیر للعقیلیؒ ج ۴ ص ۳۰۴، کامل فی الضعفاء لابن عدیؒ ج ۷ ص ۲۵۰۵، مجروحین لابن حبانؒ ج ۳ ص ۴۸، قانون الضعفاء للفتنیؒ ص ۳۰۱، سنن دارقطنیؒ ج ۲ ص ۱۳۲، نصب الرایہ للزیلعی ج ۱ ص ۱۵۴، ۲۱۳ ج ۳ ص ۱۵، موضوعات لابن الجوزیؒ ج ۱ ص ۱۴۱، ج ۲ ص ۶۰، ۶۷، ۲۹۲، ج ۳ ص ۳۵، ۴۰، ۲۲۸، تنزیہ الشریعہ لابن عراق ج ۱ ص ۱۲۲، مجمع الزوائد للہیثمیؒ ج ۲ ص ۹۵، ۱۲۴، ج ۱۰ ص ۱۹۳، تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری ج ۴ ص ۲۹۵۔

اس حدیث کو امام طبرانی نے روایت کیا ہے ، اس کے متعلق علامہ ہیثمیؒ مجمع الزوائد ومنبع الفوائد میں فرماتے ہیں ، "اس کی سند میں عبدالحمید بن سلیمان ہے جو کہ ضعیف راوی ہے"[۱۴]

عبدالحمید بن سلیمان الخزاعی الضریر جو فلیح کا بھائی ہے کے متعلق یحییٰؒ فرماتے ہیں "ثقہ نہیں ہے" ایک مرتبہ آپ نے فرمایا: "کچھ بھی نہیں ہے" آپ کا ایک اور قول ہے کہ : "اسکی حدیث نہیں لکھی جاتی" ، علی بن مدینی ، نسائی اور دارقطنی نے اسے "ضعیف الحدیث" اور ابوداؤدؒ نے "غیر ثقہ" قرار دیا ہے ، امام ابن حبان فرماتے ہیں" یہ ان لوگوں میں سے تھا جو خطا کرتے ہیں اور از خود اسانید بنالیتے ہیں ، جب اس کی مرویات میں ان چیزوں کی کثرت ہوئی تو اس کے ساتھ احتجاج باطل ہوا الخ" امام ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی اس کو "ضعیف" گردانا ہے ، عبدالحمید کے تفصیلی ترجمہ کے لئے حاشیہ [۱۵] کے تحت درج کتب کی طرف رجوع فرمائیں

نتیجۃً یہ حدیث بھی "ضعیف" اور ناقابل احتجاج قرار پائی ۔

جہاں تک دوسری تمام رسوم ختم قرآن کا تعلق ہے تو وہ سب کی سب غیر مسنون ، غیر ثابت بلکہ مخترع ہیں ، جیسا کہ مضمون کے اوائل میں بیان کیا جا چکا ہے ، اس بارے میں زیادہ سے زیادہ کوئی چیز ملتی ہے تو وہ مندرجہ ذیل ایک اثر ہے ۔

"عن ثابت أن أنس بن مالك	حضرت ثابت سے مروی ہے کہ حضرت انس بن مالک
كان اذا ختم القرآن جمع اهله	بوقت ختم قرآن اپنے اہل وعیال کو جمع کرتے
وولده فدعا لهم"	اور ان کے لئے دعا (ئے خیر) فرماتے ۔

اس اثر کو امام طبرانیؒ نے روایت کیا ہے ، اور بقول علامہ ہیثمیؒ "اس کے رجال ثقات ہیں"[۱۶] مگر اس اثر کو مروج رسوم ختم قرآن کے لئے کسی طرح بھی دلیل نہیں بنایا جا سکتا ہے ،

---

[۱۴] مجمع الزوائد للہیثمیؒ ج ۷ ص ۱۷۲ ۔

[۱۵] سوالات محمد بن عثمان ص ۱۱۱ ، تاریخ الکبیر للبخاری ج ۳ ص ۵۲ ، تاریخ یحییٰ بن معین ج ۳ ص ۱۶۰ ، معرفۃ والتاریخ للبسوی ج ۳ ص ۴۳ ، میزان الاعتدال للذہبی ج ۲ ص ۵۴۲ ، تہذیب التہذیب لابن حجرؒ ج ۶ ص ۱۱۶ ، تقریب التہذیب لابن حجرؒ ج ۱ ص ۴۶۸ ، جرح والتعدیل لابن ابی حاتمؒ ج ۳ ص ۱۴ ، ضعفاء الکبیر للعقیلیؒ ج ۳ ص ۴۶ ، ضعفاء والمتروکون للدارقطنیؒ ترجمہ ۳۵۱ ، ضعفاء والمتروکون للنسائیؒ ترجمہ ۳۹۷ ، کامل فی الضعفاء لابن عدیؒ ج ۵ ص ۱۹۵۶ ، ضعفاء والمتروکین لابن الجوزیؒ ج ۲ ص ۸۶ ، مجروحین لابن حبانؒ ج ۲ ص ۱۴۱ ، تحفۃ الاحوذی للمبارکفوریؒ ج ۲ ص ۱۶۹ ، مجمع الزوائد للہیثمیؒ ج ۱ ص ۱۵۵ ، ج ۴ ص ۴۹ ، ۔

[۱۶] مجمع الزوائد للہیثمیؒ ج ۷ ص ۱۷۲ ۔

شبانِ اہلِ حدیث کو خطاب

تبلیغِ دین میں کتاب و سنت کے عِلم کی اہمیت

علم وعمل کے مابین نسبت کو صحیح طور پر سمجھنے اور ہر ایک کو اس کے صحیح مقام پر رکھنے کے سلسلے میں اکثر لوگوں کو دھوکہ ہوتا ہے دعاۃ میں بھی ایسے افراد نظر آتے ہیں جو ان دونوں اوصاف کے مابین تلازم کو سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں، اس غلطی سے بچنے کے لئے صحیح بخاری کی کتاب العلم کے دسویں باب اور اس کی شرح پر غور وفکر مفید ہوگا۔

امام بخاریؒ نے مذکورہ باب کا عنوان رکھا ہے: "باب العلم قبل القول والعمل" یعنی کہنے اور کرنے سے پہلے جاننا ضروری ہے۔ اس کے لئے آیت کریمہ "فاعلم أنه لا اله الا الله" پیش کی ہے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ قول وعمل علم ہی سے معتبر ہو سکتا ہے، علم مقدم ہے۔ اس کے بعد عمل کا درجہ ہے۔ ابن منیرؒ کے حوالہ سے آگے لکھا ہے کہ جن لوگوں نے کہا ہے کہ: ان العلم لا ینفع الا بالعمل (یعنی علم عمل کے بغیر نفع بخش نہیں) ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ علم کی شان اور اس کے مرتبہ کو کم کیا جائے، اور اس کے حصول میں تساہل کی حوصلہ افزائی کی جائے، بلکہ وہ دونوں صفتوں میں تلازم کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں، اور علم کے بعد عمل کی ضرورت کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔

اسلام کے نام پر آج مختلف جماعتیں اور تنظیمیں ملک میں اور ملک کے باہر کام کر رہی ہیں، ان تنظیموں کا مزاج اور ان کے اغراض ومقاصد لوگوں کے سامنے ہیں، ان کی سرگرمیوں سے جو اثرات معاشرہ پر پڑ رہے ہیں، انہیں بھی ہم لوگ جانتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان تنظیموں کی روح ومزاج سے متعلق کچھ باتیں عام لوگوں کے ادراک وشعور سے باہر ہوتی ہیں۔ اسی لئے یہ لوگ ان تنظیموں کے تئیں نوجوانوں کے دلوں میں مختلف نوعیت کے موافق ومخالف رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں، اور اس طرح نوجوان طبقہ

ایک طرح کی نفسیاتی کش مکش ، شکوک و شبہات اور بے یقینی میں مبتلا ہوجاتا ہے ، اور اس کی نگاہیں ادھر ادھر اٹھنے لگتی ہیں۔

جس سے دعاۃ کے لئے علم و تجربہ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ، ہمیں جب تک دینی دعوت کے اصول و مقاصد کا صحیح علم نہ ہوگا ہم مذکورہ الجھن سے نجات نہیں پاسکتے ، ہماری دعوت کسی مخصوص ماحول کی پیداوار نہیں ، یہ قرن اول سے آج تک حالات کے مطابق اپنی ذمہ داری ادا کرتی آئی ہے ، مختلف ادوار میں مختلف طبقوں کی طرف سے اس کی مخالفت بھی ہوئی ، لیکن اس نے کسی بھی دور میں اپنے اصول سے تنازل نہیں کیا ، اور ہمیشہ مثبت طور پر لوگوں کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کی ، ہمارے نوجوان اگر دعوت عمل بالکتاب والسنۃ کی طویل تاریخ اور اس دعوت کے خادمین کی کارکردگی اور ان کو پیش آنے والی مخالفتوں اور آزمائشوں کا صحیح طور پر مطالعہ کرلیں تو انہیں پورے طور پر اطمینان اور اعتماد حاصل ہوجائے گا ، برصغیر ہی میں جب اس دعوت نے منظم طور پر کام شروع کیا تو اس پر طرح طرح کے اعتراضات کئے گئے ، سیاسی و دینی دونوں سطح پر دعوت کے حاملین کو مطعون کیا گیا ، انھیں قید و بند کی سزائیں دی گئیں ، املاک و جائدادیں ضبط کی گئیں ، خاندان کے خاندان تباہ و برباد کردیئے گئے ، پورا پورا محلہ مسمار کردیا گیا ، لیکن ان اللہ کے بندوں نے دعوت کے کسی بھی اصول یا مقصد سے دست برداری گوارا نہ کی ، ایسا نہیں تھا کہ انہیں اپنی جان و مال عزیز نہ ہو ، لیکن راہ حق کی پیروی کو انہوں نے ہر چیز پر ترجیح دی اور اس طرح صبر و استقامت اور شجاعت و عزیمت کی مثال دنیا کے سامنے پیش کی۔

آج بھی دعوتِ حق کے خلاف وہ تمام اعتراضات و الزامات کھلے یا دبے لفظوں میں دہرائے جاتے ہیں ، اور جماعت اہلحدیث کے افراد ان الزامات سے شکستہ خاطر و مایوس ہوتے ہیں ، اور بعض لوگوں کے اندر احساس کمتری پیدا ہوجاتا ہے اور دائیں بائیں نظریں اٹھانے لگتے ہیں ، لیکن یقین رکھئے اس بے اطمینانی و مایوسی سے بچنے کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ اس دعوت کی حقیقت و اہمیت کو سمجھیں اور اس کی خدمت کرنے والوں کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تاکہ آپ کو اس دعوت کی اور خود اپنی قیمت کا اندازہ ہوسکے۔

(بقلم : مقتدیٰ حسن ازہری)

جود وسخا اور ایثار وقربانی کی ضرورت واہمیت

اصغر علی امام مہدی السلفی
استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

قوموں کے عروج وزوال، ترقی وتنزلی، رفعت ونکبت اور عزت وذلت میں جود وسخا اور ایثار وقربانی، بخل وحرص کا خاص دخل رہا ہے۔ جو قوم ایثار وقربانی کی صفت سے متصف ہوتی ہے فتح وکامرانی اس کا مقدر ہوا کرتی ہے۔ اسی کے برخلاف بخیل اور بزدل قوم ہمیشہ شکست وہزیمت اور ذلت ونکبت سے دوچار ہوتی ہے۔ بلکہ انسانیت کے زمرے سے بہت دور ہوتی ہے۔ اخلاق ومروت جیسی خوبیوں سے عاری اور محروم ہوا کرتی ہے۔ اسی لیے اسلام جو دین فطرت ہے اپنے متبعین کو جود وسخا اور ایثار وقربانی کا درس دیتا ہے اور بخل وشح جیسی قبیح افعال سے منع کرتا ہے۔ قرآن مجید اور حدیث پاک میں ایثار وقربانی کی مدح وتعریف اور بخل کی مذمت بکثرت کی گئی ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو انسان کی انسانیت اسی میں ہے کہ وہ اپنے انسان بھائی کی مدد کرے، ضرورتمندوں کے کام آئے، حاجتمندوں کی حاجت برآری کرے، اور جو کچھ اس پر خرچ کرے احسان واذیت رسانی کے ذریعے اسے رائیگاں نہ کرے۔ بلکہ پورے اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے دائرے میں بذل وانفاق سے کام لے۔ انسان جتنا خرچ کرتا ہے رب کریم کی درگاہ سے اسے اتنا ہی زیادہ عطا کیا جاتا ہے۔

جو شخص بخل سے کام لیتا ہے تو پھر اسے معلوم ہونا چاہئے کہ حالات زندگی یکساں نہیں رہتے حالات بدلتے اور پلٹا کھاتے رہتے ہیں۔ اس دنیا کا کیا ٹھکانہ اگر یہ آج پیروں تلے مال ودولت اور خوشیاں نچھاور کر رہی ہے تو مغرور نہ ہونا چاہئے کہ کل یہی دنیا مصائب وآلام کے پہاڑ بھی توڑ سکتی ہے۔

جب دنیا کی بے ثباتی کا یہ عالم ہے اور آخرت میں انسان کو مال و اعمال کا حساب و کتاب چکانا ہے تو پھر اسلامی تعلیم یہ ہے کہ انسان جوہر ایثار و قربانی اور عطا و بخشش سے متصف ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اسلام نے فضائل و ترغیب سے بڑھکر انفاق مال فی سبیل اللہ کو فرض قرار دیا ہے۔ چنانچہ اسلام کے اہم ارکان خمسہ میں سے ایک اہم رکن زکوٰۃ ہے جو خالص مالی عبادت ہے۔ درحقیقت زکوٰۃ و خیرات اور صدقات کی تعلیم و ترغیب، بخل و حرص جیسے افعال قبیحہ کے استیصال کے لیے ہے۔ اور اسلیے بھی کہ بذل و انفاق کے ذریعے معاشرے میں اسلامی کاز کو فروغ دیا جا سکے، ایک دوسرے سے تعلق ہمدردی اور ربط و ضبط کا سلسلہ قائم رہے، آپسی میل جول اور محبت و الفت پروان چڑھے، انسانوں کے درمیان مال کی بنیاد پر اونچ دینچ کا جو بھید و بھاؤ ہے اور افراط زر اور فقر و فاقہ کے درمیان جو فاصلہ ہے وہ مٹ جائے۔ آپسی رسہ کشی، حسد و بغض اور کینہ و عداوت اور نفرت کی جو عظیم خلیج مال و دولت کی کثرت و قلت کی بنیاد پر حائل ہے اسے پاٹا جا سکے۔ فقراء و مساکین و معذورین کی دلجوئی اشک شوئی، حاجت براری اور قوام زندگی کا انتظام ہو۔ اور صاحب مال کیلئے انکے دل میں کسی قسم کی رنجش، بغض و عناد کے بجائے محبت اور ہمدردی ہو۔ اور خود دینے والے کا نفس فیاض و سخی بن جائے اور حرص و طمع اور بخل و شح جیسی قبیح صفات سے پاک ہو جائے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی و تعاون جیسے خصائل حمیدہ پروان چڑھیں۔ اور دوسروں کے درد و غم کو سمجھنے اور اس کے ازالے کا جذبہ پیدا ہو۔

دین اسلام چونکہ خاتم الادیان ہے وہ اپنے متبعین کو جسد واحد قرار دیتا ہے، ایک احساس، ایک ہی شعور و وجدان سب کا ہے۔ سب کی آرزوئیں، تمنائیں اور مقاصد ایک ہی ہیں، اور سب ایک ہی شعور و وجدان کے تحت جینے کے مکلف ہیں تو پھر اسلامی معاشرے میں مال و دولت اور فقر و فاقہ کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہونی چاہئے۔ اسلامی معاشرے میں موجودہ دور کے افراط و تفریط زر کی گنجائش اصلا نہیں ہے۔ بلکہ یہاں روزی روٹی کی تقسیم میں جو فرق نظر آتا ہے اس کی حکمت عیاں ہو جاتی ہے۔ اور اسکی افادیت دوچند۔

ان تمام حکمتوں اور فلسفوں کے ساتھ ساتھ یہ بات مسلم ہے کہ حق و باطل کے درمیان کشمکش قدیم اور فطری امر ہے۔ تو حق کی سرفرازی اور باطل کی سرکوبی کے لیے اہل حق کو ہمہ وقت اپنے جان و مال کی قربانی دینے کے لیے تیار رہنا چاہئے۔ تاکہ وہ اپنے قوی ترین عقیدہ و عمل کے ذریعے حق و صداقت کی روشنی پھیلاتے رہیں اور باطل کی تیرگی مٹا سکیں۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب اہل حق اپنے ایثار و قربانی اور جود و سخا کا فیض جاری رکھیں۔

تاکہ وہ تمام امور پایۂ تکمیل تک پہونچ جائیں جس سے اسلامی معاشرے کو امن و استقرار حاصل ہو جائے۔ دینی درسگاہیں علمی معاہد۔ ثقافتی ادارے قائم ہوں، علم کا دور دورہ ہو، صالح اور مستحکم معاشرہ وجود میں آئے۔ اور مسلمان اپنے معاشرے میں باعزت زندگی گذار سکے۔ اسلامی لشکر تیار ہو کہ وہ اپنے سرحدوں کی حفاظت کر سکے۔ اپنے دین وعقیدہ، مال وجاہ عزت وآبرو، وطن اور اپنے مقدسات کی دفاع کر سکے کہ

کوئی ملت جہاں میں سربلندی پا نہیں سکتی
نہ دے جب تک ثبوتِ جذبۂ ایثار و قربانی

یہ تمام امور فرد وجماعت کے لیے بسا اوقات فرائض و واجبات کے قبیل سے ہیں۔ اور عام حالات میں افراد کے لیے جود وسخا اور صدقات وخیرات نوافل اور تطوعات کے قبیل سے ہیں۔

مگر جہاں تک ایثار و قربانی کا تعلق ہے وہ ایک بہت بڑا درجۂ فضیلت ہے کیونکہ ایثار کہتے ہی ہیں خود باوجود سخت ضرورت مند ہونے کے دوسروں پر خرچ کرنا اور ان کو اپنے آپ پر ترجیح دینے کو (بذل الشئی للغیر مع حاجتہ الشدید الیہ) گویا صفت ایثار انسان کے اندر اپنی فضیلت وبرتری اور رفعت شان میں چوٹی سے تعبیر ہے جسکا شاندار نمونہ بے نظیر قدوہ اور بہترین اسوہ وہ مردان خدا تھے جس کے واسطے سے دور اول میں اسلام کی نشر واشاعت اور حق کا بول بالا ہوا شعائر واحکام دین کی بالادستی ہوئی۔ اور اسلام کا پرچم بلند ہوا جنہوں نے اپنے پاک لہو سے انسانی تاریخ کے سب سے بہترین اور قیمتی صفحات رقم کئے۔ کہ تاریخ عالم ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر وعاجز ہے۔ راہ خدا میں اپنی جانیں نچھاور کرتے ہوئے بھی، ان کا تأثر یہ تھا۔ کہ ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا — رضی اللہ عنہم

جہاں تک مال کا معاملہ ہے تو اس کا مصرف انکے یہاں اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انسان کی غمخواری اور اس سے ربط وتعلق اور اسکی حاجت براری کا ذریعہ اور اعلاء کلمۃ اللہ کا وسیلہ تھا جو رب کریم کی محبت اور اس کی رضا جوئی کا آئینہ دار تھا۔ یہ انصار ہیں جنکے یہاں ان کے مہاجرین بھائی بے سروسامانی کے عالم میں دنیا کی تمام نعمتوں پر اپنے دین وعقیدے کو ترجیح دیتے ہوئے مدینہ پہنچتے ہیں گھر بار کو ہمیشہ کے لیے ترک دیا ہے مال ودولت لٹا چکے ہیں۔ آل واولاد اور ماں باپ کی محبتیں اور شفقتیں رضاء الٰہی کے نذر کر چکے ہیں۔ سب کا سودا مکمل کر چکے ہیں۔ اور ایک مومن کی یہ بھی کوئی بیع وصفقہ

اس سے زیادہ کامیاب، سود مند، نفع بخش؟ ہرگز نہیں۔ پیارے نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صہیب رومی سے ان کے ایمان کے بدلے ہر چیز چھن جانے پر فرمایا تھا۔ اے صہیب! (افسوس کا زمانہ نہیں کہ) "یہ بیع بہت ہی سود مند اور باعث ربح و نفع ہے"۔ بلکہ اس صفقۂ مبارکہ کی تکمیل ہے جس کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:-

إن الله اشترى من المؤمنين أنفسهم وأموالهم بأن لهم الجنة ۔	اللہ تبارک و تعالیٰ نے جنت کے بدلے مومنین کی جان و مال کو خرید لیا ہے۔

کیا ہی عظیم مشتری ہے کتنے خوش نصیب بائع ہیں اور کیا ہی مبارک اور سود مند بیع ہے۔

ہاں تو انصار مدینہ اپنے مہاجرین بھائیوں کا استقبال عام انسانی وہم و خیال سے بڑھ کر کرتے ہیں، انسان جو کسی کی خیر مقدم کے لیے اچھا سے اچھا تصور کر سکتا ہے اس سے چند قدم آگے بڑھ کر ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اپنے مال و دولت زر و زمین میں اور گھر بار میں ان کو برابر کا شریک کر لیتے ہیں۔ یہ سعد بن ربیع ہیں جو اپنے مہاجر بھائی عبدالرحمان بن عوف سے فرماتے ہیں کہ میرے پاس دو چہیتی بیویاں ہیں ایک کو طلاق دیکر دست کش ہوتا ہوں، آپ ان سے عقد فرمالیں۔ مال بھی برابر برابر تقسیم کرتا ہوں اسے قبول فرمالیں۔ ان کا یہی ایثار و قربانی ہے جس سے میدان جنگ میں اپنے مسلمان بھائی کے بچاؤ کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈال دیتے ہیں، اور خود قطرہ قطرہ کا محتاج ہوتے ہوئے دوسروں کے لیے آب حیات نچھاور کر دیتے تھے درحقیقت ان کا ایثار و محبت ہے جس کی تعریف باری تعالیٰ نے یوں بیان فرمایا ہے:

" اور وہ لوگ جنہوں نے (ان مہاجرین کے) پہنچنے سے پہلے (مدینہ شریف میں) دارالایمان بنایا، جو لوگ ان کی طرف ہجرت کرکے آتے ہیں، وہ لوگ ان سے دلی محبت کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ان کو خدا کیطرف سے (مال اسباب) ملا ہے (بمقابلہ ضروریات مہاجرین کے) اپنے دلوں میں اس (مال) کی حاجت نہیں پاتے، اور ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ ان کو سخت حاجت ہو، اور جو لوگ اپنے نفس کے بخل سے بچ جائیں وہی لوگ نجات یاب ہونگے"۔

(سورۂ حشر آیت ۱۸، تفسیر ثنائی)

انصار کا یہ ایثار و قربانی باعث تعجب نہیں یہ تو ایمان قوی، اخلاص نیت اور عزم صادق اور صحیح اور کامل عقیدے کے مظاہر اور ثمرات ہیں۔ اور اہل ایمان کی زندگیاں جود و سخا اور ایثار و قربانی سے تعبیر ہیں۔ نہایت ہی تنگ دستی کا عالم ہے "جیش العسرۃ" کی تجہیز کا حکم نبوی صادر ہوتا ہے۔ قحط سالی کا سماں ہے، گرمی اپنی شباب پر ہے حضرت ابوبکرؓ اپنے تمام

کیا چھوڑا ہے؟ عرض کرتے ہیں کہ ان کے لیے اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ آیا ہوں۔

یہی قحط کی قہرسامانیاں ہیں اور غلے کے احتیاجات کا موسم ہے حضرت عثمان غنی کا تجارتی قافلہ وارد مدینہ ہوتا ہے۔ بازار کا بھاؤ بڑھا ہوا ہے۔ مال خریدنے والے تاجروں کی بھیڑ جمع ہے ہر شخص بڑھ چڑھ کر بولی بولنے اور سودہ کرنے پر تیار ہے۔ گاہک ایک سے بڑھکر ایک بولی بولتے ہیں۔ یہاں تک کہ نفع پانچ گنا ہو جاتا ہے۔ آپؓ تاجروں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں۔ کہ مجھے پانچ گنا سے بھی زیادہ نفع مل رہا ہے۔ پھر اسی سے سودہ کیوں نہ کروں؟ مدینے کے تمام موجود تجار بیک زبان کہتے ہیں کہ ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں۔ پھر حضرت عثمان غنی کی آواز بلند ہوتی ہے کہ نہیں سودہ کسی اور سے ہو چکا ہے میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے یہ تمام مال "جیش العسرۃ" کے لیے راہ خدا میں تبرع اور صدقہ کر دیا ہے۔ اور اس سے بڑھکر کون دے سکتا ہے کہ (من جاء بالحسنۃ فلہ عشرۃ امثالہا)۔

یہ ایثار و قربانی اور بے مثال فیاضی اس مرد غنی کی زندگی کا اول اور آخر کارنامہ نہیں ہے بلکہ اس کی زندگی ایسی قربانیوں سے معمور و لبریز ہے۔ اور یہی نہیں کہ تاریخ اسلام میں یہی چند مثالیں ہیں بلکہ تاریخ اسلامی ایسے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔

ایثار و قربانی اور جود و سخا وہ صفات حمیدہ ہیں جو معاشرہ، ملک اور وطن کو امن و استقرار کا گہوارہ بنادیتے ہیں۔ نفس انسانی کا تزکیہ و تطہیر کر کے بخل و حرص اور حقد و حسد اور خیانت و رشوت اور چوری و رہزنی جیسے واردات اور افعال قبیحہ سے پاک کر دیتے ہیں۔

اسلام اپنے ماننے والوں سے جن فضائل و محاسن کا طالب ہے، اور جن خوبیوں اور اخلاق و کردار کا متمنی ہے وہ دراصل وعدۂ ربانی کی تکمیل کا ذریعہ اور وسیلہ ہے۔ ان تنصروا اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم

چنانچہ جب صحابۂ کرام اور خیر القرون و ما بعد کے مسلمان ان خوبیوں اور خصائل حمیدہ سے مسلح ہو کر نکلے تو بڑی بڑی سلطنتیں ان کے زیر نگیں آگئیں۔ اور دنیا کے زبردست طاغوتی قومیں زیر فرمان ہو گئیں۔ باطل کے بڑے بڑے ٹڈی دل لشکر ہزیمت اور شکست و ریخت سے دوچار ہوئے۔ اور اسطرح ان نفوس قدسیہ نے اپنی ایمانی قوت و غیرت اور ایثار و قربانی کے ذریعے چار دانگ عالم میں حق و انصاف کو عام کر دیا۔ بڑے بڑے جابر دشمن ڈرنے اور دہلنے لگے۔

ع لوٹ پیچھے کیطرف اے گردش ایام تو

لیکن جب بھی اسلام کا نام لینے والی عظیم بھیڑ جب ایثار و قربانی کے جذبے سے ایمانی غیرت سے

شبکدوس اور عدل وانصاف کے راستوں سے دور ہوگئی۔ اختلاف ونفاق کا شکار ہوکر ٹولیوں میں بٹ گئی۔
اور ایک دوسرے کو نگل جانے کی روش اختیار کی تو پھر ذلت سے دوچار ہوئی۔ دشمن ان کی طرف للچائی نظروں
سے دیکھنے لگا اور انکے مقدسات اور اوطان اور اموال پر ٹوٹ پڑا۔ ان پر اپنا گھیرا تنگ کر دیا اور ہر چہار جانب
سے انھیں نوچ کھانے کے لیے نت نئی تدبیریں نکالنے لگا۔ مسلمان یاس وقنوط کے شکار ہوگئے۔ رحمت خداوندی اور
نصرت باری ان سے روٹھ گئی۔ اے کاش کہ مسلمان اپنی حالت پر غور کرتا اور اسکے اندر انقلاب لاتا۔

ان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمہا علیٰ قوم حتی یغیروا ما بانفسہم ۔

قارئینِ محدث کی خدمت میں

ماہنامہ محدث ہر ماہ پابندی سے آپ کے نام ارسال کیا جاتا ہے۔ اسلئے آپ سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اگر آپ کے ذمہ ماہنامہ خریداری کی رقم باقی ہے تو براہ کرم پہلی فرصت میں بھیجنے کی زحمت فرمائیں۔

ادارہ

مسلمان ۔ ماضی وحال کے آئینے میں

تحریر :۔ شیخ محمد علی عبدالرحیم — ترجمہ : امتیاز احمد سلفی

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اسلام کی روشنی سے منور فرمایا، چنانچہ وہ ایمان کی شیرینی سے لذت اندوز ہوئے، درحقیقت یہی اللہ تعالیٰ کے ولی ہیں ۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (احقاف : ۱۳)

جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار خدا ہے، پھر وہ اس پر قائم رہے تو ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے ۔

ان کے عقیدے پاکیزہ، اعمال نیک اور اخلاق عمدہ تھے ۔ انھوں نے ایمان کی صحت اور حسن سلوک سے استقامت کو حاصل کیا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، خود بھی مشکلات میں صبر کیا اور دوسروں کو بھی صبر کی تلقین کی ۔ انھیں نہ کمزوری لاحق ہوئی نہ ہی مغلوب ہوئے اور نہ ہی ذلیل وخوار ہوئے بلکہ صبر وثبات قدمی پر ڈٹے رہے ۔ اپنے دشمنوں کا مقابلہ شہادت کے جذبہ سے سرشار ہوکر انتہائی بے باکی اور دلیری سے کیا اور عوام الناس پر سربلند وفائق رہے ۔ ارشاد باری ہے :

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ ۔ (عنکبوت : ۶۹)

جن لوگوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہم ان کو ضرور اپنے رستے دکھادیں گے اور خدا تو نیکوکاروں کے ساتھ ہے ۔

ان کے نزدیک کوئی خود ساختہ اصول وضابطہ نہیں تھا، جو شریعت الٰہی سے مزاحم ہوتا بلکہ قرآن پاک ہی ان کی اصل شریعت تھی، اسی کی حلال وحرام کردہ چیز کو حلال وحرام سمجھے ۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا قانون وشریعت نہیں تھی جس سے وہ استعانت چاہتے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حق وانصاف کا علم بلند ہوا اور خویش واقارب ونسبی تعلق سے بالا ہوکر

تمام لوگ ان کے زیرنگیں رہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (حجرات: ۱۳)

اورخدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

اگر کسی معاملہ میں نزاع بھی ہوتی تو کتاب وسنت کو وہ سرچشمہ تسلیم کرتے تاکہ اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی نہ ہو۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (نساء: ۶۵)

تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کردو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

اور یہ فرمان:-

فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ (نساء: ۵۹)

اور کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو

ان بزرگوں نے ہوا پرستی اور بدعت کو راہ نہیں دی ان کا دین ہر قسم کی بدعتی آلودگی سے پاک وصاف تھا۔ عقائد ہوں یا عبادات وسلوک، سب کچھ اسلام کے صافی چشمے سے منسلک تھا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بابت ایک سائل نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا تو آپ نے اس سے کہا، کیا تم قرآن کی تلاوت نہیں کرتے؟ رسول پاک کا اخلاق سراپا قرآن تھا۔ کان خلقہ القرآن (مسند احمد)

اللہ تعالیٰ نے جو دین متین مسلمانوں کو عطا فرمایا، اسے انھوں نے مضبوطی سے تھامے رکھا اور اللہ سے ان کی محبت سچی اور خالص تھی۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ (بقرہ: ۱۶۵)

لیکن جو ایمان والے ہیں وہ تو خدا ہی کے سب سے زیادہ دوست دار ہیں۔

یہی محبت ان کی توحید اور تقویٰ میں بھی کارفرما تھی اور یہی جذبہ آنحضرت ؐ کے تمام امور و معاملات کی اقتدا میں کام کر رہا تھا۔

انہیں خوبیوں کی وجہ سے اس وقت کے اسلامی معاشرے میں اسلام کی روح جاگزیں تھی اور ان کی زندگی کا ربط دین و دنیا ہر ایک سے منسلک تھا۔ حدیث شریف میں وارد ہے

المومن القوی خیر من المؤمن الضعیف وفی کل خیر (مسلم، ابن ماجہ)

طاقتور مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر معاملہ میں کمزور مومن سے بہتر ہے۔

شب کو وہ لوگ دنیا سے قطع تعلق ہو کر یادِ الٰہی میں مشغول ہوتے، دن میں میدانِ کارزار کے سپاہی رہتے۔ نیکی اور خیر کے کاموں میں باہم متعاون ہوتے، بڑا چھوٹوں پر رحیم ہوتا، مالدار فقیروں پر مہربان ہوتا۔ تمام اوقات مسجدیں نمازیوں سے آباد رہتیں، بھلائیاں ان میں کامل طور پر موجود تھیں، برائیاں قریب نہیں پھٹکتی تھیں۔ اپنے نفس سے برسرِ پیکار رہے اور محاسن کا اسے عادی بنایا اور متعدد اسباب ذیل کی وجہ سے سراپا پیکر شرم وحیا تھے۔

۱۔ فرمانِ الٰہی کی بجا آوری، اس کی وعید وتہدید سے باز رہتے، ظاہری و باطنی اعضاء کی حفاظت، مصیبت اور موت کی یاد۔

۲۔ ایذا رسانی سے دور رہتے اور برملا دین کی مخالفت سے اجتناب کرتے۔

۳۔ اللہ سے، اپنے آپ سے اور لوگوں سے شرم کرتے۔

ان بنیادوں پر وہ اصحابِ فضل کے نام سے معروف ہوئے اور اخلاقِ کریمہ کے ذریعہ ان کا ذکرِ خیر ہوتا، ان کی مسجدیں قبر پرستی سے پاک تھیں اور اس پاک سرزمین میں ہر وہ چیز حرام سمجھی جاتی جس کو رسولِ خدا نے حرام قرار دیا تھا، اور کسی قبر وغیرہ کی تعمیر نہیں ہوئی تاکہ مسجد کی جگہ سے وحدانیت کی اشاعت اور شرک و بت پرستی کا ازالہ ہو۔

ان کے بعد ایسے اخلاف پیدا ہوئے، جنھوں نے نماز ترک کر دی، خواہشات کے تابع رہے، قریب ہے کہ یہ لوگ ہلاک و گمراہ ہو جائیں، اور خطرات سے دوچار ہوں، ان کے ذریعہ محرمات کی بے حرمتی ہوئی اور محاسن معدوم ہو گئے۔

نوجوانوں کی نشو ونما غیر اسلامی طور پر ہوئی اور موجودہ ذرائع ابلاغ، ویڈیو، ٹیلی ویژن کی برائیاں بے حیائیاں ناچ گانے اور عریاں تصویروں نے معاشرے میں برائیاں پھیلا رکھیں اور پورا سماج برائیوں کا گہوارہ بن گیا ہے۔ خصوصاً ان ممالک میں جہاں زن و شو کے مابین مساوات قائم کی گئی، ان کے باہم اختلاط نے نت نئی خرابیوں کو جنم دیا اور ہر میدان میں عورتوں کو مردوں کے بالمقابل لا کھڑا کیا۔ درحقیقت شیطان نے ان کو اس قسم کے اختلاط پر برانگیختہ کیا اور یہی آئینی تہذیب بن گئی۔

اس اختلاط سے عورتوں کا معاملہ شدت اختیار کر گیا، بے پردہ اور عریاں، جاذب نظر شکل وشباہت اپنا کر برسرعام پارکوں، بازاروں کی زینت بے رہنا اور کھلے بندوں محرمات کا مذاق اڑاتے پھرنا، حتیٰ کہ نوجوان طبقہ دین سے بیزار ہوگیا، اور اسلامی حمیت کو کھو بیٹھا اور اس فلسفہ میں مبتلا ہوکر گمراہ وبے دین ہوگیا۔ اور محاسن و خوبیاں برائیوں کے اڈوں میں مدفون ہونا شروع ہوگئیں۔ جہاں نہ کوئی نصیحت کرنے والا ہے اور نہ کوئی سخت گیر ہے جو ان غلط کاروں کو منع کرے۔

غور طلب امر یہ ہے کہ اس الحاد و دہریت کے کیا اسباب ہیں جو اکثر اسلامی ممالک میں اپنا جال پھیلائے ہوئے ہے۔ اور مسلمان اس سے دوچار ہیں۔

ان کے اسباب یہ ہیں کہ ہم نے نیکی اور حق بات کی تذکیر ترک کردی اور معروف و منکر کے فریضۂ تبلیغ سے سبکدوش ہوگئے، دینی تعلیم سے غفلت، اور گھر اسلامی تربیت سے خالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تربیت پانے والی نسل سوائے اپنے نام کے دین واسلام سے ناواقف ہے۔ صوم وصلوٰۃ کی کوئی پرواہ نہیں، نہ ہی اسلامی اخلاق سے کوئی واسطہ، لطف یہ ہے کہ ملحدوں کی تائید میں اس قسم کے کاموں کو حریت پسندی کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

آج پورے سوادِ اعظم میں مسلمانوں کا یہی حال ہے، خصوصاً ان لوگوں کا جنھیں اللہ تعالیٰ نے مال واسباب سے نوازا ہے، وہ اپنے مال کو خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل وآسودگی میں خرچ کرتے ہیں، جس کا انجام یہ ہوا کہ اکثر وبیشتر نئی نسل بداخلاق، بدخو ہوگئی اور مطمحِ نظر فلم بینی، گانے، ڈرامے جیسی فاسد الاخلاق چیزوں میں مصروف کار ہوگیا۔ تاآنکہ ان خرابیوں نے انھیں فتنوں کے اڈوں پر لاکھڑا کیا اور ان کاموں میں اتنی مصروفیت بڑھی کہ ان کی معیشت بھی متاثر ہوئی، اور فقر وتنگدستی نے آدبوچا۔

آج مسلمان اکثر ملکوں میں برسرعام ٹیلی ویژن، ویڈیو کی فتنہ پردازی کا جو مشاہدہ کر رہے ہیں، اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ بھلائی کے کاموں سے دور ہوگئے، بلکہ برائی کا بیج لوگوں نے لگایا تاکہ جدید نسل اس فتنہ پرور ماحول میں نشوونما پائے اور گانے ڈرامے کا رول پیش کرنے والی تصویروں کو دیکھ کر مزید فتنہ کا سامان مہیا کرے۔

موجودہ دور میں مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا ہتھیار دینِ مبین، شریعتِ الٰہی اور قرآن پاک ہے۔ ہم کبھی لوگوں کو خواہ حاکم ہوں یا محکوم، اسلام کی نشرواشاعت میں کدوکاوش کرنی چاہیے اور آدابِ محمدیہ کو اپنائیں تاکہ محاسن کے ستون مضبوط ہوں اور اخلاقِ فاسدہ کی عمارت منہدم ہو اور ذرائع ابلاغ کے کاموں میں ایسے افراد کی تعیین ہو؛

باقی صفحہ ۲۴۲ پر

مضرتیں منشیات کی

عبدالسمیع محمد ہارون انصاری

منشیات کا بڑھتا نشہ بلاشبہ آج کا ایک سنگین ترین مسئلہ ہے جو کم وبیش مشرق سے لے کر مغرب تک کے تمام ملکوں میں زور پکڑتا جا رہا ہے ، اس نازک مسئلے کے حل کے لئے اور اس پیچیدہ سمسیا کے سمادھان کے واسطے ملکی ، قومی اور بین الاقوامی طور پر مختلف تدبیریں اور کوششیں کی جارہی ہیں مگر بقول میر تقی میر ؎ الٹی ہوگئی سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا ۔

منشیات کا سیلاب ہے جو امنڈتا ہی جارہا ہے اور مرض ہے کہ بڑھتا جارہا ہے ، حالانکہ منشیات کی مضرتیں اور نقصانات تجربات اور مشاہدات کے ذریعہ عوام کو بتلائی جاتی ہیں مگر اس کا بھی کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ، لہذا اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر بنیادی کون سی وجہ ہے کہ جس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اتنی تدابیر کی جاتی ہیں پھر بھی اس کا مثبت اور مفید اثر مرتب نہیں ہوتا ہے ، اس کی ایک بنیادی وجہ ۔ منجملہ دیگر وجوہات کے ۔ یہ ہے کہ یہ دور جس میں ہم اور آپ سانس لے رہے ہیں ، بدامنی ، اضطراب اور جرائم و روحانی سکون واطمینان سے عاری دور ہے ۔ اور منشیات ان چیزوں کا بہترین مصاحب ہے ۔

آج ایک آدمی جن کے پاس دنیا کی تمام تر مادی سہولتیں اور آسائشیں مہیا ہیں ، مگر جب وہ دن بھر کی تھکان کے بعد جب گھر واپس لوٹتا ہے تو اضطراب اور روحانی سکون سے خالی اپنے آپ کو محسوس کرتا ہے ، اس لئے غم غلط کرنے اور دن بھر کی تھکاوٹ کو بھلا دینے کے لئے شاید ان کے پاس منشیات ہی دوا ہوتا ہے ، اس کے علاوہ جرائم جو آج کی گھٹی میں شاید ہے اس نے منشیات کو اور منشیات نے جرائم کو فروغ دینے میں اہم کردار کیا ہے ، بنابریں تمام تر کوششوں کے باوجود منشیات کا جادو سر چڑھ کر بول رہا اور تمام تر تدابیر کے باوجود منشیات کا نشہ ہے کہ روز افزوں رو بہ ارتقاء ہے ۔

منشیات کی کتنی مضرتیں ہیں وہ اب ایک عام حقیقت بن چکی ہے تاہم ان کی چند مضرتوں پر سرسری طور پر نشاندہی کررہا ہوں ، منشیات سے متعلق کسی نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے اور خوب کہا ہے کہ جب ہم منشیات کا استعمال کرتے ہیں تو جسم میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے ، مگر یہ خوشی خطرے کا پیش خیمہ ہوتی ہے ، جیسے جب چور بہت سامان چرالیتا ہے تو اسے ذہنی سکون ضرور حاصل ہوتا ہے مگر چوری کا انجام کتنا برا ہے

کتنا خطرناک ہے ہم سب جانتے ہیں، منشیات کی عادت ایک بہت بری عادت ہے" بالکل چور کی طرح"، اب آپ اس مثال اور اقتباس سے حد تک موازنہ کر کے منشیات کی مضرتوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

منشیات مختلف اقسام کے ہیں مثلاً تمباکو، بھانگ، چرس، ہیروئن وغیرہ وغیرہ اور ان میں سے ہر ایک ایک سے بڑھ کر ایک مضرت رساں ہے، مثلاً تمباکو میں ایسے ایسڈ اور زہر پائے جاتے ہیں جن کا ایک قطرہ بھی انسان کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے، چند سال پیشتر امریکہ میں ایک سائنسداں نے جانوروں پر تمباکو کا اثر معلوم کرنے کے لئے تجربہ کیا اس نے ایک چھٹانک تمباکو ابالا اور کتے کو اس کا ٹیکہ لگایا، کتا چند منٹ تک ہوش میں رہا پھر مر گیا، اسی طرح مشہور ہے کہ قدیم زمانے میں چین میں یہ دستور تھا کہ جس چینی کو دوسرے سے انتقام لینا ہوتا تھا وہ اسے پکڑ کر تمباکو کا پتہ اس کی چھاتی پر مل دیتا اس سے اس کی موت واقع ہو جاتی تھی، ایک سال قبل کی بات ہے روزنامہ قومی تنظیم (پٹنہ) کے حوالے سے مجھے مغربی ملک کی ایک عبرت آموز خبر پڑھنے کو ملا ایک بچی کو صرف اس لئے کینسر ہو گیا اور پھر وہ مر گئی کیونکہ وہ اپنے باپ کے ہمراہ ہر وقت رہا کرتی تھی اور اس کا باپ بہت سگریٹ نوشی کیا کرتا، گویا صرف اس لڑکی کی ہلاکت کا باعث یہ ہوا کہ اس کا اپنے ابا کے ہمراہ رہنے سے سگریٹ کے دھوئیں ان کی سانسوں کے راہ سے پھیپھڑوں اور دل میں داخل ہو جایا کرتے اور پھر نتیجے میں وہ کینسر اور پھر موت کی شکار ہو گئی، تو یہ اس کا انجام ہوا، اب بھلا بتایئے جو سگریٹ پیتا ہوگا اس کا انجام کتنا اور کس قدر خطرناک ہوگا۔

منشیات کی یہ سرسری بیان کردہ مضرتیں ہیں جو صرف واقعات و تجربات پر مبنی ہیں ورنہ ان کے نقصانات ان سے بھی بہت زیادہ ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کی روک تھام کے لئے ناکامیوں کے باوجود مختلف ممالک کے لوگ اور حکام ہمیشہ تدابیر اور کوششیں کرتے رہتے ہیں، مثلاً افریقی ممالک میں منشیات کے نقصانات کو عام کرنے کے لئے ڈاک ٹکٹ پر نقصانات سے متعلقہ تصویروں والے اشتہارات چھاپے جاتے ہیں اٹلی کے ڈاک ٹکٹ پر دل اور پھیپھڑے کی تصویر کے وسط میں جلتی سگریٹ رکھ کر لوگوں کو اس سے بچنے کا پیغام دیا گیا ہے، اسرائیل کے ڈاک ٹکٹوں پر بھی منشیات مخالف نعرہ لکھا ہوتا ہے۔ اور خود ہمارے ملک ہندوستان میں سگریٹ کے ڈبوں پر لکھا ہوتا ہے۔

Cigaratte Smoking is injurious To Health

(یعنی سگریٹ نوشی صحت کے لئے مضر ہے)

مقدرسہ انوار العلوم املو کا

تقدس حرمین اور خلیجی بحران

پر ایک اجتماع عام

آج مورخہ ۱۰ شعبان ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۶ فروری ۱۹۹۱ء بروز منگل مدرسہ انوار العلوم املو (مبارکپور) کے زیر اہتمام مولانا عبدالرحمان مبارکپوری حفظہ اللہ کی صدارت میں ایک عام اجتماع منعقد ہوا، صبح سے باد و باراں کا سلسلہ رہنے کی وجہ جلسہ گاہ کے بجائے جامع مسجد اہلحدیث املو میں اجلاس منعقد کیا گیا (اللہ تعالیٰ ہی اپنے مصالح سے واقف ہے) پھر بھی حاضرین کی تعداد اچھی خاصی رہی ۔

جلسہ عشار کی نماز کے بعد شروع ہو کر پونے ایک بجے رات تک چلتا رہا اور حاضرین نے کامل اطمینان اور مستعدی سے مقررین کی تقاریر سنیں۔

تلاوت کلام پاک مدرسہ انوار العلوم کے ایک طالبعلم نے کی، مولانا قرۃ العین صاحب مبارکپوری نے تعارفی تقریر میں جلسہ کی غرض وغایت اور اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مہمان مقررین کا تعارف کرایا۔

سب سے پہلے مولانا عبدالرحمن مبارکپوری نے اپنی صدارتی تقریر میں مختصراً خلیجی فتنہ کے اسباب پر روشنی ڈالی۔

اس کے بعد مولانا عبدالوہاب حجازی استاذ جامعہ سلفیہ بنارس نے فکر انگیز خطاب فرمایا، موصوف نے اس خاص حادثۂ فاجعہ سے عبرت وموعظت کے پہلو کو اجاگر کر کے بتایا کہ اسطرح کے حادثات سے ہم کس طرح استفادہ کر سکتے ہیں. اور ہر آدمی کس طرح سے ان امور سے اپنی سیرت کی تعمیر میں مدد لے سکتا ہے۔

نیز آپ نے اس جنگ سے پیدا ہونے والی تباہیوں اور اس کے اسباب پر تفصیلی روشنی ڈالی، اور کتاب و سنت کی روشنی میں یہ واضح کیا کہ اس وقت ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ ہم اپنی ہمہ جہتی اصلاح کریں، عقائد سے لیکر اخلاق و معاملات

تک میں امت جس پستی و زبوں حالی کا شکار ہے یہ جنگ اور اس طرح کا بحران ایک تازیانۂ عبرت ہے، اگر ہم نے اس پہلو سے ان حادثات سے فائدہ اٹھایا، اور صبر و تحمل کے دامن کو پکڑے رکھا تو یقیناً یہ چیز ہمارے لیے دنیا و آخرت دونوں جگہ سعادت و کامرانی کا ذریعہ ہوگی، ان شاء اللہ العزیز۔

دوسرے مہمان مقرر جناب ڈاکٹر عبد الرحمن عبد الجبار الفریوائی استاذ جامعہ سلفیہ نے اپنے پر مغز اور مدلل خطاب میں نجدی وہابی تحریک اور ہندوستان کی تحریک شہیدین اور تحریک اہلحدیث کی نشو و نما کے وقت سے اب تک ان حقیقی اسلامی تحریکوں کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کا تاریخی جائزہ لیکر ان اسباب و عوامل سے پردہ اٹھایا جو ان دونوں صدیوں میں برابر فتنوں اور مصائب کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔

موصوف نے بتایا کہ زار روس (جو کہ عیسائی تھے) کی صدیوں سے یہ کوشش تھی کہ کسطرح عالم اسلام میں نقب لگائی جائے، لیکن ان کو یہ موقع نہیں مل سکا ـــ لیکن جب ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب رونما ہوا اور ۲۷ اسلامی ریاستوں پر قبضہ۔ اور وہاں کے کروڑوں مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دینے کے بعد عالم اسلام پر یلغار کا سلسلہ شروع ہوا۔ تو ترکی اور افغانستان میں کامیابی کے بعد جمال عبد الناصر کے عہد سے مصر پھر دمشق و عراق، اردن اور فلسطین، یمن، لیبیا الجزائر، مغرب اور تونس وغیرہ میں کمیونزم کے ہرکاروں نے پرفریب نعروں، جوڑتوڑ۔ اور سیاست کے بعد الحاد کی تخم ریزی کر لی تو پورا مسلم علاقہ مصائب اور ابتلاآت کی آماجگاہ بن گیا، اور اہل اسلام پر زمین تنگ کر دی گئی، مصر سے لیکر عراق تک (جو بعث پارٹی کی قیادت میں ہے) مختلف سنہرے نعروں کے ذریعہ جو آواز بلند کی گئی، دراصل وہ اسلامیت و عربیت کے ہر نشان کو ختم کر کے الحاد و زندقہ کی سیادت و حکمرانی کا دوسرا نام تھا۔

موصوف نے کہا کہ مذہبیت اور لامذہبیت کی اس ہمہ گیر لڑائی میں ان شاء اللہ یہ آخری لڑائی ہوگی جس میں کمیونزم و اشتراکیت پارہ پارہ ہو گئی ہے، اب آئندہ اسلام اور یہودیت و نصرانیت کے مابین معرکہ آرائی ہوگی۔

اور چونکہ وہابی تحریک کو اہل باطل زیادہ طور پر سمجھتے ہیں اسلیے کویت اور سعودیہ کے خلاف مسلح کاروائی کا مقصد یہ تھا کہ اس ابھرتی ہوئی اسلامی طاقت کو اس کے گہوارہ ہی میں زندہ درگور کر دیا جائے تاکہ

" نہ رہے بانس نہ بجے بانسری "

اسلیے کہ ساری دنیا میں جہاں بھی اسلامی تحریکیں کام کر رہی ہیں، اور جہاں بھی جہاد کی تحریکیں چل رہی ہیں،

جہاں ہی اسلامی تعلیم و ثقافت اور عربی زبان کی نشر و اشاعت کا کام ہو رہا ہے سب کے پیچھے سعودی عرب کی حکومت، وہاں کے علماء اور عوام اور ان کے حامیوں کی شرکت و مساہمت نمایاں ہے افغانستان اریٹیریا (حبشہ) اور فلپائن وغیرہ کی جہادی تحریکیں ان کی زندہ مثالیں ہیں۔ نیز فلسطینی کاز کو ۱۹۴۸ء سے اب تک تقویت دینے والا یہی گروہ ہے۔

آخر میں موصوف نے جماعت اہلحدیث اور علماء اہل حدیث کے واضح موقف اور اسلامیان عرب و عجم کی تائید کی توجیہ کرتے ہوئے بتایا کہ احقاق حق کے لیے ہم یہ حمایت کر رہے ہیں، ورنہ ہمیں یہ خوب معلوم ہے کہ سلفی تحریکوں کے ساتھ دنیا میں کیا کیا سلوک کیا جا رہا ہے۔

موصوف نے یہ بھی واضح کیا کہ آج بعض اسلامی تحریکیں جو خلیجی تعاون کے بل پر اندر اور باہر اپنی بساط جمائے ہوئی تھیں۔ ایران عراق جنگ میں اپنے فاسد عقائد و نظریات کی بنا پر شیعوں اور رافضیوں کی تائید کر رہی تھیں، اور اب دوسری مرتبہ صدام کی حمایت پر کمربستہ ہیں، اس سے انھوں نے اپنی ایمانی قوت، مومنانہ فراست، سیاسی بصیرت، جذبۂ احسان سب کا پول کھول دیا ہے۔ سچ ہے جنگ اور آزمائشیں کھرے کھوٹے کے امتیاز کیلئے ہوتی ہیں، رہ گئے اہلحدیث تو انھوں نے شاہ عبدالعزیز آل سعود کی اوائل صدی ۱۹۲۶ء میں اس وقت حمایت کی تھی جب وہاں پٹرول کی دولت نہیں تھی۔ لیکن پٹرول کی دولت سے مستفید ہونے والوں میں ان کا نام سب سے پیچھے ہے ۱۹۲۶ء کے مشہور اخبارات و جرائد میں اس مؤمنانہ دفاع کی تفصیلات موجود ہیں، بعض دستاویزات جامعہ سلفیہ نے شائع کر دی ہیں۔ اس وقت بھی ہمارا مجموعی موقف کتاب و سنت کے تابع ہے، اور آئندہ بھی ہم دعا کرتے ہیں کہ کتاب و سنت کی روشنی میں ہمارا قافلہ سخت جان محو خرام رہے۔ وماذ لك علی اللہ بعزیز۔

آخر میں آپ نے مسلمانوں کی ذمہ داریوں اور بالخصوص اہلحدیث علماء کی ذمہ داریوں کو یاد دلایا۔
اس کے بعد قرارداد و تجاویز پڑھ کر سنائی گئیں، اور مولانا سعید سالم صاحب نے اجلاس کے اختتام کا اعلان کیا۔

محمد سعید سالم ناظم اعلیٰ مدرسہ انوار العلوم املو۔

رپورٹ اجلاس حرمت حرمین و خلیجی بحران

منعقدہ زیر اہتمام دارالدعوہ لال گوپال گنج

ضلع الہ آباد، یوپی،

آج مورخہ ۲۹ رجب مطابق ۱۵ فروری بروز جمعہ دارالدعوۃ کی جامع مسجد واقع لال گوپال گنج (ترا باں) میں ایک اجتماع منعقد ہوا، جس میں دعوۃ الاسلام (جونیر ہائی اسکول) کے اساتذہ و طلبہ اور لال گوپال گنج و بریوا نارائن پور، نیز قرب وجوار کے لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ مولانا عبدالوہاب حجازی استاذ جامعہ سلفیہ بنارس (و ایڈیٹر محدث) نے دیا چونکہ اس دن کے اجتماع کا موضوع خلیجی بحران تھا، اس لیے موصوف نے خطبۂ جمعہ میں عام مسلمانوں کو بڑے مؤثر انداز میں یہ بتایا کہ اہل ایمان ہمیشہ کسی نہ کسی مسئلہ میں گھرے رہیں گے، اس لیے کہ یہ دنیا دارالامتحان ہے، اور یہ دنیا اہل ایمان کے لیے قیدخانہ، اور اہل کفر کے لیے جنت ہے، اور مومن خوشی وغمی ہر حال میں کتاب وسنت کی تعلیمات کا پابند ہے۔ اہل ایمان کو اسطرح کے حوادث کے موقعہ پر اپنا محاسبہ کرنا چاہئے کہ کون سی کوتاہی کے واقع ہونے سے مصائب و مسائل کا ہمیں سامنا ہے۔

جمعہ کی نماز کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبدالجبار الفریوائی کی صدارت میں باقاعدہ جلسہ جناب مولانا عبدالکریم عمری کی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوا۔

صدر جلسہ نے اپنی صدارتی تقریر میں مختصراً اس اجتماع کی اہمیت اور غرض وغایت پر روشنی ڈالی۔

پھر مولانا اصغر علی مدنی نے خطاب عام کیا، واضح رہے کہ بریوا نارائن پور کی جامع مسجد میں آپ نے خلیجی بحران کے موضوع پر خطبہ دیا تھا، اس جلسہ میں موصوف نے اس امر پر زور دیا کہ ہر مسئلہ میں حق و باطل کی پہچان کے

کچھ آداب واصول اور ضوابط ہیں، اکثریت اور بھیڑ کے نظریات وخیالات سے حق نہیں پہچانا جاتا، بلکہ حق کے لیے معیار کتاب وسنت ہے، اس لیے خلیجی فتنہ میں حق وناحق کا مقررہ معیار ہی قابل قبول ہوگا، اس ضمن میں ملک کے اکثریتی طبقہ کی زور زبردستی اور دھاندھلیوں کی مثال دیتے ہوئے موصوف نے کہا ہے کہ بابری مسجد کے بارے میں ہندؤں کے ظالمانہ موقف سے اپنے مسئلہ کا تقابل کرکے دیکھئے تو اقلیت واکثریت کے پیمانے سے حق وناحق کے جانچنے کا پیمانہ چکنا چور ہو جائیگا، خلیجی ممالک کے خلاف پھیلائے گئے پروپیگنڈہ کی بھی آپ نے پرزور تردید کی، اور واقعات سے اس کو واضح کیا۔

پھر مولانا عبدالوہاب حجازی نے حرمتِ حرمین اور تقدسِ حرمین کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کے مقدس شہر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے تقدس کو پامال کرنے اور حرمین اور اہل حرمین کو رسوا کرنے، اور وہاں کے امن وامان کو غارت کرنے کی ناروا کوششوں اور سازشوں کو واقعات وحقائق کی روشنی میں بیان کیا، اور اردو اخبارات وجرائد کی ابن الوقتی، اور دین سے جہل، حالات وواقعات سے غفلت کیطرف اشارہ فرمایا۔

آخر میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن الفریوائی نے خلیجی فتنہ اور جنگ کے اسباب پر روشنی ڈالی، اور اس سے ہونے والے ہمہ گیر نقصانات اور تباہیوں کی تفصیل بتائی، اور عالم اسلام میں دعوت وتبلیغ، تحریک جہاد، اسلامی تہذیب وتمدن، اتحاد واخوت اور تعلیم وثقافت اور اقتصادیات ومعیشت پر جو اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کو مفصل اور مدلل طور پر بیان کیا۔

اس کے بعد قرارداد وتجاویز پڑھ کر سنائی گئیں۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم۔

محمد حسان سلفی

مدیر دارالدعوۃ، لال گوپال گنج۔ الٰہ آباد

وامیر جمعیۃ اہل حدیث۔ پریوا۔

ماہنامہ **محدث** بنارس

شمارہ ۷ | جولائی سنہ ۱۹۹۱ء | ذی الحجہ سنہ ۱۴۱۱ھ | جلد ۹

اس شمارہ میں

مدیر
عبدالوہاب حجازی

پتہ
دارالتالیف والترجمہ
بی ۱۸/۱ جی ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰

بدلِ اشتراک
سالانہ ۴۵ روپے • فی پرچہ ۴/ روپے

○

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوچکی ہے •

احمد مجتبیٰ سلفی

ضعیف اور موضوع احادیث

• مُردہ کی طرف سے قربانی •

عن حنش قال: رأیت علیًّا - رضی اللہ عنہ - یضحی بکبشین، فقلت: ماھٰذا؟ فقال: رسول اللہ صلی اللہ علیہ أوصانی عن أضحی عنہ، فأنا أضحی عنہ۔

حنش کہتے ہیں: میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ دو مینڈھے قربانی کیا کرتے ہیں، میں نے ان سے دریافت کیا، آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی تھی کہ میں ان کی طرف سے قربانی کیا کروں، سو میں ان کی طرف سے قربانی کیا کرتا ہوں۔

یہ حدیث صدرجہ ضعیف ہے (۱)

اس کو امام ابوداؤد (۲) اور امام ترمذی نے، (۳) بطریق: "شریک القاضی، عن ابی الحسناء، عن الحکم بن عتیبۃ، عن حنش" روایت کیا ہے۔

اس سند کے تین راویوں پر کلام ہے۔ شریک القاضی کے متعلق حافظ ابن حجر ائمہ جرح وتعدیل کے کلام کا خلاصہ یوں نقل فرماتے ہیں:

صدوق یخطئ کثیرا، تغیر حفظہ منذ ولی القضاء (۴)

یعنی صدوق تو ہیں مگر بہت زیادہ غلطیاں کرجاتے ہیں۔ نیز جب سے قاضی ہوئے ان کی قوتِ حافظہ میں تغیر واقع ہوگیا۔

---

(۱) دیکھئے: مختصر أبی داؤد للمنذری (ج ۴ / ص ۹۵) وتحفۃ الاحوذی (ج ۲ / ص ۳۵۴) ومرعاۃ المفاتیح (ج ۵ / ص ۹۵) وکتب الرجال لترجمۃ: شریک القاضی، وأبی الحسناء، وحنش بن المعتمر۔ (۲) کتاب الضحایا: باب الأضحیۃ عن المیت۔ (۳) کتاب الاضاحی، باب ماجاء فی الأضحیۃ عن المیت۔ (۴) تقریب التہذیب: ترجمہ شریک بن عبداللہ القاضی۔

اور یہ یقین سے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کی یہ روایت قاضی ہونے سے پہلے کی ہے یا بعد کی ؟ نیز اگر پہلے کی ہے تو کیا یہ ضمانت دی جا سکتی ہے کہ اس روایت میں غلطی کے شکار نہ ہوئے ہوں ؟ اگر صحیحین کی روایت ہوتی تو دونوں احتمالات نہ ہوتے۔

دوسرے راوی " ابوالحسناء " کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں کہ میں نے علی بن المدینی سے پوچھا، ان کا نام کیا ہے ؟ تو ان کو اس بارے میں کوئی علم ہی نہیں تھا۔[1] البتہ امام مسلم نے فرمایا : ان کا نام "حسن" ہے، بعض نے کہا "حسین" ہے۔ امام ذہبی[2]، امام ہیثمی اور حافظ ابن حجر[3] فرماتے ہیں کہ یہ ایک مجہول آدمی ہیں، اور مجہول آدمی کی روایت کے بارے میں کسی کا بھی اختلاف نہیں کہ اس کی روایت مقبول نہیں ہوتی۔

تیسرے راوی " حنش " کے بارے میں امام بخاری فرماتے ہیں یتکلمون فی حدیثہ[4] یعنی محدثین کو ان کی روایتوں پر کلام ہے۔ اور امام ابوحاتم فرماتے ہیں :

لم أرھم یحتجون بحدیثہ[5] — یعنی میں نے محدثین کو ان کی حدیثوں سے حجت پکڑتے نہیں دیکھا۔

امام ابن حبان فرماتے ہیں :

کان کثیر الوھم فی الاخبار ینفرد عن علی باشیاء لا تشبہ حدیث الثقات حتی صار ممن لا یحتج بہ۔[6] — روایتوں میں بہت ہی زیادہ وہم کے شکار ہوتے تھے حضرت علی سے ایسی روایتوں میں منفرد ہیں جو ثقہ رواۃ کی روایات کے مثل نہیں، اس لئے ان کا شمار ان رواۃ میں ہونے لگا جن سے حجت نہیں پکڑی جاتی۔

امام حاکم کبیر کہتے ہیں۔ متین (مضبوط) راوی نہیں ہیں، اور امام ابن حزم فرماتے ہیں "ساقط مطرح" یعنی گرے پڑے راوی ہیں۔ امام عقیلی[7]، ساجی، اور ابوالعرب الصقلی نے ان کا ذکر اپنی اپنی " ضعفاء " میں کیا ہے۔[8]

---

(۱) سنن الترمذی بحوالہ مذکور۔ (۲) میزان الاعتدال، ترجمۃ ابی الحسناء، مجمع الزوائد (۳/۲۳)

(۳) تقریب التہذیب۔ (۴) التاریخ الکبیر (۳/۹۹)

(۵) الجرح والتعدیل (۳/۲۹۱) (۶) المجروحین (۱/۲۶۷)

(۷) الضعفاء الکبیر (۱/۲۸۸) (۸) مرعاۃ المفاتیح (۵/۹۳)

اگر حنش کے بارے میں امام ابوداؤد اور عجلی کی توثیق ہی کو لیا جائے تب بھی ابوالحسنار کی جہالت حدیث کی صحت میں مانع رہے گی۔

یہاں پر یہ نہ کہا جائے کہ حاکم نے مستدرک[1] میں اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے، اور یہ کہ ابوالحسنار کا نام "الحسن بن الحکم النخعی" ہے، اور امام ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے، کیونکہ اولاً تو حاکم سے تصحیح احادیث میں تساہل واقع ہوئے ہیں جیسا کہ علم حدیث سے تعلق رکھنے والا ہر فرد جانتا ہے۔ ثانیاً امام مزی نے تحفۃ الاشراف[2] میں اس حدیث کی سند میں ابوالحسناء۔ ہی لکھا ہے، اور تہذیب الکمال میں ابوالحسنار ہی کے ترجمہ میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے، بلکہ اپنی سند سے روایت بھی کی ہے نیز حافظ ابن حجر نے بھی تہذیب التہذیب میں ابوالحسنار ہی کے ترجمہ میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے نہ کہ الحسن بن الحکم النخعی کے ترجمہ میں اور خود امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں ابوالحسنار کے ترجمہ میں اس کا ذکر کیا ہے نہ کہ الحسن بن الحکم کے ترجمہ میں۔

اس سے ثابت ہوا کہ اس کا راوی ابوالحسنار ہے نہ کہ الحسن بن الحکم ابوالحسن، نیز حافظ نے تہذیب التہذیب میں ابن الحکم کی صحیح کنیت " أبوالحکم " ثابت کیا ہے۔

امام حاکم کو یہاں وہم ہو گیا ہے، اور ذہبی رواروی میں حاکم پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی موافقت کر گئے ہیں، اس کی دلیل اس حدیث کو ابوالحسنار کے ترجمہ میں ذکر کرنا ہے۔ یا یہ کہا جائے کہ حاکم تساہل کے شکار ہوئے ہیں، اور ذہبی رواروی کے۔

امام ترمذی اس حدیث کے بارے میں اپنا حکم یوں صادر فرماتے ہیں " هذا حديث غريب، لا نعرفه إلا من حديث شريك "

اور یہ اہل علم سے پوشیدہ نہیں کہ امام ترمذی کا کسی حدیث پر صرف " غریب " کا حکم اس کے ضعف کی طرف اشارہ ہوتا ہے[3]
امام منذری اس حدیث پر ساکت نہیں رہے، بلکہ فرمایا: تكلم فيه غير واحد[4] یعنی حنش پر بہت سے لوگوں کا کلام ہے۔ اور ہیثمی نے مجمع الزوائد[5] میں اس حدیث کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے:

فيه أبوالحسناء ولا يعرف۔ یعنی اس حدیث کی سند میں ابوالحسنار ہیں اور یہ مجہول آدمی ہیں۔

---

(۱) ج ۴ رص ۲۲۹-۲۳۰ — (۲) ج ۷ رص ۳۴۹ — (۳) ارواء الغلیل (ج ۴ رص ۳۵۶) والدراسات فی الجرح والتعدیل للدکتور ضیاء الأعظمی (ص ۲۰۵)، — (۴) مختصر سنن ابوداؤد للمنذری (ج ۴ رص ۹۵) —
(۵) ج ص ۲۳ —

صاحب تحفۃ الاحوذی فرماتے ہیں:

قلت: ابو الحسناء شیخ عبد اللہ[1] مجہول فالحدیث ضعیف[2]	میں کہتا ہوں شریک بن عبد اللہ کے استاذ ابو الحسناء مجہول ہیں، اس لئے یہ حدیث ضعیف ہے۔

نیز فرماتے ہیں:

قلت: لم أجد في التضحية عن الميت منفردا حديثا مرفوعا صحيحا، وأما حديث علي المذكور في هذا الباب فضعيف كما عرفت[3]	میں کہتا ہوں: میت کی طرف سے علاحدہ طور پر قربانی کے بارے میں کوئی حدیث صحیح مرفوع مجھے نہیں ملی، رہی حضرت علی کی مذکورہ حدیث تو وہ تو ضعیف ہے جیسا کہ آپ نے دیکھا۔

علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوری اس حدیث کے رواۃ پر توثیق و تجریح کے اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا حکم یوں صادر فرماتے ہیں:

قلت: كون هذا الحديث صحيحا عندي نظر قوي. وهذا لا يخفى على من تأمل في ترجمة شريك، وأبي الحسناء، وحنش[4]	میں کہتا ہوں: میرے نزدیک اس حدیث کے صحیح ہونے میں سخت تأمل ہے اور یہ امر کسی صاحب نظر پر مخفی نہیں، جس کی شریک القاضی ابو الحسناء اور حنش کے ترجمہ پر نظر ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مذکورہ حدیث کے مرتبے پر علماء کے اقوال کے پیش نظر اس سے میت کی طرف سے قربانی کرنے پر استدلال کرنا سلفی علماء کے لئے کسی طرح جائز نہیں، حُبِّ حدیث کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کسی حدیث کے مرتبے سے قطع نظر کرکے اس سے استدلال کیا جائے، سلفی علماء کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ پہلے حدیث کے صحت و ضعف کا پتہ چلاتے ہیں، پھر استدلال کرتے ہیں۔

اب ذرا اس حدیث کے معنی پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے،

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف تھے، آپ کے زندگی کی عبادت صرف:

أفلا أكون عبدا شكورا؟ — کیا میں شکر گذار بندہ نہ بنوں؟

کے لئے تھی، اور جب آپ انتقال فرما گئے تو عبادت کی کیا ضرورت رہ گئی؟ اسی لئے احادیث و آثار کے مجموعے میں یہ کہیں نہیں ملتا

---

(۱) سبقت قلم ہے عبد اللہ ہوگیا ہے، صحیح شریک بن عبد اللہ ہے۔ (۲) تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۳۵۴۔ (۳) حوالہ مذکور۔
(۴) مرعاۃ المفاتیح ج ۵ ص ۹۵۔

کہ آپ نے درود و سلام، دعاء وسیلہ[1] اور عام دعاء خیر کے سوا اپنے لئے کسی عبادت کا حکم امت کو دیا ہو۔

شرعی اصول کے مطابق وفات کے بعد نیکیوں میں اضافہ کی ضرورت نیکیوں کے محتاج بندوں کو ہوتی ہے (وہ بھی صرف دعاء خیر اور مالی عبادات کے ذریعہ) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چونکہ اگلے پچھلے تمام گناہ معاف تھے، اس لئے آپ کو اس کی کیا ضرورت تھی؟ کہ آپ وصیت فرماتے کہ میری طرف سے بھی قربانی کیا کرو۔

بنا بریں ہماری سمجھ سے اس حدیث کا متن بھی اس کے ضعف پر دال ہے۔

یہاں پر اس حدیث سے استدلال کرنے والے سلفی علماء سے ایک سوال یہ ہے کہ بدعتی معاشرہ میں جو عام رواج ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عبدالقادر جیلانی یا کسی بھی بزرگ اور ولی کے نام سے قربانی کرتے ہیں تو اہل حدیث علماء اس رواج پر نکیر بنام بدعت کیوں کرتے ہیں؟

نوٹ:- بعض علماء نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مندرجہ ذیل حدیث سے میت کی طرف سے قربانی پر استدلال کیا ہے جس کو امام مسلم نے روایت کیا ہے۔

أخذ الكبش فأضجعه ثم ذبحه، ثم قال: باسم الله، اللهم تقبل من محمد، وآل محمد، ومن أمة محمد (۲)	اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مینڈھے کو لیا اس کو ذبح کیا، پھر یہ کہا: اللہ کے نام سے، اے اللہ! اس کو تو محمد کی طرف سے، آل محمد کی طرف سے اور امت محمد کی طرف سے قبول فرما۔

نیز دیگر صحابہ کرام سے بھی اس مضمون کی روایتیں آئی ہیں، علامہ البانی نے ان سب کو اکٹھا کر کے ان کی تخریج کی ہے[3] اخیر میں آپ فرماتے ہیں،

وما جاء في هذه الأحاديث من تضحية صلى الله عليه وسلم	ان أحادیث میں جو یہ آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمّت کے ایسے افراد کی طرف سے

(۱) مرعاة المفاتيح (ج ۵ / ص ۹۵)۔

(۲) كتاب الأضاحي باب استحباب الضحية وذبحها مباشرة بلا توكيل۔

(۳) إرواء الغليل ج ۴ / ص ۳۴۹ - ۳۵۴۔

عمن لم یضح من أمته ھو من خصائصه صلی اللہ علیه وسلم کما ذکرہ الحافظ فی الفتح (۱) عن أھل العلم وعلیه فلا یجوز لأحد أن یقتدی به صلی اللہ علیه وسلم فی التضحیة عن الأمة ۔

قربانی کی جو قربانی نہیں کر سکے تھے تو یہ آپ کی خصوصیات میں سے ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے اہل علم سے نقل کیا ہے ۔ بنا بریں کسی امتی کے لئے یہ جائز نہیں کہ اس بارے میں آپ کی اقتداء کرے ۔

اگر اس کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت نہ بھی مانیں تو یہی معنی کیوں لیا جائے کہ " عن أمته " یا " عن أمتی " میں زندہ اور مردہ سب شامل ہیں ، صرف زندہ افراد کیوں نہ مراد لئے جائیں ؟ کیونکہ قربانی ، نماز ، روزہ کی طرح زندہ افراد کی وقتی عبادت کے قبیل سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے ، اس آپ کی امت کی طرف سے قربانی سے یہ کیوں نہ مراد لیا جائے کہ آپ نے ان زندہ افراد کی طرف سے قربانی کی جن کو قربانی میسر نہ ہو سکی تھی ، بلکہ یہی معنی راجح ہے ، فحوائے کلام سے اس معنی کی تعیین ہوتی ہے نیز محدثین کے مشہور اصول :

الأحادیث یفسر بعضها بعضا ۔۔　　بعض احادیث بعض احادیث کی تشریح کر دیتی ہیں ۔

کے مطابق جب ہم حضرت عائشہ کی حدیث اور اس کے ہم معنی دیگر صحابہ کی احادیث کے الفاظ کا تتبع کرتے ہیں تو حضرت ابوہریرہ کی حدیث کے الفاظ یوں ملتے ہیں :

ضحی رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم بکبشین .... أحدھما عنه وعن أھل بیته والآخر عنه وعن من لم یضح من أمته ۔ (۲)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مینڈھے کی .... قربانی کی ، ایک اپنی اور اپنے اہل بیت کی طرف سے ، اور دوسرا اپنی اور اپنی امت کے ان افراد کی طرف سے جنہوں نے قربانی نہیں کی ۔

(۱) کتاب العقیقة : باب إماطة الأذی الصبی فی العقیقة (۹/۵۹۵)

(۲) الطبرانی فی الأوسط والکبیر (مجمع الزوائد ج ۴/ص ۲۲ ، وإرواء الغلیل (ج ۴/ ۳۵۳)

اور حضرت جابر کی حدیث کے الفاظ ہیں :

فلما قضی خطبته نزل من منبره ، و أتی بکبش فذبحه بیده وقال : بسم اللہ واللہ أکبر ، ھذا عنی وعمن لم یضح من أمتی ۔ (۱)	جب آپ خطبہ سے فارغ ہوئے تو ایک مینڈھا لایا گیا اس کو آپ نے اپنے ہاتھ سے ذبح فرمایا ، اور کہا یہ میری طرف سے اور میری امت کے ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے قربانی نہیں کی ۔

اور یہ ظاہری بات ہے کہ " عمن من لم یضح " کا لفظ زندہ افراد کے متعلق ہی استعمال کیا جاسکتا ہے ۔ اور اگر کسی کو یہ ضد ہو کہ " عن أمته " کے مفہوم میں مردے بھی شامل ہیں تو ہم کہیں کہ اس حدیث سے قربانی کی جس نوعیت کا پتہ چلتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندہ و مردہ امتیوں کی طرف سے بالاشتراک قربانی کی تھی ، یعنی ایک ہی جانور میں خود کو ، اپنے اہل وعیال اور اہل خاندان کو اور اپنے زندہ مردہ امتیوں کو شریک کیا ، تو اس سے یہ کہاں نکل آیا کہ مستقلا کسی میت کی طرف سے ایک جانور کی قربانی جائز ہے ۔ استدلال واستنباط میں اتنی زبردستی نہیں کرنی چاہئے ، اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے جس نوعیت کی قربانی کا پتہ چلتا ہے اسی پر اکتفا کرنا چاہئے ۔

اب رہا " بعض اہل علم " کا میت کی طرف سے علاحدہ طور سے قربانی کو جائز قرار دینے کا مسئلہ (۲) تو اس سلسلے میں ہم عرض کریں گے کہ

۱ ۔ ہوسکتا ہے کہ ان " بعض اہل علم " نے حضرت علی کی مذکورہ ضعیف ترین حدیث ہی کو مستدل بنایا ہو ۔

۲ ۔ یا حضرت عائشہ اور دیگر صحابہ کی مذکورہ احادیث سے زبردستی کا مفہوم نکالا ہو ۔

۳ ۔ یا میت کے حق میں مالی عبادت کے ثواب کے پہونچنے " کے مسئلے پر قیاس کرکے جائز قرار دیا ہو ۔ (اس شق پر ہم اخیر نظر ڈالیں گے) ۔

کسی مسئلہ میں صرف بعض اہل علم کی رائے کا ہونا اس کے جواز کے لئے کافی نہیں ورنہ امت میں اصول وفروع کے بہت سارے اختلافات میں اس حربہ کے استعمال سے سارے مسائل مختلف فیہ پر عمل جائز ہوجائے گا ، اور اہل حدیثوں کا ہر ہر مسئلہ میں داد تحقیق دینا بے سود ہوجائے گا ، کیا کوئی اہل حدیث اس پر صاد کرے گا ؟ ہرگز نہیں !

---

(۱) کتاب الضحایا : باب فی الشاۃ یضحی بہا من جماعۃ ۔

(۲) سنن الترمذی ۔ حوالہ مذکور ۔

غلط اثرات :- اب دیکھئے اس ضعیف سے، یا اس زبردستی کے مفہوم سے استدلال کرکے میت کی طرف سے مستقلاً قربانی کو جائز قرار دینے کے اثرات ۔ یہ تو کہیں دیکھنے میں نہیں آتا کہ ایک جانور کی قربانی میں تمام اہل خانہ (زندہ و مردہ) کے لئے ثواب کی نیت کی جاتی ہو جیسا کہ حضرت عائشہ وغیرہا کی احادیث کا مقتضی ہے، اس کی بجائے یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ زندہ افراد کو چھوڑ مردہ کی طرف سے ایک علاحدہ جانور کی قربانی کی جاتی ہے، فرض و واجب کو ترک کرکے اس ضعیف حدیث سے مستنبط ایک مستحب قربانی کی جاتی ہے، حالانکہ حضرت علی نے اس ضعیف حدیث کے مطابق پہلے اپنی طرف سے قربانی کی، پھر دوسرے جانور کی آپ کی طرف سے قربانی کی، نیز اسی ضعیف حدیث کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اولیاء کرام کی طرف سے قربانی کا بدعتی رواج چل پڑا ہے ۔

ہاں میت کی طرف سے قربانی جائز ہو سکتی ہے ۔

مردہ کی طرف سے علاحدہ طور پر قربانی صرف مالی ایصالِ ثواب کے مسئلہ پر قیاس کرکے جائز ہو سکتی ہے (حضرت علی کی ضعیف حدیث اور دیگر صحابہ کی احادیث سے زبردستی کے استدلال سے نہیں) ۔

مگر اس سلسلے میں ہر سلفی عالم کو یہ خیال رکھنا چاہئے کہ کسی چیز کی رخصت اور چیز ہے، اور باقاعدہ اہتمام کے ساتھ اس کو ایک مستقل سنت جاریہ بنا دینا اور بات، کیا اس قیاس سے رخصت کے سوا اور بھی کچھ ثابت ہو رہا ہے ؟ میرے خیال میں اس جواز کو ویسا ہی جواز سمجھنا چاہئے جو ہر رکعت میں کسی سورہ کے بعد سورۂ اخلاص (قل ھو اللہ احد) پڑھنے کا ہے، بتقریر نبوت جائز ہونے کے باوجود امت کا تعامل اس پر نہیں ہوا، اِکّا دُکّا اگر کسی نے اس پر عمل کیا تو بتقریر نبوت جائز ہونے کی وجہ سے امت نے ٹوکا بھی نہیں۔ نیز یہ کہ میت کی طرف سے قربانی اس کی موت کے بعد والی ایک دو عید قرباں ہی میں کیوں کی جائے ؟ کیا اس کے بعد میت کو ثواب کی ضرورت نہیں رہتی ؟

اور یہ کہ کیا قربانی کے سوا اور کوئی ثواب کا کام ایسا نہیں جس کے ذریعہ میت کو ثواب پہونچایا جائے ؟ جب کہ بعض اہل علم کے نزدیک یہ جائز ہی نہیں، تو کیا اس سلسلے میں احتیاط کا پہلو اختیار کرنا ہی بہتر نہیں ہے ؟ ۔

اگر کوئی مردہ کو ثواب بذریعۂ قربانی ہی پہونچانے کا عزم کئے ہوئے ہے تو چونکہ " صدقہ پر قیاس کرکے ہی اس کے جواز کی صورت نکلتی ہے " اس لئے اس قربانی کا پورا گوشت فقراء و مساکین میں تقسیم کرنے ہی میں احتیاط ہے، جیسا کہ عبد اللہ بن المبارک کا فتویٰ ہے، نیز صاحب تحفۃ الاحوذی بھی اس کو راجح قرار دیتے ہیں۔

امام ترمذی حضرت ابن المبارک کے الفاظ یوں نقل کرتے ہیں۔

اَحَبُّ اِلَیَّ اَنْ یتصدق | میرے نزدیک زیادہ اچھا یہی ہے کہ مردہ

فلا يضحى عنه، وان ضحى فلا ياكل منه شيئا و يتصدق بها كلها.

کی طرف سے قربانی نہ کرکے صدقہ کردے اور اگر قربانی کرتا ہی ہے تو اس کے گوشت میں سے نہ کھائے بلکہ سارا گوشت صدقہ کردے۔

صاحب تحفۃ الاحوذی کے الفاظ ہیں :

فاذا ضحى الرجل عن الميت منفردا فالاحتياط أن يتصدق بها كلها۔

اگر کوئی آدمی میت کی طرف سے علاحدہ طور پر قربانی کرے تو احتیاط یہی ہے کہ سارا گوشت صدقہ کردے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین کی صحیح سمجھ عطا کرے، اور اپنے صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی توفیق دے،

(آمین)

کیا عصا۔۔۔ مومن کی علامت اور انبیاء کی سنت ہے؟

بتحقیق: غازی عزیر، ص ب ۸۷ ۴۰۰، الخبر - ۳۱۹۵۲، (المملکۃ العربیۃ السعودیۃ)

بعض خطباء اور واعظین اکثر بیان کرتے ہیں کہ عصا لینا مومن کی علامت اور انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے، بعض مولوی حضرات تو اس کے استعمال میں اس قدر شدت کرتے ہیں کہ خطبۂ جمعہ، نماز عیدین، یا دینی درسگاہوں اور مساجد کی جانب جاتے ہوئے ہاتھ میں عصا لینا کبھی نہیں بھولتے خواہ ان کی عمر اس کی متقاضی نہ ہو، ایسا عادۃً نہیں تطوع اور سنت سمجھتے ہوئے حصول اجر کی غرض سے کیا جاتا ہے، اس بارے میں دیلمیؒ نے "مسند الفردوس[1]" میں بطریق یحییٰ بن ہاشم الغسانی عن قتادۃ عن انس مرفوعاً روایت کی ہے کہ:

حمل العصا علامۃ المؤمن وسنۃ الأنبیاء	عصا کا لینا مومن کی نشانی اور انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔

علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے اس حدیث کو اپنی مشہور کتاب "جامع الصغیر" میں وارد کرکے گویا اس کی صحت کیطرف اشارہ کیا ہے نیز آں رحمہ اللہ نے اپنے "فتاویٰ[2]" میں بھی اس کو ذکر کرنے کے بعد اس پر سکوت اختیار کیا ہے۔ علامہ عجلونی نے "کشف الخفاء ومزیل الالباس[3]" میں ابن حجر ہیثمی مکیؒ کا طویل قول نقل کرتے ہوئے اس حدیث کو بطور استشہاد بحوالہ دیلمیؒ درج کیا ہے اور خود اس پر کوئی کلام نہیں کیا البتہ "جامع الصغیر" للسیوطی کے شارح علامہ مناویؒ تعقباً فرماتے ہیں:

"اس کی سند میں موجود غسانی کے متعلق علامہ ذہبیؒ کتاب الضعفاء میں فرماتے ہیں: بیان کیا گیا ہے کہ وہ حدیث گھڑتا تھا"

اس یحییٰ بن ہاشم السمسار ابوزکریا الغسانی کو امام نسائیؒ وامام بیہقیؒ نے "متروک الحدیث" اور یحییٰ نے "اس امت کا دجال" بیان

---

[1] مسند الفردوس للدیلمیؒ ج ۲ ص ۹۵، [2] فتاویٰ للسیوطی ج ۲ ص ۲۰۱، [3] کشف الخفاء ومزیل الالباس للعجلونیؒ ج ۱ ص ۳۹۳۔

کیا ہے۔ ابن عدیؒ فرماتے ہیں: "بغداد میں تھا حدیث گھڑتا تھا اور ان کا سرقہ کرتا تھا۔"

صالح جزرہؒ کا قول ہے: "میں نے یحییٰ بن ہاشم کو دیکھا ہے وہ حدیث میں کذب بیان کرتا تھا۔" امام ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ "ابن معین نے اس کی تکذیب ہے۔" ابو علی الحافظ کا قول ہے "جھوٹ بولتا تھا۔" محمد بن عبدالرحیمؒ فرماتے ہیں: "حدیث گھڑتا تھا۔" امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں: "اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی۔" ابن حبانؒ بیان کرتے ہیں: "یہ ان لوگوں میں سے تھا جو ثقات کی طرف سے حدیث گھڑتے، اور اثبات کی طرف سے معضلات روایت کرتے ہیں، اس کی حدیث کا لکھنا جائز نہیں ہے الا یہ کہ اہل الصناعۃ کے لئے علی جہت التعجب ہو اور اس سے کسی بھی حالت میں روایتِ حدیث جائز نہیں ہے۔"

یحییٰ بن ہاشم کے تفصیلی حالات کے لئے حاشیہ [۴] میں مذکور کتب ملاحظہ فرمائیں۔

پس یہ حدیث "موضوع" یعنی من گھڑت قرار پائی۔ محدث شام علامہ شیخ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ نے بھی اس حدیث کو "ضعیف جامع الصغیر" اور "سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ"[۵] میں وارد کرکے اس پر "موضوع" ہونے کا حکم صادر فرمایا ہے۔

حمل عصا کے بجائے بعض دوسری روایتوں میں "عصا پر ٹیک لگانے کو" انبیاء علیہم السلام کی سنت بیان کیا گیا ہے، مثلاً:

اَلتَّوَكُّؤُ عَلَى الْعَصَاءِ مِنْ سُنَّةِ الْأَنْبِيَاءِ۔ عصا پر ٹیک لگانا انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔

ملا علی القاری الحنفیؒ فرماتے ہیں:

"کلام تو صحیح ہے لیکن اس کے لئے کوئی صریح اصل موجود نہیں ہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے اس قول سے اخذ کیا جا سکتا ہے: وما تلك بيمينك يا موسىٰ[۶] یعنی اے موسیٰ تیرے داہنے ہاتھ میں یہ کیا ہے، اور بعض اوقات میں عصا لینا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہوتا ہے، جیسا کہ میں نے ایک رسالہ میں بیان کیا ہے۔"[۷]

---

[۴] کشف الحثیث عمن رمی بوضع الحدیث للحلبی ص۴۶۱، قانون الضعفاء للفتنی ص۲۰۶، ضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج۳ ص۲۰۳، ضعفاء والمتروکون للنسائی ترجمہ ۶۳۸، ضعفاء الکبیر للعقیلی ج۴ ص۴۳۲، ضعفاء الدارقطنی ترجمہ ۵۴۳، کامل فی الضعفاء لابن عدی ج۷ ص۲۷۰۶، مجروحین لابن حبان ج۳ ص۱۲۵، جرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج۴ ص۱۹۵، میزان الاعتدال للذہبی ج۴ ص۴۱۲، تنزیہ الشریعۃ لابن عراق ج۱ ص۱۲۸، نصب الرایہ للزیلعی ج۱ ص۷، سنن الکبریٰ للبیہقی ج۱ ص۴۲۴۔ [۵] سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ للالبانی ج۲ ص۱۹-۲۰۔ [۶] سورہ طٰہٰ: ۱۷۔ [۷] اسرار المرفوعۃ للقاری ص۹۹۔

علامہ اسماعیل عجلونی جراحیؒ نے اس حدیث کے متعلق ملا علی قاری کا مذکورہ کلام نقل کرنے کے بعد اس حدیث کے ہم معنیٰ شواہد پر مبنی ابن حجر ہیثمی مکی کا طویل تر اقتباس " کشف الخفاء و مزیل الالباس " میں نقل کیا ہے لیکن اس پر کوئی کلام نہیں کیا۔[۸]

علامہ محمد درویش حوت البیروتیؒ نے " اسنی المطالب " میں " سنۃ الانبیاء " کے بجائے " سنن الانبیاء " لکھا ہے، اور فرماتے ہیں: " کلام صحیح ہے لیکن یہ حدیث نہیں ہے "۔[۹]

عصا پر ٹیک لگانے سے متعلق بعض دوسری روایات میں مروی ہے:

اَلتَّوَكُّؤُ عَلٰى عَصَا مِنْ اَخْلَاقِ الْاَنْبِيَاءِ	عصا پر ٹیک لگانا انبیاء علیہم السلام کے اخلاق میں
كَانَ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	سے ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھی
عَصَا يَتَوَكَّأُ عَلَيْهَا وَيَأْمُرُنَا بِالتَّوَكُّؤِ	ایک عصائے (مبارک) تھا کہ جس پر آپ ٹیک فرماتے تھے
عَلَيْهَا۔	آپؐ نے ہمیں بھی اس پر ٹیک لگانے کا حکم فرمایا ہے۔

اس حدیث کو امام ابن عدی نے " کامل فی الضعفاء " میں[۱۰] اور ابوالشیخ نے " اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم "[۱۱] میں بطریق ... ن بن عبدالرحمٰن عن المعلیٰ بن ہلال عن لیث عن مجاہد عن ابن عباس رضی اللہ عنہما انہ قال بہ روایت کیا ہے، امام ذہبیؒ نے اس ... ث کو " میزان الاعتدال " میں معلیٰ بن ہلال کے ترجمہ کے تحت وارد کیا ہے۔[۱۲]

علامہ عجلونی نے " کشف الخفاء " میں ابن حجر ہیثمی مکی کے حوالہ سے اس حدیث کو بطور استشہاد نقل کیا ہے، ابن حجر ہیثمی کی بیان ... ہ روایت کے الفاظ اس طرح ہیں۔ " التوکؤ علی العصا من اخلاق الانبیاء وکان صلی اللہ علیہ وسلم ... وکأ علیہا "[۱۳] مگر اس حدیث کی اسناد پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں دو مجروح راوی موجود ہیں۔

۱۔ معلیٰ بن ہلال بن سوید ابوعبداللہ الطحان الکوفی، ابن مبارکؒ اور علی بن مدینیؒ فرماتے ہیں: " حدیث گھڑتا تھا " سعدیؒ کا ... ہے: " معلیٰ کذاب ہے " علی بن جنیدؒ فرماتے ہیں: " اس کو کذب کے لئے متہم کیا گیا ہے " امام بخاریؒ کا قول ہے: " ترکوہ " ابن ... نیؒ کا ایک قول ہے: " غیر ثقہ تھا " امام عجلیؒ فرماتے ہیں: " کذاب تھا " ابن عدیؒ کا قول ہے: " وہ ان متعدد لوگوں میں ہے جو حدیث

---

۸ کشف الخفاء للعجلونیؒ ج ۱ / ص ۳۸۳ ۔ ۹ اسنی المطالب للحوت بیروتیؒ ص ۱۱۸ ۔

۱۰ کامل فی الضعفاء لابن عدیؒ ج ۶ / ص ۲۳۶۹ ۔ ۱۱ اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم لابو الشیخؒ ص ۲۵۹ ۔

۱۲ میزان الاعتدال للذہبیؒ ج ۴ / ص ۱۵۳ ۔ ۱۳ کشف الخفاء للعجلونیؒ ج ۱ / ص ۲۸۳ ۔

گھڑتے ہیں " امام نسائیؒ اسے " متروک الحدیث " بتاتے ہیں۔ امام احمدؒ کا قول ہے : " متروک الحدیث ہے، اس کی حدیث موضوع اور کذب ہوتی ہیں " امام دارقطنی اور ازدیؒ نے بھی اسے " متروک " قرار دیا ہے۔ ابن عدیؒ نے امام بخاری، امام نسائی، امام احمد، اور سعدی رحمہم اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اسے کذاب و وضاع بتایا ہے " یحییٰ فرماتے ہیں کہ وہ وضع حدیث اور کذب بیانی کے لئے معروف رواۃ میں سے ہیں " امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں : " نقاد اس کی تکذیب پر متفق ہیں " اور امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں : " وہ اقوام ثقات کی جانب سے موضوعات روایت کرتا تھا لکھا پڑھا شخص نہ تھا، تشیع میں غلو کرتا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب پر سب وشتم کرتا تھا، اس سے حدیث کی روایت کرنا کسی بھی حال میں جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس کی حدیث کا لکھنا اِلّا یہ کہ علیٰ جہۃ التعجب ہو " معلی بن ہلال کے تفصیلی ترجمہ کے لئے حاشیہ ۱۲۱ کے تحت درج شدہ کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔

۲۔ عثمان بن عبدالرحمٰن بن مسلم الحرانی الطرائفی القرشی : ابن نمیرؒ کا قول ہے : " کذاب ہے " ازدیؒ فرماتے ہیں " متروک ہے " ابو عروبہؒ بیان کرتے ہیں : " اس کے پاس عجائب ہیں، مجہولین سے روایت کرتا ہے، وہ جزریین میں ایسا ہی ہے جیسا کہ شامیین میں بقیہ ہے کیونکہ بقیہ بھی مجہولین سے روایت کرتا ہے اور اس کے پاس بھی عجائب ہیں "

امام بخاریؒ نے اسے اپنی کتاب الضعفاء میں داخل کیا ہے، مگر امام ابوحاتم نے اس کا انکار کیا ہے، اور فرماتے ہیں : " وہ صدوق ہے " امام ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں " صدوق ہے مگر بکثرت ضعفاء و مجاہیل سے روایت کرتا ہے پس اس باعث اس کی تضعیف کی گئی ہے یہاں تک کہ ابن نمیرؒ نے اس کی نسبت کذب کی جانب کی ہے، لیکن ابن معین نے اس کی توثیق کی ہے "

امام ابن حجر نے اسے اپنی دوسری کتاب " تعریف اہل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس " میں بھی وارد کیا ہے۔ امام ابن حبانؒ نے بھی اس کی نسبت تدلیس کی جانب کی ہے، چنانچہ فرماتے ہیں " معلم تھا، ضعاف کی اقوام سے روایت کرنے میں ثقات سے تدلیس کرتا تھا، حتی کہ سننے والا اگر سنتا تو اسے اس کے وضع کرنے کا شک تک نہ ہو پاتا تھا۔ پس میرے نزدیک اس کی تمام روایتوں سے کسی بھی حال میں احتجاج کرنا جائز نہیں ہے، جبکہ اس پر مشاہیر سے منکرات اور ثقات سے موضوعات روایت کرنے کا غلبہ رہتا ہو " مگر امام

۱۲۲ ضعفاء والمتروکون للدارقطنی ترجمہ ۳۵۰، ضعفاء والمتروکون للنسائی ترجمہ ۵۶۱، قانون الضعفاء للفتنی ص۲۹۹، ضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج ۳ ص ۱۳۲، ضعفاء الکبیر للعقیلی ج ۴ ص ۲۱۴، کامل فی الضعفاء لابن عدی ج ۶ ص ۲۳۶۹، مجروحین لابن حبان ج ۳ ص ۱۶، جرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج ۴ ص ۳۳۱، سوالات الحاکم ص ۲۵۷، سوالات محمد بن عثمان ص ۱۶۹، علل لابن حنبل ج ۱ ص ۱۷۸، معرفۃ الثقات للعجلی ج ۲ ص ۲۹، کشف الحثیث عمن رمی بوضع الحدیث للحلبی ص ۴۲۶، تہذیب التہذیب لابن حجر ج ۱۰ ص ۲۳۲، تقریب التہذیب لابن حجر ج ۲ ص ۲۶۹، میزان الاعتدال للذہبی ج ۴ ص ۱۵۲، معرفۃ والتاریخ للبسویؒ ج ۳ ص ۱۳۷، تاریخ الکبیر للبخاری ج ۴ ص ۳۹۶، تاریخ الصغیر للبخاریؒ۔

ذہبی فرماتے ہیں: "حران کے علمائے حدیث میں سے تھا۔ ابن معین نے اسے صدوق اور ابو عروبہ نے متعبد لا بأس بہ کہا ہے۔ قوم مجہولین سے منکرات کی روایت کرتا ہے، ابن عدی اور عقیلی فرماتے ہیں: فی نفسہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے، میں کہتا ہوں امام بخاری نے اس کے بارے میں جو کہا ہے وہ قوم ضعاف سے بکثرت روایت کرنے کی وجہ سے ہے، اور ابن حبان نے اپنی عادت کے مطابق اس پر شدید جرح کی ہے لیکن آں رحمہ اللہ نے اس کے ترجمہ میں کسی ایسی چیز کی روایت نہیں کی ہے، اگر ان کے نزدیک اس کی کوئی موضوع خبر ہوتی تو اس کو پیش کرنے میں وہ بہت سرعت سے کام لیتے، اور مجھے علم نہیں ہے کہ کسی شخص نے بھی عثمان بن عبدالرحمٰن کے بارے میں یہ بات کہی ہو، نیز محمد بن عبداللہ بن نمیر نے اس کے بارے میں اسراف کام لیتے ہوئے کذاب کہا ہے۔"

عثمان بن عبدالرحمٰن الطرائفی کے ترجمہ کے لئے حاشیہ ۱۵ میں مذکور کتب کی طرف رجوع فرمائیں۔

اس روایت کی سند میں صرف معلی بن ہلال کی موجودگی ہی اسے "موضوع" قرار دینے کے لئے کافی ہے۔ چنانچہ مشہور محدث علامہ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ نے "سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ" میں اسے "موضوع" قرار دیا ہے [۱۶]

عصا کی فضیلت کے بیان میں علامہ عجلونی الجراحی نے ابن حجر ہیثمی مکی کے حوالہ سے دو مزید حدیثیں بطور استشہاد نقل کی ہیں جو اس طرح ہیں:

(۱) "كانت للانبياء كلهم مخصرة يتخصرون بها تواضعا لله عزوجل"

اس حدیث کو دیلمی نے بطریق وثیمہ بن موسیٰ عن سلمہ بن الفضل عن محمد بن اسحاق عن الزہری عن سعید بن المسیب عن ابن عباس مرفوعاً روایت کیا ہے، علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنے "فتاوی [۱۷]" میں اس حدیث کا ذکر کیا ہے، مگر اس کی صحت پر کوئی کلام

ج ۲ ص ۱۶۹، تاریخ یحیٰ بن معین ج ۳ ص ۳۶۸ ج ۴ ص ۱۲۹، تنزیہ الشریعۃ لابن عراق ج ۱ ص ۱۱۹، سنن دارقطنی ج ۳ ص ۸۸، نصب الرایۃ للزیلعی ج ۱ ص ۲۹۱ ج ۴ ص ۳۵ ص ۲۴۳، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۶ ص ۲۶۲۔

[۱۵] تقریب التہذیب للامام ابن حجر العسقلانی ج ۲ ص ۱۱-۱۲، تعریف اہل التقدیس بمراتب الموصوفین بالتدلیس لابن حجر عسقلانی ص ۱۴۲، تاریخ الکبیر للامام بخاری ج ۶ ص ۲۳۸، مجروحین لابن حبان ج ۲ ص ۹۶، ضعفاء الکبیر للعقیلی ج ۳ ص ۲۰۷، میزان الاعتدال فی نقد الرجال للذہبی ج ۳ ص ۴۵، ضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج ۲ ص ۱۹۶، قانون الضعفاء للفتنی ص ۲۷۶، جرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج ۳ ص ۱۵۷، تہذیب التہذیب لابن حجر عسقلانی ج ۷ ص ۱۳۴، تنزیہ الشریعۃ لابن عراق الکنانی ج ۱ ص ۸۴، نصب الرایۃ للزیلعی ج ۳ ص ۱۹۸، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۱ ص ۲۷۵۔ [۱۶] سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ للالبانی ج ۲ ص ۳۱۶-۳۱۷۔ [۱۷] فتاوی للسیوطی ج ۲ ص ۲۰۱۔

نہیں کیا، حالانکہ اس طریق میں ایک مجروح راوی وثیمہ بن موسیٰ البصری موجود ہے جس کے متعلق ائمہ رجال فرماتے ہیں کہ "سلمہ بن الفضل سے موضوع احادیث روایت کرتا ہے" اور امام عقیلی بیان کرتے ہیں "صاحب اغالیط ہے ... زہری کی جو احادیث وہ بیان کرتا ہے ان کی کوئی اصل نہیں ہوتی"۔ وثیمہ کے ترجمہ کے لئے حاشیہ ۱۸ کی طرف رجوع فرمائیں، علامہ محمد ناصر الدین البانی حفظہ اللہ نے اس حدیث کو "موضوع" قرار دیا ہے[۱۹]۔

(۲) "إن أتخذ العصاء فقد اتخذها أبي إبراهيم"

اس حدیث کو بزار و طبرانی نے "معجم الکبیر" میں حضرت معاذ بن جبل سے مرفوعاً تخریج کیا ہے، مگر اس کا مکمل متن حسب ذیل ہے:

"إن اتخذ المنبر فقد اتخذه أبي إبراهيم وإن اتخذ العصا فقد اتخذها أبي إبراهيم صلى الله عليه وسلم"

بزار و طبرانی کی اس حدیث کے متعلق علامہ ہیثمی فرماتے ہیں: "اس کی اسناد میں ایک راوی موسیٰ بن محمد بن ابراہیم بن الحارث التیمی ہے جو کہ بہت زیادہ ضعیف ہے[۲۰]"

اس موسیٰ بن محمد بن ابراہیم کے متعلق علامہ قطان فرماتے ہیں: "امام بخاریؒ، امام ابو حاتمؒ اور امام ابو داؤدؒ کے نزدیک وہ مضعف ہے" امام نسائیؒ اور ابن حجر عسقلانیؒ نے اسے "منکر الحدیث" قرار دیا ہے، یحییٰؒ فرماتے ہیں: "وہ کچھ بھی نہیں ہے، اس کی حدیث نہیں لکھی جاتی" ایک مرتبہ آں رحمہ اللہ نے فرمایا کہ "وہ ضعیف ہے" امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں "متروک ہے" امام بخاری کا قول ہے: "اس کے پاس مناکیر ہیں" امام عقیلی فرماتے ہیں: "اس کی حدیث غیر متابع ہوتی ہے" ابن المدینی کا قول ہے: "وہ ضعیف ہے، ضعیف ہے، ضعیف ہے" اور امام ابن حبان بیان کرتے ہیں "وہ ساقط الاحتجاج ہے"، تفصیلی ترجمہ کیلئے حاشیہ ۲۱ کی طرف رجوع فرمائیں۔

---

۱۸ جرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج ۴/۲ ص ۵، ضعفاء الکبیر للعقیلی ج ۴ ص ۳۳۲، ضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج ۳ ص ۱۸۲، قانون الضعفاء للفتنی ص ۳۰۱، میزان الاعتدال للذہبی ج ۴ ص ۳۳۱، تنزیہ الشریعۃ لابن عراق الکنانی ج ۱ ص ۱۲۳، ۱۹ سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ للالبانی ج ۲ ص ۲۰۲، ۲۰ مجمع الزوائد للہیثمی ج ۲ ص ۱۸۱، ۲۱ ضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج ۳ ص ۱۴۸، قانون الضعفاء للفتنی ص ۲۹۹، ضعفاء الکبیر للعقیلی ج ۴ ص ۱۶۹، ضعفاء الصغیر للبخاریؒ ترجمہ ۳۵۱، ضعفاء والمتروکون للنسائی ترجمہ ۵۵۶، ضعفاء والمتروکون للدارقطنی ترجمہ ۵۱۸، کامل فی الضعفاء لابن عدیؒ ترجمہ ۲۳۴۲، مجروحین لابن حبانؒ ج ۲ ص ۲۴۱، جرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج ۴ ص ۱۵۲، سوالات محمد بن عثمان ص ۹۵، میزان الاعتدال للذہبی ج ۴ ص ۲۱۸، تقریب التہذیب لابن حجر ج ۲ ص ۲۸۷، تاریخ الکبیر للبخاری ج ۴ ص ۲۹۳، تاریخ الصغیر للبخاری ج ۲ ص ۱۴۲، تاریخ یحییٰ بن معین ج ۳ ص ۱۸۲، فتح الباری لابن حجر ج ۱ ص ۶۶، تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری ج ۳ ص ۱۷، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۴ ص ۲۴۲، ج ۹ ص ۱۴۸۔

خود علامہ ابن حجر ہیثمی مکیؒ نے اس حدیث کے "ضعف" کی جانب ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے: " واُخرج البزار والطبرانی بسند ضعیف " پس یہ حدیث ناقابل استشہاد ہوئی۔

پھر ابن حجر ہیثمی مکی نے عصا کے متعلق حضرت ابو امامہ سے مروی ایک حدیث اس طرح بیان کی ہے:

خرج الینا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس اس حال میں
متوکئاً علیٰ عصاہ [۲۲]	تشریف لائے کہ آپ اپنی عصا پر سہارا لئے ہوئے تھے۔

عصا کی فضیلت کے باب میں دو (۲) اور " موضوع " احادیث عوام میں مشہور ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

(۱) " من بلغ الاربعین ولم یُمسك العصا فقد عصٰی ": یعنی جو چالیس (سال کی عمر کو) پہونچے اور عصا نہ لے وہ عاصی یعنی گنہگار ہے۔ ملا علی القاری الحنفیؒ نے اس حدیث کو " اسرار المرفوعۃ " میں وارد کیا ہے، اور فرماتے ہیں: " اس کی کوئی اصل نہیں ہے [۲۳] علامہ عجلونی نے کشف الخفاء " میں اس حدیث کو قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ اس طرح درج فرمایا ہے: " من بلغ اربعین سنۃ عدلہ ذلك من الکبر " اور بطور استعجاب فرماتے ہیں: " ابن حجر مکی نے اپنے فتاویٰ " میں علامہ سیوطیؒ سے نقلاً بیان کیا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے [۲۴]

(۲) من خرج فی سفر ومعہ عصا ورأی فیہ اللّٰہ بکل سبع ضار۔

اس حدیث کو بھی علامہ عجلونی نے " کشف الخفاء " میں وارد کیا ہے، اور حیرت کے ساتھ فرماتے ہیں: " ابن حجر مکی نے اپنے " فتاویٰ " میں علامہ سیوطی سے نقلاً بیان کیا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے [۲۵]

نوٹ: (اختصار کے پیش نظر ان دونوں حدیثوں کی اسناد پر بحث نہیں کی گئی ہے، صرف چند مشاہیر کے اقوال پر اکتفا کیا گیا ہے)

خلاصۂ کلام: اگرچہ بعض مواقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا لینا ثابت ہے مگر عصا کی فضیلت میں جتنی بھی احادیث بیان کی جاتی ہیں ان میں سے کوئی ایک روایت بھی " صحیح " اور قابل احتجاج نہیں ہے، عصا لینا " سنن العادت " میں سے تو ہو سکتا ہے مگر " سنن العبادت " میں سے ہرگز نہیں ہے جیسا کہ محدث عصر علامہ شیخ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ نے بیان [۲۶] فرمایا ہے۔ واللّٰہ اُعلم بالصّواب۔

---

[۲۲] اخرجہ ابن ماجۃ۔ [۲۳] اسرار المرفوعۃ للقاریؒ ص ۹۹ [۲۴] کشف الخفاء ومزیل الالباس للعجلونیؒ ج ۱ ص ۳۸۳ [۲۵] ایضاً۔
[۲۶] سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ للالبانی ج ۲ ص ۲۰۔

از: ڈاکٹر محمد اقبال حسین ندوی، شعبہ عربی سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انگلش اینڈ فارن لنگویز۔ حیدرآباد۔

محمد بن سلام الجمحی اور "طبقات فحول الشعراء"

ان تمام مؤلفین میں جنہوں نے عربی شعری سرمایہ کے تحفظ کے لئے جدوجہد کی، اور انہوں نے عربی شعری سرمایہ کا حسین گلدستہ انتخاب کی شکل میں پیش کیا، اس انتخاب میں شعری ذوق کے ساتھ تنقیدی بصیرت اور تنقیدی صلاحیت کا بھی ثبوت دیا اور فنی اصول بھی وضع کئے ان میں محمد بن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۱ھ) کی خدمات کو سبقت حاصل ہے، اس میدان میں اس کی کاوش اور اس کی تحقیق و تنقیدی اصول و مباحث بہت ممتاز ہے، اور خاص قدر و قیمت کے حامل ہے، واقعہ یہ ہے کہ تنقیدی اصول کی پہلی بیج اسی نے عربی زبان و ادب میں ڈالی ہے اور تنقید بحیثیت فنی اصول کے اسی کی تحریر میں سب سے پہلے پائی جاتی ہے، اس کی اس انفرادیت پر بحث کرتے ہوئے طہ احمد ابراہیم رقم طراز ہے۔

> ہم ابن سلام پر بحث کے لئے جداگانہ باب قائم کرتے ہیں، اس لئے نہیں کہ اس نے ایسی چیز پیش کی جس کو اس سے پہلے تنقید میں یا معاصرین نے پیش نہیں کیا، اور ہم خاص طور پر بحث کرتے ہیں اس لئے نہیں کہ اس نے ان افکار و آرار کو زیر بحث لایا، جن کو ان کے علاوہ راویوں اور لغویوں نے نہیں چھیڑا تھا، بلکہ اس لئے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے ان افکار کو منظم طور پر بحث کی شکل میں پیش کیا، اور اس نے اس بات کو سمجھا کہ کس طرح ان کو پیش کیا جائے اور دلائل قائم کئے جائیں اور ان سے اپنی کتاب "طبقات فحول الشعراء" میں ادبی حقائق و اصول کا استنباط کرتے۔[1]

---

[1] طہ احمد ابراہیم، تاریخ النقد الادبی عند العرب (دارالحکمۃ بیروت، لبنان) ص ۷۵۔

ابن سلام الجمحی پہلا ناقد ہے جس نے اپنے معاصرین لغوی اور شعر کے روایت کرنے والوں کی نفی، ادبی اور تنقیدی مباحث کو خالص علمی رنگ دیا، اس سے قبل کسی ناقد نے تنقید کو علمی شکل میں پیش نہیں کیا، اس کی کتاب کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اس نے شعراء کے سلسلہ میں جن تنقیدی آراء کو نقل کیا ہے، وہ محض نقل نہیں ہے، یا دوسرے معاصرین کی طرح محض ان آراء کی تجمیع نہیں کی ہے بلکہ ان میں خالص علمی رنگ پیدا کیا ہے، اور مباحث کو خاص علمی تناظر میں پیش کیا ہے، فنی اعتبار سے اس نے اس میں اضافہ بھی کیا ہے اور ادب و تنقید کے سلسلہ میں اس وقت تک جو رائے پائی جاتی تھی اور جو افکار وجود میں آئے تھے ان میں اس نے نئی جہت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور تنقید کے سلسلہ میں اس نے جن معلومات کو فراہم کیا ہے، اس سے قبل کی کسی کتاب میں ایسی معلومات فراہم نہیں کی گئی ہے۔

ابن سلام الجمحی نے پہلی بار تنقید کے مفہوم اور اس کے ضروری عناصر پر منطقی اور علمی انداز پر بحث کی ہے، ادبی تنقید کے میدان میں یہ اس کا اہم کارنامہ ہے، اور اس کی وجہ سے ادبی تنقید کے میدان میں وسعت بھی پیدا ہوتی ہے، ڈاکٹر احسان عباس ان نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں :

> "ابن سلام پہلا شخص ہے جس نے ادبی تنقید کو مستقل فن کا درجہ دیا اور ناقد کو ایک خاص مرحلہ میں داخل کردیا۔" [1]

ڈاکٹر محمد مندور نے بڑے احتیاط سے ابن سلام الجمحی کی کتاب پر اظہار رائے کیا ہے، اس کے بعض جملے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ابن سلام کا کارنامہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے، لیکن اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہے کہ ابن سلام نے نصوص کی تحقیق کے سلسلہ میں جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ درست ہے، اور ابن سلام نے تنقید کے سلسلہ میں جو رجحان اپنایا ہے، اور کلام کی تنقید میں تفسیر اور تعلیل کو جو جگہ دی ہے، یعنی کسی کلام کا تنقیدی جائزہ وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کا جو رجحان اپنایا ہے وہ فنی اعتبار سے قابل تعریف ہے، محمد مندور رقم طراز ہے :

> "ابن سلام نے فنی تنقید کو کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھایا، اگرچہ اس نے نصوص کی تحقیق میں صحیح طریقۂ کار اپنانے میں سبقت کیا ہے، اور اس نے تاریخ ادب عربی میں فنی احکام (فنی تنقیدی آراء) کو مرتب طور پر پیش کرنے اور تفسیر و تعلیل کے لئے رجحان پیدا کرنے میں (کامیاب) کوشش کی ہے۔" [2]

---

[1] احسان عباس : تاریخ النقد الادبی عند العرب (دار الثقافۃ بیروت، لبنان ۱۹۸۶ء) ص ۷۸۔

[2] محمد مندور : النقد المنہجی عند العرب (دار نہضۃ مصر، القاہرۃ) ص ۲۱

بہرحال دو باتوں کی وجہ سے ابن سلام الجمحی کی کتاب "طبقات فحول الشعراء" کو اہمیت حاصل ہے۔ اول یہ کہ اس نے پہلی مرتبہ اس کتاب میں فنی تنقید کو موضوع سخن بنایا ہے، دوسری بات یہ کہ انہیں عملی طور پر کلام کو مختلف پیرایہ میں جانچنے پرکھنے اور اس کی تعلیل و توضیح کرنے میں پیش رفت کی اور تحقیق و تنقید دونوں کو لازم ملزوم قرار دیا۔

ابن سلام الجمحی نے پہلی بار شعر اور تنقید کو فن قرار دیا، دوسرے علوم و فنون کے مقابلہ میں شعر و نقد کی تفریق کے لئے فن کا لفظ تو استعمال نہیں کیا، لیکن اس مفہوم میں اس سے قریب تر لفظ "الصناعة" استعمال کیا، چونکہ فن کا مفہوم کسی بھی چیز میں کمال و مہارت پیدا کرتا ہے، چاہے زبان و ادب کی قابلیت و صلاحیت اور مہارت ہو یا آلہ و جوارح کی مہارت سے کسی چیز کو خوبصورت شکل میں پیش کرتا ہو، لیکن دونوں ہی میں فنکاری کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ فنی عمل ہی "فن" ہے، دونوں صورتوں میں فنکار حسین و خوبصورت شئی کو وجود بخشتا ہے، اور اپنے فن سے اس میں ایک تاثیر اور کشش پیدا کرتا ہے، اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب فنکار کسی شئی کو حسین قالب میں ڈھالنے پر قدرت رکھتا ہے، عربی زبان و ادب میں اس عمل کو "صناعة" کہا گیا ہے، جس میں قدرت و مہارت کے ساتھ خیال میں جدت، فکر میں جمال اور اسلوب میں شگفتگی۔ اور فنکاری میں حسن پیدا کیا گیا ہے، اور یہی چیز فن ہے، ابن سلام نے تحریر کیا ہے:

"شعر ایک فن (صناعة) اور علم (ثقافة) ہے، اہل علم دوسرے اصناف علم اور فنون (صناعات) کی طرح اس سے بھی واقف ہوتے ہیں" [1]

ابن سلام الجمحی نے فن شناس اور فن شناسی کے موضوع پر ایک ساتھ گفتگو کی، اور اس نے یہ نکتہ ابھارا کہ فن کا قدردان اور فن شناس ہی فن کی قدر و قیمت معلوم کر سکتا ہے، اور وہی کسی فن کے متعلق رائے قائم کر سکتا ہے اور بتا سکتا ہے کہ کسی فن کا مرتبہ اور اس کی قدر و قیمت کیا ہے، ہر ایک فن سے متعلق ماہرین ہی اس فن کے اعلیٰ یا ادنیٰ ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں اور اس کی حیثیت متعین کر سکتے ہیں، ہر شخص ہر ایک فن کا ماہر نہیں ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کا رمز شناس ہو سکتا ہے، اس لئے شعر و ادب جیسے فن کا اداشناس وہی ہو سکتا ہے اور اس فن سے واقفیت اسی کو ہو سکتی ہے، جن کا شعر و ادب سے گہرا ربط ہو اور اس فن پر اس کا خود عملی مشق ہو، اس کا مطالعہ کثرت سے کرتا ہو، اور شعر و ادب اس کی زندگی پر حاوی ہو، گویا شعر و ادب ہی اس کا شب و روز ہو، اگر شعر و ادب سے اسے شغف نہیں ہے، کثرت مطالعہ نہیں ہے تو اسے اس کے حسن و قبح کے مابین فیصلہ کا ادراک نہیں ہو سکتا ہے، تنقیدی بصیرت اور ملکہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔ غرض کہ نقاد کے لئے ضروری ہے کہ شعر و ادب کے مختلف اوصاف سخن اور مختلف ادوار کے کلام پر گہری نظر رکھے ورنہ ناقد کی تنقید کا

---

[1] محمد بن سلام الجمحی، طبقات الشعراء (مطبعة بریل، لیدن ۱۹۱۳ء) ص ۳

معیار بلند اور فیصلہ صحیح نہیں ہوگا، تنقید اور ناقد کے اس اہم نقطہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اصولی طور پر محمد بن سلام الجمحی نے یہ بات کہی :

" یقیناً کثرت مطالعہ علم میں اضافہ کرتی ہے " [1]

حسن و قبح کی تمیز کو صاحب طبقات فحول الشعراء نے نقد کا نام دیا اور حسن و قبح اور کھرے کھوٹے کی تمیز کرنے والے اور ان کے مابین فرق کرنے والے کو " ناقد " کہا ۔

محمد بن سلام الجمحی پہلا ناقد ہے جس نے " ناقد " کا لفظ اس کے لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں بیک وقت استعمال کیا ہے ، اور ادبی تنقید کو بھی دِرہم و دینار کے پرکھنے کی طرح ایک عمل قرار دیا ہے ، چونکہ دونوں میں جانچنے اور پرکھنے اور حسن و قبح کے مابین تفریق و تمییز کرنے کا عمل پایا جاتا ہے ، اس لئے اس عمل کے انجام دینے والے کے لئے ناقد کی اصطلاح وضع کیا ہے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ ہر ایک شئی کے حسن و قبح کا معیار مختلف ہوتا ہے ، اور چونکہ ہر ایک شئی کے صفات مختلف ہوتے ہیں اور ان کے عمدہ صفات کی بنیاد پر ناقد کی شئی کی جودت اس کے اچھا ہونے یا حسین ہونے کا فیصلہ کرتا ہے یا اس کے عیوب کی بنیاد پر اس کے معیار سے کمتر ہونے یا کھوٹا ہونے یا کم قیمت ہونے کا فیصلہ کرتا ہے ۔

محمد ابن سلام الجمحی نے مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے اور تحریر کیا ہے کہ جیسے لُورلُور (موتی) اور یاقوت محض اوصاف یا وزن سے نہیں پہچانا جاتا ہے ، بلکہ اس کے اوصاف کا معاینہ ضروری ہے ، اور پرکھنے والے ہی اس کو پرکھ سکتے ہیں ، اس طرح دینار و درہم کا پرکھنے والا ان کے اچھا ہونے کو محض رنگ سے ، چھونے سے ، شکل سے اور کسی قسم سے نہیں پہچان سکتا ہے بلکہ ناقد بغور دیکھ کر ہی اس کو سمجھ سکتا ہے ، اور اس کے کھرا کھوٹا اس کے وزن اور ہلکا ہونے کو معلوم کر سکتا ہے ۔

اسی طرح اور مثالیں دیتے ہوئے کہتا ہے کہ کسی کنیز یا دوشیزہ کی قدر و قیمت اس کے اوصاف کے اعتبار سے لگائی جاتی ہے جیسے کوئی دوشیزہ جس کا رنگ گورا صاف شفاف ، قد نکلتا ہوا لمبی شیریں ذہن ، شیریں لب ، سفید چمکتے ہوئے دانت خوبصورت آنکھ ، ستواں ابھری ہوئی ناک ، چھوٹا منہ اور بال لمبے ہوں ، ان خوبیوں کی حامل کوئی سو دینار کی کوئی دو سو دینار کی ہوگی اور کوئی ہزار دینار کی ہوگی ، اور اس سے بھی زیادہ کی ہو سکتی ہے جبکہ اس کے حسن کی کوئی مثال نہ ہو [2] (لا یجد واصفتها مزیدا اعلیٰ هذه الصفة)

محمد بن سلام الجمحی نے یہ بھی اصول وضع کیا کہ کثرت مطالعہ ، تنقیدی بصیرت ، محاسن و معائب سے واقفیت کے علاوہ ناقد کے لئے

---

[1] محمد بن سلام الجمحی ، طبقات الشعراء ، (مطبعۃ بریل ، لیدن ۱۹۱۳ء) ص ۳ -

[2] ایضاً ..... ص ۳ -

مختلف تہذیب وثقافت کا مطالعہ بھی ضروری ہے، تہذیب وثقافت پر گہری نظر اس لئے ضروری ہے کہ شاعر اپنی تہذیب وثقافت کا نمائندہ فرد ہوتا ہے، اس کی شاعری پر اس کے معاشرہ وسماج کی تہذیب کا اثر ہوتا ہے اس لئے کہ شاعر اسی ماحول اور زندگی سے متاثر ہوتا ہے جس سماجی زندگی میں شب وروز گذارتا ہے، اور اس کی تہذیبی اثرات کی نشاندہی سے شاعر کے شعر کی تحقیق وتنقید آسان ہوجاتی ہے، اس کے فکر وخیال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ زبان واسلوب کے معیار متعین کرنے میں تعاون ملتا ہے، اگر ناقد کے پاس مختلف تہذیب وثقافت کا مطالعہ نہیں ہے اور سماجی شعور نہیں رکھتا ہے تو مختلف ادوار یا تہذیب کے شعراء کے کلام میں جو تہذیبی اثرات ہوتے ہیں اس کے لئے اس کو سمجھے بغیر شعر کی حقیقت اور فکر وخیال کو سمجھنا اور شعر کی نسبت فیصلہ کرنا ایک دشوار امر ہے، الغرض کہ شخصیت ماحول اور تخلیق یا فن تینوں میں باہمی ربط ہوتا ہے، ماحول وتہذیب کا اثر شخصیت پر اور شخصیت کا اثر فن یا تخلیق پر ہوتا ہے، جب بھی کسی فن پارہ یا تخلیق کی تحقیق وتنقید کی جائے گی، اس میں شخصیت کے ارتسامات کی تلاش ضروری ہے، اور ان ارتسامات پر چونکہ عہد وماحول کا عکس ہوتا ہے، اس لئے اس عہد وماحول کے تہذیبی وثقافتی علامات سے واقفیت لازمی ہے، اور ان ہی باتوں کی وجہ سے ایک تہذیب وماحول کے شاعر کی شخصیت اور فن دوسری تہذیب وماحول کے شاعر کی شخصیت اور فن سے مختلف ومنفرد ہوتا ہے، ابن سلام الجمحی کے نزدیک تہذیبی نقطہ کی تلاش تنقید کے لئے ضروری ہے۔

ابن سلام نے تنقید کیلئے ایک شرط یہ بھی رکھی کہ کسی بھی شعر کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل اس کے نص کی تحقیق ضروری ہے، ناقد کا اولین فریضہ یہ ہے کہ وہ شعر کی صحت، اور شاعر کی طرف اس کی نسبت کی چھان بین کرے اگر شعر کی عبارت میں تحریف ہے یا دوسرے شاعر کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اور اس بات کی تحقیق کے بغیر ناقد تنقید کرتا ہے تو اس کی تنقید کی بنیاد صحیح نہیں ہوگی، اور اس شعر پر تبصرہ یا تنقید کی بنیاد ہی غلط ہوگی، اور وہ تنقید بے معنی بھی ہوگی، اس لئے کہ شاعر کی شخصیت اور اس کی ثقافت کے اثرات جو شعر پر مرتب ہوئے ہیں، شعر کا جو پس منظر ہے کلام کا جو معیار ہے اس پر تبصرہ وتنقید محض ایک اندازہ پر مبنی ہوگی، ایسے تنقیدی فیصلہ کی کوئی قدر وقیمت نہیں ہوگی۔

محمد بن سلام الجمحی نے ناقد یا نقد کے لئے اس لئے یہ اصول وضع کیا کہ اس نے جب اشعار کے انتخاب کا ارادہ کیا تو اس کے سامنے کسی شعر کی حقیقت وصحت معلوم کرنے کے لئے یہ مسائل درپیش آئے اس لئے کہ اس کے عہد میں عہد جاہلی یا عہد اسلامی کے جو اشعار پائے جاتے تھے، ایک عام رائے تھی کہ ان میں انتحال یا تحریف کیا گیا ہے۔

راویوں نے اشعار کی تعداد میں حذف واضافے کئے ہیں، اور اشعار ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں جن کا عربی زبان یا شعر سے کوئی تعلق نہیں تھا، ان اسباب پر محمد بن سلام الجمحی نے خود روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"جب عربوں نے شعر کو روایت کرنے، اپنی تاریخ بیان کرنے، اور کارناموں کو بیان کرنے کا ارادہ کیا تو بعض قبائل نے شعراء کے اشعار پر ہی اکتفا کیا، ان کے تاریخی حالات بیان کرنے سے گریز کیا، وہ جماعت یا قوم جن کے تاریخی کارنامے اور اشعار کم تھے، انہوں نے چاہا کہ جن کے پاس تاریخی کارنامے بھی تھے اور اشعار بھی ان کی ہمسری کرے اس غرض کے لئے کہ انہوں نے شعراء کی زبان میں اشعار کہے، اس کے بعد راویوں نے اس میں مزید اضافے کر دیئے " [1]

ابن سلام الجمحی نے نصوص کی تحقیق کے متعلق اصولی بحث کے ساتھ تنقید کا نمونہ بھی پیش کیا ہے، ان راویوں نے جنہوں نے کذب بیانی سے کام لیا ہے اور شعر کی نسبت تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لیا ہے، ان میں محمد بن اسحاق کو بھی شمار کیا ہے، اور اس کے متعلق تحریر کیا ہے کہ اس نے قوم عاد و ثمود کی طرف بعض اشعار کو منسوب کیا ہے جو تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ہے، ابن سلام نے نص کی تحقیق کرتے ہوئے منطقی استدلال اس طرح پیش کیا ہے۔

پہلی دلیل قرآن کریم کی آیات سے دی ہے، اور ثابت کیا ہے کہ قوم عاد و ثمود کا کس قسم کا ادبی سرمایہ عذاب الٰہی اور ان قوموں کی ہلاکت کے بعد باقی نہیں بچا تھا۔

قرآن کریم کی آیت قوم ثمود کی ہلاکت سے متعلق ہے،

أنه أهلك عادا الاولىٰ وثمود فما أبقى ۔

اور عاد کے متعلق یہ آیت ہے:

فهل ترىٰ لهم من باقية ؟ ۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ قوم عاد کے عہد میں عربی زبان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ جس زبان کا وجود نہیں تھا اس زبان کے اشعار کا وجود کیسے ممکن ہے، سب سے پہلے شخص اسمٰعیل علیہ الصلاۃ والسلام ہیں جنہوں نے عربی زبان میں گفتگو کی ہے اور ان کا زمانہ قوم عاد کے بعد کا ہے۔

تیسری دلیل تاریخی و ثقافتی بنیاد پر دی ہے، یہ کہ قوم عاد کا مسکن یمن تھا، اور اہل یمن کی عربی، اہل حجاز و نجد کی عربی سے اس عہد میں بالکل مختلف تھی، جب عربی زبان نے یمن میں رواج پائی ہے۔

چوتھی دلیل یہ دی ہے کہ عربی شاعری میں قصیدہ کا وجود عہد اسلام سے قبل قریب تر عہد میں ہوا ہے، محمد بن سلام الجمحی نے خالص علمی

---

[1] محمد بن سلام الجمحی، طبقات الشعراء (مطبعہ بریل، لیدن ۱۹۱۳ء) ص ۱۴۔

انداز میں شعر کے نص کی تحقیق کی مثال پیش کی ہے، اور اس کے نزدیک ناقد کا یہ بنیادی عمل ہے۔

اس اعتبار سے ابن سلام الجمحی کی کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے شعر کے منحول اور موضوع ہونے پر مدلل بحث کی ہے، اور تنقیدی نقطۂ نظر سے شعر کے نصوص کا جائزہ لے کر اس کو تنقید کا موضوع بنایا ہے۔

غرض کہ محمد بن سلام الجمحی نے نقد اور تنقید کا مفہوم پہلی بار پیش کیا، اور اس نے تنقید کے لئے بعض بنیادی اصول بھی مرتب کیا، اگرچہ ان اصولوں کی حیثیت تنقید کے ابتدائی معلومات کی حیثیت رکھتے ہیں پھر بھی اس لحاظ اہم ہیں کہ اس نے اپنے انتخاب کلام اور شعراء کے متعلق تنقیدی اقوال کی تحقیق، تدقیق اور تنقید شروع کیا تو اس نے بعض فنی باتوں کو محسوس کیا۔ اپنی ذہانت اور معلومات کی بنیاد پر ان باتوں کو تنقیدی اصول کی حیثیت سے بیان کیا ..... اس نے ناقد کے لئے وسعت معلومات مختلف تہذیب وثقافت سے واقفیت، حسن وقبح کے مابین فرق کرنے کی صلاحیت بنیادی اصول قرار دیا، اور تنقید کے لئے نص کی تحقیق لازمی قرار دیا، یہ باتیں ابن سلام کے تنقیدی اصول کی روح ہیں۔

عملی تنقید کے نقطۂ نظر سے یہ بات بھی اہم ہے کہ محمد بن سلام الجمحی نے شعراء کی تقسیم ادوار مقامات اور کلچر کی بنیاد پر کیا، یہ پہلا شخص ہے جس نے محسوس کیا کہ شاعر کی شخصیت اور اس کی شاعری پر تہذیبی، ثقافتی، جغرافیائی، سماجی وسیاسی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور کسی بھی شاعر کے کلام کا جائزہ اسی تناظر میں لینا چاہئے، شاعر کا مرتبہ متعین کرتے وقت ان باتوں کا لحاظ کرنا ضروری اور شعراء کے کلام کا موازنہ کرتے وقت بھی ان باتوں پر نظر رکھنا لازمی ہے، ادبی تنقید کا یہ تاریخی نقطۂ نظر HISTORICAL METHOD. ادبی تنقید کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

ابن سلام نے جاہلی شعراء کو دس طبقوں میں تقسیم کیا ہے، اور ہر ایک طبقہ میں چار شعراء کو شامل کیا ہے، اس کے علاوہ مراثی، عرب بدوی اور یہودی شعراء کے تین مزید طبقے قائم کیا ہے، اصمعی نے شعراء کی تقسیم فحول اور غیر فحول کے درمیان کیا ہے لیکن ابن سلام نے اس پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ طبقات کی تقسیم میں فحول الشعراء کے مابین بھی امتیاز اور موازنہ کرنے کی غرض سے تہذیب وثقافت، متمدن وغیر متمدن، دیہات وشہر، کلام کے قلت وکثرت اور دوسری باتوں کو بھی پیش نظر رکھ کر مزید تقسیم کیا ہے، جو شاعر کے کلام کا تنقیدی جائزہ لینے کے لئے ضروری ہے۔

اس موضوع پر باقاعدہ تالیف کی حیثیت سے محمد بن سلام الجمحی کی اس کتاب کو نقش اول کی حیثیت حاصل ہے، اس لئے خامیوں کا ہونا بھی فطری بات ہے، اس نے شعراء اور ان کے کلام کے متعلق مختلف آراء کو نقل کیا ہے، خود سے کلام کی تحلیل اس طرح نہیں کیا ہے کہ اس کا حسن وجمال واضح ہو کر سامنے آجائے، اس لئے تنقیدی احکام کی تحلیل وضاحت اور تفصیل نہ ہونے کی وجہ سے تنقید کا جو حق ہے

وہ ادا نہیں ہوا ہے۔

اس کے باوجود عربی تنقید کی وہ پہلی کڑی ہے جس سے آئندہ کی کڑیاں جڑتی ہیں، نقش اول ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت اپنی جگہ ہے، ڈاکٹر محمد طاہر درویش نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

"اس کی کتاب اس طویل سفر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے" [1]

طٰہٰ احمد ابراہیم رقمطراز ہے:

"ابن سلام کی یہ کتاب عربی ادبی تنقید کی کتابوں میں اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے، ذہنی سلاست روی، قوتِ فکر، بصیرت اور بات کو بسیط انداز میں کہنے کی وجہ سے ابن سلام کا شمار بڑے ناقدوں میں ہوتا ہے، اور اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے بات کو دلائل سے زیادہ واضح کر کے کہا ہے، اور اسباب و علل کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے، اُدبار اور لغویین سے جو کچھ اس نے حاصل کیا ہے اس کو حسین انداز میں اخذ کیا ہے، اور اس میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔" [2]

---

[1] محمد طاہر درویش، فی النقد الأدبی عند العرب (دار المعارف، مصر ۱۹۷۹ء) ص ۱۵۱

[2] طٰہٰ احمد ابراہیم، تاریخ النقد الأدبی عند العرب ص ۸۸

محمد خالد پٹیل، بھیونڈی

مسئلۂ تصویر

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے دین کے ساتھ بھیجا ہے جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے اور جس میں ہر بات کی مکمل رہنمائی موجود ہے، اس دین میں اللہ تعالیٰ نے تصویر کے متعلق واضح احکام نازل فرمائے ہیں جن کی بنا پر یہ بات بغیر شک وشبہ کے کہی جا سکتی ہے کہ جاندار چیزوں کی تصویریں حرام اور بے جان چیزوں کی تصویریں جائز ہیں، یہ تصویریں خواہ کاغذ پر بنائی جائیں یا کپڑے پر، دیوار پر بنائی جائیں یا سلولائڈ فلم پر سب حرام ہیں، اسی طرح مٹی، لکڑی، پتھر، ربڑ، شیشے، پلاسٹک اور کسی بھی دھات کی تراشی یا ڈھالی ہوئی مورتیاں اور مجسمے سب حرمت میں برابر ہیں، علاوہ ازیں جس طرح ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویریں حرام ہیں، اسی طرح کیمرہ سے کھینچی ہوئی، سینمائی، ریڈیائی، ویڈیائی، ٹیلی ویژنی، الکٹرونی، برقی، جوہری اور قیامت تک ایجاد ہونے والے دیگر طریقوں سے بنائی گئی تصویریں بھی حرام ہیں۔

تصویر بنانے کی ممانعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف تصویر بنانے سے منع فرمایا ہے بلکہ اسے گھر میں رکھنے سے بھی منع فرمایا ہے، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں:

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الصورة في البيت، ونهى عن أن يصنع ذلك۔ (الترمذی، کتاب اللباس)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر میں تصویر رکھنے اور تصویر بنانے سے منع فرمایا ہے۔

یہ حکم عام ہے اور اس میں مذکورہ بالا تمام قسم کی تصویریں شامل ہیں، خواہ بنانے والے نے انھیں شوقیہ بنایا ہو، یا اظہار فن کے لئے، بیچنے کی غرض سے بنایا ہو یا اور کسی مقصد سے، آپؐ نے حضرت علیؓ کو اس مہم پر روانہ کیا تھا کہ جو مجسمہ نظر آئے اسے توڑ دیں، جو اونچی قبر نظر آئے اسے زمین کے برابر کر دیں اور جو تصویر نظر آئے اسے مٹا دیں۔

لاتدع تمثالا إلا طمسته ولا قبرا مشرفا إلا سويته ولا صورة إلا طمستها۔ (مسلم)	کسی مجسمہ کو توڑے بغیر، کسی اونچی قبر کو ہموار کئے بغیر اور کسی تصویر کو مٹائے بغیر نہ چھوڑنا۔

غور فرمایئے یہاں " تمثالا " اور " صورۃ " دونوں الفاظ عام ہیں، اور ان میں ہر مجسمہ اور ہر تصویر شامل ہے خواہ حقیقی ہو یا فرضی، اور خواہ اسے کسی فنکار نے بنایا ہو یا کسی اناڑی شخص نے۔

تصویر بنانے والے کو عذاب

حدیث میں آتا ہے کہ جو کوئی تصویر بنائے گا اسے قیامت کے روز اس بات کا مکلف بنایا جائیگا کہ اس میں روح پھونکے مگر وہ روح نہیں پھونک سکے گا (چنانچہ اللہ تعالیٰ اسے عذاب دے گا)۔ آپؐ نے فرمایا:

من صوّر صورۃ فی الدنیا کلّف یوم القیامۃ أن ینفخ فیہا الروح ولیس بنافخ۔ (بخاری، کتاب اللباس)	جو شخص دنیا میں کوئی تصویر بنائے گا قیامت کے روز اسے اس بات کا مکلف بنایا جائے گا کہ اس میں روح پھونکے، اور وہ روح نہیں پھونک سکے گا۔

اس حدیث میں لفظ " صورۃ " نکرہ ہے، اور اس میں ہر جاندار کی تصویر شامل ہے، خواہ انسان کی ہو، جانور کی ہو، پرندے کی ہو، درندے کی ہو، کیڑے مکوڑے کی ہو یا مچھلی اور مگرمچھ وغیرہ کی ہو، اس طرح حدیث ذیل میں بھی لفظ " صورۃ " عام اور اس میں بھی جاندار کی ہر تصویر شامل ہے۔

لا تدخل الملائکۃ بیتا فیہ کلب ولا صورۃ تماثیل۔ (بخاری، کتاب بدء الخلق)	فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا تصویر ہو۔

حدیث میں وارد شدہ اس عام ممانعت کے باوجود " محدث " بنارس (اکتوبر ۹۰ء) میں ہمیں الشیخ عبدالرحمٰن عبدالخالق کا مضمون " اسلام اور فوٹوگرافی " پڑھ کر افسوس ہوا کیونکہ موصوف نے آلاتی تصاویر کو حرمت سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

" تصویر سے منع کرنے والی احادیث کا اطلاق آلاتی تصاویر پر نہیں ہوتا ہے، کیونکہ فوٹو مشین اللہ کی خلقت کو بعینہٖ نقل کرلیتا ہے اور پھر اس کو کاغذ یا کسی دوسری سطح پر منتقل کردیتا ہے، اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ فلاں فنکار کی بنائی ہوئی تصویر ہے، کیونکہ مشین سے فوٹو ایک چھوٹا بچہ بھی لے سکتا ہے جو اپنا نام بھی لکھنا نہ جانتا ہو، چہ جائیکہ تصویر بنانا " (ص۲۵)

موصوف کا یہ استدلال بالکل باطل ہے، کیونکہ اگر فوٹو مشین اللہ کی خلقت کو بعینہٖ نقل کرلیتا ہے تو بہت سے مصور بھی ایسے ماہر فن ہوتے ہیں جو کسی انسان یا جاندار کی ایسی تصویر بناتے ہیں جو اس کی ہو بہو نقل ہوتی ہے، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ کامل مشابہت رکھنے والی ایک تصویر کو حرام کہا جائے اور ویسی ہی دوسری تصویر کو جائز! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہیں نہیں فرمایا کہ جو تصویر کسی جاندار سے کامل مشابہت رکھتی ہو وہ حرمت سے مستثنیٰ ہے، بلکہ آپ نے ہر تصویر کو حرام قرار دیا ہے، جیسا کہ ہماری پیش کردہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے،

خواہ اس میں سو فیصد مشابہت ہو یا کچھ کسر باقی ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مذکورہ استدلال کو درست تسلیم کرلیا گیا تو ٹیپ ریکارڈ مشین پر موسیقی اور گانے بجانے کے پروگرام سننا بھی جائز ہوگا، کیونکہ ٹیپ ریکارڈ مشین ٹیپ شدہ آواز کو بغیر آلات موسیقی کے استعمال کے دہراتی ہے، اور مشین کو ایک چھوٹا بچہ بھی جو گانے بجانے کے فن سے بالکل ناواقف ہو، چلا سکتا ہے، پس یہاں نہ گانے والی عورت کا وجود ہے نہ آلاتِ موسیقی کا، لہذا اسے بھی حرمت سے مستثنیٰ ہونا چاہئے۔

ذرا غور کیجئے کہ اگر اس قسم کی باطل تاویلوں سے شریعت کی حرام کردہ چیزوں کو حلال کرلیا گیا تو اللہ کا دین کھیل ہو کر رہ جائے گا۔

آئینہ کا عکس اور ٹیلیویژن کی تصویر

شیخ نے ٹیلی ویژن کی تصویر کو آئینہ میں نظر آنے والے عکس کی مانند قرار دیا ہے جبکہ دونوں میں نمایاں فرق ہے۔

۱۔ آئینہ دیکھنا شرعاً جائز ہے اور اس میں پڑنے والے عکس پر نہ شرعاً "تصویر" کا اطلاق ہوتا ہے نہ آئینہ دیکھنے کو "تصویر بنانا" یا "تصویر کھینچوانا" کہتے ہیں، اس کے برخلاف ٹیلی ویژن پر نظر آنے والی شکلیں برقی یا مشینی آلات کے ذریعہ ٹیلی ویژن کے پردہ پر منتقل کی ہوئی تصویریں ہوتی ہیں، جن پر شرعاً و عرفاً لفظ "تصویر" کا اطلاق ہوتا ہے۔

۲۔ آئینہ کا استعمال اپنی صورت دیکھنے کے لئے کیا جاتا ہے جبکہ ٹیلی ویژن پر دوسروں کی تصویریں دیکھی جاتی ہیں۔

۳۔ آئینہ میں صورت معکوس نظر آتی ہے یعنی داہنا ہاتھ بائیں طرف اور بایاں ہاتھ داہنی طرف، اس کے برخلاف ٹیلی ویژن کی تصویر اصلی حالت میں ہوتی ہے۔

۴۔ آئینہ میں عکس کبھی بھی آئینہ کی سطح پر نظر نہیں آتا بلکہ ہمیشہ فاصلہ پر نظر آتا ہے، یعنی جتنے فاصلے پر صورت دیکھنے والا کھڑا ہوگا اتنے فاصلہ پر اس کا عکس نظر آئیگا، جبکہ ٹیلی ویژن کی تصویریں اس کے پردہ کی سطح پر نمایاں ہوتی ہیں۔

۵۔ آئینہ میں قریب موجود انسان کا عکس نظر آتا ہے ٹیلی ویژن پر میلوں دور انسانوں کی تصویریں نظر آتی ہیں۔

۶۔ چھٹا اور آخری فرق جو سب سے اہم ہے یہ ہے کہ گھر میں آئینہ رکھنا اور اس میں اپنی صورت دیکھنا نہ صرف شرعاً جائز ہے بلکہ سنت بھی ہے، حضرت علیؓ سے روایت ہے:

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا نظر وجہہ فی المرآۃ، قال: الحمد للہ، اللہم کما حسنت خلقی فحسن خلقی. (رواہ ابن السنی فی عمل الیوم واللیلۃ)	کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتے، تو فرماتے: سب تعریفیں اللہ کے لئے ہے، اے اللہ! جس طرح تو نے مجھے حسن خلقت عطا فرمایا ہے مجھے حسن اخلاق بھی عطا فرما!

اس کے برخلاف ٹیلیویژن تصویریں ظاہر کرنے اور بنانے والی مشین ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں چھوڑتے تھے جس میں تصویریں ہوتی تھیں۔

ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یترک فی بیتہ شیئاً فیہ تصالیب الا نقضہ (بخاری، کتاب اللباس)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں کوئی ایسی چیز بغیر توڑے ہوئے نہیں چھوڑتے تھے جس میں تصویریں ہوں۔

پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے بھی گھر میں ٹیلی ویژن رکھنے کی حرمت ہی ثابت ہوتی ہے اور ہمیں حضور کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے نہ کہ اپنی یا اور کسی کی رائے پر چلنے کا۔

موصوف ٹیلیویژن کے استعمال کی حمایت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: "مصور اخبار کی تاثیر دلوں کے اندر بہت زیادہ ہوتی ہے، زبان رسول ہے لیس الخبر کالمعاین۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ گویا صورت کا دیکھنا اصل کا دیکھنا ہے"

جواباً عرض ہے کہ اس بات کو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ صورت کا دیکھنا اصل کا دیکھنا ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ نے مسلمان مردوں کو غیر محرم عورتوں کے دیکھنے اور مسلمان عورتوں کو غیر محرم مردوں کے دیکھنے سے منع فرمایا ہے تو ہمارے لئے یہ کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ ہم ٹی وی پر ان کی تصویریں دیکھیں؟ سورۂ نور میں یہ فرمان الٰہی

قل للمؤمنین یغضوا من أبصارھم وقل للمؤمنات یغضضن من أبصارھن۔

مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں، اور مومن عورتوں سے کہو کہ اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

اسی لئے ہے تاکہ مومن مرد اور عورتیں آنکھوں کے زنا سے محفوظ رہ سکیں، تو کیا ٹی وی دیکھنے کے لئے اس فرمان الٰہی کو پس پشت ڈال دیا جائے؟ ساء مایحکمون۔ مذکورہ بالا خرابیوں کے علاوہ ٹیلی ویژن کا دیکھنا صحت کے لئے بھی سخت مضر ہے، اس سے آنکھیں کمزور ہوتی ہیں، ان کی شعاعیں عارضہ قلب پیدا کرتی ہیں نیز اس سے کینسر کا مرض بھی لاحق ہوتا ہے۔

آخر میں ہم علماء کرام سے گذارش کرینگے کہ شریعت کے حرام کردہ کسی کام کو باطل تاویلوں کے ذریعہ حلال کرنے کی کوشش نہ کریں، قیامت میں سب سے زیادہ عذاب جسطرح بنانے والوں کو ہوگا اسی طرح ان علماء کو بھی ہوگا جنہوں نے اپنے علم سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا۔

عن عبد اللہ ابن عباسؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول، أشد الناس عذابا یوم القیامۃ من قتل نبیا أو قتلہ نبی أو قتل احد والدیہ والمصورون وعالم لم ینتفع بعلمہ (بیہقی، مشکوٰۃ)

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے روز سب سے زیادہ عذاب اس شخص کو ہوگا جس نے کسی نبی کو قتل کیا ہو یا جس کو کسی نبی نے قتل کیا ہو یا جس نے اپنے ماں باپ میں سے کسی کو قتل کیا ہو، اور تصویر بنانیوالوں کو اور اس عالم کو جسے اس کے علم سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔

اصغر علی امام مہدی السلفی

عِلم وعقل عطیہ الٰہی ہے

علم اور عقل اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاص عطیہ ہے، رحمت الٰہی ہے، عظیم امانت ہے، انسان کو یہ امانت رب العزت نے اس کی تکریم کیلئے عطا کیا ہے انسان کو ان دونوں چیزوں سے مزین کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس کی روشنی سے فیضیاب ہو کر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر گذار بندہ بن جائے، اس کی اطاعت وبندگی اس کے بتائے ہوئے راستے اور طریقے کے مطابق کرے۔

کتاب وسنت میں علم وعقل کی فضیلت آئی ہے، اور اہل علم وخرد کو خاص طور پر ان کے شعور وآگہی کے حوالے سے مخاطب کیا گیا ہے، آیات قرآنی کے اخیر میں " لعلکم تعقلون " اور " لعلکم تشعرون " کے ذریعہ انسان کے علم وعقل کو خاص طور پر کام میں لانے کا حکم اور ترغیب دی گئی ہے، ساتھ ہی ان دونوں سے مستفید نہ ہونے والوں کے لئے وعید شدید آئی ہے " لھم قلوب لایفقھون بھا ولھم اعین لایبصرون بھا ولھم اذان لایسمعون بھا " ان کے دل تو ہیں لیکن ان سے سمجھتے بوجھتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھتے نہیں، ان کے کان بھی ہیں لیکن سن گن اس میں نہیں ہے۔

اس ارشاد باری میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ انسان اپنے علم وعقل کو کام میں نہیں لاتا، بلکہ بے سوچے سمجھے جس راہ پر لگ گیا ہے اسی کو اول وآخر جان کر پیہم چلتا رہتا ہے، حالانکہ وہ اپنے منزل سے قریب ہونے کے بجائے اس سے اور دور ہوتا چلا جاتا ہے

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ تو می روی بہ ترکستان ست

اس سلسلے میں انسان اس وقت خاص طور پر کوتاہی اور گمراہی کا شکار ہوتا ہے جبکہ اس کے سامنے آباء واجداد اور اس کے بزرگوں کا طرز عمل اور اصول سامنے ہوتا ہے، اس وقت ان کی پیروی میں اپنے عقل وعلم کو پس پشت ڈال دیتا ہے، اور علم وعقل کے تمام دریچے اپنے اوپر بند کر کے اندھی تقلید کرنے لگ جاتا ہے، تو گویا شیطان انسان کو گمراہ کرنے کے لئے تقلیداً باء واجداد اور بزرگوں کے آراء

وخیالات کا پابند کر کے بندوں کو عقل اور علم کا راستہ اختیار کرنے اور اس پر غور و فکر کرنے سے کوسوں دور کر دیتا ہے، امام ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ ابلیس کے اس تلبیس کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

ابلیس لعین نے اس امت کے عقائد کو نیست و نابود کرنے کے لئے دو چالیں چلی، پہلا حربہ جسے اس نے بنی نوع انسان کو گمراہ کرنے کے لئے اپنایا وہ آباء و اجداد اور بزرگوں کی تقلید کا ہے، (اور تقلید کہتے ہیں شخص خاص کی تمام باتوں اور آراء و خیالات کو بلا دلیل و برہان مان لینے کو)۔

دوسرا راستہ جس کے ذریعہ شیطان امت کے عقائد و اعمال کا ستیاناس کرتا ہے، وہ لایعنی اور بے مقصد اور ممنوعات کے اندر غیر معمولی غور و خوض کرنے کا وسوسہ دلاتا ہے کہ انسان اس کی حقیقت کو پا سکے اور نہ اس کی گہرائی کو پہنچ سکے، اور نتیجے میں حیران و پریشان اور عاجز ہو کر تشکیک و شبہات کی ہلاکت خیزی میں مبتلا ہو جائے، جیسا کہ فلاسفہ اور متکلمین کا انجام رہا ہے

تقلید کے واسطے سے جو مفاسد عقائد و اعمال میں واقع ہوتے ہیں اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ابلیس لعین مقلدین کو یہ سمجھا دیتا ہے کہ دیکھو دلیل و برہان کی روشنی سے منور ہونا آسان نہیں بلکہ بسا اوقات ادلہ و براہین مشتبہ اور غیر واضح ہوتے ہیں اور حق و صواب مخفی رہ جاتا ہے، اس لئے اس جنجال میں پڑا ہی کیوں جائے، تمہارے لئے اگلوں کی تقلید کا راستہ ہی اسلم اور مامون ہے، اس میں کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں پڑتی اور نہ ہی ادلہ و براہین کے مشتبہ ہونے کا خدشہ ہی رہتا ہے، اور حق و صواب کے پوشیدہ رہنے کا اندیشہ بھی تو نہیں، بس کیا ہے انسان کے سامنے عقل کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور وہ اندھی تقلید کا شکار ہو جاتا ہے، شیطان کا یہ حربہ اتنا کارگر اور کامیاب ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے وہ خلق کثیر کو ضلالت و گمراہی کے عمیق غار میں ڈھکیل دیتا ہے، اور عوام الناس حتیٰ کہ علماء کی ہلاکت کا سبب بنتا ہے، یہی حربہ شیطان نے یہود و نصاریٰ کی تضلیل اور گمراہی کے لئے بھی اپنایا تھا اور وہ اس میں صد فیصد کامیاب رہا، یہاں تک کہ حق و باطل کی تمیز ختم ہو گئی، دین موسوی اور دین مسیح کے اصل تعلیمات مٹ گئے، انہوں نے آباء و اجداد اور علماء و مشائخ کی تقلید کرنے کی روش اختیار کی اور گمراہ ہو گئے، اور یہی حال اہل جاہلیت کا تھا۔

حالانکہ ان مقلدین کو جاننا چاہئے اور غور کرنا چاہئے کہ جس کی وجہ سے وہ تقلید کی مدح خوانی کرتے ہیں، اور اس پر چلنے کی وجہ بتاتے ہیں درحقیقت وہی علت تقلید کی مذمت کے لئے ہے، وہ اس طرح کہ ان کے بقول ادلہ و براہین مشتبہ اور غیر واضح ہیں اور حق و صواب مخفی ہے، تو ایسی صورت میں تقلید کا چھوڑ دینا زیادہ بہتر اور ضروری ہے، تاکہ حق کے پوشیدہ ہونے اور ان کی نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد تقلید کے راستے گمراہی کے شکار نہ ہو جائیں، لیکن کیا کہئے تقلید میں ہر بات الٹی نظر آتی ہے۔

اور خود ذات باری تعالیٰ نے آباء و اجداد اور علماء کے تقلید کی مذمت بیان فرمائی ہے، اور اس پر اڑے رہنے والوں کو سخت وعید

سنائی ہے ، ارشاد باری تعالیٰ ہے " بل قالوا انا وجدنا آباءنا علی امۃ وانا علی آثارھم مقتدون قل اولو جئتکم باھدی مما وجدتم علیہ آباءکم " بلکہ وہ (علم وعقل کا راستہ اپنانے کے بجائے) کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے آباء واجداد کو ایک راستے پر پایا ہے ، اور ہم انھیں کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں ، تو آپ فرمادیجئے کیا تم اس کے باوجود (ان کی تقلید کروگے) جب کہ میں تمہارے پاس اس سے زیادہ رشد وہدایت کا راستہ لے کر آیا ہوں جس سے تم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا ہے ۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے " انھم الفوا آباءھم ضالین فھم علی آثارھم یھرعون " انہوں نے اپنے آباء واجداد کو گمراہ پایا اور وہ انھیں کے نقش قدم پر رواں دواں ہیں ۔

امام ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معلوم ہونا چاہئے کہ مقلد اپنی تقلید کی راہ میں کبھی مامون نہیں ہے ، بلکہ تقلید ایسی ضرررساں ، نقصان دہ شئی ہے کہ اس راہ میں عقل کی منفعت رائیگاں اور بے سود ہو جاتی ہے ، تقلید کی روش اختیار کرنے میں گویا عقل وشعور کے منافع اور فوائد کا ابطال لازم آتا ہے ، کیونکہ انسان کو عقل جیسی نعمت سے اسلئے بہرہ ور کیا گیا ہے کہ وہ اسے غور وفکر اور تدبر سے کام میں لاکر فائدہ اٹھائے ۔ کیونکہ یہ تو بہت ہی بری اور قبیح بات ہوگی کہ کسی شخص کو روشنی حاصل کرنے کے لئے شمع دیدی جائے اور وہ اسے گل کرنے کے بعد تاریکی اور اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرے ، اور یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ مذاہب وفرق کے عام مقلدین شخص معین کی عظمت اپنے دل میں بٹھا لیتے ہیں ، اور اس کے عظمت کی راگ الاپتے ہوئے اس کی ہر بات کی تقلید کرنے لگ جاتے ہیں[1] ذرہ برابر بھی اس کے اقوال میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے ، کتاب وسنت کے نصوص اور اس کے ادلہ وبراہین پر غور کرنا تو دور کی بات ہے ، سرے سے اس سلسلے میں کلام کرنا ہی تقلید سے خارج ہونے کے مرادف سمجھتے ہیں ، اور وہ اس طرح خود اپنے پیشواؤں کے فرمان کی نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں ، چنانچہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان ہے ۔ حرام علی من لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی جس کو میرے قول کی دلیل کی معرفت نہ ہو اسے میرے کلام پر فتویٰ دینا حرام ہے ۔

امام ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں ؛ کہ شخصیت پرستی کا یہ طریقہ عین گمراہی ہے ، کسی بھی قول کو جانچنا چاہئے کہ کس لائق

---

[1] اسی کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ یوں بیان فرماتے ہیں ۔ فان احدھم یتبع امامہ مع بعد مذھبہ من الأدلۃ مقلدا لہ فیما قال کانہ نبی أرسل وھذا نأی عن الحق وبعد عن الصواب لا یرضی بہ احد من أولی الالباب ، (حجۃ اللہ ۳۲۳ ج ۱) ان مقلدین میں سے بعض کا حال تو یہ ہے کہ وہ اپنے امام کے قول کے باوجود ادلہ شرعیہ سے دور ہونے کے تقلید کرتا ہے گویا کہ وہ نبی مرسل ہے ، اور یہ بات تو حق وصواب سے دور ہے کوئی بھی عقلمند اس سے راضی نہیں ہو سکتا ۔

، قائل کے قدوقامت کو نہیں ناپنا چاہئے، کیونکہ رجال اپنے قول کی روشنی میں پہچانے جاتے ہیں، اتو ال صاحب قول کی وجہ سے
رف دمقبول نہیں، چنانچہ حارث بن حوط نے جب حضرت علی سے حجت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا خیال ہے کہ ہم حضرت طلحہ وزبیر
اللہ عنہما کے موقف کو باطل قرار دیں، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تم غلط مبحث کا شکار ہو، حق رجال کے ذریعے نہیں پہچانا
، بلکہ پہلے حق کو پہچانو پھر اہل حق کو پہچان جاؤ گے۔ (تلخیص من کتاب: تلبیس ابلیس لابن الجوزیؒ صد ۸۱—۸۲)

یہاں پر یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ عامی آدمی دلیل جانتا نہیں پھر اس کے لئے تقلید کے علاوہ چارۂ کار کیا ہے، تو اس کا جواب یہ
کہ ایسا آدمی جو دلیل و برہان کے ذریعے مسائل کو حل نہیں کرسکتا اسے ان علماء کی طرف رجوع کرنا چاہئے جو کتاب و سنت کی روشنی میں
ام و مسائل کا حل بتاتے ہیں اور وہ اس سلسلے میں مختار ہے کہ جن علماء کے بارے میں وہ چھان پھٹک کر جان چکا ہے کہ وہ اللہ اور اس
سول کی باتوں ہی کو بتاتے ہیں، ان میں سے کسی کی طرف رجوع کرے، اور ان سے اللہ و رسول کا حکم معلوم کرے کسی شخص معین کی رائے
ب، کیونکہ ہر بندہ اللہ و رسول کی اطاعت و فرمانبرداری کا مکلف ہے۔ ومن یطع اللّٰہ ورسولہ فقد فاز
زاً عظیماً۔

مروجہ تقلید اور اتباع رسول میں یہی واضح فرق ہے، اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی اطاعت و اتباع کی توفیق عطا فرمائے
علم سے بہرہ ور فرما کر اس سے فائدہ اٹھانے اور عقل کو کام میں لانے کی توفیق دے۔ آمین!

اردو میں وہابی ادب

ثوبان سعید انصاری ، ریسرچ اسکالر جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی۔

زیرِ نظر مضمون پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی ایک تصنیف " اردو میں وہابی ادب " کی تلخیص ہے۔ طوالت کے خوف سے صرف چند اشارئیے ہی دیئے جا سکے ہیں :

انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنے کے لئے انیسویں صدی میں مختلف سیاسی اور سماجی تحریکات پیدا ہو چکی تھیں، اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی تحریک مجاہدین ہے، جس کو عرف عام میں " وہابی تحریک " کہا جاتا ہے ، لیکن جسکا سرچشمہ دراصل شاہ ولی اللہ کے افکار و خیالات اور نظریات ہیں اسی لئے اسے " ولی اللّٰہی تحریک " بھی کہا جاتا ہے ۔

یہ تحریک ایک سیاسی ، سماجی ، اصلاحی ، مذہبی اور ادبی تحریک تھی ، جو پشاور سے لے کر بنگال تک اپنا اثر پیدا کیے ہوئے تھی سردست ہمیں اس تحریک کا ادبی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا مقصود ہے تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے سیاسی ، سماجی اور مذہبی خدوخال کو بھی واضح کر دیا جائے تاکہ اس کی ہمہ گیری اور عام مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکے ، کیونکہ ابھی تک اس موضوع پر کوئی ایسی تحقیقی کتاب سامنے نہیں آئی ہے جو اس تحریک کا تنقیدی اور معروضی جائزہ پیش کر سکے ، اس باب میں جو اکا دکا تصانیف ہیں وہ افراط و تفریط کا شکار ہیں ، یا تو ان کی ادبی حیثیت مشکوک ہے ۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف نظریات و خیالات اور مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد ہیں ، اس ملک کی ایک بڑی تعداد ہندو اور مسلمانوں پر مشتمل ہے ، جہاں تک ان دونوں مذاہب کے باہم ارتباط و آہنگ کا تعلق ہے تو ان کی درمیانی خلیج وسیع ہی نہیں بلکہ صریح تضاد کی حامل ہے ، چنانچہ اسلام میں اگر ایک خدا کی پرستش عین دین ہے تو ہندو مذہب میں مختلف دیوی دیوتاؤں کے تصورات ملتے ہیں ،

اسلام اگر سماجی سطح پر اخوت و مساوات پر زور دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ خدا کی نظر میں تمام انسان بلا امتیاز رنگ و نسل برابر ہیں

وہیں ہندو مذہب سماج کو مختلف ذاتوں اور طبقوں میں تقسیم کر کے اپنے مذہب کا تقدس ثابت کرنا چاہتا ہے، ہندوستان میں اسلام اور ہندو مذہب کا سابقہ تاریخ عالم کا عجیب و غریب واقعہ ہے، یہ دو متضاد نظریوں کا ٹکراؤ تھا، ظاہر ہے باہمی اختلافات اور تفرقات کی جتنی صورتیں ممکن ہو سکیں پیدا ہوئیں، تاہم جلد ہی ان دونوں نے باہمی مفاہمت پیدا کر کے اتحاد اور اختلاط کا عمل شروع کر دیا، چنانچہ ہندوؤں نے مسلمانوں سے اگر موسیقی، آرٹ، زبان و ادب کے عناصر حاصل کئے تو مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کے اثرات قبول کئے، اور ان کی زندگی میں زبردست تغیرات رونما ہوئے، اس عمل میں حکومتوں نے بھی بزور بازو اور بطریق حکمت عملی مؤثر کردار ادا کیا، نتیجتاً مسلمانوں کے اندر اپنے مذہب سے بے گانگی اور بے عملی پیدا ہو گئی، شرک و بدعت نے ان کے عقائد کو گندلا دیا اور ان کے افکار و خیالات زنگ آلود ہو گئے، اسی دوران بعض صوفیاء کرام نے اسلام اور ہندو مذہب کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی، چنانچہ شفقہ فیض (طالب حسین شاہ چشتی قادری) میں لکھا ہے کہ "دین ہندو اور دین اسلام میں در اصل فرق نہیں ہے، کیونکہ کتاب کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور خبر کو خبر تصدیق کرتی ہے۔"

یہ مقامی اثر بہار اور بنگال میں خاص طور سے نمایاں ہے (اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں وہابی تحریک سب سے زیادہ مقبول اور مؤثر ہوئی) اس کی مستند شہادت ہمیں بنگالی ادب میں ملتی ہے کہ مسلمان ادبا اور شعراء نے بالکل اسی طرز کی شاعری کی ہے، جس طرح ہندوؤں نے۔ ان کے استعارات و تشبیہات زیادہ تر ہندو معاشرت سے مستعار ہیں۔

معاشرتی حالات اس سے مختلف نہیں تھے، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا بیان ہے کہ منوہر ناتھ کے مندر میں ہندو مسلمان دونوں سر جھکاتے تھے۔ ستیہ دھرم (جو خالص ہندو عقائد پر مشتمل تھا) کے ماننے والے دونوں فرقوں کے لوگ تھے، اس کے علاوہ دیوتاؤں نے پیروں کی اور درگا پوجا نے تعزیہ داری کی شکل اختیار کر لی تھی۔ دوسرے چونکہ مسلمانوں کی تہذیب اور کلچر رو بزوال تھے، اور ہندو کلچر اور سنسکرتی بھی فرسودہ اور کہنہ ہو چلی تھی، اس لئے عین ممکن تھا کہ دونوں کسی باہمی نقطے پر مفاہمت کر لیں اور انھیں اپنا نصب العین بنا لیں، مگر اس راہ میں ہندو ذات پات کی بندش آڑے آگئی ورنہ یہ اثرات ہندوستانی سنسکرتی کی کایا پلٹ دیتے۔ خالص اسلامی نقطۂ نظر سے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے تسخیر و فتحمندی کے لئے کمند تیار کی تھی، مگر وہ خود بستۂ زنجیر ہو گیا۔

یہ تھے وہ حالات، جن کے زیر اثر مجاہدین تحریک شروع ہوئی تھی، اس کا سیاسی پس منظر اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط سے ہماری خارجی زندگی میں زبردست انقلاب ہو رہا تھا، جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط، شاہ عالم کی مظلومی، پنجاب اور سرحد کے علاقوں کا سکھوں کے زیر اثر آجانا، یہ تمام باتیں کسی بھی سیاسی تحریک کو ہوا دینے

کے لئے کافی تھیں، ظاہر ہے مجاہدین تحریک اس سے الگ کیسے رہ سکتی تھی؟

یہ تحریک اٹھارہویں صدی عیسوی میں شاہ ولی اللہ کے زیر اثر شروع ہوئی، گو یہ ایک مذہبی، سیاسی، معاشی اور ادبی تحریک تھی، لیکن بنیادی طور سے یہ ایک مذہبی تحریک تھی جو اوہام باطلہ کے خلاف صف آرا تھی مگر حالات کے پیش نظر بہت جلد سیاسی رنگ میں ڈھل گئی اور ہندوستان سے انگریزوں کو بے دخل کرنے، اقتصادی نظام میں تبدیلی لانے، مزدوروں اور کاریگروں کو ان کے صحیح حقوق دلوانے کے لئے جدوجہد اور نبرد آزمائی کرنے لگی۔

اس تحریک کی ادبی حیثیت بھی ہے (مگر افسوس کہ اس طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی) شاہ صاحب نے قرآن شریف کا فارسی میں ترجمہ کیا، قرآن کی دعوت ایسا انقلابی اقدام تھا کہ اس سے حکومت کے ایوان میں زلزلہ آگیا اور اسی کے اکسانے پر جاہل عوام اور ملا حضرات ننگی تلواریں لے کر شاہ صاحب پر ٹوٹ پڑے۔ نجف خان نے شاہ صاحب کے پہونچے اتروا دیئے تھے تاکہ کوئی مضمون یا کتاب نہ لکھ سکیں، اسی نے ان کے بیٹوں شاہ عبدالعزیز اور شاہ رفیع الدین کو اپنی قلمرو سے نکلوا دیا تھا لیکن ان سختیوں سے یہ تحریک دب نہ سکی، اور ۱۸۰۳ء میں شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ قرآن بھی مکمل ہو گیا (یہ وہی زمانہ ہے جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے اندر اردو اور ہندی کے متعدد مصنفین آسان اور سہل زبان کے لئے ہمہ تن مصروف تھے)

شاہ ولی اللہؒ کے بعد شاہ عبدالعزیزؒ نے زبان و قلم کی مدد سے اس تحریک کو آگے بڑھایا، لیکن سید احمد بریلویؒ (مت ۱۸۳۱ء) کے زمانے میں یہ تحریک اپنے نقطۂ عروج پر پہونچ گئی۔ سید احمد بریلوی نے اس کو ایک عوامی متحرک اور جہادی تحریک میں بدل دیا، اس تحریک کی راسخ الاعتقادی شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تصانیف سے ظاہر ہوتی ہے جو سید صاحب کے مشیر اور دست راست تھے۔

سید صاحب بنیادی طور سے اسلام میں ہندو عناصر کے مشمول کے خلاف تھے ان کی کوشش تھی کہ اسلام کو ہندو عناصر سے پاک کیا جائے، تاہم وہ ہندوؤں سے اتحاد کرنے اور امن سے تعاون لینے کے دل سے حامی تھے، انہوں نے مختلف راجاؤں (ہندو رائے، بدھ سنگھ) کے نام جو خطوط لکھے ہیں ان سے موصوف کے مقاصد اور ارادوں پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ لیکن رواداری ہی کا اثر ہے ہندو مذہب کے ہر طبقہ کے لوگ اس تحریک کے ساتھ تھے، اگر انہیں ان کا تعاون نہ ملتا تو شاید یہ تحریک ہگلی سے پشاور اور سرحد سے کرنول تک نہ پہونچتی، اور اسی رواداری کے باعث وہابی تحریک کی اشاعت اور اس کے فروغ میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شریک ہیں مثلاً شاہ رفیع الدین کی مشہور کتاب "تنبیہ الغافلین" کا اردو ترجمہ نرائن نے کیا ہے، مزید برآں سید احمد بریلوی نے اپنے خیالات و رجحانات کی اشاعت کے لئے ہندی اور اردو دونوں رسم الخط سے فائدہ اٹھایا تھا۔

شاہ ولی اللہؒ کے خاندان نے قرآن کے ترجمے کئے، اور قرآن فہمی کی نئی روایات قائم کیں، اس سلسلے میں شاہ عبدالقادر

خلف شاہ ولی اللہ کا اردو ترجمہ نہایت اہم ہے جو ۱۷۹۰ء میں مکمل ہوا، اس ترجمے کے مقدمے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سامنے زبان کے وہ صحیح اصول اور تبلیغی تقاضے تھے جن کے بغیر کوئی عوامی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی، فرماتے ہیں:

"اس بندۂ عاجز کو خیال آیا کہ جس طرح ہمارے بزرگوار شیخ ولی اللہ ابن عبدالرحیم محدث دہلوی فارسی ترجمہ کر گئے ہیں سہل و آسان۔ اب ہندی زبان میں قرآن شریف کو ترجمہ کرے، الحمدللہ کہ ۱۲۰۵ھ میں موقع میسر ہوا۔ اس کتاب کا نام موضح القرآن ہے اور یہی اس کی صفت ہے۔ اور اس کی تاریخ ہے، اس میں زبان ریختہ نہیں بولی بلکہ ہندی متعارف ہے تاکہ عوام کو بے تکلف دریافت ہو۔"

وہابی تحریک کو اس بات کا افسوس تھا کہ مذہب صرف چند بدعتوں کا نام رہ گیا ہے، اسی لئے انہوں نے قرآن کو اردو کے لباس میں پیش کیا تاکہ اس کی تفہیم آسان ہو جائے، اور لوگ غیر اسلامی شعار کو ترک کر دیں، اس سلسلے میں " ہدایۃ المسلمین " بڑی اہم کتاب ہے، اس کے علاوہ ایک رسالہ " نصیحۃ المسلمین " کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں، اس میں لکھا ہے کہ " اس رسالہ کو ہندی میں آسان کر کے لکھا تاکہ جلد سمجھنے کے لئے آیت اور حدیث کا ترجمہ محاورے ہندی کے کیا کہ سب بے چارے ناواقفوں کو فائدہ ہو۔"

اس ضمن میں شاہ اسمٰعیل شہید کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے، انہوں نے ایک مثنوی بھی " سلک نور " کے نام سے تحریر کی ہے، اس کی زبان بھی سادہ، سہل اور عام فہم ہے ؎

الٰہی تیرا نام کیا خوب ہے — کہ ہر جان کو وہی مطلوب ہے
زباں کس طرح حمد تیری کرے — کہ ہے تو تو ادراک ہی سے پرے
ہمیں بس یہی تیرا ادراک ہے — کہ بے شک تو ہر عیب سے پاک ہے

اس وہابی لٹریچر میں (جس کا اجمالی ذکر ہم نے کیا) چنداں ادبی محاسن نہیں، تاہم اردو نثر کی تاریخ میں اس کی اہمیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

وہابی مصنفین اور اہل قلم نے اردو نثر کے پر تکلف اسلوب کو بدل دیا، اور نثر نہایت صاف سادہ اور تکلف سے معرا ہو گئی۔ اس کے لکھنے والے عوامی اور عمومی ابلاغ کے قائل تھے، ان کا خطاب براہ راست عوام سے اور حقائق نفس الامری پر مبنی ہوتا تھا نتیجتاً ڈھاکہ سے پشاور اور پونا سے پٹنہ تک ان کی آواز عوام تک پہونچ گئی، ان کی تصانیف سے طباعت و اشاعت میں بھی ترقی ہوئی جو اس عہد کے لئے ایک اہم اور نیک فال تھی۔ " تقویۃ الایمان " (شاہ اسماعیل شہیدؒ) بیسیوں مرتبہ شائع ہوئی، اور یہ شرف

اردو میں کسی اور کتاب کو حاصل نہیں ہوا ۔

عام مؤرخین نے وہابی ادب پر بہت کم توجہ کی ہے، حالانکہ اس وقت بھی ان کا اسلوب خاصا مقبول تھا، اسی لئے ان کی سرحدیں مستقبل سے ملتی ہیں، بعض لوگوں کا گمان ہے کہ عوام تک پہنچانے کے لئے سادہ وآسان طرز کی ابتدا سرسید نے کی، تاریخی اعتبار سے صحیح نہیں، وہابی ادب کو موجودہ اردو نثر کے ارتقاء میں ایک اہم مقام حاصل ہے، اگر وہ نہ ہوتا تو دہلی کالج اور سرسید کی تصانیف کا رنگ شاید کچھ اور ہوتا ۔

اس میں شک نہیں کہ شاہ ولی اللہؒ سے شاہ اسماعیل تک کے علماء کی بدولت اردو نثر میں گرانقدر اضافے اور ترجمے ہوئے، حالانکہ ان کی کتابیں مذہبی اور اصلاحی تھیں مگر عوامی ضرورت کے پیش نظر سہل اور آسان لکھی گئیں، جس سے اردو نثر کو تقویت پہونچی اور اس طرح جدید نثر کے لئے راہ ہموار ہوگئی ۔

اس تحریک نے وہ آزادی جرأت اور بے باکی پیدا کی جو اس سے قبل اردو میں ناپید تھی، جس طرح شاہ اسماعیلؒ نے مذہب اور معاشرے میں تقلید کے خلاف آواز بلند کی، اسی آزادی سے مرزا غالب نے فن لغت اور فن شعر میں بڑے بڑے اساتذہ پر نکتہ چینی کی، اور پرانے اصنام خیالی کو توڑ ڈالا، مولانا حالی نے بھی اعتراف کیا ہے کہ سرسید کے یہاں جو آزادی اور جرأت گفتار ہے، ان کا سرچشمہ بھی شاہ اسماعیلؒ کی تحریریں اور تقریریں ہیں، مومن کے یہاں بھی وہابی تحریک کے اثرات صاف نمایاں ہیں ۔

یہ صحیح ہے کہ ادبی اعتبار سے یہ کاوشیں زیادہ وقیع نہیں اور نہ ہی اس میں وہ فنی خوبیاں ہیں جو اسے حلقۂ شام وسحر سے نکال کر جاوداں بنادیں، مگر ہمیں اس کا مطالعہ اس مقصد کی طرف دعوت دیتا ہے کہ ایسے وقت میں جب اردو نثر تکلفات اور تصنعات سے گراں بار تھی، اس نے صفائی، سادگی اور صراحت کی ایک نئی بنیاد قائم کی، ایک نیم سیاسی اور نیم ادبی تحریک کے لئے اس سے بڑی فضیلت اور کیا ہوسکتی ہے ؟ ۔

اسلام میں گھروں کی نظافت کے آداب

ترجمہ: امتیاز احمد سلفی

رہائش گاہ یا مکان انسان کو طبعی عوارض سے محفوظ رکھتا ہے اور اس کو اس کے اندر رہ کر معاشرے کی بہت سی قید بندیوں سے آزادی اور اپنے تحفظ کا احساس ہوتا ہے، جسم و روح کو تسکین اور فرحت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں فرمایا گیا:

واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا (النحل ۸۰) اور خدا ہی نے تمھارے لیے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کشادہ مکان پسند تھا، وہ اسے دنیاوی سعادت مندی کا ذریعہ تصور فرماتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا: وربع من السعادۃ: المرأۃ الصالحۃ، والمسکن الواسع، والجار الصالح والمرکب الھنی۔ چار چیزوں میں سعادت اور بھلائی مضمر ہے: نیک بیوی، کشادہ مکان، نیک پڑوسی اور آرام دہ سواری۔ اسی طرح آپ یہ دعا اکثر ورد فرمایا کرتے تھے: اللھم اغفر لی ذنبی ووسع لی فی داری وبارک لی فی رزقی۔ "پروردگار میری مغفرت فرما، کشادہ مکان عطا کر اور رزق میں برکت دے۔" آپ سے پوچھا گیا، اس دعا کے کثرت ورد کی کیا وجہ ہے، آپؐ نے فرمایا، اس سے بھی جامع کوئی دعا ہو سکتی ہے۔

نبیؐ نے گھریلو مکانات کی نظافت پر کافی زور دیا ہے، تاکہ پاکیزگی اسلام کا ایک شعار اور مسلم اور غیر مسلم میں مابہ الامتیاز ہو۔ جن لوگوں نے اسلام کے ساتھ یہ بدگمانی قائم کی کہ گندے اور میلے کچیلے رہنا تقرب الی اللہ کا ذریعہ ہے اس تصور نے ان کو مکانات کی صفائی ستھرائی سے لاپرواہ بنا دیا، حالانکہ یہ نظریہ اسلامی تعلیم کے برعکس ہے۔

رسول اکرمؐ نے فرمایا: ان اللہ طیب یحب الطیب، نظیف یحب النظافۃ، کریم یحب الکرم جواد یحب الجود فنظفوا افنیتکم ولا تشبھوا بالیھود۔ اللہ پاکباز ہے پاکیزگی کو پسند فرماتا ہے، طاہر ہے اسے طہارت پسند ہے۔

شریف ہے، شرافت پسند ہے، سخی ہے، سخاوت میں اس کی رضا ہے تو لوگو اپنے گھر کے اندر باہر ہر حصے کو صاف ستھرا رکھو اور یہودیوں جیسے نہ بنو۔ معلوم ہوا کہ گھروں کو خوبصورت بنانا، اسے رنگین کرنا اور حلال چیزوں سے مزین کرنا درست ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔ (اعراف: ۳۲)

پوچھو تو کہ جو زینت (و آرائش) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں خدا نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، ان کو حرام کس نے کیا ہے؟

بلاشبہ مکان، لباس، جوتا اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کے استعمال میں خوبصورتی کو پسند کرنا بہتر ہے، بشرطیکہ ان کے استعمال سے تکبر کا شائبہ نہ پیدا ہو۔ آپؐ نے فرمایا:

لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِّنْ كِبْرٍ۔

جس میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ صحابۂ کرام میں سے ایک شخص نے عرض کیا،

صحابۂ کرام میں سے ایک شخص نے عرض کیا، اللہ کے رسول! انسان لباس و جوتا وغیرہ کے استعمال میں فطرۃً باذوق اور حسن پسند واقع ہوا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ان اللہ جمیل یحب الجمال « اللہ تعالیٰ کی ذات جمیل ہے اور وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں یوں ہے کہ ایک اچھی شکل و صورت کا آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا حضور میں حسین و جمیل بنایا گیا ہوں اور اس کا کچھ حصہ مجھے عطا بھی کیا گیا ہے، مجھے اتنا گوارا نہیں کہ کوئی مجھ سے جوتا کے تسمہ برابر بھی فوقیت رکھتا ہو تو کیا اس طرح کا خیال تکبر میں داخل ہے؟ (آپ نے فرمایا) نہیں بلکہ تکبر یہ ہے کہ آدمی حق بات جاننے کے باوجود اسے قبول کرنے سے اعراض کرے اور بہ مصداق "ہم چوں دیگرے نیست" اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہ لائے، یعنی زرق برق لباس سے تم متکبر نہیں شمار کیے جاؤ گے۔ بلکہ دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جس طرح خوبصورت پیدا فرمایا ہے، اسی طرح خوب سیرت بھی بنادے۔

اسلام اعتدال پسند ہے، کسی چیز میں غلو اس کے نزدیک ناجائز ہے۔ مکان کی زیب و زینت میں حد سے زیادہ اسراف کرنا اور آرام و آرائش میں راہِ اعتدال سے تجاوز نبی امی کو سخت ناپسند کرنے والی ہے اور قرآن نے بھی اس سے منع فرمایا ہے۔ نیز رہائش گاہ کو بت پرستی کے شعار سے پاک رکھنا چاہیے، کیونکہ اسلام نے بت پرستی کے نام و نشان

کو مٹا دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے ۔ راہِ اعتدال سے متعلق تعلیم ربانی ملاحظہ ہو :

ولا تجعل یدك مغلولة الى عنقك اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ)
ولا تبسطها کل البسط فتقعد ملوما کرلو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ بالکل کھول دو (کہ سبھی کچھ
محسوراً دے ڈالو، اور انجام یہ ہو کہ ملامت زدہ اور ماندہ ہو کر
... ... بیٹھ جاؤ۔

یعنی حد سے زیادہ بخل سے کام لینا خود کو ہلاک کرنا ہے اور عام لوگوں کے نزدیک بھی یہ چیز موجب طعن وتشنیع اور رسوائی کا ذریعہ ہے ، اور اپنے اہل وعیال کے اخراجات میں اسراف اور نوع بنوع سامانِ تعیش میں بیجا خرچ سے انسان کے اندر نفع ونقصان کی تمیز معدوم ہوجاتی ہے اور ہر قسم کی خواہشات کی تکمیل ، بلند و بالا محلات کی تعمیر اور سیم وزر میں پانی کی طرح روپیہ بہاتا ہے ۔ بالآخر فقر وفاقہ اور مفلسی تک نوبت آجاتی ہے اور ہائے افسوس کا ورد کرنے پر انسان مجبور ہوجاتا ہے ۔ مگر حسرت وافسوس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا ۔ ہر دو صورت میں خواہ انسان حد سے زیادہ بخل سے کام لے ، یا بے پناہ اسراف وتبذیر کو اپنائے ، نفس کو ہلاکت میں مبتلا کرتا ہے ۔

اسی وجہ سے اسلام نے سونا چاندی کا برتن ، اور ایک مسلمان کے گھر میں خالص ریشمی بستر کا استعمال حرام قرار دیا ، اور اس کے استعمال کرنے والے کو سخت وعید سے ڈرایا دھمکایا ہے ۔

مسلم شریف میں بروایت اُمّ سلمہ مروی ہے ، رسولِ خدا نے فرمایا: ان الذی یاکل ویشرب فی آنیة الذهب والفضة انما یجرج فی بطنه نار جهنم ۔ سونے اور چاندی کے برتن میں کھانا پینا ایسا ہی ہے ، جیسے کوئی اپنا شکم جہنم کی آگ سے بھر لے ۔

بخاری میں حضرت حذیفہؓ سے ایک دوسری روایت میں یوں بیان کیا گیا: نهانا رسول اللهؐ ان نشرب فی آنیة الذهب والفضة وأن ناکل فیها وأن نلبس الحریر والدیباج وأن نجلس علیه وقال: هو لهم فی الدنیا ولنا فی الآخرة۔ رسول اللہ نے ہمیں سونے چاندی کے برتن میں کھانے پینے اور ریشمی لباس استعمال کرنے اور اس پر اٹھنے بیٹھنے ، سونے سے منع فرمایا اور کہا ، ان سب کا استعمال دنیا میں کافروں کے لیے ہے اور مسلمانوں کے لیے جنت میں ۔

اسی طرح اسلام نے مکانات میں تصاویر ، مجسمے اور فوٹو کا استعمال بھی حرام قرار دیا ہے اور علت یہ بتائی کہ ان چیزوں

گھر میں رہنے سے فرشتے اس سے دور رہتے ہیں، فرمایا: إن الملئكة لا تدخل بيتاً فيه تماثيل۔

موجودہ دور میں کچھ ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو مرنے والوں کی حد سے زیادہ تعظیم و تکریم میں ان کا مجسمہ بنا کر بطور یادگار اپنے گھروں کو مزین کرتے ہیں اور یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ ان بزرگوں نے تاریخ کے صفحات کو اپنے کارناموں سے تابناک اور درخشاں بنایا تو یہ کتنی دغابازی ان کے ساتھ ہے کہ ہم ان کا مجسمہ بھی نہ بنائیں، اس مقصد کے تحت کہ آنیوالی نسل ان کے روشن کارناموں کو مشعل راہ بنائے اور ان کے صحیح مقام و مرتبے کو پہچان سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب اسلام نے شخصیت پرستی اور انسانیت کی بیجا تعظیم و تکریم سے امت کو منع فرمایا ہے، خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ، وہ اگرچہ مقام و مرتبے کے اعتبار سے ان کی رسائی اوجِ کمال تک کیوں نہ ہو۔ خود حضرت محمد ﷺ نے جو بحیثیت رسول و نبی مبعوث کیے گئے، یہ فرما کر شخصیت پرستی سے باز رکھا: لا تطروني كما أطرت النصارى عيسى ابن مريم ولكن قولوا عبد الله ورسوله۔ میری تعریف میں کسی قسم کی بیجا آمیزش نہ کرو جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کے ساتھ کیا کہ (ان کو خدا کا بیٹا قرار دیا) بلکہ مجھے صرف اللہ کا بندہ اور رسول کہا کرو۔

صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کی تعظیم و تکریم میں کھڑے ہونا چاہتے تھے تو آپ نے ان کو روک دیا اور فرمایا: لا تقوموا كما تقوم الأعاجم بعضها بعضاً — غیر عربوں (روم و فارس وغیرہ) کی طرح میری تعظیم میں کھڑے نہ ہوا کرو۔

نبی اکرم ﷺ نے امت کو وفات کے بعد بھی اپنی شان میں غلو سے منع فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہے: لا تجعلوا قبري عيداً — میری قبر کو زیارت گاہ نہ بنانا۔ اور اس سے بچنے کے لیے آپ نے دعا بھی فرمائی: اللهم لا تجعل قبري وثنا يعبد —— پروردگار! میری قبر کو بت پرستی سے محفوظ رکھنا۔

آپ کی خدمت میں چند لوگ حاضر ہوئے اور کہا اے ہمارے سب سے بہتر شخص! سب سے بہتر کے صاحبزادے! اور اے سردار صاحبزادۂ سردار! آپ نے فرمایا: لوگو! مجھے زیادہ بھاری بھرکم الفاظ سے نہ نوازو، دیکھنا کہیں تم کو شیطان گمراہ نہ کردے۔ میں تو محض اللہ کا بندہ اور اسی کا پیغمبر ہوں، مجھے یہ پسند نہیں کہ تم لوگ مجھے میرے مرتبے سے بڑھا چڑھا کر بڑے بڑے القاب فاخرہ سے پکارو۔

انسان کی توقیر کے باب میں اسلام کی یہی تعلیم ہے۔ اسلام تو یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ مرنے کے بعد کسی کی قبر پر اینٹ یا پتھر صرف علامت کے لیے ہی یہی رکھا جائے کہ مستقبل میں اسے کسی پیر، ولی کا ڈھونگ رچا کر قبر کی شکل دینے میں مداہنت کا

ہزاروں، لاکھوں روپیہ برباد کیا جائے گا اور لوگوں کا ہجوم اکٹھا کرنے کے لیے عرس و میلہ لگایا جائے۔ حقیقی اور دائمی زندگی مومنوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت میں متعین فرمادی ہے جو اپنے بندے کے نیک و بد ظاہری و باطنی ہر اعمال سے واقف ہے۔ ایسے بزرگان و صلحاء نہ معلوم کتنے اللہ تعالیٰ کے دفتر میں نامزد ہوں گے، جن کا نام ابدالآباد تک ثبت کر دیا گیا ہے اور جو لوگوں کی نظروں سے اوجھل اور مخفی رہے۔ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ایسے ہی لوگوں کو پذیرائی نصیب ہوتی ہے جو زندہ رہ کر بھی نام و نمود اور ریاکاری سے بچ بچا کر گمنامی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

نہ معلوم کتنے مجسمے اور تصویریں ایسی ہیں جنھیں دنیا میں زندہ جاوید ثابت کرنے کے لیے عالی شان مقبروں اور قبوں میں سجایا گیا ہے۔ حالانکہ قیامت کے دن ندا دینے والا پکار دے گا۔

خذوہ فغلوہ ثُمَّ الجحیم صلوہ فی سلسلۃ ذرعها سبعون ذراعاً فاسلکوہ انہ کان لا یؤمن باللہ العظیم ولا یحض علیٰ طعام المسکین فلیس لہُ الیومَ ھٰھُنا حمیم ولا طعامٌ الا من غسلین لا یاکلہ الا الخاطئون (الحاقہ: ۳۰-۳۷)

(حکم ہوگا کر) اسے پکڑلو اور طوق پہنادو، پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دو، پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے جکڑ دو، یہ نہ تو خدائے جل شانہ پر ایمان لایا تھا اور نہ فقیر کو کھانا کھلانے پر آمادہ کرتا تھا، سو آج اس کا بھی یہاں کوئی دوست دار نہیں، اور نہ پیپ کے سوا اس کے لیے کھانا ہے۔

الم تر کیف فعل ربک بعاد، ارم ذات العماد، التی لم یخلق مثلها فی البلاد وثمود الذین جابوا الصخر بالواد، وفرعون ذی الاوتاد، الذین طغوا فی البلاد فاکثروا فیها الفساد فصب علیهم ربک سوط عذاب، ان ربک لبالمرصاد،

(الفجر: ۶-۱۴)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمھارے پروردگار نے عاد کے ساتھ کیا کیا (جو) ارم (کہلاتے تھے اتنے) دراز قد کہ تمام ملک میں ایسے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اور ثمود کے ساتھ (کیا کیا) جو وادی (قریٰ) میں پتھر تراشتے (اور گھر بناتے) تھے، اور فرعون کے ساتھ (کیا کیا) جو خیمے اور میخیں رکھتا تھا، یہ لوگ ملکوں میں سرکش ہو رہے تھے اور ان میں بہت سی خرابیاں کرتے تھے تو تمھارے پروردگار نے ان پر عذاب کا کوڑا نازل کیا، بیشک تمھارا پروردگار تاک میں ہے۔

اسلام کے نزدیک زندۂ جاوید رہنے کے لیے پسندیدہ اور واحد راستہ یہ ہے کہ عمل میں اخلاص اور صدق نیت ہو زبان و دل کے عمل میں یگانگت ہو اور عمل خیر کا ذخیرہ ہو۔ اخلاف کے لیے کارنامے چھوڑ جانا ہی دائمی یادگار کا ذریعہ ہے۔

رسول خدا، خلفاء راشدین، قائدین اسلام اور ائمۂ عظام کسی مادی چیز یا پتھر کے مجسموں کے ذریعہ حیات جاودانی کے قائل نہ تھے، بلکہ ان کے فضائل و مناقب اعمال و کردار تھے جسے اخلاف نے اپنے اسلاف سے سیکھا، سینہ میں محفوظ رکھا، زبان کو ان کی یاد سے تر و تازہ کیا اور کتابوں میں مدون کیا، جس سے محفلیں زعفران زار ہوتی تھیں اور دل و دماغ بغیر کسی ظاہری شکل و صورت کے معطر رہا کرتے تھے۔

ہاں آجکل جو تصویریں گڑیوں کی شکل میں رہتی ہیں جو بچوں کے بہلانے پھسلانے اور لہو و لعب کا ایک بہترین ذریعہ ہیں، ان کا مقصد اس کے سوا کچھ پیش نظر نہیں ہوتا۔ ان کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ ایک طرح سے ان کی تحقیر ہوتی ہے، چہ جائیکہ کسی قسم کی تکریم کا پہلو نمایاں ہو۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرمؐ حضرت عائشہ کے پاس تشریف لائے، یہ ابتدائی زمانہ تھا جب آپ ان کو بیاہ کر لائے تھے، وہ ابھی گڑیا کھیلا کرتی تھیں۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا: عائشہ یہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا یہ میری بچیاں ہیں، آپؐ نے دوبارہ پوچھا: سب کے بیچ میں کیا ہے تو جواب ملا یہ گھوڑا ہے۔ آپؐ نے پھر سوال کیا: اس پر کیا چیز ہے تو بتایا کہ اس کے دو بازو ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ایسا گھوڑا کہاں ہوتا ہے، جس کے پر بھی ہوں۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا: آپ کو معلوم نہیں کہ حضرت سلیمانؑ کے گھوڑے پروالے ہی ہوا کرتے تھے۔ یہ جواب سن کر نبی کریمؐ کھلکھلا اٹھے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کو گڑیا، گھوڑا، بلی، بطخ اور دوسرے جانور جو کھلونوں کی شکل میں ملتے ہیں، دیا جا سکتا ہے۔

(مجلۃ العباد، بیروت، شمارہ ۱۸۵ ذی الحجہ ۱۴۰۶ھ)

ماسٹر نثار احمد انصاری

کی وفات سے قوم و ملت کی ہمہ جہت سرگرمیوں میں عظیم خلا محسوس کیا جائیگا

جامعہ عالیہ عربیہ مئو میں ۲۳ راپریل ۱۹۹۱ء بروز منگل بعد نماز عشاء ۹ بجے رات جناب ماسٹر نثار احمد صاحب مرحوم ناظم جامعہ عالیہ عربیہ کے ناگہانی وفات حسرت آیات پر ایک تعزیتی اجلاس منعقد ہوا جس میں جامعہ عالیہ عربیہ کے عہدیداران و ممبران اور اساتذہ، عالیہ گرلس ہائی اسکول کے عہدیداران و ممبران شریک ہوئے، اور باتفاق رائے مندرجہ ذیل تجویز تعزیت منظور ہوئی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آہ کس قدر المناک ہے یہ سانحہ اور کتنا صبر شکن ہے یہ ناگہانی حادثہ کہ ۱۹ر۲۰ راپریل ۹۱ء کی درمیانی شب میں تقریباً ۴ بجے جبکہ طائران خوش الحان کل من علیھا فان سے کائنات کو بیدار کرتے ہیں، اسی وقت قوم و جماعت کے درد آشنا اور عظیم محسن تقریباً ۵۵ رسال کی عمر میں ہمیشہ کے لئے سو گئے، ماسٹر نثار احمد انصاری صاحب ناظم جامعہ عالیہ عربیہ و مدرسہ عالیہ نسواں و رکن عالیہ گرلس ہائی اسکول و جنرل سکریٹری عالیہ ایجوکیشنل سوسائٹی مئو صرف دو گھنٹہ دورۂ قلب کے شدید حملہ کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

۲۰ راپریل کو ہزاروں ہزار سوگواروں نے تدفین میں شرکت کی، مولانا عبدالحکیم فیضی استاذ جامعہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور ۲ بجے دن میں اپنے آبائی قبرستان مدنپورہ میں قوم و جماعت کا گوہر گراں مایہ سپرد خاک ہو گیا۔

اب ہم لرزتے قلم اور کانپتے ہوئے ہاتھ سے ماسٹر صاحب کو مرحوم و مغفور لکھنے پر مجبور ہیں، وقت سحر یہ خبر کیا تھی، ایک بجلی کا کڑکا تھا جس نے مئو اطراف مئو کو حواس باختہ و حیران و پریشان کر دیا، خبر ہی ایسی حیرت انگیز تھی کہ ماسٹر صاحب ابھی آج عشاء کی نماز میں موجود تھے اور اس کے بعد بھی بعض امور کے لئے آتے جاتے نظر آئے، کوئی غیر معمولی اثر بھی ان کے اندر دیکھنے میں نہ آیا اور ایسا شخص اچانک وفات پا گیا، انسانی فطرت کیلئے ایسے حالات حیرت انگیز ہوا کرتے ہیں مگر اس میں کوئی حیرت کی بات اہل بصیرت کے نزدیک نہیں ہونی چاہئے، حضرت ابوبکر صدیق اکثر ایک شعر

پڑھا کرتے تھے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہر شخص اپنے اہل عیال میں شادماں صبح وشام کرتا ہے، اور اس کی موت جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ قریب ہے۔

مرحوم ماسٹر نثار احمد صاحب عنفوان شباب ہی سے مختلف ادبی اور سماجی تنظیموں میں صرف حصہ ہی نہیں لیتے تھے بلکہ ان کی سربراہی کرتے رہے، ذہن رسا تھا، بڑی بڑی ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہ کر کسی اجتماعی ادارہ کو کامیابی سے چلانے کا بھرپور تجربہ قدرت نے ودیعت کیا اس تجربہ سے قدرت خداوندی کو ایک مقدس کام لینا مقصود تھا۔

۱۹۷۰ء میں مدرسہ کے سابق ناظم مولانا عبدالاحد صاحب مرحوم اپنی کبر سنی اور ضعف کی وجہ سے تقریباً بیالیس سال نظامت کرنیکے بعد سبکدوش ہو گئے، اس وقت ہر شخص سوالیہ نشان بنا ہوا تھا کہ اب کون اس بار عظیم کا متحمل ہوتا ہے، علماء اور کہن رسیدہ بزرگوں کے ہوتے ہوئے ایک جواں سال فرد پر ہر ایک کی نظر مرکوز ہو گئی اور ماسٹر نثار احمد مرحوم ۲۵ رنومبر ۱۹۷۰ء کو نظامت کے عظیم منصب کے لئے منتخب کئے گئے، اسوقت سے اب تک ہر سالہ انتخاب میں روز افزوں مقبولیت کے ساتھ منتخب ہوتے رہے، یہ مرحوم کی نظامت کا اٹھارہواں سال ہے، ہم اٹھارہ سال قبل کے جامعہ عالیہ اور نسواں اسکول کے کیف وکم کا موازنہ آج کے کیف وکم سے کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ سو سال میں ادارہ میں تعلیمی وتعمیری اور ہر میدان میں جتنا کام ہوا اس سے کہیں زیادہ صرف اٹھارہ سال میں ہو گیا، گویا ایک صدی تک تدریجی رفتار سے چلتے چلتے انتظامیہ کے حوصلہ مند قدم نے جست لگا دی اور تمام ترقیوں کا سہرا اول نمبر پر مرحوم ماسٹر نثار احمد صاحب کے سر ہے، ان کی قوت کارکردگی، ذہنی وسعت کے شاہین کو اخلاص ونیک دلی کے بازو نے کہاں سے کہاں تک پہونچا دیا۔ اور رفقاء کار بھی قابل ستائش ہیں کہ مرحوم کے مجوزہ پروگراموں کی بھرپور تائید کے ساتھ ساتھ حرکت وعمل میں برابر کے شریک رہے۔ اللہ کے اس مخلص بندہ پر بے پایاں رحمتیں نازل ہوں کہ اس کی دور اندیشی اور مستقبل شناسی کے سبب جامعہ عالیہ عربیہ کی ملکیت میں تین مقامات پر وسیع وعریض زمین ہے، اور جامعہ عالیہ عربیہ اور عالیہ گرلس ہائی اسکول دونوں منزلوں کی تکمیل کی سعادت آپ ہی کے دور نظامت میں حاصل ہوئی، لائبریری وکتب سے مرحوم کو خاص دلچسپی تھی، اور موجودہ لائبریری ہال جو اس شہر کا سب سے وسیع اور جاذب نظر ہال ہے یہ مرحوم کے پاکیزہ ذوق کی نشاندہی کر رہا ہے۔

ہمہ جہت کارہائے نمایاں کی طویل فہرست کا ذکر ایک طویل مقالہ چاہتا ہے، اس غمزدہ اور سوگوار مجلس میں اسی خراج عقیدت پر اکتفا کرتے ہوئے اللہ رب العزت سے دعاء ہے کہ مرحوم کی خدمات دینی کو قبول فرما کر ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے، ان کے پسماندگان کے زخمی دلوں پر صبر جمیل کا مرہم رکھ دے ان سب کی دستگیری فرمائے، مرحوم کے محبوب کارہائے خیر کو تکمیل تک پہونچانے کے لئے ہم سب کو توفیق عطا کرے، آمین! یارب العالمین۔

منجانب

اراکین جامعہ عالیہ عربیہ و عالیہ گرلس ہائی اسکول، مئوناتھ بھنجن، الہند

ہماری نظر میں

نام کتاب :	زیورات میں زکوٰۃ
مؤلف :	مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب فیضی حفظہ اللہ
صفحات :	ایک سو بارہ (۱۱۲)
ناشر :	فیض عام اکیڈمی، مئوناتھ بھنجن
ملنے کا پتہ :	جامعہ فیض عام مئوناتھ بھنجن، یوپی ،

اس حقیقت سے کسی مسلمان شخص کو مجال انکار نہیں کہ زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے ، اور ان پانچ ستونوں میں سے ایک ہے جن پر اسلام کی عمارت قائم ہے ، اسی لئے اس کا منکر کافر ہے اور اس کی ادائیگی میں کاہلی موجب وعید شدید ہے ۔

اموال زکویہ میں سے سونا اور چاندی کی معدنیات بھی ہے ، یہ جس شکل میں بھی موجود ہو، باتفاق علماء امت ان میں زکوٰۃ فرض ہے ۔ اسی طرح ان کے زیورات جو شرعًا ناجائز یا استعمال کے لئے بنائے گئے ہوں زکوٰۃ فرض ہے ، زیر تبصرہ کتاب کا موضوع یہی ہے ۔

عورتوں کے لئے مباح و مستعمل زیورات کے بارے میں عمومًا علماء کے دو مذاہب ہیں ، ایک جماعت ان زیورات میں وجوب زکوٰۃ کی قائل ہے جب کہ دوسری جماعت سرے سے زکوٰۃ کی قائل ہی نہیں یا اگر قائل ہے تو صرف ایک مرتبہ نہ کہ ہر سال ۔ اس سلسلہ میں صحابہ و تابعین ہی کے دور سے اختلاف چلا آرہا ہے

مؤلف موصوف نے مذکورہ دونوں جماعتوں کے دلائل کا جائزہ لینے اور حق و صواب کی ترجیح و تحقیق کی کامیاب کوشش کی ہے اور نہایت عمدہ ڈھنگ سے تقابلی مطالعہ کر کے اس مسئلہ پر محققانہ سیر حاصل بحث کی ، اور دلائل و براہین فراہم کر کے حسن ترتیب سے اہل علم کی خدمت میں پیش کیا ہے ۔

قرآن کریم اور بعض حدیث کے عمومی دلائل و نصوص سے استعمال ہونے والے زر و سیم کے زیورات میں زکوٰۃ کی فرضیت کے ساتھ

ساتھ متعدد علماء کے اقوال کی تائید کا تفصیلی جائزہ لیا ہے ۔

پھر متعدد احادیث نبویہ صحیحہ کے ذریعہ عمومی دلائل اور نصوص خاصہ سے بھی استدلال کرکے ہر حدیث پر محدثین کے اقوال کی تصریحات یا بصورت دیگر عائد ہونے والے نقد واعتراض کی تردید کا شافی جواب موجود ہے ، ساتھ ہی ان احادیث کے رواۃ کی ثقاہت پر تبصرہ ، اور روایت کی صحت میں فن علماء حدیث کے اقوال سے تائید حاصل کی گئی ہے ۔

غرض محدثانہ اسلوب وطریقہ سے مسئلہ کی وضاحت کرکے آثار صحابہ وتابعین اور سلف صالحین کے اقوال سے بھی خوب خوب موضوع کو منقح اور مزین کیا گیا ہے ۔

اس سلسلہ میں عدم وجوب زکوٰۃ پر قیاسی موشگافی پر رد وقدح کی جانب بھی توجہ مبذول ہوئی ہے ، مؤلف کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ مباح ومستعمل زیورات میں زکوٰۃ واجب ہے اور یہی اکابر علماء اہل حدیث کا بھی مسلک ہے ۔

کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے شروحات احادیث کا ایک دفتر موجود ہے ، کتاب یقیناً علماء اور طلباء کے لئے ایک بیش بہا تحفہ اور اسلامی مکتبات میں اہم اضافہ ہے ۔

استاذ گرامی مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی حفظہ اللہ علمی وتحقیقی دنیا میں معروف ومشہور ہیں ، آپ نے زیر نظر کتاب میں مسئلہ کا حق تحقیق ادا کردیا ، موصوف کا یہ عمل قابل صد مبارکباد اور لائق تحسین ہیں ، اور اہل علم کی تہنیت کے بجا طور پر مستحق ہیں ، دعاء ہے کہ اللہ رب العزت مؤلف کی اس علمی وتحقیقی کوشش کو قبول عام فرمائے ، اور طالبان علوم دینیہ کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے ۔

یہ کتاب جامعہ فیض عام کے شعبۂ تالیف وترجمہ فیض عام اکیڈمی کی مطبوعات میں سے ایک ہے ، اس سے پہلے بھی اکیڈمی نے مؤلف مذکور کی بعض دیگر تصنیفات کو شائع کرکے اہل علم سے داد تحسین حاصل کرچکی ہے ۔

(اِمتیاز احمد سَلفی)

ماہنامہ — بنارس

شمارہ ۸ • اگست سنہ ۱۹۹۱ء | محرم سنہ ۱۴۱۲ھ • جلد ۹

اس شمارہ میں

مدیر

عبدالوہاب حجازی

پتہ

دارالتالیف والترجمہ

بی ۱۸/۱ جی ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰

بدل اشتراک

سالانہ ۴۵ روپے • فی پرچہ ۴ روپے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ

کی مدت خریداری ختم ہو چکی

افتتاحیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حالیہ الیکشن میں ملّی انتشار کے خوفناک مظاہر

حالیہ انتخابات میں خصوصیت سے یوپی کے اندر غیر مسلم اقوام کے سامنے یہ بات کھل کر آگئی کہ مسلمانوں میں دینی وملی اعتبار سے کوئی ایسی قوت باقی نہیں رہی جو انہیں اکٹھا رکھ سکے، انتخابات کے تقریبا تمام حلقوں میں ایک کے مقابل دو دو مسلمان سیاسی رہنما کھڑے ہوئے اور انہوں نے مسلم عوام کو دو ٹکڑیوں میں بانٹ کر وہ میدان حشر بپا کیا کہ غیر مسلم اقوام کو بھی یہ کہنا پڑا:

ع یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

سب سے شرمناک بات یہ تھی کہ افتراق وانشقاق کی اس عظیم معصیت کی تائید میں ہر جانب سے مقتدر علماء کے فتاوے حاصل کرکے مسلم عوام کے درمیان اسکڈ اور پیٹریاٹ میزائیلوں کی طرح داغا جارہا تھا، ان سب باتوں سے متأثر ہوکر خود مسلم عوام کے درمیان ایک دوسرے کی تکفیر کا بازار گرم تھا، ہمارے قریہ سے متصل ایک بستی کی ایک مجلس میں میرے سر کے ان کانوں نے ایک شخص کی زبان سے یہ سنا کہ: علماء جو ہمارے رہنما ہیں سب کافر ہیں، اس موقعہ پر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ایک واقعہ خصوصیت سے یاد آیا جب ایک شخص نے آپؐ کی تقسیم پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا: "یا محمد اعدل فانك لم تعدل" اے محمد عدل وانصاف برتو یقیناً تم نے عدل وانصاف نہیں برتا" جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا تھا: "لقد خبت وخسرت ان لم اعدل" اگر میں نے عدل وانصاف نہیں برتا تو تم یقیناً خائب وخاسر ہوگئے" اپنے ظن، ہوا وہوس اور خواہشات نفس کو معیار قرار دے کر جب صاحب سنت یا سنت پر اعتراض کیا جاتا ہے تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے۔ علماء کی رہنمائیاں اگر کتاب اللہ، صاحب سنت اور ان کی سنت کی اقتداء پر مبنی ہیں تو ان پر اعتراض اور ان کی تکفیر یقیناً اسی انجام کی موجب ہوگی۔

مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے جو بدترین مظاہر سامنے آئے ان سب کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں، یہاں صرف اس پہلو پر گفتگو مقصود ہے کہ مسلمانوں میں باہم تکفیر کا جو بازار گرم تھا اور انتخابات میں اسے بطور ایک حربے کے استعمال کیا جا رہا تھا اس کا سلسلۂ سند ان کو کہاں سے دستیاب ہوا۔

اہل السنۃ والجماعۃ کا ایک عام اصول ہے کہ کسی اہل قبلہ مسلمان کو اس کے کسی گناہ یا خطا بلکہ بدعت کی بنیاد پر کافر نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ عاصی، فاسق و فاجر اور اہل وعید جہنمیوں میں سے ہو سکتے ہیں، لیکن جہنم میں ہمیشہ نہیں رہیں گے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "یخرج من النار من کان فی قلبہ مثقال ذرۃ من ایمان"۔ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہوگا وہ جہنم سے نکال لیا جائے گا، کسی گناہ کی بنیاد پر کسی مسلمان کو کافر ٹھہرانا اہل السنۃ والجماعۃ یعنی اہل الحدیث کا اصول نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایک گمراہ فرقہ خوارج کا اصول ہے جو گنہگار مسلمان کو مرتد اور کافر کہتے ہیں، اور ان کے جان، مال، اور عزت و آبرو سب کو حلال سمجھتے ہیں اور جو بھی ان کی مخالفت کرے اس کو کافر سمجھتے ہیں۔ یہی اصول روافض کا بھی ہے، وہ خود کو مؤمن کہتے ہیں اور جو ان کی مخالفت کرے اسے کافر کہتے ہیں، مسلمانوں کے ایسے ممالک، شہر اور بستیاں جہاں ان کے اصول نافذ نہ ہوں انہیں دار الکفر سمجھتے ہیں اور ان پر تسلط اور جنگ کے لئے کفار، مشرکین، یہود اور نصاریٰ سب سے موالات اور دوستی کرتے ہیں، خوارج اور روافض سے قربت کی بنا پر یہی اصول بعض دوسرے غالی بدعتی فرقوں کا ہے جو خود کو مؤمن اور حد یہ ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ بھی کہتے ہیں اور جو بھی ان کی مخالفت کرے اسے کافر کہتے ہیں، اس توضیح سے صرف یہ مطلوب ہے کہ کسی گناہ یا خطا کی بنیاد پر کسی مسلمان کو کافر کہنا اہل السنۃ والجماعۃ کا اصول نہیں بلکہ خوارج، روافض اور بعض دوسرے بدعتی اور گمراہ فرقوں کا اصول ہے۔

یہ خوارج جو گنہگار مسلمانوں کو کافر کہتے ہیں نص صریح اور اجماع سلف سے ان کی ضلالت ثابت ہے، اللہ اور اس کے رسول نے مسلمانوں کو ان سے جنگ کرنے کا بھی حکم دیا، بڑے بڑے صحابہ کرام نے ان کے ساتھ جنگ کرنے کے باوجود انہیں کافر نہیں کہا بلکہ مسلمان ہی سمجھا، یہ جنگ صرف انہیں اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف لوٹانے اور مسلمانوں کی جماعت میں شامل کرنے کے لئے تھی۔

کوئی مسلمان اگر کسی مسلمان کی تکفیر کے جواز کا قائل ہو تو اس کی وجہ سے اس کی تکفیر نہیں کی جا سکتی، عمر بن خطاب اور حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہما بدری صحابہ ہیں، ایک بڑی غلطی کی بنا پر عمرؓ نے حاطبؓ کے متعلق کہا: یا رسول اللہ دعنی اضرب عنق ھذا المنافق، اللہ کے رسول مجھے اجازت دیجئے اس منافق کو قتل کر دوں، آپ نے فرمایا یہ جنگ بدر میں شریک ہو چکے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم" جو چاہو کرو میں نے

تمہیں بخش دیا ہے۔ اس طرح کے متعدد واقعات ہیں کہ ایک بدری نے دوسرے کو منافق کہا لیکن نبی اکرمؐ نے نہ اسے کافر ٹھہرایا نہ اسے بلکہ سب کو جنت کی بشارت دی، جنگ جمل وصفین میں سلف صالحین نے ایک دوسرے سے جنگیں کیں لیکن سب کے سب ایک دوسرے کو مؤمن اور مسلم سمجھتے تھے، ایک دوسرے سے دینی موالاۃ رکھتے تھے، اس طرح کی عداوت نہیں رکھتے تھے جیسے کافروں سے رکھی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کی شہادت قبول کرتے تھے، ایک دوسرے سے علم حاصل کرتے تھے، وراثت، نکاح اور دیگر معاملات بھی باہم انجام پاتے تھے۔

تکفیر کے سلسلہ میں دو نہایت اہم اصول ہیں جن کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

پہلا اصول .. یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیئے کہ اہل صلاۃ وقبلہ میں سے حقیقت میں اگر کوئی کافر ہوتا ہے تو وہ منافق ہی ہوتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، قرآن کی تنزیل، اور ہجرت مدینہ کے وقت سے انسانوں کی کل تین قسمیں ہیں:- ۱۔ مؤمن ۲۔ کافر جو کفر کو ظاہر رکھے ۳۔ منافق جو کفر کو چھپائے

اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ کے آغاز میں سب کا بیان کیا ہے۔

(۱) اس اصل کی بنیاد پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور اہل السنۃ والجماعۃ کی شاہراہ چھوڑ کر بدعت وضلالت کی راہ اختیار کرنے والوں میں جو منافق وزندیق ہیں یعنی کافر اصلی ہیں لیکن مصلحتاً اسے نمایاں نہیں کرتے وہ کافر ہیں، یعنی جن کا نفاق اور زندقہ کتاب وسنت کی کسوٹی پر واضح طور پر معلوم ہو چکا ہو، اس طرح کے لوگ روافض اور جہمیہ میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، ان کے مقتدر لوگ منافق اور زندیق تھے، رافضیت کا پہلا موجد منافق تھا، اسی طرح تجہم کی اصل بھی زندقہ اور نفاق ہے اسی لئے باطنی اور متفلسف قرامطہ میں سے زندیق منافقین رافضیت اور جہمیت کی طرف میلان رکھتے تھے، اسی لئے کہ ان کی ان سے قربت تھی۔

(۲) بدعت وضلالت کی راہ اختیار کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن میں ظاہری اور باطنی طور پر ایمان پایا جاتا ہے، لیکن ان میں جہالت اور ظلم وبے اعتدالی پائی جاتی ہے یہاں تک کہ ان سے ایسی خطائیں سرزد ہوتی ہیں جیسی اہل السنۃ والجماعۃ کے افراد سے ہوتی ہیں، اس طرح کے لوگ کافر ومنافق نہیں ہیں، اس طرح کے لوگوں سے کبھی عدوان وظلم سرزد ہوتا ہے جس سے وہ فاسق اور عاصی ہو جاتے ہیں، اور کبھی ایسے امور میں خطائیں سرزد ہوتی ہیں جن کے متعلق وہ جائز ہونے کا گمان رکھتے ہیں، اس قسم کے لوگوں کی ایسی خطائیں بخش دی جاتی ہیں اس لئے کہ ان سے متعلق ان کی نیت صحیح ہوتی ہے، ایسے لوگوں کے پاس بسا اوقات

ایمان اور تقویٰ ہوتا ہے ، اور اس ایمان و تقویٰ کی مقدار سے انہیں اللہ تعالیٰ کی قربت اور دوستی بھی حاصل ہوتی ہے

دوسرا اصول .. باتیں کفر کی ہوتی ہیں لیکن ان کا قائل کافر نہیں ہوتا ، مثلاً نماز ، زکوٰۃ ، روزہ رمضان اور حج کی فرضیت کا انکار اور زنا ، شراب ، جوا اور ذو محرم لوگوں کے باہمی نکاح کا حلال ٹھہرانا کفر ہے ، لیکن ان باتوں کا کہنے والا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسے کتاب و سنت کے احکامات نہیں پہونچے ، اس لئے ان کی فرضیت کے منکر کو کافر نہیں کہا جائے گا جیسے ایسا شخص جو دوسرا مذہب چھوڑ کر نیا نیا اسلام لایا ہو یا ایسے دور افتادہ بادیہ ، صحرا اور دیہات میں رہتا ہو جہاں اسلام کی تعلیمات نہیں پہونچی ہیں ، اس طرح کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کئے گئے کسی حکم کے انکار سے کافر نہیں ٹھہرائے جائیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہی نہیں کہ یہ رسول پر نازل کیا گیا ہے ، جہمیہ کی باتیں اسی نوع کی ہیں ۔ وہ اللہ کے اسماء و صفات و افعال اور اللہ نے اپنے رسول پر جو نازل کیا ہے ان کے انکار پر مبنی ہیں ، کتاب و سنت اور اجماع سے ثابت ان کے اقوال کی مخالف نصوص بہت زیادہ ہیں ، یہ لوگ تحریف کے ذریعہ ان کا رد کرتے ہیں ، ان کے قول کی حقیقت صانع کی تعطیل ہے ، اگرچہ ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو نہیں جانتے کہ ان کا قول تعطیل صانع کو مستلزم ہے ۔ بس جس طرح ایمان کی اصل اللہ کا اقرار ہے اسی طرح کفر کی اصل اللہ اور اس کے دین و شرائع کا انکار ہے ۔ ان لوگوں نے اگرچہ ایسے امور کی مخالفت کی ہے جن پر تمام ملل اور سلیم الفطرۃ انسان متفق ہیں ، لیکن اس کے باوجود ان کی بہت سی باتیں بہت سے اہل ایمان پر مخفی رہتی ہیں ، حتیٰ کہ یہ گمان کیا جاتا ہے کہ حق انہیں کے ساتھ ہے کیونکہ یہ لوگ بہت سے شبہات وارد کرتے ہیں ، اس صورت میں یہ اہل ایمان ظاہری و باطنی طور پر مؤمن ہی رہیں گے ، اصل یہ ہے کہ حق ان پر ملتبس اور مشتبہ ہو گیا ہے ۔ جس طرح اور دوسرے بہت سے مبتدعین پر ملتبس ہو گیا ہے ، یہ لوگ قطعاً کافر نہیں ہیں بلکہ کبھی ان میں فاسق اور عاصی ہوتے ہیں ، اور کبھی ان میں ایسے خطا کار ہوتے ہیں جنہیں معاف کر دیا جائے گا اور کبھی ان کے پاس ایمان و تقویٰ ہوتا ہے جس کی مقدار سے انہیں اللہ کی قربت حاصل ہوتی ہے ۔

کسی مسلمان میں اگر فسق و فجور ، معصیت ، عصیان و طغیان اور بدعات و منکرات پائے جاتے ہیں تو دین اسلام کا اصل طریقہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ اس پر حق واضح کیا جائے ۔ اہل السنۃ والجماعۃ یعنی اہل الحدیث کا اصول یہی ہے ، اس طرح کے مسلمانوں کو کافر و منافق کہنا سنت نبوی کے بھی خلاف ہے اور جماعت مسلمین میں اتحاد و ائتلاف کے بجائے اختلاف و انشقاق پیدا کرنا ہے ، اہل الحدیث اہل السنۃ والجماعۃ اسی لئے ہیں کہ وہ ہمیشہ سنت کی اتباع کرتے ہیں ، اور جماعت مسلمین میں کتاب و سنت اور اجماع کی بنیاد پر اتحاد و ائتلاف قائم رکھنے کی سعی کرتے ہیں ۔

تعارف اہلحدیث

مولانا محمد حنیف ندوی

ہم فرقہ واریت سے بالا ہیں

یہ عجیب بات ہے کہ اہل حدیث کا تصور دین جس درجہ سادہ، سمجھ میں آنے والا اور قلب و روح کو حرارت و تپش عطا کرنے والا ہے، یار لوگوں نے اتنا ہی اسے الجھا دیا ہے اور اس کے بارہ میں ایسی ایسی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں کہ الامان والحفیظ۔ سوال کم پڑھے لکھے یا جہال کا نہیں، اچھے خاصے علماء کا ہے۔ ان حلقوں میں اگر کسی جانی پہچانی شخصیت کے بارہ میں بھولے سے کسی نے یہ کہہ دیا یا لکھ دیا کہ صاحب وہ تو "وہابی" "غیر مقلد" یا اہل حدیث ہے تو نہ پوچھئے صرف اتنا کہہ دینے اور لکھ دینے سے اس کے متعلق طبیعت اس تیزی سے بدل جاتی ہے اور اس کے خلاف نفرت و تعصب کے کتنے طوفان اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

نفرت و تحقیر کا یہ بادۂ تلخ انگریز کے استعماری مصالح کے علاوہ اور کن کن مقدس ہاتھوں سے کشید ہوا ہے؟ اور تہمت کی اس سازش میں کس کس نے حصہ لیا ہے؟ کن کن عناصر نے اہل حدیث کے خلاف اس نفسیاتی مہم کو چلانے میں کامیاب کردار ادا کیا ہے؟ یہ ایک مستقل اور علیحدہ موضوع ہے جو مخصوص تحقیق و التفات چاہتا ہے، ہمارے نزدیک اس کے متعلق سر دست تعرض کرنا موزوں نہیں کیونکہ ؎

"اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں"

تاہم اتنی بات کہہ دینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں کہ نفرت کی یہ مہم پورے زور و شور اور تنظیم کے ساتھ آج بھی جاری ہے، حالانکہ جماعت اہل حدیث کے عقائد و سرگرمیاں اور کارنامے کوئی چیز بھی تو ڈھکی چھپی نہیں اور کوئی چیز بھی ایسی تو نہیں جس میں اسلامی نظریہ و تصور سے کسی درجہ میں بھی انحراف پایا جائے، بلکہ یوں کہنا چاہئے ہم تو معتوب اور مستوجب تعزیر ہی اس بنا پر ہیں کہ ہم فقہ ہو یا کلام، تفسیر ہو یا حدیث و دین کے معاملہ میں ادنیٰ انحراف کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ہمارا سیدھا سادہ عقیدہ یہ ہے کہ حق و صداقت کو صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں محصور

منحصر مانو اور سعی و عمل یا فکر و عقیدہ کا جب بھی کوئی نقشہ ترتیب دو تو تابش اور ضو کے لئے اسی آفتاب ہدایت کی طرف رجوع کرو جس کو اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات انسانی کے لئے سراج منیر ٹھہرایا ہے۔ یا ایہا النبی انا ارسلنٰک شاھداً ومبشراً ونذیراً ؕ وداعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیراً۔

یہاں اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہم کسی طرح بھی تاریخی ارتقاء کے منکر نہیں، اور زمانے کے ناگزیر تقاضوں کے تحت فقہ و کلام کے سلسلہ میں ہمارے ہاں جلیل القدر علماء اور ائمہ نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں ان سے ذرہ برابر صرف نظر نہیں کرتے ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہ کی فکری و آئینی کاوشیں۔ امام شافعی کی اصول فقہ و حدیث کی ترتیب۔ امام مالک کا اصحاب مدینہ کے تعامل کو دست برد زمانہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لینا اور امام احمد بن حنبل کی جمع حدیث کی وسیع تر کوششیں ہماری تہذیبی انفرادیت کا زندہ ثبوت ہیں، اور یہ ایسی چیزیں ہیں کہ جن پر ہم جس قدر بھی فخر و ناز کریں کم ہے۔

ہم حق کو ان سب مدارس فکر میں جن کی ان بزرگوں نے بنیاد رکھی، دائر و سائر تو مانتے ہیں لیکن محصور و منحصر کسی میں بھی نہیں جانتے کیونکہ ہمارے نقطۂ نگاہ سے صحت و صواب کی استواریاں غیر مشروط طور پر صرف کتاب اللہ و سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص ہیں۔

یاایہا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ و الیوم الآخر ذٰلک خیر واحسن تاویلا۔

ہمارے عقیدہ کی رو سے استدلال و تاویل کا یہی دو چیزیں نقطۂ آغاز ہیں اور یہی نقطۂ آخر، دوسرے لفظوں میں سورۂ نساء کی اس آیت کو ہم PREAMBLE یا قانونی اساس سمجھتے ہیں، اس آیت ہی کے لب ولہجہ میں علماء سے کہتے ہیں کہ ہر ہر متنازع فیہ مسئلہ میں اول و آخر کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کیجئے، تقلید و عدم تقلید کی اصطلاح میں پڑے بغیر کہ اس میں قدرے الجھاؤ اور جھول ہے، ہم محبت و وفا کی زبان میں دعویٰ داران عشق رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ خدارا آپ ہی بتائیے اگر کسی گروہ نے یہ فیصلہ ہی کر لیا ہو کہ طلب و آرزو کے دامن کو وہ صرف انہی گل بوٹوں سے سجائے گا جو قرآن و سنت کے سدا بہار دبستان میں نظر افروز ہیں اور کچھ لوگوں نے از راہ شوق یہی مناسب جانا ہو کہ ان کی نظر اگر کسب ضو کرے گی تو انہی انوار و تجلیات سے جو چہرۂ نبوت کی زیب و زینت ہیں یا زمان و مکان کے فاصلوں کو ہٹا کر اگر کوئی بے تاب اور متجسس نگاہ اسی جمال جہاں آراء کا براہ راست مشاہدہ کرنا چاہتی ہے جس کی جلوہ آرائیوں نے عشاق کے دلوں میں پہلے پہل ایمان و عمل کی شمعیں فروزاں کیں تو آیا یہ

کوئی جرم، گناہ یا معصیت ہے ؟ اور اگر یہ جرم اور معصیت ہے تو ہمیں اقرار ہے کہ ہم وابستگان دامن رسالت اور اسیران حلقۂ نبوت مجرم اور گناہ گار ہیں۔

تقلید و عدم تقلید کا مسئلہ دراصل فنی و علمی سے زیادہ نفسیاتی ہے، سوال یہ ہے کہ ٹھیٹھ اسلام کی رو سے ہماری اولین ارادت کا مرکز کون ہے، ہماری پہلی اور بنیادی وابستگی کس سے ہونی چاہئے، اور پیش آمدہ مسائل میں، مشکلات کے حل وکشود کے سلسلہ میں ہمیں اول اول کس کی طرف دیکھنا چاہئے، کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم کشا اور ابدی تعلیمات کی طرف یا فقہی مدارس فکر کی دقیق اور محدود تعبیرات کی طرف، اس سے قطع نظر کہ تقلید سے فکر و نظر کی تازہ کاریاں مجروح ہوتی ہیں، اور اس سے بھی قطع نظر کہ اس سے خود فقہ و استدلالی قافلوں کی تیز رفتاری میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہیں، اور تہذیب و فن کی وسعتیں، زندگی، حرکت اور ارتقاء سے محروم ہو جانے کے باعث حد درجہ سمٹاؤ اختیار کر لیتی ہیں، اصل نقص اس میں یہ ہے کہ اس سے عقیدہ و محبت کا مرکز ثقل یکسر بدل جاتا ہے، یعنی بجائے اس کے کہ ہماری ارادت و عقیدت کا محور و قبلۂ اول و آخر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رہے، ہماری عصبیتیں مخصوص فقہی مدارس سے وابستہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور غیر شعوری طور پر قلب و ذہن اس بات کا عادی ہو جاتا ہے کہ بحث و تمحیص کے مسئلہ میں کتاب و سنت سے کسی نہ کسی طرح مسائل کی وہی نوعیت ثابت ہو جو ہمارے حلقہ اور دائرہ کے تقاضوں کے عین مطابق ہو حالانکہ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ربط و تعلق کی کیفیتیں معروضیت (Objectivity) چاہتی ہیں اور اس بات کی مقتضی ہیں کہ ہر ہر مسئلہ اور امر میں نقطۂ نظر کسی خاص مدرسہ فکر کی تائید و حمایت کرنا نہ ہو بلکہ اس شئی کی تصدیق مقصود ہو کہ اخذ و قبول کے لحاظ سے کون صورت کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ قریب تر ہے۔

ممکن ہے اس پر کوئی صاحب کہہ اٹھیں کہ مسائل پر غور و فکر کرنے کا یہ تو محض ایک انداز ہوا یا زیادہ سے زیادہ اہل حدیث کی نفسیات دینی کی تشریح ہوئی، لیکن حل طلب سوال تو یہ ہے کہ صرف انداز فکر اور اسلوب استدلال سے کوئی مذہب یا مسلک کب متعین ہوتا ہے، مسلک اور مذہب کی تعیین کے لئے ضروری ہے کہ اہل حدیث کے مخصوص مابعد الطبیعاتی تصورات ہوں، علیحدہ اور ممیز علم الکلام ہو اور کتاب و سنت کی واضح تعلیمات پر مبنی اپنا علم الفقہ ہو اور اسی کی روشنی میں ان کی خاص تاریخ ہو جس سے کہ ان کے ارتقائے علمی کا پتہ چل سکے، اور معلوم کیا جا سکے کہ ماضی کے قریب و بعید کے مختلف ادوار میں انہوں نے مذہب و دین کی تشریح و تعبیر کے سلسلہ میں کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں، یا اسلامی تہذیب و تمدن کی نشاط آفرینیوں میں ان کا کیا حصہ ہے؟ —

اعتراض بظاہر بہت وزنی ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہمارا مسلک واقعی "مذاہب مدونہ" کی فہرست میں شامل

نہیں۔ یہ ایک مذہب ہے جس کے اصول اور کلامی وفقہی پیمانے گو متعین ہیں تاہم اصطلاحی معنوں میں یہ مذہب نہیں ہے، اس کے ماننے والوں کے باقاعدہ معمولات ہیں اور عقیدہ وعمل کا متعین قالب ہے، مگر اسے کسی لحاظ سے بھی گروہ نہیں کہنا چاہئے اسی طرح اس کی اصلاح وتجدید کے کارناموں پر مشتمل اپنی ایک تابناک تاریخ بھی ہے لیکن یہ تاریخ صرف انہی کی تاریخ نہیں ہے، اسے پورے اسلام کی تاریخ قرار دینا چاہئے۔

بظاہر یہ بات حد درجہ تضاد لئے ہوئے ہے لیکن ذرا غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ اسی تضاد میں اس کا حل بھی مضمر ہے، کون نہیں جانتا کہ پہلی صدی ہجری کے آخر ہی میں اسلام کو شدید نوعیت کے دینی وسیاسی انحرافات سے دوچار ہونا پڑا، اور تیسری صدی ابھی اختتام کو نہیں پہونچی تھی کہ ان انحرافات نے شدید نوع کے تعصبات کا روپ دھار لیا، اسی عرصہ میں مسئلہ امامت وخلافت کی وجہ سے شیعیت ابھری اور اس کے پہلو بہ پہلو ایک تاریخی حادثہ کی بناء پر خارجیت نے جنم لیا جس نے آگے چل کر مستقل فتنے کی شکل اختیار کرلی، انہی سیاسی اختلافات نے ارجاء کی مصلحتوں کو ہوا دی اور مسلمان مرجۂ اور غیر مرجۂ دو گروہوں میں بٹ گئے اور یونانی علوم کے فروغ وارتقاء نے اعتزال وجہمیت کی تخلیق کی جس نے صدیوں تک مسلمانوں کو گوناگوں عقلی اختلافات میں الجھائے رکھا، نتیجہ یہ ہوا کہ علمی ودینی حلقوں میں بیسیوں نئے مسئلے پیدا ہو گئے، صفات باری عین ذات ہیں یا غیر۔ استوا علی العرش کے کیا معنی ہیں، قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔ قدرت واستطاعت افعال سے پہلے ہے یا ان کے ہم قرین ہے۔ انسان مجبور ہے یا مختار، اللہ تعالیٰ محالات پر قادر ہے یا نہیں، خلق [illegible] سے کیا مراد ہے، خورد سال اطفال قیامت کے روز عذب کا ہدف بنیں گے یا نہیں، جنت ودوزخ عارضی ہیں یا دائمی۔ روح کیا ہے۔

یہ اور اس نوع کے عجیب وغریب مسائل جن کی وجہ سے اسلامی صفوں میں انتشار وتشتت کا پیدا ہونا ناگزیر تھا، اسی دور میں غنوصیت (Gnosticism) نے جس کے ماننے والے عراق میں کثرت سے تھے تصوف کو حریفانہ شکل میں پیش کیا اور تقدس وریاضت کے بہروپ میں اس یقین کو دلوں میں اتارنے کی کوشش کی کہ علوم نبوت کے مقابلہ میں عرفان وادراک کا ایک اور یقینی ذریعہ کشف بھی ہے جس کی مدد سے براہ راست حقائق کونیہ ودینیہ کا پا لینا ممکن ہے۔

قریب قریب یہی وہ زمانہ ہے جس میں فقہی مذاہب مدوّن ومرتب ہوئے اور ان کے پرجوش حامی ایک دوسرے کے مقابل میں صف آرا ہوئے اور باقاعدہ مناظرہ وجدل کی بنیاد پڑی، اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ عصبیتیں ابھریں حلقے بنے اور آخر تقلید وجمود نے اسلامی معاشرہ کی اکثریت کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

یہاں غور طلب یہ نکتہ ہے کہ گمراہیوں کے اس ہجوم میں اسلام کی فطرت میں اصلاح احوال کی جو قدرتی صلاحیتیں تھیں

وہ چپ چاپ یہ تماشا دیکھتی رہیں، اور کسی گروہ کسی جماعت کو یہ توفیق نصیب نہ ہوئی کہ وہ ان انحرافات کی نشاندہی کرے اور یہ بتائے کہ ان گمراہیوں کے مقابلہ میں اسلام کا صحیح صحیح موقف کیا ہے؟ خوش قسمتی سے واقعہ یہ نہیں ہے۔ تاریخ سے سرسری واقفیت رکھنے والے حضرات بھی جانتے ہیں کہ بفحوائے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ہر دور میں ایسے لوگوں کا وجود رہا ہے کہ جنہوں نے کلمۂ حق کا برملا اظہار کیا ہے۔ جنہوں نے تجدید واصلاح کی ذمہ داریوں کو سنبھالا ہے۔ اور اسلام کے چہرۂ زیبا سے بدعات کے گرد وغبار کو دور کرنے کی مقدور بھر مساعی جاری رکھی ہیں۔ جنہوں نے ذخائر حدیث کی حفاظت کی جنہوں نے عقائد کی پیچیدگیوں کو سلجھایا اور مروجہ فقہی مذاہب کے مقابلہ میں سنت پر مبنی، سنت سے مستنبط اور سنت سے قریب تر مسائل کی طرف فقہا کی عنان توجہ والتفات کو موڑ دینے میں کامیابی حاصل کی ہے، یہ گروہ اہل الحدیث و سنۃ کا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری نے مقالات الاسلامیین کی پہلی جلد کے آخر میں تقریباً پانچ صفحوں میں اس گروہ کے عقائد وسیر کا ایک دلچسپ اور دل نواز نقشہ پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے وسط تک اہل الحدیث والسنۃ کے سامنے کلام وفقہ کے کیا کیا مسائل تھے، اور ان حضرات نے ان مسائل کو کیونکر حل کیا، ہم اس سلسلہ میں دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اصلاح وتجدید کی یہ تمام کوششیں جو مختلف حلقوں اور مختلف زمانوں میں فقہ وکلام کی طرفہ طرازیوں کو کتاب وسنت کے سانچوں میں ڈھالنے کی غرض سے انجام پائیں، ہماری ہیں، ان کا علم الکلام ہمارا علم الکلام ہے، ان کی فقہ ہماری فقہ ہے اور ان کی تاریخ ہماری تاریخ ہے۔

لیکن اس کے باوجود ہم نے کسی متعین مدرسہ یا فقہ یا علم الکلام کے کسی بنے بنائے اصولوں کو اس بنا پر اپنانے کی کوشش نہیں کی ہے کہ مبادا ہماری عصبیتیں بھی اپنا محور بدل لیں اور بجائے اس کے کہ عقیدت ووابستگی کے داعیے براہ راست کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ رہیں، ہم بھی اس تضاد کا شکار ہو کر نہ رہ جائیں کہ جس کا ماضی میں تمام فقہی و کلامی مذاہب شکار ہوئے ہیں۔

گویا ہماری نفسیات دینی اور ہمارے جذبۂ حب رسول کا تقاضہ یہ ہے کہ فکر وعمل کی کسی صورت میں بھی ہم بجز کتاب اللہ کی اطاعت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری کے اور کسی تقیید، کسی تقلید اور انتساب کو اپنے لئے گوارا نہ کریں، اور زمان ومکان اور اشخاص دائمہ سے قطع نظر ہر اس سچائی کو اپنائیں، ہر اس استدلال کو تسلیم کریں اور تجدید واصلاح کی ہر اس کوشش کو سراہیں جو قرآن وحدیث پر مبنی ہو، اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسی حال میں ہمیں زندہ رکھے اور جذبہ وکیف اسی جانفزا عالم میں موت سے دوچار کرے، آمین! (بشکریہ الحدیث، لاہور)

جدید ہندوستان اور مسلمان

اسلامی تعلیمات کی تشریح اور ان پر عمل سے متعلق سوال وجواب

اسلام کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے۔ تمدن کی ترقی کے نتیجہ میں ہر دور میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت کے احکام کی تشریح وتوضیح کس طرح کی جائے، اور نئے حالات میں ان پر عمل کی کیا صورت ہو؟ اسلام اپنے گہوارۂ اول یعنی جزیرۃ العرب سے جب سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلا، اسی وقت سے آج تک یہ سوال مسلم علماء ومفکرین کے سامنے آتا رہا، اور انہوں نے اپنے علم وفہم کے مطابق اس کا جواب دیا۔ سوال وجواب کے اس عمل میں مسلم وغیر مسلم دونوں طرح کے اہل علم شریک رہے، اسی طرح مشرق ومغرب کے مختلف محققین نے اس میں حصہ لیا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا تو برصغیر میں نیا سیاسی وسماجی نظام قائم ہوا، پہلے بھارت و پاکستان کے نام سے دو حکومتیں قائم ہوئیں، پھر ایک تیسری حکومت یعنی بنگلادیش نے جنم لیا، اب برصغیر کی ان تینوں حکومتوں کے الگ الگ سیاسی نظام ہیں، اور بھارت میں سیکولر سیاسی نظام ہے جس کے زیر سایہ مختلف مذہبی اقلیتیں زندگی بسر کر رہی ہیں۔ آزاد بھارت میں ایک بار پھر مذکورہ سوال مسلمانوں کے سامنے آرہا ہے اور اس سوال کو مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم محققین کی جانب سے بھی پیش کیا جارہا ہے۔ پچھلے دنوں جامعہ سلفیہ میں ایک غیر مسلم یورپین محقق کی جانب سے چند سوالات موصول ہوئے جن کے جواب کے لئے موصوف نے اصرار کیا تھا، خاکسار نے اپنی ناقص فہم اور محدود مطالعہ سے جو جوابات تحریر کئے تھے انہیں مع سوالات قارئین محدث کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، ساتھ ہی اہل قلم حضرات سے گزارش ہے کہ ان سوالات پر اپنا نقطۂ نظر تحریر فرماکر محدث کو ارسال فرمائیں، ہم شکریہ کے ساتھ ان کی تحریر شائع کریں گے۔

(مقتدیٰ حسن ازہری)

جامع سوال : مسلم مفکرین اور علماء کی رائے میں ، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا ہندوستان کے موجودہ سیاسی جمہوری نظام میں مسلمانوں کا شریک ہو کر تعاون بہم پہنچانا جائز ہے یا نہیں ؟

منفرد سوالات :

۱ ۔ کیا آپ اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستان کا سیاسی نظام مسلمانوں کے لئے تاریخ میں ایک بالکل نئی صورت حال سے دوچار ہونا ہے ، کیونکہ نہ تو مسلمان حکمراں ہے اور نہ محکوم ؟

۲ ۔ اگر ہندوستان کے سیاسی نظام کو ایک نئی صورت حال تصور کیا جاتا ہے تو پھر ضرورت ہوتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک نیا لائحہ عمل تیار کیا جائے تاکہ مسلمانوں کی ہند میں موجودگی بحیثیت شہری رہنے کے لئے جواز پیش کیا جاسکے ، ورنہ ایسا معلوم ہوگا کہ ہندوستانی مسلمانوں نے ہندوستانی نظام کو دل سے قبول نہیں کیا ہے ، کیوں کہ اس کا اسلامی ورثہ سے کوئی رابطہ نہیں ہے ۔

۳ ۔ بدلے ہوئے حالات میں اسلامی تعلیمات کی تشریح اور اشاعت کس طرح ممکن ہے ، اور اب اسلامی شریعت کا نفاذ کس طرح ہوگا ، خاص طور پر آزادی کے بعد کے ہند میں ؟

۴ ۔ نئی حکمت عملی کے تحت قرآنی تصورات اور حدیث پر کس طرح عمل پیرا ہوا جائے گا ، اور سیرت نبوی کی کس طرح اتباع کیا جائے ؟

۵ ۔ کس طرح شریعت کے روایتی معنوں پر نظر ثانی کر کے ماحول کے مطابق ان کی وضاحت کی جائے ، خاص طور پر فقہی مسائل کی توجیہ کیسے کی جائے کہ حال سے مطابقت پیدا ہو سکے ؟

جامع سوال کا جواب : سوال میں " مسلم مفکرین اور علماء " کے جو الفاظ آئے ہیں پہلے ان کی توضیح ضروری ہے ، بالخصوص " مسلم مفکرین " کی ، کیونکہ ایک خاص حلقہ میں عام طور پر یہ لقب جن شخصیتوں پر بولا جاتا ہے ان کے متعلق امت اسلامیہ کے مستند علماء کی رائے قابل توجہ ہے ، یعنی امت کے مستند و معتبر علماء ان حضرات کو اسلامی فکر کا نمائندہ نہیں تسلیم کرتے کیونکہ ان کے افکار و خیالات ایسے نہیں ہیں جن کو اسلامی فکر کا ترجمان کہا جا سکے ۔ بلکہ بسا اوقات اس طرح کے افراد سے اسلامی فکر کو تقویت کے بجائے دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ، اس طرح کی شخصیتیں ماضی قریب و بعید میں متعدد نظر آتی ہیں جن

کو "مفکر" اور "مصلح" وغیرہ القاب سے نوازا گیا، لیکن بعد کے واقعات سے واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ یہ حضرات اسلامی فکر کے نام پر اپنے مخصوص افکار و خیالات کی ترجمانی کا بیڑہ اٹھائے ہوئے تھے، اسی طرح کے لوگوں کی طرف سے متعدد دینی احکام وشعائر اور مذہبی مسلمات پر اعتراضات کئے گئے، حتیٰ کہ بعض افراد نے دین کے اصل سرچشمے یعنی کتاب وسنت کے عبارات ونصوص کو بھی تاویل وتحریف کا شکار بنایا، اور اس کے نتیجہ میں امت کے متعدد افراد آج تک فکری انتشار و بے راہ روی کا شکار ہوئے۔

اس لئے ضروری ہے کہ پہلے "اسلامی فکر" کی تعیین کرلی جائے، تاکہ اس کی روشنی میں "اسلامی مفکرین" کی اصطلاح کا اطلاق ہوسکے۔

• اسلام کی بنیاد کتاب وسنت پر ہے، اور اسے عصر نبوی میں اور قرون مشہود لہا بالخیر میں جس طرح سمجھا اور نافذ کیا گیا ہے وہی سمجھ اور تنفیذ ہمارے لئے سند ہے۔ زمانہ کے تغیرات اور تبدیلیوں کا سہارا لے کر قرآن کریم کی کسی آیت یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی حدیث کی ایسی تفسیر وتشریح جس سے دین کی روح اور اس کا مقصد مجروح ہو، صحیح نہیں۔ آج کے دور میں مادیت اور اباحیت کا زور ہے، صنعت و ٹکنالوجی کے میدان میں انسان بہت زیادہ ترقی کرچکا ہے، اور اسی سہارے بہت سے غلط کام صحیح سمجھے جاتے ہیں، یا تمدن و ترقی کا لازمہ شمار کئے جاتے ہیں، اہل زمانہ پیروان اسلام سے بھی ان غلط کاموں کو کرنے کا یا ان کی اجازت دینے کا مطالبہ کرتے ہیں، یا ایسی توقع رکھتے ہیں، اور جب مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوتی ہے تو ان کو رجعت پسند اور بنیاد پرست وغیرہ القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

غلط افکار و اعمال کو اسلام میں گھسیڑنے کی کوشش جو لوگ کرتے ہیں وہ اسی زعم میں مبتلا رہتے ہیں کہ اسلامی فکر کو انہوں نے دوسروں سے زیادہ صحیح طور پر سمجھا ہے، اور اپنی رائے کو مدلل کرنے کے لئے وہ تاویل وتحریف کی راہ اختیار کرتے ہیں، اور اس سلسلہ میں امت کے جمہور علماء کی آراء سے صرف نظر کرتے ہوئے شواذ کا سہارا لیتے ہیں، سود کی حلت، پردۂ نسواں کا خاتمہ اور بین الملل شادیاں وغیرہ اسی طرح کی ذہنیت کی پیداوار ہیں، ان افکار کو امت میں رواج دینے والے غیر مسلم نہیں تھے، بلکہ ایک بڑا طبقہ ان کو "مفکر و مصلح اسلام" کے نام سے جانتا تھا۔

اس توضیح کے بعد یہ عرض ہے کہ "اسلامی مفکر" اسی شخص کے لئے کہا جاسکتا ہے جو کسی تحریف وتاویل کے بغیر کتاب وسنت کے نصوص کا پابند ہو، اور سلف صالح کی فہم وفکر اور اسلام کی روح اور اعلیٰ مقاصد سے پوری طرح باخبر اور پابند ہو، اور اسلام کے اصل مآخذ سے سمجھنے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے ان کا ماہر ہو، عربی زبان پر عبور کے ساتھ ساتھ تفسیر، حدیث، اصول حدیث، اصول فقہ، علم توحید اور بلاغت ومعانی پر اس کی گہری نظر ہو، ثانوی مآخذ سے اسلام کو پڑھنے والے اسلامی مفکر نہیں بن سکتے

اور ان کی آراء کو بنیادی یا مختلف فیہ مسائل میں فیصلہ کن مانا جا سکتا ہے۔

• ہندوستان کا موجودہ سیاسی وجمہوری نظام ہو یا کوئی اور دوسرا نظام، جب تک اس میں دستوری طور پر اسلام کی مخالفت مقصود نہ ہو، نیز عملی طور پر شعائر اسلام کے قیام میں رکاوٹ نہ پیدا کی جائے، اور مسلمانوں کو مذہبی معاملات میں آزادی حاصل ہو تو ایسے کسی نظام کے ساتھ تعاون میں کوئی شرعی قباحت نہیں، اسلام کے دور اول میں مختلف غیر مسلم حکومتوں یا نظام کے ماتحت مسلمانوں کو زندگی بسر کرنے کی ضرورت پیش آئی، لیکن اسے ناجائز نہیں بتایا گیا۔ ہاں دستوری یا عملی طور پر اگر کسی نظام کا مقصد اسلام کی مضرت رسانی اور مخالفت ہو تو ایسے کسی نظام کے ساتھ مسلمانوں کا تعاون کرنا جائز نہیں۔

ہندوستانی نظام کی بہت سی دفعات اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں، اس نظام کے ساتھ تعاون کرنے والا مسلمان اگر ان دفعات کی پابندی کے لئے مجبور ہو تو پھر تعاون جائز نہیں، لیکن دستور کی مذہبی آزادی کی رو سے اگر اسے اس طرح کے امور واشغال سے مستثنیٰ رکھا جائے تو تعاون میں کوئی قباحت نہیں۔

ہندوستانی دستور میں مذہبی آزادی کو بڑی وسعت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے، لیکن عملی طور پر مختلف مذاہب کے ماننے والے اس آزادی سے پورے طور پر بہرہ ور نہیں ہو پاتے، اس صورت حال کے پیش نظر تعاون کے جواز کا فیصلہ کرتے ہوئے تأمل ہوگا، لیکن عملی صورت حال سے قطع نظر اگر دستور کی عبارت اور اس کے مضمرات پر نظر رکھی جائے تو حکم وہی ہوگا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

منفرد سوالات کے جوابات :

۱۔ ہندوستان کے سیاسی نظام کو کلی طور پر مسلمانوں کے لئے "نئی صورت حال" نہیں کہا جا سکتا ۔ اس نظام میں حکمرانی مذہب کی بنیاد پر نہیں ہے ، بلکہ ہندوستان کے شہری یا باشندہ ہونے کی بنیاد پر ہے ، لہذا مسلمان بحیثیت مسلمان اس ملک میں حکمراں نہیں ہے ، البتہ اس ملک کے شہری اور باشندہ ہونے کی حیثیت سے اسے حکمرانی میں شرکت حاصل ہے ، یہ کہنا کہ اس نظام میں مسلمان نہ تو حکمراں ہے نہ محکوم ، صحیح نہیں ۔ بعض حیثیتوں سے اگر وہ حکمراں نہیں تو بعض حیثیتوں سے حکمراں ہے ، اور اسی طرح محکومیت کا مسئلہ بھی ہے ۔ حکومت کے ایسے قوانین جن میں اسلام کی مخالفت نہیں ہے ، مسلمان ان کا پابند ہے اور اس نے اس کی حیثیت محکوم کی ہے ، اس طرح انتظامیہ وعدلیہ کے وہ قوانین جن میں شریعت کی خلاف ورزی نہیں ، اور اس کے اجراء میں مسلمانوں کا اشتراک ہے ، ان کی رو سے مسلمان حکمراں ہے ۔

۲۔ اگر ہندوستان کے سیاسی نظام کو ایک نئی صورت حال تصور کر لیا جائے تو نئے لائحہ عمل کی تیاری کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی ۔ ہندوستانی دستور مسلمانوں کو ان کے مذہب کی اب تک کی تعبیرات وتنفیذات کے ساتھ ہندوستان کا شہری قرار دیتا ہے ، اور انہیں مذہب پر عمل کی پوری آزادی دیتا ہے ، پھر شہریت کے جواز کے لئے کسی نئے لائحہ عمل کی تیاری کی ضرورت کیوں محسوس کی جارہی ہے ؟ حکومت نے اسلام یا مسلمانوں کو کسی مخصوص شرط کے ساتھ شہری نہیں مانا ہے ، لہذا کسی مناسب و مخصوص لائحہ عمل کی تیاری کے ذریعہ شہریت کو مستحکم کرنے کی بات تحصیل حاصل معلوم ہوتی ہے ۔

ہندی مسلمانوں پر بعض حلقوں کی طرف سے یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندوستانی نظام کو دل سے قبول نہیں کیا ہے ، لیکن اس طرح کا الزام کسی بھی مذہب کے ماننے والے پر عائد کیا جا سکتا ہے ، اور واقعات نے مسلمانوں کے مقابلہ میں دیگر مذاہب کے متبعین کی طرف سے ہندوستانی نظام کی مخالفت وبیخ کنی کو زیادہ واضح طور پر ثابت کیا ہے ۔

اگر کسی نظام کا متبع بننے یا کسی ملک کا شہری ہونے کے لئے اسلام کے کسی حکم کی خلاف ورزی یا تحریف لازم آئے تو مسلمان کو اس اتباع اور شہریت کی کوئی ضرورت نہیں ، خواہ وہ کسی لائحہ عمل کی رو سے جائز ہو یا ناجائز ۔ لیکن اسلامی تعلیمات کی پیروی اور احترام کے ساتھ اگر مسلمان کسی نظام کے ساتھ منسلک ہو سکیں تو خواہ مخواہ اس سے علیحدگی اور تنفر غلط ہے ۔

۳۔ اسلامی تعلیمات کی تشریح واشاعت اور اسلامی شریعت کا نفاذ حالات وزمانہ کی قید سے آزاد ہے ، اسلام کا کلمہ پڑھنے والے ہر شخص کے لئے ابتداہی میں ضروری ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات وشریعت کے بارے میں یہ یقین کرلے کہ یہ ایک دائمی دین اور دائمی شریعت ہے ، اس پر ایمان اور عمل کا وہ مکلف ہوگا ، اور اس کے لئے حالات کی موافقت وہمواری کی شرط بالکل بیجا ہے ۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت میں یہ بات بالکل واضح ہے، معمولی معمولی امور و احکام کے سلسلہ میں انہوں نے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا، کیا ان کے واقعات کے تذکرہ کا یہی مقصد ہے کہ امتی حالات سے سمجھوتہ کر کے اپنے دین و شریعت کے احکام میں تبدیلی کر دیں، یا ان کے اندر ایسی لچک پیدا کریں کہ زمانہ کی بے راہ روی کے لئے جواز پیدا ہو سکے ؟

اسلامی شریعت کے نفاذ کا مسئلہ آخر کیوں مشکل نظر آتا ہے ؟ جب انسانی معاشرہ ایسے نظام و قانون کو گوارہ کر لیتا ہے جس کے زیر سایہ چوری، شراب، زنا، قتل و غارت، فحاشی و بد اخلاقی جیسے جرائم فروغ پاتے ہیں تو آخر وہ ایسے نظام کو کیوں قبول نہیں کرے گا جس کے زیر سایہ مذکورہ جرائم کی جگہ دیانت داری، عفت و حیا داری، امن و سلامتی اور مساوات و انسانی ہمدردی کا دور دورہ ہو ؟ کیا موجودہ دور میں اسلامی شریعت کے نفاذ کو آپ دور جاہلیت میں اسلام کے نفاذ سے زیادہ مشکل سمجھتے ہیں ؟ دورِ جاہلیت میں انسان اسلام کی مخالفت اپنے جاہل و غیر متمدن ذہن و فکر کی بنیاد پر کرتا تھا، لیکن آج کا انسان گوناگوں علوم و فنون سے آراستہ ہو کر تمدنی فکر و مزاج کا مالک ہے، کیا وہ انسانیت کے بھلے برے میں اپنی موجودہ تمدنی ترقی کے بعد تمیز نہیں کر سکتا ؟ کیا وہ اسلامی شریعت کا موجودہ انسانی قوانین کے مجموعہ سے تقابل کر کے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ کس نظام میں انسانیت کی فلاح و بہبود ہے، اس موضوع پر التشریع الجنائی فی الاسلام مصنفہ عبد القادر عودہ کا مطالعہ کر کے بہت سے سوالات کے جوابات حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

اسلامی شریعت کے نفاذ میں دشواری دکھا کر اس سے دست برداری کا مطالبہ کیا جاتا ہے، یا کم از کم مسلمانوں کے دلوں میں یہ تصور پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی شریعت کے احکام و قوانین موجودہ متمدن دنیا میں ناقابل عمل اور غیر مفید ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ دور میں روس، امریکہ اور یورپ کے ممالک میں جو نظام نافذ ہے اسے تمام لوگ سو فیصد صحیح مانتے ہیں اور برضا و رغبت اس کی پیروی کرتے ہیں یا اس پر عمل کے لئے حکومت اور انتظامیہ کو جد و جہد کرنا پڑتی ہے ؟ کیا کمیونزم اور سرمایہ داری و استعماریت وغیرہ نظاموں کو دنیا نے خوشی سے قبول کیا تھا ؟ اور اس کے نافذ کرنے والوں نے اسے غلط سمجھ کر نافذ کیا تھا ؟ جو آدمی اسلام پر ایمان رکھتا ہے اس سے اسلام کا یہ مطالبہ ہے کہ وہ اس کے نظام کو دنیا کے لئے بہتر یقین کرتے ہوئے اس کی تنفیذ کی کوشش کرے اور جو رکاوٹیں پیش آتی ہیں ان کا مقابلہ کر کے انہیں دور کرے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ اسلامی شریعت پر ناقابل تنفیذ ہونے کا الزام جس دور میں عائد کیا جا رہا ہے، اسی دور میں اللہ تعالیٰ نے سعودی عرب کی حکومت کو اس بات کی توفیق دی ہے کہ وہ عدلیہ و انتظامیہ میں اسلامی شریعت کی تنفیذ کرے، اس تنفیذ میں کوئی جزوی کمی ہو سکتی ہے، لیکن جن احکام کو کھلے طور پر نافذ کیا جا رہا ہے کیا ان سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ

اسلامی احکام میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ہر دور میں انسانیت کی رہنمائی کریں ؟

رہا ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں اسلامی شریعت کی تنفیذ کا مسئلہ تو اس سلسلہ میں ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کوئی اسلامی ملک نہیں جس میں حکمرانوں پر اسلامی شریعت کی تنفیذ کی ذمہ داری ہو ، ہر دور میں ایسے غیر مسلم ممالک موجود رہے ہیں جو اسلامی شریعت کی پابندی سے آزاد تھے ۔ البتہ ان میں سے بعض ایسے تھے جو اسلامی شریعت کی مخالفت و بیخ کنی کیلئے کوشاں تھے ، اور بعض ملک ایسے تھے جن کو اسلامی شریعت اور ان پر عمل کرنے والوں سے کوئی عداوت دشمنی نہیں تھی ، آج کے آزاد و سیکولر ہندوستان کو ہم ایسا ہی ملک قرار دیتے ہیں جس کے زیر سایہ مسلمانوں کو اپنے مذہب پر عمل کی اجازت ہے ، البتہ اسے یہ حق حاصل نہیں کہ اسلامی شریعت کی پابندی پر تمام باشندوں کو مجبور کرے ، لیکن اسلام کی رو سے اس طرح کا اختیار ضروری نہیں ، ہندوستان کا مسلمان اپنی زندگی میں اسلامی شریعت کے نفاذ کا پابند ہے اور اس میں اسے کوئی دشواری نہیں ، سیاسی طور پر خوف و ہراس اور سماجی نابرابری کی مشکلات سے وہ دوچار ہے لیکن اس کے باوجود دستوری طور پر اسے جو مذہبی آزادی حاصل ہے اس کا اعتبار کرنا ضروری ہے ۔

۴ ۔ اس سوال کا جواب بڑی حد تک سابقہ جواب کے ضمن میں آچکا ہے ، قرآن و حدیث ہر دور میں عمل ہی کے لئے آئے ہیں البتہ یہ صحیح ہے کہ اسلام کے دشمن ہمیشہ معاشرہ کو ایسے رخ پر لے جاتے ہیں جس سے اسلام پر عمل کے لئے دشواری پیدا ہو۔ آج بھی معاشرہ کو بڑی طاقتوں نے اس طرح کے اقتصادی و سماجی نظام میں جکڑ دیا ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر آسانی سے عمل نہ ہوسکے اس طرح کے نظام کو دنیا سے ختم کرنے کے لئے کوشش ضروری ہے ، اگر انسانی کوشش نہ ہوگی تو قدرت کی طرف سے ایسے حالات پیدا کئے جائیں گے کہ اسلام پر عمل آسان ہوسکے ، روس میں کمیونسٹ انقلاب کی کامیابی کے بعد انسان سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہاں کے عوام کبھی اس نظام کو ٹھکرا دیں گے ، لیکن آج جو صورت حال پیش آئی وہ سب کے سامنے ہے ۔

رہا سیرت نبوی کے اتباع کا معاملہ تو اسے بطور اشکال پیش کرنا غلط ہے ، سیرت نبوی تو درحقیقت ایسی چیز ہے کہ اگر اس کا صحیح طور پر اتباع کیا جائے تو اسلام پر عمل کے لئے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی دشواری ہی نہ پیدا ہو ، یہ سیرت انسانیت کے لئے طرۂ امتیاز و باعث افتخار ہے ، اس کی کشش ، جاذبیت اور تاثیر و افادیت انسانی بیان سے باہر ہے ، جو لوگ صحیح طور پر اس سیرت کے محاسن کو سمجھ نہیں پاتے اور جن کے ذہن و فکر اس کی بلندیوں تک پہونچنے سے عاجز ہیں وہ اسے ایک دشوار گذار کردار کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں ، اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ یہی موجودہ دور کا سب سے بڑا ظلم ہے ۔

۵ ۔ اسلام میں روایتی معانی اور رسم ورواج کوئی چیز نہیں ، اسلام ابدی حقائق اور مستحکم قوانین ونظریات پر مشتمل ہے ، جو کتاب وسنت سے ثابت ہیں ، وہ ہر دور میں رسم ورواج اور روایت واقدار سے بالا وبرتر ہے ، جو روایتی معانی کتاب وسنت کے خلاف ہیں ان پر نظر ثانی کی ضرورت نہیں ، ان کو یکسر مسترد کرنا ضروری ہے ۔ اور جس جگہ اور زمانہ کا ماحول اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے ، اس کے ساتھ مطابقت بھی قابل اعتنا نہیں ، اسلام کے احکام من جانب اللہ ہیں ، ان میں تبدیلی کا تصور غلط ہے ، جو ماحول اس دین سے اور اس کی تعلیمات سے ہم آہنگ نہ ہوگا اسی کو بدلنے کی بات سوچی جائے گی نہ کہ اسلامی تعلیمات کو ۔

جن فقہی مسائل کا استناد کتاب وسنت سے نہ ہو ان کو کسی طرح کی توجیہ کے ذریعہ حال سے مطابق کرنے کی ضرورت نہیں وہ فقہائے اسلام کی ذہنی کاوش کی عکاسی کرتے ہیں ، ان کی حیثیت ذاتی آراء کی ہے ، جب تک وہ کتاب وسنت کے نصوص کے خلاف نہ ہوں ہم ان کی پابندی کریں گے ، لیکن مخالفت کی صورت میں ان کو رد کرنے میں کوئی قباحت نہیں ۔ فقہاء اسلام نے اپنی ذہنی کاوش سے جو فقہی سرمایہ جمع کیا ہے وہ من وعن ہمارے لئے واجب التعمیل نہیں ، اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے کتاب وسنت کی نصوص وعبارات کی وسعت وجامعیت کا اندازہ ہوتا ہے ، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں کس طرح قرآن وحدیث سے مسائل کا استنباط کیا جاسکتا ہے ، اور تمدن کی گوناگوں ضرورتوں کو پورا کیا جاسکتا ہے ، مسلمانوں نے اس فقہی سرمایہ سے جمود وتعطل کا سبق سیکھا ، اور حزبیت وگروہ بندی کی لعنت کا شکار ہو گئے ، ہر فقیہ وامام کے الگ الگ حامی ومتبع پیدا ہو گئے جس سے فرقہ بندی کا مرض امت میں پھیل گیا ۔

امت کا اس کے برعکس فرض یہ تھا کہ وہ فقہی ذخیرہ کو اسلامی شریعت کی ہمہ گیری وجامعیت اور اس کے دوام وخلود کی دلیل کے طور پر پیش کرے اور یہ بتائے کہ آج سے سیکڑوں سال قبل جب انسانی فکر موجودہ علمی ترقی وکمال سے آشنا نہ تھی ، اور بحث وتحقیق کے موجودہ وسیع اصول وطریقے معلوم نہ تھے ، کس طرح فقہاء نے اتنا عظیم سرمایہ کتاب وسنت کے نصوص کی بنیاد پر تیار کیا ، اور تمدنی ضرورتوں کو پورا کیا ، آج بھی اسی طرح اگر محنت وکوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ پیش آمدہ مسائل کا ایسا حل نہ نکلے جس میں انسانیت کی بھلائی ہو ۔ فقہی ذخیرہ کو اسی حیثیت سے دیکھنا مفید ہے ، اگر کسی واجب العمل مجموعہ کی حیثیت سے اس پر نظر ڈالیں گے تو اشکال والجھاؤ کے سوا کچھ اور حاصل نہ ہوگا ۔ وما توفیقی الا باللہ ۔

مقتدی حسن ازہری

جامعہ سلفیہ ، مرکزی دار العلوم ، بنارس

تحریر بتاریخ ۸ ؍ ۱۱ ؍ ۱۴۱۰ھ = ۲ ؍ جون ۱۹۹۰ء

علم کی فضیلت اور اہلِ علم کی قدر و منزلت

تحریر / علامہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز حفظہ اللہ
ترجمہ / ڈاکٹر عبدالرحمٰن بن عبدالجبار الفریوائی

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، والصلاۃ والسلام علی عبدہ ورسولہ وخیرہ من خلقہ وأمینہ علی وحیہ، نبینا وإمامنا محمد ابن عبد اللہ وعلی آلہ وأصحابہ ومن سلک سبیلہ، واھتدی بھداہ إلی یوم الدین۔ أمّا بعد!

علم کی فضیلت اور علماء اور اہل علم کی قدر و منزلت کے موضوع پر اختصار کے ساتھ یہ تحریر پیش کی جارہی ہے۔

دین میں تفقہ اور بصیرت کی فضیلت کتاب وسنت کے دلائل ثابت ہے، اخلاص وللّٰہیت اور اللہ کی توفیق کی نعمت سے جو شخص مالا مال ہوگا، اس کو اس علم و تفقہ پر بے پایاں اجر وثواب، ذکر جمیل، نیک انجام، اور عظیم خیر و برکت وغیرہ اچھے ثمرات ملیں گے کتاب وسنت کے نصوص اس باب میں معروف و مشہور اور بہت زیادہ ہیں، علم کے شرف اور قدر و منزلت اور اہل علم کی فضیلت کے لئے یہی کافی ہے کہ اللہ رب العزت نے علماء کو اپنی وحدانیت پر گواہ بنایا ہے، اور ان کے بارے میں کہا ہے کہ حقیقی معنوں میں اور مکمل طور پر یہی لوگ اللہ تعالیٰ سے خوف کھاتے ہیں:

شھد اللہ أنہ لا إلہ إلا ھو والملائکۃ وأولوا العلم قائما بالقسط لا إلہ إلا ھو العزیز الحکیم۔

(آل عمران : ۱۸)

گواہی دی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی کہ بجز اس ذات کے کوئی معبود برحق ہونے کے لائق نہیں اور فرشتوں نے بھی اور اہل علم نے بھی اور معبود بھی وہ اس شان کے ہیں کہ اعتدال کے ساتھ انتظام رکھنے والے ہیں ان کے سوا کوئی معبود برحق ہونے کے لائق نہیں، وہ زبردست اور حکمت والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ملائکہ اور اہل علم کو اپنی وحدانیت پر گواہ بنایا ہے، یہ اللہ کی معرفت رکھنے والے ربانی علماء اور اس کے دین کے ماہر ہیں، جو اللہ تعالیٰ سے خوف کھاتے ہیں، اور اس کو اپنا نگہبان اور رقیب سمجھتے ہیں، حدود اللہ سے تجاوز نہیں کرتے، ارشاد باری ہے:

إنما يخشى الله من عباده العلماء۔ (فاطر: ۲۸)

اور اللہ سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ سے ڈرتا اور ہر مومن اللہ سے خوف کھاتا ہے، لیکن مکمل خوف، اور کامل خشیت صرف اہل علم کا حصہ ہے جن میں سرفہرست انبیاء ورسل علیہم الصلاۃ والسلام کی جماعت ہے، پھر اس کے بعد فرق مراتب کے ساتھ علماء ہیں، علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔

خشیت الٰہی حق ہے، اور کامل خشیت اللہ کے علم ومعرفت رکھنے والے اس کے اسماء وصفات اور اس کے عظیم حقوق میں بصیرت رکھنے والے علماء کے لئے خاص ہے، ان میں سب سے بلند وبالا اور ارفع مقام انبیاء ورسل علیہم الصلاۃ والسلام کا ہے، اس کے بعد اہل علم جن کے اللہ کی معرفت اور اس کے دین سے واقفیت میں کمی وبیشی کے اعتبار سے مختلف مراتب وطبقات ہیں۔

عالم اور طالب علم دنیا میں جہاں بھی ہو اسے اس مسئلہ پر توجہ مرکوز کرنی چاہئے، اسے اللہ سے ڈرنا چاہئے، اپنے سارے معاملات میں اللہ کو اپنا نگراں سمجھنا چاہئے، حصول علم میں، اس علم پر عمل کرنے میں، اس کی نشر واشاعت میں، اور حقوق اللہ اور حقوق العباد میں اللہ کو اپنا رقیب ونگہبان سمجھنا چاہئے۔

حضرت معاویہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من يرد الله به خيرا يفقهه في الدين۔ (صحیح بخاری وصحیح مسلم)

اللہ تعالیٰ جس کا بھلا چاہتا ہے اس کو دین میں بصیرت کی نعمت سے نوازتا ہے۔

یہ عظیم الشان حدیث دوسرے صحابۂ کرامؓ سے بھی مروی ہے، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں انسان کا تفقہ وبصیرت حاصل کرنا سعادت اور خیر کی دلیل ہے۔

کسی بھی یونیورسٹی، علمی معہد اور مدرسہ کے ہر مخلص طالب علم کا گوہر مقصود یہی دین میں تفقہ اور بصیرت ہے، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے عزیز طلباء کو اپنی توفیق وہدایت سے نوازے اور اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ آمین!

اگر کسی شخص نے تفقہ فی الدین سے اعراض کیا تو اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے کسی خیر اور بھلائی کا ارادہ نہیں فرمایا، "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" (ہر طرح کی طاقت اور تصرف کی قوت صرف اللہ رب العزت کو حاصل ہے)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے جو مجھے علم اور ہدایت کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اس کی مثال اس بارش کے پانی کی ہے جو زمین میں پہنچا، زمین میں ایک اچھا زرخیز حصہ تھا جس نے پانی کو جذب کرلیا اور اس سے زمین سبزہ زار ہوگئی، زمین کا کچھ حصہ نشیبی تھا اس لئے گڑھوں میں پانی محفوظ ہوگیا جس سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ اسے خود پیا، جانوروں کو پلایا، اور کھیت سینچے، پانی کا کچھ حصہ چٹیل میدان میں گرا جہاں پانی ٹکتا نہیں اور نہ ہی وہ سبزہ اگاتا ہے، اللہ کے دین میں تفقہ اور بصیرت پیدا کرنے والے، اور اللہ نے مجھے جس پیغام کو لے کر بھیجا ہے اس سے نفع اٹھانے والے کی یہ مثال ہے۔ جس نے علم حاصل کیا اور اسے لوگوں کو سکھلایا، اور یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے حصول علم سے کوئی سربلندی نہیں حاصل کی اور اللہ کی اس ہدایت کو جو میں لے کر آیا ہوں قبول نہیں کیا"

اس علم کے حاملین علماء کے دو[۲] طبقے ہیں:

ایک[۱] وہ جس کو حصولِ علم کے بعد اس پر عمل اور اس میں تفقہ و بصیرت کی دولت میسر ہوئی، اور اس سے مسائل کے استنباط و استدلال کی توفیق ہوئی اور وہ حفاظ و فقہاء بن گئے، انہوں نے اس علم کو آنے والی نسلوں تک منتقل کیا، اور اسے لوگوں کو سکھلایا، اس میں انھیں بصیرت پیدا کرائی، وہ معلم، قاری، داعی الی اللہ، استاذ اور مدرس تھے، اور تعلیم و تفقہ کے میدان میں وہ سب کچھ تھے۔

دوسرا[۲] گروہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے اس علم کو حفظ کیا، اسے اصحاب استنباط اور ارباب اجتہاد تک منتقل کیا، یہ دونوں گروہ تو عظیم الشان ثواب اور بے پایاں اجر و ثواب اور امت اسلامیہ کے نفع عام کے مستحق ہوئے۔

لیکن اکثریت اس چٹیل میدان کی طرح ہے جو پانی کو روک نہیں سکتا اور جس میں کوئی سبزہ نہیں اگتا، کیونکہ یہ لوگ اعراض اور غفلت کی روش اختیار کرتے ہیں اور علم سے بے توجہی برتتے ہیں۔

علوم شرعیہ کے مدارس و معاہد میں رہنے والے علماء اور طلباء رحمہ اللہ عظیم الشان خیر و بھلائی اور صراط مستقیم پر گامزن ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اخلاص نیت کی اور حصول علم میں سچائی کی توفیق عطا فرمائی ہے۔

مبارکباد ہو طالبانِ علوم شریعت کو جو اللہ کے دین میں تفقہ و بصیرت حاصل کر رہے ہیں، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایت اور علم لے کر آئے اس میں غور و خوض کر رہے ہیں، اس میں مسابقت اور منافست کا راستہ اختیار کرتے ہیں، اور حصول علم کی راہ کی مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کر رہے ہیں کیونکہ حصول علم جسم کو تھکائے بغیر ناممکن ہے، اس کے لئے صبر، جد و جہد اور مشقت کی وادیاں طے کرنی ضروری ہیں۔

امام مسلم رحمہ اللہ صحیح مسلم میں کتاب الصلاۃ کے ابواب المواقیت میں چند اسانید ذکر کرنے کے بعد یحییٰ بن أبی کثیر رحمہ اللہ کا یہ

قول نقل کرتے ہیں :

لاینال العلم براحة الجسم۔ جسمانی آرام وآسائش کے ساتھ حصول علم ناممکن ہے ۔

آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ علم کا حصول اور دین میں تفقہ وبصیرت کے لئے صبر وضبط ، وقت کی حفاظت ونگہداشت اور اخلاص وللہیت کی ضرورت ہے ۔

جن معاہد ومدارس اور مساجد میں شرعی علوم کی درس وتدریس کا سلسلہ قائم وجاری ہے ، یہ بہت ہی عظیم الشان اور مفید سلسلہ ہے اس لئے کہ اس سے لوگ فیضیاب ہوتے ہیں ، اور اس سے ان کے مسائل ومشکلات حل ہوتے ہیں ۔ ان مدارس کے فارغین سے بڑی بھلائی ، بڑا خیر ، بڑا فائدہ اور نفع عام کی امید ہے ، اس لئے اللہ رب العزت نے جس شخص کو اس عظیم نعمت سے مالا مال کیا اس کے لئے یہ مناسب ہے کہ وہ لوگوں کو نفع پہونچائے ، انھیں پڑھانے لکھانے اور حقوق اللہ وحقوق العباد کی تذکیر وتعلیم سے وہ اپنے آپ کو دور رکھے ۔ ارشاد وتوجیہ ، تعلیم وتربیت اور وعظ ونصیحت کی ذمہ داری چاہے درس وتدریس ، افتاء وقضاء اور وعظ ونصیحت کے ممکن ذرائع میں سے ہر ممکن ذریعہ سے ، یا دوستوں اور ساتھیوں کے مابین عمومی وخصوصی مجالس میں مذاکرات کے ذریعہ سے ، غرضیکہ ہر طریقہ سے اصحاب علم وفضل کو اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا چاہئے ۔

اسی طرح اہل علم کو چاہئے کہ وہ ذرائع ابلاغ کی عظیم افادیت کے پیش نظر ان ذرائع سے علم کی اشاعت میں حصہ لیں اس لئے دنیا کے گوشہ گوشہ میں ان کے ذریعہ سے علم پہونچ جاتا ہے ۔

یہ بات معلوم ہے کہ مسلمانوں کے لئے علم کی اشاعت میں عظیم الشان خیر اور عام فائدے ہیں ، اور جس کی اس زمانہ میں بلکہ ہر زمانہ میں سخت ضرورت ہے ، لیکن ہمارے زمانہ میں علم کی قلت اور مدعیان باطل کی کثرت کی وجہ سے اس کی ضرورت اور بھی سخت ہو جاتی ہے ۔

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے علم کی دولت عطا فرمائی ہے اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اس سے نفع پہنچانے کی تکالیف برداشت کرے ، قضاء کے ذریعہ ، درس وتدریس کے ذریعہ ، دعوت وارشاد کے ذریعہ ، غرضیکہ مسلمانوں کے متنوع امور ومعاملات تک اس کا دائرہ وسیع ہے تاکہ حصول علم کا بڑا فائدہ اور جد وجہد کا عظیم الشان نتیجہ سامنے آئے ۔

طالب علم اس لئے علم حاصل کرتا ہے کہ وہ اولاً اپنی ذات کو فائدہ پہونچائے ، خود کو جہالت کی تاریکی سے نکالے ، اور اللہ رب العزت سے علی وجہ البصیرہ تقرب حاصل کرے ، وہ اس واسطے بھی علم حاصل کرتا ہے کہ وہ لوگوں کو بھی نفع پہنچائے ، انھیں ظلم کی تاریکی سے نکال کر علم وہدایت کی روشنی میں لے آئے ، ان کے مسائل ومشکلات میں ان کے مابین فیصلہ کرے ، ان میں صلح کرائے ، جاہل وناخواندہ لوگ

کو تعلیم دے، گمراہوں کو رشد وہدایت کی راہ پر لے آئے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے۔

طالب علم کی ذمہ داریوں اور اعمال کا دائرہ بڑا وسیع ہے، یہ چند ابواب میں منحصر نہیں ہے، خاص کر منصفی اور جج کے عہدے کی اہمیت ہے، اگر اللہ کی توفیق شامل حال ہو تو قاضی اور جج کا دائرہ بڑا وسیع ہوتا ہے، وہ ایک وقت میں عالم بھی ہوتا ہے اور قاضی وجج بھی، وہ مدرس بھی ہوتا ہے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرنے والوں میں بھی اس کا نام آتا ہے، وہ داعی الی اللہ بھی ہوتا ہے اور مصلح ومبلغ بھی۔

قاضی کو چاہئے کہ وہ ان تمام ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرے، صبر وضبط اور تحمل کا شیوہ اختیار کرے اور راہ حق میں پیش آنے والی مشکلات کو برداشت کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرے، اسے ہمارے سلف صالحین اور ائمہ اعلام رحمہم اللہ کی طرح باحوصلہ اور باہمت ہونا چاہئے جو لوگوں کو ہر ممکن طریقہ سے فائدہ پہونچاتے تھے۔

اہل علم، طلبہ اور سارے مسلمانوں کو میری یہ وصیت وتلقین ہے کہ وہ علم کے حصول اور اس کی نشر واشاعت میں صبر کا مظاہرہ کریں، راہ حق میں اپنی کوششیں جاری رکھیں، اپنی اوقات کی حفاظت کریں، جن مسائل میں بعض لوگوں کو مشکلات پیش آتی ہیں ان کے حل کے لئے کثرت سے باہم مذاکرات کریں، تاکہ انہیں وافر مقدار میں ایسی معلومات بہم پہنچیں، جن سے وہ اور دوسرے مسلمان باذن اللہ فائدہ حاصل کریں گے، ساتھ ہی جن امور سے بندوں کو اللہ کی قربت حاصل ہوتی ہے اور ہر وہ چیز جو لوگوں کے لئے نفع بخش ہو، ان میں نیک نیتی کی خواہش اور حرص ہو۔

لوگوں کے درمیان فیصلہ اور ان کی تعلیم وتربیت کی طرف اہل علم واصحاب بصیرت اور ارباب اقتدار کی توجہ ان امور میں سے ہے جو لوگوں کے لئے مفید ہے، اور جس سے مسائل ومشکلات حل ہوتے ہیں، اور عدل وانصاف عام ہوتا ہے۔

یہ معلوم ہے کہ قضا ان امور میں سے ہے جس پر اللہ کی طرف سے ان لوگوں کے لئے بڑا اجر وثواب اور بڑے درجات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے صالح نیت اور نافع علم سے نوازا ہے اور جس کے ذریعہ مسلمانوں کے لئے خیر وبرکت مقدر کر رکھا ہے۔

منصب قضا اگرچہ بڑا پر خطر عہدہ ہے اور ہمارے اسلاف جس سے خائف رہتے تھے، لیکن حالات بدلتے ہیں، زمانہ میں تفاوت آتا ہے، اس وقت لوگوں کو ایسے علماء کی سخت ضرورت ہے۔ جو علی وجہ البصیرۃ لوگوں کے درمیان فیصلہ کر سکیں، اور لوگوں کے مسائل ومشکلات کے حل میں وہ اللہ سے ڈرتے ہوں اس واسطے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کا اہل بنایا ہے اور جسے علم وبصیرت کی دولت سے نوازا ہے۔ اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ منصب قضا کو قبول کرنے سے اعراض کرے بلکہ اس عہدہ کو قبول کرنا ضروری ہے اسے چاہئے کہ خود کو اپنے علم کے مطابق عمل پر آمادہ کرے، اس سے جس چیز کا مطالبہ کیا گیا ہے اسے پورا کرے، اپنے علم سے لوگوں کو نفع پہنچائے۔

اور اللہ رب العزت سے توفیق وتعاون کا طلبگار رہے، اگر اس کے بعد وہ اپنے آپ کو اس ذمہ داری کے نبھانے سے عاجز و درماندہ پائے۔ اور یہ سمجھے کہ وہ یہ ذمہ داری نہیں نبھا سکتا تو اس کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنا عذر پیش کر کے اس سے مستعفی ہو جائے، لیکن پہلے وہلہ میں اس کے لئے مناسب نہیں ہے کہ اس منصب کے قبول کرنے سے معذرت کر دے۔

اہل علم وایمان اور لوگوں کو نفع پہنچانے پر قدرت رکھنے والوں کے لئے نامناسب ہے کہ اس اعراض وانکار کا دروازہ کھولیں، اہل علم کو عالی ہمت ہونا چاہئے، انہیں چاہئے کہ ان کے مقاصد نیک ہوں مسلمانوں کو نفع پہونچانے میں ان کو دلچسپی ہو، ان کو پیش آنیوالے مسائل ومشکلات کو حل کرنے میں کوشاں ہوں تاکہ نااہل اور جاہل لوگ ان مناصب پر نہ آجائیں، کیونکہ اہل علم کے چلے جانے کے بعد یقینی طور پر ان جگہوں پر جاہل آجائیں گے یا تو اہل علم ان مناصب پر رہیں یا جاہلوں کے لئے یہ میدان چھوڑ دیا جائے، کیونکہ لوگوں کے مسائل ومشکلات کو حق وانصاف کے ساتھ حل کرنے اور ان کے مابین فیصلہ کرنے کیلئے قاضیوں کا ہونا ضروری ہے، اگر اچھے لوگوں نے یہ عہدے قبول کئے تو ایسا ہونا ممکن ورنہ دوسرے لوگ اس پر قابض ہو جائیں گے، اس لئے اہل علم کو اور ہر اس آدمی کو جو اللہ کا خوف رکھتا ہو، اس صورتحال کو اپنے سامنے رکھنا ضروری ہے، اس کا اجر وہ اللہ سے مانگے، صبر وتحمل کا مظاہرہ کرے اور اللہ کے یہاں جو اجر وثواب ہے اس کی توقع رکھے۔

صحیح بخاری وصحیح مسلم میں عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے یہ حدیث مروی ہے:

إن الله لا يقبض العلم انتزاعا ينتزعه من صدور الرجال، ولكن ..... (الحديث)

اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں کے سینوں سے کھینچ کر نہیں اٹھاتا، علم کو علماء کی موت کے ذریعہ اٹھاتا ہے حتی کہ جب کوئی عالم نہیں بچے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنا لیں گے، ان سے سوال کیا گیا تو انہوں نے بغیر علم کے فتوے جاری کئے، خود گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔

اہل علم وایمان یہیں سے علماء حق کے فوت ہو جانے یا دوسروں کے لئے میدان چھوڑ دینے میں جو عظیم خطرات اور نتائج بد ہیں اس کا بخوبی علم وادراک رکھتے ہیں۔

یہ مخفی نہیں ہے کہ عالم چاہے وہ قاضی ہو یا کچھ اور، جب اس نے اجتہاد کیا اور اس میں صائب الرائے رہا تو دو اجر کا مستحق ہے، لیکن اگر اجتہاد کیا اور اس میں اس سے غلطی ہوئی تو وہ ایک ہی اجر کا مستحق ہوگا، جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے اس لئے صدق واخلاص اور حق وصواب کی جستجو کے ساتھ اس کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے، خوف اور خطرہ تو اس شخص کو ہے جو قضیایا فتوی کی جرأت ظلم اور جہالت

کے باوصف کرتا ہے ۔

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :
قاضی کی تین قسمیں ہیں ۔ دو قسم کے لوگ جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں ۔ جنت میں وہ قاضی ہوگا جس نے حق کو پہچانا اور اس کے مطابق فیصلہ کیا ، اور جس شخص نے حق کو پہچان کر ظلم و زیادتی کی راہ اختیار کی تو وہ جہنم میں ہوگا ، اور جس آدمی نے لوگوں کے درمیان جہالت کے ساتھ فیصلہ کیا اس کا انجام جہنم ہے ۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والحاکم وصححہ)

جو شخص حق کی جستجو کرتا ہے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مسلمانوں کے لئے نفع کی تلاش میں رہتا ہے تو وہ دو حال سے خالی نہیں جیساکہ حدیث رسول سے معلوم ہوا ۔

پھر میں عمومی طور پر سارے مسلم بھائیوں کو اور خصوصی طور پر اہل علم اور طلبہ کو اور خود اپنے آپ کو سارے معاملات میں تقوی اور فرائض و واجبات کی ادائیگی میں علم پر عمل ، اور فواحش و منکرات سے دور رہنے کی وصیت و تلقین کرتا ہوں ، اس لئے کہ طالب علم اپنے عمل و کردار میں اور قضاء و افتاء وغیرہ کے مسائل میں اور گھر کی چہار دیواری اور اس سے باہر کے طرز عمل اور لوگوں سے ملنے جلنے میں اور اپنی زندگی کے دوسرے امور میں دوسروں کے لئے اسوہ و نمونہ ہوتا ہے ، وہ اچھی باتوں میں لوگوں کے لئے اسوہ اور نمونہ ہے ، اس لئے اسے اللہ کو ہر وقت سامنے رکھنا چاہئے ، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو علم کی جو نعمت عطا کی ہے اس پر عمل پیرا ہونا چاہئے اور لوگوں کو اپنے قول و فعل سے بھلائی کی طرف دعوت دینی چاہئے تاکہ وہ لوگوں کے مابین ایک امتیازی شخصیت کا مالک ہو ، لوگ اسکے علم و فضل اور اچھے طریقے اور سلوک کے معترف ہوں اور انھیں یہ معلوم ہو کہ یہ آدمی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کی سیرت پر ہے ، اسے اس بات کا بھی اہتمام کرنا چاہئے کہ وہ کبر و نخوت اور غرور و تکبر کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دے ۔

عالم اور غیر عالم سبھی کو ریا ، و نمود اور کبر وغیرہ امور اور متنوع مقاصد و ارادوں کی طرف سے بڑے خطرات لاحق ہیں ، عالم کو چاہئے کہ وہ اللہ سے ڈرے ، اپنے اعمال کو اللہ کی رضا کے حصول کے لئے کرے ، اپنے سارے امور و معاملات میں اللہ کو سامنے رکھے ، اللہ کے بندوں کے ساتھ تواضع و انکساری سے پیش آئے ، جس علم کی نعمت سے بہت سے لوگوں کو اللہ نے محروم رکھا اور اسے نوازا ہے تو اس کی وجہ سے لوگوں پر اپنا کبر و غرور ظاہر نہیں کرنا چاہئے ، اسے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے ، تواضع سے پیش آنا اور کبر و نخوت کا نہ کرنا اللہ کا شکر ہے ، اسی طرح سے مسجد اور اس سے باہر علم کی نشر و اشاعت بھی اللہ کے شکر میں داخل ہے ۔

قاضی ضرورت کے وقت لوگوں سے خطاب کرتا ہے ، طلبہ کو پڑھاتا ہے لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فرائض انجام دیتا ہے ، مسلمانوں کے احوال کی اصلاح کی کوشش کرتا ہے ، حکمرانوں سے اتصال کرتا ہے ، اور ان کی خیر خواہی

کے امور سے انہیں باخبر کرتا ہے، اس کے سارے اوقات ہمیشہ مسلمانوں کی مصلحت اور ان کو فائدہ پہنچانے والے امور، اسلام اور اہل اسلام کی شان کی بلندی اور اپنے عند اللہ بری الذمہ ہونے والے امور میں صرف ہوتے ہیں۔

برادران اسلام، خصوصاً قرآن سے شغف رکھنے والے علماء اور طلبہ کو یہ وصیت و تلقین ہے کہ قرآن سب سے عظیم اور سب سے زیادہ شرف و منزلت والی کتاب ہے، جو سب سے زیادہ نفع بخش اور اچھے علوم و فنون پر مشتمل ہے، کما لا یخفی۔

اللہ رب العزت کی توفیق کے بعد دین میں تفقہ و بصیرت اور خشیت الٰہی کی طلب کے لئے قرآن سب سے بڑا مددگار ہے اخیار و صلحاء کی پیروی و اقتداء میں وہ معین و مددگار ہے، میں سارے لوگوں کو اور اپنے آپ کو قرآن میں غور و فکر کرنے اور کثرت سے شب و روز اس کی تلاوت کرنے اور ہر معاملہ میں قرآن کی طرف مراجعت اور مشکل مقامات میں مفسرین کے اقوال کی طرف رجوع کی وصیت و تلقین کرتا ہوں، کتاب اللہ کے فہم کے لئے یہ بہترین معاون و مددگار ہے، اس لئے کہ یہ کتاب مقدس سب سے بہتر، سب سے افضل اور سب سے سچی کتاب ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ۔ (الإسراء - ۹)	بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے۔
وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ۔ (النحل ۸۹)	اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے کہ تمام باتوں کا بیان کرنے والا ہے اور مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور خوشخبری سنانے والا ہے۔
قُلْ هُوَ لِلَّذِينَ آمَنُوا هُدًى وَشِفَاءٌ۔ (فصلت ۴۴)	آپ کہدیجئے کہ قرآن ایمان والوں کے لئے تو رہنما اور شفاء ہے۔
مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ۔ (انعام ۳۸)	ہم نے کتاب میں کوئی چیز بھی نہیں چھوڑی ہے۔

پس مسلمان مردوں اور عورتوں کو بالعموم اور اہل علم کو بالخصوص اپنی تمام تر توجہ قرآن پاک پر کرنی چاہئے، اسے وہ مضبوطی سے پکڑ لیں، اس کے فہم و تدبر اور اس پر عمل کی کوشش کریں، اور مشکل مقامات میں اہل علم کے اقوال کی طرف رجوع کریں۔

باری تعالیٰ کا فرمان ہے:

كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِّيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ وَلِيَتَذَكَّرَ	یہ بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور

أولوا الألباب ۔ (ص ۲۹) تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں۔

نیز دوسری جگہ ارشاد ہے:

أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب أقفالها ۔ (محمد ۲۴) تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔

پھر حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی توجہ صرف کرنی چاہئے اور جو ممکن ہو اسے حفظ کرنا چاہئے، احادیث کا کثرت سے مطالعہ کرنا چاہئے، بالخصوص جن احادیث کا تعلق عقیدہ سے ہے اور جو امور مکلف واجب ہیں اور جو انسان کے ساتھ خاص ہیں، اس لئے کہ ہر آدمی سے متعلق مسائل کی انسان کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لئے اس پر توجہ اور اہتمام زیادہ واجب اور مؤکد ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قل إن كنتم تحبون الله فاتبعوني يحببكم الله ويغفر لكم ذنوبكم ۔ (آل عمران ۳۱) آپ فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے، اور تمہارے گناہوں کو معاف کر دیں گے۔

سنت مطہرہ کا علم حاصل کئے بغیر اور اس کی اور کتاب اللہ کی طرف رجوع کے بغیر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکمل اتباع کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

اہل علم اور طلبہ کو میری وصیت و تلقین ہے کہ وہ کتب حدیث کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں، زیادہ سے زیادہ انہیں پڑھیں پڑھائیں، اور مذاکرہ و بحث کا سلسلہ جاری رکھیں، حدیث کی سب سے اہم کتابیں صحیح بخاری و صحیح مسلم ہیں، پھر سنن اربعہ (ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ) موطا امام مالک، مسند امام احمد، سنن دارمی وغیرہ حدیث کی معروف و مشہور کتابیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے مؤلفین کو اجر عظیم سے نوازے۔ جزاهم الله عن المسلمين خير الجزاء ۔

اس کے بعد ان اہل علم کی کتابوں کی اہمیت ہے جو عقیدہ کی صحت اور شرعی دلائل میں توسیع میں معروف ہیں ۔ ان مؤلفین میں شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اور آپ کے دوست گرد علامہ ابن قیم اور حافظ ابن کثیر ہیں، جنہیں اس میدان میں تفوق و شہرت حاصل ہے، ان حضرات نے مسلمانوں میں بیش بہا علوم کی نشر واشاعت فرمائی اور لوگوں کو کتاب و سنت کے دلائل کے ساتھ اہل سنت والجماعۃ کا عقیدہ بیان کیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کی اہم کتابوں میں "مجموع الفتاوی" "مطابقة صريح المعقول لصحيح المنقول"، اور "الجواب الصحيح في الرد

علی من بدّل دین المسیح وغیرہ ہیں۔ یہ بڑی مفید کتابیں ہیں جو صحیح عقائد واحکام کے بیان پر مشتمل ہیں، اور مخالفینِ اسلام کی ان میں تردید ہے۔

علامہ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف میں الطرق الحکمیۃ، اعلام الموقعین اور زاد المعاد بڑی عظیم الشان کتابیں ہیں بالخصوص قاضیوں اور مفتیوں کے لئے تو بہت ہی مفید ہیں۔

اسی طریقہ سے ائمہ دعوت کے فتووں کا مجموعہ " الدُّرَرُ السَّنِیَّۃ " ہے، جس میں شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب اور آپ کے اتباع واصحاب اور تلامذہ کے بہت سارے رسائل وفتاوے شامل ہیں، اسی طریقے سے ہمارے استاذ محترم مفتی اکبر علامہ شیخ محمد بن ابراہیم آل شیخ کے فتاوے ہیں، یہ فتاوے بڑے فوائد کے خزینے اور عظیم الشان علم کا گراں مایہ تحفہ ہیں۔

کتاب وسنت کے بعد مذکورہ کتابوں کے مطالعہ کی میں وصیت وتلقین کرتا ہوں اس لئے کہ ان میں عظیم علم، اور ہر خیر پر مدد موجود ہے، انہیں مفید کتابوں کی قبیل سے وہ کتابیں ہیں جن میں دلائل کے ذکر کا اہتمام ہوتا ہے، جیسے ابن قدامہ کی " المغنی " اور شرح المہذب، والمحلّٰی " وغیرہ کتابیں، جن میں دلائل کا اہتمام ہوتا ہے، اور اہل علم کے اقوال مذکور رہتے ہیں، یہ اہل علم، طلبہ قاضی اور فقیہ وغیرہ کے لئے اہم کتابیں ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے میں اس کے اچھے ناموں اور بلند وبالا صفات کے ذریعہ سوال کرتا ہوں کہ وہ ہمیں اور سارے مسلمانوں کو علم نافع اور عمل صالح کی توفیق دے، ہم سب کو خلوص نیت، دین میں تفقہ وبصیرت، دنیا وآخرت میں فلاح وکامرانی کی دولت عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ عطا کرنے والا ہے۔ اِنہٗ تعالیٰ جواد کریم!

اللہ تعالیٰ سے میں یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمارے حکمرانوں اور ساری دنیا کے مسلمانوں کے حکمرانوں کو اپنی توفیق سے نوازے، اور ان کے مشیروں کو نیک بنائے، انہیں ہر معاملے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے نفاذ میں ان کا معاون ہو، ہمیں اور انھیں اور سارے مسلمانوں کو اپنے نفوس کی برائیوں اور ہمارے اپنے اعمال کی برائیوں سے اپنی پناہ میں رکھے۔ اِنہٗ سمیع قریب، وصلی اللہ علٰی نبینا محمد وعلٰی آلہ وصحبہ وسلم۔

تحریر
فضیلۃ الشیخ الدکتور
احمد عبد الرحمن

ترجمہ وتعلیق
ریاض احمد محمد سعید السلفی
المتخصص فی الحدیث وعلومہ

غزالی کی کتاب "السنۃ النبویۃ بین اہل الفقہ واہل الحدیث" پر ایک تنقیدی نظر

شیخ غزالی نے اپنی کتاب میں عقیدہ، فقہ اور اصول سے متعلق چند مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے، اس میں انہوں نے اپنے مخالفین کو اپنی انتقاد کا ہدف بنایا ہے، اور ہم کو یہ باور کرایا ہے کہ ان کا ووٹ فقہاء کے حق میں ہے اور انتقاد کی یلغار محدثین پر ہے، نیز صواب دید ہمیشہ فقہاء کی حق میں آئی، اور محدثین کا دامن ہمیشہ خطا وغیر درستی سے داغدار رہا ہے، لیکن عنقریب مطالعہ سے ہم پر یہ واضح ہو جائے گا کہ دونوں مکاتب فکر کے چند ایک افراد ایسے ہیں جن کا فقہ وحدیث دونوں میدانوں سے تعلق ہے۔

زیر نظر کتاب میں زیر بحث آئے ہوئے نیز ان کے علاوہ بہت سارے ایسے اختلافی مسائل سے عقائد، فقہ اور اصول کی کتابیں بھری پڑی ہیں جو اہل حدیث واہل فقہ کے ان دو متوازی مکاتب فکر سے متعلق نہیں ہیں بلکہ بعض اختلافات تو اہل سنت (خواہ فقہاء ہوں یا محدثین) اور فرقہ معتزلہ کے درمیان واقع ہوئے، یا فقہاء محدثین اور مفسرین کے آپسی اختلافات کی قبیل سے ہیں، لیکن یہ صورت حال فقہاء اور محدثین کے درمیان چند ایک اختلافات کے وقوع کے منافی نہیں ہے۔

متذکرہ صدر حقائق کی روشنی میں یہ امر اظہر من الشمس ہو جاتا ہے کہ اختلافات کو علوم اسلامیہ سے اشتغال رکھنے والے دو ہی جماعتوں میں منحصر کرنا، اور انھیں دو متوازی یا متعارض جماعتوں کے روپ میں عوام پر پیش کرنا مبنی بر خطاء اور خلاف مصلحت ہے، اس لئے کہ یہاں دونوں میں ایسا باہمی تعلق ہے جو اس تقسیم کو روا نہیں رکھتا، اور موجودہ یونیورسٹیوں میں علوم فقہ اور حدیث کے جو دو مخصوص شعبے قائم ہیں وہ محض نظام تعلیم کا معاملہ ہے، کسی مسلکی یا فکری تقسیم کا مسئلہ نہیں ہے۔

۱- جبر واختیار کا مسئلہ

سلسلہ کی ابتداء میں ایک اعتقادی مسئلہ "جبر واختیار" سے کرتا ہوں، میرے علم کی حد تک یہ مسئلہ اصلاً بجائے حدیث کے قرآنی ہے، چنانچہ قرآن مقدس کی چند ایک آیات انسان کو مختار و

باارادہ تسلیم کرتی ہیں اور دوسری چند اس کے مجبور محض ہونے کا فیصلہ صادر فرماتی ہیں صحابہ کرام نے ان آیات کے مابین تطبیقی کشمکش کو محسوس فرماکر دربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کی تھی، اختصار کے پہلو کو ملحوظ رکھتے ہوئے جواب نبوی کے متعلق اتنی سی بات کفایت کر جائے گی کہ وہی زیر بحث مسئلے کا ایمان افروز حل تھا، چودہ صدیوں کے بعد یہ ثابت ہوگیا ہے کہ بجز جواب نبوی کے اس مسئلے کا کوئی حل بھی نہیں، چنانچہ عقل شریعت یا فلسفیانہ انداز میں نصوص کی گرفت سے آزاد ہوکر کسی قسم کا کوئی حل پیش کرنے میں بری طرح ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اور افلاطون سے لے کر سارتر تک مکمل ۲۵ صدیوں تک مختلف نقیضوں کے درمیان بھٹکتی رہی ہے، جب کہ حیات انسانی قانون سازی واخلاق میں انسان کے آزاد و بااختیار ہونے کے اصول پر برابر آگے بڑھتی رہی۔ گرچہ اس حدیث پر وہ عقلی دلائل فراہم نہیں کرسکتا۔

یہ مسئلہ اپنی اس مخصوص نوعیت میں " سنت نبوی " کے عنوان کے تحت منضبط نہیں ہوتا ہے، اور اس میں وقوع پذیر اختلافات گروہ فقہاء و محدثین سے متعلق نہیں ہے گرچہ بسا اوقات ان دونوں مکاتب فکر کی بھی مشارکت رہی ہے، اس لئے بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ فقہاء اپنے فن میں اختصاص کی بناء پر زیر بحث مسئلہ میں تقلید کا دامن تھامے ہوئے ہیں، اور اہل حدیث کو اس سلسلے میں چند ایک احادیث کا شرف روایت حاصل ہے، لیکن اس مسئلے میں ان مرویات سے باہر کی دنیا میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے، البتہ اس حکم سے وہ عبقری شخصیات مستثنیٰ ہیں جو توحید و عقیدہ، فقہ و اصول فقہ اور حدیث کے علوم میں ید طولیٰ رکھتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ کسی خاص فن میں یکتائے زمانہ کی حیثیت سے ظاہر ہوئیں۔

یہ امر شاہد ہے کہ معتزلہ اور ان کے قدیم وجدید موافقین نے ہمیشہ حریت ارادہ کا دفاع کیا ہے اور اس کے لازمے کے طور پر صفت " عدل " کی حفاظت کی ہے، اہل سنت نے ان پر یہی گرفت کی ہے کہ انھیں " ہر چیز پر محیط صفت ارادہ، اور صفت " علم مایکون " کے تحفظ پر ذرا بھی توجہ نہیں ہے۔ درحقیقت یہی دشواری ہے کہ جنہوں نے صفت " عدل " کو اصلی روپ میں تسلیم کیا ہے انہوں نے " ارادۂ محیطہ " اور " علم مایکون " دونوں صفتوں کو تعلیل وانکار کی نذر کردیا ہے اور جنہوں نے ان دونوں صفتوں کو ان کا صحیح مقام دیا وہ صفت عدل کے تحفظ پر کوئی عقلی دلیل فراہم نہ کرسکے۔

عالم اسلام میں ایسی معرکہ آرائی کی آگ کو بھڑکانے کے بجائے خود سر سیکولر یلغار کی مقاومت میں اجتماعی جدوجہد ہمارا بنیادی فریضہ ہے۔ اسی طرح اس صحیح شرعی اسلوب کی تعیین بھی ہمارے فرائض مہمہ میں داخل ہے جس کا ہم اپنی بحثوں اور علمی اختلافات میں بالدوام التزام کرسکیں، شیخ غزالی پہلوں کی طرح اب بھی یکتائے عصر علماء کرام اور لائق صد احترام دعاۃ میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔

قاضی عبدالجبار معتزلی اور عالم اہل سنت استاذ ابواسحٰق اسفرائنی کے مابین وقوع پذیر مناظرہ۔ جس کا بیان آئندہ سطور میں آرہا ہے۔ اس پیچیدگی کی حقیقی عکاسی کرتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جب صاحب بن عباد کے پاس ان دونوں کی ملاقات ہوئی تو قاضی عبدالجبار نے کہا کہ: "پاک ہے وہ ذات جو فواحشات سے منزہ ہے" (ان کی مراد یہ تھی کہ بندہ خود مختار ہے، اور وہ اپنے برے اعمال کا جوابدہ ہوگا، نیز بندے کو مسلوب الاختیار قرار دینا ذات باری کو ارتکاب فواحش پر وصف اجبار سے متصف کرنے کے مرادف ہے، اس لئے وہ ذات خداوندی کو اس سے منزہ رکھتے ہیں) استاذ ابواسحٰق اسفرائنی نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ: "پاک ہے وہ ذات جس کی پوری بادشاہت میں اس کی مشیت ہی کی کامیاب حکمرانی ہے" (اس سے تمام چیزوں پر محیط صفت ارادہ کی تاکید مقصود تھی، اور یہ کہ خدا کی بادشاہت میں اس کی مشیت کے بغیر بندہ کوئی کام انجام نہیں دے سکتا)

معتزلی صفت "عدل" پر زور دیتا ہے اور آزادی وجواب طلبی کی تاکید کرتا ہے لیکن ہر چیز پر محیط صفت ارادہ اور صفت علم یکون کو نسیاً منسیا کر دیتا ہے، اس کے برخلاف سنی صفت "ارادہ وعلم" کو علی حالہا قبول کرتا ہے، لیکن صفت "عدل" کی طرف اس کو التفات نہیں ہوتا، اور معتزلی وسنی کا ذکر کردہ عمل بمقتضائے حال متذکرہ صدر صفات کے مابین عقلی توفیق کی دشواری کا نتیجہ ہے نصوص میں نہ تو کوئی تعارض ہے اور نہ تناقض، بلکہ یہ صرف عقل انسانی کی کوتاہی وناکامی کا نتیجہ ہے۔ خواہ یہ قصور عبارت کے راستے سے آیا ہو یا اس کے ذاتی اصولوں کے راستے سے۔ اسی عقلی تنگ ذاتی کو المانیا کے عظیم فلسفی "عمانویل کانٹ" نے اپنی مشہور کتاب "نقد العقل البحث" میں مؤکد طور پر ثابت کیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ مشرق ومغرب کی خاک چھاننے کے بعد بھی عقل اس مسئلے میں کوئی حل پیش نہیں کر سکی۔ اور صحابۂ کرام کے واسطے دربار رسالت سے زیر بحث مسئلے کی عقدہ کشائی کو تا ہنوز انفرادیت وافضلیت کا مقام حاصل ہے۔ اگر ہم اس مسئلے کو موضوع بحث بنائیں کہ یہ درس اور تحقیق ومطالعہ کے میدان سے متجاوز نہ ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اور ہمیں اپنے مخالفین کی تکفیر سے اجتناب کرنا چاہئے نیز میرا تو عقیدہ ہے کہ ہر بحث وتنقیب کے بعد وہ پامثبوت سے شائع شدہ یہ ایمانی حل (کل یعمل لما خلق له او لما یسر له[1]) "ہر آدمی وہی کام کرتا ہے جس کے لئے اس کی تخلیق ہوتی ہے، اور وہی راستہ اختیار کرتا ہے جو اس کے لئے آسان کیا گیا ہے"۔ ہمارے لئے انشاء اللہ ایمان کا سبب بنے گا۔

۲- صفات باری تعالیٰ کا مسئلہ

استاذ غزالی نے قول الٰہی "ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی" (پھر وہ لگا اور جھکا) سے متعلق تفسیری اختلافات کے ضمن میں صفات الٰہی اور اس کے افعال کے موضوع کو بھی اٹھایا ہے

---

(۱) رواہ البخاری، کتاب القدر، باب جف القلم علی علم اللہ۔

حالانکہ اس آیت کی تفسیر عقیدے کے ایک مسئلے کے صرف ایک جزیئے کی تصویرکشی کرتی ہے، اور اس مسئلے میں فقہاء و محدثین کے مابین کوئی اختلاف نہیں ہے، کیونکہ اصلاً یہ مسئلہ فقہاء کے دائرہ کار سے خارج ہے، اس کا معاملہ بالکل جبر و اختیار کی طرح ہے، محدثین کے مابین متداول مرویات کے بجائے نصوص قرآنی نے اس مہتم بالشان مسئلے کو عقل منقاد پر فرض کیا ہے، اگر ہم اس سلسلے کی تمام مرویات سے صرف نظر کرلیں تب بھی اس مسئلے کی نوعیت کوئی اور نہیں ہوسکتی، کیونکہ بہت سے مسائل مثلاً: مجیٔ، اتیان، ید، وجہ، عینین، فوقیۃ و کافیۃ، رویۃ ایسے ہیں جو قرآنی اصول سے ثابت ہیں، اور ارشاد باری " ثم دنیٰ فتدلّیٰ " کی محدثین کی تفسیر مزید پیچیدگی کا باعث نہیں بن سکتی، محدثین نے اپنی مرویات سے ان عظیم ترین تضایا کو وجود نہیں بخشا، بلکہ اہل سنت کی وجہ سے انہوں نے صفات باری کے انکار و تعطیل میں غلو کرنے والے معتزلہ و فلاسفہ کی مقاومت کی ہے، اور اہل سنت ان صفات کی کیفیت کو تویل خداوندی میں[۲] دینے اور انھیں بلا تاویل تسلیم کرنے کے حق میں ہیں۔

ہر منصف مزاج پر یہ حقیقت عیاں ہوچکی ہے کہ اہل سنت کا موقف ہی عقلی و نقلی حیثیت سے صوابدید و درستگی کا حامل ہے، اس لئے استاذ غزالی کا اہل حدیث یا ان نئے علماء کو جنھوں نے اسلامی تراث تک دسترس حاصل کی، بغض مسئلہ کو چھیڑنا، اور اس سلسلے کی باتوں کو نقل کیا یا اہل سنت میں سے قدیم علماء توحید کی آراء کو دہرایا، اپنی شدید ترین ملامت کا نشانہ بنانا میرے فہم سے بالاتر ہے لیکن اگر ہم محدثین کی مرویات سے اغماض کرکے قرآنی ٹکڑا " ثم دنیٰ فتدلیٰ " سے مراد جبریل ہی کو لےلیں تو اتیان، مجی، نزول، دکافیہ، فوقیہ، ید، عینین اور وجہ کے متعلق ہمارا کیا ارشاد ہوگا، نیز خود علم، سمع، بصر، کلام ان سب صفات کے متعلق ہمارا کیا موقف ہوگا۔

تفویض کیفیت کی تسلیم اور ارشاد خداوندی " لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع البصیر " (اس جیسی کوئی چیز نہیں (نہ ذات میں نہ صفات میں) اور وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے)۔ پر ایمان کے سوا ہمارے لئے کوئی دوسرا راستہ ہے ہی نہیں، اور یہی اہل سنت والجماعۃ کے فقہاء، محدثین، مفسرین اور اصولیین و متکلمین کا مذہب ہے۔

۳- جانی قصاص کا مسئلہ

شیخ غزالی نے اس مسئلے میں امام ابوحنیفہ کا دفاع کیا ہے۔ ہم سب کو معلوم ہے کہ ان کا یہی مذہب ہے۔ اور اسی کو بنیاد بناکر مذہب اہل حدیث کی مخالفت کی ہے گویا کہ ان کی نظر میں امام ابوحنیفہ اہل فقہ کے واحد نمائندہ ہیں، اور شافعی، احمد، مالک، لیث اور ثوری و داؤد مکتب اہل حدیث کے نمائندہ

---

(۲) مؤلف نے اپنی تحریر میں تفویض کا لفظ استعمال کیا ہے، جس سے ان کی مراد تفویض المعنی ہے، لیکن تفویض المعنی کو سلف کی طرف منسوب کرنا درست نہیں ہے، بلکہ صحیح بات وہی ہے جو میں نے ترجمے میں پیش کیا یعنی تفویض الکیفیۃ کے سلف قائل تھے۔

ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ابوحنیفہ کو مدرسۂ رائے کی نمائندگی کے باوجود زمرہ اہل حدیث سے خارج کرنا غیر ممکن ہے، اسی طرح شافعی، مالک، احمد، اور دوسرے کبار فقہاء کا نام فقہاء کی فہرست میں مندرج نہ کرنا بہت مشکل ہے، کیونکہ تمام کا تعلق فقہ و حدیث اور سنت سے ہے۔

اسی مسئلے سے متعلق ابن رشد کے یہاں فقہاء کا مذہب اس طرح ہے :

ا ۔ شافعی، ثوری، احمد اور داؤد نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ " کافر کے بدلے مسلم کو قتل نہیں کیا جائے گا " یہی ارشاد نبوی بھی ہے، اور اس حدیث نبوی کو انہوں نے کلام الٰہی " النفس بالنفس " (جان کے بدلے جان ماری جائے گی) کے لئے مخصص مانا ہے۔

ب ۔ ابوحنیفہ، ان کے اصحاب اور ابن ابی لیلیٰ کا قول ہے کہ " مسلم بھی کافر کے بدلے قتل کیا جائیگا "۔ انہوں نے اپنے اس موقف میں حدیث نبوی " لایقتل مسلم بکافر " کا انکار نہیں کیا ہے، بلکہ انہوں نے عبدالرحمٰن البیلمانی کی حدیث بالفاظ " قتل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رجلا من اہل القبلۃ برجل من اہل الذمۃ وقال انا احق من وفی بعہدہ "[1] (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ذمی کے بدلے ایک مسلم کو قتل کیا اور کہا کہ میں وفار عہد کا سب سے زیادہ حقدار ہوں) سے اس کی تخصیص کرتے ہوئے کہا ہے کہ حربی کافر کے بدلے مسلم قتل نہیں کیا جائے گا، لیکن محدثین نے عبدالرحمٰن البیلمانی کی تضعیف کی ہے اور اس بنیا دپر ان کی اس حدیث پر مبنی تخصیص مذکور کو قبولیت کے مقام پر نہیں رکھا ہے، نیز حدیث " لایقتل مسلم بکافر " کو علی حالہ برقرار رکھ کر اسی کو آیت کریمہ کا مخصص مانا ہے۔

ج ۔ مالک ولیث کا مذہب ہے کہ " اگر مسلم کافر کو دھوکے سے قتل کر دے تبھی اس کے بدلے اس کو قتل کیا جا سکتا ہے "[2]۔

ابن رشد کے کلام مذکور سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ: ابوحنیفہ نے حدیث " لایقتل مسلم بکافر " کا لحاظ نہیں کیا، بلکہ دوسری حدیث سے اس کی تخصیص کی ہے، اور صحیح الاسناد حدیث کے ابطال (جیسا کہ استاذ غزالی نے ان کی طرف نسبت کی ہے) اور دوسری حدیث سے اس کی تخصیص (جیسا کہ ابن رشد کا امام موصوف کے متعلق دعویٰ ہے) کے مابین جو بعد ہے وہ اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔

اور حدیث مذکور نص قرآنی کے مخالف نہیں بلکہ مخصص ہے، اور یہ بہت بڑا فرق ہے۔

اور زیر بحث مسئلے میں اختلاف فقہاء و محدثین کے مابین نہیں بلکہ فقہاء ہی میں منحصر ہے، الا یہ کہ ہم دوسروں کو قائمہ فقہاء سے

---

(۱) اسے دارقطنی نے سنن میں روایت کیا ہے، اس کی سند میں تین تین راوی ضعیف اور متروک ہیں۔ دیکھئے: نصب الرایہ، کتاب الجنایات، باب ما یوجب القصاص۔ (۲) بدایۃ المجتہد ۲/۳۴۴ ۔

خارج کر کے صرف ابوحنیفہ کو فقیہ تسلیم کریں، اور یہ ہمارے لئے انتہائی اہمیت کی حامل حقیقت ہے، کیونکہ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ شیخ غزالی کی کتاب میں وارد شدہ اختلافات ایسے دو متوازی مکاتب فکر کی تشکیل کو جائز قرار نہیں دیتیں جن میں سے ایک کا تعلق اہل فقہ ہو اور دوسرا اہل حدیث سے متعلق ہو، اور ان کے مابین موضوع نزاع حدیث نبوی ہو۔ نہ ہی اس بات کی روادار کھتی ہیں کہ فقہاء صحیح الاسناد احادیث کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، اور ان کے برخلاف محدثین نص قرآنی کے مخالف ہونے کے باوجود ان سے چمٹے رہتے ہیں، یہ تو معلوم ہی ہے کہ صحیح احادیث کے رفض وانکار کا دروازہ کھولنا انتہائی خطرناک ہے، اسی طرح صحیح احادیث کے متعلق مخالفت قرآن کا عقیدہ رکھنا پہلی صورت سے کم مہلک نہیں۔ علماء دین کو عام حالتوں میں تطبیق پر دسترس حاصل ہے، نیز تمام فقہاء و محدثین احترام حدیث، اس کے عدم ابطال اور مخالفت کتاب اللہ سے اس کے تحفظ پر سخت حریص ثابت ہوئے ہیں، ساتھ ہی اصول فقہ کی مبادیات راہ تطبیق میں سامنے والی مشکلات کے لئے کامیاب آلہ ہیں۔

۴۔ شادی میں جبر واختیار کا مسئلہ

شیخ محمد غزالی نے رائی اور روایت یا اہل فقہ (یا احناف، وشافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ میں سے اہل حدیث کے درمیان اختلاف کی نمونہ آرائی کے لئے جن مسائل کو چھیڑا ہے انھیں میں سے "شادی میں رضا و جبر" کا مسئلہ بھی ہے، ہم تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ رضامندی شادی اور تمام شرعی معاملات کا قاعدہ کلیہ ہے، لیکن شادی میں رضامندی کے اس عام قاعدے سے کچھ چیزیں مستثنیٰ ہیں، ان مباح مستثنیات کے متعلق فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، انہوں نے بیوی کے ولی کو چند اسباب و مبررات مثلاً کم سنی، بھولاپن (بالخصوص لڑکیوں میں) فساد کے خوف، یا شادی کی عمر گذر جانے کے ڈر کی بناء پر لڑکی کی عدم رضا کی صورت میں بھی حق ازدواج دیا ہے اور انہوں نے یہ موقف فقہ و حدیث سے اغماض فرما کر اختیار نہیں کیا ہے، جیساکہ شیخ غزالی کی رائے ہے بلکہ نقلاً ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے آن کے والد محترم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تزویج پر ان کی عمر کے چھٹے یا ساتویں سال میں شادی کی اور نویں سال میں رخصتی کرائی"(۱)

اسی طرح فقہاء اپنے اس موقف میں "عورت اور اس کی شخصیت کی توہین و تحقیر کے رسم و رواج" کی رو میں نہیں بہے ہیں، بلکہ بشمول ابوحنیفہ تمام فقہاء عورت کی سعادت برآری، اس کے شرعی حقوق کے تحفظ، شادی میں اس کی خوشنودی اور ساتھ ہی سنت نبوی کے اجراء پر شدید حریص ثابت ہوئے ہیں، ذیل میں اس مسئلے کی تفصیل دی جارہی ہے:

---

(۱) بدایۃ المجتہد ۸/۲

ا ۔ ابوحنیفہ اور مالک کا خیال ہے کہ " باپ اپنی ثیبہ غیر بالغہ بیٹی کو نکاح پر مجبور کر سکتا ہے ۔
امام شافعی کا ارشاد ہے ، کہ نہیں کر سکتا ، (امام ابوحنیفہ نے عدم بلوغ کو مدنظر رکھا ہے اور امام شافعی نے ازدواجیت جو مفید تجربہ ومعلومات ہے کا اعتبار کیا ہے)

ب ۔ مالک ، شافعی اور ابن ابی لیلیٰ کا خیال ہے کہ : صرف باپ کو اپنی بالغہ باکرہ کو نکاح پر مجبور کرنے کا حق حاصل ہے ۔ امام ابوحنیفہ ، ثوری ، اوزاعی اور دیگر فقہار کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ : باپ کو بھی اس کی رضامندی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے (امام شافعی نے اس کی دوشیزگی کو بنیاد بنا کر فیصلہ کیا ہے اور امام ابوحنیفہ نے اس کی بلوغت کا لحاظ کیا ہے)

ج ۔ اس بات پر تمام متفق ہیں کہ باپ صرف بیٹی ہی کو نہیں بلکہ کمسن بیٹے کو بھی نکاح پر مجبور کر سکتا ہے ، اسی طرح اپنی کمسن غیر شادی شدہ بیٹی سے طلب رضا کے بغیر اس کو شادی پر مجبور کر سکتا ہے ۔ (یہ موقف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ طریقہ ازدواج نبوی کے اتباع میں اختیار کیا گیا ہے)

د ۔ ابوحنیفہ کا قول ہے : صغیرہ پر ہر اس شخص کو حق اجبار حاصل ہے جسے اس پر حق ولایت حاصل ہے ، خواہ وہ باپ ہو ، خواہ وہ کوئی قریبی رشتہ دار یا اور کوئی ۔ لیکن بلوغت کے بعد اسے نکاح کے فسخ ونفاذ کا اختیار ہوگا ۔ (یہاں پر صغرسنی اور اس پر طاری ہونیوالی بے خبری اور ناتجربہ کاری کو ملحوظ رکھا گیا ہے)

اس جگہ ہم ملاحظہ کر رہے ہیں کہ شرط رضا کی مستثنیات لڑکیوں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ لڑکوں کو بھی شامل ہیں ، اس لئے یہ مسئلہ "دستور توہین عورت " سے متعلق نہیں بلکہ اس میں نابلد غیر بالغ بچوں کے ساتھ خیراندیشی ، بگاڑ سے ان کے تحفظ اور کارآمد مصالح کی برآری کا جذبہ کارفرما ہے ، اسی طرح یہ بھی امر مشاہد ہے کہ امام مالک اور شافعی نے باپ کے دل میں اپنی بیٹی کے لئے بے مثال درد اور اس پر اس کی بے شفقتوں کے پیش نظر حق ترزیج کو اسی تک محدود رکھا ہے ، جب کہ ابوحنیفہ نے اس کو اتنی وسعت دی ہے کہ ہر وہ شخص اس کے گھیرے میں آگیا ہے جس کو چھوٹی بچی پر حق ولایت حاصل ہے ، لیکن یہ پورا اختلاف فقہار کے درمیان ہے نہ کہ فقہار و محدثین کے درمیان ، اور ہر ایک نص کو سامنے رکھ کر اجتہاد کرتا ہے ، اس لئے اس اختلاف کو رائے اور روایت کے درمیان وقوع پذیر اختلاف کے نمونے کے روپ میں پیش کرنا بالکل جائز نہیں ہے ، اگر کوئی نصوص کی گرفت سے آزاد ہو کر اپنا موقف بنائے تو اس کا موقف اہل اسلام کے یہاں شرف قبولیت سے نوازا نہیں جا سکتا ۔

۵ ۔ مطلقہ ثلثہ کیلئے سکنیٰ ونفقہ کا مسئلہ

شیخ غزالی نے راوی اور روایت کے بیچ اختلاف کی دوسری مثال میں اس مسئلے کو پیش کیا ہے ، اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے

نفقہ کا دفاع کیا ہے جو ظاہر قرآن کو سنت متبعہ کی شکل دیتا ہے، اور جس کی بنیاد پر انہوں نے فاطمہ بنت قیس کی حدیث " جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے مطلقہ ثلاثہ ہونے کا علم ہوا تو آپ نے ان کو حق نفقہ و سکنیٰ سے معطل کر دیا " کو نسیان کا شکار قرار دے کر مسترد کر دیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس موقف کو جو ظاہر قرآن کے تمسک پر مبنی ہے، رائی کے لئے نمونہ بنانا کم از کم میرے فہم سے بالا تر ہے۔

دوسرے نقطۂ نظر سے (عدم وجوب نفقہ و سکنیٰ) کو شرعی جواز حاصل ہے، اخبار آحاد سے عموم قرآنی کی تخصیص ائمہ کرام کا طریقہ رہا ہے، انہوں نے فاطمہ بنت قیس کی اس روایت کی تصحیح کی ہے، اور اسے ارشاد باری " اسکنوھن من حیث سکنتم " (ان مطلقہ عورتوں کو اپنی مقدور کے موافق رکھا کرو جہاں تم خود رہتے ہو) کی عمومیت کے لئے مخصص مانا ہے، نیز انہوں نے علی ابن ابی طالب، ابن عباس اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے مروی شدہ روایات کہ " سکنیٰ اور نفقہ کی حقدار وہی عورت ہے جس کے شوہر کو حق رجعت حاصل ہے " سے اس کو تقویت بخشی ہے، اور انہوں نے کہا ہے کہ سکنیٰ کی مشروعیت صرف مراجعت پر اکسانے کے لئے ہے۔ جیسا کہ آیت کریمہ " لا تدری لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا "[1] (شاید اللہ واقعہ طلاق کے بعد کوئی امر پیدا کر دے، یعنی مصالحت کی صورت ہو جائے) میں تصریح ہے۔ اس آیت نے اس حقیقت کو مبرہن کر دیا کہ مطلقات کو گھر میں ٹھہرانے کا مقصد صرف امید رجعت ہے، اور چونکہ بصورت بینونت شوہر کا حق رجعت ختم ہو جاتا ہے، اس عورت کا ازدواجی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رہ جاتا اور اس صورت میں شوہر کے پاس اس کے ٹھہرنے کے لئے کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہتی بلکہ شوہر کے لئے اس کی حیثیت اجنبی عورت کی ہو جاتی ہے، اس لئے اس صورت میں اس کے لئے نہ سکنیٰ ہوگا نہ نفقہ۔

پھر اس واقعے میں فاطمہ بنت قیس پر نسیان کا طاری ہونا خارج از امکان ہے، کیسے ممکن ہے کہ وہ اس صورتحال کو ان کی طرف سے سکنیٰ و نفقہ کے مطالبہ پر دربار نبوی سے جواب نفی میں صادر ہو رہا ہے ذھول کی نذر کر دیں۔ کیا اس مختصر مگر مؤثر گفتگو پر نسیان کا تسلط ہو سکتا ہے؟

اس لئے صحیح بات یہ ہے کہ حضرت فاطمہ کے امکان نسیان کو بنیاد بنا کر اس حدیث کو معلول قرار دینا بالکل بے بنیاد ہے، غالباً یہی سبب ہے کہ شعبی جیسے شخص کو اس پر عمل کا اصرار رہا ہے، اور مفسر کبیر قرطبی جیسے لوگوں نے اس کو مستحسن قرار دیا ہے، یہ کوئی غیر ثابت شدہ روایت نہیں ہے جیسا کہ مؤلف کا خیال ہے، بلکہ اسے دوسری روایت کی تائید حاصل ہے، اور ان دونوں روایتوں کو کتاب اللہ کی پشت پناہی

---

(۱) الطلاق : ۱

حاصل ہے۔

٦۔ تجارتی مال میں زکوٰۃ کا مسئلہ

شیخ غزالی کے منتخب کردہ مسائل میں سے مال تجارت میں زکوٰۃ کا مسئلہ بھی ہے۔ ان کی تحریر نے اس امر کو بھی بے نقاب کیا کہ علم حدیث سے اشتغال رکھنے والے ایک جزائری شخص نے اس مال میں زکوٰۃ کی عدم فرضیت کا فتوی دیا ہے، اور شیخ غزالی نے اس فتویٰ کو صرف مسترد ہی نہیں کیا بلکہ پوری قوت سے اس کی مقاومت کی ہے[1]۔ ان کا یہ طرز عمل تو کسی کے لئے محل اعتراض نہیں، لیکن اگر شیخ غزالی جزائری مفتی کو طفل دبستان قرار دیں، اور اہل فقہ سے نبرد آزمائی میں ایسے اہل حدیث کا ترجمان تسلیم کریں تو یہ چیز قابل قبول نہیں ہوسکتی۔

پھر جزائری مفتی کوئی مجتہد تو ہیں نہیں، وہ تو ہماری طرح تراث سلف کے ناقل ہیں، اور "سامان تجارت میں زکوٰۃ نہیں" یہ ان کا خود ساختہ قول تو ہے نہیں بلکہ اصلا یہ حافظ ابن حزم کا قول ہے، اور ابن حزم کا حال یہ ہے کہ انھیں ایسی کوئی نص نہیں مل سکی جسے بنیاد بنا کر وہ سامان تجارت میں اس عبادت کی فرضیت کو تسلیم کریں۔ دوسروں کی مستدل مرویات کو انہوں نے ناقابل اعتبار قرار دے دیا ہے اور کئی بار مؤکد طور پر کہا ہے کہ "ملک و بیرون ملک کے مسلم و غیر مسلم تجار کے اموال تجارت میں زکوٰۃ یا عشر وصول کرنا جائز نہیں ہے[2]"۔ اگر شیخ غزالی اموال تجارت میں وجوب زکوٰۃ کے قائلین میں سے ہیں تو حضرت ابوذر، سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہما اور دوسروں کی مرویات جو ابن حزم کے یہاں درجہ اعتبار سے فروتر ہوچکی ہیں کی تصحیح ان کا علمی فریضہ تھا[3]۔ لیکن افسوس یہ کہ انہوں نے ایسا نہ کرتے ہوئے صرف اتنی سی بات پر اکتفا کرلی کہ: یہ فتویٰ اسلام اور اہل اسلام کے لئے سخت مضرت رساں ہے[4]۔ لیکن یہ بات ناقابل تسلیم ہے، "معترضین" کہہ سکتے ہیں کہ فرضیت زکوٰۃ ہی اسلام اور اہل اسلام کے لئے نقصان دہ ہے پھر ان کو اپنے دعویٰ میں کسی قطعی نص کی پشت پناہی بھی تو حاصل نہیں ہے۔ اور معترضین کی دلیل یہی ہے کہ مؤلف کو بجز چند عمومات قرآنی کے جو انفاق کا حکم تو دیتی ہیں لیکن اس مسئلے پر ان کی دلالت غیر مسلم ہے کوئی قابل استناد نص حاصل نہیں ہے، اور سامان تجارت میں جو لوگ۔ اور انہیں کی اکثریت ہے۔ وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں وہ ان سے دلیل نہیں پکڑتے۔ اس سلسلے میں "المنار" میں منقول ہے کہ "جمہور علماء سامان تجارت میں وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں، لیکن اس سلسلے میں کتاب

---

(١) ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ر ٢٥

(٢) المحلی، مسئلہ رقم ٧٠٢ ص ر ٢٤١١

(٣) کتاب مذکور ص ر ٢٢٣۔ اور بعد کے صفحات۔

(٤) زیر بحث کتاب ص ر ٢٥

سنت سے کوئی قطعی دلیل نہیں ہے بلکہ چند ایسی روایات منقول ہیں جن کو باہم دیگر تقویت حاصل ہوتی ہے(۱) فقہ السنۃ للشیخ سید سابق ج ۱ ص ۳۲۵
جو لوگ سامان تجارت میں زکوٰۃ کے قائل نہیں ہیں وہ ان مرویات کو ناقابل اعتبار تسلیم کرتے ہیں اور انہوں نے قیاس کی بنیاد پر کسی عبادت کی فرضیت کا صاف انکار کر دیا ہے، اسی لئے انہوں نے کہا ہے کہ اموال تجارت میں زکوٰۃ کی فرضیت بالکل بے اصل ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ جزائری مفتی اہل حدیث یا اہل روایت کی ترجمانی نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ ابن حزم ظاہری کے متبعین میں سے ہیں اور مذہب ابن حزم کی رو سے ان کا فتوی صحیح ہے۔ اس مسئلے میں ابن حزم کو جمہور اہل سنت کے مخالف ہونے کے باوجود مضبوط اصولی میراث کی تائید حاصل ہے، اور شیخ غزالی کے موقف کو اگرچہ عموم قرآنی کی حمایت حاصل ہے لیکن ان کا یہ موقف پوری کتاب میں ان کی یلغار کا ہدف بنے ہوئے اہل حدیث کے موقف کے عین مطابق ہے۔ مذکرہ صدر ملاحظات حسب ذیل سوالات کو جنم دیتے ہیں:

۱۔ کیا کسی فقیہ کو ایک مسئلے میں اخبار آحاد کے ابطال اور دوسرے میں اس کی تسلیم کا حاصل ہے؟ نیز اخذ ورد کے اصولی قواعد کیا ہیں؟

۲۔ کیا قیاس یا غیر ثابت شدہ مرویات کی بنیاد پر زکوٰۃ جیسی عبادت کے وجوب کا موقف اختیار کرنا جائز ہے؟ اور اگر بعض فقہاء اس عبادت کے جواز اور بعض اس کے عدم جواز کی راہ اپنائیں تو کیا یہ عقلی بحران اور منطق کی بے بضاعتی کی دلیل ہوگی؟

۳۔ اور بحیثیت عموم: وہ صحیح شرعی اسلوب کیا ہے جس کا ہم اپنی بحثوں اور علمی اختلافات میں التزام کریں؟

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ ہمیں دعوت کے میدان میں بہترین حکمت عملی اور پند و موعظت کا اسلوب اختیار کرنا چاہیئے، اور ترش روئی سخت مزاجی اور توہین شعاری کے بجائے تعلیم و تربیت کو نقش راہ بنانا چاہیئے، نیز عالم اسلام میں معرکہ آرائی کی آگ دھڑکانے کے بجائے خود سر سیکولر کی مقاومت کے لئے اجتماعی جدوجہد ہمارا بنیادی فریضہ ہو۔ (الاعتصام جمادی الاولی ۱۴۱۰ھ، موافق دسمبر ۱۹۸۹م) ○○

ڈاکٹر اسلم حنیف

سرِ شاخِ طوبیٰ

"کی ایک فکر انگیز نظم"

معاصر شعری ادب کے پیش روؤں میں فضا ابن فیضی کا نام نہایت عقیدت و احترام سے لیا جاتا ہے ، وہ تقریباً پانچ دہائیوں سے ادب کی خدمات میں منہمک ہیں، ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں اور تابناک پہلو یہ ہے کہ اس طویل مدت میں انہوں نے رومانی عقلیت، ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور جدید ترین ادب کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے ، مختلف نظریات کو ابھر کر ڈوبتے ہوئے دیکھا ہے ۔ لیکن کسی مخصوص فکر کے دائرے میں قید ہونے کے بجائے ان کے افادی رنگوں کے عکس سے استفادہ ضرور کیا ہے۔ شخصیت میں مضمر یگانگی، تحفظ اور تنہا روی یہ عناصر، ذات پر اعتماد کا نتیجہ قرار دیئے جا سکتے ہیں ۔ شخصیت میں اعتماد کا جذبہ اسی وقت پیدا ہوتا ہے ، جب اپنی وراثت و روایت اور لمحۂ آئندہ کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں ہوتی ، جو لوگ ہوسِ نقد اور سستی شہرت کی خاطر روایت سے انحراف کو ترجیح دیتے ہیں ۔ فضا صاحب کی طبیعت ان سے بالکل مختلف ہے ، وہ قدیم اقدار کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے فنی سطح پر نئے امکانات کو سمیٹنے پر بھرپور یقین رکھتے ہیں ، اس لئے ان کی شاعری ہیئت کے اعتبار سے روایتی اور موضوع و مواد کے اعتبار سے جدید نظر آتی ہے ، اس بات کی شہادت ان کی غزل، رباعی اور نظم کے بڑے حصے کو سامنے رکھ کر دی جا سکتی ہے ۔

فضا ابن فیضی اس عہد کے بڑے فنکار ہیں ، اور انہوں نے اپنی گوناگوں ، متنوع اور ہمہ گیر فنی شخصیت کے اظہار کے لئے اردو شاعری کی کئی اصناف کو وسیلے کے طور پر قبول کیا ہے ۔ لیکن کسی بھی صنف کو برتتے میں اپنے انفرادی اسلوب و آہنگ کو مجروح نہیں ہونے دیا ، فضا صاحب کی اس مخصوص شعری گونج کو اردو شاعری کبھی فراموش نہیں کر سکے گی ۔

"سرِ شاخِ طوبیٰ" فضا صاحب کی مذہبی نظموں کا مجموعہ ہے ، لگ بھگ پینسٹھ نظموں پر مشتمل یہ مجموعہ دو سو تینتس صفحات کو محیط ہے ، حمدیہ اور نعتیہ کلام کے علاوہ ، اور دیگر موضوعات پر بھی بہت سی نظمیں اس میں شامل ہیں ، آخر میں " گل نغمہ " کے عنوان

سے کچھ ترانے مرقوم ہیں ۔

ان سب کے مجموعی مطالعہ کے بعد ہم فضا صاحب کے مذہبی اعتقادات ، ان کے ذہنی مضمرات اور ملی جذبات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں ، وہ سلفی عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں ، اس لئے ان کی عملی زندگی قرآن وسنت کے دائروں میں اسیر ہے ، مسرت کی بات یہ ہے کہ تخلیقی سطح پر بھی ان کی فکر بے راہ روی کا شکار نہیں بن سکی ہے ، ورنہ عام طور پر شاعر کے یہاں جو تخلیقی کیفیت ابھرتی ہے وہ مذہبی نظموں کے میدان کو بھی دیگر اصناف کی طرح سیر کرجاتی ہے اور لاعلمیت وقرآن ناآشنائی کی بناء پر شاعر اس طرف دھیان بھی نہیں دیتا ، فضا صاحب کا یہ محتاط تخلیقی رویہ انہیں اردو کے دیگر اکثر نعت نگاروں کی صف سے الگ کر دیتا ہے ، ان کے کلام کی یہ منفرد جہت قرآن وسنت کی آگہی کا نتیجہ قرار دی جا سکتی ہے ۔

زیر نظر مجموعے کی کوئی بھی نظم ایسی نہیں ہے جو اپنے قاری کو متاثر کئے بغیر رہ سکے ، یہاں ان کے مجموعے پر تفصیلی محاکمہ پیش کرنا ایک وقت طلب مرحلہ ہے ، البتہ جس نظم سے میں بے حد متاثر ہوا ہوں ، اس کا اجمالی طور پر تحلیلی تجزیہ ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

" امّیِ حرف آشنا " نظم کا عنوان ہی چونکا دینے والا ہے ، اردو اور فارسی شاعری میں رسولؐ کے لئے یہ بالکل نئی ترکیب استعمال کی گئی ہے ، اس تحیر آمیز توجیہ کو ہم شاعرانہ تعلّی کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتے ، اس حقیقت پر گفتگو سے قبل پہلے اس نظم کے ابتدائیہ شعر ملاحظہ فرمالیجئے :۔

سرور وصدر انبیا ، کون ، محمدؐ کریم
خواجۂ بزم دوسرا ، کون ، محمدؐ کریم
عالمِ علم کبریا ، کاملِ فنِ ارتقا
امّیِ حرف آشنا ، کون ، محمدؐ کریم

جمہور علماء کا اتفاق اس بات پر ہے کہ آپ اَن پڑھ ہوتے ہوئے بھی زبردست نکتہ سنج ونکتہ دانِ قرآن وحکمت تھے ، لیکن کسی بھی مفسر کی نگاہ یہاں تک نہیں پہونچتی کہ آپ مفسر وشارح ہی نہیں بلکہ باقاعدہ پڑھنا بھی جانتے تھے ۔ فضا صاحب نے دوسرے شعر میں اسی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے ، اس بات کی تصدیق کے لئے ان آیات کی نشاندہی ضروری نہیں جن میں رسولؐ کے متعلق " تلاوتِ آیات " کے بارے میں نمایاں طور پر اشارے موجود ہیں ، کیونکہ بعض علماء تلاوت یا قرأت کے لئے کتاب کے زیر نگاہ ہونے کو غیر ضروری قرار دے سکتے ہیں یعنی صفات کو قوتِ حافظہ کا نتیجہ ۔ اس لئے وہ آیت پیش کر دینا ضروری ہے جس میں پڑھنے کے لئے کتاب یا اوراقِ کتاب کی عدم موجودگی کا جواز بے معنی ہو جاتا ہے ۔

رسول من اللہ یتلوا صحفا مطہرہ — اللہ کا رسول جو مقدس اوراق کو پڑھ کر سنائے

اس کے پیش نظر آپ کو ناآشنائے حرف تصور کرنا تحقیق کی غلطی کے سوا کچھ نہیں، فضا صاحب نے حرف آشنائی کی دلیل کے لئے عالم علم کبریا اور کامل فن ارتقاء کی جو خوبصورت اور بامعنی تراکیب تراشی ہیں وہ بھی قرآنی نصوص کے خلاف نہیں ہیں، آپ کے صاحب علم ہونے کا ذکر ذیل کی آیت میں موجود ہے۔

ولئن اتبعت أهواءهم بعد ما جاءك من العلم۔ (رعد) — اور اگر علم کے باوجود تو ان خواہشات پر گامزن ہو۔

فضا صاحب نے اگرچہ آپ کے بارے میں یہ اشارہ نہیں کیا ہے کہ آپ پڑھنے کی صفت کے علاوہ لکھنے پر بھی قدرت کاملہ رکھتے تھے، لیکن اس بحث کے ضمن میں بہتر معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی ان تحقیقات کو بھی اجمالی طور پر پیش کر دوں جو میرے ایک نا تمام مقالے کا حصہ ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمی حیثیت کے بارے میں لفظ " امی " سے کئی قسم کے مغالطے پیدا ہوئے ہیں، چنانچہ کسی نے اس کو " ام " سے منسوب کرکے ماں کے بے لکھے پڑھے ہونے کا جواز پیش کرتے ہوئے اس صفت کو آپ پر منطبق کیا ہے، کسی نے بے پڑھے لکھے انسان کے اوصاف کو بچہ کی پیدائشی حالت پر محمول کیا ہے، بعض نے " ام القریٰ " کی طرف نسبت دیتے ہوئے قریش کی جہالت کو پیش نظر رکھا ہے، زجاج نے لاعلمیت کو عرب کی مخصوص صفت قرار دیتے ہوئے " امیَ " کے معنی امت عرب کی صفت پڑھا لکھا ہونا تحریر کیا ہے۔ اس سلسلے میں صحیحین میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے مروی یہ حدیث بھی پیش کی جاتی ہے، کہ رسول اکرم نے فرمایا:

أنا امة أمية لا نكتب ولا نحسب۔ — یعنی ہم امی جماعت ہیں نہ لکھنا ہی جانتے ہیں نہ حساب کرنا

اس سلسلے میں بنیادی سہو یہ پیدا ہوا ہے کہ لفظ " امی " کو " ام " (ماں) سے نسبت دیتے ہوئے اس کی ناخواندگی پر زور صرف کیا گیا ہے جب کہ زمانی اور مکانی قیود سے ماورا اس کی اہم اور ناقابل فراموش خصوصیت " شفقت آمیز تربیت " ہوتی ہے، اس لحاظ سے اگر " امی " کے معنیٰ " گہوارہ تربیت " کئے جائیں تو معنیٰ کی وسعت اور رسول کی انفرادی شان کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اس کے علاوہ جمع کی صورت (امیین) میں بھی اس کے معنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس سے قطع نظر عربی زبان و ادب میں نسبت کے لئے صفات یا مرکب ناموں کے کسی ایک لفظ سے پورا مفہوم ادا کرنے کی بہت سی مثالیں مل جائیں گی، یہاں صرف ایک مثال پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ عرب کا ایک شعر ہے ؎

قلت لها قفي فقالت لي " ق " ✽ لا تحسبي أنا الإيجاف

یعنی میں نے اس سانڈنی سوار عورت سے کہا، ذرا ٹھہرجا اور یہ خیال مت کر کہ ہم سانڈنی ہانکنا بھول گئے ہیں۔ اس پر اس نے جواب دیا "ق" یعنی قفت، مطلب یہ ہے کہ میں ٹھہر گئی ہوں۔

ظاہر ہے کہ قرآن نے بھی اسی لسانی قرینے کو ملحوظ رکھتے ہوئے "امی" کہہ کر "صاحب ام القریٰ" کے مفہوم کا احاطہ کیا ہے، ذیل کی آیات میں یہ معنیٰ ہٹائے نہیں ہٹتے۔

فآمنوا باللہ ورسولہ النبی الأمی (اعراف) — پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے مکی رسول پر۔

ھوالذی بعث فی الامیین رسولاً منہم (جمعہ) — وہی اللہ ہے جس نے اہل مکہ ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا۔

یہاں زیر بحث لفظ کے معنیٰ "تربیت دینے والا" بھی کئے جاسکتے ہیں اور اس کی تشریح کے لئے مکہ کی جغرافیائی اہمیت اور بیت اللہ کی دائمی حیثیت کو مدنظر رکھنا ہوگا، تاکہ بعثتِ انبیاء کے مقاصد اور ان کی تعلیمات، تبلیغی نوعیات نیز ان کے اثرات کی نشاندہی ممکن ہوسکے۔

ان لفظی و معنوی توضیحات کے بعد اب صرف یہ ثابت کرنا باقی رہ جاتا ہے کہ آپ پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے پر بھی دست گاہ رکھتے تھے اس کے لئے اس آیت کا بغور مطالعہ کرنا ہوگا جسے علماء و شارحین رسول صلعم کے ان پڑھ ہونے کی دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں۔

وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینک۔ — مطلب یہ کہ اے رسول تو نزول کتاب سے قبل نہ تو قرآن کو پڑھ ہی سکتا تھا اور نہ اپنے داہنے ہاتھ لکھ سکتا تھا۔

بالفاظ دیگر نزول قرآن کے بعد تو ان دونوں صفات سے متصف ہوگیا۔ کتنے صریح الفاظ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت فراہم کردیا گیا ہے، لیکن جو لوگ آپ کو ان پڑھ تصور کرتے ہیں وہ آیت میں مضمر نبوت کے بعد کی کیفیت پر غور نہیں کرتے۔ یہ آیت بالکل ذیل کی آیت کی طرح اپنا مطلب و مفہوم ظاہر کررہی ہے۔ وکذالک أوحینا الیک روحا من امرنا ما کنت تدری ما الکتب ولا الایمان۔

یہاں بھی وحی کے نزول سے قبل آپ کو کتاب و ایمان سے ناآشنا قرار دیا گیا ہے جس کا واضح مقصد یہی ہے کہ بعد نبوت آپ قرآن و ایمان کے بارے میں مکمل طور پر آگاہ ہوگئے تھے۔ تبصرے کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریری و تقریری صلاحیتوں کے مزید انکشافات کا یہاں پیش کرنا متعذر ہے۔ البتہ تاریخ کا یہ اہم واقعہ بھی نظر میں رکھنا چاہئے کہ جس وقت رسول اکرمؐ مرض الموت میں مبتلا تھے، آپ نے امت کی ہدایت کے لئے کچھ لکھنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہوئے کاغذ طلب کیا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے آپ کی تکلیف کے پیش نظر "کتاب اللہ حسبنا" کہہ کر آپ کو روک دیا تھا۔ اس واقعہ سے بھی ہماری بات کی تائید ہوتی

ہوتی ہے۔ رہا[1] منقولہ حدیث کا سوال تو اس کے لئے قرین قیاس بات یہ ہے کہ یہ الفاظ نزول وحی کے قبل کے بھی ہو سکتے ہیں جو من وعن کتب احادیث میں جگہ پا گئے اور ان کی صحت و ضعف کے بارے میں چھان بین نہ کی جا سکی ہو۔

نبوت کے بعد آپ کے پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے کہاں اور کس طرح تعلیم حاصل کی؟ تعلیم و تدریس کے مراحل پر فضا صاحب کی بھی نظر گئی ہے، اور انہوں نے نہایت پر وقار جواب عطا کیا ہے ؎

جس نے بہ پیشِ جبرئیل ، زانوئے درس تہ کیا
فاضلِ مکتبِ حرا ، کون ؟ محمد کریم

اس کی تحلیل کے لئے بھی پہلی وحی کے نزول کا واقعہ دہرانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ ان آیات پر سرسری نگاہ ڈال لیجئے :

اِقراء باسم ربك الذی خلق . خلق الإنسان من علق . اقراء وربك الاکرم الذی علم بالقلم ۔

ان آیات میں قلم کا علم دینے کا واضح ثبوت موجود ہے، اور چونکہ "اقرءِ" قراءۃ سے ہے جس کے معنی پڑھنے کے ہیں، امر کا صیغہ ہے، اور واحد مذکر حاضر کے لئے استعمال ہوا ہے، جس کے معنی ہوئے " اے غار حرا میں موجود ہستی پڑھ " یہ سب جانتے ہیں کہ جس وقت جبرئیل نے آپ سے کہا تھا " اقراء " تو آپ نے معذوری کا اظہار ان الفاظ سے کیا تھا، " مَا أَنا بقاری "، یعنی میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، جبریل نے یہ جواب سن کر آپ کو بھینچا اور پھر کہا " اقراء " آپ نے وہی الفاظ دہرا دیئے، اس طرح تین مرتبہ کے عمل کے بعد آپ نے باقاعدہ صورت میں شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اگر یہاں پڑھنے سے مراد الفاظ کو زبان سے دہرانا تھا تو یہ کوئی ایسا مشکل امر نہ تھا کہ اس پر آپؐ اظہارِ مجبوری فرماتے، اس لئے اس واقعہ کے پس منظر میں جا کر یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جبرئیل نے محض

---

[1] حدیث " انا امۃ امیۃ لا نکتب ولا نحسب ، الشہر ھکذا وھکذا " الحدیث۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے اس لئے اس کی صحت پر کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس حدیث کو قبل نبوت پر محمول کرنا بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کے اخیر میں " الشہر ھکذا وھکذا " یا " صوموا لرویتہ وافطروا لرویتہ " مذکور ہے جو صریح دلیل ہے کہ یہ حدیث صیام رمضان کے بارے میں ہے جس کی فرضیت ۲ھ میں ہوئی ہے۔
اس حدیث کی شرح فتاویٰ ابن تیمیہ جلد ۲۵ ص۱۲۶ تا ص۲۰ تفصیل سے کی گئی ہے، اس میں " امۃ امیۃ " اور " رسول امی " کی بحث بھی بہت مدلل ہے، مناسب ہے کہ صاحب مضمون اسے ملاحظہ فرمالیں، تاکہ اشتباہ رفع ہو جائے۔ (ادارہ)

سے قرآن کے اوراق ساتھ لائے تھے۔ اور غار حرا میں آپ کو پڑھنے اور لکھنے کا معجزہ عطا کر دیا گیا ، فضا صاحب نے غار حرا کو اسی لئے مکتب کہا ہے ، اور یہ اشارہ معمولی ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتا ۔

"حرا کی تلمیح نعتیہ شاعری میں بہت اہمیت کی حامل رہی ہے ، لیکن فضا صاحب نے اس کو رسول کی زندگی کا استعارہ بنا کر پیش کیا ہے ۔ جس سے اس مقام کے بہت سے ابعاد پر روشنی پڑ رہی ہے ، اور خود ہادیِ اسلام کی حیات کے بہت سے پہلو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں ، متذکرہ نظم میں یہ لفظ تین مرتبہ وارد ہوا ہے ۔ ذیل کے یہ شعر ملاحظہ فرمائیے : ؎

ارضِ حرم کی روشنی ، کنجِ حرا کی چاندنی
شمعِ حریمِ اولیاء ، کون ؟ محمد کریم
جس سے عیاں شفق ، سحر ، جلوۂ سِرِّ لا الٰہ
شیشۂ زانوِ حرا ، کون ؟ محمد کریم

کنجِ حرا اور شیشۂ زانوِ حرا کے ندرت آمیز استعارے سیرت رسول کے ان گنت تابناک پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہیں ، پہلے شعر کے پہلے مصرع میں ارضِ حرم اور کنجِ حرا کو منور کرنے والی ذات محدود سی نظر آتی ہے ، لیکن دوسرا مصرع پڑھتے ہی "رحمۃ للعالمین" کا مفہوم جس طرح ذہن میں منقش ہوتا ہے ، اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی ۔

دوسرے شعر میں شیشۂ زانوِ حرا کی ترکیب جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے نادر بھی ہے اور پر لطف بھی ، لیکن کمال یہ ہے کہ اس شعر کی تخلیق کے وقت شاعر کا تخیل جس بلندی کو چھوتا ہے ۔ شاعر حقائق و شعور کی حدوں کو عبور نہیں کرتا ، بلکہ فنی اور مذہبی قابو کی بنا پر وہ رسول کی ذات کو پر نور کہنے کے بجائے صفاتی اعتبار سے آپ کو نور تسلیم کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مبالغہ اور ایسا غلو جو انتہائے مدح کے سبب بذات خود مذمت نما بن جاتے ہیں ۔ فضا صاحب کی شاعری کا دامن ان سے بالکل پاک ہے ۔

" امیِ حرف آشنا " میں شعروں کی تعداد انیس ہے ، ظاہر ہے کہ تمام اشعار کی توجیہ و تجزیہ کا کام لمبا وقت چاہتا ہے آیات و احادیث کے تحت شعری مفاہیم کی گرفت یہاں غیر ممکن ہے ۔ اس لئے اس نظم کے یہ دو شعر پیش کر دینا کافی ہوں گے ۔

مصرعِ کائنات کا عیبِ شکستِ نا روا
حسن میں جس سے ڈھل گیا ، کون ؟ محمد کریم

گو کہ حیات و وقت کے جبر سے دھول دھول ہوں
میں بھی اسی رسول کے باغ کا ایک پھول ہوں

جو لوگ شاعری کے معائب و محاسن، صنائع بدائع اور فنی رموز و نکات کے بارے میں جانتے ہیں وہ یقیناً ایسے شعر کے
تاثر و نفوذ کو نظر انداز نہیں کر سکتے، یہاں فنی اعتبار سے یہ اشارہ بھی کرتا چلوں کہ اس مضاعف بحر میں اکثر شعراء کے یہاں شکستِ
اردا کا عیب پیدا ہو جاتا ہے، جس سے تخلیق کا حسن متاثر ہوتا ہے، فضا صاحب نے پوری نظم میں اس عیب کو داخل نہیں ہونے
یا، یہ ان کے فنی کمال ہی کا نتیجہ ہے۔

دوسرا شعر نظم کا آخری شعر ہے، اور نظم کے تمام اشعار میں جس ردیف و قافیہ کا التزام ہے اس سے بالکل مختلف
ہے، رسول کی مدحت و توصیف کو بیان کرنے کے بعد انفرادی زندگی پر حیات و وقت کے جبر کو نمایاں کرنے کے لئے یہ روئیہ تخلیق
اصا دلکش ہے، لیکن یہاں ذات کے حوالے سے اجتماعی زندگی کے بحران کو ظاہر کیا گیا ہے، اور آفات کا شکار ہونے کے باوجود
دکو رسول کے باغ کا پھول کہنا، رجائی اندازِ فکر کی علامت ہے۔

" سرِ شاخِ طوبیٰ " یقیناً اردو نظمیہ شاعری میں ایک اہم اضافہ ہے، نعتیہ شاعری کے عام پیٹرن سے ہٹ کر فضا
حب نے اس صنف کو قرآن و سنت کے دائروں سے باہر کی ہوا نہیں لگنے دی ہے، اور یہ کام ایسا ہے جو مذہبی تبحرِ علمی
ناممکن ہے۔ ان کے اس مجموعے کا بڑا حصہ کسی نہ کسی احتجاج کو دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، زیرِ بحث نظم کے بارے میں، میں نے جو
ں بات محسوس کی ہے وہ یہ ہے کہ شاعر نے رسول کی جس خاص صفت کو ابھارا ہے دراصل اس کی زیریں تہوں میں یہ احتجاج
پوشیدہ ہے کہ اکثر اکابرین و فقہاء نے " اَفَلَا یَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوبٍ اَقْفَالُهَا " کے اعلان کے باوجود
فکر کی دولت سے استفادہ نہیں کیا، جس کے نتیجے میں مذہبی علوم جمود کا شکار ہو گئے ہیں۔

اس مجموعے کی اشاعت کی ذمہ داری " ادارۃ البحوث الاسلامیہ، جامعہ سلفیہ بنارس " نے پوری کی ہے میں اس ادارہ
لین کی پُرخلوص کوشش پر مبارکباد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن اس مجموعے میں موجود نظم " لالۂ صحرائے کربلا " کی
مت کے بارے میں اراکین ادارہ اور خود فضا صاحب سے مجھے اختلاف ہے۔ واقعۂ کربلا کے سلسلے میں شیعیت کے علمبرداروں
نے جس طرح پامال کیا ہے، ہمیں ان کی ازسرِ نو تحقیق کرنا چاہئے اور انہیں یونہی تخلیق کرنے سے گریز کرنا چاہئے۔

مجھے امید ہے کہ یہ ادارہ آئندہ بھی اس نوع کی تخلیقات شائع کرتا رہے گا۔

کیا اللہ عزوجل مخلوق پیدا کرنے سے قبل ایک پوشیدہ خزانہ تھا؟

بتحقیق: غازی عزیر، ص ب ۲۰۰۸۷، الخبر ۳۱۹۵۲ المملکۃ السعودیۃ

ارباب تصوف عموماً ایک حدیث قدسی اس طرح بیان کیا کرتے ہیں،

کُنتُ کَنزاً مخفیاً فأحببتُ أن أُعرَفُ فَخَلَقتُ الخَلق ۔	اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا میں نے پھر یہ پسند کیا کہ پہچانا جاؤں چنانچہ میں نے مخلوق پیدا کی۔

بعض روایات میں "مخفیا" کے بجائے "لا اعرف" (یعنی جو پہچانا نہ جاتا تھا) "فخلقت الخلق" کے بجائے "فخلقت العباد" اور "فخلقت خلقا"، نیز روایت کے آخر میں "لأعرف"، "فتعرفوني فبي عرفوني"، "تعرفت لهم فبي عرفوني"، "فعرّفتهم بي"، "فعرّفتهم فعرفوني" اور "فعرّفتهم بي فبي عرفوني" وغیرہ اضافی الفاظ بھی ملتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم کی آیت "وما خلقت الجن والانس إلا ليعبدون"[1] (یعنی اور نہیں پیدا کیا میں نے جنوں اور انسانوں کو سوائے اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں) کی تفسیر میں آں رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اس آیت میں ليعبدون کا لفظ دراصل ليعرفون کے معنوں میں آیا ہے" اپنی اس تفسیر کی تائید میں آں رضی اللہ عنہ وہی حدیث قدسی پیش فرماتے ہیں جو اس مضمون کی ابتداء میں اوپر بیان کی گئی ہے۔

مفسر قرآن علامہ آلوسیؒ سورہ الذاریات کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"اور وارد ہے، کنت کنزا مخفیاً فأحببت أن أعرف فخلقت الخلق لأعرف[2]۔"

مشہور صوفی بزرگ محی الدین ابن عربی (جو شیخ اکبر کے نام سے معروف ہیں) "فتوحات المکیۃ[3]" میں اور شیخ سعد الدین سعید الفرغانی نے

---

[1] سورہ الذاریات ۵۶ [2] تفسیر روح المعانی للآلوسی ج ۲۷ ص ۲۲ [3] فتوحات المکیۃ لابن عربی باب ۱۹۸

"منتھی المدارک" میں اس حدیث قدسی کا تذکرہ تھوڑے لفظی اختلاف کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن اگر اس حدیث کو "صحیح" یا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کو درست تسلیم کیا جائے تو سورہ الذاریات کی مذکورہ آیت کا مطلب قرآن کے صریح ارشاد کے خلاف یہ ہوگا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک دنیا کو معرض وجود میں لانے کی حقیقی غرض وغایت یہ تھی کہ انسان وجن بلکہ تمام مخلوق اللہ کی معرفت حاصل کرنے کی جستجو کرے۔ شاید اسی باعث شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا مشہور قول ہے: "من لم یعرف لم یعبد" (یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کو نہیں پہچانا اس نے گویا عبادت ہی نہیں کی)۔ مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب بقول حضرت ابن عباس "لیعبدون" سے اللہ تعالیٰ کی اصل مراد "لیعرفون" ہی تھی تو خواہ مخواہ قرآن نازل فرماتے وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی اصل مراد کے اظہار میں اس قدر تکلف سے کیوں کام لیا؟ سیدھے سادے طور پر آیت میں "لیعرفون" ہی کیوں نہ فرما دیا؟ کیا وہ (نعوذ باللہ) اپنی اصل مراد بیان کرنے سے قاصر تھا؟۔

واضح رہے کہ کلام اللہ کے اصل ترجمان وشارح ومفسر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث قدسی باسناد صحیح ثابت نہیں ہے، خود اکابر صوفیاء نقلاً اس کے عدم ثبوت کے معترف ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ حدیث کشفاً ثابت ہے جیسا کہ محی الدین ابن عربی نے "فتوحات المکیۃ" میں دعویٰ کیا ہے، مگر محدثین کرام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ کسی حدیث کی صحت وضعف کی بنا کشف ومنامات پر نہیں رکھی جا سکتی ہے[4]، مگر اس کے باوجود صوفیاء کے علاوہ بعض متاخرین فقہائے حنفیہ بھی اس حدیث قدسی کی شرح میں مستقل رسائل مرتب کئے ہیں، جن میں سے بعض مکتبۃ الاوقاف الاسلامیہ بحلب (مصر) کے شعبہ مخطوطات میں رقم شمار ۱۳۵ کے تحت محفوظ ہیں۔

زیر مطالعہ حدیث کو امام ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ "الاحادیث القصاص" میں وارد کیا ہے اور فرماتے ہیں:

"یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے، اس کی کوئی سند نہ صحیح ہے اور نہ ہی ضعیف[5]"

امام ابن تیمیہ کی متابعت میں علامہ شیبانی اثری نے "تمییز الطیب من الخبیث[6]" میں علامہ زرکشی نے "تذکرۃ فی الاحادیث المشتہرۃ[7]" میں، علامہ سخاوی نے "مقاصد الحسنۃ[8]" میں، جلال الدین سیوطی نے "الدرر المنتثرۃ[9]" میں، علامہ سمہودی نے "الغماز علی

---

[4] اس بحث کی تفصیل کے لئے راقم کی زیر طبع کتاب "ضعیف احادیث کی معرفت اور ان کی شرعی حیثیت" کا مطالعہ مفید ہوگا۔

[5] احادیث القصاص لابن تیمیہ ص۵۵۔ [6] تمییز الطیب للشیبانی ص۱۳۲ [7] تذکرۃ فی الاحادیث المشتہرۃ للزرکشی ص۱۳۶۔

[8] مقاصد الحسنہ للسخاوی ص۳۲۷۔

[9] درر المنتثرۃ للسیوطی ص۳۳۔

اللماز[10] " میں ، ملا علی قاری حنفیؒ نے " مصنوع[11] " میں ، علامہ حوت بیروتیؒ نے " اسنی المطالب[12] " میں ، علامہ ابن حجر عسقلانیؒ نے " اللآلی " میں اور علامہ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ نے " سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ[13] " میں اس حدیث کو " بے اصل " قرار دیا ہے۔ جب کہ علامہ ابن عراق الکنانیؒ نے " تنزیہ الشریعۃ[14] " میں اور ملا طاہر پٹنی گجراتی حنفیؒ نے " تذکرۃ الموضوعات[15] " میں اسے " موضوع " قرار دیا ہے ، اور اس کے حکم وضع کو امام ابن تیمیہؒ کی جانب منسوب کیا ہے ۔

مگر ملا علی قاری حنفیؒ اپنی دوسری کتاب " اسرار المرفوعۃ فی الاحادیث الموضوعۃ " میں امام ابن تیمیہؒ کے قول نیز زرکشیؒ و ابن حجرؒ کی ان سے متابعت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

" لیکن اس کے معنی صحیح ہیں ، اور اللہ کے اس قول سے مستفاد ہیں ، وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون اس میں " میری عبادت کریں " سے مراد " مجھے پہچان لیں " ہے ، جیسا کہ ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر بیان کی ہے[16] "

ملا علی قاری حنفی چونکہ فکری اعتبار سے ایک جامد مقلد اور مزاجاً صوفی واقع ہوئے تھے اس لئے ان کے نوک قلم سے اس قسم کی چیزیں صادر ہو جانا کوئی انوکھی و نرالی بات نہیں ہے مگر افسوس اور حیرت تو اسماعیل عجلونیؒ کے اس کلام پر ہوتی ہے جسے آں رحمہ اللہ نے " کشف الخفاء و مزیل الالباس " میں ابن تیمیہؒ ، زرکشی و ابن حجر وغیرہم کی آراء اور ملا علی قاری کا مذکورہ معنوی صحت کا دعویٰ نقل کرنے کے بعد اس کی تعقیب کے بجائے استدراکاً یوں رقم فرمایا ہے :

" اور یہ زبان زد ہر خاص و عام ہے ، صوفیہ کے کلام میں یہ بکثرت واقع ہے ، انہوں نے اس پر اعتماد کیا ہے اور اس پر مبنی اپنے اصول وضع کئے ہیں[17] "

علامہ عجلونی جراحیؒ اگرچہ " جامع الصحیح " للبخاریؒ کے ایک مشہور شارح شمار کئے جاتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ وہ تصوف کے بہت زیادہ زیر اثر تھے ، اور محدثانہ طرز تحقیق کے برخلاف بذریعہ کشف والہام حدیث کی تصحیح وتضعیف کے قائل تھے[18] ، فانا للہ الخ ۔

مندرجہ بالا استدراک کی عبارت پڑھ کر ہر شخص محسوس کر سکتا ہے کہ آں رحمہ اللہ نے اگرچہ یہ عبارت اپنی کتاب " کشف الخفاء و مزیل الالباس عما اشتہر من الاحادیث علی السنۃ الناس " میں درج کی ہے ، لیکن اپنی کتاب کے اس عنوان کے ساتھ پوری طرح وفا نہیں کر سکے ہیں ۔ واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم ۔ ...

---

[10] الغماز علی اللماز للسمہودی ص۱۷۳ ، [11] المصنوع للقاری ص۱۴۱ ، [12] اسنی المطالب للحوت ص۲۳۲ ، [13] سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ للالبانی ج۱ ص۹۶ ، [14] تنزیہ الشریعۃ لابن عراق ج۱ ص۱۴۸ ، [15] تذکرۃ الموضوعات للفتنی ص۱۱ ، [16] اسرار المرفوعۃ للقاری ص۱۷۹ ۔
[17] کشف الخفاء للعجلونی ج۲ ص۲۶۲ ، [18] ایضاً ج۱ ص۹ ۔

شمارہ ۹ ✦ ستمبر ۱۹۹۱ء ✦ صفر ۱۴۱۲ھ ✦ جلد ۹

اس شمارہ میں

مدیر

عبدالوہاب حجازی

پتہ

دارالتالیف والترجمہ

بی ۱۸/۱ جی ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰

بدل اشتراک

سالانہ ۴۵ روپئے۔ فی پرچہ ۴ روپئے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

افتتاحیہ
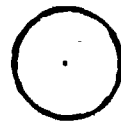
اتباعِ رسالت

نوعِ انسانی کیلئے کیوں ضروری ہے؟

رسالت کی اتباع نوع انسانی پر فرض ہے، انسان کی سعادت اور اس کی ہدایت رسول کی اتباع سے مربوط ہے، اور اس کی ضلالت وشقاوت رسول کی مخالفت میں ہے، عالم میں جو خیر بھی پایا جاتا ہے خواہ عام ہو یا خاص اس کا سرچشمہ رسول کی رسالت ہے، اور عالم میں جو شر بھی پایا جاتا ہے اور انسان کے ساتھ مختص ہے، اس کا سبب رسول کی مخالفت یا احکام رسالت سے بے علمی ہے، دنیا وآخرت میں نوع انسانی کی سعادت رسالت کی اتباع سے مربوط ہے۔

رسالت انسان کے لئے ضروری امر ہے، انسانوں کے لئے اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں، رسالت کے لئے ان کی ضرورت ہر چیز کے لئے ان کی ضرورت سے بالا ہے۔ رسالت عالم کی روح، عالم کا نور اور عالم کی حیات ہے، عالم کے لئے وہ کون سا خیر وصلاح ہے جب روح، حیات اور نور ہی مفقود ہو، دنیا تاریکیوں سے بھری ہوئی اور لعنت زدہ ہے، بجز اس کے جس پر رسالت کا آفتاب طلوع ہوا، ٹھیک اسی طرح انسان کے دل میں جب تک رسالت کا آفتاب ضوفشاں نہ ہو جائے، اور اسے اپنی حیات اور روح کا حصہ نہ عطا کر دے وہ تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے، وہ زندوں میں سے نہیں بلکہ مردوں میں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

أو من كان ميتا فأحييناه وجعلنا له نورا يمشي به في الناس كمن مثله في الظلمات ليس بخارج منها؟ (الانعام/۱۲۲)

کیا وہ شخص جو حیات سے محروم تھا پھر ہم اسے حیات عطا کریں اور اسے نور عطا کریں جسے وہ لوگوں میں پھیلاتا ہو اس جیسا ہے جو تاریکیوں میں ہے جن سے وہ نکلنے والا نہیں۔

یہ مومن کا وصف ہے، جہالت کی تاریکی کو مردہ پڑا تھا، اللہ تعالیٰ نے رسالت کی روح اور ایمان کے نور سے اسے زندہ کر دیا، اور اسے ایسا نور عطا کیا جس کے ساتھ وہ انسانوں میں آمد و رفت رکھتا ہے لیکن کافر و منکر مردہ دل ہے اور تاریکیوں میں پڑا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کو "روح" کا نام عطا کیا ہے، اور روح جب نہ ہو تو یقیناً زندگی مفقود ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

وکذلک أوحینا إلیک روحاً من أمرنا، ما کنت تدری ما الکتاب ولا الإیمان ؟ ولکن جعلناہ نوراً نہدی بہ من نشاء من عبادنا ۔ (الشوریٰ/۵۲)

اسی طرح ہم نے تمہاری طرف اپنے حکم سے روح بھیجی ہے، تم نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ایمان کو جانتے تھے، لیکن ہم نے اسے نور بنایا اس کے ذریعہ ہم جسے چاہتے ہیں اپنے بندوں میں سے ہدایت دیتے ہیں۔

یہاں دو اصلوں کا ذکر فرمایا ہے، اور وہ دونوں "روح" اور "نور" ہیں، روح حیات ہے اور نور نور ہے۔ وحی و رسالت جسے اللہ تعالیٰ نے دلوں کی حیات اور ان کی روشنی کے لئے نازل فرمایا ہے اس کی مثال اس پانی سے بیان فرمائی ہے جسے زمین کی حیات کے لئے وہ آسمان سے نازل فرماتا ہے، اسی طرح اس آگ سے بھی اس کی مثال بیان فرمائی ہے جس سے روشنی حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا ہے:

انزل من السماء ماء فسالت أودیۃ بقدرھا فاحتمل السیل زبدا رابیا، ومما یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃ أو متاع زبد مثلہ، کذلک یضرب اللہ الحق والباطل، فاما الزبد فیذھب جفاء وأما ما ینفع الناس فیمکث فی الأرض کذلک یضرب اللہ

اللہ نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے جس سے وادیاں اپنے اپنے ظرف کے مطابق بہ نکلیں، پھر سیل آب نے چھولتے جھاگ کو اوپر اٹھا لیا اور جن چیزوں کو آگ میں تپاتے ہیں زیور یا دوسرے سامان حاصل کرنے کے لئے ان میں بھی پانی کے مثل جھاگ ہوتا ہے، اسی طرح اللہ حق اور باطل کی مثال بیان کرتا ہے، لیکن جھاگ رائیگاں جاتا ہے، اور جو لوگوں کو نفع دیتا ہے وہ زمین میں ٹک جاتا ہے، اللہ اسی طرح مثالیں

الأمـثـال ۔ (الرعد/۱۷) بیان کرتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے علم کی تشبیہ آسمان سے نازل کئے گئے پانی سے دی ہے ۔ اس لئے کہ اسی علم سے دلوں کی حیات ہے جس طرح کہ پانی سے اجسام کی حیات ہے ، اور دلوں کی تشبیہ وادیوں سے دی ہے ، اس لئے کہ علم کے ٹھہرنے کی جگہ یہی ہے جس طرح وادیاں پانی کے ٹھہرنے کی جگہ ہیں ، کوئی دل ایسا ہوتا ہے جس میں بہت زیادہ علم کی گنجائش ہوتی ہے جیسے کچھ وادیاں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں بہت زیادہ پانی سما جاتا ہے ۔ اور کوئی دل ایسا ہوتا ہے جس میں تھوڑا علم سماتا ہے جیسے کوئی وادی ایسی ہوتی ہے جس میں تھوڑا پانی سماتا ہے ، اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ سیلِ آب پر پانی سے ملنے کے سبب میل کچیل چڑھ آتا ہے لیکن وہ رائیگاں جاتا ہے ، اور اسے پھینک دیا جاتا ہے لیکن لوگوں کے لئے جو نفع بخش ہوتا ہے وہ زمین پر ٹک جاتا ہے ۔ یہی حال قلوب انسانی کا ہے ، ان میں شہوات و شبہات کی آمیزش ہو جاتی ہے ۔ حق جب ان میں نشو و نما پا کر بڑھتا ہے تو یہ شکوک و شبہات ان میں اٹھنے لگتے ہیں ، پھر یہ رائیگاں جاتے ہیں اور ان میں ایمان اور قرآن ٹک جاتا ہے جو اسے اور دوسرے انسانوں کو نفع پہونچاتا ہے ، اسی طرح دوسری مثال آگ کی ہے ۔۔۔ پہلی مثال حیات کے لئے ہے دوسری مثال ضیاء کے لئے ۔

ان دونوں مثالوں کی نظیر وہ دونوں مثالیں بھی ہیں جو سورۂ بقرہ کے شروع میں بیان کی گئی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

مثلهم كمثل الذى استوقد نارًا ۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی الخ

الیٰ قوله

أو كصيب من السماء فيه ظلمات ورعد و برق ۔ یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش نازل ہوئی اس میں تاریکیاں اور گرج اور بجلی ہے ۔ الخ

لیکن کافر و منکر کفر و شرک کی تاریکیوں میں مردہ پڑا ہوتا ہے ، اسے اگرچہ بہیمی اور حیوانی زندگی حاصل ہوتی ہے لیکن وہ حیات روحانی علوی سے محروم ہوتا ہے جس کا سبب ایمان کا سبب ہے اور جس سے انسان کو دنیا و آخرت میں سعادت و فلاح حاصل ہوتی ہے ، اللہ سبحانہ نے رسولوں کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان اس کام کا واسطہ بنایا ہے کہ انہیں یہ بتائے کہ کیا چیزیں انہیں نفع دے سکتی ہیں اور کیا چیزیں انہیں نقصان دے سکتی ہیں اور دنیا و آخرت میں جو امور ان کے خیر و صلاح کا باعث ہیں ان کی تکمیل فرمائے تمام انبیاء و رسل دعوت الی اللہ ، اللہ تک پہونچانے والے صراط مستقیم کی تعلیم و تبلیغ اور اللہ تک پہونچنے کے بعد لوگوں کے احوال کے بیان کے لئے مبعوث فرمائے گئے ، دعوت الی اللہ میں صفات باری تعالیٰ ، توحید ، قضاء و قدر کا اثبات اور اولیاء اللہ اور ان کے اعداء میں ایام اللہ کے نفاذ کا ذکر شامل ہے ، ایام اللہ سے مراد قصص اور امثال ہیں ، صراط مستقیم میں احکام کی تفصیل اور امر

نہی اور اباحت کا بیان اور اللہ جس چیز کو محبوب رکھتا ہے اور جسے ناپسند کرتا ہے ان سب کا بیان شامل ہے، اللہ تک پہونچنے کے بعد کے احوال میں، یوم آخرت، جنت اور جہنم اور ثواب اور عقاب پر ایمان لانا شامل ہے، انہیں تین اصول پر خلق وامر کا مدار ہے اور سعادت وفلاح انہیں پر موقوف ہے، اور ان کے معرفت کی سبیل بجز رسولوں کے اور کوئی نہیں، عقل ان کی تفاصیل اور ان کے حقائق کی معرفت کی راہ نہیں پاسکتی، اگرچہ من حیث الجملہ ان کی ضرورت کی وجہ کا ادراک کرلیتی ہے، جیسے مریض علاج کی حاجت کی وجہ کا ادراک کرلیتا ہے اور یہ جان لیتا ہے کہ اس کا علاج کون کرے گا، لیکن مرض کی تمام تفاصیل اور اس کے لئے دوا کی تجویز کی راہ اسے معلوم نہیں ہوتی۔

رسالت کے لئے انسان کی حاجت دوا علاج کے لئے مریض کی حاجت سے بدرجہا بڑی ہے، طبیب کے نہ ملنے پر سب سے آخری بات جو مقدر ہوتی ہے وہ جسموں کی موت ہے، لیکن انسان کو اگر رسالت کا نور اور اس کی حیات نہ مل سکے تو اس کا دل ایسی موت مرجاتا ہے کہ اس کے ساتھ زندگی کی کبھی امید نہیں کی جاسکتی، یا وہ ایسا شقی اور بدنصیب ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ سعادت کی کبھی امید نہیں کی جاسکتی، بس کوئی فلاح وکامرانی نہیں مگر اتباع رسول میں اللہ نے فلاح وکامرانی رسول کے مومن اتباع وانصار کے لئے خاص کردی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

فالذين آمنوا به وعزروه	جو لوگ اس نبی پر ایمان لائے اور اس کی عزت کی
ونصروه واتبعوا النور الذی انزل	اور اس کی مدد کی اور اس نور کے پیچھے پیچھے چلے جو اس
معه أولئك هم المفلحون (الاعراف/١٥٧)	کے ساتھ نازل کیا گیا، وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

یعنی ان کے سوا کوئی فلاح پانے والا نہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير	تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جس کے افراد
ويأمرون بالمعروف وينهون عن	خیر کی دعوت دیں اور بھلائیوں کا حکم دیں۔ اور
المنكر وأولئك هم المفلحون۔	برائیوں سے روکیں، اور وہی لوگ کامیاب ہونے
(آل عمران/١٠٤)	والے ہیں۔

اس آیت میں فلاح وکامرانی ان لوگوں کے لئے خاص کردی ہے، جس طرح ان متقیوں کے لئے فلاح وکامرانی کو خاص کردیا ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، اور اللہ نے جو انہیں دیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اللہ کے رسول پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں، اور ان سب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو آپ سے پہلے نازل ہوئے

اور آخرت اور ہدایت اور فلاح کا یقین رکھتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت اور فلاح وجود و عدم کے اعتبار سے رسالت پر منحصر ہے۔

یہ ان امور میں سے ہے جس پر تمام آسمانی کتابوں کا اتفاق ہے، اور تمام رسولوں کی بعثت اسی کے ساتھ ہوئی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے رسولوں کی تکذیب کرنے والی امتوں کے واقعات ہمارے لئے بیان فرمائے، اور یہ بتایا کہ ان کا انجام کیا ہوا، اللہ تعالیٰ نے ان کے آثار و دیار باقی رکھے تاکہ ان کے بعد کے لوگوں کے لئے سامان عبرت و موعظت ہوں، انبیاء کی مخالفت کی وجہ سے کتنوں کو مسخ کر کے اس نے بندر اور خنزیر بنا دیا، اور کتنوں کو زمین میں دھنسا دیا، کتنوں پر آسمان سے پتھر برسائے اور کتنوں کو دریا میں غرق کر دیا، اور کتنوں کو زوردار خوفناک آواز سے ہلاک کر دیا۔ اس طرح کی مختلف سزاؤں کی لپیٹ میں لے لیا، اس کا سبب رسولوں کی مخالفت ان کی رسالت سے اعراض اور اللہ کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز ٹھہرانا تھا۔

جن لوگوں نے اللہ کے رسولوں کی مخالفت کی اور ان کے احکامات رسالت سے اعراض کر کے دوسرا راستہ اختیار کیا، ان کے متعلق اللہ سبحانہ کی یہی سنت ہے، اسی لئے اللہ سبحانہ نے ان مکذبین کے آثار باقی رکھے ہیں تاکہ ہم ان سے عبرت و موعظت حاصل کریں تاکہ ہم اس طرح کے کام نہ کریں جیسے انہوں نے کئے ورنہ ہمیں بھی وہی سزا ملے جیسی انہیں ملی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

إنا منزلون على أهل هٰذه القرية رجزا من السماء بما كانوا يفسقون، ولقد تركنا منها آية بينة لقوم يعقلون۔ (العنکبوت ۳۴)	ہم اس بستی والوں پر آسمان سے عذاب اتارنے والے ہیں اس وجہ سے کہ یہ بدکرداری کرتے تھے اور ہم نے اس میں ان لوگوں کے لئے کھلی نشانی چھوڑ دی جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

اور ارشاد ہے:

ثم دمرنا الآخرين، وانكم لتمرون عليهم مصبحين، وبالليل، افلا تعقلون۔ (الصافات ۱۳۶)	پھر ہم نے باقی لوگوں کو ہلاک و برباد کر دیا اور تم لوگ ان پر صبح کے وقت اور رات کو گذرتے ہو تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

قوم لوط کی بستیوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وامطرنا عليهم حجارة من سجيل إن في ذٰلك لآيات للمتوسمين	اور ہم نے ان پر کنکر قسم کے پتھر برسائے یقیناً اس میں سمجھ رکھنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔

وانہا لبسبیل مقیم ۔ (الحجر/۷۶)	قوم لوط کی بستیاں سیدھی راہ پر واقع ہیں ۔

اورارشاد ہے :

أولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلہم ۔ (فاطر/۴۴)	کیا ان لوگوں نے زمین کی سیر نہیں کی کہ دیکھتے کہ ان سے پہلے کے لوگوں کا کیسا انجام ہوا ۔

کتاب عزیز میں یہ بیان کثرت سے وارد ہے جس میں اللہ سبحانہٗ رسولوں کے مخالفین کی ہلاکت اور ان کی اتباع کرنے والوں کی نجات کی خبر دیتا ہے ، اسی لئے اللہ سبحانہٗ نے سورۃ الشعراء میں موسیٰ ، ابراہیم اور نوح علیہم السلام اور عاد و ثمود اور لوط و شعیب علیہم السلام کا ذکر کیا ہے ، اور تمام انبیاء کے مکذبین کو ہلاک کردینے اور ان کو اور ان کے اتباع کو نجات عطا کرنے کا ذکر کیا ہے ، پھر اس بیان کو اس قول پر ختم کیا ہے :

إنّ فی ذٰلک لآیۃ وما کان اکثرھم مؤمنین وان ربک لہو العزیز الرحیم ۔ (الشعراء/۸)	یقیناً اس میں نشانی ہے ان کے اکثر لوگ ایمان نہیں لائے تھے اور یقیناً تیرا رب ہی سب پر غالب اور نہایت رحم کرنے والا ہے ۔

اس بیان کو اللہ سبحانہ نے اپنے اسماء میں سے دو ایسے ناموں پر ختم کیا ہے کہ اس بیان کا وصف ان کا مقتضی تھا اور وہ " العزیز " اور " الرحیم " ہیں ، اللہ سبحانہ نے اپنے بے مثل غلبہ و قوت سے اپنے دشمنوں سے انتقام لیا ، اور اپنے رسولوں اور ان کے اتباع کو اپنی رحمت سے نجات عطا کی ۔

(جاری)

اسلامی عقائد اور وحدت امت کے بعض بنیادی اصول

کتاب و سنت کی روشنی میں۔

تحریر: شیخ عبدالرحمن عبدالخالق (کویت)
ترجمہ: ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبدالجبار الفریوائی

الحمد لله الذى هدى هذه الأمة طريق الرشاد واكرمها ببعثة النبى الخاتم الكريم محمد سيد الأولين والأخرين وحفظ لها كتابها من التغيير والتبديل، وسنة نبيها أن تضيع وجعل طائفة منها على الحق ظاهرة منصورة، لايضرها من خذلها وخالفها إلى يوم القيامة۔

والصلاة والسلام على نبى الهدى والرحمة الذى أمر بالجماعة والاعتصام بكتاب الله وسنته وحذر من مخالفة ذلك، وعلى آله واصحابه الطيبين الطاهرين الذين بلغوا الرسالة وأدوا الأمانة كاملة غير منقوصة، وعلى التابعين لهم باحسان إلى يوم القيامة، ونسأله تعالى ان يجعلنا منهم، وبعد!

ہر طرح کی تعریف و توصیف، اور حمد و ثنا کا مستحق و سزاوار اللہ رب العزت کی ذات ہے جس نے امت محمدیہ کو رشد و ہدایت کی شاہراہ پر گامزن فرمایا، اسے نبی آخر الزماں سید الاولین والآخرین محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے سرفراز فرمایا، اس کے لئے کتاب ہدایت یعنی قرآن مجید کو ہر طرح کی تبدیلی اور تحریف سے محفوظ رکھا، اس کے نبی کی سنت کو ضائع ہونے سے بچایا، امت محمدیہ کے ایک طبقہ کو حق کی خاطر غلبہ دیا جو مؤید من اللہ ہوگا، ان کی مخالفت کرنے اور ان کو ذلیل و رسوا کرنے والے تا قیامت ان کو گزند نہیں پہونچا سکتے۔

نبی رحمت اور رسول ہدایت پر درود و سلام ہو جس نے اتحاد و اجتماع اور کتاب و سنت کے اعتصام و تمسک کا حکم دیا، اس کی مخالفت

سے منع فرمایا، اور آپ کی پاکیزہ اور طاہر آل و اولاد اور اصحاب پر تاقیامت درود و سلام ہو، جنہوں نے پیغام رسالت اور امانت اسلام کو بلا کم و کاست پورے طور پر پہونچایا، اور تاقیامت ان کے نقش قدم پر چلنے والے تابعین پر درود و سلام ہو۔

ہم اللہ رب العزت سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہم کو بھی انہیں لوگوں میں بنا دے۔ آمین!

وبعده۔ صدر اول کے بعد ہی سے امت اسلامیہ اختلاف کا شکار ہو گئی، یہ اختلاف ابتداءً اپنی معمولی شکل میں نمودار ہوا تھا، لیکن اس کا سلسلہ برابر جاری رہا، حتی کہ اس سے امت کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اس کی شان و شوکت ماند پڑ گئی اور اسی کی بنا پر دشمن اس پر غالب آگئے، جو کچھ پیش آیا گرچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل پیش گوئی کے عین مطابق تھا کہ:

یہود ۷۱ ر فرقوں میں بٹ گئے، اور نصاری	افترقت الیہود علی إحدی
۷۲ ر فرقوں میں، اور یہ امت محمدیہ	وسبعین فرقة، وافترقت النصاری
۷۳ ر فرقوں میں بٹ جائے گی، اس میں ایک	اثنتین وسبعین فرقة وستفترق امتی
فرقہ کے علاوہ سب کا ٹھکانا جہنم ہو گا۔	علی ثلاث وسبعین فرقة کلها فی النار إلا واحدة۔

لیکن بایں ہمہ ہم اس بات کے مکلف ہیں کہ آپس میں متحد و متفق رہیں، ہماری صفوں میں اختلافات نہ در آئیں، ہم اختلافات سے باز آجائیں، لیکن مسلمانوں کے مابین اتفاق و اتحاد اور ان کی شیرازہ بندی عقیدہ ایمان، شریعت و قانون اور ہدایت و طریقت کی اسی اساس اور بنیاد پر ممکن ہے جس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔

مسلمانوں میں افتراق و اختلاف اس وقت راہ پایا جب کہ ان کے عقائد و اعمال اور عبادات و تشریعات میں بدعتوں نے راہ پانا شروع کیا۔ بلا علم تقوّل علی اللہ۔ اور کسی رائے اور خیال پر تعصب کا ایسا رویہ اختیار کرنا کہ جس سے نصوص شرعیہ پر عمل ممکن نہ ہو، جب ان امور نے دین میں راہ پائی تو امت اختلاف و انتشار کا شکار ہو گئی۔

سلفی عقیدہ ہی وہ اساس ہے جو کلمۂ واحدہ پر مسلمانوں کو متحد کر سکتا ہے اور جس کے ذریعہ سے دین میں تشتت و افتراق سے بچا جا سکتا ہے، اس لئے کہ یہ عقائد مسلمانوں کا رخ کلی طور پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف موڑ دیتے ہیں۔

زیر نظر رسالہ میں سلفی عقائد کے انہیں اصول و مبادی اور کلیات کا بیان ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس رسالہ سے مسلمانوں کو ایسے وقت میں فائدہ پہونچائے، جس وقت اختلاف کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے، جو عام ابتلاء اور آزمائش کی صورت اختیار کر چکا ہے، اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر دشمن کی گرفت مسلمانوں پر مضبوط ہو گئی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی معین و مددگار ہے، اور توفیق بھی اسی کی رہین منت ہے (واللہ سبحانہ وتعالی هو المستعان، وبه التوفیق).

"سلفیت" کی تعریف اور اسکی تاریخ

یونانی علوم وفلسفہ کو جب عربی زبان میں منتقل کیا گیا تو اس کے نتیجہ میں کلام اللہ میں تاویل وتحریف اور اس کے معانی میں ظاہری اور معنوی الٹ پھیر کا سلسلہ شروع ہوا، عقیدۂ اسلام کے فہم میں اس انحراف کے بعد "سلفیت" کی اصطلاح وجود میں آئی، اسی وقت مسلمان عقائد کے باب میں "سلفی" اور "خلفی" (غیر سلفی) دو گروہوں میں بٹ گئے۔

سلفی یا اہل حدیث

یہ وہ لوگ ہیں جن کا اعتقاد یہ ہے کہ ہم ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں جس پر اوائل اہل اسلام یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان رکھتے تھے، وہی ہمارے سلف صالح ہیں اور اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جس پر امام احمد وغیرہ جیسے ائمہ دین ایمان لائے، جن کے تقویٰ، دینداری اور زہد وورع اور صحیح دینی فہم وبصیرت پر دنیا شاہد ہے۔

خلف یا غیر سلفی

خلف وہ جماعت ہے جس نے یونانی منطق کو حاصل کیا اس سے متاثر ہوئے اور کہا کہ صفات باری تعالیٰ وغیرہ عقائد کے مسائل میں قرآن وحدیث کے نصوص کے ظاہری معنیٰ پر ایمان سے اللہ تعالیٰ کی اس کی مخلوق سے تشبیہ لازم آتی ہے، اسی بنا پر انہوں نے آیات وصفات میں تحریف وتاویل کا راستہ اختیار کیا تاکہ ان کے زعم میں اللہ تعالیٰ کا فضل وکمال موزوں ومناسب طور پر ثابت اور متحقق ہوجائے۔

تاویل وتحریف میں کمی وبیشی کے اعتبار سے یہ گروہ مختلف گروہوں میں بٹ گیا، بعض لوگ کم تاویلات کرتے تھے، اور بعض لوگ خوب خوب تاویل کرتے، ان کا خیال ہے کہ تاویل میں ان کی یہ روش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روش سے زیادہ عالمانہ اور حکیمانہ ہے، گرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طریقہ محفوظ وخدشات سے پاک تھا، لیکن بہرحال وہ غیر علمی اور غیر حکیمانہ تھا۔ ان کے اپنے الفاظ یہ تھے

" طريقة السلف أسلم، وطريقة الخلف أعلم وأحكم "

سلف کا طریقہ محفوظ اور خدشات پاک ہے، اور خلف کی روش زیادہ علمی اور حکیمانہ ہے۔

پھر جب مسلمانوں میں ماہرین علوم شریعت مشاہیر پیدا ہوئے، ان میں سے ائمہ اربعہ (ابوحنیفہ، مالک، شافعی، احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کی فقہ کی تدوین عمل میں آگئی، بعد کے اکثر لوگوں نے اس مدون ومرتب فقہ پر عمل کا التزام اس طرح سے کیا کہ اس سے ادھر یا ادھر نہیں ہٹتے تھے، اس سے اسلامی شریعت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی، حتیٰ کہ ہر فقہی مذہب ایک مستقل شریعت کی حیثیت اختیار کر گیا، فروعی اختلافات کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ اس کی زد میں وہ اصول بھی آگئے جن سے یہ فروعی مسائل مستنبط ہوئے ہیں، ایک گروہ نے چند اصولوں پر اعتماد کرلیا، دوسرے گروہ نے ان اصولوں کو ناقابل اعتماد سمجھا، پھر جمود وتعطل کا دور آیا، بعض لوگوں نے فتویٰ صادر کردیا کہ اب اجتہاد کا دروازہ ہی بند ہوگیا ہے، ہر آدمی اپنے مذہب پر سختی سے جم گیا، آخر کار اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی شریعت انسانی زندگی سے

سے بے دخل ہوگئی، غیر اسلامی کافرانہ قوانین نے اس کی جگہ لے لی، عام وخاص سبھی لوگوں نے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

پھر عصرِ حاضر میں بعض حضرات نے سوچا کہ واجب العمل دلائل کی رعایت کے بغیر معنی ومصالح کے مناسب امور کو ہر مذہب سے لے کر تلفیق بین المذاہب کے اصول پر شرعی مسائل میں پیوند کاری کی جائے۔

سلفی تحریک کے علماء اور داعیوں نے ہر زمانہ میں یہ دعوت دی کہ اجتہاد کا دروازہ ہر اس شخص کے لئے جو اس کی صلاحیت واستعداد اپنے اندر پاتا ہو، برابر کھلا رہنا چاہئے، اور یہ کہ ائمہ اربعہ اور ان کے علاوہ دوسرے ائمۂ اسلام وفقہائے عظام نے جن فقہوں کو مرتب و مدون فرمایا ہے، ہر ایک کی کاوش وتحقیق کا کتاب وسنت کی مخالف رائے کے ساتھ تعصب کے بغیر مطالعہ کیا جائے، اور ہر اختلافی مسئلہ میں حکم کتاب وسنت کو مانا جائے۔

۱۔ قرآن کریم اور فہم قرآن کا طریقہ

۱۔ اللہ کی کتاب قرآن مجید نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کلام الٰہی ہے جو ہم تک متواتر طور پر پہونچا ہے، جس کی تلاوت عبادت ہے جو اسلام کا زندہ جاوید درخشاں دائمی معجزہ ہے، اور اسلام کے مطالعہ کی پہلی بنیاد ہے۔

۲۔ اس کتاب میں اللہ رب العزت نے اپنے بندوں کے دنیوی واخروی مصالح ومنافع کے سارے احکام وقوانین کو بالتفصیل بیان کر دیا ہے، ارشاد باری ہے:

ونزلنا علیك الكتاب تبیانا	ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے کہ تمام (دین کی) باتوں کا
لكل شئ وهدى ورحمة و	بیان کرنے والا ہے اور مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت
بشرى للمسلمين. (سورۃ النحل ۸۹)	بڑی رحمت اور خوشخبری سنانے والا ہے۔

۳۔ قرآن کریم کی جزئیات میں کسی بھی نوعیت کا کوئی اختلاف نہیں ہے، ایک معنی کی آیات قرآنیہ میں سے کسی ایک آیت سے کوئی حکم علی الانفراد نہیں اخذ کیا جائے گا، بلکہ تمام آیات کو ایک دوسرے سے ملا کر مفہوم سمجھا جائے گا۔

۴۔ قرآن مجید اپنی تالیف وترکیب یعنی لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، اس میں علمی معجزات ہیں، انسانوں کے دل ودماغ پر اس کی سحر انگیزی اور تاثیر، لوگوں کے احوال کی اصلاح یہ سب معجزہ ہیں، کیونکہ ہر مؤمن صادق کے دل ودماغ اس نور ہدایت سے منور اور مستنیر ہیں،

۵۔ قرآن کریم کا ایسا فہم جو انسان کو عمل صالح اور اصلاح وتزکیۂ نفس پر ابھارے تین چیزوں کے بغیر ناممکن ہے۔

۱۔ عربی زبان وادب جس میں قرآن کریم نازل ہوا، کا فہم وعلم، کتاب اللہ کا فہم سلیم، عربی زبان میں مہارت کی مقدار ہی پر

منحصر ہے۔

ب۔ حدیث کا مطالعہ اور اس کا فہم وتدبر، کیونکہ سنت رسول علی صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام ہی منشار الٰہی کی عملی تطبیق، اور قولی توضیح وتشریح ہے۔

ج ۔ اللہ رب العزت سے قرآن فہمی کی دعا، اور اس سے ہدایت یابی کا سوال اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق کے بغیر انسان ہدایت تک نہیں پہونچ سکتا، بلکہ اس کے لئے وہ مختلف اسباب ووسائل اختیار کرتا ہے اور اللہ کی رحمت وتوفیق سے اسے ہدایت نصیب ہوتی ہے، اسی بنا پر قرآن کریم کا ہر طالب علم ہدایت یاب نہیں ہوتا۔

قرآن کریم کے طالب علم کے لئے فہم قرآن میں ممد ومعاون ان مفسرین کے اقوال پر اطلاع وآگاہی بھی ہے، جنہوں نے مندرجہ بالا اسلوب اور اصول کی رعایت کی ہے، اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے فہم قرآن کی نعمت سے بہرہ ور فرمایا ہے، جیسے امام محمد بن جریر طبری اور حافظ ابن کثیر دمشقی وغیرہ۔

۲۔ سنت یا حدیث

۶۔ قرآن مجید کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شریعت سازی کے لئے سارے اقوال وافعال اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے افعال پر آپ کا سکوت جس کو اصطلاح میں "تقریر" کہتے ہیں، کو سنت یا حدیث کہتے ہیں۔

۷ ۔ سنت صرف علماء حدیث کے وضع کردہ علمی اصولوں سے ثابت سندوں سے ماخوذ ہوگی، اور جو چیز نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہو اس سے نہ تو استدلال کیا جائے گا اور نہ ہی اس پر عمل کیا جائے گا۔

۸ ۔ سنت پر ایمان اور اس پر عمل ایسے ہی واجب ہے جیسے قرآن پر ایمان لانا اور اس پر عمل کرنا واجب ہے، اس حیثیت سے سنت قرآن کے مساوی اور برابر ہے، یہ بھی ضروری ہے کہ سنت کے بارے میں ہمارا یہ اعتقاد ہو کہ یہ بھی من جانب اللہ ہے، فرق صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے احادیث کے معانی ومفاہیم پر عمل کرنا بتایا ہے، اور قرآن کے لفظ ومعنی دونوں سے عبادت مقصود ہے۔

۹ ۔ سنت قرآن کی ضد اور مخالف نہیں ہے اس لئے کہ دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ ارشاد باری ہے:

وما ينطق عن الهوىٰ إن هو إلا وحي يوحىٰ۔ (سورہ النجم ۳-۴)	نہ ہی آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں کرتے ہیں ان کا ارشاد نری وحی ہے۔
إنا أنزلنا إليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس	بے شک ہم نے آپ کے پاس حق کے موافق کتاب بھیجی تاکہ آپ ان لوگوں کے درمیان اس کے مطابق

بما اراک اللہ، ولا تکن للخائنین خصیما۔ (سورہ النسا ۱۰۵) فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلادیا ہے، اور آپ ان خائنوں کی طرفداری کی بات نہ کیجئے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن شرعی امور میں اجتہادات فرمائے ہیں، وہ سب حق وصواب ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی کسی باطل چیز پر برقرار نہیں رکھ سکتا۔

۱۰ ۔ صحیح سندوں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ ثابت ہے اس پر اعتقاد وعمل واجب ہے، اس کو "خبر آحاد" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

۳- توحید کے مسائل

۱۱ ۔ اس کائنات کا خالق جس میں ہم اور آپ زندگی گذار رہے ہیں، معبود برحق، حکیم علیم، قدیر، قیوم اللہ ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ کائنات جس نظم وضبط اور ترتیب وتنسیق اور اتقان وپختگی کے ساتھ قائم ہے، کائنات کے اجزاء وعناصر ایک دوسرے کے آپس میں اس طرح محتاج ہیں کہ علی، قدیر معبود برحق اللہ کے اس کائنات کی بقاء واستمرار محال ہے۔

۱۲ ۔ اللہ رب العزت نے اس کائنات کو عبث اور بیکار نہیں پیدا کیا ہے، اس لئے کہ جس ذات کی یہ صفات وخوبیاں ہوں وہ اپنی تخلیق وصناعی میں صفت عبث سے متصف نہیں ہو سکتی، اس تخلیق کے سلسلہ میں اللہ کی منشاء ومراد کو وحی اور رسول کے بغیر سمجھنا محال ہے۔

۱۳ ۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں تاکہ لوگ اسے سمجھیں اور اپنی تخلیق کا مقصد اور حیات ومعاد کی غرض وغایت معلوم کریں، اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل علیہم الصلاۃ والسلام کی تائید ایسے معجزات اور ایسی نشانیوں سے فرمائی جو اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام اپنے رب کی طرف سے جو پیغام لے کر آئے ہیں اس میں یہ سچے ہیں۔

۱۴ ۔ سلسلۂ انبیاء کی آخری کڑی نبی آخر الزماں محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اللہ رب العزت نے آپ کی نصرت وتائید قرآن جیسی زندۂ جاوید معجزہ سے فرمائی، بہت سارے معجزات سے بھی نوازا۔

۱۵ ۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی بہت ساری صفات اور خوبیوں سے ہمیں مطلع فرمایا ہے، جو قرآن کریم میں مذکور ہیں، اور جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا، ان اسماء وصفات پر ہم اس کے اصلی عربی معنی ومفہوم کے مطابق بغیر کسی تحریف، تاویل وتشبیہ ایمان لاتے ہیں، اس لئے کہ یہ وہ زبان ہے جس میں یہ صفات نازل کی گئی ہیں۔

اور اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ ذات باری تعالیٰ کی صفات کے یہ مفاہیم اور اسماء اللہ تعالیٰ کی تعظیم وتکریم کے لائق ہیں

اس لئے کہ صفات ہمیشہ اس ذات کے مناسب اور حسب حال ہوا کرتی ہیں، جس سے ان کو متصف کیا جاتا ہے ۔

۱۶ ۔ ہم صفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں کسی طرح کا فرق وامتیاز نہیں رکھتے کہ بعض کو مانیں اور بعض کا انکار، یا اس کی تاویل وتوجیہ کردیں، بلکہ ہم تو کہتے ہیں کہ سب کچھ ہمارے رب کی جانب سے ہے ۔

۱۷ ۔ انسانی وجود کی غرض وغایت ذات باری تعالیٰ کی معرفت اور شناخت جیسا کہ اس نے اپنی تعریف وتوصیف اور حمد وثنا بیان کی ہے، اور اس کی اطاعت وعبادت ہے، یہ اطاعت باری تعالیٰ کو نہ تو نفع پہنچاتی ہے اور نہ نقصان، اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے برتر وبالا اور پاک ہے، یہ تو محض ابتلاء وآزمائش اور امتحان، اور عابد کے نفس وقلب کی اصلاح وتہذیب اور تزکیہ ہے ۔

۱۸ ۔ مطیع وفرمانبردار مومن کی جزاء جنت ہے، اور نافرمان کافر کی جزاء جہنم ۔

۱۹ ۔ اللہ وحدہٗ لاشریک کی مطابق سنت، غایت درجہ خشوع وخضوع کے ساتھ مطلق اطاعت وفرماں برداری کو اطاعت کہتے ہیں، انسانی ذہن ودماغ اس امر کا ادراک کرسکے یا نہ کرسکے، مذکورہ دونوں شرطوں میں سے اگر کوئی شرط اس عبادت میں نہ پائی جائے گی تو ایسی عبادت باطل ہوگی، اور اس کا کرنے والا عذاب وعقاب کا مستحق ہوگا ۔

۲۰ ۔ مخلوقات کو ان کی قدر ومنزلت پر رکھنا واجب ہے، فرشتوں کے لئے کتاب سنت میں صفات، اعمال اور حدود متعین اور ثابت ہیں جس سے وہ تجاوز اور انحراف نہیں کرسکتے، ایسے جنوں کا معاملہ ہے، ان میں سے ہر فرد کے لئے ثابت شدہ قدر ومنزلت اور حد ہے، جس میں غلو اور مبالغہ آمیزی یا کوتاہی ناجائز ہے ۔

۲۱ ۔ گذشتہ باتوں کا ماحصل یہ ہے کہ شرک کی دو قسمیں ہیں :

(ا) صفات باری تعالیٰ میں سے کسی صفت کی قدر ومنزلت میں کوتاہی وتقصیر یا اس کا جحد وانکار ۔

اس نوع سے متفرع ہونے والے امور میں اللہ تعالیٰ کے لئے واسطوں اور شفاعت کرنے والوں کو بنانا ہے، اس لئے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں کے مشابہ قرار دینا ہے، کیونکہ ان بادشاہوں کے یہاں سے شفاعت اور وساطت کے ذریعہ مجرم معافی پاتا ہے، حاشا اللہ عن ذلک ۔

(ب) مخلوقات کی کسی صفت میں اتنا غلو کہ وہ اس صفت سے مشابہ ہو جائے جس سے متصف ہونے میں اللہ تعالیٰ منفرد ہے۔

اس کے فروع میں یہ ہے کہ بعض انسانوں کی ربوبیت والوہیت کا اعتقاد رکھا جائے، ان کو ان کے حق سے زیادہ قدر ومنزلت دی جائے، اور ان کے لئے وہ چیزیں مخصوص کی جائیں جو اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے مناسب نہیں ہے ۔

۲۲ ۔ انسانوں کے دینی اور دنیاوی امور ومعاملات میں شریعت سازی اور قانون سازی صرف اللہ رب العزت کا حق ہے

جس سے تجاوز نہیں، عالم دین شریعت کے دائرہ میں احکام کا استنباط و اجتہاد کرے گا، اور اس سے عمداً خروج ناجائز ہے۔

۲۳۔ انسان خیر و شر اور بھلی و بری چیزوں کو اپنے اختیار اور اپنی مرضی سے حاصل کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق کے بغیر وہ کوئی کار خیر نہیں کرسکتا، اور نہ کسی شر کا ارتکاب ہی اللہ تعالیٰ پر جبر کر کے کرسکتا ہے، اس کی مشیت اور ارادے کے دائرے ہی میں رہ کر وہ کوئی کام کرسکتا ہے۔

۲۴۔ اللہ تعالیٰ ہر اس چیز کا علم رکھتا ہے جو واقع ہو چکی ہیں، یا آئندہ واقع ہوں گی، اور ناواقع ہونے والے امور کو بھی جانتا ہے جو اگر واقع ہوتے تو کیسے واقع ہوتے۔

۲۵۔ قیامت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اس کی علامتیں ہیں، جن میں بعض کا تذکرہ قرآن مجید میں ہے، اور تفصیلی طور پر اس کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات موجود ہیں۔

۲۶۔ انسان کا منتہائے کمال اس کا حسن عمل ہے جس کا وصف یہ ہے کہ انسان عبادات، معاملات، اخلاق اور صنعت و حرفت وغیرہ کو کامل ترین صورت میں انجام دے، اور یہ سب صرف اللہ کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لئے ہو، اس کا ذریعہ خوف الٰہی ہے، اسی تقویٰ اور خشیت کے بقدر درجۂ کمال و احسان حاصل ہوگا۔

۲۷۔ ہم صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت کرتے ہیں، اور ان کے لئے اس امر کی شہادت دیتے ہیں، جس کی شہادت اللہ تعالیٰ نے انہیں دی ہے اللہ و رسول کے ان کے ایمان کی شہادت اور جنت کی بشارت کے بعد جس شخص نے ان میں سے کسی ایک صحابی کی بھی تکفیر کی، وہ کافر ہوگیا۔

۲۸۔ سارے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے کسی مسئلہ پر اجماع کی مخالفت ہرگز جائز نہیں ہے۔

۴۔ فہم و استنباط اور اجتہاد کے مسائل

۲۹۔ اختلافی امور میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع ضروری ہے۔

۳۰۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور دوسرے مسلمان مسائل میں مصیب اور مخطی ہوتے ہیں، کتاب و سنت کے کسی نص کے مخالف کسی کا قول قابل قبول نہیں ہوگا۔

۳۱۔ لوگوں کے تین طبقات ہیں:

(ا) عامی، یہ اہل علم و دین میں سے جس سے حسن ظن رکھتا ہے اس کی تقلید و اتباع کرے گا۔

(ب) اور مجتہد عالم کی ذمہ داری ہے کہ وہ دلیل کی روشنی میں راجح مسئلہ اختیار کرے۔

(ج) متبع جس کے پاس علم وفہم کا ایک حصہ ہوتا ہے، اس کو کسی کی تقلید نہیں کرنی چاہئے، ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ شرعی احکام کو ان کے دلائل کے ساتھ ایسے لوگوں کی معرفت حاصل کرے جن کے علم اور دین پر اعتماد ہو۔

۳۲۔ دلیل سے عاری اقوال وآراء کی حیثیت مساوی ہے، کسی ایک پر عمل جائز ہے، ایسی صورت میں جب مکلف کا دل اس پر مطمئن ہو، کسی قول پر تعصب وجمود گمراہی ہے۔

۳۳۔ مسلمان ولی اُمر کی اطاعت ان امور میں کرنی چاہئے جن کا وہ مسلمانوں کے مصالح ومفادات کے لئے اجتہاد کرتا ہے اس کی نصیحت وخیر خواہی واجب ہے، اس کی مخالفت صرف اس صورت میں جائز ہے کہ صریحا وہ اللہ کی معصیت ونافرمانی کا حکم دے، (جن مسائل پر عالم کو اتفاق وانشراح نہیں ہے، اگر کسی مفتی کے پاس اس پر دلیل ہو تو وہ اسی پر فتوی دے سکتا ہے)

امیر کی عام امور میں اطاعت اگرچہ وہ تاویل کی قبیل سے کیوں نہ ہو، جائز ہے، لیکن خاص امور ومسائل جن کے خلاف دلیل قائم ہو، اور جس کی مخالفت مسلمانوں میں تشتت وافتراق کی موجب نہیں، اس کی اطاعت جائز نہیں۔

۳۴۔ انسانوں کی معیشت ومعاشرت کے نئے مسائل واحکام کا حکم درج ذیل ہے:

(الف) اگر یہ نئے مسائل وسائل کے باب سے ہوں تو ان کے استعمال کے اعتبار سے ان پر حکم لگایا جائے گا، اگر ان کا خیر وشر دونوں میں ممکن ہے تو یہ مباح ہیں، اور ان کا استعمال صرف خیر میں جائز ہے۔

(ب) اور اگر یہ معاملات کے باب سے ہیں تو دین کے عام قواعد اور ضوابط کے تحت ان پر عمل ہوگا، محرمات ومنہیات سے اجتناب کے بعد جتنے نئے معاملات پیدا کئے جائیں، اس میں کوئی حرج نہیں۔

(ج) اور اگر یہ امور کھانے پینے، پہننے اور زینت وآرائش کے قبیل سے ہوں تو جن امور کی حرمت پر نص شرعی موجود ہے، وہ حرام ہیں، اور جن سے طبیعت، اخلاق، جسم یا نسل میں فساد پیدا ہو گرچہ اس میں بعض فوائد بھی ہوں، حرام ہیں۔

۳۵۔ دین اور عبادت میں کسی نئی بات کی ایجاد واختراع جائز نہیں ہے۔

نئی چیز کے حکم کا استنباط، یا انسانی زندگی میں پیش آمدہ کسی معاملے کا شرعی حکم جاننا مطلوب ومقصود ہے، لیکن شریعت سازی کے وقت کسی امر کے موجود ہوتے ہوئے اس پر کسی نص کا نہ نازل ہونا، جب کہ اس کے اسباب ودواعی وافر مقدار میں موجود تھے، تو اس کا استنباط نا جائز ہے، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ پر استدراک اور اضافہ ہے۔

۳۶۔ احکام شرعیہ کی تطبیق میں اجتہاد واستنباط سے کام لیا جاتا ہے، اسی طرح سے دنیاوی امور ومسائل اور ضرورتوں میں سے کسی نئے مسئلہ پر حکم میں اجتہاد کی ضرورت پڑتی ہے، اس سے اصلاً ممانعت جائز نہیں ہے۔

٣٧ ۔ اجتہاد و استنباط اور افتار کی اہلیت رکھنے والے کے علاوہ کے لئے اجتہاد استنباط اور افتار ناجائز ہے ۔

٣٨ ۔ ہر دعویٰ جو دلیل و برہان سے عاری ہو نا قابل قبول ہے، اس کی نفی بھی بغیر دلیل کے ناجائز ہے ۔

٣٩ ۔ اخلاص اور حق و صواب تک پہونچنے کی کوشش کے ساتھ جن امور و مسائل میں نصوص نہ ملیں، بشری طبائع کی بنار پر ان میں اختلافات کا پیدا ہونا ضروری ہے، لیکن اختلاف یعنی اختلاف کے اثرات جو دشمنی اور قطع تعلق کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں حرام ہیں، اختلافات کے خاتمہ کے لئے اللہ و رسول کو حکم بنایا جائے، اگر دلیل نہ ظاہر ہو تو ہر آدمی اپنے بھائی کو معذور سمجھے، اور دلوں کے احوال کو اللہ رب العزت کے سپرد کر دے، اور اخوت و محبت پر مداومت کرے ۔

٤٠ ۔ اجتہاد کہتے ہیں کسی شرعی حکم تک پہونچنے کے لئے عالم دین کی ذہنی کاوش کو، اگر نص شرعی سے حکم بیان کیا تو اللہ کے حکم سے فیصلہ کیا، اور اپنی فہم پر اعتماد کر کے فیصلہ کیا تو یہ واجب ہے کہ اس کا یہ ظن غالب ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ اس حکم پر کوئی نص نازل فرمائے تو وہ اس کی موافقت کرے گا، اس کے خلاف فتویٰ نہیں دے گا ۔

٥ ۔ دعوت دین کے چند اصول

٤١ ۔ سارے مسلمان ایک امت ہیں، ایک اللہ پر ایمان ان کو باہم جوڑے ہوئے ہے، اور ایک شریعت ان کو اکٹھا کئے ہوئے ہے، چاہے مسلمانوں کی جتنی انواع و اقسام ہوں اور چاہے ان کے دیار کتنے متعدد و مختلف ہوں، اس وحدت کی طرف دعوت دینی فریضہ ہے ۔

٤٢ ۔ نسل، وطن، مذہب کی ساری عصبیتیں جو اس وحدت کو پارہ پارہ کرتی ہیں۔ ان کے خلاف جنگ، اور ان کا خاتمہ ضروری ہے، اسی طرح سے ہر تفرقہ اور اختلاف کے خلاف جنگ اور اس کا خاتمہ دینی فریضہ ہے ۔

٤٣ ۔ ہر اجتماع اور تعصب جو اسلام کی ضد اور نقیض ہو وہ باطل ہے، جس کے خلاف جنگ واجب ہے، اور اس کے ازالہ کے لئے سرگرم ہونا ضروری ہے ۔

٤٤ ۔ کفار و مشرکین وغیرہ اغیار اسلام سے اتحاد اور انضمام کی ہر دعوت باطل ہے، چاہے اس کا نام انسانیت ہو، قومیت و وطنیت ہو، یا پارٹی و جماعت ہو، اس واسطے کہ اس سے مسلمانوں کا تشخص ختم ہو جائے گا، کفر کا اقرار ہوگا، اور اعدار اسلام کو اہل اسلام پر کنٹرول دینے کا مسئلہ ہوگا ۔

دعوت کے بعض ضوابط

٤٥ ۔ حسب استطاعت دعوت دین واجب ہے ۔

٤٦ ۔ اس میں اصل یہ ہے کہ سب سے پہلے اہم مسئلہ سے اس کی ابتدا ہوگی پھر اس کے بعد جو اہم ہوگا اس کی دعوت دی جائے گی، دعوت کا اسلوب و طریقہ نصیحت آمیز و حکیمانہ ہوگا، اور جدال بالحسنیٰ سے کام

لیا جائے گا۔

۴۷۔ دعوت کا پہلا فریضہ ابلاغ و بیان ہے، داعی حق کے لئے یہ ناجائز ہے کہ وہ لوگوں کے لئے خود دعوت کا نمونہ پیش کرے۔

۴۸۔ عمل و کردار سے دعوت، زبانی دعوت سے زیادہ بلیغ ہے، اس لئے ضروری ہے کہ داعی حق زبان و بیان سے زیادہ اخلاق کی استواری اور عبادت میں درجۂ کمال و احسان کو حاصل کرنے کی حرص کرے۔

۴۹۔ جس شخص نے تھوڑا بھی علم دین سیکھا ضروری ہے کہ وہ اس کی تبلیغ دوسروں تک کرے۔

۵۰۔ دعوت و تبلیغ کی غرض و غایت: لوگوں کی اللہ کے راستہ کی طرف ہدایت و رہنمائی اور اللہ کے بندوں پر اللہ کی حجتوں اور دلیلوں کو قائم کرنا، اہل علم پر من جانب اللہ عائد امانت کی ادائیگی اور زمین میں اعلاء کلمۃ اللہ (یعنی کلمۂ حق) کو بلند کرنا ہے۔ جس شخص میں ان مقاصد میں سے کوئی ایک مقصد موجود ہو وہ دعوت و تبلیغ کا اہل ہے، اگر اس میں ان چاروں میں سے کسی ایک کی اہلیت نہ ہو تو وہ دعوت کا اہل نہیں ہے۔

۵۱۔ توحید کی دعوت اور شرک سے اجتناب دعوت کی اصل اور غایت ہے۔

۵۲۔ اسلام کے اصول و مبادی کی طرف رجوع فروع کی طرف دعوت سے زیادہ اہم ہے، مدعو کو مدنظر رکھتے ہوئے داعی کو دعوت کا ہدف متعین کرنا چاہئے۔

اللہ کی ذات سے توقع ہے کہ وہ عنقریب مجھے ان اصول و ضوابط[1] کی مختصراً شرح و تفسیر کی توفیق عطا فرمائے،

والحمد للہ اولاً و آخراً۔

---

[1] مؤلف حفظہ اللہ و تولاہ نے نظر ثانی اور اضافہ کے بعد اس رسالہ کا نیا ایڈیشن شائع کردیا ہے جو کہ عنقریب کتابی صورت میں ادارۃ البحوث سے شائع کیا جائے گا۔ انشاء اللہ؛ فی الحال کتاب القضایا الکلیۃ للاعتقاد فی الکتاب والسنۃ کے اس ایڈیشن کا ترجمہ پیش خدمت ہے جس کو مؤلف نے ۱۳۹۳ھ میں شائع فرمایا تھا، اور مترجم نے ۲/۱/۸۵ء میں مدینہ منورہ میں اس کا ترجمہ کیا تھا۔

(مترجم)

فضا ابن فیضی کا نیا مجموعۂ کلام

سرِ شاخِ طوبیٰ

فنی ریاضت اور قلبی سوز و گداز کا حسین مرقع

بقلم: ڈاکٹر مقتدیٰ حسن یاسین ازہری

تقریبِ سخن

جامعہ سلفیہ نے اپنے آغاز ہی سے تدریس کے ساتھ ساتھ تبلیغ اور تصنیف و ترجمہ کا سلسلہ بساط بھر جاری رکھا ہے، شروع میں عربی زبان میں تحقیقی و علمی کتابوں کی اشاعت پر توجہ تھی، پھر ضرورت محسوس کرتے ہوئے اردو زبان میں اصلاحی و تبلیغی کتابوں کی اشاعت کا بھی آغاز کیا گیا۔ عربی سے اردو کی جانب اس تحول میں جامعہ کے ذمہ داروں کو شاید کبھی یہ خیال نہ آیا ہوگا کہ تصنیف و اشاعت کے اس سفر میں کوئی منزل شعر و ادب کی بھی آئے گی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کام مقدر ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔

جامعہ سلفیہ کے سابق ناظم اعلیٰ مولانا عبدالوحید رحمہ اللہ کے سامنے جب فضا ابن فیضی کے دینی مجموعۂ کلام کی اشاعت کا ذکر آیا تو موصوف نے قدردانی کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے جامعہ سلفیہ سے اس کی اشاعت کی پیش کش کی۔ موصوف شاعر نہ تھے لیکن کبھی شعر کہا تھا، البتہ شعر فہمی کا ملکہ رکھتے تھے، اور شعر کی لفظی و معنوی خوبیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے، اس کا ثبوت وہ شعری انتخاب ہے جو موصوف کی وفات کے بعد ان کے سامان سے ملا ہے۔

۱۹۸۰ء میں جامعہ سلفیہ کی "دعوت و تبلیغ کانفرنس" کے انعقاد کے موقع پر موصوف نے فضا ابن فیضی کا وہ ترانہ بغور سنا تھا جسے

شاعر نے فن ریاضت مذہبی بصیرت اور قلبی سوز وگداز سے ایسے مقام پر پہونچا دیا ہے کہ وہ دوسرے ترانوں کے لئے معیار بن گیا ہے ، اس سے قبل ناظم اعلیٰ رحمہ اللہ فضا کی شخصیت اور شاعری سے بخوبی واقف تھے ، اور مئو کے سفر کے دوران باہمی ملاقات وتعارف بھی تھا موصوف کی خواہش تھی کہ اردو ادب کی خدمت کے لئے بامقصد شاعری کا ایک نمونہ بھی جامعہ سلفیہ سے اشاعت پذیر ہو تاکہ شاعری کی یہ صنف مزید متعارف ہو ، اور اسلامیات سے متعلق ایک معیاری فنی کلام عوام کے سامنے آجائے ۔ موصوف نے اپنے پاکیزہ جذبہ کے ساتھ اس مجموعہ " سرِ شاخِ طوبیٰ " کی اشاعت کی منظوری دی اور کتابت کا کام بھی شروع ہوگیا ، لیکن اللہ تعالیٰ کو منظور یہ تھا کہ اس کارخیر کی طمانیت اور اس کا ثمرہ ان کو دار فانی میں نہیں بلکہ دار باقی میں ملے ، نومبر ۱۹۸۹ء میں ناظم صاحب نے وفات پائی ، اور اپریل ۱۹۹۰ء میں یہ مجموعہ شائع ہوا ، ادب نوازی کی جو روایت موصوف کے ذریعہ اس ادارہ میں قائم ہوئی امید ہے کہ اسے ذمہ داران باقی رکھیں گے ۔

فضا کی شاعری

فضا کی فنی عظمت اور شاعری میں ان کی اہمیت وانفرادیت کا ذکر کرتے ہوئے اطہر نقوی لکھتے ہیں:

" فضا ابن فیضی اردو شعر وادب کا ایک معروف ومعتبر نام ہے ، فضا ایک ایسے شاعر ہیں جن کے سر پر نہ کسی تحریک کا سایہ ہے نہ ان کے پیچھے کسی حلقہ یا گروپ کی بھیڑ ، پھر بھی ان کے فن نے اپنی توانائیوں کے سہارے اپنی اہمیت کو منوایا ہے " (سرِ شاخِ طوبیٰ ص ۹)

فضا ابن فیضی کے فن شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبد المغنی لکھتے ہیں :

" فضا ابن فیضی کی آواز جدید اردو شاعری میں ایک مخصوص ومنفرد جانی پہچانی آواز ہے ، کسی کے اسلوب سخن کا اس طرح متعین اور معروف ہونا یقیناً اس کی قادر الکلامی کی دلیل ہے ، اور قدرتِ بیان کا ثبوت ، یہی قدرت وندرت ان کی غزلوں اور نظموں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے ۔"

(مذکورہ مجموعہ سرِ ورق کی پشت)

اطہر نقوی لکھتے ہیں ؛

" ان کی قادر الکلامی ، علوِ فکر ، الفاظ کے انتخاب اور استعمال پر بے پناہ قدرت ، کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ ، علوم مشرقی پر تبحر کی حد تک دسترس ، فن پر کامل عبور ، یہ ایسی باتیں ہیں جو ان کی شخصیت اور فن کو قابل رشک اور عظمت عطا کرتی ہیں ۔"

(سرِ شاخ طوبیٰ ص ۹)

شاعری کا طویل تجربہ

فضاؔ ایک کہنہ مشق و تجربہ کار شاعر ہیں، ان اشعار میں اس تجربہ و مہارت کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ اطہر نقوی لکھتے ہیں:

"فضا کا شمار اب بزرگ شعرا میں ہے، وہ گذشتہ تقریباً نصف صدی سے ریاضت فن میں معروف ہیں، اور فکر و فن کی ان بلندیوں پر پہونچ چکے ہیں جہاں تک پہونچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔"

(سرِ شاخ طوبیٰ ص ۹)

فضاؔ کے کلام کا بغور مطالعہ کرنے والے ہر شخص کو ان کی قدرتِ بیان، دقتِ تعبیر اور معنی آفرینی کا واضح احساس ہوتا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

"جب وہ فکر سخن کرتے ہیں تو لمحۂ تخلیق میں انہیں الفاظ و تراکیب، محاورات و استعارات حتیٰ کہ قوافی کی کمی اور تنگی کا سامنا کبھی نہیں کرنا پڑتا، بلکہ وسائل اظہار کی فراوانی اور موآجی کا عالم ہوتا ہے، ساتھ ہی خیالات و احساسات کا بھی ایک چشمہ سا بہنے لگتا ہے۔

پھر الفاظ و خیالات کو برتنے کے لئے شاعر کا اپنا ایک انداز طبیعت ہے جس میں تازگی اور حسن کاری ہے۔"

حرکی فکر

قدیم ادبی سرمایہ سے استفادہ اور جدید رجحانات سے ہم آہنگی شاعری میں ایک اہم مسئلہ ہے، فنی صلاحیتوں سے بھرپور شعرا اس امتحان میں پورے اترتے ہیں اور کلام میں دونوں چیزوں کی رعایت کا ایک حسین امتزاج پیش کرتے ہیں، اطہر نقوی لکھتے ہیں،

"انہوں نے ادبِ عالیہ کا گہرا مطالعہ ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس کی پاکیزہ اور دل آویز روایات کو اپنایا بھی ہے تاہم وہ روایت پرست نہیں ہیں، انہوں نے بدلتے ہوئے وقت اور حالات کے مطابق اپنی فکر کو بھی بدلا ہے اس حرکی فکر نے ان کے کلام کو وہ قوت اور توانائی عطا کی ہے کہ آج وہ اردو کے ممتاز شعرا کی صفِ اوّل میں مقام حاصل کر چکے ہیں۔" (سرِ شاخ طوبیٰ ص ۹)

فضاؔ اور اقبال

اخذ و عطا کا سلسلہ علم و ادب کی روایت ہے، سلامتی طبع اور قدر شناسی سے متصف افراد اہل کمال کا تتبع کرتے ہیں تاکہ کاروان شعر و ادب کی معیت و مصاحبت کا شرف حاصل رہے، ساتھ ہی اپنی صلاحیتوں کے سہارے اپنی انفرادیت کا نقش بھی بٹھاتے ہیں، تاکہ چمنستانِ ادب کے گل بوٹوں کی رنگارنگی میں اضافہ کر سکیں۔ فضاؔ نے اپنی شاعری کے آغاز میں اقبال کا تتبع کیا کیونکہ ان کے گوناگوں اوصاف اور فکر و فن کے کمال سے وہ بیحد متأثر

تھے ۔ پھر فن کی پختگی اور حالات کی تبدیلی کے بعد فضا نے اپنی مستقل راہ اختیار کی ، اطہر نقوی لکھتے ہیں :

" ضرورت تھی کہ اپنی فکر کو افلاک سے اتارا جائے اور زمین پر بکھرے ہوئے انسانوں کے دکھ درد اور مسائل پر توجہ دی جائے ، چنانچہ فضا ابن فیضی نے وقت کی اس پکار کو سنا اور جلد ہی وہ جبریل و ابلیس کے مکالمے چھوڑ کر اپنے عہد کے مسائل اور مصائب کے ترجمان بن گئے ، یہ ان کی فکر اور شاعری کا اہم ترین موڑ تھا ، اب ان کی شاعری عصری مسائل اور انسان کے درد و کرب کی عکاس بن جاتی ہے ، یہ ان کے فکر و فن کے سفر ارتقاء کی داستان ہے ، اب ان کا طرز و اسلوب ہے ، اپنی فکر ہے ، اور اس فکر و اسلوب میں اب وہ پختگی آچکی ہے کہ اس چراغ سے بہت سے چراغ جلے ہیں ۔" (سر شاخ طوبیٰ ص ۱۱ ۔ ۱۲)

جدتِ ترکیب

فضا کی شاعری میں ترکیب و استعارہ کا حسن ہر جگہ نمایاں ہے ، انہوں نے بعض ترکیبیں ایسی استعمال کی ہیں جن سے اسلامی تاریخ کے بعض اہم واقعات اپنے پورے پس منظر کے ساتھ ذہن میں آجاتے ہیں ، ناقد جب ان کے کلام کا مطالعہ کرتا ہے تو ایسی ترکیبیں بے ساختہ اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی ہیں ، اطہر نقوی لکھتے ہیں :

" فضا ابن فیضی نے اپنے کلام میں لفظ حرا کا بکثرت ذکر کیا ہے ، نئی نئی ترکیبوں اور استعاروں کی شکل میں یہ لفظ ان کے یہاں بار بار آیا ہے ، لب حرا ، رواق حرا ، کف حرا ، مکتب حرا ، شیشۂ زانوِ حرا جیسی دلکش ترکیبیں انہوں نے استعمال کی ہیں ، غارِ حرا کی جو اہمیت اسلام میں ہے اس سے کون واقف نہیں ہے ، سچ تو یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ ہی حرا سے شروع ہوتی ہے ، لیکن شاید فضا سے پہلے کسی شاعر نے حرا کی عظمت و اہمیت کو اس طرح اجاگر کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ایسی خوبصورت ترکیبوں کے ساتھ اسے استعمال کیا ۔"

(سرِ شاخ طوبیٰ ص ۱۸)

مشرقیت کا تحفظ

فضا کا گھرانہ اسلامی روایات اور مشرقی اقدار کا امین رہا ہے ، کئی نسل سے ان کے خاندان میں دینی علوم کے ماہر پیدا ہوتے رہے ہیں ، ان کے جد امجد کا شمار مئو کے صاحب تصانیف علماء میں ہوتا ہے ، اور ان کے والد محترم بھی دینی علوم میں اپنی بالغ نظری کے لئے مشہور تھے ، فضا نے اس روایت کو قائم رکھتے ہوئے مئو کی عظیم دینی درسگاہ مدرسہ فیض عام سے باقاعدہ فراغت حاصل کی ، اور یہیں سے ان کے اندر دینی اقدار سے محبت اور ان کے تحفظ کا جذبہ پیدا ہوا ، انہوں نے بعض دیگر شعراء کی طرح مغرب سے ایسا کوئی تاثر نہیں لیا جس سے ان کی خاندانی روایت پر کوئی حرف آئے ، نہ ہی مغرب کی ایسی مبالغہ آمیز تقلید کی جس سے ان کی خاندانی روایت پر کوئی حرف آئے ، نہ ہی مغرب کی ایسی مبالغہ آمیز تقلید کی جس سے ان کی مشرقیت مجروح

ہو، ایک توازن کے ساتھ انہوں نے دونوں سے استفادہ کیا، اور اپنے تشخص کو برقرار رکھا، پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

"آج کے طوفانِ مغرب میں فضا کی مشرقیت اپنی جگہ ایک مضبوط ستون کی طرح قائم ہے، یہ یقین شاعر کے فکری رسوخ اور ذہنی بلوغ کی علامت ہے۔"

تہذیبی اقدار پر یقین

شاعری میں ماحول سے ربط اور تہذیبی اقدار پر یقین کی بڑی اہمیت ہے، شاعر کا کلام اس یقین کے باعث ہر دل کی آواز اور ہر طبیعت کا احساس بن جاتا ہے، پروفیسر عبدالمغنی فضا کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تجربے میں روایات اور لفظ میں معانی کا عکس اس وقت آتا ہے جب فنکار اپنے گرد وپیش کی زندگی اور اس کے نظام میں دلچسپی لیتا اور اپنی تہذیبی قدروں اور عام انسانی اصولوں پر یقین رکھتا ہو، یعنی فکری بصیرت کے بغیر وہ فنی مہارت نہیں پیدا ہو سکتی جو با معنی تخلیقات کو جنم دیتی اور روایات میں کچھ اضافہ کرتی ہے۔"

فکری بصیرت اور نظامِ اقدار کے باہمی ربط پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

"یقیناً بصیرت کا یہ معاملہ کسی نہ کسی نظامِ اقدار سے وابستگی کا ہے جو ایک معیارِ نظر اور محورِ فکر حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے، ہمارے نئے شاعر عام طور سے اس ذمہ داری سے گریزاں ہیں، مگر فضا ابن فیضی فرار کی اس کیفیت میں مبتلا نہیں ہیں، ان کا ذہن حقائق کا انکار نہیں اقرار کرتا ہے۔"

حمدیہ شاعری کی تاریخ

اردو شاعری اپنی مختلف روایات میں فارسی و عربی شاعری کی پابند ہے، اور مذکورہ دونوں زبانوں کی شاعری میں حمد ومناجات کی صنف ابتدا ہی سے معروف ہے، اردو شاعری میں بھی یہ صنف شروع سے موجود ہے، البتہ زمانہ کے امتداد سے اس میں تبدیلی وترقی ضرور ہوئی ہے۔

فضا کا حمدیہ کلام

فضا کے حمدیہ کلام پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اطہر نقوی لکھتے ہیں:

"فضا ابن فیضی کی حمد ونعت، زورِ بیاں، علوِ فکر، جذبات کی گرمی اور پاکیزگی کا بڑا دلکش نمونہ ہیں، ان سے ایمان کو تازگی اور روح کو بالیدگی ملتی ہے، انہوں نے معروف اور غیر معروف سبھی قافیے استعمال کئے ہیں اور طویل نظمیں لکھی ہیں، لیکن ان کے کلام کی دلکشی ایسی ہے کہ یہ طوالت اکتاہٹ کا باعث نہیں بنتی، اور قاری الفاظ وآہنگ کے طلسم ونغمگی اور جذبات کی پاکیزگی میں کھویا رہتا ہے۔"

(سرِ شاخِ طوبیٰ ص ۱۲)

فضا کے حمدیہ کلام کی بعض خوبیوں کو اجاگر کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں :

"انہوں نے جو حمد لکھی ہیں، ان میں عقیدۂ توحید کی بھرپور عکاسی ہے، ان کے عنوانات آیات قرآنی سے لئے گئے ہیں جس نے ان نظموں کو ایک نئی دلکشی اور تقدیس عطا کی ہے، انہوں نے کہیں بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، نہ خالق کائنات سے شوخی کی ہے، نہ ذات رسالت کو کبریائی کے درجہ تک پہونچایا ہے، یہی احتیاط واعتدال ان کے کلام کا مابہ الامتیاز وصف ہے۔" (سرشاخ طوبیٰ ص ۱۳)

خوشۂ سبز کا تعارف

سرِشاخِ طوبیٰ کے صفحات کی تعداد ۲۲۳ ہے، مقدمہ اطہر نقوی صاحب نے لکھا ہے، اس کے بعد "خوشۂ سبز" کے عنوان سے حمدیہ کلام "قوسِ حرا" کے عنوان سے نعتیہ کلام، "منظر و پس منظر" کے عنوان سے نظمیں اور "گلِ نغمہ" کے عنوان سے ترانے درج ہیں۔

الف ـ حمد کا حصہ

سرِشاخ طوبیٰ میں حمد کا حصہ ۱۲ نظموں پر مشتمل ہے جس کے بعد مناجات کی چار نظمیں ہیں، اس تعارف میں صرف حمد و مناجات والے حصہ پر اظہار خیال مقصود ہے۔

حمد کے حصہ میں قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ فضا نے ہر نظم کا عنوان کسی قرآنی آیت کے ایک حصہ کو قرار دیا ہے جس سے شاعر کے فکری رخ کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ نظموں کو تقدس و اعتبار بھی ملتا ہے۔

۱ـ ھُوَ اللہُ اَحد

- مسلمان کے لئے عقیدۂ توحید سب سے بڑا سرمایہ، ہر غم کا مداوا اور ابدی سرور کا سرچشمہ ہے، فضا کہتے ہیں :

دہن و کام میں، گھلتی ہوئی یہ قندِ حرا
داروِ تلخی مافات، ھو اللہ احد

"قندِ حرا" کی تعبیر کو اس پس منظر میں دیکھئے جسے تعارفی حصہ میں بیان کیا جا چکا ہے۔

- اللہ تعالیٰ کی الوہیت و حاکمیت کو اگر انسان صحیح طور پر سمجھ لے تو دوسرے علوم و معارف اس کے لئے آسان ہو جاتے ہیں، اور وہ ایک نفع بخش انسان بن جاتا ہے جسے زندگی میں کسی غلط چیز کی پیاس نہیں رہتی، اسی راز کی تشریح و تعبیر کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام

کا طویل سلسلہ اللہ تعالیٰ نے قائم فرمایا، فضا اس نکتہ کو بلیغ خوبصورت اسلوب اور دلکش ترکیب کے ذریعہ یوں ادا کرتے ہیں:

دانش آرائے دو عالم، یہی اک نکتہ خیر
حاصلِ کلمۂ و آیات ، ہو اللہ احد

• انسان کو جب تک توحید کا راز سمجھ میں نہیں آتا، تحیّر و تشکیک کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا ہے، کائنات کی وسیع و متنوع کتاب اس کے سامنے ہوتی ہے، موت و حیات کے نظام کا ہر گھڑی وہ مشاہدہ کرتا ہے، اس لئے ذہن میں طرح طرح کے سوالات آتے ہیں، اور کبھی کبھی الجھن ہو جاتی ہے، لیکن توحید کا راز سمجھ لینے کے بعد یہ الجھنیں دور ہو جاتی ہیں، اور انسان ایمان کی دولت سے سرفراز ہوتا ہے، فضا اس مفہوم کو اس طرح تعبیر کرتے ہیں:

جھاڑ کر ذہن سے، فارغ ہوں میں، تشکیک کے گرد
وسوسے اب ہیں نہ خدشات ، ہو اللہ احد

• علم کا وسیع سرمایہ اور افکار و نظریات کا ذخیرہ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات تک نہ پہونچا سکے تو اس کی کوئی حقیقت نہیں، فضا کہتے ہیں:

اس کا عرفاں جو نہ بخشیں تو فضا محض فریب
یہ درایات و روایات ، ہو اللہ احد

۲- فلا تدعوا مع اللہ أحدا

• اسلام نے شرک کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے اور قرآن کریم میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گناہ کو معاف نہیں کرے گا، جن قوموں نے توحید کی دعوت سے اعراض کر کے شرک کی راہ اختیار کی انھیں اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر کے بعد والوں کے لئے ذریعۂ عبرت بنایا، فضا اس تاریخی حقیقت کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں کہ لہجہ کا اعتماد توحید کی اہمیت اور شرک کی شناعت کو صاف طور پر ظاہر کرتا ہے:

بھٹکے جو تیری راہ سے غارت ہوئے تمام
کیا عاد کیا ثمود ، تری ذات لاشریک

اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا تقاضا ہے کہ بندے کی زندگی اور اس کی عبادت اسی کے لئے خاص ہو، فضا کہتے ہیں:

تیرے لئے رکوع بھی میرا قیام بھی
تو لائقِ سجود تری ذات لاشریک

● ہر طرح کی حمد و ستائش کا مستحق اللہ تعالیٰ ہے، اس کی حمد ایک ایسی عبادت ہے جس کے لئے ذہن و فکر کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ انسان کے ظاہر کی صفائی و ستھرائی بھی ضروری ہے، اس پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فضا ایسا اندازِ تعبیر اختیار کرتے ہیں جس سے اللہ تعالیٰ کے مستحقِ حمد و تقدیس ہونے کی دلیل بھی واضح ہو جاتی ہے :

ہے باوضو قلم بھی کہ لکھتا ہوں تیری حمد
تو ربِ ہست و بود ، تری ذات لاشریک

۳۔ ھوالظاہر والباطن

اس عنوان کے تحت شاعر نے خالقِ کائنات کے احسانات، نعمتیں اور قدرت و وحدانیت کے مظاہر کو گنایا ہے سادگی کے ساتھ ساتھ اسلوب میں قوت اور تعبیر میں دقت ہے، بعض اشعار میں بیحد بلیغ تلمیح ہے ، ایک شعر میں کہتے ہیں :

مٹی کو امکاں کا شرف دینے والا
آگ کو خلدِ سبز بنانے والا تو

● بعض اشعار میں استعارہ سے بیحد حسن پیدا کیا ہے ، اور متناسب الفاظ کے استعمال سے موسیقی پیدا کی ہے، کہتا ہے :

جلوے تیرے شمع شگوفے اور شفق
خاکِ شب سے چاند اگانے والا تو

● موسیٰ علیہ السلام کے بعض معجزے اردو ادب میں بیحد معروف ہیں ، شاعر نے اپنی جدت تعبیر سے ان کے تذکرے میں ندرت پیدا کی ہے :

تیرا کرشمہ زورِ عصائے دست کلیم
پانی میں دیوار اٹھانے والا تو

● انسان کا علم اللہ کی بڑی نعمت ہے ، انسان کو اس نعمت پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے اور ساتھ ہی اپنے علم کی محدودیت و قصور کا احساس رکھنا چاہئے۔

ہم سب کو ادراک کی دولت دی تو نے
پھر بھی کب ہے عقل میں آنے والا تو ۔

۴۔ خالق کل شئی

جس طرح ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت وملکیت میں ہے، اسی طرح ہر چیز کو اس کا وجود اور اس کی رعنائی وجمال بخشنے والا بھی وہی ہے، کائنات کا پورا نظام اسی حیثیت سے دعوت فکر ونظر اور سامان عبرت وموعظت ہے، فضا کہتے ہیں:

عالم تمام اسی کی مشیت سے رنگ رنگ
یہ روزگارِ ابر وہوا بھی اسی کا ہے

- دنیا میں کوشش ہر آدمی کرتا ہے لیکن کامیابی سے سب کے سب ہمکنار نہیں ہو پاتے، فضا کہتے ہیں:

ہے باثمر اسی سے مری سعیِ رائیگاں
یہ مروہ وہ صفا یہ منیٰ بھی اسی کا ہے

سعی کی مناسبت سے مروہ، صفا اور منیٰ کا ذکر قابل توجہ ہے، اس تلمیح کو سمجھنے والوں کے لئے شعر کا حسن دوگنا ہوگا۔

- اولوالعزم پیغمبر اور ان کی عظیم صفات بھی اللہ تعالیٰ کی تخلیق وتوفیق کی مرہونِ منت ہیں، فضا کہتے ہیں:

آہو اسی کے دشت کے ایوبؑ اور خلیلؑ
یہ کاروبارِ صبر ورضا بھی اسی کا ہے

- اپنی شخصیت اور فن کے سلسلے میں بھی فضا نے توفیقِ الٰہی کا ذکر کیا ہے، اور بڑی مہارت وخوبی کے ساتھ اپنی فنی عظمت کی جانب اشارہ بھی کر دیا ہے، تین شعر ملاحظہ ہوں جن میں فن کی اہمیت کے ساتھ ہی تواضع کا اظہار بھی ہے:

میرے ہنر کا یہ پیچ وخم ہے اسی کا فیض
یہ میرے پاس رختِ نوا بھی اسی کا ہے

امکان وعرش کب تھے تہِ شہپرِ خیال
یوں ہے کہ میرے فن کا انا بھی اسی کا ہے

یہ اور بات ہے کہ ہے سرگشتہ وخراب
اتنا تو کم نہیں کہ فضا بھی اسی کا ہے

۵۔ نورٌ کمشکوٰۃ

کائنات کے ہر ذرہ سے اور تاریخ کے ہر واقعہ سے اللہ تعالیٰ کی قدرت وصناعی اور لطف وکرم ظاہر ہے، اس نظم میں عنوان کی مناسبت سے شاعر نے " روشن ہے " کا قافیہ استعمال کیا ہے، اور مختلف مظاہر قدرت کو صراحتاً یا تلمیحاً بیان کیا ہے، مشیت الٰہی کی طرف بڑے خوبصورت انداز میں اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لکھا ہے جس کو تیرے خامۂ مشیت نے
ورق ورق وہی اک داستان روشن ہے

- وحی الٰہی تمام انسانوں کے لئے سرمایۂ رشد و ہدایت اور سامانِ راحت و تسکین ہے، فرشتے اور انبیاء سب کے سب اس امانت کے امین اور اس نور سے مستنیر ہیں۔ فضا کہتے ہیں:

محمد عربی ہوں کہ جبرئیل و خلیل
ترے کلام سے سب کی زبان روشن ہے

- حمد کا موضوع بیحد وسیع اور اہم ہے، انسانی بساط ایسی نہیں کہ اس موضوع کا حق ادا کر سکے البتہ اس کے فیض اور برکت سے ہر ایک مستفید ہے:

بہ وصفِ بے ہنری لکھ رہا ہوں حمد تری
قلم ہے خوشۂ پرویں، بیان روشن ہے

۶ لہ الاسماء الحسنیٰ

اسماء و صفات باری تعالیٰ کا موضوع نازک ہے، اس موضوع سے توحید باری تعالیٰ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و ملکیت کو سمجھا جا سکتا ہے، فضا نے مذکورہ بالا عنوان کے تحت بڑی سلاست و روانی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرت کو بیان کیا ہے، اور کائنات پر اس کے تصرف کی نشاندہی کی ہے:

از ورق تا بہ ورق سارے خطاب اس کے ہیں
لفظ اس کے ہیں معانی کے نصاب اس کے ہیں
انجمن اس کی چراغ اس کے ہیں راتیں اس کی
صبح اس کی ہے شفق اس کی گلاب اس کے ہیں
بادباں اس کا ہے، بحر اس کا، سفینہ اس کا
موج اس کی ہے بھنور اس کے حباب اس کے ہیں
خلعت ماہ و قبائے گل و دستارِ شمر
خرمن گوہر و رفعتِ زرِ ناب اس کے ہیں

- نسبتِ عبودیت کا خوبصورت انداز میں یوں ذکر کیا ہے:

کی عطا اس نے سند ہم کو عبودیت کی
فخر یہ کم نہیں، ہم خانہ خراب اس کے ہیں

- قدرت و صنعت کے بے شمار مظاہر کے باوجود انسانی عقل و فکر بہت سے سربستہ رازوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ شاعر اس کو یوں تعبیر کرتا ہے:

دانشِ عقدہ کشا پر بھی یہ عقدہ نہ کھلا
کتنے اسرار بھی زیرِ نقاب اس کے ہیں

- مقطع میں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت و حاکمیت کا خوبصورت اور بامعنیٰ اعتراف کیا ہے:

میرے ہاتھوں میں دیا ہے یہ قلم اس نے قضا
یہ قلم اس کا ہے قرطاس و کتاب اس کے ہیں

۷۔ لہٗ مقالیدُ السمٰوات والارض

اس سرخی کے ماتحت بھی شاعر نے اللہ تعالیٰ کی قدرت و صناعی کے مظاہر کو بیان کیا ہے، اور فنی اسلوب و انداز میں بڑی سلاست کے ساتھ کائنات کی ان چیزوں کو ذکر کیا ہے، جن سے رب العالمین کی عظمت و جلال اور رحمت و لطف کا احساس ہوتا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یہ شاخ بھی تری برگ و ثمر بھی تیرے ہیں
یہ زندگی کے گھنیرے شجر بھی تیرے ہیں
مجھے ترازوِ انجم میں تولنے والے
شفق بھی تیری ہے، شام و سحر بھی تیرے ہیں
ہو خوف کیوں مجھے دریا میں ڈوب جانے کا
یہ کشتیاں بھی ہیں تیری بھنور بھی تیرے ہیں
چلوں کہیں سے ترا ہی سفر قدم بہ قدم
کہ منزلیں ہیں تری، رہ گذر بھی تیرے ہیں

عصا و چشمۂ حیواں وقُم باذن اللہ
ملائکہ بھی مسیح و خضر بھی تیرے ہیں
حرا بھی تیرا حرا کا رواق بھی تیرا
مرے حرم کے یہ محراب و در بھی تیرے ہیں
ورق ورق یہ لپکتے چراغ بھی تیرے
یہ لفظ لفظ دمکتے گہر بھی تیرے ہیں

۸۔ لاتدرکہُ الأبصار

دنیا میں انسانی نگاہیں اللہ تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتیں، لیکن اس کی قدرت کے جلوے ذرے ذرے سے عیاں ہیں، بلکہ غور کیا جائے تو انسان کے پہلو میں دھڑکتے ہوئے دل کی ہر ضرب اور چلتی ہوئی ہر سانس اللہ تعالیٰ کے وجود و قدرت کی گواہ ہے، اس حقیقت کو محسوس کرنے کے بعد جذبات کی حرارت اور اسلوب کی ندرت کے ساتھ اسے دوسروں تک منتقل کر دینا شاعر کا کمال ہے، احساس میں گہرائی اور جذبات میں خلوص و صدق کے اوصاف نہ ہوں تو ابلاغ و ترسیل کا یہ عمل مشکل ہوتا ہے۔

فضاؔ نے عنوان کو کس طرح خوبصورت انداز میں ابھارا ہے:

جلوۂ بے رنگ تماشہ جاری
پھر بھی نادیدہ ہے پیکر اس کا

پیکر نظر نہ آئے تو بھی جلوہ ہر طرف نظر آتا ہے:

وہی پردہ وہی پرتو وہی بزم
سارا پس منظر و منظر اس کا

اسلامی تاریخ کے اہم واقعات کی طرف تلمیح سے فضا کے کلام کی معنویت دوچند ہو جاتی ہے، اصحاب فیل کا واقعہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا انوکھا مظہر ہے، اس کو انوکھے انداز میں پیش کرنا بھی ایک کمال ہے جس سے فضا کا فن بہرہ ور ہے:

ابرہہ اور ابابیل نہ پوچھ
ہے عجب خیمہ و لشکر اس کا

● حمد نام ہے خدا کی تعریف و توصیف کا، لیکن انسان عاجز کو خدا کی حمد کا کیا یارا، حدیث میں ہے کہ: الٰہا! میں تیری

حمد و ثنا نہیں کر سکتا، تو ویسا ہی ہے جیسا تو نے بتایا، یعنی تیرے وصف ہی سے ہم نے تجھے جانا ہے، پھر تیری تعریف کا حقہٗ کیسے کر سکتے ہیں، فضا نے اپنی تواضع کے ساتھ ساتھ اس مفہوم کو کتنی خوبی سے ادا کیا ہے :

حمد میں اس کی میں کیا کیا لکھوں

حرف تا حرف ہوں دفتر اس کا

۹۔ ھو اللہ واحدٌ

قرآن کریم کی ایک آیت میں تصریح ہے کہ روئے زمین کے تمام درخت اگر قلم اور سمندر روشنائی بن جائیں تب بھی حمد باریؔ کا حق ادا نہیں ہو سکتا، فضا کی حمدیہ نظمیں پڑھ کر آیت کے مذکورہ مضمون کی تصدیق ہو جاتی ہے، یعنی حمد و ثنا کرنے والا اگر اس فن سے واقف ہو تو اس سرچشمۂ معانی و مفاہیم کے سوتے کبھی خشک نہیں ہو سکتے، فضا نے بڑی ہنرمندی اور معنیٰ آفرینی کی قوت سے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کمال، اسماء و صفات اور دیگر صفات عالیہ کو اجاگر کیا ہے، مذکورہ عنوان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

یکتا ہے اس کی ذات ہو اللہ واحدٌ

وہ روحِ کائنات ہو اللہ واحدٌ

روشن تمام نقش اسی کے فروغ سے

اسماء ہوں یا صفات ہو اللہ واحدٌ

ہاتھوں میں اس کے تیرگی و نور کی کلید

دن اس کے اس کی رات ہو اللہ واحدٌ

روز و شب کے آمد و شد کی اس سے بہتر تعبیر کیا ہو سکتی ہے ؟

شاعر کی پاکیزہ و قابل قدر تمنا ملاحظہ کیجئے :

دامن رہے نہ ثروتِ توحید سے تہی

قرآن کی زکات ہو اللہ واحدٌ

ساری جہت اسی کی مکاں ہو کہ لامکاں

پھر بھی وہ بے جہات ہو اللہ واحدٌ

" جہت " اور " بے جہات " کے تقابل سے جو حسن پیدا کیا ہے قابل غور ہے ۔

توحید سے متعلق اسلامی عقیدہ کا خلاصہ ملاحظہ کیجئے:

وردِ زباں رہے یہ وظیفہ کہ ہے فضاؔ
سرمایۂ نجات ھو اللہ واحدٌ

۱۰۔ نورٌ علیٰ نور

کہنہ مشق وقادر الکلام شاعر کا کمال یہ ہے کہ وہ عام معانی کو خوبصورت تعبیر کے ذریعہ کردے، اور معنیٰ آفرینی کی قوت کے سہارے دقیق معانی کو محسوس انداز میں سامنے دے، اللہ تعالیٰ کی صناعی اور کمال قدرت کے اظہار میں فضا کے یہاں ہم کو یہی اسلوب نظر آتا ہے، عنوان کی مناسب سے وہ ایسے قافیہ کا انتخاب کرتے ہیں جس سے مدعا بالکل واضح ہوجاتا ہے، چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

وہ صنّاعِ ازل، اس کے کمالِ دست قدرت سے
گہر خوشں آب، لالے شبنم آسودہ، صدف روشن
کلاہ آفتاب وجیبِ ماہ د قوسِ روز و شب
بساطِ گوہر و گل، دامن خاک و خزف روشن
نوازش بیکراں اس کی، کرم بے انتہا اس کا
ہوئی طاقِ عبودیت میں قندیلِ شرف روشن
اسی کی فیض بخشی کا یہ پر تو ہے کہ ہیں اب تک
معانی کے دریچے میرے لفظوں کی طرف روشن

پہلے شعر میں گہر کو خوش آب اور لالے کو شبنم آسودہ کہنا کتنی حسین تعبیر ہے، اس سے دونوں چیزوں کا اصل وصف نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

انسانوں پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے اظہار کے لئے " طاقِ عبودیت میں قندیل شرف روشن " کہنا بیحد انوکھی تعبیر

۱۱۔ علیٰ کل شئی قدیر

قدرت خداوندی کے مظاہر لاتعداد ہیں، ان کا صحیح ادراک اور خوبصورت تعبیر کسی شاعر کا کام ہے جس کی نظر عمیق، شعور باریک، ذہن رسا اور فکر شاداب ہو فضا نے فنی چابکدستی سے یہ فرض اس طرح ادا کیا ہے:

سفینے تیرے اشارے پہ رخ بدلتے ہیں
ہوائیں تیری، مرا بادبان بھی تیرا

قریب شہ رگِ جاں، اور آنکھ سے اوجھل
عجب ہے، فاصلۂ درمیان بھی تیرا
تو برگِ گل سے سبک تر، تو بوئے گل سے لطیف
نہ بوجھ اٹھا سکی، بھاری چٹان بھی تیرا
مرے کلام میں تیرا جمال، تیری مہک
مرا شعور، مرا گیان دھیان بھی تیرا
ورق ورق مجھے پڑھتے رہیں گے لوگ کہ ہے
اک انکشاف مری داستان بھی تیرا
تو اس کے زخمِ ہنر کو زبان دے یارب
یہی فضا ہے یہاں ترجمان بھی تیرا

سفینوں کا اشارہ پر رخ بدلنا، قدرت کی کتنی حسین و واقعی تعبیر ہے! تیسرے شعر میں برگِ گل سے سبک اور بوئے گل سے لطیف کہہ کر پھر چٹان کے بوجھ نہ اٹھا سکنے کی جو بات کہی ہے اس سے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت و جلال کا سراپا سامنے آجاتا ہے۔

آخری شعر میں "زخمِ ہنر کو زبان دینے" کی تعبیر بھی اچھوتی ہے، شاعر نے اپنی تمنا کو کتنی خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے!

۱۲- انّ فی ذلک لآیات

اللہ تعالیٰ کی نشانیاں کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں، ان میں ہر نشانی اپنے اندر عبرت و موعظت کے بہت سے پہلو رکھتی ہے، ان نشانیوں کا ادراک پھر انہیں صحیح اور خوبصورت طور پر قاری کے سامنے پیش کرنا فنی مہارت کے بغیر ممکن نہیں، اور جب یہ مہارت پیدا ہو جائے تو صاحبِ فن خود ایک نشانی بن جاتا ہے۔ فضاؔ نے مذکورہ عنوان کے تحت چھوٹی بحر میں بڑی سلاست و تاثیر کے ساتھ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے تصرّف و قدرت کو بیان کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

میری ساری خواہش اس کی
بادل اس کے بارش اس کی
سبزہ شبنم، اس کی نزہت
لالہ و سنبل نازش اس کی

نقش و نگار و نجم و نگینہ
طرز طراز طرازش اس کی

تناسب اور موسیقی ملاحظہ ہو کہ پہلے مصرع میں تمام الفاظ حرف "ن" سے شروع ہوئے ہیں، اور دوسرے مصرع میں ایک ہی مادہ کے تین الفاظ کو انتہائی متناسب انداز میں استعمال کیا ہے:

وہ بے ابر ترشح اس کا
وہ بے آب ترادش اس کی
اس سے تپش اندوز دو عالم
آہن اس کا آتش اس کی
پچھم پورب اتر دکھن
آب و ہوا سے سازش اس کی
کشفِ حقائق ادراک اس کا
درس یقیں آموزش اس کی
میرے دل میں اس کی دھڑکن
درد مرا آرامش اس کی
میرے ہونٹ وظیفہ اس کا
میری روح ستائش اس کی

حمد کے اس شعر میں کتنی خوبصورتی سے حمد کے مفہوم کو واضح کر دیا ہے ۔

مری جبیں میں سجدہ اس کا
میرے سر میں نیائش اس کی
پتوار اس کی کشتی میری
بازو میرے کوشش اس کی

تاثیر و واقعیت کی داد دیجئے ۔

پتھر میرا تیشہ اس کا
جرم مرا آمرزش اس کی

اس حقیقت نگاری میں حمد کے مفہوم کو کتنی مہارت سے ادا کیا ہے، اور تیشہ و جرم کے استعارہ سے کس قدر حسن پیدا کیا ہے!

آنسو میرے دامن اس کا
لغزش میری بخشش اس کی

بندہ کے عجز و قصور اور اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم کی اس سے بہتر تصویر کیا ہوگی؟

میری عبارت مفہوم اس کا
میرے فقرے بندش اس کی
میری حمد تعارف اس کا
میرے حرف سفارش اس کی
اس کے آگے سب بے قیمت
کس سے پوچھوں ارزش اس کی

ب۔ مناجات کا حصہ

زیر تعارف مجموعہ میں حمدیہ نظموں کے بعد چار نظمیں مناجات کی بھی ہیں، ان کے اندر بھی فضا کی شاعری کا فن نمایاں ہے چست ترکیبیں، سچی تعبیریں، دل کا سوز و گداز، الفاظ میں تناسب و موسیقی، حسن افزا تشبیہات و استعارے ان نظموں کی خوبیاں ہیں، ہر شعر پر تبصرہ سے مضمون بیحد طویل ہو جائے گا، اس لئے ہر سرخی کے ذیل میں اپنے پسندیدہ اشعار پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، اگر ضروری ہوا تو مختصراً تاثر کا اظہار کروں گا۔

۱۔ التجاء

مجھی کو سونپ دے تو اپنی حکمتیں ساری
ہوں موجِ خاک تو کیا نقشِ آسمانی دے

جو آئینہ ہے شعورِ یقیں شناسی کا
مجھے وہ جوہرِ پندارِ خوش گمانی دے
بہ نام جسم یہ کیسی چٹان راہ میں ہے
رکا رکا ہے نفس بحر کو روانی دے
جو اہلِ دل کے لئے مایۂ قناعت ہے
مجھے وہ نفع زیاں سودِ رائگانی دے
کوئی گلاب نیا میری شاخ جاں پہ کھلا
کفِ گلاب کو پھر خارِ شادمانی دے
مجھے غرض کسی بے روح داستان سے کیا
تو جس کہانی میں شامل ہے وہ کہانی دے
رہوں مطالعۂ ذات و کائنات میں گم
کتاب دی ہے تو ذوقِ کتاب خوانی دے

۲- دعا قبول ہو یارب

مناجات کے اس عنوان پر غور کیجئے کہ یہ خود بہترین مناجات ہے، اس عنوان کے تحت چند اشعار ملاحظہ کیجئے:

صلہ علم آموزش
جہل جہل عبرت دے

غم کی بے کرانی بخش — زخم بے نہایت دے
زندگی کو صیقل کر — آئنوں کو صورت دے
منتشر نہ ہو جاؤں — فن کی سالمیت دے
میں بھی ہوں ثمر جیسا — شاخ شاخ زینت دے
ذہن میں اتر جاؤں — وہ بلیغ حجت دے
شاعرانہ مشوؤں کو — دانش رسالت دے

میں فقیر ہوں یا رب!
آگہی کی دولت دے

۳- گذارشِ مجبور

اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندہ کا جو تعلق ہونا چاہیئے اسے یہ عنوان بخوبی واضح کر رہا ہے، بندہ کو اللہ سے جو کچھ مانگنا چاہیئے اور جس طرح مانگنا چاہیئے اس کی بہترین تصویر اس نظم میں موجود ہے، شاعر نے بڑے سوز اور انتہائی عاجزی سے ان باتوں کا سوال کیا ہے، جن سے زندگی میں استواری اور معنویت پیدا ہوتی ہے اور انسان آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے، اسلوب میں سلاست، تعبیر میں واقعیت، الفاظ میں موسیقی اور الفاظ میں سوز و گداز رچا بسا ہے، نظم کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس مناجات کو ہر پڑھنے والا اپنے دل کی آواز سمجھے گا، چند اشعار ملاحظہ ہوں:

گداز قلب دے، سوزِ جگر دے
مرا ساغر تہی ہے اس کو بھر دے

اٹھا دے جہل و نادانی کے پردے
مذاقِ امتیازِ خیر و شر دے

ترے سرِ نہاں کو فاش دیکھوں
وہ چشم نکتہ بیں و نکتہ ور دے

زیاں پرور ہے سودِ زندگانی
خیالِ سود و نقصاں محو کر دے

یہ دنیا ہو چکی آئینہ مجھ پر
جہاں تو ہے وہاں کی اب خبر دے

مجھے رہنا ہے مثلِ بو پریشاں
چمن سے اب مجھے اذنِ سفر دے

دعا یہ ہے کہ مثلِ نکہتِ گل
مجھے اہلِ جہاں پر فاش کر دے

۴۔ مناجات کے آنسو

اس مناجات میں شاعر نے اپنے عجز وقصور کی تصویر پیش کرتے ہوئے بڑی خوبی سے اللہ تعالیٰ کی عظمت وکمال کی جانب اشارہ کیا ہے، پھر اپنی تمناؤں کو دعا کے رنگ میں اس طرح پیش کیا ہے کہ دل کا سوز وگداز الفاظ میں محسوس کیا جا سکتا ہے، کہتے ہیں :

الٰہی مجھ کو بینائی عطا کر
خدائی کو تماشائی عطا کر
دعا دے گی مری ذرّہ نہادی
اسے صحرا کی پہنائی عطا کر
رہے تیری طلب پا کر بھی تجھ کو
وہ ذوق ناشکیبائی عطا کر

اللہ تعالیٰ کی سچی محبت پیدا ہونے کے بعد دل کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کی کتنی پاکیزہ تصویر ہے! اللہ تعالیٰ کی عظمت اور بندہ کی عاجزی کو اس شعر سے کس طرح واضح کیا ہے!

لبِ قلزم کو وسعت دینے والے
مرے قطروں کو گہرائی عطا کر
میں ہنگاموں سے اب اکتا گیا ہوں
مجھے محفل میں تنہائی عطا کر

محفل میں تنہائی کی طلب کتنا انوکھا تصور ہے ۔

ہیں محرومِ بصیرت دل کی آنکھیں
عطا کر ان کو بینائی عطا کر
تخیّل کو بلندی کی سند دے
تفکر کو توانائی عطا کر
فضا کے ناتراشیدہ قلم کو
تمیزِ نکتہ آرائی عطا کر

مقطع میں شاعر نے تواضع کا اظہار کرتے ہوئے نکتہ آرائی کی تمیز کے لئے دعا کی ہے حسن مطلب کا کتنا نادر نمونہ ہے !

اعتراف واختتام

سرِ شاخِ طوبیٰ کے حصۂ حمد ومناجات کا یہ ایک سرسری تعارف ہے ، فضاؔ کی شاعری اہل نقد ونظر کی توجہ کا مرکز ہے ، اور وہی اس کے محاسن ومیزات کا صحیح تعارف کرانے کے اہل ہیں ، میں نے جو چند سطریں تحریر کی ہیں ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ اسلامی ادب سے تعلق رکھنے والے اہل قلم فضاؔ کی شاعری کے ان عناصر پر توجہ مبذول کریں جن کا تعلق اسلامی اقدار کے تعارف وتجدید سے ہے ، کیونکہ فنی لحاظ سے اس کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس سے نئی نسل کے شعراء کو بہت زیادہ روشنی ملے گی ۔ والتوفیق من اللّٰہ ۔

نوٹ

یہ مقالہ رابطہ ادب اسلامی کے مذاکرۂ علمی بعنوان " حمد ومناجات " منعقدہ رائے بریلی بتاریخ ۷ ، ۸ ، ۹ / اکتوبر ۱۹۹۰ء کے لئے تحریر کیا گیا تھا ، راقم اس مذاکرہ میں شریک نہ ہوسکا ، البتہ ادارہ کے صدر دفتر کو یہ مقالہ بھیج دیا ہے ۔

حررہٗ

مقتدیٰ حسن ابن محمد یاسین ازہری

۲۴ / ربیع الاول ۱۴۱۱ھ

۱۴ / اکتوبر ۱۹۹۰ء

دعاءِ استلام حجرِ اسود

بتحقیق : غازی عزیر، ص ب ۲۰۰۸۷ الخبر ۳۱۹۵۲ (المملکۃ العربیۃ السعودیۃ)

"حج وعمرہ" کے موضوع پر لکھی جانے والی بیشتر کتابوں میں استلام حجرِ اسود کی دعاء اس طرح بیان کی جاتی ہے :

كَانَ إِذَا اسْتَلَمَ الْحَجَرَ قَالَ اللّٰهُمَّ إِيْمَانًا بِكَ	حجرِ اسود کا استلام کرتے وقت فرماتے ، اے اللہ تجھ پر
وَتَصْدِيقًا بِكِتَابِكَ وَوَفَاءً بِعَهْدِكَ	ایمان لاتے ہوئے تیری کتاب کی تصدیق کرتے ہوئے تیرے
وَاتِّبَاعًا لِسُنَّةِ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ	عہد کو پورا کرتے ہوئے تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ۔	کی اتباع کرتے ہوئے طواف کرتا ہوں ۔

امام نوویؒ کتاب "الاذکار" کی فصل "اذکار الطواف" میں فرماتے ہیں :

"اولاً حجرِ اسود کے استلام اور طواف کی ابتداء کے وقت یہ کہنا مستحب ہے بسم اللہ واللہ اکبر اللّٰھم ایمانا بك الخ. نیز اس ذکر کا طواف کے چکر میں حجرِ اسود کے محاذات پر بار بار پڑھنا بھی مستحب ہے"[1]

علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ کتاب "المغنی" میں فرماتے ہیں :

"اور استلام حجرِ اسود کے وقت یوں کہے : بسم اللہ واللہ اکبر ایمانا الخ ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عبداللہؓ بن السائبؓ نے مرفوعاً اس کی روایت کی ہے"[2]

علامہ زیلعی "نصب الرایہ" میں فرماتے ہیں :

. اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، بسم اللہ واللہ اکبر ایمانا باللہ وتصدیقا بما جاء بہ محمد[3]

---

[1] اذکار للنووی ص۱۷۶ [2] مغنی لابن قدامہ ج ۳ ، ص ۳۷۱ [3] نصب الرایہ للزیلعی ج ۳ ، ص ۳۷

ادارت البحوث العلمیہ والافتاء والدعوۃ والارشاد بالریاض کے رئیس العام اور عالم اسلام کے مشہور عالم دین شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ ابن باز حفظہ اللہ اپنی کتاب " التحقیق والایضاح لکثیر من مسائل الحج والعمرۃ والزیارۃ علی ضوء الکتاب والسنۃ " میں تحریر فرماتے ہیں :

طواف شروع کرتے ہوئے اگر یہ پڑھا جائے تو بہتر ہے : اللھم ایمانا بک الخ کیونکہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے[4]

سعودی عرب کی مجلس القضاء الاعلیٰ کے سابق رئیس شیخ عبداللہ بن محمد بن حمید رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب " ہدایۃ الناسک إلی اھم المناسک " میں اس دعاء کا ذکر کیا ہے[5]۔ ہندوستانی مرکزی جمعیۃ اہلحدیث کے امیر جناب مولانا مختار احمد ندوی صاحب اپنی کتاب " حج مسنون " میں فرماتے ہیں :

" طواف کے درمیان کوئی مخصوص دعاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، جو دعاء بھی پسند آئے کرنی چاہئے، ہر چکر کے لئے جو دعائیں لوگوں نے مخصوص کر رکھی ہے ان کی کوئی بنیاد نہیں البتہ طواف کی ابتداء میں یہ دعاء پڑھی جائے تو بہتر ہوگا : اللھم ایمانا بک ... الخ (الایضاح)[6]

واضح رہے کہ مولانا موصوف کی یہ کتاب شیخ الحدیث جناب مولانا عبیداللہ رحمانی مبارکپوری (صاحب مرعاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح) حفظہ اللہ کی نظر ثانی کے بعد طبع ہوئی تھی، مگر آں موصوف نے بھی اس دعاء کے استحباب کو بلا دلیل قطعی باقی رکھا ہے۔ فانا للہ الخ ۔

اصلاً یہ دعاء " معجم الاوسط " للطبرانیؒ میں بطریق ابی اسحاق عن الحارث عن علی انہ کان فذکرہ مروی ہے[7]۔ علامہ ہیثمی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں : " اس کی سند میں حارث ہے جو کہ ضعیف ہے، مگر اس کی توثیق بھی کی گئی ہے[8] "۔ اور علامہ شیخ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ کا قول ہے : " یہ سند حارث الاعور جو کہ ضعیف ہے کے سبب واہی ہے[9] "۔ یہ حارث بن عبداللہ الاعور الہمدانی الکوفی وہ شخص ہے جس کے متعلق ابو اسحٰقؒ، شعبیؒ اور ابن المدینیؒ نے " کذاب "، نسائی نے " قوی نہیں ہے " اور دارقطنیؒ وابن معینؒ نے " ضعیف " کہا ہے، ابن معین کا ایک دوسرا قول ہے کہ " اس میں کوئی حرج نہیں ہے " آں رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ اسے " ثقہ " بھی کہا ہے، احمد بن صالحؒ اور ابن ابی داود نے بھی اسے " ثقہ " بتایا ہے، مگر ثوری، ابو زرعہ، ابن عدی، ابن سعد اور ابو حاتم وغیرہم نے اس پر کلام کیا ہے، ابن عدی فرماتے ہیں : " عام طور پر وہ جو روایت کرتا ہے وہ غیر محفوظ ہوتی ہے " سلیمان یشکری اور ابن جنید کا قول ہے : " اضعف القوم الحارث عن علی " امام عجلی بیان کرتے ہیں کہ " حارث متہم تھا " امام ابن حبان فرماتے ہیں : " وہ تشیع میں غلو کرتا تھا اور حدیث میں واہی

---

[4] التحقیق والایضاح لابن باز ص۴۵ ۔ [5] ہدایۃ الناسک للشیخ عبداللہ ص۲۹ ۔ [6] حج مسنون مصنفہ مختار احمد ندوی ص۱۲۷-۱۲۸ ۔

[7] معجم الاوسط للطبرانی حدیث نمبر ۴۸۸ ۔ [8] مجمع الزوائد للہیثمی ج ۳ ص۲۴۰ ۔ [9] سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ للالبانی ج ۳ ص۱۵۷ ۔

تھا، جریر بن عبد الحمید فرماتے ہیں " ذیف تھا " ابن سیرین بیان کرتے ہیں کہ " حضرت علی سے جو روایت کرتا ہے عام طور پر وہ باطل ہوتی ہے " امام ذہبی فرماتے ہیں " وہ کبار علمار تابعین میں سے تھا باوجود اس کے کہ اس میں ضعف ہے ... شعبی نے اس کی تکذیب کی ہے مگر پھر بھی اس سے حدیث کی روایت کی ہے، ظاہر ہے کہ وہ اپنی حکایات اور لہجہ کے اعتبار سے کذب بیانی کرتا ہو مگر حدیث نبوی میں کذب بیانی نہیں کرتا تھا اور اوعیۃ العلم میں سے تھا " شعبی کا قول ہے " ہم نے حارث سے حدیث بیان کی ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ جھوٹوں میں سے ایک تھا، یحیٰ اور عبد الرحمنؒ ابو اسحاق عن الحارث عن علی کے طریق سے حدیث بیان نہیں کیا کرتے تھے، تشیع میں اس کے غلو کی یہ انتہا تھی کہ حضرت علیؓ کو حضرت ابو بکرؓ پر فضیلت دیتا تھا، حارث الاعور کے حالات کے لئے حاشیہ [10] میں مذکور کتب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

استلام حجر اسود کی دعار کے متعلق دو[2] اور روایتیں " معجم الاوسط[11] للطبرانی میں بطریق عون بن سلام ثنا محمد بن مہاجر عن نافع قال کان ابن عمر اذا استلم الحجر قال فذکرہ مروی ہیں، مگر ان دونوں روایتوں کے آخر میں " ثم یصلی علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم " (یعنی پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھتے) کے اضافی الفاظ موجود ہیں۔ ان روایتوں کے متعلق علامہ ہیثمی فرماتے ہیں " اس کے رجال صحیح کے رجال ہیں "[12] مگر شاید علامہ ہیثمی کو اس حدیث کے راوی محمد بن مہاجر سے یہ وہم ہوا ہے کہ وہ " مسلم " کا ثقہ راوی محمد بن مہاجر بن ابی سلیم " الشامی " ہے۔ حالانکہ اس طریق میں موجود محمد بن مہاجر " الشامی " نہیں بلکہ " القرشی الکوفی " ہے جو " صحیح " کے رجال میں سے نہیں ہے اور نہ اس سے اصحاب ستہ میں سے کسی نے کوئی روایت لی ہے بجز امام نسائی کے، مگر انہوں نے بھی اس سے اپنی " سنن "

---

[10] تاریخ یحییٰ بن معین ج ۳ ص ۲۶۸، ضعفاء والمتروکون للنسائی ترجمہ ۱۱۴، علل لابن حنبل ج ۱ ص ۱۴۷، تاریخ الکبیر للبخاری ج ۱ ص ۲۷۳، تاریخ الصغیر للبخاری ج ۱ ص ۱۴۹، ضعفاء الصغیر للبخاری ترجمہ ۶۰، ضعفاء الکبیر للعقیلی ج ۱ ص ۲۰۸، جرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج ۱ ص ۷۸، مجروحین لابن حبان ج ۱ ص ۲۲۲، کامل فی الضعفاء لابن عدی ج ۲ ص ۶۰۴، ضعفاء والمتروکون للدارقطنی ترجمہ ۱۵۲، میزان الاعتدال للذہبی ج ۱ ص ۱۳۵، مغنی فی الضعفاء للذہبی ج ۱ ص ۱۴۱، تہذیب التہذیب لابن حجر ج ۲ ص ۱۴۶، معرفۃ الثقات للعجلی ج ۱ ص ۲۷۸، تاریخ الدارمی عن ابن معین ص ۹۰، کشف الحثیث للحلبی ص ۱۳۰، قانون الضعفاء للفتنی ص ۲۴۸، ضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج ۱ ص ۱۸۱، تقریب التہذیب لابن حجر ج ۱ ص ۱۴۱، صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۹، مجموع المہذب للنووی ج ۳ ص ۲۲، ۲۴۳، ج ۴ ص ۲۴۱، ج ۵ ص ۱۰، ج ۶ ص ۳۱۵، ج ۸ ص ۳۱، ۶۲، علل المتناہیۃ لابن الجوزی ج ۱ ص ۱۴۳، ۱۸۴، ۲۴۴، ۴۲۶، ج ۲ ص ۲۲۰، ۳۶۴، تحفۃ الاحوذی للمبارکفوری ج ۲ ص ۱۵۸، ج ۳ ص ۱۴۵، ج ۶ ص ۱۷۲، ج ۸ ص ۸، نصب الرایہ للزیلعی ج ۱ ص ۳۶۷، ج ۲ ص ۴۲۶، ۲۸۱، ۳۲۹، ج ۴ ص ۲۱۱، مجمع الزوائد للہیثمی ج ۸ ص ۱۳۰۔ [11] معجم الاوسط للطبرانی حدیث نمبر ۵۹۶۱، ۵۹۱۷۔ [12] مجمع الزوائد للہیثمی ج ۳ ص ۲۴۰۔

کے بجائے "عمل الیوم واللیلۃ" میں روایت کی ہے، محمد بن مہاجر کی شخصیت کی تعیین کے سلسلہ میں جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے اسے اس بات سے مزید تقویت ملتی ہے کہ "الشامی" جسے امام احمد، ابن معین، ابوزرعہ، دحیم، ابوداود، عجلی، ابن حجر اور ذہبی وغیرہم نے ثقہ، نسائی نے "لیس بہ بأس" ابن حبان نے "متقناً" اور ابن المدینی نے "کان وسطاً" قرار دیا ہے [۱۳]، کے شیوخ میں نہ نافع کا شمار ہوتا ہے، اور نہ اس سے روایت کرنیوالوں میں کوئی فرد عون بن سلام ہے جبکہ "القرشی الکوفی" کے شیوخ وتلامذہ میں مذکورہ دونوں شخصیات نظر آتی ہیں، یہ محمد بن مہاجر الکوفی وہ شخص ہے جسے ابن حجر عسقلانی نے "لین" (یعنی لچک والا)، صالح بن محمد الاسدیؒ نے "اللہ کی مخلوق میں سب سے بڑھ کر جھوٹ بولنے والا" ابن عقدہ نے "کچھ بھی نہیں، ضعیف وذاہب" دارقطنی نے "ضعیف" امام بخاریؒ وامام عقیلیؒ نے "لایتابع علی حدیثہ"، امام ذہبی نے "لایعرف" اور امام ابن حبان نے "ثقات پر حدیث گھڑنے والا، اثبات پر اسانید بنانے والا اور اخبار صحاح میں الفاظ کا اضافہ کرنے والا" بتایا ہے "القرشی الکوفی" کے تفصیلی حالات کے لئے حاشیہ [۱۴] میں مذکورہ کتب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

امام عقیلی نے زیر مطالعہ حدیث کو اپنی کتاب "الضعفاء الکبیر" میں محمد بن مہاجر "القرشی" کے ترجمہ میں بطریق عون بن سلام حدثنا محمد بن مہاجر عن نافع عن ابن عمر قال: "کان إذا رأی أن یستلم الحجر یقول: اللّٰھم ایماناً بك وتصدیقاً بکتابك وسنۃ نبیك صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثم یصلی علی النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم ثم یستلمہ" وارد کیا ہے، اور فرماتے ہیں: "ولا یتابع علیہ [۱۵]"

اور اسی حدیث کے متعلق علامہ شیخ محمد ناصر الدین البانی حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ "یہ سند ضعیف ہے اور اس کی علت محمد بن مہاجر القرشی

---

[۱۳] تاریخ یحیی بن معین ج ۲ ر ص۵۴۰، جرح والتعدیل لابن ابی حاتم ج ۸ ر ص۹۱، الثقات لابن حبان ج ۷ ر ص۴۱۳، ۴۱۴، میزان الاعتدال للذہبی ج ۴ ر ص۴۹، تقریب التہذیب لابن حجر ج ۲ ر ص۲۱۱، سوالات محمد بن عثمان ص۱۶۰، تاریخ الکبیر للبخاری ج ۱ ر ص۲۲۹، تاریخ الصغیر للبخاری ج ۲ ر ص۱۸۲، مشاہیر علماء الامصار ص۱۸۳، معرفۃ الثقات للعجلی ج ۲ ر ص۲۵۵، تہذیب التہذیب لابن حجر ج ۹ ر ص۴۷۷، نصب الرایہ للزیلعی ج ۲ ر ص۳۷۲۔

[۱۴] تاریخ الکبیر للبخاری ج ۱ ر ص۲۳۰، میزان الاعتدال للذہبی ج ۴ ر ص۴۸، کشف الحثیث عمن رمی بوضع الحدیث للحلبی ص۴۰۹، ضعفاء الکبیر للعقیلی ج ۴ ر ص۱۳۵-۱۳۶، مجروحین لابن حبان ج ۲ ر ص۳۰۱، تحقیق لابن الجوزی ج ۱ ر ص۳۳۲، ضعفاء والمتروکین لابن الجوزی ج ۳ ر ص۱۰۳، علل المتناہیۃ فی الاحادیث الواہیۃ لابن الجوزی ج ۱ ر ص۱۵۷، ۴۳۳، ج ۲ ر ص۲۶۱-۲۶۳، تقریب التہذیب لابن حجر ج ۲ ر ص۲۱۱، نصب الرایہ للزیلعی ج ۱ ر ص۱۷۳، ج ۲ ر ص۳۷۲۔ [۱۵] ضعفاء الکبیر للعقیلی ج ۴ ر ص۱۳۶۔

الکوفی ہے۔[۱۶]

پس معلوم ہوا کہ یہ حدیث "مرفوع" نہیں بلکہ "موقوف" اور ساتھ ہی سنداً "ضعیف" بھی ہے، لہٰذا اس کا استحباب کسی طرح سے ثابت نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم۔

واضح رہے کہ محدث عصر علامہ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ نے بھی "سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ"[۱۷] میں اس کو "موقوف" "ضعیف" قرار دیا ہے۔ نیز علامہ موصوف ہی نے اپنی ایک دوسری کتاب "مناسک الحج والعمرۃ فی الکتاب والسنۃ وآثار السلف" میں اس دعا کے پڑھنے کو "بدعاتِ طواف" میں شمار کیا ہے[۱۸] واللہ اعلم۔

محررہ: ۱۱/۴/۱۴۱۱ھ

بمطابق: ۲۹/۱۰/۱۹۹۰ء

۱۶؎ سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ للالبانی ج ۳، ص ۱۵۷۔

۱۷؎ ایضاً ج ۳، ص ۱۵۶۔

۱۸؎ مناسک الحج والعمرۃ للالبانی ص ۵۱۔

اطاعتِ امیر یا پیر پرستی

اصغر علی امام مہدی السلفی رجامعہ سلفیہ بنارس

کتاب وسنت میں اطاعت امیر کی بڑی تاکید آئی ہے، ارشاد باری ہے:

أطیعوا اللہ وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم۔ یعنی اطاعت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اولی الأمر کی۔

اس آیت کریمہ میں امیر شرعی کی اطاعت کا حکم اور تاکید ہے، ایک حدیث پاک میں یوں ارشاد ہے:

ان امر علیکم عبد مجدع یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا (مسلم) اگر تمہارے اوپر کان کٹا غلام بھی امیر مقرر کردیا جائے جو تمہیں کتاب اللہ کے احکام پر چلاتا ہو تو اس کی سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

اس طرح اطاعت امیر کو ایمان کی صفت قرار دیا گیا ہے، مسلمانوں کے متفقہ امیر کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص دعویٰ امارت [کر]تا ہے تو گویا وہ تفریق بین المسلمین کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے، اس لئے فتنے کی انسداد کے لئے ایسے باغی شخص کو قتل کردینے کا حکم [ہ]ے، اور اسے مسلمانوں کے زمرے سے نکالنے کی سخت وعید سنائی گئی ہے۔

جب تک امیر تعلیمات اسلام کی پابندی کرتا اور کراتا ہے، اور مخالف شریعت امور کے کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ معروف کا حکم دیتا [ہ]ے جس میں خالق کی معصیت نہیں ہوتی تب تک اس کی اطاعت ضروری ہے۔

مگر افسوس اس بات پر ہے کہ آج کا مسلمان اطاعت امیر کے سلسلہ میں افراط وتفریط کا شکار ہے، کہیں امیر کی اعلانیہ نافرمانی [ہے]، تو کہیں اطاعت امیر میں خالق کی معصیت کا پرواہ نہیں کیا جاتا۔ تعلیمات اسلام کی کس تعلیم سے امیر کا یہ فرمان متصادم ہے، اس سے [قط]ع نظر امیر کی ہر بات میں اطاعت ہی اصل اصول دین قرار دیا گیا ہے، راقم کا اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ بعض لوگوں کے شریعت مخالف امور [و] باتوں کی تصویب اور یاددہانی پر وہ شرعی باتوں کے قبول کرنے کے بجائے غصہ ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے امیر اور پیشوا کا یہی حکم

ہے، اور اطاعت امیر لازم اور ضروری ہے، حدیث پاک کیا کہتی ہے، اللہ تعالیٰ کا حکم کیا ہے، فرمانِ رسول کیا ہے، اس سے ان کو کوئی سروکار نہیں، تصوف کی تعلیمات کا اثر ان پر اتنا غالب ہے کہ قرآن وحدیث کے احکام کا ان کے یہاں کوئی وزن نہیں، قرآن وحدیث کا نام لیتے نظر آئیں گے مگر اس کی تعلیمات سے یکسر نابلد ہوں گے، قرآن وحدیث کی تعلیم تو یہ ہے کہ:

لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق   کسی مخلوق کی اطاعت خالق کی نافرمانی میں جائز نہیں ہے

جب کہ تصوف کی تعلیم وتلقین یہ ہے کہ مامور امیر کے اور مرید پیر کے حکم اور خواہش کے سامنے لاشہ بے جان ہے، جسے غسل دینے والے جدھر چاہتے ہیں اپنی مرضی سے گھماتے اور الٹتے پلٹتے ہیں، اس میں مرید کے ارادہ کا کوئی دخل نہیں ہوتا، مرید کو کل اختیار اتنا ہے کہ امیر کی ہر خواہش کے سامنے بے چون وچرا سر تسلیم خم کردے وہ کسی امر کی وجہ دریافت نہیں کرسکتا اور نہ ہی کسی بات پر اعتراض کرنے کا مجاز ہے۔

ایک تو پہلے ہی بیعت کے وقت اس قسم کی اندھی تقلید کا اقرار تاکیدی طور پر کرالیا جاتا ہے، دوسرے عوام الناس اور مریدین کے دلوں کو موہ لینے اور خودساختہ باتوں پر چلانے کے لئے ان کے سامنے پیر ومرشد اور مرید کے عجیب وغریب شریعت مخالف طلسماتی قصے بیان کرکے ان کے عقل اور عقیدہ سے کھیلا جاتا ہے۔

آج کل کی بہت سے تبلیغی کتابوں میں اور واعظوں کی زبان پر ایسے قصے عام ہیں جن سے لوگوں کے دلوں کو مسحور کرکے ان کو آنکھ رہتے ہوئے نابینا، کان رہتے ہوئے بہرا، زبان رہتے ہوئے گونگا اور ہاتھ پیر رہنے کے باوجود بے دست وپا کردیتے ہیں، اسی قسم کا ایک واقعہ امام ابن جوزی رحمۃ اللہ نے اپنی مشہور کتاب "تلبیس ابلیس" میں ذکر کرکے اس پر رد فرمایا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ: یوسف بن حسین نے بیان کیا ہے کہ احمد بن ابی الحواری مرید اور ابوسلمان پیر کے درمیان عہد وپیمان تھا کہ مرید پیر کے کسی حکم کی مخالفت نہیں کریگا (تب اس کو سلوک کے "مراتب حاصل ہوں گے اور تصوف کا گر سمجھ میں آئے گا) چنانچہ مرشد نے حکم دیا کہ تنور گرم کرو، مرید تنور گرم کرنے کے بعد ابوسلمان پیر کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت پیر صاحب مجلس میں بیان فرمارہے تھے، مرید نے دست بستہ عرض کیا کہ حضرت جی تنور سلگ چکا ہے آپ کا کیا حکم ہے؟ حضرت جی خاموش رہے، مرید نے دوبارہ عرض کیا، پیر صاحب نے ہنوز جواب نہیں فرمایا، مرید نے جب تیسری بار عرض کیا تو حضرت گویا ہوئے اور فرمایا کہ جا دور ہو اور گرم تنور میں بیٹھ جاؤ، مرید بے ارادہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور دہکتے تنور میں جا بیٹھا، پھر حضرت جی ابوسلمان نے مجلس برخاست کی اور فرمایا کہ چلو دیکھو اس نے کیا کیا اس نے تو وعدہ کیا تھا کہ میرے کسی بھی حکم سے سرتابی نہیں کرے گا، جب مرشد اپنے مریدوں کے جلوں میں تنور کے پاس حاضر ہوا تو مرید کو درمیان تنور بیٹھا ہوا پایا، پیر نے مرید کی دستگیری کی اور کھڑا کردیا (مرید کا جل کر راکھ ہوجانا تو دور کی بات ہے) اس کے بدن پر آگ کا ادنیٰ اثر بھی نہیں تھا۔ (تلبیس ابلیس ص۳۵۱)۔

امام صاحب اس گمراہ کن واقعے کو تلبیس ابلیس قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ قصہ درست نہیں، اگر اسے درست مان لیا جائے اور اس شعبدہ بازی کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو پیر کا آگ میں داخل ہونے کا حکم دینا اور مرید کا اس کی تعمیل کرنا معصیت ہے، بلکہ میں کہتا ہوں کہ عین ضلالت ہے، اور فرمان الٰہی:

لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ   اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

کے بالکل منافی ہے۔ کوئی بھی صاحب عقل دخرد چہ جائیکہ مرشد ایسا مخالف شریعت کام نہیں کرسکتا، یہ کام خودکشی کے مرادف ہے جو سراسر حرام ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس قسم کے طلسماتی حکایات کا دین اسلام سے کوئی تعلق ہے اور نہ خارج میں اس کا وجود درست ہے، یہ پیری اور مریدی کا گورکھ دھندا ہے۔ اسلامی تعلیمات وحکایات سے اس قسم کے لغویات کا کوئی ربط وتعلق ہے اور نہ اس کے لئے ادنیٰ گنجائش ہے۔

امام ابن جوزیؒ مزید فرماتے ہیں کہ مذکورہ قصہ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت سے متعارض ہے، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ بھیجا اور ایک انصاری صحابی کو اس کا امیر مقرر فرمایا جب یہ لوگ روانہ ہوگئے تو راستے میں امیر اپنے ساتھیوں کی کسی بات پر غصہ ہوگئے اور فرمایا کہ لوگو! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تم کو میری اطاعت کا حکم نہیں دیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ ہاں! تو انہوں نے حکم دیا کہ ایندھن جمع کرو! جب ایندھن جمع کر دیا گیا تو اس میں آگ لگا کر شعلہ زن کر دیا اور لوگوں کو اس میں داخل ہوجانے کا حتمی حکم دیا، تمام لوگ آگ میں کودجانے کو تیار ہوگئے کہ ان میں سے ایک جوان نے کہا کہ تم لوگ جلدی نہ کرو تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آگ ہی سے بھاگ کر آئے تھے تو ان سے مل لو، آپؐ حکم دیں تو پھر آگ میں داخل ہوجاؤ، جب یہ لوگ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو اس واقعہ کی خبر دی، آپ نے فرمایا کہ اگر تم اس آگ میں داخل ہوجاتے تو پھر اس سے کبھی بھی نہیں نکل پاتے، امیر کی اطاعت تو خیر کے کاموں میں ہے۔

بخاری مسلم کی اس صحیح روایت کی روشنی میں مذکورہ بالا پیر پرستی کی دعوت دینے والے قصے کی قلعی کھل جاتی ہے اور اس کا شریعت کے مخالف ہونا واضح ہے اور یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اس قسم کے من گھڑت قصے اسلام کی بیخ کنی کے لئے اختراع کئے گئے ہیں، مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ انہی دیومالائی قصوں پر اعتماد رکھتا ہے اور اپنے حلقے کو وسعت دینے کے لئے اس قسم کے قصوں کی نشرواشاعت میں لگا ہوا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ اطاعت امیر کی فرضیت سے پہلے امیر اور پیر کے فرق کو جان لینا ضروری ہے، اور یہ امر تو یقینی ہے کہ موجودہ پیری مریدی اور بیعت وسلاسل کا اسلام سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی یہ لوگ شرعی امیر ہیں، جن کی اطاعت اسلام میں لازم ہے۔

امیر جس کی اطاعت فرض ہے وہ امیر المؤمنین اور مسلمانوں کے علماء و حکام ہیں، جو دین کے حفظ و بقاء اور اعلائے کلمۃ حق کے لئے جیتے ہیں، مسلمانوں کے امور کی نگہبانی ان کا فریضہ ہے، اور اسلامی احکام کا اجراء و نفاذ ان کا وطیرہ ہے، مسلمانوں کی قیادت کتاب و سنت کی روشنی میں کرتے ہیں، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے لئے بندوں کی رہنمائی فرماتے ہیں، امر بالمعروف کا فریضہ انجام دیتے اور نہی عن المنکر کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں، بصورت دیگر مسلمان ان کے سمع و طاعت کے مکلف نہیں ہیں۔ دینی تعلیم سے بیگانہ اور کتاب و سنت کے علم سے کورے، امیروں اور پیروں کی اطاعت تو دور کی بات ہے، سرے سے ان کو امیر اور پیر کہنا ہی جائز اور درست نہیں چہ جائیکہ ان کی اطاعت واجب ہو۔

مگر افسوس ہے کہ آج کل اکثر جماعتوں میں ذیل در ذیل مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے امیر نما پیر دینی تعلیم سے نابلد اور جاہل ہی ملیں گے جن کی امارت کی دھوم مچی ہوئی ہے اور ان کی اطاعت کو واجب اور لازم قرار دینے کے لئے ہر طرح کے من گھڑت حکایات کو عوام کے گوش گذار کیا جا رہا ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کا واقع ہونا بھی تو ضروری ہے، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مجلس میں حدیث بیان فرما رہے تھے کہ اسی اثناء میں ایک دیہاتی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ قیامت کب ہوگی؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث بیان فرماتے رہے کہ بعض لوگوں نے کہا کہ آپ نے اس کی بات سنی اور ناپسند فرمایا (اس لئے جواب مرحمت نہیں فرما رہے ہیں) کچھ لوگوں نے کہا کہ بلکہ آپ نے سرے سے سنا ہی نہیں، جب آپ نے اپنی بات پوری کر لی تو فرمایا کہ قیامت کے سلسلہ میں سوال کرنے والا شخص کہاں ہے؟ تو اس نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! میں یہاں حاضر ہوں، آپ نے فرمایا کہ جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو! اس سائل نے کہا کہ امانت ضائع کیسے ہوگی؟ آپ نے فرمایا کہ امارت و سیادت نااہل لوگوں کو سونپ دیا جائے تو پھر قیامت کا انتظار کرو (بخاری مع فتح الباری ۱/۱۴۲)

الغرض امارت کا مستحق وہ شخص نہیں ہو سکتا جو تعلیمات کتاب و سنت سے ناواقف ہو اور امارت کا اہل نہ ہو، ورنہ بجائے فائدہ کے نقصان عظیم کا سبب ہوگا۔ نیز اطاعت امیر خیر کے کاموں میں لازم ہے جہاں خالق کی معصیت کا حکم ہو وہاں اطاعت امیر ہرگز جائز نہیں، اور امارت شرعیہ نہیں رہ جائے گی بلکہ پیر پرستی کے زمرے میں آئے گی جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حق و باطل کے درمیان تمیز کرنے کی توفیق دے، اور سدا حق پر چلنے اور حق کی دعوت دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

ماہنامہ محدث بنارس

جلد ۹	ربیع الاول ۱۴۱۲ھ	اکتوبر ۱۹۹۱ء	شمارہ ۱۰

مُدیر

عبدالوہاب حجازی

پتہ

دارالتالیف والترجمہ

بی ۱۸/۱ جی، ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰

بدلِ اشتراک

سالانہ ۴۵ روپئے فی پرچہ ۴ روپئے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔

اِس شمارہ میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

اتباعِ رسالت

نوعِ انسانی کیلئے کیوں ضروری ہے؟

دنیا اور آخرت دونوں میں انسان کے خیر و صلاح کے لئے رسالت ضروری ہے، جس طرح اتباعِ رسالت کے بغیر انسان کیلئے اس کی آخرت میں کوئی خیر و صلاح نہیں، اسی طرح دنیا اور اس کی زندگی میں اتباعِ رسالت ہی سے انسان کو خیر و صلاح حاصل ہو سکتا ہے، انسان شریعت کا بالاضطرار ضرورت مند ہے، وہ دو حرکتوں کے درمیان قائم ہے، ایک حرکت ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے لئے نافع چیزوں کو حاصل کرتا ہے، اور دوسری حرکت ہے جس کے ذریعہ وہ ضرر رساں چیزوں کو دفع کرتا ہے، اور شریعت وہ نور ہے جو اس کے لئے نافع اور ضار چیزوں کو نمایاں کرتا ہے، شریعت اللہ کی زمین میں اللہ کا نور ہے، اور اس کے بندوں کے درمیان اس کا عدل ہے اور اس کا وہ قلعہ ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو جاتا ہے اسے امن حاصل ہو جاتا ہے۔

شرع سے مراد یہ نہیں ہے کہ حس کے ذریعہ نافع اور ضار میں تمیز کی جائے، یہ وصف تو بے زبان حیوانوں کو بھی حاصل ہے گدھے اور اونٹ جو اور مٹی کے درمیان تمیز کر لیتے ہیں، بلکہ شرع سے مراد ایسے افعال میں تمیز کرنا ہے جو اپنے فاعل کے لئے دنیا اور آخرت میں ضرر رساں ہوتے ہیں جیسے یہ بتانا کہ، ایمان، توحید، عدل، بر، صدقہ، احسان، امانت، عفت، شجاعت، علم، صبر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، صلہ رحمی، والدین کے ساتھ حسن سلوک، غلام، خادم اور پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک، ادا حقوق، اللہ کے لئے عمل کا اخلاص، اللہ پر توکل، اللہ سے استعانت، اس کے قضا و قدر پر راضی رہنا، اس کے حکم پر تسلیم و انقیاد اختیار کرنا، اس کے اولیاء سے محبت اور اس کے دشمنوں سے عداوت رکھنا، کھلے چھپے اس سے ڈرنا، اس کے فرائض کی ادائیگی اور اس کے محارم سے اجتناب کے ذریعہ اس کا تقویٰ اختیار کرنا، اللہ کے پاس ثواب کی امید رکھنا، اللہ کی تصدیق کرنا، اللہ اس کے

رسولوں نے جو کچھ بتایا ہے ان کے متعلق ان کی تصدیق کرنا، جن باتوں کا حکم دیا گیا ہے سب میں اللہ کی اطاعت کرنا، ان میں دنیا اور آخرت میں انسان کے لئے نفع اور خیر وصلاح ہے، اور اس کے مخالف امور میں دنیا اور آخرت میں انسان کے لئے شقاوت ومضرت ہے۔

اگر رسالت نہ ہوتی تو دنیا اور آخرت میں انسان کے لئے نافع اور ضار امور کی تفصیلات تک عقل کی رسائی نہ ہوتی، اپنے بندوں پر اللہ کی عظیم ترین نعمتوں اور باشرف احسانات میں سے ہے کہ اس نے ان کی طرف اپنے رسول بھیجے، ان پر اپنی کتابیں نازل فرمائیں، ان پر صراط مستقیم کو واضح کیا، اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان مویشیوں اور چوپایوں کے درجہ میں ہوتے، بلکہ ان سے بھی بدتر حالت میں، جن لوگوں نے اللہ کی اس رسالت کو قبول کیا اور اس پر استقامت اختیار کی وہ خلق کے بہترین لوگوں میں سے ہیں، اور جن لوگوں نے اسے رد کر دیا اور اس سے علیحدہ نکل گئے وہ خلق کے بدترین لوگوں میں سے ہیں، وہ کلب خنزیر اور مویشیوں سے بدتر حالت میں ہیں۔

صحیح بخاری میں ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ نے جو ہدایت اور علم دے کر مجھے مبعوث فرمایا ہے اس کی مثال زمین پر برسنے والی بارش کی ہے، زمین کے کچھ قطعات نے تو پانی کو قبول کر لیا اور کثرت سے گھاس اور روئیدگی اگائی، اور کچھ قطعات بنجر اور افتادہ ہوتے ہیں، انہوں نے پانی کو روک لیا جس سے اللہ نے لوگوں کو نفع پہونچایا، اس سے پیا، نفع حاصل کیا، اور کھیتیاں سیراب کیں، اور کچھ قطعات چٹیل میدان ہوتے ہیں، جو نہ پانی کو روکتے ہیں نہ روئیدگی اگاتے ہیں، یہ ایسے لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے اللہ کے دین کی سمجھ حاصل کی، اور اللہ نے جو علم وہدایت دے کر مجھے مبعوث فرمایا ہے اس نے انہیں نفع پہونچایا، ان لوگوں نے اسے سمجھا اور دوسروں کو سکھایا، اور ان لوگوں کی مثال ہے جنہوں نے سرے سے اسے اٹھایا ہی نہیں، اور اس ہدایت کو قبول ہی نہیں کیا جس کے ساتھ میں رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اس اللہ کے لئے تمام اور ہر طرح کی حمد وثنا ہے جس نے ہم میں سے ہماری طرف ایک رسول بھیجا، ہم کو اللہ کی آیات پڑھ پڑھ کر سناتا ہے، ہمیں رذائل اخلاق سے پاک کرتا ہے، اور ہمیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اور اس سے پہلے ہم کھلی گمراہی میں مبتلا تھے، اور اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کا قول بیان فرمایا:

الحمد لله الذي هدانا	سب تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جس نے ہمیں اس کی
لهذا وما كنا لنهتدي لولا أن	راہ دکھائی حق، اور ہم ہدایت نہیں پا سکتے تھے اگر ہمیں
هدانا الله، لقد جاءت	اللہ ہدایت نہ دیتا، یقیناً ہمارے رب کے رسول

فقد جاءت رسل ربنا بالحق ۔ (الاعراف/۴۳) حق لے کر آئے تھے ۔

پوری دنیا ملعون ہے ، اور جو کچھ اس میں ہے وہ بھی ملعون ہے بجز اس کے جس پر رسالت کا آفتاب ضوفشاں ہو جائے ، اور اسی پر اپنی بنیاد تعمیر کرے جائے ، زمین والے اسی وقت تک باقی رہیں گے جب تک رسولوں کے آثار ان میں موجود ہوں گے ، زمین سے جب رسولوں کے آثار مٹ جائیں گے اور کلی طور پر محو ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ عالم علوی اور سفلی کو تباہ کر دیگا ، اور قیامت قائم کر دے گا ۔

اہل زمین کو رسول کی حاجت ایسی نہیں ہے جیسی انہیں سورج اور چاند ہوا اور پانی کی ضرورت ہے اور نہ ایسی ہے جیسے انسان کو اپنی زندگی کی ضرورت ہے ، اور نہ ایسی ہے جیسے آنکھ کو اپنی روشنی کی ضرورت ہے ، اور جسم کو کھانے اور پینے کی ضرورت ہے بلکہ اس سے بہت بڑی ہے ، انسان کسی بھی چیز کا جو اندازہ بھی مقرر کرے ، اور جو خیال بھی باندھے ہر ایک سے رسول کی حاجت بڑھ کر ہے ، رسول اللہ اور اس کے خلق کے درمیان اللہ کے امر و نہی کے متعلق واسطہ ہوتے ہیں ، وہ اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان سفیر ہیں ۔

رسولوں کے خاتم ، ان کے سید اور ان کے اکرم محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے ، "یا أیھا الناس ! انما انا رحمۃ مھداۃ " لوگو! میں اللہ کی طرف سے تحفۂ رحمت ہوں ۔ اور اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

وما ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین ۔ اور ہم نے تم کو ۔ اے نبی ۔ تمام جہان والوں کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے ۔

اور آپ صلوات اللہ وسلامہ علیہ نے فرمایا : " ان اللہ نظر الی اھل الارض فمقتھم ، عربھم ، وعجمھم الا بقایا من اھل الکتاب " اللہ نے اہل زمین کی طرف دیکھا تو تمام اہل عرب و عجم پر غصہ کا اظہار فرمایا بجز اہل کتاب کے تھوڑے سے لوگوں کے ۔

یہ غصہ اس لئے تھا کہ وہ رسولوں سے ہدایت نہیں حاصل کرتے تھے ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ نے ان سے غصہ رفع کیا ، آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا عمل کرنے والوں کے لئے روشن شاہراہ بنایا ، اور تمام خلائق پر قیام حجت کے لئے ارسال فرمایا ، انسانوں پر ان کی اطاعت و محبت ، نصرت و توقیر اور ان کے حقوق کی ادائیگی فرض قرار دی ، آپ کے راستہ کے سوا تمام راستے بند کر دیئے ، آپ کے راستہ کے سوا کسی کے لئے کوئی اور راہ نہ کھولی ، آپ پر ایمان لانے اور آپ کی اتباع کیلئے تمام انبیاء و مرسلین سے عہود و مواثیق لئے اور انھیں حکم دیا کہ اپنے اتباع مومنین سے یہی عہود و مواثیق لیں ۔

اللہ نے آپ کو ہدایت اور دین حق دے کر قرب قیامت کے عہد میں بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ، اپنے اذن سے داعی الی اللہ

اور روشن چراغ بنایا، آپ پر رسالت ختم فرمادی، آپ کے ذریعہ ضلالت سے ہدایت عطا کی، جہالت سے علم عطا کیا، آپ کی رسالت سے اندھی آنکھوں، بہرے کانوں اور بند دلوں کو کھول دیا، زمین اپنی تاریکیوں کے بعد آپ کی رسالت سے منور ہوگئی، بکھرے ہوئے دل اس سے جڑ گئے، منحرف ملت اس سے درست اساس پر قائم ہوگئی، اور اس سے روشن شاہراہ واضح ہوگئی، اللہ نے آپ کا سینہ کھول دیا، اور آپ کا بوجھ اتار دیا، آپ کا ذکر بلند کیا، اور ان لوگوں کے لئے ذلت ورسوائی لکھ دی، جنہوں نے آپ کی مخالفت کی، ایسے وقت آپ کو رسول بناکر بھیجا جب لمبے وقفے سے رسولوں کی آمد کا سلسلہ بند تھا، آسمانی کتابوں کے آثار ناپید ہوچکے تھے، ان کے کلام میں تحریف اور شرائع میں تبدیلیاں واقع ہوچکی تھیں، تمام اقوام نے اپنی غیر معتدل اور بے نور آراء سے استناد کر رکھا تھا، اپنے فاسد اقوال اور اپنی اغراض داہواء کے مطابق اللہ کے احکام کی خلاف ورزی اور اس کے بندوں کے درمیان فیصلہ کرتے، اللہ نے آپ کے ذریعہ خلائق کو ہدایت بخشی، آپ کے ذریعہ صراط مستقیم کو واضح فرمایا، اور آپ کے ذریعہ لوگوں کو تاریکیوں سے نور کی طرف نکالا، اللہ نے آپ کے ذریعہ بے بصری سے بصارت عطا فرمائی، اور گمراہی سے آپ کے ذریعہ ہدایت کا راستہ دکھایا، آپ کو جنت اور جہنم کا تقسیم کرنے والا بنایا، اور ابرار وفجار کے درمیان فرق واضح کیا، اور ہدایت وفلاح آپ کی اتباع اور موافقت میں رکھی، اور ضلالت وشقاوت آپ کی نافرمانی اور مخالفت میں رکھی۔

خلائق سے ان کی قبروں میں آپؐ کے نام سے امتحان لیا لوگ قبروں میں آپ کے متعلق پوچھے جائیں گے اور آپؐ کے نام سے امتحان لئے جائیں گے، بندے سے اس کی قبر میں پوچھا جائے گا: "ماکنت تقول فی ھذا الرجل الذی بعث فیکم؟ اس آدمی کے بارے میں جو تمہارے درمیان نبی بناکر بھیجا گیا تھا تم کیا کہتے تھے؟" جو مومن ہوگا وہ کہدے گا: میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ اللہ کے بندے ہیں، ہمارے پاس روشن دلیلیں اور ہدایت لے کر آئے تھے، ہم آپ پر ایمان لائے تھے، اور ہم نے آپ کی اتباع کی تھی، اس سے کہا جائے گا: تم نے سچ کہا، اسی پر تم زندہ رہے اور اسی پر تمہاری موت ہوئی اور اسی پر تم اٹھائے جاؤگے، ان شاء اللہ، سوجاؤ جیسے دلہن سوتی ہے، جسے اس کے گھر کا محبوب ترین شخص ہی بیدار کرتا ہے، پھر قبر اس کے لئے کشادہ کردی جائے گی، اور اس کے لئے اس میں روشنی کر دی جائے گی، اور جنت کی طرف ایک دروازہ اس کے لئے کھول دیا جائے گا جس سے اس کے مسرت وسرور میں اضافہ ہوگا۔ لیکن جو کافر ومنافق ہوگا وہ کہے گا: میں نہیں جانتا! میں نے لوگوں کو سنا کہ وہ کچھ کہہ رہے ہیں تو میں نے بھی کہہ دیا، پھر اس سے کہا جائے گا ہم اس کو جانتے تھے، اسی پر تم زندہ رہے، اسی پر تمہاری موت ہوئی اور اسی پر تم اٹھائے جاؤگے، ان شاء اللہ، پھر لوہے کے گرز سے اسے مارا جائیگا جس سے وہ ایسی چیخ چیخے گا جسے ہر چیز سن لے گی، مگر انسان نہیں سن سکے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا حکم قرآن مجید میں تیس سے زیادہ مقامات پر دیا ہے، اور اپنی اطاعت کو رسول کی اطاعت کے ساتھ جوڑا ہے، اسی طرح اپنی مخالفت کو رسول کی مخالفت کے ساتھ جوڑا ہے، جس طرح اپنے نام کے ساتھ رسول کے نام کو جوڑا ہے، اس طرح جب بھی اللہ کا ذکر کیا جائے گا اسی کے ساتھ آپ کا بھی ذکر ہوگا۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ کے قول "ورفعنا لك ذكرك" کے بارے میں فرمایا: یعنی جب بھی میرا ذکر کیا جائے گا تو میرے ساتھ تمہارا ذکر ضرور کیا جائے گا، اور یہ جیسے تشہد، خطبات اور اذان وغیرہ:

أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا رسول الله ۔

اسلام آپ ہی کے ذکر اور آپ کے لئے رسالت کی شہادت ہی کے ذریعہ صحیح ہوگا، اسی طرح اذان آپ کے ذکر اور آپ کے لئے شہادت کے بغیر صحیح نہیں ہوگی، نہ نماز آپ کے ذکر اور آپ کے لئے شہادت کے بغیر صحیح ہوگی، نہ خطبہ آپ کے ذکر اور آپ کے لئے شہادت کے بغیر صحیح ہوگا۔

آپ کی مخالفت کرنے والے کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عذاب اور کفر سے ڈرایا ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لا تجعلوا دعاء الرسول بينكم كدعاء بعضكم بعضا، قد يعلم الله الذين يتسللون منكم لواذا، فليحذر الذين يخالفون عن أمره ان تصيبهم فتنة أو يصيبهم عذاب أليم ۔ (النور/۶۳)

مسلمانو! تمہارے درمیان رسول کی پکار کو آپس میں ایک دوسرے کی پکار کی طرح نہ سمجھو اللہ یقیناً ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو تم میں سے چھپ چھپ کر کھسک جاتے ہیں، جو لوگ اس کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں انہیں ڈرنا چاہیئے کہ ان پر کوئی آفت آپہونچے یا ان پر دردناک عذاب نازل ہو جائے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں، یہ کون سا فتنہ ہے؟ یہ کفر ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کے حکم کی مخالفت کرنے والوں پر ذلت و رسوائی مسلط کر دی ہے، جیسا کہ مسند امام احمد میں عبداللہ بن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بعثت بين يدي الساعة حتى يعبد الله وحده لا شريك له

میں قرب قیامت کے عہد میں رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں یہاں تک کہ اللہ وحدہٗ لا شریک کی عبادت کی جائے

وجعل رزقی تحت ظل رمحی
وجعلت الذلۃ والصغار علی
من خالف أمری ومن تشبہ
بقوم فھو منھم۔

اور میری روزی میرے نیزے کے سائے میں رکھی
گئی ہے اور ذلت وپستی میرے حکم کی مخالفت کرنے
والے کے لئے مقدر کردی گئی ہے اور جو کوئی کسی قوم
کی مشابہت اختیار کرے گا وہ انہیں میں سے ہوگا۔

جس طرح آپ کی مخالفت اور آپ سے عداوت کرنے والا شقی اور ہلاک ہونے والا ہے، اسی طرح آپؐ سے اور آپ کی تعلیمات سے اعراض کرنے والا اور آپ کے بدلے دوسرے سے مطمئن اور راضی ہوجانے والا بھی ہلاک ہوجانے والا ہے پس شقاء اور ضلال آپ سے اعراض اور آپ کی تکذیب میں ہے اور ہدایت اور فلاح آپ کے احکام کو قبول کرنے اور انہیں ہر چیز پر مقدم کرنے میں ہے، یہ کل تین قسم کے لوگ ہوئے:

۱۔ آپ پر ایمان لانے والے یعنی آپ کے متبع اور محب، اور دوسروں پر آپ کو مقدم رکھنے والے۔
۲۔ آپ سے عداوت رکھنے والے۔
۳۔ آپ کے احکام سے اعراض کرنے والے۔

ان میں پہلی قسم سعید اور خوش نصیب ہے، اور بقیہ دو قسم کے لوگ ہلاک ہونے والے ہیں۔

ہم اللہ العظیم سے سوال کرتے ہیں کہ ہمیں آپؐ کے متبعین میں بنائے، آپ پر ایمان لانے والوں میں شامل فرمائے، آپؐ کی سنت پر ہمیں زندہ رکھے، اور اسی پر ہمیں فوت کرے، ہمارے اور سنت کے درمیان جدائی نہ ڈالے، یقیناً وہی دعا کا سننے والا ہے، اور امید رکھے جانے کا اہل ہے، وہ ہمارے لئے کافی اور بہترین کارساز ہے، تمام اور ہر نوع کی تعریفیں اللہ ہی کے لئے ہیں جو تمام جہانوں اور تمام اقوام کا رب ہے۔ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وأصحابہ الطیبین الطاھرین۔　　(از افادات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ)

تحریر: علامہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز حفظہ اللہ — ترجمہ: ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبدالجبار الفریوائی

باطل افکار ونظریات کے رد وابطال میں علم کی اہمیت اور اس کا مقام

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، والصلاۃ والسلام علی عبدہ ورسولہ، وخیرتہ من خلقہ، وامینہ علی وحیہ، نبینا محمد بن عبداللہ وعلی آلہ واصحابہ ومن سلک سبیلہم واتبع ھداھم الی یوم الدین۔ وبعد!

علم بلاشک وشبہ ہر خیر کی کنجی اور واجبات وفرائض کی ادائیگی اور محرمات کے ترک واجتناب کا وسیلہ ہے، توفیق الٰہی جس شخص کے شامل حال ہو، عمل اس کے علم کا نتیجہ ہے، علم ہر بہتر اور بھلی بات پر آدمی کے عزم کو پختہ ومضبوط کرتا ہے۔

ایمان، عمل، جہاد اور قربانی کا تصور علم کے بغیر ممکن نہیں، علم سے عاری اقوال وافعال بے قیمت اور غیر مفید ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کا انجام برا ہوتا ہے، اور وہ بہت بڑے فساد کا موجب ہوتے ہیں، اللہ کی عبادت، اس کے حقوق کی ادائیگی، اس کے دین کی نشر واشاعت کا کام، نیز باطل افکار ونظریات، گمراہ کن خیالات اور منحرف اور غیر مستقیم کوششوں کا مقابلہ کتاب وسنت سے ماخوذ علم نافع ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

اسی طریقہ سے علم ہی کے ذریعہ فرائض وواجبات ادا کئے جاتے ہیں، اسی کے ذریعہ سے اللہ سے ڈرا جاتا ہے، اور کتاب وسنت میں موجود حقائق کی معرفت علم ہی کے ذریعہ ممکن ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ولا یأتونک بمثل إلا جئناک بالحق وأحسن تفسیراً (سورۃ الفرقان ۳۳)	اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کریں گے مگر ہم اس کا ٹھیک جواب اور وضاحت میں بڑھا ہوا بیان آپ کو عنایت کر دیں گے۔

باطل پرست اپنی گمراہ کن دعوتوں کے سلسلے میں جن ہتھکنڈوں کا استعمال کرتے اور کتاب وسنت کے خلاف لوگوں میں جن شکوک وشبہات کو پھیلاتے ہیں ان کا رد وابطال کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی واضح ترین عبارتوں، کامل ترین بیانات دل ودماغ کو مطمئن کرنے والے اور حق کے مؤید قیمتی دلائل سے ہوجاتا ہے، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کتاب وسنت سے ماخوذ علم جو اس اللہ علیم وحکیم کی ذات سے صادر ہوا ہے، جو بندوں کے حالات ان کے مسائل ومشکلات ان کے دلوں میں پیدا ہونے والے اچھے یا برے افکار وخیالات اور ہر زمانے کے اہل باطل کے افکار ونظریات اور ان کے استدلالات سے پوری طرح آگاہ اور واقف ہے اللہ سبحانہ وتعالیٰ ان تمام باتوں کو جانتا ہے، اس نے اپنی کتاب کو باطل کا پول کھولنے اور انبیاء ورسل علیہم الصلاۃ والسلام کی دعوتوں پر دلائل وبراہین کے قائم کرنے کے لئے نازل فرمایا ہے، اپنے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دین حق دے کر مبعوث فرمایا، اپنی کتاب مقدس کو ہر چیز کے لئے تبیان اور مسلمانوں کے لئے ہدایت، رحمت اور بشارت کے طور پر نازل فرمایا۔

باطل پرست تو صرف اس وقت سرگرم ہوتے ہیں جب علم مٹ جاتا ہے، جہالت کا غلبہ ہوجاتا ہے اور قال اللہ وقال الرسول کہنے والوں سے میدان خالی ہوجاتا ہے، ایسے ماحول میں وہ دوسروں کے مقابل میں شیر ہوجاتے ہیں اور ارباب حق وایمان اور اہل بصیرت کی عدم موجودگی میں دھڑلے اور بے خوفی سے اپنے باطل نظریات کی اشاعت میں سرگرم ہوجاتے ہیں، اللہ رب العزت نے اپنی کتاب میں ہر چیز کو مختلف مقامات میں اجمال اور تفصیل سے بیان فرمادیا ہے،

ارشاد باری ہے:

ونزلنا علیك الکتاب تبیانا لکل شیٔ۔ (سورۃ النحل ۸۹)

اور ہم نے آپ پر قرآن اتارا ہے کہ تمام دین کی باتوں کا بیان کرنے والا ہے۔

یہ علیم وحکیم اللہ کا کلام ہے جس سے زیادہ سچ کوئی خبر نہیں

ومن أصدق من اللہ قیلا (سورۃ النساء ۱۲۲)

اللہ تعالیٰ سے زیادہ کس کا کہنا صحیح ہوگا۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے اس قول " ونزلنا علیك الکتاب تبیانا لکل شیٔ وھدی ورحمۃ وبشری للمسلمین " میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ قرآن کریم ہر چیز کے لئے تبیان ہونے کے ساتھ ساتھ ہدایت، رحمت اور بشارت بھی ہے، یہ حق کا بیان ہے [illegible] حق کے طریقوں اور اس کے مناہج کی وضاحت ہے، اور اس میں واضح طور پر حق کی دعوت ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اس میں دنیا والوں کے لئے ہر اس چیز میں رہنمائی ہے جس کی انھیں اپنے رب کی یاد اور اس کی رضاجوئی، اور اس کی ناراضگی سے دور رہنے میں ضرورت پڑے، قرآن نے لوگوں کے لئے کامیابی اور سعادت کا راستہ دکھایا جس سے ایسے حقائق واضح

تے، اور ایسی بصیرتوں کی طرف رہنمائی ہوتی ہے جو دلوں کو قابو میں کر لیتی ہیں اور جن سے اپنی وضاحت و صراحت کے باعث شرح صدر حاصل ہوتا ہے۔

یاایہا الناس قد جاءتکم موعظۃ من ربکم وشفاء لما فی الصدور وھدی ورحمۃ للمؤمنین۔	اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو (برے کاموں سے روکنے کیلئے) نصیحت ہے اور دلوں میں جو (برے کاموں سے) روگ (ہو جاتے) ہیں ان کے لئے شفاء ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت
(سورہ یونس/۵۷)	(اور ذریعۂ ثواب) ہے
یاأیہا الذین آمنوا أطیعوا اللہ وأطیعوا الرسول وأولی الأمر منکم ط فإن تنازعتم فی شئ فردّوہ إلی اللہ والرسول إن کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر ج ذلک خیر وأحسن تأویلاً۔ (النساء/۵۹)	اے ایمان والو! تم اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کرو، اور تم میں جو لوگ أولوالأمر ہیں ان کا بھی کہنا مانو پھر کسی امر میں تم باہم اختلاف کرنے لگو تو اس امر کو اللہ اور اس کے رسول کے حوالے کر دیا کرو، اگر تم اللہ پر اور یوم قیامت پر ایمان رکھتے ہو، یہ امور سب بہتر ہیں، اور ان کا انجام خوشتر ہے۔
وما اختلفتم فیہ من شئ فحکمہ إلی اللہ ج ذلکم اللہ ربی علیہ توکلت وإلیہ أنیب۔ (الشوریٰ/۱۰)	اور جس جس بات میں تم (اہل حق کے ساتھ) اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ اللہ ہی سپرد ہے، یہ اللہ میرا رب ہے میں اسی پر توکل رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

کتاب وسنت پر اکتفاء

اگر کتاب وسنت میں ہدایت اور صرف ان پر اکتفار کی بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی طرف نہیں لوٹاتا بلکہ "نعوذ باللہ" اللہ عزوجل کا یہ لوٹانا بے فائدہ ہوتا، اختلاف نزاع کے وقت صرف قرآن وحدیث کی طرف اس واسطے لوٹایا کہ ان دونوں میں ہدایت، واضح بیان، مشکلات کا حل اور خلل کی سرکوبی کا سامان موجود ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو ایمان کی شرط ٹھہرایا (ان کنتم تؤمنون باللہ) پھر یہ بتایا کہ دنیا وآخرت میں بندوں کے لئے یہی سب سے بہتر اور عمدہ بات ہے، یعنی اختلافی اور نزاعی امور میں مسلمانوں کا اللہ

اور رسول کی طرف لوٹنا دنیا و آخرت میں سب سے بہتر اور انجام کے اعتبار سے سب سے اچھا ہے ۔

اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ سارے مسائل ومشکلات کا حل کتاب وسنت میں موجود ہے، دین ومذہب کے بارے میں انسان کو جن امور کی ضرورت واحتیاج ہوتی ہے ان سب چیزوں کو ان میں بیان کر دیا گیا ہے، لوگوں کے مابین نزاع اور دشمنی کے خاتمہ کا بھی اس میں سامان موجود ہے، اسی طریقہ سے داعیِ حق کے لئے اس میں فتح ونصرت کا سامان موجود ہے، اور اس میں واضح دلائل سے دشمنانِ حق کا استیصال ہے ۔

ارشادِ ربانی ہے :

ولا یاتونک بمثلٍ الا جئنٰک بالحق واحسن تفسیراً (الفرقان/۳۳)	اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کریں گے مگر ہم اس کا ٹھیک جواب اور وضاحت میں بڑھا ہوا بیان آپ کو عنایت کر دیں گے ۔

یہ مثال ہر اس شبہ کو جسے یہ لوگ بزعمِ خویش حجت اور دلیل بنا کر پیش کرتے ہیں، ہر مذہب کو جس کی صحت کا وہ دعویٰ کرتے ہیں اور ہر اس دعوت کو جس کی آفادیت کے قائل ہیں، شامل ہے ۔ کتاب اور سنت ان تمام کا پول کھول دیتے ہیں، پس ان کے سارے مسائل ومشکلات، شکوک وشبہات، گمراہ کن تحریکات، اور باطل مذاہب ونظریات سے پردہ کتاب اور سنت کا علم ہی اٹھا سکتا ہے ۔

وجودِ باری تعالیٰ کا منکر

یہ تو معلوم ہے کہ باطل اور تباہ کن افکار ونظریات، گمراہ کن اصول ومبادی، منحرف مذاہب وادیان کی بہتات ہے، حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرنے والے بے شمار ہیں، باطل کی طرف دعوت دینے والے، راہِ حق سے روکنے والے مؤلفین ومصنفین کا شمار اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں کر سکتا، یہ لوگ کلام میں تحریف وتبدیلی کر کے لوگوں پر اپنے باطل افکار ونظریات کی تلبیس کرتے ہیں، اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں، صحافت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن وغیرہ نشریاتی اداروں اور سوسائٹی کے دوسرے اداروں میں مقررین اور خطباء کی بہتات ہے ہر شخص اپنے مذہب اور اپنے اپنے نظریئے کا داعی ومنّاد ہے، جو لوگوں کو باطل کی دعوت دیتا ہے اس پیچیدہ صورت حال، اور مشکل مسئلے کا حل اور اس سے نپٹنے کا ذریعہ صرف یہ ہے کہ اسے کتاب وسنت کی عظیم میزان پر پیش کر دیا جائے، کتاب وسنت کی ترازو پر ان چیزوں کے تولنے سے حق، باطل سے، اور رشد وہدایت، گمراہی وضلالت سے ممیز ہو جائے گا، اس طریقے سے حق اور اہلِ حق کامیاب، باطل اور اربابِ باطل پسپا ہو جائیں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ کے وجود اور اس کی وحدانیت اور الوہیت

کے منکر، مادی زندگی پر ایمان رکھنے والے، حق کو جھٹلانے والے، کتاب اللہ کے منکر، اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی عظیم قدرت اور اس کے احاطہ کرنے والے علم پر قرآن میں موجود نقلی اور عقلی دلائل کو جھٹلانے والے کمیونسٹ، شیوعی اور اشتراکی جب میدان میں آئیں یا سر اٹھائیں تو کتاب اللہ کی طرف رجوع کرو، اور ان قرآنی آیات کو پڑھو جن میں وجود باری تعالیٰ کے دلائل ہیں، اور جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات کا خالق اور موجد اللہ صانع حکیم ہی ہے، ان امور کی طرف اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں رہنمائی فرمائی ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ یہ وہی ذاتِ برحق رب العالمین ہے، وہی خلاق وعلیم ہے، وہی ہر چیز کا خالق ہے، وہی حق کی تائید وحمایت کرتا ہے، ان امور پر اللہ رب العزت قرآن کریم کے بہت سے مقامات پر دلائل دیتا ہے، تاکہ حق کا طالب ان پر اعتماد کرے۔

وإلٰهكم إلٰه واحد لآ إلٰه إلاّ
هو الرحمٰن الرحيم
إنّ فى خلق السمٰوات و
الأرض واختلاف الليل والنهار
والفلك الّتى تجرى فى البحر بما
ينفع الناس وما أنزل اللّٰه
من السّمآء من مّاء فأحيا به
الأرض بعد موتها وبثّ فيها
من كلّ دآبّة وتصريف الرّياح
والسّحاب المسخّر بين السّمآء و
الأرض لأيٰت لقوم يعقلون ۔

(سورۂ بقرۃ / ۱۶۳-۱۶۴)

اور تمہارا معبود ایک معبود ہے، کوئی معبود نہیں مگر صرف اسی کی ایک ذات رحمت والی اور اپنی رحمت کی بخشش سے تمام کائنات ہستی کو فیض یاب کرنے والی، بلا شبہ آسمان وزمین کے پیدا کرنے میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لئے ہوئے دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے، پھر اس کے ذریعہ سے زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اسی انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے۔ ہواؤں کی گردش میں، اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابعِ فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں، ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھنے والے ہیں (اللہ کی ہستی ویگانگی اور اس کے قوانین رحمت کی) بڑی ہی نشانیاں ہیں۔

يا أيّها النّاس اعبدوا
ربّكم الّذى خلقكم
والّذين من قبلكم

اے افرادِ نسل انسانی! اپنے پروردگار کی عبادت کرو (اس پروردگار کی) جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان سب کو بھی پیدا کیا جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں، (اور اس کی عبادت

لعلکم تتقون ، الذی جعل	کرو، تاکہ متقی بن سکو ، وہ ذات پاک ایسی ہے جس
لکم الارض فراشا والسماء	نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا
بناء وأنزل من السماء	اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس پانی
ماء فأخرج به من	کے ذریعہ پھلوں کی غذا کو پردۂ عدم سے نکالا ، تم
الثمرات رزقا لکم فلا	لوگوں کے واسطے ، پس اب تم ایسا نہ کرو کہ اللہ
تجعلوا للہ أندادا	پاک کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو شریک
وأنتم تعلمون ۔	اور ہم پایہ بناؤ ، اور تم جانتے بوجھتے ہو کہ اس کے
(سورۃ البقرہ ۲۱، ۲۲)	سوا کوئی نہیں ہے)
إنما إلٰھکم اللہ الذی	پس تمہارا حقیقی معبود تو صرف اللہ ہے جس کے
لا إلٰہ إلا ھو وسع کل	سوا کوئی عبادت کے قابل نہیں ، وہ اپنے علم سے
شیئ علما ۔ (سورہ طٰہ ۹۸)	تمام چیزوں کو احاطہ کئے ہوئے ہے
وقضی ربک ألا تعبدوا	اور تیرے رب نے حکم کردیا ہے کہ بجز اس کے کسی
إلا إیاہ ۔ (سورہ بنی اسرائیل ۲۳)	کی عبادت مت کرو ۔
إیاک نعبد وإیاک	ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے
نستعین ۔ (سورہ فاتحہ ۴)	اعانت کی درخواست کرتے ہیں ۔

ان آیات اور ان کے علاوہ بے شمار آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہی بندوں کا اور سارے جہاں کا رب ہے انبیاء ورسل علیہم الصلاۃ والسلام نے یہی بات بتائی ہے ۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

(۱) ولقد بعثنا فی کل	اور ہم ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجتے رہے
أمۃ رسولا أن اعبدوا	ہیں کہ تم (خاص) اللہ کی عبادت کرو اور
اللہ واجتنبوا الطاغوت ۔ (النحل ۳۶)	شیطان کے رستہ سے بچتے رہو ۔
(۲) وما أرسلنا من قبلک	اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا

من رسول إلا نوحي إليه أنه لا إله إلا أنا فاعبدون. (الأنبياء/۲۵)	جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہ بھیجی ہو کہ میرے سوا کوئی معبود (ہونے کے لائق) نہیں، پس میری ہی عبادت کیا کرو
(۳) ذلك بأن الله هو الحق وأن ما يدعون من دونه الباطل، وأن الله هو العلي الكبير. (سورۂ لقمان/۳۰)	یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ ہی حق ثابت اور ہستی میں کامل ہے اور جن چیزوں کی اللہ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں بالکل ہی لچر اور ناپید ہونے والی ہیں، اور اللہ ہی عالیشان (بلند مرتبہ) اور بزرگ و برتر ہے۔
(۴) فاعبد الله مخلصا له الدين ۔ ألا لله الدين الخالص۔ (الزمر/۲-۳)	پس آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ کی بندگی کرتے رہیئے، یاد رکھو! عبادت جو کہ شرک سے خالص ہو اللہ ہی کے لئے سزاوار ہے۔
(۵) الله خالق كل شئ وهو على كل شئ وكيل۔ (الزمر/۶۲)	اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی ہر چیز کا نگہبان اور کارساز ہے۔
(۶) هل من خالق غير الله۔ (فاطر/۳)	کیا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔

ربوبیت سے عبادت پر استدلال

پھر بہت سے مقامات پر اللہ تعالیٰ ان دلائل کا تذکرہ کرتا ہے، ایک مسلمان ان دلائل میں جب غور و فکر کرتا ہے تو اسے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ یہ عقلی دلائل ان نقلی دلائل کے مؤید ہیں، اسی واسطے اللہ رب العزت نے " یاأیها الناس اعبدوا ربکم" کے بعد دلیل قائم کرتے ہوئے فرمایا الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون ٥

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس واسطہ ہماری عبادت کا مستحق ہے کہ وہ ہمارا خالق ہے اور وہی بندوں کے مصالح کی نگرانی کرتا ہے، یہ بات فطرتِ سلیمہ اور عقولِ صحیحہ کے واسطے سے ہمیں معلوم ہے کہ انسانوں نے اپنے آپ کو پیدا نہیں کیا ہے، بلکہ ان کا خالق اللہ جل شانہ ہے، اور یہ بات عقلی و نقلی دلائل سے ثابت ہے۔

الذی جعل لکم الأرض فراشا و	وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا

السماء بناء وّأنزل من	اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا
السماء ماءً فاخرج به من	پھر اس پانی کے ذریعہ پھلوں کی غذا نکالی تم لوگوں
الثمرات رزقا لکم فلا	کے واسطے، پس اب تم ایسا نہ کرو کہ اللہ کے ساتھ
تجعلوا للہ أندادا وأنتم	کسی دوسری ہستی کو شریک اور ہم پایہ بناؤ
تعلمون۔	اور تم جانتے بوجھتے ہو (کہ اس کے سوا کوئی معبود
(البقرۃ / ۲۲)	نہیں ہے)۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان مجسم محسوس اور قابل مشاہدہ مخلوق کے بارے میں یہ بتایا کہ ان کا ادراک کیسے ہو، یہ ایسی مخلوقات ہیں جن کا ادراک عقل کرتی ہے اور جن کا ادراک ہر انسان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے زمین کو بچھونا بنایا جس پر ہم سوتے ہیں اور چلتے ہیں اور جس پر ہم اپنے مویشیوں کو چراتے ہیں، درخت اور پودے اگاتے ہیں اور جس کی تہ سے طرح طرح کی معدنیات نکالتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے آسمان سے بادلوں سے بارش برسائی جس سے ہمارے لئے طرح طرح کے پھل پیدا کئے، کس نے بارش برسائی؟ انسانوں کی بوئی ہوئی یا خود رو سبزیاں اور پھلوں کو جسے انسان اور حیوان کھاتے ہیں کس نے اگایا؟

یہ ساری چیزیں اللہ کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں جو اس کی عظیم قدرت پر دلالت کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی رب العالمین ہے، یہ ٹھہری ہوئی اور پر سکون زمین جسے اللہ رب العزت نے پہاڑوں سے استقرار بخشا ہے جنہیں زمین کے لئے کھونٹا بنا رکھا ہے، اور جس نے زمین کو اس طرح پر سکون بنا دیا ہے کہ ہم اس پر اپنی زندگی گذار رہے ہیں، اور جس پر ہم، ہمارے چوپائے ہماری گاڑیاں اطمینان کے ساتھ متحرک ہیں، جن کی فضاؤں میں ہمارے ہوائی جہاز محو پرواز ہیں، زمین میں جتنی مخلوقات اللہ نے پیدا کی ہیں ہم سب سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اسی طریقے سے اللہ رب العزت نے ہمارے اوپر آسمان کو پیدا کیا جنہیں متحرک اور ثابت ستاروں سے مزین کیا، سورج اور چاند کو بنایا تاکہ انسان وحدہٗ لاشریک، خلاق عظیم، علیّ وکبیر کی قدرت کو جان لے، پھر بیش بہا کھیتیاں، نوع بنوع پھل میوہ جات جن میں بڑے منافع اور مصالح ہیں، ان کے رنگ میں، حجم میں، مزا میں کافی اختلافات وتنوع ہے، یہاں پر اللہ تعالیٰ کی قدرت ظاہر ہوتی ہے اور اس کی عبادت کے استحقاق کا پتہ چلتا ہے۔

وإلٰهكم إلٰه واحد	اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا
لا إلٰه إلا هو الرحمٰن الرحيم	کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی بخشش کرنیوالا مہربان ہے

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ۔

(سورۂ بقرہ /۱۶۳-۱۶۴)

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں اور جہازوں میں جو کہ آدمیوں کے نفع کی چیزیں اور اسباب لے کر سمندر میں چلتے ہیں اور بارش کے پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو اس کے خشک ہونے کے بعد تر و تازہ کیا، اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے، اور ہواؤں کے پھیرنے اور بدلنے میں، اور بادلوں میں جو زمین کے اور آسمان کے درمیان مقید و معلق اور حکم کے بندے ہیں، البتہ بیشمار نشانیاں اور (توحید) کے دلائل (موجود) ہیں، ان لوگوں کے لئے جو عقلِ سلیم رکھتے ہیں۔

کائنات کی جن نشانیوں کو ہم دیکھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے استدلال فرما کر ہماری ہدایت و رہنمائی کرتا ہے۔ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ۔

یہ آسمان اپنی وسعتوں اور بلندیوں میں اور اس میں جو عجائب و غرائب ہیں، اسی طرح یہ زمین اپنی وسعت اور پھیلا اور نہروں اور پہاڑوں کے ساتھ، پھر لیل و نہار کی یہ گردش، آسمانوں سے مینہ کا برسنا، سمندروں سے انسانوں کے کام آ والی چیزیں، سمندروں کے سینے پر انسانوں کی ضروریات اور خود انسانوں کو ڈھو نے والے اور ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کر والے پانی کے جہاز، پھر اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، اور اس پانی سے سوکھی زمین کو سرسبز و شاداب کر دیا، زمین میں ہر قسم کے حیوا پھیلا دیئے اور آسمان و زمین کے مابین مسخر بادلوں اور ہواؤں کو چلایا، ان بڑی بڑی نشانیوں میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس بات کی رہنمائی یہ ہے کہ ان چیزوں کو پیدا کرنے والی اور انہیں عدم سے وجود میں لانے والی ہستی موجود ہے اور وہ رب العالمین کی ذات ہے، اور یہ مخلوقات اللہ ہی کی ذات سے قائم ہیں۔

" وَمِنْ آيَاتِهِ أَن تَقُومَ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ بِأَمْرِهِ "

جن نشانیوں کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں یا جن دلائل کو ہم پڑھ اور سن رہے ہیں ان سے صرف صحیح فکر و نظر رکھنے والے لوگ ہی فا

اٹھا سکتے ہیں، اسی واسطہ اللہ تعالیٰ آیت کے اخیر میں ارشاد فرمایا: "لآیات لقوم یعقلون" یعنی یہ نشانیاں عقل و فہم رکھنے والوں کے لئے ہیں۔

انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام سب سے سچے لوگ ہیں جنہوں نے اپنی حقانیت و صداقت کے دلائل دیئے ہیں، معجزات ان کی صداقت و حقانیت کی دلیل ہیں، انہوں نے ہمیں یہ ساری باتیں بتائی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ یہ سب اللہ کی صنعت و کاریگری ہے وہی ہمارا رب ہے، وہی ہمارا خالق ہے، وہی رحمٰن، رحیم، سلام اور قدوس اور دوسرے اسماء حسنیٰ و صفات علیا سے متصف ذات ہے۔ جیسا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان کیا ہے کہ وہی حکیم و علیم اور قادر مطلق ذات ہے۔

ملاحدہ وزنادقہ کی تردید

وجود باری تعالیٰ کے منکر، شیوعیت، اشتراکیت اور الحاد و زندقہ کے داعیوں اور منادوں پر ان آیات میں بھرپور رد و ابطال ہے۔

کیا یہ ساری کائنات اور کائنات کی مخلوقات خود بخود وجود میں آگئی ہیں؟ کیا کوئی عقل مند آدمی ایسا کہہ سکتا ہے بلکہ اگر تم کسی عاقل سے کہو کہ پانی کا ایک پیالہ خود بخود پیدا ہو گیا تو وہ تمہیں پاگل کہے گا، چائے کا گلاس، قہوہ کی پیالی، چمچہ اور لاٹھی وغیرہ کے بنانے کا علم ہے تو اس عظیم کائنات جس کو اللہ نے عدم سے وجود بخشا اور اس میں بے حد و شمار نشانیاں اور منافع رکھے۔ سکا موجد صرف اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے، پھر اس خالق کائنات نے اپنے ایسے نام و صفات بتائے جو ذات باری تعالیٰ کو لائق و سزاوار ہیں۔ انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام نے اس کے ناموں اور صفتوں کو بتایا، اس کی خوبیوں کا گن گایا، اس کی عبادت کی طرف لوگوں کو بلایا، ان انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام کی صداقت و حقانیت پر دلائل و براہین قائم ہو چکے ہیں، جن کے سرتاج ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو سب سے زیادہ افضل اور سب سے زیادہ سچے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو عظیم کتاب اور عام رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا، آپ کے ذریعہ سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر چیز کو واضح طور پر بیان کر دیا۔

ماسونیت اور اشتراکیت

اس کے بعد ماسونیت کے داعیوں اور مبلغوں کا ظہور ہوا جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ لوگوں کو دوبارہ بہیمانہ حالت میں پہنچا دیں، ہر چیز میں مساوات ہو جائے۔ یہ لوگ اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کے خلاف جنگ چھیڑے ہوئے ہیں، تاکہ انسانوں کو حیوانوں کی طرح بنا دیں، تاکہ وہ خیر و شر اور حق و باطل میں تمیز نہ کر پائیں، یہ سراسر انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام کی دعوت کے خلاف ہے، قرآن کے خلاف ہے، عقل صحیح اور فطرت سلیمہ کے خلاف ہے، جس پر اللہ نے بندوں کو پیدا کیا ہے، اللہ نے لوگوں کی فطرت میں یہ بات ڈال دی ہے کہ وہ اخلاق حسنہ، اعمال صالحہ، عدل و انصاف اور حق و صداقت کا اعتراف کریں، ظلم و عدوان اور ایذا رسانی کو ناپسند کریں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں میں یہ فطرت ودیعت کی ہے کہ وہ باپ بیٹے، بھائی بہن اور بیوی وشوہر کے مابین فرق وامتیاز کو سمجھیں حتیٰ کہ حیوانات بھی ان چیزوں میں تمیز کرتے ہیں۔

اباحیت کے دعویداروں کی تردید

جن لوگوں نے اباحیت کا دعویٰ کیا، ہر طرح کی برائیوں کے ارتکاب کو ہر حال میں انسانوں کے لئے جائز رکھنے کی بات کہی، اوران مسائل میں کسی طرح کا مضائقہ نہ محسوس کیا تو ایسے سارے لوگ ملحد، بے دین اور گمراہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس الحادی مذہب کا ابطال فرمایا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ اس سے انبیاء ورسل کی بعثت اور بندوں پر کتابوں کا نزول اپنے حقوق کو بیان کرنے کے لئے، اور یہ بتانے کے لئے کیا کہ کون سی چیز طیب وحلال اور کون سی چیز خبیث وحرام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو انبیاء ورسل کی لائی ہوئی باتوں کو اپنانے اور اس کے مخالف امور کو ترک کردینے کی وصیت فرمائی، اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابوں میں حلال کو حرام سے، ہدایت کو گمراہی سے، معروف کو منکر سے اور خیر کو شر سے ممیز کرکے اس کو مفصل طور پر بیان کر دیا ہے۔

لیکن اباحیوں، کمیونسٹوں اور ماسونیوں نے ان ہدایات سے کلی طور پر اعراض کیا، اوران تمام تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا، وہ نہ تو اخلاق کریمانہ کے پابند ہیں نہ ہی انہوں نے صحیح عقل ودماغ ہی سے اپنا رشتہ استوار کیا ہے۔ اس لئے انہوں نے حق وباطل اور ہدایت وگمراہی کے مابین تمیز کرنے والی اور رشد وہدایت پر مبنی انبیاء ورسل علیہم الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کو نہیں اپنایا۔

کتاب وسنت اور احوال عالم میں غور وفکر کرنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ انبیاء ورسل من جانب اللہ حرام وحلال امور پر مبنی جو تعلیمات لے کر آئے ہیں وہ سب کی سب حق ہیں، یہ برگزیدہ ہستیاں حلال وحرام اور طیبات وخبائث کے مابین تفریق وامتیاز کی خاطر مبعوث کی گئیں، تاکہ انسانی معاشرہ رشد وہدایت، خیرات وحسنات، بیان وتوضیح، اخلاق کریمانہ، صفات حمیدہ وغیرہ امور کی روشنی میں اپنا سفر جاری رکھے۔

یہ اوصاف واخلاق انسانوں کی جان، مال، عقل، دین، بیوی بچوں کی حفاظت کرتے ہیں، تاکہ کوئی انسان کسی پر ظلم وزیادتی نہ کرسکے، اس طرح معاشرہ میں امن وامان برقرار رہتا ہے، اخلاق درست رہتے ہیں، حالات بہتر ہوجاتے ہیں، اور لوگ مامون رہتے ہیں، ہر انسان اپنے لین دین، بیع وشراء اور دوسرے شرعی طریقوں سے حلال کمائی کے تملک اور اس میں مفید اور بے ضرر تصرف وغیرہ امور ومعاملات میں آزاد رہتا ہے۔

مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی جھوٹی نبوت

جس شخص نے غیر اسلامی افکار و نظریات کی دعوت دی، جیسے قادیانی وغیرہ جنہوں نے نئے رسول کی اطاعت کی طرف لوگوں کو بلایا تو اس کا یہ دعویٰ باطل اور اس کے افکار و نظریات گمراہ کن ہیں، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب مبین میں فرماد ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں، جن پر مہر نبوت لگ چکی ہے، متواترا بھی یہ ثابت ہے، سابقہ انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام نے بھی بعثت محمدی کی بشا دی ہے۔

اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

ما کان محمد أبا أحد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین۔ (الأحزاب/ ٤٠)	لوگو! محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں —

لیکن عوام کالانعام ہر دعویٰ پر کشش و پیچ کا شکار ہو جاتے ہیں، ان پر ہر چیز مخفی رہتی ہے، وہ حق و باطل اور ہدایت و گمراہی کے درمیان تفریق و امتیاز نہیں کر پاتے، علم اور بصیرت کے فقدان کے باعث وہ ہر آواز پر لبیک کہتے اور ہر گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ " مرزا غلام احمد قادیانی " نامی جھوٹے نبی کے جھوٹے دعوائے نبوت پر عوام کالانعام نے لبیک کہا، اس کی ہر بات اور ہر تحریر کی تصدیق کی جو نص قرآنی اور متواتر احادیث کے خلاف ہے، یعنی نبی اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں۔

یہ سب کیسے ہوجاتا ہے ، اور بنی نوع انسان کے عقل مند اور پڑھے لکھے لوگوں کی نظروں سے حقائق کیسے پوشیدہ ہوجاتے ہیں ، اور یہ شکوک وشبہات کا شکار کیسے ہوجاتے ہیں ، حالانکہ اس کا بطلان نہایت ہی ظاہر و باہر ہے۔

اللہ رب العزت اپنے بندوں کو عجائب وغرائب اور عبرت وموعظت کے قابل چیزوں کا مشاہدہ کراتا ہے جن میں صاحب عقل کے لئے عبرت کا سامان موجود ہے ۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

فانہا لا تعمی الأبصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ (سورۂ حج ۴۶)	پس حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں میں ہیں ۔

بہائیت اور بابیت

اسی طریقہ سے بہائیوں اور بابیوں کا معاملہ ہے جنہوں نے باطل دعوے کئے ، خود گمراہ ہوئے اور عوام کالانعام کو بھی گمراہ کیا ، ان کے اولین داعی نے سب سے پہلے اپنی نبوت کا دعویٰ کیا ، پھر اپنے رب العالمین ہونے کا اعلان کیا ، ان کا باطن بالکل ظاہر ہے لیکن بایں ہمہ ہم ان کے اتباع ، مبلغین اور ان کے باطل کو رواج دینے والے اداروں اور تنظیموں کو سرگرم عمل دیکھتے ہیں ، بسا اوقات ان میں سے بہت سے لوگ حق سے آگاہ ہوتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ وہ اپنے دعوے میں جھوٹے ہیں لیکن باطل کی یہ ظاہری تائید کسی دنیاوی مقصد کے لئے ہوتی ہے ، اس کے اس باطل میں عوام کالانعام بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ لوگ ان کی تقلید کرتے ہیں ، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

أم تحسب أن أکثرھم یسمعون أو یعقلون إن ھم إلا کالأنعام بل ھم أضل سبیلا۔ (الفرقان ۴۴)	کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں ؟ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں ، بلکہ ان سے بھی گئے گذرے ہیں ۔
ولقد ذرأنا لجہنم کثیرا من الجن والإنس ، لہم قلوب لا یفقہون بہا لہم أعین لا یبصرون بہا ولہم آذان لا یسمعون بہا أولئک	اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان جہنم کے لئے پیدا کئے ہیں جن کے دل ایسے ہیں جن سے نہیں سمجھتے اور جن کی آنکھیں ایسی ہیں جن سے نہیں دیکھتے ، اور جن کے کان ایسے ہیں جن سے نہیں سنتے ، یہ لوگ چوپایوں

کالانعام بل ھم اُضل ، واُولٰئک ھم الغافلونَ ۔ (سورۂ اعراف / ۱۷۹) | کی طرح ہیں ، بلکہ یہ لوگ زیادہ تر گمراہ ہیں ۔ یہی لوگ غافل ہیں ۔

یہ لوگ اپنی گمراہی میں بہت دور نکل گئے ہیں جس طرح اصحاب فرعون فرعون کے ساتھ اور اصحاب نمرود نمرود کے ساتھ آگے نکل گئے تھے ، کھانے پینے ، پیشاب وپاخانہ کرنے اور بات بات پر غمزدہ ہونے والا حقیر وناتواں آدمی لوگوں کا رب اور ان کا معبود کیسے ہوسکتا ہے ؟ یہ چیز اس کے اور اس کے اتباع کے لئے کیسے جائز ہوسکتی ہے ؟ لیکن بات وہی سچ ہے جو اللہ رب العزت نے فرمائی :

فإنہا لا تعمی الأبصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور ۔ (الحج / ۴۶) | بات یہ ہے کہ (نہ سمجھنے والوں کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں ، بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجایا کرتے ہیں ۔

أم تحسب أن أکثرھم یسمعون أو یعقلون ، إن ھم إلّا کالأنعام بل ھم أضل سبیلاً ۔ (الفرقان / ۴۴) | کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ ان میں کے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں ، یہ تو محض چوپایوں کی مانند ہیں (کہ وہ بات کو نہ سنتے اور نہ سمجھتے ہیں) بلکہ ان سے بھی زیادہ بے راہ ہیں ۔

ومَن أضلّ ممّن اتّبع ھواہ بغیر ھدی من اللّٰہ ۔ (القصص / ۵۰) | اور ایسے شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرتا ہو بغیر اس کے کہ من جانب اللہ کوئی دلیل اور ہدایت اس کے پاس ہو ۔

دجّال کا ظہور اسی طریقہ سے آخری زمانہ میں دجال کا ظہور ہوگا ، جاہلوں اور کور اندیشوں کا ایک جم غفیر اس کے متبعین میں ہوگا ۔ دجال جن باطل امور کی ترویج کرے گا اور جن خرقِ عادات امور کو لے کر آئیگا عوام کالانعام کے شک وشبہ میں پڑنے اور ان کی گمراہی کے لئے وہ کافی ہیں ۔

نسخۂ کیمیا تمہیں ہر جھوٹے اور باطل مذہب کے اتباع وموئدین ملیں گے ۔ لیکن وہ رشد وہدایت اور عقل سلیم سے عاری ہوں گے ، جس شخص کے پاس تھوڑی سی بھی نظر وبصیرت ہے اور حق کی طلب میں اسے رغبت و دلچسپی ہے تو اس کے لئے سلف صالحین کا طریقہ اپنے واضح اور قطعی دلائل وبراہین کی بنا پر اظہر من الشمس ہے ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب کریم میں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت مطہرہ میں بیان فرمادیا ہے، کہ کتاب وسنت سے تمسک اور صحابہ وتابعین وغیرہ سلف صالحین کی روشنی میں چلنے میں خیر وفلاح ہے۔

داعیانِ حق کا اسلوبِ دعوت

اسی لئے داعیان حق کو چاہئے کہ کتاب وسنت سے، اور اپنی صحیح فکر ونظر اور پختہ بصیرت اور فطرتِ سلیمہ سے جو کچھ سیکھا ہے، اس کو استعمال کریں، اور کتاب وسنت کی تعلیمات اور کائنات میں اللہ کی قدرت وعظمت اور کبریائی اور الوہیت کے استحقاق، اور رسولوں کی رسالت اور ان کی تعلیمات کی حقانیت پر جو محسوس کیا ہے، ان امور کی روشنی میں وہ ان منحرفین کا ردّ وابطال کریں۔

کتاب وسنت میں حلال وحرام، ہدایت وگمراہی، اوامر ونواہی، اور جنت جہنم کے اوصاف وغیرہ وغیرہ امور کو بیان کریں۔

ان کمیونسٹوں اور دوسرے ملحدوں نے حشر ونشر، جنت وجہنم وغیرہ، جن اخروی مسائل کا انکار کیا ہے وہ سب باطل اور قطعی دلائل کے خلاف ہیں۔

دلائل وجودِ باری تعالیٰ

ان کی ساری دلیلیں لچر اور بے وزن ہیں، ان کا باطل واضح ہے، مردوں کا دوبارہ اٹھایا جانا، اور اللہ رب العالمین کے حضور ان کے پیش ہونے پر بے شمار دلائل ہیں، کائناتِ عالم کی ساری مخلوقات اللہ رب العزت کی قدرت وطاقت اور اس کی الوہیت کے اعتراف کے وجوب پر گواہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ مردہ اور سوکھی زمینوں کو بارش کے پانی سے سیراب کرتا ہے، اللہ تعالیٰ جب پانی برساتا ہے تو یہ مردہ زمینیں بارش کے پانی سے لہلہا اٹھتی ہیں جس سے وہ جتنے میوے اور پھل پیدا کرنا چاہتا ہے کرتا ہے۔

ان پودوں کو کس نے اگایا؟ اور ان پھلوں کو ہمارے لئے کس نے نعمت بنایا؟ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی ذات ہے جس نے بارش برسائی، مردہ زمینوں میں زندگی کے آثار پیدا کئے، جس سے نباتات اور پھل پیدا ہوئے، وہی ذات برحق مردوں کو عنقریب زندہ کرے گی، قبروں سے انہیں اٹھائے گی، اور وہ اپنے دنیاوی اعمال کے حساب کتاب کے لئے اللہ کے حضور پیش ہوں گے۔

اسی طرح سے انسان کا معاملہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمارے باپ آدم کو مٹی سے پیدا کیا، آدم علیہ السلام نے انسانی نسل چنی، اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو حقیر پانی سے پیدا کیا، جو خون کے لوتھڑے میں تبدیل ہوا، پھر گوشت کا ٹکڑا بنا، پھر اس نے ایک باقاعدہ انسان کی شکل اختیار کی، اللہ تعالیٰ نے جیسے سننے، دیکھنے اور عقل وادراک کی طاقت عطا کی، اس کے اعضاء وجوارح بنائے، پھر انسان بتدریج بڑھ کر ایک بڑا آدمی بنا اور اس لائق ہوا کہ وہ لین دین کا معاملہ کرے، فکر ونظر، تعلیم وتعلّم اور انتاج کے کاموں میں حصہ لے۔

یہ عظیم الشان نشانیاں سب کی سب اللہ کی قدرت پر دلالت کرتی ہیں۔

عقیدۂ آخرت انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام نے ہمیں یہ بتایا کہ آخرت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کے پاس سب اکٹھا کئے جائیں گے، اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر حق کی تائید کرے گا، اہل حق کو بہترین بدلہ دے گا، انہیں عذاب جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کرے گا، دشمنانِ حق کو ذلیل و خوار کرے گا اور انہیں ہمیشہ ہمیش کی آگ میں ڈال دے گا۔

پھر ہر عقلمند انسان اس دنیا میں یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ کون ظلم کر رہا ہے کس کی حق تلفی ہو رہی ہے، کس کی جان و مال پر زیادتی کی جا رہی ہے، پھر حق دیئے بغیر ظالم مر جاتا ہے، مظلوم کے ساتھ انصاف نہیں پاتا تو کیا مظلوموں، کمزوروں اور غریبوں کے حقوق اسی طرح ضائع ہو جائیں گے؟ — ایسا ہرگز نہ ہوگا، خلاق عظیم، حکیم و علیم اللہ رب العزت نے انصاف کا ایک دن مقرر کر رکھا ہے، وہ قیامت کا دن ہے، جس میں اللہ تعالیٰ مظلوم کے ساتھ — جسے ظالم سے دنیا میں پورا حق نہیں ملا — انصاف کریگا ظالم سے انتقام لے گا، اور جتنی سزا کا وہ مستحق ہوگا اس کو وہ سزا دے گا، ہماری یہ دنیا جزا کی دنیا نہیں ہے، یہ تو امتحان و آزمائش کی جگہ ہے، عملی جد و جہد، خوشی اور غم کی دنیا ہے، اس دنیا میں مظلوم کے ساتھ کبھی انصاف ہو جاتا ہے، وہ اپنے حق کو پالیتا ہے، اور کبھی کسی عظیم حکمت و مصلحت کے پیش نظر اس کا معاملہ قیامت کے دن تک کے لئے ملتوی کر دیا جاتا ہے، اس روز اللہ تبارک و تعالیٰ ظالموں سے انتقام لے گا۔

ولا تحسبن اللہ غافلا عما	اور تو ظالموں کے اعمال سے اللہ کو ہرگز غافل مت جان
یعمل الظالمون انما یؤخرھم	وہ ان کو اس دن تک مہلت دیتا ہے جس میں آنکھیں
لیوم تشخص فیہ الأبصار (سورۃ ابراہیم ۴۲)	پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔

اس خوفناک دن میں اللہ تبارک و تعالیٰ مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے گا، انھیں پورا پورا بدلہ دے گا، ظالموں سے انتقام لے گا، اللہ تعالیٰ دنیا میں کبھی کبھی ظالموں کو سزا دیتا ہے، جیسا کہ بہت سی امتوں اور قوموں کے ساتھ پیش آیا، اور کبھی ظالموں اور مظلوموں دونوں کا معاملہ مؤخر کر دیتا ہے، یہ حقوق اس عظیم دن یعنی یوم قیامت میں لوگوں کو ملیں گے جس دن آنکھیں خوف سے باہر آجائیں گی، یہ ساری باتیں حق ہیں۔

قادر مطلق، علیم و حکیم اللہ رب العزت مظلومین کے حق کو فوت نہیں کرے گا، اسی واسطہ ہمیں اس نے حشر و نشر جزا و سزا کے لئے یوم قیامت کی خبر دی ہے۔ کتاب و سنت، اجماع، عقل صحیح اور فطرت سلیمہ سب کے سب ان چیزوں پر شاہد عدل ہیں، اور دلالت کرتی ہیں کہ جزا و سزا اور حساب کتاب ضروری ہے، اور یہ کہ حشر و نشر حق ہے، جنت حق ہے، جہنم حق ہے، آسمانی کتابوں، سنت نبویہ

اور مسلمانوں کے اجماع سے یہ سب باتیں ثابت ہیں، ساتھ ہی ساتھ عقل صحیح اور فطرت سلیمہ بھی اس کی گواہی دیتی ہیں، ہم ظالم و مظلوم سب کو دیکھتے اور یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ نہ ہی مظلوم کو ظالم سے قصاص ملا، اور نہ ہی اسے اس کا حق ملا، اس لئے ضروری ہے کہ محاسبہ کا ایک دن ہو جس میں ہر انسان اپنے اعمال کی بناء پر جزاء وسزا کا مستحق قرار دیا جائے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بھلائی کی راہ میں جدوجہد کرنے والے نیکوکار اہل ایمان کو ان چیزوں میں سے کچھ نہیں ملا، جن سے ان کے علاوہ حدود اللہ سے تجاوز کرنے والے اللہ کے بندوں پر ظلم کرنے والے بہرہ اندوز ہوتے ہیں، ان کے پاس بڑے بڑے محلات ہیں، دولت کی ریل پیل ہے، نوکر چاکر اور خدم وحشم کی کثرت ہے۔

اہل خیر اور متقیوں کا ایک جم غفیر اس دنیاوی مال ومتاع سے بالکل محروم ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ایک وقت موعود آئے جس میں یہ اللہ کے نیک بندے اپنے رب سے شرف ملاقات حاصل کریں، اس وقت انھیں اللہ تعالیٰ بلند مراتب اور اجر عظیم سے نوازے اعمال صالحہ اور صبر وشکر کے بدلے طرح طرح کے انعامات کے وہ مستحق ہوں، یہ متقی لوگ بڑے ثواب، بڑے مرتبے، بڑے خیر، عظیم احسان وفضل، حور وقصور اور بے پایاں خیرات وحسنات کو اپنے نیک اعمال کے بدلے میں حاصل کریں۔

اور اللہ تعالیٰ ظالموں، راہ حق سے اعراض کرنے والوں، اور مجرموں کو جو دنیا ہی کے ہو کر رہ گئے تھے، اور جنہیں دنیا کی شہوات نے دھوکہ دے رکھا تھا جس کے پیچھے وہ بھاگتے رہتے تھے سزا دے گا، اور انہیں سخت عذاب میں ڈالے گا جس کے وہ مستحق ہیں، اور یہ اس واسطے ہوگا کہ انہوں نے کوتاہی کی، اللہ سے اعراض کیا، اس کی حدود کو توڑا، ناشکری اور کفران نعمت کیا، بندگان خدا پر ظلم ڈھایا، اللہ کی اطاعت سے منہ موڑتے رہے، اِن لوگوں کو اللہ رب العزت جس سزا کے مستحق ہیں دے گا۔

عقل صحیح اور فطرت سلیمہ رکھنے والے لوگ اگر ان عظیم الشان امور ومسائل میں غور کریں تو یہ جان جائیں گے کہ معاد حق ہے۔ آخرت اور جسمانی معاد کے منکر، ملحد، کمیونسٹ، شیوعی اور بت پرست وغیرہ کے دعاوی سراسر باطل، ساقط الاعتبار اور جھوٹ ہیں۔

اسی طریقہ سے مختلف گمراہ کن اور تباہ کن افکار ونظریات، دعوات وتحریکات اور مذاہب وادیان کے ماننے والوں کا معاملہ ہے لوگوں کے دعووں پر اگر عقل صحیح بصیرت، سلیم فطرت رکھنے والے لوگ غور کریں تو کتاب وسنت اور صحیح کتابوں کے ذریعہ سے ان پر ان کی دعوت کے بطلان اور ان کے دلائل کی سلمیت واضح ہو جائے گی، اللہ تبارک وتعالیٰ نے کتاب وسنت اور لوگوں کی عقلوں میں فہم وادراک کی جو طاقت رکھی ہے، اور اپنی مخلوقات اور کائنات عالم میں حق وصداقت پر جو بے شمار دلائل قائم کئے ہیں، یہ تمام چیزیں اس بات پر گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے، وہی خلاق وعلیم ہے، رزاق، کریم اور قادر مطلق ہے، اور صرف اسی کی ذات عبادت

کی مستحق اور سزاوار ہے۔

طالبانِ علومِ نبوت کی ذمہ داریاں

طالبانِ علومِ نبوت کو چاہئے کہ وہ چاہے جہاں اور جس حال میں ہوں کتاب اللہ پر اپنی توجہ صرف کریں، ان کا سب سے بڑا اور اہم مشغلہ قرآن میں غور و فکر اور تدبر ہو، کامل توجہ سے اس کی تلاوت کریں، اور اس میں انبیاء و رسل علیہم الصلاۃ والسلام کے پیغامات کی صحت پر جو دلائل و براہین ہیں ان کی صداقت پر، اور برے لوگوں کے اقوال کے بطلان پر جو روشن دلائل اور عظیم معانی و مفاہیم ہیں، ان تمام امور کے سلسلے میں وہ قرآن میں غور و خوض کریں۔

جس شخص نے بھی ہدایت کی غرض سے قرآن میں تدبر کیا، اللہ تبارک و تعالیٰ اسے عزت بخشے گا، اس کا حامی و ناصر اور مددگار ہوگا، اور اس کی مرادوں کو پورا کرے گا

إنّ هذا القرآن يهدي للتي هي أقوم ـ (بنی اسرائیل / ۹)	بلاشبہ یہ قرآن ایسی راہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔
قل هو للذين آمنوا هدى وشفاء ـ (حٰم سجدہ / ۴۴)	آپ کہہ دیجئے کہ یہ قرآن ایمان والوں کے لئے تو رہنما اور شفاء ہے۔

اسی طرح سے جو مسلمان سنتِ مطہرہ، اور مکہ و مدینہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعداء و خصوم سے موقف اور رویئے پر غور کرے گا تو اسے حق معلوم ہو جائے گا، اسے یہ معلوم ہو جائے گا کہ اہل حق ہی کامیاب و کامراں ہوتے ہیں، انہیں ابتلاء و آزمائش سے دوچار ہونا پڑتا ہے، دنیا میں اگر نصرت و تائید سے کوئی محروم رہا تو آخرت کے دن اس کو اس کا بدلہ ضرور ملے گا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

إنّا لننصر رسلنا والذين آمنوا في الحياة الدنيا ويومَ يقوم الأشهاد ـ يوم لا ينفع الظالمين معذرتهم ولهم اللعنة ولهم سوء الدار ـ (المؤمن / ۵۱ ـ ۵۲)	ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دنیوی زندگانی میں بھی مدد کرتے ہیں اور روز بھی جس میں گواہی دینے والے (یعنی فرشتے) کھڑے ہوں گے جس دن کہ ظالموں کو ان کی معذرت کچھ نفع نہ دے گی اور ان کے لئے لعنت ہوگی اور ان کے لئے اس عالم میں خرابی ہوگی۔

اللہ تبارک و تعالیٰ نے نیکوکاروں کے لئے دنیا میں نصرت و تائید اور آخرت میں ثواب کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

ولینصرن اللہ من ینصرہ ان اللہ لقوی عزیز الذین ان مکناھم فی الأرض أقاموا الصلاۃ وآتوا الزکاۃ وأمروا بالمعروف ونھوا عن المنکر (الحج/۴۱)	بے شک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ (کے دین) کی مدد کرے گا، بیشک اللہ تعالیٰ قوت والا اور غلبہ والا ہے، یہ لوگ ایسے ہیں کہ ہم ان کو دنیا میں حکومت واقتدار دیدیں تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو نیک کاموں کے کرنے کو کہیں اور برے کاموں سے منع کریں ـــــ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان دونوں آیتوں میں راہ حق پر چلنے والوں، نماز قائم کرنے والوں، زکوٰۃ کو اس کے مستحقین کو ادا کرنے والوں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والوں سے اپنی نصرت وتائید کا وعدہ کیا ہے، یہ نصرت وتائید دنیا میں تمکن واقتدار اور قیامت کے دن اللہ کی رضا اور نصرت کو شامل ہے، اس میں مومنین کے لئے شرف وعزت، اور کافروں کے لئے ذلت ہے، مومن جنت سے فائز المرام ہوں گے اور کافروں کے چہروں پر ذلت وندامت کی سیاہی ہوگی، ان کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ اللہ جل شانہٗ کا ارشاد ہے:

وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الأرض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم أمنا، یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً۔ (النور/۵۵)	اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گذرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اور ان کے لئے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کردے گا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے، اور ان کی (موجودہ) حالت خوف کو امن سے بدل دے گا، بشرطیکہ وہ میری عبادت کرتے رہیں اور میرے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کریں (یا کسی کو شریک نہ کریں)

اس مفہوم کی اور بہت ساری آیتیں ہیں ۔

امت اسلامیہ میں جن اہل علم کو شہرت وکمال حاصل ہوا ، اللہ کی توفیق جن کے شاملِ حال رہی ، جنہوں نے کتاب و سنت میں غور وفکر کیا اور دونوں کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے ہر وہ معاون علم سیکھا جو ان کو اس مقصد میں مفید تھے ، یعنی صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ، تابعین عظام اور ائمہ اسلام اور ان کے راستہ اور منہج پر چلنے والے اصحابِ خلوص وبصیرت اور اربابِ صدق وصفا جیسے شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے دونوں شاگرد ابن قیم اور ابن کثیر وغیرہ وغیرہ ومشاہیر ائمۂ اسلام ۔ ان ائمہ کے حالات پر جس شخص نے بھی غور کیا ، اللہ تعالیٰ نے جن کو ان لوگوں کی کتابوں اور ان کی باتوں کو سمجھنے کی توفیق بخشی تو وہ بڑی عجیب چیزیں ، روشن عبرتیں ، صحیح علم ، روشن دل ، واضح دلائل وبراہین دیکھیں گے جو ان چیزوں سے تمسک کرنے والوں کو سعادت واستقامت کا راستہ دکھلانے والے ہیں ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق سے اس امر سے مطلوبہ مقصد حاصل ہو جائے گا ، اور اپنے نفس کو ان علوم ومعارف اور حق کی طمانیت سے مسلح کرے گا ، وہ حق جس کو لے کر اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیجا ، اپنی کتابیں نازل کیں ، اور جس پر سلف صالحین چلتے آئے ہیں ، اور اس پر یہ واضح ہو جائے گا کہ ضلالت وگمراہی کی دعوت دینے والے اس کے مخالفین کے پاس باطل شکوک وشبہات اور لچر ، بے وزن دلائل کے سوا کچھ نہیں ہے ، اسے معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت میں صرف وہی طالب علم ہے جو حق کو واضح اور روشن دلائل وبراھین کے ساتھ باطل سے الگ کر سکے ، جو ہدایت یافتہ ائمہ کی کتابوں کو پڑھے ، ان میں سے حق کے موافق جو چیز ہو اسے لے لے اور حق کے مخالف باطل چیزوں کو ترک کر دے ، ان مشہور ائمہ میں سے بارہویں صدی سے بعد کے عہد تک شیخ امام محمد بن عبدالوہاب اور آپ کے اتباع وانصار کا نام سرفہرست ہے جنہیں اس میدان میں کافی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی ، ان لوگوں نے بڑی عظیم الشان اور کامیاب کتابیں تصنیف کیں ، لوگوں کے پاس خطوط بھیجے ، معاندین اور خصوم کی تردید کی ، کتاب وسنت کے دلائل سے اپنے رسائل ومؤلفات میں حق کو واضح کیا ، علامہ شیخ عبدالرحمٰن بن قاسم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب " الدرر السنیۃ فی الأجوبۃ النجدیۃ " میں ان کتابوں کی ایک اچھی خاصی تعداد کو جمع کر دیا ہے ، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب اور آپ کے تلامذہ واصحاب نے جو دلائل دیئے ہیں ان میں جو شخص بھی غور وخوض کرے گا اس کو اس میں واضح حق اور روشن دلائل ملیں گے جو مخالفین کے اقوال وشبہات کا بخوبی بطلان اور حق کو واضح اور روشن دلائل سے بیان کرتے ہیں ۔

ان ائمہ اسلام کے ساتھ ۔ آخری زمانہ میں ہوتے ہوئے بھی حق کے اظہار اور اس کے دلائل کے بیان کرنے میں

اللہ جل شانہ کی توفیق شامل حال رہی ، انہوں نے توحید کی دعوت کی توضیح اور بت پرستی کے داعیوں اور قبروں کی پوجا کرنے والوں کے ردو ابطال میں شہرت حاصل کی ، یہ سلف صالحین کے سیدھے اسلوب اور منہج پر تھے ، انہوں نے کتاب و سنت کے واضح دلائل کا سہارا لیا ، حدیث اور تفسیر کی کتابوں پر توجہ اور اہتمام میں نمایاں رہے ، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے حق کو بلند ، اور باطل کو سرنگوں اور دوسروں پر اتمام حجت کیا ، ان کے ذریعہ سے اسلام کا جھنڈا لہرا دیا ، جہاد قائم ہوا ، اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ بے حد وحساب نعمتوں اور احسانات کو ظاہر کیا ، ساری دنیا میں ان لوگوں کی کتابوں کو پڑھنے اور ان کی دعوت کو صحیح سمجھنے والے ، اور ان کے اسلوب و منہج کی سلامتی کے قائل اہل حق اس دعوت کو پھیلا رہے ہیں ، اور ہر جگہ کے ارباب شرک وبدعات وخرافات اور دشمنانِ اسلام کے ردو ابطال میں انہیں علماء کی کتابوں سے استفادہ کر رہے ہیں ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے ہم دعاگو ہیں کہ ہمیں ان تمام چیزوں کی توفیق دے جس وہ راضی ہو ، ہماری ، ہمارے قلوب اور ہمارے اعمال کی اصلاح کرے ، ہمیں ہدایت دے اور ہادی بنائے ، ہمیں صالح بنائے اور ہم سے اصلاح کا کام لے ، اپنے دین میں فقہ وبصیرت عطا فرمائے ، اپنے دین کی نصرت فرمائے ، اپنا کلمہ بلند کرے ، ہر جگہ کے مسلمانوں کے احوال درست فرمائے اچھے لوگوں کا ان کا حکمراں بنائے ، مسلمان حکمرانوں کی اصلاح کرے ، انہیں ہدایت کی راہ پر چلنے اور ہدایت کی دعوت دینے والا بنائے ، انہیں شریعت کے نفاذ کی توفیق دے ، ہمارے سلاطین وحکام کو ہر خیر اور بھلائی کی توفیق بخشے ، ان سے حق کی تائید ہو ۔

إِنَّهُ جَلَّ وَعَلَا جَوَادٌ كَرِيْم ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلىٰ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ وَ آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّم ۔

بقیہ ص ۴۲ کا

قبطیوں کے عہد میں بھی مقدس راہبوں کے احوال کندہ پائے گئے ہیں[۱] تذکرہ نویسی کی درج ذیل شکلیں عام طور پر پائی جاتی ہیں :

۱ — معلوماتی تذکرے (Informative Biography)
۲ — تنقیدی تذکرے (Critical Biography)
۳ — معیاری تذکرے (Standard ")
۴ — تفسیری تذکرے (Interpretative ")
۵ — قصصی تذکرے (Fictionalized ")
۶ — فسانہ بشکل تذکرہ (Fiction presentedas Biography)

---

(۱) محمد کامل فراد ... الفاظ ... ص ۱۱۳

مغرب کی اندھی تقلید مضر ہے

تحریر: ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری ــــــ ترجمہ: امتیاز احمد سلفی (مئوی)

عصر حاضر میں مشرقی معاشرے کی بنیاد طبعی طور پر مغربیت کے خود ساختہ اصول اور اس کی تعلیمات پر قائم ہے، اس معاشرے کی تشکیل بذات خود ہوئی، نہ ہی مشرقیت پسند لوگوں کی ضروریات ولوازمات زندگی کے نتیجہ میں رونما ہوئی، بلکہ اہل یورپ نے ہی اس معاشرہ کو جنم دیا، اور اس میں اپنے نظریات کو پھیلایا اور رواج دیا اور اہل مشرق نے ان آداب واطوار کو قبول کیا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان پر یورپ کا تسلط ہے، اور وہ اس کے زیر نگیں ہیں، اس لئے مناسب ہے کہ معاشرتی حالات کا سرسری جائزہ پیش کیا جائے، پھر اسلام کی تعلیمات اور اس کی ہدایات جو فرد و معاشرے کے لئے ہیں پیش کی جائیں۔

مغربی معاشرہ کی بنیاد مادہ پرستی کے فلسفہ پر قائم ہے اور یہ ایسا فلسفہ ہے جو ایک معتبر علم کے ماخذ کی حیثیت سے ذہن وفکر کی خود مختاری کو نظر انداز کر دیتا ہے اور ماضی کی ثقافتی میراث پر بھی قدغن لگاتا ہے جو دینی تعلیمات یا انسان کے غور وفکر کے نتیجہ میں وجود میں آئی ہے، اور یہ فلسفہ عقل وتعلیم دونوں سے بیک وقت انسانوں کو محروم کرنے کے بعد معرفت کے حصول کے لئے صرف اور صرف حواس پر اعتماد رکھتا ہے۔

انسان فلسفہ کی نظر میں

دور حاضر میں علم اس معرفت کو سمجھا جانے لگا ہے جو ظن وتخمین اور قیاس کے وسائل وذرائع سے حاصل ہو، اور اسی کا داعی موجودہ مادہ فلسفہ ہے اور اس کی نظر میں اسی پر آج کے انسانوں کو ایمان بھی رکھنا چاہیئے اور اسے اپنا معبود تصور کرنا چاہیئے نہ کہ دور ماضی کے انسان کی طرح کسی معبود کا [illegible] قائم کر کے اس پر ایمان وایقان کی بنیاد ڈالی جائے۔

موجودہ مادی فلسفہ کی اہمیت، صنعتی میدان میں سائنس کی اہمیت، اور سائنس کے ذریعہ مادی تہذیب کے معیار کی بلندی کی اہمیت کے مابین گہرے تعلق کی وجہ سے آج مہذب انسان اور اخلاقی قدروں کا کوئی مقام نہیں۔ اب تمام تر توجہ تہذیب کی سطح کو مادی [illegible]

سے اوپر اٹھانے کے لئے ریسرچ وتحقیق پر مرکوز ہے، اور اب انسان کے اخلاقی اقدار یا عمل کا کوئی وزن نہیں، یہ فلسفہ انسان کو صرف اخلاقی قدروں سے ہی غافل نہیں کرتا بلکہ ان معیاروں سے کنارہ کش رہنے پر بھی آمادہ کرتا ہے، جن کو انسانی معاشرہ نے ایک مہذب وپاکیزہ ملول کی تشکیل کے لئے انیسویں صدی سے قبل وضع کیا تھا۔

مذکورہ معاصر فلسفہ نے اخلاقی معیار وضابطہ کے سلسلہ میں مادی نقطۂ نظر کی دعوت دی ہے اور اس طرح وہ اخلاقی معیار کو کوئی مستقل وجود یا حیثیت نہیں دینا چاہتا، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اخلاقی قدریں واقعاتی اور علمی ترقی کے نظریے کے ماتحت ہوں جس کا مطلب یہ ہے کہ معاشرہ جتنا ہی علم وصنعت میں ترقی کی راہ پر گامزن ہوگا اتنا ہی انسانی طرز عمل موجودہ فلسفہ کی نظر میں برتر اور فائق ہوگا، اور ترقی پسندی کا نظریہ اس کے اندر اپنا مقام پیدا کرے گا، ایسی صورت میں اخلاقی قدریں واقعیت پر مبنی نقطۂ نظر کے تابع قرار پائیں گی، اور انسانی آلات کی ایجاد، علمی میدان میں جس قدر ترقی یافتہ ہوتا جائے گا ویسے ہی معاشرہ میں تہذیب کے لحاظ سے برتر مانا جائے گا۔

اخلاق وکردار کے باب میں فلسفہ کی ناکامی

اب یہ بات دو ٹوک ہوگئی کہ عصری فلسفہ نے علمی پیش رفت میں بڑی کامیابی حاصل کی، اسی طرح صنعت میں بھی اسے خاصی ترقی ملی، جو تاریخ میں ایک اہم اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن افسوس کہ اسے انسان کے اخلاقی کردار اور روشن ضمیر افراد جنم دینے میں سخت ناکامی بھی ہوئی جس کا ذاتی قوت وصلاحیت میں کافی دخل ہے، اور یہی کردار ہی کی طاقت ہے جو انسان کو نیکی اور بھلائی کے میدان میں اپنی قوت سے کام لینے پر ابھارتی ہے، اور برائی سے محفوظ رکھتی ہے جب کہ موجودہ فلسفہ ان دونوں کے مابین کسی قسم کی تفریق پیدا کرنے سے قاصر ہے، اس لئے کہ خیر وشر کا تعلق تمام تر اخلاقیات سے ہے اور فلسفہ ان کے دوام وبقار کا قائل ہی نہیں، بلکہ وہ تو انھیں ایک جزوی اور فروعی حیثیت دیتا ہے۔

سابقہ سطور سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ عصری فلسفہ کو با اخلاق اور روشن ضمیر افراد پیدا کرنے میں ناکامی ہوئی جب کہ یہی روشن ضمیری ایسی قوت ہے جو انسانی کردار انجام دینے میں محرک بن سکتی ہے، یہی اخوت وبھائی چارگی ایک دوسرے کے معاون ومددگار بن کر زندگی گذارنا، انسانی مرتبہ کو سمجھنا اور اخلاق وکردار کی پابندی کرنا انسانیت کا اصل مقام ہے، لیکن یہ فلسفہ اسی سے بیگانہ ہے اور چونکہ آج کا معاشرہ اسی کی بنیاد پر قائم ہے، اس لئے وہ بھی نہایت گرا ہوا ہے۔

یہ نقص فلسفہ کی غلو پسندی کے نتیجہ میں رونما ہوا جو ریاضی علوم اور آلات پر مبنی تجربے کو بنظر حقارت دیکھتا ہے اس لئے اس غلو کی جملہ توجہات ان امور پر مرکوز ہیں جو قوت حس اور مادی تجربے سے حاصل ہوں، فلسفہ معرفت وہدایت کے ان تمام ذرائع کو باطل خیال کرتا ہے جو انسان کے مادی تجربے کے تابع نہ ہوں۔ چنانچہ اس نے انسانی زندگی کی تمام اعلیٰ قدروں کو لغو اور بیکار قرار دیا ہے، دین کے ذریعہ

ہدایت و رہنمائی کو بے سود بتلایا ہے۔ لیکن اگر اسے اس بات کا ادراک ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت حاصل کرنا مرکز کمال ہے، اور حق المقدور اس کی راہ میں جد و جہد کمال کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی عبادت ہی انسانی عمل میں کمال پیدا کرنے کا ذریعہ ہے تو اس پر یہ بھی عیاں ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت واقعاتی نظریہ کی راہ میں مانع نہیں، اور نہ ہی اس سے صنعت و حرفت میں مسابقت کا درجہ کمزور پڑتا ہے، بلکہ یہی درحقیقت وہ مستقل اور پائیدار شئے ہے جس سے وہ تفوق حاصل کیا جا سکتا ہے جو فلسفہ واقعیت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مغربی معاشرہ کا معبود علم و صنعت ہے، اور اس معاشرہ کی نظر میں لوگوں کے معبود اور پروردگار کی کوئی حیثیت نہیں، آج اہل مشرق جن مصائب سے دوچار ہیں وہ مغربیت پسندی کی دین ہے، اور جس الحاد و دہریت، فتنہ و فساد اور بے راہ روی کے امراض میں اسلامی ممالک مبتلا ہیں، وہ سامراجی یورش کی سیاست کے لازمی نتیجے ہیں۔

یورپین زندگی کا امتیاز سراپا اور خالص مادیت پسندی ہے، ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات سے ربط و تعلق بے معنی اور لغو ہے، وہاں انسان خواہشاتِ زندگی کا پجاری ہے، اس کی بھاگ دوڑ ضروریات زندگی کے حصول پر موقوف ہے، اور یورپ و امریکہ جب شر سے بچانے والی ترغیبات و ترہیبات سے عاری ہو گئے تو وہ اپنے لئے کسی رب کا تصور کرتے ہیں اور نہ ہی انھیں ثواب کی امید ہے اور عقاب و عذاب کا کوئی ڈر ہے۔

مغربی تہذیب کی یہ بھی ایک خاصیت ہے کہ نفسانی خواہشات کو اس کے نزدیک شرف قبولیت حاصل ہے، اور ہر کس و ناکس کے لئے اس کا حصول آسان بھی ہے، یہی وجہ ہے کہ حلال و حرام کی حرص اور چاہت روز افزوں ترقی پذیر ہے، اور زنا، شراب جیسی ام الخبائث پر وہاں کا کوئی قانون آج تک کسی قسم کی پابندی عائد کرنے سے قاصر ہے، جب سے دیگر ممالک میں یورپ نے سامراجیت کا جادو چلایا، لوگ ایمان جیسی لازوال نعمت سے محروم ہو گئے، اور مغربی زندگی کا عکس ہر جگہ نظر آنے لگا، اور اسلام کی موروثی تعلیمات اور بچا کھچا سرمایہ بھی مسلمانوں نے یورپ کی تقلید میں گنوا دیا، اور اسلام کی اتباع، اس کی شریعت کی پیروی کو فرسودہ اور حقیر سمجھنے لگے۔

مغرب کا خود ساختہ اور بہت سے اسلامی ممالک میں مروج قانون زنا کو طرفین کی رضامندی کی صورت میں جائز و مباح قرار دیتا ہے اس سلسلہ میں جو قانون الٰہی ہے کہ اس قسم کی گندی تہذیب سے انسانی نفوس کی تطہیر اور پاکیزگی ہو، اس کے مرتکب پر حد لگائی جائے، تاکہ معاشرے کو محرمات سے دور رکھا جا سکے، یہ مغرب پسندوں کی نظر میں عجیب و غریب شئے ہے۔

ہمارے معاشرے میں فحش و منکرات کی اشاعت دو طریقہ سے ہوئی، اول یہ کہ عام زندگی مغربی سامراجیت کی اثر اندازی عام ہوئی، اور دوسرے یہ کہ اس دور زوال میں امت اسلامیہ کے اندر افتراق و انتشار پیدا ہو جانے کے بعد اخلاقی کمزوریوں کا ورثہ ہمیں حاصل ہوا۔ لیکن اگر عقل و بصیرت سے کام لیا جائے تو ہمارے اندر پائی جانے والی کمزوریاں دور ہو سکتی ہیں۔

اب جب کہ بیشتر مشرقی ممالک سے سامراجیت کا جنازہ نکل رہا ہے، اور اصل مقصد حیات سے پہلوتہی کی خرابی شہوت انگیز چیزوں کے پیچھے بھاگ دوڑ اور ہر چیز میں مادیت پرستی کے رجحان کی خرابی کا علم لوگوں کو ہو چکا ہے، تو رفتہ رفتہ صورت حال میں تبدیلی، شریعت اسلامیہ کی آفاقی حیثیت کا احساس، پرامن اور پاکیزہ معاشرہ سازی میں اس کے کردار کی اہمیت، نفس کی تہذیب و شائستگی سے آراستگی، ان تمام چیزوں میں اسلام کی حقانیت کا رجحان غالب ہو رہا ہے، اسی وجہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ جگہ جگہ اسلامی ممالک میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا مطالبہ بڑھ رہا ہے، اور بعض اسلامی ممالک نے نفاذ شریعت کی نادر مثال پیش کر کے دنیا والوں کے سامنے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ قانون الٰہی کے نفاذ سے بہتر اثرات ہی مرتب ہوتے رہے ہیں۔

السيرة الذاتية فى الادب العربي الحديث

(۱۸۵۰ـــــــ۱۹۵۰)

مؤید عبدالستار

اطروحة للحصول على شهادة الدكتوراة

فى الادب العربي الحديث

عربی ـــــ سے ـــــ ترجمہ

ڈاکٹر عبدالباری

ریڈر شعبۂ عربی

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

جدید عربی آپ بیتیاں

(باب اوّل)

تذکرہ اور آپ بیتی

لفظ "السیرۃ" (× Biography) کے معنی فیروز آبادی نے اپنی لغت القاموس المحیط میں طریقہ، رہن سہن، ہیئت اور چال کے بتائے ہیں[1]۔ اس لفظ کی لغوی صراحت کی جائے تو اس سے مراد وہ طریقہ ہے جو ایک انسان اپنی زندگی گذارنے میں اختیار کرتا ہے۔ معجم مصطلحات الادب[2] میں اس کے معنی شخصی زندگی کی عہد بہ عہد تاریخ اور زندگی کا تذکرہ بتایا گیا ہے، یعنی :

۱ـــ کسی شخص کی زندگی کی مربوط تاریخ، مثلاً ڈاکٹر احمد بیاسی کی کتاب "حیاۃ صلاح الدین الایوبی"

۲ـــ مخصوص شخصیت کی تذکرہ نگاری کا فن۔

۳ـــ ادب کی وہ مخصوص صنف جو اشخاص کے احوال زندگی کو بیان کرتی ہے

× یورپی زبانوں میں اصل لفظ Biography یونانی (Greek) ہے جو Bios یعنی زندگی اور Graphavi یعنی لکھی ہوئی سے مرکب ہے، دیکھئے معجم مصطلحات الادب مصنفہ مجدی وھبۃ۔ مادہ Biog -

[1] الفیروز آبادی، قاموس المحیط، ۲، ۵۶ ـــ [2] مجدی وھبۃ معجم مصطلحات الادب، مادہ ـ Biog ـ

اس لفظ سے متعلق مفہوم کو اگر ہم مزید وسیع کرنا چاہیں تو شاید ہمیں " محیط المحیط " کے مصنف کی درج ذیل باتوں پر نگاہ ڈالنی ہوگی جو انہوں نے لفظ " السیرۃ " کے ضمن میں پیش کئے ہیں۔

یہ لفظ " سَارَ " سے بنا ہوا اسم ہے، جس کے معنی رہن سہن، طریقہ، راستہ، ھیئت اور چال کے ہیں، اسکی جمع " سِیَرْ " آتی ہے، عربی میں کہا جاتا ہے سَارَ بِھِمْ سیرۃ حسنۃ (ان کے ساتھ بہتر سلوک کیا)

" سیرۃ السلطان " کے معنی بادشاہ کا وہ طریقہ زندگی ہے جس پر وہ خواہ انصاف پر مبنی یا غیر انصافی پر، اپنی رعایا کو چلاتا ہے، عربوں کا قول ہے تنشر الملائکۃ سیرتہ (ملائکہ اپنی کارکردگی پیش کرتے ہیں) یہاں " سیرۃ " سے مراد اس مذکورہ ہستی کے اعمال اور فرماں برداری کا اعمال نامہ ہے۔ اس جگہ مضاف کو حذف کر دیا گیا ہے یعنی اصل لفظ " حالۃ السیرۃ " تھا، ہاں یہ ضرور ہوا کہ شرعی اصطلاح میں لفظ " سیرۃ " کے معنی مغازی اور اس سے متعلقہ امور لئے گئے، جیسا کہ حج کے لئے " مناسک " کا لفظ چل پڑا۔

لوگوں نے " السیر الکبیر " کا لفظ استعمال کیا ہے اور صفت کو مذکر کے طور پر لایا ہے کیونکہ اس جگہ اسے مضاف کا مقام حاصل ہوتا ہے، وہ مضاف جو کتاب کے مفہوم میں ہی لیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح کہ لوگ " صلی الظہر " کہہ کر " صلاۃ الظہر " (ظہر کی نماز پڑھی) مراد لیتے ہیں۔

کہتے ہیں مغازی کو سِیَرْ کا نام اس لئے دیا جاتا ہے کہ اس میں پہلا مرحلہ جنگ کی طرف چل پڑنے سے شروع ہوتا ہے۔

" کتاب السیر " ایک رجزیہ انداز کی نظم بھی ہے جس میں شیخ ابراہیم الحلبی نے رسول پاکؐ کی ولادت سے وفات تک کی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے، رسول پاک کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے انہوں نے اس نظم کو ۶۳ بیتوں میں پیش کیا ہے، علامہ حلبی نے اس کی ایک طویل شرح بھی لکھی ہے جس میں کل غزوات اور اس کے متعلقہ امور کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب " السیر الکبیر " کے نام سے موسوم ہے۔

انسان کی سیرت دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو لوگوں سے لین دین کے درمیان ظاہر ہوتی ہے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص اچھی سیرت والا ہے یا بری سیرت والا ہے، اسی طرح کہا جاتا ہے۔ جس کی سرشت اچھی ہوتی ہے اس کی سیرت بھی اچھی ہوتی ہے عمومی طور پر لفظ سیرۃ کا اطلاق کہانی یا قصہ پر بھی ہوتا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں کہا جاتا ہے " سیرۃ عنتر " اور " سیرۃ الملک سیف " وغیرہ وغیرہ [1]

---

[1] بطرس البستانی، قاموس محیط المحیط، مادہ " سیر "

مذکورہ بالا باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ سیرۃ شروع شروع میں رسول پاک کے احوال زندگی کے لئے مخصوص تھا، اس کے بعد لفظ سیرۃ کا استعمال احوال زندگی کے لئے ہونے لگا، خاص طور پر رسول پاک کے لئے یا پھر کسی بھی شخص کے لئے۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، میں سیرۃ بمعنی احوال نبی مذکور ہے۔ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس لفظ کا استعمال ابن ہشام سے پہلے شروع ہو چکا تھا اور ابن ہشام سے پہلے پہلے واقدی اور ان کے شاگرد ابن سعد بھی اس لفظ کا استعمال کر چکے تھے۔ البتہ مزید یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ لفظ سیرۃ کے عمومی معنیٰ کا اطلاق کسی شخص کی زندگی کی تاریخ پر بھی ہوتا ہے۔ الکلبی متوفی ۱۵۸ھ کی کتاب موسوم بہ "سیرۃ معاویۃ و بنی امیۃ" سے بھی ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے، مستشرق نولدیکی اس بات کو مان کر چلتا ہے کہ سیرت نبوی کے رواۃ اور ادبا، شاہان فارس کی کتب سوانح کے اسلوب سے واقف تھے اور اسی سے متاثر ہوئے ہیں، خصوصیت سے ظہور اسلام کے وقت[1] اس کے برعکس ڈاکٹر محمد کامل حسین کا خیال ہے کہ مصر کے فن تذکرہ نگاری (السیرۃ) سے سیرت نبوی کا فن بھی متاثر ہوا ہے، یہ وہ فن تھا جو مصر میں قبطیوں اور فراعنہ کے عہد سے رائج تھا، کیونکہ وہ لوگ اپنے گذرے ہوئے آباء واجداد اور مقدس ہستیوں کی سیرت واحوال لکھا کرتے تھے۔

مصر میں ظہور اسلام کے بعد یہ سلسلے سیرت رسول کے فن میں دراز ہوئے۔ شاید اسی بناء پر یہ بات کہی گئی ہے کہ ابن اسحٰق مصنف "السیرۃ النبویۃ" نے مصر کا سفر کیا تھا اور وہاں سے متعلق سیرت کے بعض اجزاء کی روایت بیان کی، ابن ہشام بھی مصر گئے تھے اور مصریوں کی سیرت واحوال سے متعلق بعض اجزاء کی روایت بیان کی۔ تذکرہ نگاری کے سلسلے میں مصریوں کی دلچسپیاں کچھ زیادہ ہی تھیں، انہوں نے اس فن کو پروان چڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، چنانچہ انہوں نے اہل وطن کے لئے ایسے سورماؤں کے احوال زندگی کو کتابی شکل میں پیش کیا جنہیں مصر والے محبوب رکھتے تھے، عوام انھیں قصوں کو مختلف مجالس اور محفل سماع میں سنایا کرتے تھے جیسے "سیرۃ عنتر بن شداد" اور سیرۃ الھلالیۃ وغیرہ[2]

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قدیم عربی ادب میں پائے جانے والے تذکرہ نگاری کے فن (السیرۃ) کا ڈانڈا سیرت نبی کے فن سے آملا، اور اس طرح سچ پوچھئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور غزوات نے تذکرہ نگاری یا سیرت نگاری کے ادب کو سب سے زیادہ بال و پر عطا کئے، یہاں تک کہ اس کے دائرہ کار میں وہ سب کچھ آگیا جو اسلام کے ابتدائی زمانوں اس ادب کے اندر پایا جاتا ہے۔

---

[1] دیکھئے: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مادہ "Sira"۔
[2] محمد کامل حسین: فی ادب مصر الفاطمیۃ ص ۱۱۳ -

سیرت رسولؐ کا مطالعہ اس کی روایتوں کا پیش کرنا اور اس پر کچھ لکھنا بڑے بڑے ادباء فقہاء اور مؤرخین کی مشغولیتوں کا محور قرار پائے، انہوں نے دیگر علوم اسلامیہ کی طرح اس فن کو بھی اپنی شرحوں اور تعلیقات کے ذریعہ وسیع سے وسیع تر بنا دیا، مناسب ہوگا اگر بتاتا چلوں کہ "علم الرجال" کا فن بھی احادیث نبوی سے غیر معمولی شغف کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا ہے اور محدود معنوں میں اسے سیرت کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔

کچھ دوسرے تذکرے یا سوانح بھی ہیں جو بعد کے زمانوں میں منظر عام پر آئے مثلاً "سیرۃ سیبویہ المصری" "سیرۃ ابن طولون والاخشیہ" جنہیں مورخ ابن زولاق نے لکھا ہے، ان میں بعض تو وہ ہیں جن تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔

سیرت نگاری کے فن کو ایک خوبصورت تاریخی دستاویز کی حیثیت سے بھی مانا جاتا ہے، چنانچہ گلبرٹ برنٹ (Gilbert Burnet) "ماسیو ہال" کی زندگی سے متعلق اپنی کتاب کے مقدمے میں جو سنہ ۱۶۸۲ء میں طبع ہوئی، لکھتے ہیں ــ

"تاریخ کی کتابوں میں کوئی سا باب بھی سیرت و سوانح کے متعلق ان کتابوں سے زیادہ علمی افادیت کا حامل نہیں ہوتا جن میں عظیم شخصیتوں کے احوال مذکور ہوتے ہیں[1]

فن تذکرہ یا سیرت نگاری کی ماہیت کے مسئلہ پر اختلاف پایا جاتا ہے، یعنی اسے تاریخ یا ادب، کس زمرے میں رکھا جائے؟ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ فن تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے لہذا تاریخ ہے، کچھ لوگوں کا نقطۂ نظر اس کے خلاف ہے چنانچہ پروفیسر محمد کامل حسین کہتے ہیں: جہاں تک فن سیرت نگاری کا تعلق ہے تو یہ فن تاریخ میں شمار کیا جاتا ہے، کیونکہ اسلامی مصر کی فکری زندگی میں اس کا بڑا اہم رول رہا ہے، یہ بات اس وجہ سے کہی جاتی ہے کہ مصر کے نثر نگاروں اور علماء نے اپنے نابغۂ روزگار شخصیتوں، سورماؤں اور عظیم ہستیوں کی سوانح لکھنے پر خاص توجہ دی تھی، ان میں سے چند کتابیں ہم تک پہونچ پائی ہیں مثلاً دوسری صدی ہجری میں مصر کے مالکی مسلک کے سرخیل عبداللہ بن عبدالحکیم کی سیرۃ عمر بن عبدالعزیز[2]

ڈاکٹر احسان عباس سیرت نگاری کے فن کو تاریخ کا ایک حصہ ماننے سے انکار کرتے ہوئے ایک دوسری رائے پیش کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ سیرت نگاری محدود ہوتی ہے، ان حادثات کے ساتھ جن کا تعلق زندگی کے طبعی کوائف (Biological facts) سے ہوتا ہے، اور جس کا سلسلہ پیدائش سے موت تک محیط ہے، اس میں عہد بچپن، بڑھاپا اور امراض وغیرہ سبھی شامل ہوتے ہیں۔

---

1. Pinto Vivian De sola English Biography in SeventeenThe Cent. PP. 199.
2. محمد کامل حسین فی ادب مصر الفاطمیۃ ص ۱۱۳ ـ

یہ جسم انسانی کے حوافی وجود کی صورت گری ہوتی ہے اور انہیں سے بہت سارے دوسرے انسانی عواطف جڑے ہوتے ہیں، مگر یہ ساری باتیں تاریخ نہیں قرار دی جاسکتی ہیں[1]

بہرحال ان اختلافات آراء کے باوجود بین بین کی راہ نکالی جاسکتی ہے، وہ اس طرح کہ ہم اگر تاریخ اور سیرت نگاری کو ادب کی دو شکلوں کی حیثیت سے مان لیں، اس کے علاوہ کاسیل کی انسائیکلوپیڈیا کے الفاظ اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ سیرت نگاری تاریخ کا ایک حصہ ہے، "سیرت نگاری تاریخ کی ایک شاخ ہے، اس کی غرض وغایت انسانی زندگی کو بقدر امکان صحیح طریقے پر پیش کرنا ہے"[2]

اس میں کیا شک وشبہے کی گنجائش ہے کہ کسی بھی شخصیت کی سیرت کا جائزہ ایک فنی جائزہ بھی ہوتا ہے اس صورت میں کہ تذکرہ نگار فنی موشگافیوں سے بھی عہدہ برآ ہونے کی استطاعت رکھتا ہو، کیونکہ تذکرہ نگار بھی جہاں تک اس کے اسلوب اور فنی ڈھانچہ کے پیش کرنے کا تعلق ہے کسی شاعر یا افسانہ نویس کی طرح ایک ادیب وفنکار ہی ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے تخیلات کے سہارے شخصیت کی تخلیق کرتا ہے[3]

ظاہر ہے کہ اس طرح فنی جائزے کے لئے کچھ شرطیں اور کچھ امتیازی شکلیں ہوتی ہیں، اور ان مناسبتوں ہی کی بنا پر ہم اس لائق ہوتے ہیں کہ تذکرہ نگاری کا فن پیش کرسکیں، بلکہ اس حیثیت سے پیش کرسکیں کہ اسے افسانہ اور ناول کی طرح ادب کی ایک شاخ سمجھ لیا جائے۔

اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ایک مؤرخ کو بھی فن تذکرہ نگاری کا سہارا لینا پڑتا ہے کیونکہ اس میں وہ معلومات ہوتی ہیں جنہیں وہ تاریخی حقائق کے بیان کرنے میں کام لاتا ہے۔ صدیاں گذریں کہ فرانسیس بیکن (Francis Bacon) نے اپنی کتاب "(The development of Learning)" میں جو ۱۶۰۵ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی تاریخ کو تین عناصر

---

[1] احسان عباس: فن السیرۃ ص ۱۰

[2] Cassell's Encyclopaedia – Biog – "Biography is a branch of history, it's purpose is to relate as faithfully as possible the life of an individual.

[3] احسان عباس: فن السیرۃ ص ۸۵

[illegible] بنایا تھا۔ وقت، شخص اور واقعہ ۔

پہلی قسم کو ہم تاریخ کا نام دیتے ہیں، دوسری کو تذکرہ حیات کے نام سے پکارتے ہیں، اور تیسری کو روایات کے نام سے جانتے ہیں[1]۔ اس بات کے باوجود کہ تذکرہ کو تاریخ کی حیثیت سے لکھا گیا یا اس سے تاریخ نویسی کے مختلف مقاصد کی مطلب برآری کی گئی یہ کچھ بغیر چارۂ کار نہیں کہ بعد کے تذکروں نے جو عہد حاضر میں لکھے گئے، ادبی وجمالیاتی پہلوؤں کا خیال رکھا ہے، اور وہ اس لائق ہیں کہ انہیں ہم بہتر ادبی شہ پاروں میں شمار کریں۔

فنِ قصہ نویسی اور تذکرہ نگاری کو جدید دور کے ادبی پیش رفت میں بڑا مقام حاصل ہے کیونکہ ان دونوں میں بڑا ہی مضبوط رشتہ ہے، ایسا بھی سمجھا جاتا ہے کہ قصہ نویسی یا افسانہ نگاری کا فن آج ترقی کے جس زینے پر پہونچ پایا ہے نہ پہونچ پاتا اگر اسں جدید تذکرہ نگاری کی ترقی نہ ہوئی ہوتی جس کی بنیاد برطانیہ میں سترہویں صدی کے اختتام سے پہلے پہلے پڑ چکی تھی، اس کے برعکس نثری قصوں کا وجود اٹھارہویں صدی کے نصف اول سے پہلے پہلے نہیں ہو سکا تھا[2]۔

جیسا کہ قبل مذکور ہوا، تذکرہ نگاری ادب کی شاخوں میں سے ایک شاخ شمار ہوتی ہے، کیونکہ اس کی بنیادیں ادب سے مشابہت رکھتی ہیں، اس کی بنیادیں وہی ہیں جن پر افسانہ اور ناول کا فن قائم ہوتا ہے، پس تذکرہ کا فن ایک ادبی عمل ہے جس میں حقائق پر انحصار کیا جاتا ہے، چنانچہ تذکرہ نگار بھی ناول نگار کی طرح کوشش کرتا ہے کہ اس کشمکش کو بیان کرے اور توضیحاتی شکلیں پیش کرے، جو اس کی شخصیت اور اس کے ماحول سماجی حقائق اور ان حقائق کے درمیان رہنے والے انسانوں کے مابین رواں دواں ہوتا ہے۔

اس میں اس ذاتی کشمکش کا اضافہ بھی شامل ہوتا ہے جو تذکرہ نگار اور مذکورہ شخصیت کے درمیان قائم ہو جاتی ہے — اس کے عوامل اور عواقب بھی، کیونکہ تذکرہ نگار تاریخی اور موضوعاتی حقائق سے بندھا ہوتا ہے، اس کے لئے ممکن نہیں ہوتا ہے کہ خیالی پرواز سے کل کشاکش زندگی کا احاطہ کر لے، اور اپنی شخصیت اور دوسروں کی شخصیت کے مابین واسطوں کی تفصیل بیان کر دے جیسا کہ ایک ناول نگار یا قصہ نویس اس کام کو پورا کر دیتا ہے، جب اسے نئے روابط کو پیدا کرنے، اور ان سے پیدا شدہ کش مکش کے عوامل کو بیان کرنے، اور دور اسی فضائے بسیط میں جس کا حقیقی زندگی سے تعلق نہیں ہوتا، پرواز کرنے کی

---

[1] Pinli English Biography PP. 20

[2] نفس المراجع

ضرورت پیش آتی ہے، کیونکہ کہانی یا افسانہ وہ حادثاتی بیانیہ ہے جسے خیال تخلیق کرتا ہے۔ اس طرح کہانی ہمارے سامنے وقوعہ کا حقیقی روپ نہیں پیش کرتی ہے جیسا کہ تاریخ و تذکرہ کی کتابیں پیش کرتی ہیں، کہانی تو صرف ہمارے سامنے ایک خیالی تصویر پیش کرتی ہے، اس افسانہ نگار کے لئے بھی جو حقیقت پسندی کا رویہ اپنا کر چلتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ واقعات کو سندوں اور دستاویزوں کی بنیادوں پر پیش کرے، یا ہوبہو پیش کر دے، یا ایسے اشخاص کی روایتوں کو پیش کر دے جن کے موت و حیات کی تصدیق رجسٹروں سے ہو چکی ہے، اسے تو ہمیں صرف اس حد تک مطمئن کرنا ہوتا ہے کہ اس طرح کے واقعات و حادثات امکانی ہیں اور اس طرح کی شخصیاتی وجود اس زندگی میں ممکن ہے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، اور جس سے ہم مانوس ہیں [1] لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ تذکرہ نگار اس بات کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ اس راکھ میں پھر سے زندگی کے آثار پیدا کر سکے جسے ایک جیتی پھرتی ہستی اپنے پیچھے چھوڑ گئی ہے، کیونکہ بہت ساری گفتگو، حادثات اور یادداشتیں، جن کا تعلق کسی شخص سے ہوتا ہے، تاریخی اسباب کے نتیجے میں جمود کا شکار رہتی ہے۔ مگر تذکرہ نگار انہیں اپنے ادبی پیرایۂ بیان سے اصلی رنگ و روپ کی طرف لے آتا ہے، اور اس سے ایک خوبصورت فنی پیکر تراشی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہ چیز ہم آزار یئے کو رداکے اس تذکرہ میں پاتے ہیں جو اس نے انگریزی شاعر شیلی کی زندگی سے متعلق تصنیف کی ہے یا میخائیل نعیمہ کی اس کتاب میں پاتے ہیں جو جبران خلیل جبران کی زندگی کے متعلق لکھی گئی ہے، بلاشبہ احوال زندگی کی ترجمانی یا تذکرہ نویسی ایک فنی عمل ہے، اس کا تعلق تاریخ سے ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی فنکار کا ہوتا ہے، ایسے میں کہ جب وہ کسی شخصیت کا خاکہ (Portrait) پیش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس شخص سے متعلق پس منظر کو بھی اجاگر کر دے۔

بعض فنکار اس عمل کو خالی چھوڑ دیتے ہیں اور بعض اختیار کر لیتے ہیں جس کے ذریعہ وہ پس منظر کی عکاسی کا کام لیتے ہیں [2] تذکرہ (السیرۃ) کی عمدہ اور جامع تعریف ہمیں آکسفورڈ ڈکشنری میں ملتی ہے، اس میں تذکرہ کو اشخاص کے احوال زندگی کی تاریخ اور ادب کی ایک شاخ بتایا گیا ہے [3]

---

[1] محمد یوسف نجم: فن القصۃ ص ۱۰

[2] دیکھئے: انسائیکلوپیڈیا کا سیل مادہ (Biog) ڈاکٹر عزالدین اسمٰعیل کی کتاب الادب و فنونہ، میں اسطرح کی باتیں کہی گئی ہیں۔

[3] آکسفورڈ ڈکشنری میں لفظ Biog کے ضمن میں مذکور ہے۔ The History of The lives of individual as a branch of literature.

اس تعریف میں فن تذکرہ کے اندر پائے جانے والے ان تین عناصر کی خاص طور پر نشاندہی کی گئی ہے، یعنی: تاریخ، شخصی زندگی اور ادب، چنانچہ تذکرہ نویسی کا تاریخ سے تعلق ہوتے ہوئے بھی ایک جہت سے شخصی زندگی کی تاریخ فن تذکرہ نگاری کی ہی خاطر لکھی جاتی ہے، اور یہ چیز تاریخ کو ادبی شکل میں پیش کرنے کے مترادف ہوتی ہے۔ ہاں اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ بعض تذکروں کا تعلق ادب سے بہت کمزور بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، کیونکہ ان میں اشخاص کی سوانح ساری کی ساری تاریخی رخ سے پیش کی جاتی ہے، جب بھی تذکرہ میں فرد کی شخصیت سماج کے دائرے میں محدود کرتے ہوئے پیش کی جائے گی اور اس کے کارناموں کو عام حادثات سے جوڑ کر اس سے منعکس کرتے ہوئے یا متأثر شدہ شکلوں میں پیش کیا جائے گا تو ایسی صورت میں تاریخی غایت مستحکم ہوگی، اور جب بھی تذکرہ میں صرف فرد کی ذات ملحوظ خاطر ہوگی اسے سماج سے علیحدہ رکھا جائے گا، اسے تنہا ایک بڑی حقیقت کے روپ میں دیکھا جائے گا اور اس کے حرکات و سکنات کا ایک مخصوص نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے گا، تو ایسے تذکرہ کا ناطہ تاریخ سے زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا ہے [1]

سیرت نگاری سے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس کی اصلی غرض و غایت سے مشابہ دوسری غایت، فنی تذکرہ کی اصل روح کو متأثر کر دیتی ہے، اور نتیجتاً اسے دوسرے ڈگر پر ڈال دیتی ہے، نہ صرف تاریخی حقائق سے بلکہ خود موضوع سے بھی۔ زیادہ تر یہ اس وقت ہوتا ہے جب سیرت نگار اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے تذکرہ کو ایک وسیلہ بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے، سیرت نگاری کی اس انحرافی شکل سے دینی رجحانات اور زہدیہ خیالات بالخصوص کچھ زیادہ ہی ابھر آتے ہیں، چنانچہ راہب انتونی کا تذکرہ، صحرا مصر کے راہبوں کا تذکرہ، یا راہبہ کولمبا اور دوسرے راہباؤں اور راہبوں کے تذکرے، دراصل ایسے تذکرے ہیں جن کا مقصد خالص اخلاقی ہوتا ہے [2]

عربی ادب میں بھی سیرت نگاری کا فن ان کمزوریوں سے اپنا دامن پورے طور پر نہیں بچا سکا ہے، چنانچہ یہاں بھی تذکرہ نگاروں نے اکثر دینی، اخلاقی اور سیاسی اسباب کی بناء پر تقدیس و تعظیم کے عنصر کو یک گونہ بڑھا دیا ہے، پھر بعد کے سیرت رسولؐ کے فن پر لکھنے والے " دلائل النبوۃ " اور " شمائل النبیؐ " کی تدوین کی طرف مائل ہوئے، انہی اسباب کی بناء پر سیرت نگاری میں تاریخی عنصر صرف اخلاقی مقاصد کو مدنظر رکھنے کی وجہ سے قدرے دھندلے پڑنے لگے۔ " دلائل النبوۃ " پر لکھنے والے ادباء مثلاً ابونعیم

---

[1] احسان عباس فن السیرۃ ص ۱۱

[2] نفس المرجع ص ۱۱

بیہقی اور " اعلام النبوۃ " کے مصنفین، مثلاً سجستانی اور ماوردی، ان چیزوں کے ثبوت فراہم کرنے کی طرف متوجہ ہوئے جو صرف معجزات کے ہی ذریعہ ممکن ہو سکتے ہیں، اور جن کی نسبت نبیؐ کی طرف کی گئی ہے[1]۔ مزید یہ کہ مسلمان ادبا نے حکمرانوں کی تاریخ لکھنے پر خاص توجہ مبذول کی، مگر اس معاملہ میں بیشتر ادبا، موضوع سے ذرا دور ہٹنے اور مبالغہ آمیزی کی طرف بڑھنے لگے، شاید یہ اس وجہ سے ہوا کہ مسلم مؤرخین فن تذکرہ نگاری کو تاریخ کا ہی ایک حصہ سمجھ کر آگے بڑھ رہے تھے، بلکہ ان کے نزدیک تاریخ حکمرانوں کے تذکرے کے سوا اور کوئی دوسری چیز نہ تھی[2]۔

یہ طریقۂ تصنیف عہد جدید تک باقی رہا، کیونکہ تذکرہ نگاری اس طرح کے آفات سے محفوظ نہ رہ سکی، واضح مثالوں میں ہم " عبقریات العقاد " کو پیش کر سکتے ہیں، جسے انہوں نے دینی محرکات کے تحت لکھا اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ موضوع کی اصل ڈگر سے دور جا پڑے۔

عقاد تذکرہ نگاری میں اپنی ادبی حریت کو تین مواقع پر محدودیت کا شکار ہونے سے محفوظ نہیں رکھ سکے ہیں۔ ایک مرتبہ اس وقت جب وہ تذکرہ میں آنے والی شخصیتوں کے لئے تقدس کا عنصر مان کر چلتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ اپنے آپ کو ان چیزوں سے بری کر لیں جنہیں لوگ غلطی تصور کرتے ہیں، دوسری مرتبہ جب وہ طے کر لیتے ہیں کہ ان کی گفتگو عام لوگوں سے متعلق نہیں بلکہ صرف عبقری شخصیات سے متعلق ہوگی، تیسری مرتبہ جب وہ ان شخصیات کے بارے میں لکھنا طے کر لیتے ہیں جن کے بارے میں خود مضبوط شواہد نہیں رکھتے ہیں[3]۔

یہ وہ چیزیں ہیں جنہوں نے عقاد کی " عبقریات " کو سیرت نگاری کے فن سے قدرے دور کر دیا ہے، عبقریات میں اگر تاریخ تقریض اور جانب دارانہ مبالغہ کے عناصر ملے ہوئے ہوں تو انہیں صحیح معنوں میں سیرت نگاری کیونکر مانا جائے گا، اور غالباً یہی وہ راہ ہے جس سے سیاسی مقاصد بھی سیرت نگاری میں اثر انداز ہو جاتے ہیں، یہ عناصر کھل کر ان تذکروں میں ظاہر ہوتے ہیں جو حکمرانوں سے متعلق ہوتے ہیں اور ایسے وقتوں میں لکھے جاتے ہیں جب وہ برسر اقتدار بھی ہوتے ہیں، ایسی صورت میں معلومات پر انحصار کر کے ہی لکھنا ممکن نہیں رہتا ہے، کیونکہ اس طرح کے تذکروں کو لکھنے والے اُدبا، بڑی حد تک منفعت کے حصول کی خاطر، خواہ وہ منفعت مادی ہو

---

1. احسان عباس فن السیرۃ ص ۱۷
2. نفس المرجع ص ۱۸
3. نفس المرجع ص ۶۸

یا سیاسی، انہیں لکھتے ہیں۔

تذکرہ نگاری محض نمائشی ہوکر رہ جاتی ہے، اس کا تاریخ حقائق سے واسطہ نہیں ہوتا، نتیجہ کے طور پر اصل موضوع، اپنا مقام ومرتبہ کھودیتا ہے۔

اس مسئلے کو طے کر لینے کے بعد کہ فن تذکرہ ادب کی ایک شاخ ہے، مزید ایک بات یہ رہ جاتی ہے کچھ لوگ اسے علم نفسیات (Psychology) کی ایک شاخ بھی مانتے ہیں، کیونکہ یہ فن شخصیت سے متعلق مخفی عوامل کو بھی سامنے لاتا ہے اور ایک شخص اپنی زندگی میں جن محسوسات، مشاہدات اور وجدانی کیفیات سے گذرتا ہے، ان کی نشاندہی بھی کرتا ہے، اور اسی چیز کے سہارے شخصیت کی بہتر پیکر تراشی ممکن ہوتی ہے۔

فن تذکرہ نگاری کے ابتدائی نمونوں کی بات کی جاتی ہے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ چینی مؤرخ سوماچیان (Ssu-ma Chien) پہلا شخص ہے، جس نے تذکرہ نویسی کی ابتدا کی ہے[1] یہ دوسری صدی عیسوی کی بات ہے۔

پھر فن تذکرہ اس کے بعد دو سلطنتوں تک سلطنت روما میں ترقی کے منازل طے کرتی ہوئی مشہور مؤرخ بلوتاخ کے ہاتھوں ادبی پیرایہ اختیار کرگئی، لیکن محمد کامل حسین کا خیال ہے کہ عہد فراعنہ میں مصر کے اندر سب سے پہلے اس فن کی ترقی کے آثار پیدا ہوئے، کیونکہ ان لوگوں نے اپنے بادشاہوں کے احوال زندگی، عبادت گاہوں اور مقبروں کی دیواروں پر لکھنا شروع کر دیا تھا، اور اسی وجہ سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مصر نے قدیم ترین زمانے سے ہی اس فن کو اپنی توجہات کا مرکز بنالیا تھا۔ اس کی مثال ہمیں عہد فراعنہ کے مصر میں پائی جانے والی ان منقوش عبارتوں میں ملتی ہے جو عبادت گاہوں اور قبروں پر کندہ ہوئی تھیں، اور ان میں بادشاہوں اور اُمراء کے احوال زندگی درج ہوتے تھے، اسی طرح مصر میں

بقیہ ص ۲۸ پر

[1] سوماچیان ۱۴۵ قبل مسیح پیدا ہوا۔
اس کا باپ چینی بادشاہ "Wu" کا مؤرخ تھا، سوماچیان سفر کا بڑا دلدادہ تھا، اس نے اپنی سیاحت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تاریخ کے فن کو آگے بڑھایا تھا۔
اس کی مشہور کتاب "تاریخی دستاویز" (Shih-chi) ہے۔
دیکھئے: Chinese Literature Vol. 12, PP. 100 — 1978.

تشہد میں انگلی سے اشارہ اور اسکی کیفیت

از : امتیاز احمد سلفی

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ جماعت اہل حدیث کے علماء وعوام کو ہمیشہ یہ خیال رہتا ہے کہ ان کی نماز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے مطابق ادا ہو، اور نماز میں کسی سنت کی مخالفت نہ ہوجائے، اسی اہتمام و توجہ کا نتیجہ ہے کہ نماز کے مسائل اکثر اوقات زیر بحث آتے رہتے ہیں، شرعی مسائل کی تنقیح کا جذبہ قابل ستائش ہے، لیکن یہ دھیان رکھنا ضروری ہے کہ یہ جذبہ تعنت کی حد میں داخل نہ ہوجائے نماز کے سلسلہ میں برصغیر کی جماعت اہل حدیث کا جو تعامل تھا، موجودہ دور کے بعض عرب علماء کی تحقیقات اس کے خلاف ہیں، علمی میدان میں ایسا ہونا فطری ہے، مختلف وسائل وذرائع کا انسان کی تحقیق پر اثر پڑتا ہے، اور انسان کو شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ غیر منصوص مسائل میں اجتہاد کرنا باعث اجر ہے، نصوص سے مسائل کے استنباط میں بھی نتائج مختلف ہوجاتے ہیں، ایسی صورت میں جس مسئلہ پر دل مطمئن ہو عمل کرنا چاہئے، مستنبط مسائل میں کسی ایک صورت پر اصرار اور دوسرے رخ کا ابطال خلاف تحقیق ہے، ایسا صرف منصوص مسائل میں ہونا چاہئے، لیکن منصوص مسائل میں اختلاف کا سوال ہی کیا ہے، جن لوگوں نے منصوص مسائل میں اختلاف کیا ہے کہ وہ حرص وہوا کے بندے ہیں، اور یہاں ان سے بحث نہیں ہے۔

نماز کی ایک سنت تشہد میں شہادت کی انگلی (سبابہ) سے اشارہ کرنا اور اسے حرکت دینا ہے، متعدد حدیثوں کی بناء پر انگلی سے اشارہ پر سب علماء کا اتفاق ہے، برصغیر کے علماء نے ماضی قریب تک ان حدیثوں کی روشنی میں یہ صورت متعین کی تھی کہ مصلی جب لا الٰہ الا اللہ پر پہونچے تو انگلی سے اشارہ کرکے اسے پھر پست کردے یا قدرے خمیدہ رکھے۔ متعدد کتب حدیث کے شائع ہونے اور بعض علماً کے فن حدیث میں غیر معمولی تبحر حاصل کرنے کے بعض مسائل کی قدیم شکل وہیئت میں فرق آیا ہے، یہ فرق اگر قیاس وتخمین کی بنیاد پر ہوتا تو قابل اعتبار نہ ہوتا، عام طور پر اس کی بنیاد کسی نہ کسی نص پر ہے، اس لئے اس کی رعایت ضروری ہے، اس وقت رفع سبابہ کے سلسلہ میں جو سوال ہے وہ یہ ہے کہ انگلی سے اشارہ شروع تشہد سے ہوگا یا لا الٰہ الا اللہ پر پہونچ کر شروع ہوگا؟ اور اشارہ کرکے انگلی کو سلام تک برابر حرکت دی جائے گی یا ایک حالت میں کھڑی رکھی جائے؟ ان دونوں سوالوں پر روشنی ڈالنے کے لئے ہم ذیل میں

صلوٰۃ الرسول مولفہ مولانا محمد صادق سیالکوٹی تحقیق شیخ عبدالرؤف بن عبدالحنان بن مولانا حکیم محمد اشرف سندھو (فاضل مدینہ یونیورسٹی) ص (۳۰۲-۳۰۸) سے ایک عبارت نقل کر رہے ہیں، امید ہے کہ ان دونوں عالموں کے بیان سے دونوں سوال حل ہوجائیں گے، صلوٰۃ الرسول کی عبارت بصورت متن اور شیخ عبدالرؤف کی تحقیق بصورت حاشیہ مذکور ہے، موصوف نے اس مسئلہ کی تحقیق میں شیخ البانی حفظہ اللہ سے استفادہ کیا ہے، ہم شیخ البانی صاحب کا بیان بھی کسی دوسری اشاعت میں پیش کریں گے،

قعدہ تشہد میں بیٹھ کر جب آپ التحیات پڑھتے ہوئے کلمہ شہادت پر پہونچیں تو انگشت شہادت سے اشارہ کریں، نماز میں انگلی کا اٹھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بابرکت اور عظمت والی سنت ہے، تشہد میں اللہ کے حضور دونوں زانو بیٹھ کر کلمہ شہادت پڑھنا خدا کی وحدانیت کا قولی اقرار ہے، اور قولی اقرار کے ساتھ ہی انگلی کا اٹھانا فعلی اقرار ہے، اب اس کا ثبوت سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاحظہ فرمائیں۔

عن عبد اللہ بن الزبیر قال: کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یشیر بإصبعیہ إذا دعا. (رواہ ابوداود والنسائی)(۱)

وعن ابن عمر قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا جلس فی الصلوۃ وضع یدیہ علی رُکبتیہ ورفع إصبعہ الیمنی التی تلی الإبہام یدعو بہا۔(۲) (مسلم)

وعن عبد اللہ بن الزبیر قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم إذا قعد یدعو وضع یدہ الیمنی علی فخذہ الیمنی ویدہ الیسریٰ علی فخذہ الیسریٰ، وأشار بإصبعہ السبابۃ ووضع إبہامہ علی إصبعہ الوسطی۔ (رواہ مسلم) (۳)

---

(۱) اخرجہ ابوعوانۃ (۲/۲۲۶) وابوداود (۹۸۹) والنسائی (۳/۳۷-۳۸) والبغوی (۲/۶۷) والبیہقی (۲/۱۳۱-۱۳۲) من طریق محمد بن عجلان عن عامر بن عبد اللہ عنہ، اس کی سند حسن ہے۔ "اذا دعا" کے بعد اس حدیث میں "ولا یحرکہا" کے الفاظ ہیں۔

(۲) اخرجہ عبدالرزاق (۳۲۳۸) وعنہ احمد (۲/۱۴۷) واخرجہ مسلم (۵/۸۰) وابوعوانۃ (۲/۲۲۵) والترمذی (۲/۲۹۴) والنسائی (۳/۳۷) وابن ماجہ (۹۱۳) وابن خزیمہ (۱/۷) والبیہقی (۲/۱۳۰) من طریق عبدالرزاق۔

(۳) اخرجہ ابن ابی شیبہ (۲/۲۳۵) وعنہ مسلم (۵/۷۹-۸۰) والبیہقی (۲/۱۳۱) من طریق ابن ابی شیبہ۔

حضرت وائل بن حجر روایت کرتے ہیں کہ : ثم جلس ...... وحلق حلقة ثم رفع اصبعه[1]

انگلی اٹھانے کی کیفیت

تشہد میں انگلی کا اٹھانا تو یقیناً ثابت ہوا، اب اس بات کی مزید تحقیق کرتے ہیں کہ انگلی کے اٹھانے کی کیفیت اور صورت کیا ہے[2]

وائل بن حجر کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا التحیات میں بیٹھنا اور انگلی سے اشارہ کرنا بیان کیا گیا ہے، حضرت وائل

---

(۱) اخرجه النسائی (۲/۳۷) والدارمی (۱/۳۱۴ - ۳۱۵) وابن خزیمة (۱۴۰) وابن حبان (۴۸۵ موارد) والبیہقی (۲/۱۳۲) من طریق زائدة بن قدامه عن عاصم بن کلیب عن ابیه عن وائل بن حجر وفیه "فرأیته یحرکها یدعوبها" بعد قوله "ثم رفع اصبعه" صحیح حدیث ہے، اس حدیث کو ابن حبان، ابن قیم اور زاد المعاد کے محققین شیخ شعیب وشیخ عبدالقادر نے بھی صحیح کہا ہے، (زاد المعاد (۱/۲۳۸ - ۲۳۹) شیخ البانی نے اسے خود بھی صحیح کہا ہے اور ابن الملقن کی بھی تصحیح ذکر کی ہے، اور کہا ہے کہ کامل ابن عدی میں اس کا شاہد بھی ہے، تحقیق المشکاۃ (۱/۲۸۷) وصفة الصلاة (۱۴۰) -

(۲) شیخ البانی فرماتے ہیں کہ لا الہ الا اللہ کہنے پر انگلی اٹھانا، اور کہنے کے بعد رکھ دینا، اس کی کوئی اصل نہیں، حتیٰ کہ اس بارے میں کوئی موضوع روایت بھی نہیں، تحقیق المشکاۃ (۱/۲۸۵) ایضاً صفة الصلاة (۱۴۰) مسند احمد (۴/۵۷) اور بیہقی (۲/۱۳۲) میں مقسم ابوالقاسم سے روایت ہے کہ مجھ سے ایک آدمی نے بیان کیا کہ میں نے خفاف بن ایماء کے ساتھ نماز پڑھی تو انہوں نے مجھے انگلی سے اشارہ کرتے دیکھا تو فرمانے لگے کہ اے میرے بھتیجے تو یہ کس لئے کرتا ہے، میں نے عرض کیا اس لئے کہ میں نے فقہاء اور نیک لوگوں کو ایسا کرتے دیکھا ہے، یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ تو نے درست کہا، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب وہ تشہد میں بیٹھتے تو انگلی سے اشارہ کرتے مشرکین آپ کو دیکھ کر یہ سمجھتے کہ جادو کر رہا ہے، حالانکہ آپ کے اشارہ سے توحید کی نیت ہوا کرتی تھی، اس حدیث سے شافعیہ وغیرہ نے حجت لی ہے کہ اشارہ لا الہ الا اللہ پر ہونا چاہیئے۔

اسی طرح صنعانی فرماتے ہیں کہ اشارہ کا مقام لا الہ الا اللہ کہنے کے وقت ہے کیونکہ بیہقی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل روایت کیا ہے اور اشارہ سے توحید اور اخلاص کی نیت ہونی چاہیئے، سبل السلام (۱/۳۱۹) مگر اس حدیث سے دو وجوہ سے استدلال صحیح نہیں : (۱) اس میں ہرگز یہ صراحت نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا الہ الا اللہ کہنے پر اشارہ کرتے تھے۔ (۲) خفاف سے بیان کرنے والا آدمی مجہول ہے، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے۔ مسند ابو یعلیٰ (۹۰۸) میں یہ حدیث دوسری سند سے ہے، اس میں خفاف سے بیان کرنے والے ان کے بیٹے حارث ہیں، ابن حجر کی تحقیق کے مطابق یہ بھی مجہول ہیں۔ ملاحظہ تہذیب التہذیب (۲/۱۴۱)، مگر ابو یعلیٰ کی سند سخت ضعیف ہے اس میں یزید بن عیاض ایک راوی ہیں، ذہبی الکاشف (۳/۲۴۳) میں کہا ہے کہ اسے ترک کر دیا گیا تھا۔ الحاصل اشارہ کے محل کی تعیین میں کوئی صریح روایت نہیں کہ لہٰذا ظاہر حدیث کے مطابق شروع سے انگلی اٹھانی چاہیئے، اور حدیث "یحرکها" کے مطابق اسے حرکت دیتے رہنے چاہیئے۔

بیت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (دوسرے سجدہ سے اٹھ کر) بیٹھے۔ اور دو انگلیوں کو بند کیا (چھنگلیاں اور اس کے پاس والی کو) اور حلقہ کیا (انگوٹھے اور بیچ کی انگلی سے) اور کلمے کی انگلی سے اشارہ کیا۔ (ابوداود)

اس حدیث سے بھی اور جتنی حدیثیں اشارہ سے متعلق آئی ہیں سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ التحیات میں بیٹھتے ہی آپ حلقہ بنالیتے اور انگلی سے اشارہ کرنے لگتے اور التحیات پڑھتے جاتے جو مشتمل ہے دعاء، ذکر اور تشہد پر (۱)

مشکوٰۃ شریف میں ابوداود اور دارمی شریف کے حوالہ سے حضرت وائل بن حجر کی حدیث میں "یحرکہا" بھی آیا ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی اٹھائی، اور اس کو ہلاتے تھے (۲) اور اسی حدیث کے آگے ہی حضرت عبداللہ ابن زبیر کی روایت میں ہے کہ تشہد پڑھتے وقت

---

(۱) ابوداود (۷/۲۶) نسائی (۳/۳۵)۔

(۲) یہ حدیث پیچھے گذر چکی ہے، یہ نسائی، دارمی وغیرہ میں ہے ابوداود میں نہیں، لہذا صاحب مشکاۃ کا اسے ابوداود کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں، "یحرکہا" کے الفاظ زائدہ بن قدامہ عن عاصم کے طریق میں ہیں، اس طریق سے یہ روایت ابوداود میں بھی ہے، مگر بہت مختصر ہے اس میں قیام کے وقت وضع الیدین کا ذکر ہے، تشہد وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، ملاحظہ ہو سنن ابوداود (۲۷)

"ولا یحرکہا" عبداللہ بن زبیر کی روایت میں ہے، اور اس کی تخریج بھی پیچھے گذر چکی، ان دونوں روایات میں صحیح روایت "یحرکہا" ہے، رہا "ولا یحرکہا" تو اس کے ابن قیم نے تین جواب دیئے ہیں:

۱۔ اس زیادتی کی صحت میں نظر ہے۔ ۲۔ ابوداود کی روایت میں صراحت نہیں کہ بحالت نماز کا واقعہ ہے۔ ۳۔ اگر اسے بحالت نماز تسلیم بھی کرلیا جائے تو یہ روایت نافی ہے، اور حدیث وائل بن حجر مثبت ہے، اور صحیح حدیث ہے اسے ابوحاتم (ابن حبان) نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے لہذا یہ حدیث نافی پر مقدم ہے۔

شیخ البانی فرماتے ہیں کہ: لا یحرکہا" میرے نزدیک شاذ یا منکر ہے کیونکہ محمد بن عجلان اس پر ثابت نہیں رہا، کبھی اسے بیان کرتا ہے، اور کبھی نہیں، اور یہی (عدم ذکر) درست ہے، دوسرے رواۃ نے اس حدیث میں اس کی متابعت کی ہے، اور انہوں نے اس زیادتی کو ذکر نہیں کیا، لہذا اسے حدیث وائل کے مقابلہ میں لانا جائز نہیں۔ (تحقیق المشکاۃ ۱/۲۸۷)

قلت: اس زیادتی کے شاذ یا منکر ہونے میں کوئی شبہ نہیں، کیونکہ اسے بیان کرنے والے محمد بن عجلان ہیں۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ (۱/۱۶۵) میں کہا ہے "فی حفظہ شئ" یعنی ان کے حافظہ میں کچھ کمزوری ہے، اور میزان (۳/۶۴۴) میں کہا ہے "کان متوسطا فی الحفظ" یعنی ان کا حافظہ متوسط درجہ کا تھا، اور "لا یحرکہا" زیادتی کو بیان کرنے والے زائدہ بن قدامہ ہیں، حافظ ابن حجر ان کے بارے میں فرماتے

حضور انگلی سے اشارہ کرتے " ولا یحرکہا " اور اسے ہلاتے نہ تھے، اس سے معلوم ہوا کہ انگلی کو دوران رفع کے بھی ہلانا درست ہے اور نہ ہلانا بھی درست ہے، جس نے انگلی کبھی نہیں ہلائی اس کو کبھی کبھی ہلانا چاہئے، تاکہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہلانے کی سنت پر بھی عمل ہوتا رہے اور سنت زندہ رہے۔

انگلی کے ہلانے کا فلسفہ یہ ہے کہ جب انگلی کو کھڑا کیا تو اس نے توحید کی گواہی دی کہ اللہ ایک ہے، پھر جب انگلی کو بار بار ہلانا شروع کیا تو اس نے بار بار ایک، ایک، ایک ہونے کا اعلان کیا، مثلاً دوران تشہد اگر انگلی کو سات یا آٹھ بار ہلایا تو اتنی مرتبہ انگلی نے توحید کا اعلان کیا، گویا انگلی کھڑی ہوئی اور بول بول کر ایک اللہ ایک اللہ کہتی رہی، اور نمازی کے کیف کا یہ عالم ہو کہ نظر انگلی کے رفع اور حرکت پر رکھے، دماغ وحدانیت کے آبشار دل پر گرائے اور قلب عطشاں یہ آب حیات پیتا جائے۔

(جاری)

ہیں، ثقہ، ثبت، تقریب (۱/۲۵۶) یہ ثقہ اور ثبت تھے، اور ذہبی نے ان کے ترجمہ میں امام احمد بن حنبل سے نقل کیا ہے کہ وکیع، زائدہ پر حافظہ میں کسی کو فوقیت نہ دیتے تھے۔ تذکرۃ الحفاظ (۱/۲۱۵)۔

ابن عجلان حافظہ میں زائدہ سے کہیں کم ہیں، لہذا اصول حدیث کے اس قاعدہ (الثقۃ اذا خالف من ھو احفظ منہ واضبط کانت روایتہ شاذۃ) کے مطابق محمد بن عجلان کی روایت شاذ ہے۔

شیخ البانی کے کلام میں گذرا ہے کہ ابن عجلان نے " ولا یحرکہا " کو کبھی ذکر کیا ہے، اور کبھی نہیں ـــــ اب اس کی تفصیل سنئے! ـــ ابن عجلان سے ابن جریج، ابو خالد، یحیٰ بن سعید اور سفیان بن عیینہ نے روایت کی ہے، ابن جریج کی روایت میں " ولا یحرکہا " ہے اور یہ ابوداود وغیرہ میں ہے، جیسا کہ پہلے گذر چکا ہے۔ باقی تینوں نے ابن عجلان سے روایت کرتے ہوئے " ولا یحرکہا " ذکر نہیں کیا بلکہ اشارہ ذکر کیا ہے۔ ابو خالد کی روایت مسلم وغیرہ میں ہے، ملاحظہ ہو یحیٰ بن سعید کی حدیث جس کا ذکر پہلے ہو چکا، اور سفیان بن عیینہ کی روایت دارمی (۱/۳۰۸) میں ہے۔

انوار مصابیح

بجواب

رکعات تراویح ..

مؤلفہ

مولانا نذیر احمد رحمانی رحمہ اللہ ــــ اس کتاب میں نہایت پر زور

دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ تراویح کی آٹھ رکعتیں ثابت اور محقق

ہیں ۔ مؤلف رکعات تراویح نے اہل حدیث کے دلائل پر جتنے

شبہات وارد کئے تھے مولانا مرحوم نے نہایت متانت سے تمام

پہلوؤں کا جائزہ لے کر اصل حقیقت کو بے نقاب کیا ہے ..

ماہنامہ

جلد ۹	ربیع الآخر ۱۴۱۲ھ	نومبر ۱۹۹۱ء	شمارہ ۱۱

اِس شمارہ میں

مدیر

عبدالوہاب حجازیؔ

پتہ

دارالتالیف والترجمہ

بی، ۱/۱۸ جی، ریوڑی تالاب وارانسی ۲۲۱۰۱۰

بدل اشتراک

سالانہ ۴۵ روپئے۔ فی پرچہ ۴ روپئے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدتِ خریداری ختم ہو چکی ہے ۔

درسِ قرآن

مولانا اصغر علی امام مہدی السلفی

میدانِ جنگ میں ثباتِ قدمی کا حکم

يا أيها الذين آمنوا إذا لقيتم الذين كفروا زحفا فلا تولوهم الأدبار، ومن يولهم يومئذ دبره إلا متحرفا لقتال أو متحيزا إلى فئة فقد باء بغضب من الله ومأواه جهنم وبئس المصير ۔ (الأنفال)

مسلمانو! جب تم جنگ کے وقت) کافروں سے مڈبھیڑ میں ملو (یعنی مڈبھیڑ ان سے ہوجائے) تو ان سے پیٹھ مت پھیرنا۔ اور جو شخص بغیر (ضرورت) تدبیر جنگ کے بلا نیت اپنی جماعت میں ملنے کے لئے میدان جنگ میں پیٹھ دے گا اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا، اور اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

آیت کریمہ میں مسلمانوں کو جہاد کے سلسلے میں واضح تعلیمات سے روشناس کرایا گیا ہے، میدان جنگ میں جب گھمسان کا رن ہو تو ایسی صورت میں پیٹھ دکھانے سے منع کیا گیا ہے اور بلا ضرورت اور تدبیر جنگ کیلئے مثلاً پینترا بدلنے اور مسلمان بھائی کے ساتھ ہوکر جم کر لڑنے کے علاوہ اگر کوئی میدان جنگ میں پیٹھ دکھاتا ہے تو اس پر اس کو وعید شدید سنائی گئی ہے میدان جنگ سے بھاگنا اور منہ پھیرنا کبیرہ گناہوں میں سے ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا باعث ہے اور اللہ تعالیٰ کا جس شخص پر غضب نازل ہو تو پھر اس کی دنیا وآخرت برباد ہے۔ اسی آیت کریمہ میں نتیجے کے طور پر فرمایا کہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ سب سے بری جگہ ہے۔

میدان جنگ سے فرار اختیار کرنا کبیرہ گناہ ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات ہلاک کرنے والی چیزوں سے بچو، پوچھا گیا یا رسول اللہ! یہ سات ہلاک کرنے والی چیزیں کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، جادو کرنا، اور ناحق کسی انسان کو قتل کرنا، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، اور جنگ کے دن میدان جنگ سے پیٹھ پھیر بھاگنا، اور بھولی بھالی مؤمن اور پاکدامن عورتوں پر تہمت زنا لگانا۔ (رواہ البخاری ومسلم)

اس حدیث پاک میں جن چیزوں کو گناہ کبیرہ بتایا گیا ہے، اور ہلاکت کا سبب قرار دیا گیا ہے اس میں سے ایک چیز میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرنا بھی ہے۔

اگرچہ بعض مفسرین نے یہ کہا ہے کہ جنگ سے راہ فرار اختیار کرنا صرف صحابۂ کرام پر حرام تھا کیونکہ ان کے اور جہاد فرض عین تھا اور اسلام کے دفاع اور تبلیغ دین حنیف کے لئے جہاد ان کے لئے سخت ضرورت کی چیز تھی، کیونکہ اسلام ابھی پھیلا نہیں تھا۔ کچھ دوسرے مفسرین نے کہا کہ یہ حرمت صرف انصار کے لئے خاص تھی، ان کے لئے جائز نہ تھا کہ وہ میدان جنگ سے کسی بھی حالت میں راہ فرار اختیار کریں، کیونکہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کیا تھا کہ وہ ہر حال میں سمع و طاعت کے پابند ہوں گے، خواہ تنگی کا وقت ہو یا وسعت کا، یا سختی کا زمانہ ہو یا نرمی کا۔ جبکہ کچھ مفسرین کا دعویٰ ہے کہ فرار کی یہ حرمت صرف اہل بدر کیلئے خاص ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے بدر کے دن سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اس بدری جماعت کے اور کوئی جماعت نہ تھی جہاں مسلمان بھاگ کر پناہ لیتے، اسلئے خاص طور پر ان کا بھاگنا ممنوع تھا۔

مگر صحیح بات یہ ہے کہ گرچہ یہ آیت کریمہ غزوۂ بدر کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے مگر اس کا حکم عام ہے اور ہر وہ شخص جو میدان جنگ سے بلا ضرورت پیٹھ پھیرتا ہے اس کے لئے سخت وعید ہے۔ میدان جنگ سے بھاگنا حرام ہے، اسکی حرمت تا قیامت باقی رہے گی، جیسا کہ آیت کریمہ کے الفاظ عام ہیں نیز قاعدہ ہے "العبرة لعموم اللفظ لا بخصوص السبب۔ اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے خصوص سبب کا نہیں"۔ نیز حدیث ابوہریرہؓ میں بھی تولی یوم الزحف کو موبقات و مہلکات قرار دیا گیا ہے۔ اور اسکے ساتھ جن چھ امور کا ذکر ہے ان کا تعلق بھی گناہ کبیرہ سے ہے۔ اور جن باتوں پر ہلاکت اور بربادی کی وعید ہو وہ گناہ کبیرہ میں شمار ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت و ضرورت اور اسکی عظمت کو مسلمانوں کے دلوں میں بیٹھا کر اس راہ میں ہر غالی و ثمین چیز کو قربان کرنے اور شہادت کے نشے میں سرشار ہونے کا جذبۂ بلند عطا فرمائے اور میدان جنگ میں ثبات قدمی عطا کرے، اور جہنم کے عذاب الیم سے محفوظ رکھے جو سب سے برا ٹھکانہ ہے۔ دنیا کی ہر مصیبت اس کے سامنے ہیچ ہے اور ہر عذاب اس عذاب جہنم سے پناہ ڈھونڈتا ہے۔

اللّٰھمّ احفظنا من کلّ بلاء الدّنیا وعذاب الآخرۃ۔

درس حدیث

نیک نیتی اور اخلاص کی اہمیت

ڈاکٹر عبدالرحمن بن عبدالجبار الفریوائی

إن أول الناس يقضى يوم القيامة عليه رجل استشهد، فأتي به فعرفه نعمه، فعرفها، قال: فما عملت فيها؟ قال: قاتلت فيك حتى استشهدت، قال: كذبت، ولكنك قاتلت ليقال جريء فقد قيل، ثم أمر به فسحب على وجهه حتى ألقي في النار ـ

۱۔ قیامت کے روز سب سے پہلے ایک ایسے آدمی کا فیصلہ ہوگا جس نے جام شہادت نوش کیا ہوگا، اسے لایا ائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو اپنی نعمتیں پہچنوائے گا جسے وہ پہچان لے گا اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اس نعمت کے بارے میں تم نے یا کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے تیری راہ میں قتال کیا حتی کہ شہید ہوگیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم جھوٹ بولتے ہو، تم نے تو قتال س واسطے کیا ہے کہ لوگ تمہیں بہادر کہیں، اور لوگوں نے تمہیں بہادر کہا بھی، پھر اس کے بارے میں حکم ہوگا اور اس کو منہ کے بل سیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

۲۔ اور ایک آدمی کا حساب ہوگا جس نے علم سیکھا اور اسے سکھایا، اور قرآن پڑھا، اس کو حاضر کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ س کو نعمتیں پہچنوائے گا جسے وہ جان لے گا، اللہ تعالیٰ سوال کرے گا کہ اس کے بارے میں تم نے کیا کیا؟ وہ کہے گا کہ میں نے علم حاصل یا اور اسے پھیلایا اور تیری خاطر قرآن پڑھا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم جھوٹ کہتے ہو، تم نے تو علم اس واسطے حاصل کیا تھا کہ عالم لوائے جاؤ، اور قرآن اس واسطے پڑھا تھا کہ تم کو قاری کہا جائے، چنانچہ تم کو لوگوں نے عالم اور قاری کہا، پھر حکم ہوگا اور اسے منہ ے بل گھسیٹ کر جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔

۳۔ اور ایک ایسے آدمی کا حساب ہوگا جس کو اللہ رب العزت نے خوب مال و دولت سے نوازا تھا، اس کو لایا جائے گا

اور اللہ اس کو اپنی نعمتیں پہچنوائے گا، جسے وہ پہچان لے گا، اللہ تعالیٰ سوال کرے گا کہ اس دولت کا استعمال کس طرح کیا؟ وہ عرض کرے گا کہ میں نے تیری رضا کے ہر راستے میں اسے خرچ کیا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم جھوٹے ہو، تم نے تو یہ کام اس لئے کیا تھا کہ تمہیں سخی اور فیاض کہا جائے سو وہ کہا گیا، پھر اسے حکم دیا جائے گا، اور اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم کی آگ میں ڈال دیا جائے گا۔ (مسند احمد، صحیح مسلم، سنن نسائی ۔ بروایت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ)

زیر نظر صحیح حدیث میں راہ جہاد میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے والے مجاہدوں اور تعلیم و ثقافت کے میدان میں کام کرنے والے علماء، فقہاء و قضاۃ، اور طلباء و اساتذہ نیز راہ حق میں خرچ کرنے والے مالداروں کے انجام بد سے مطلع کیا گیا ہے، اس لئے امت کے ہر طبقہ کے انسان کے لئے اس میں درس عبرت و موعظت و نصیحت ہے۔ نیت کی درستی، اعمال میں اخلاص اور اللہ کی رضا جوئی قبول اعمال کی شرط ہے، صحیح کاموں کو غلط جذبوں سے انجام دینے کا یہ انجام بد ہمارے لئے صراط مستقیم کو متعین کرتا ہے، جہاد کو اسلام کا سب سے اشرف و افضل اور اعلیٰ چیز کہا گیا ہے، ذروۃ سنام الاسلام الجہاد۔

اسی طرح سے علم حاصل کرنے اور اس کی اشاعت کرنے والوں کی بھی بڑی اہمیت اور فضیلت ہے۔

راہ حق میں مال و دولت کا خرچ کرنا بھی بڑی نیکی اور فضیلت کی بات ہے لیکن اپنی تمام دنیوی و اخروی افادات اور اہمیت کے باوجود صحیح نیت کے نہ ہونے سے اللہ رب العزت کے دربار میں ندامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لئے ہم لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث مبارک کو ہر وقت اپنے پیش نظر رکھنا چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم پر گامزن فرمائے، اور حسن عمل اور حسن نیت کی نعمت سے مالا مال کرے۔ آمین!

ثم آمین!!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مثالی شخصیت، مثالی کردار

اللہ تعالیٰ نے نبوت ایسے عظیم انسانوں کو دی ہے جو روحانی، اخلاقی اور عقلی اعتبار سے انتہائی کامل لوگ تھے جن کی شخصیت اور کردار بے داغ اور کھلی کتاب تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ان صفات میں اس درجہ کا کمال عطا کیا تھا کہ قیامت تک تاریخ کے ہر انقلاب، علم کی بے پایاں ترقی، تہذیب وتمدن کی انتہائی بلندی کے باوجود آپ کی شخصیت اور کردار سب سے معیاری رہیں گے۔

مثالی شخصیت اور مثالی کردار کا جوہر صداقت شعاری ہے، اس کا قول وعمل سچائی سے سر مو تجاوز نہ کرے، اسی سے انسانی کردار میں ایک جامعیت اور کمال پیدا ہوتا ہے اور یہ صفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بدرجۂ کمال پائی جاتی تھی، آپ کی پوری زندگی صداقت کا بے داغ آئینہ ہے۔

آپ کا سب سے بڑا دشمن ابوجہل کہتا تھا اے محمدؐ میں تمہیں جھوٹا نہیں کہتا ہوں، البتہ میں تمہاری باتوں کو تسلیم نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق آیت نازل فرمائی:

قد نعلم انه ليحزنك الذى يقولون	ہم جانتے ہیں کہ یہ کافر جو کہتے ہیں ان سے تم رنجیدہ
فانهم لا يكذبونك ولكن الظلمين	ہوتے ہو اس لئے کہ وہ تجھ کو نہیں جھٹلاتے بلکہ وہ
بايات الله يجحدون. (انعام ۴)	ظالم لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔
	(ترمذی)

قیصر روم نے اپنے دربار میں ابوسفیان سے جو اس وقت آپؐ کے سخت دشمن تھے، آپؐ کے متعلق پوچھا تھا کہ دعوائے نبوت سے پہلے تم نے اسے کبھی جھوٹ بولتے ہوئے دیکھا تھا؟ ابوسفیان نے ہزار عداوت کے باوجود کہا تھا نہیں، بعد میں رومی بادشاہ نے اہل دربار کے سامنے ابوسفیان سے کہا کہ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا وہ کبھی جھوٹ کا مرتکب ہوا تھا تو تم نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس لئے مجھ کو یقین ہے کہ اگر وہ اللہ کے متعلق جھوٹ بولتا یعنی دعوائے وحی و رسالت میں جھوٹا ہوتا تو وہ لوگوں میں جھوٹ بولنے سے کب باز آتا؟ (بخاری)

قریشی رؤسا کی ایک مجلس میں آپ کا ذکر ہو رہا تھا، سب سے زیادہ تجربہ کار سردار نضر بن حارث نے کہا: محمدؐ تمہاری آنکھوں کے سامنے بچہ سے جوان ہوا تم سب میں سب سے زیادہ کریم النفس، صداقت شعار اور امین تھا، اور جب اس کے بالوں میں سفیدی آگئی اور تمہارے سامنے اپنی سب باتیں پیش کیں، تو تم اسے شاعر، کاہن، مجنوں اور جادوگر کہنے لگے، بخداوہ یہ سب کچھ نہیں ہے تم پر کوئی نئی افتاد آئی ہے۔ (سیرت ابن ہشام)

ذہانت اور عقلی کمال آپؐ کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہے، نبوت سے پہلے جواں عمری میں خانۂ کعبہ کی تعمیر ہو رہی ہے، حجر اسود نصب کرنے کا موقعہ آیا تو شدید قبائلی کشمکش پیدا ہوئی، ہر قبیلہ اس پتھر کو نصب کرنے کا شدید خواہاں ہے، معاملہ کشت و خونریزی تک پہونچنے والا ہے، ایک بوڑھے سردار نے رائے دی کہ صبح حرم میں جو شخص سب سے پہلے آئے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے، اتفاق کہ سب سے پہلے ذات گرامیؐ وہاں حاضر ہوئی اس لئے اسے نصب کرنے کے آپؐ حقدار قرار پائے لیکن آپ کی عقل و تدبیر ہمہ گیر نے اس حق میں سب کو شریک کیا، چادر بچھائی حجر اسود کو اس میں رکھا اور ہر قبیلہ کے سردار کو چادر پکڑ کر اٹھانے کو کہا اس کے بعد خانۂ کعبہ کی دیوار میں جہاں اسے نصب کرنا تھا چادر سے اٹھا کر آپ نے نصب کر دیا، اس شرف میں تمام لوگ شریک ہوگئے، خون کی ندیاں جو موجزن ہونے کے لئے بیتاب تھیں خشک ہو کر رہ گئیں، آپ کی تدبیریں کمال درجہ تعمیری ہیں جس میں تاقیامت آپ کا کوئی ثانی نہ ہوگا، پوری زندگی بے مثال حسن تدبیر کا آئینہ ہے۔

اسلام کے پیغام کو سارے انسانوں تک پہونچانے کے لئے آپؐ نے دنیا کا عیش و آرام ترک کر دیا تھا۔ اللہ کی طرف سے آپ کا یہ اعلان تھا: اے لوگو! میں تم سے اس پر کوئی مال نہیں طلب کرتا، میرا اجر تو بس اللہ کے ذمہ ہے (ھود ۲۹) لوگ اس پیغام کی عظمت و اہمیت کو نہیں سمجھتے تو آپ بے انتہا رنجیدہ ہوتے، اللہ نے آپ کے غم کی تخفیف کے لئے یہ آیت نازل فرمائی:

فلعلک باخع نفسک علیٰ آثارھم   اگر یہ لوگ اس کلام پر ایمان نہ لائیں گے تو شاید تو

اِنۡ لم یومنوا بھذا الحدیث اسفا — ان کے پیچھے افسوس سے اپنی جان کو ھلاک کرڈالے گا ۔ (الکہف ۶)

اسلام کا پیغام جس بے نفسی، صبر وثبات اور عزم وحوصلے سے آپ نے دنیا تک پہونچایا ہے وہ قیامت تک آنے والی مسلم نسلوں کے لئے بے مثل نمونہ ہے ۔

قرآن نے بتایا ہے کہ دنیا میں انسانوں کی تخلیق کا مقصد اللہ کی عبادت کرنا ہے : وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون ۔ (القرآن) ہمارے حضرت جس قدر رتبے میں بلند وبالا ہیں اسی قدر اللہ کی بندگی اور عبادت میں سب سے بڑھ کر ہیں ۔

حدیث میں ہے کہ : رات کو جاگ کر آپ اس قدر اللہ کی عبادت کرتے تھے کہ آپ کے قدموں میں ورم آجاتا تھا اور جب آپ سے کہا جاتا کہ اللہ نے آپ کی اگلی پچھلی لغزشیں معاف نہیں کر دی ہیں ؟ تو آپ فرماتے : تو، کیا میں اللہ کا شکر گذار بندہ نہ ہوں ؟ (بخاری، مسلم)

آپ کے اعمال کی ایک عظیم ترین صفت یہ ہے کہ جو کام کرتے ہمیشہ کرتے تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شہادت ہے کان عملہ دیمۃ آپ کا عمل بارش کی جھڑی کی طرح ہوتا تھا، یعنی ہمیشگی سے انجام دیتے تھے، اور جس بات کی طاقت آپ رکھتے تھے تم میں کون اس کی طاقت رکھتا ہے ؟ آپ کی اسی صفت سے سنت کا لفظ نکلا ہے جس کا معنی ہمیشہ کا عمل ہے ،

آپ کی عظیم ترین صفت یہ ہے کہ آپ جن باتوں کی دعوت دوسروں کو دیتے تھے ان پر آپ سب سے پہلے ایمان لاتے اور عمل کرکے دکھاتے تھے ۔ قرآن کہتا ہے :

اٰمن الرسول بما اُنزل الیہ من ربہ ۔ (بقرہ) — رسول ان باتوں پر خود ایمان لایا ہے جو اس کے رب کیطرف سے اس پر نازل کی گئیں ہیں ۔

نیز اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے آپ سے کہلوایا لم تقولون مالا تفعلون (بقرہ) وہ باتیں تم کیوں کہتے ہو جنہیں کرتے نہیں ۔

آپ کے حسن اخلاق کی دنیا اتنی ہی وسیع ہے جتنی قرآنی تعلیمات کی، آپ اپنے اور بیگانے، چھوٹے اور بڑے، امیر اور غریب دوست اور دشمن، خلوت وجلوت صلح اور جنگ ہر شخص اور ہر موقع پر اپنے بلند ترین، بے غرض اور تعمیر سے بھرپور اخلاق کی رحمت آمیز بدلیاں برساتے تھے ۔

خادمِ رسولؐ انسؓ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کے سوال پر "نہیں" کبھی نہیں کہا۔ (بخاری)
ایک شخص نے آپؐ سے کچھ درخواست کی، اس وقت آپ کی بکریوں کا ریوڑ بہت دور تک پھیلا ہوا تھا آپ نے سب اسے دے دیں، وہ شخص اپنے قبیلہ میں واپس گیا اور بولا اسلام قبول کرلو: ارے محمد ایسے فیاض ہیں کہ فقر وفاقہ سے بھی نہیں ڈرتے۔ (مسلم)

ایک رات حضرت ابوذرؓ آپؐ کے ساتھ چل رہے تھے، آپ نے فرمایا ابوذر اگر احد پہاڑ میرے لئے سونا بنا دیا جائے تو میں اسے تین راتوں سے زیادہ روکنا پسند نہیں کروں گا حتی کہ ایک دینار بھی نہیں الا یہ کہ قرض کی ادائیگی کے لئے بچا لوں۔ (بخاری)

فیاضی اعلیٰ انسانی صفت ہے، انسانی ہمدردی کے حصول اور تسخیرِ قلوب کے لئے یہ سحرِ حلال ہے، دیگر صفات کی طرح یہ بھی تعمیری، بے غرض اور بے مثال صفت نبوی ہے اور رہتی دنیا کے لئے نمونۂ انسانیت ہے۔

فتوحات کے دور میں آپؐ کے پاس بے پناہ دولت چاروں طرف سے آتی تھی لیکن جس سادگی کا راستہ آپؐ نے اختیار کیا تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اخیر دم تک اسی سنت پر باقی رہے اور حق کوشوں کے لئے سخت کوشی کا کھرا راستہ چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر گیا، میں نے آپ کے پہلو پر چٹائی کے نشانات دیکھے، عرض کیا اے اللہ کے رسولؐ اس تکلیف سے حفاظت کے لئے چٹائی پر ایک گدا بچھا دیا جائے، آپ نے فرمایا: دنیا سے میرا کیا واسطہ میری اور دنیا کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی سوار کسی درخت کے سائے میں تھوڑی دیر رک کے پھر اسے چھوڑ کر چل دے۔ (ابوداؤد)

آپ نے اپنی آل کی روزی کے متعلق دعا کی اللّٰھم اجعل رزق آل محمد کفافا اے اللہ آلِ محمد کی روزی بقدرِ کفایت مقرر کر۔

اللہ تعالیٰ آپؐ کو اس کے متعلق تربیت دیتے ہوئے فرماتا ہے:

ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ	اور جو کچھ ہم نے مختلف قسم کے لوگوں کو متاعِ دنیا سے
ازواجا منھم زھرۃ الحیوٰۃ الدنیا	بہرہ ور کیا ہے اس کی طرف اپنی آنکھیں دراز نہ کیجیو
لنفتنھم فیہ ورزق ربک خیر و	تاکہ ہم ان کو اس مال کی وجہ سے مبتلائے فتنہ کریں
ابقی۔	تیرے پروردگار کا رزق سب سے اچھا اور باقی رہنے
(طٰہٰ ۱۳۱)	والا ہے۔

آپ ایک غزوہ سے تشریف لائے، حضرت عائشہؓ نے اپنے گھر میں چھت گیر لگا رکھی تھی، آپؐ نے اسی وقت اسے پھاڑ دیا

در فرمایا: اللہ نے دولت ہم کو اس لئے نہیں دی ہے کہ اینٹ پتھر کو کپڑے اوڑھائیں۔ (ابوداؤد)

ایک شخص آپؐ سے ملنے آیا اور رعب نبوت سے کانپنے لگا، آپ نے فرمایا گھبراؤ مت میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھے گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔ (مستدرک)

ایک شخص نے حضرت عائشہ سے پوچھا آپؐ گھر میں کیا کرتے تھے؟ کہا، آپ گھر کا کام کیا کرتے تھے، کپڑوں میں پیوند لگاتے گھر میں جھاڑو لگاتے، دودھ دوھ لیتے، بازار سے سودا خرید لاتے، جوتیاں گانٹھ لیتے، ڈول میں ٹانکے لگا دیتے، اونٹ اپنے ہاتھ سے باندھتے، اسے چارہ ڈالتے، غلام کے ساتھ مل کر آٹا گوندھتے۔ (بخاری)

نبی اور صاحب حکومت ہو کر یہ سادگی اختیار کرنا رہتی دنیا تک تمام بنی نوع انسان کے لئے خصوصاً آج کے مادہ پرست دور کے لئے ایک بے مثال نمونہ ہے، مسلم نوجوان اس اعلیٰ صفت کو اپنا کر خدمت خلق اور تسخیر قلوب کے شاندار کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔

جسمانی قوت کے اعتبار سے بھی آپؐ کی شخصیت مثالی ہے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ آپ سب سے زیادہ شجاع تھے مدینہ میں ایک بار شور ہوا کہ دشمن آگئے، سب لوگ تیار ہو گئے، لیکن سب سے پہلے آپ نکلے، بغیر زین کسے گھوڑے کی ننگی پشت پر سوار ہوئے، خطرے کی تمام جگہوں کا گشت کر کے واپس آئے اور تسکین دیتے ہوئے فرمایا کوئی خطرے کی بات نہیں ہے۔ (بخاری)

غزوۂ حنین میں دشمنوں کے تیر کی بوچھار سے اکثر صحابہ کے قدم اکھڑ گئے لیکن آپؐ چند فداکاروں کے ساتھ ڈٹے رہے، آپؐ کی زبان اطہر پر یہ شعر تھا ؎

أنا النبيُّ لا كذب أنا ابن عبد المطلب

(میں سچا پیغمبر ہوں ـــــــــــ میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں)

فاتح خیبر علیؓ کہتے ہیں: بدر میں جب گھمسان کی جنگ شروع ہوئی تو ہم نے آپؐ ہی کے دامن میں پناہ لی، آپ سب سے زیادہ بہادر تھے، مشرکوں کی صف سے آپؐ سے زیادہ قریب کوئی نہ تھا۔ (مسند احمد)

ابی بن خلف بدر میں قید ہو کر آیا پھر فدیہ دے کر رہا ہوا، جاتے ہوئے اس نے کہا میں اپنے ایک مخصوص گھوڑے کو روزانہ جوار اس غرض سے کھلاتا ہوں کہ اس پر سوار ہو کر محمد کو قتل کروں گا، غزوۂ احد میں اسی پر سوار ہو کر صفیں چیرتا آپؐ کے قریب پہنچا صحابہ نے بیچ میں اسے روکنا چاہا، آپ نے انہیں منع فرمایا، پھر ایک مسلمان سے نیزہ لے کر اس کی طرف آپؐ بڑھے اور آہستہ سے

اس کی گردن میں انی چبھودی، وہ چیخ کر بھاگا، لوگوں نے کہا، تم اس قدر کیوں ڈر گئے، زخم تو کاری نہیں ہے، اس نے کہا: یہ محمدؐ کے ہاتھ کا زخم ہے۔ (شرح شفاء قاضی عیاض)

عرب کے زبردست پہلوان رکانہ کو آپ نے تین بار کشتی میں پچھاڑا، تیسری بار اس نے آپ کی نبوت کی گواہی دی (ترمذی)

آپ نے فرمایا ہے: طاقتور مومن اللہ کے نزدیک ضعیف اور کمزور مومن سے زیادہ محبوب اور بہتر ہے۔ (مسلم)

جن شخصیات میں شجاعت کا جوہر موجود ہوتا ہے ان میں صبر وضبط اور عزم واستقلال کا خاصہ غایت درجہ پایا جاتا ہے جس طرح آپ شجاعت میں فرد تھے، عزم واستقلال میں بھی آپ کا کوئی ثانی نہیں تھا، تیئس سالہ آپ کی پیغمبرانہ جدوجہد آپؐ کی اس بلند ترین صفت کی گواہ ہے، آپ کی مخالفت میں سارا عرب ہے اور آپ یکہ وتنہا، لیکن ان کے نظام کفر وشرک سے آپ نے صلح نہیں کی بلکہ ان کی ساری طاقت آپ کے استقلال کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئی، تیرہ سال تک مسلسل آپؐ بے یار ومددگار رہے، لیکن آپ کے قدم میں جنبش نہ ہوئی، اللہ نے اپنی تربیت سے آپؐ کی اس صفت کو اور زیادہ مضبوط کیا فرمایا:

فاصبر کما صبر اولوا العزم من الرسل — پس تم صبر اختیار کرو جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا۔
(الاحقاف ۳۵)

ایک بار صحابہ نے کافروں کی مسلسل ایذا دہی سے اکتا کر کہا: آپ اللہ سے ہماری کشائش کے لئے دعا کیوں نہیں فرماتے؟ آپؐ کا چہرہ سرخ ہوگیا، فرمایا: تم سے پہلے کے لوگوں کو چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جاتا تھا، لوہے کے کنگھوں سے ان کے جسم کے گوشت نوچ لئے جاتے تھے، لیکن یہ مصائب انہیں ان کے مذہب سے نہیں پھیر سکے۔ بخدا اسلام کمال تک پہونچے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک سفر کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی سے ڈر نہ ہوگا۔ (بخاری)

عدل ومساوات اسلام کی وہ خوبی ہے جس کا اعتراف دنیا کے ہر اس شخص اور ہر اس قوم کو ہے جس نے اسلام کو سچے زاویے سے دیکھا اور مسلمانوں سے تاریخ کے کسی بھی دور میں اس کا سابقہ رہا ہے، اسلام اور اس کے ماننے والے اس معاملے میں دنیا کے ہر مذہب اور ہر قوم سے ہر دور میں ممتاز رہے ہیں، اور کیوں نہ ہو؟ یہ مذہب اس ذات کا وضع کردہ ہے جو کائنات کی ہر شئی اور نوع انسانی کی ہر قوم کا منتظم اور روزی رساں ہے، اس مذہب کو انسانوں میں نافذ کرنے کے لئے اللہ نے جس انسان کو منتخب کیا قدرتی طور پر اسے صفت عدل ومساوات سے متصف ہونا ازبس ضروری تھا، چنانچہ بلا کسی شبہ کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ عدل ومساوات میں آپؐ کا نہ کوئی ثانی ہوا ہے اور نہ ہوگا۔

جنگ بدر میں آپ کے چچا عباس گرفتار ہوکر آئے دیگر قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑا جا رہا تھا، بعض انصار نے کہا: اللہ کے رسول اگر آپ اجازت دیں تو عباس کا زر فدیہ معاف کردیا جائے، آپ نے فرمایا: بالکل نہیں! ایک درہم بھی معاف نہ کیا جائے۔ (بخاری)

ایک مخزومی عورت چوری میں پکڑی گئی، آپ سے تعلق خاص کی بنا پر لوگوں نے اسامہ بن زید کو سفارشی بنایا، آپ نے فرمایا اسامہ قانونِ خداوندی کے مقابلے میں سفارش کرتے ہو؟ لوگو! تم سے پہلے کی قومیں اسی بنا پر برباد ہوئیں کہ جب ان میں کوئی مقتدر آدمی جرم کرتا تو اسے معاف کر دیتے، اور معمولی آدمی جرم کرتا تو اسے سزا دیتے، بخدا اگر محمد کی بیٹی فاطمہ چوری کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹے جاتے۔ (بخاری)

خادمِ رسولؐ انسؓ کہتے ہیں: آپ میرے گھر تشریف لائے اور پانی طلب کیا، میں نے دودھ پیش کیا، مجلس میں آپؐ کے دائیں ایک بدو، بائیں حضرت ابوبکرؓ اور سامنے حضرت عمرؓ تھے، آپؐ کا دستور تھا کہ مجلس میں کوئی چیز دائیں سے تقسیم فرماتے، آپؐ پی چکے تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو عنایت فرمانے کا اشارہ کیا، آپؐ نے فرمایا: نہیں، دائیں والے کا حق ہے، چنانچہ بقیہ دودھ بدو کو عطا کیا۔ (بخاری

یہودیوں کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر تھے، ان میں آپس میں عدل و مساوات کے خلاف بہت قسم کے طریقے رائج تھے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ بنو نضیر کے کسی شخص کو اگر بنو قریظہ کا کوئی آدمی مار ڈالتا تو اس کے بدلے اس کی جان لے لی جاتی تھی، لیکن بنو نضیر کا کوئی آدمی بنو قریظہ کے کسی آدمی کو اگر مار ڈالتا تو اس کی جان کی قیمت سو اونٹ چھوہارا تھی، اسلام کے دور میں بنو قریظہ نے اس نوعیت کا مقدمہ آپؐ کی خدمت میں پیش کیا تو آپؐ نے تورات کے قانون "جان کے بدلے جان" کے مطابق دونوں میں قصاص کا حکم جاری فرمایا۔ (ابوداؤد)

عبداللہؓ بن سہل خیبر میں کھجور کی بٹائی کے لئے جا رہے تھے، ایک گلی میں کسی نے انہیں قتل کر کے لاش ایک گڈھے میں پھینک دی، ان کے چچازاد بھائی محیصہؓ نے آپ کے پاس مقدمہ پیش کیا، آپؐ نے ان سے قسم لینی چاہی، انہوں نے کہا میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے، آپؐ نے فرمایا: تو یہودیوں سے قسم لی جائے گی، محیصہ نے کہا ان کی قسم کا اعتبار نہیں ہے۔ آخر آپؐ نے بیت المال سے ان کے خون بہا کے سو اونٹ دلوائے اور عینی شہادت موجود نہ ہونے کی بنا پر یہودیوں سے قصاص نہیں لیا۔ (بخاری)

یہ ظاہر ہے کہ یہاں فیصلے کی زد میں ایک مسلمان صحابی ہے، اور یہ بھی واضح ہے کہ خیبر میں یہودیوں کے سوا کوئی دوسری قوم آباد ہی نہیں تھی اس لئے ان کے علاوہ قاتل کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن عینی شہادت کے اصول کے مطابق یہودیوں سے

آپ نے قصاص نہیں لیا۔ آپؐ نے فرمایا ہے :

اُنصُر اَخاکَ ظالماً کان اُومظلوماً — اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ ظالم ہو یا مظلوم

پوچھا گیا : مظلوم کی مدد کرنا تو واضح ہے، لیکن ظالم کی مدد کس طرح ؟ آپ نے فرمایا : اس طرح کہ اسے ظلم کرنے سے روکو۔

آج دنیا کا نعرہ ہے (MYNATION RIGHT OR WRONG) اپنی قوم کا ساتھ دو صحیح ہو یا غلط ، مربی نوجوانوں کو عصر حاضر کی بالادست اقوام کے دیگر اقوام کی نسبت سے ظالمانہ ، غیر منصفانہ اور غیر مساویانہ رویہ سے باخبر کر کے پیغمبر اسلام کے بے مثال عدل و مساوات پر فخر اور اس کی پیروی سکھائے۔

دشمن سے بدلہ لینا قانونی حق ہے ، لیکن طاقت رکھتے ہوئے معاف کر دینا اس سے بہتر ہے ، تمام روایات کا اتفاق ہے اور امّ المؤمنین حضرت عائشہؓ کی شہادت ہے کہ آپؐ نے ذاتی معاملے میں زندگی بھر کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ (بخاری، مسلم)

مکہ فتح ہوا تو وہ سارے دشمن آپ کی گرفت میں تھے جو برسہا برس سے اسلام کو بیخ و بُن سے اکھاڑنے کے درپے تھے، آپؐ کے ماننے والوں کی پیٹھوں پر کوڑے برسائے تھے، جنہوں نے آپؐ کے قتل کا متفقہ فیصلہ صادر کیا تھا، اور بارہا قاتل گھات میں لگائے تھے، جنہوں نے آپ پر اور آپؐ کے صحابہ پر مکہ کی سرزمین تنگ کر دی تھی اور کئی بار دو بدو تلواروں سے فیصلہ کرنے میدان کارزار میں اترے تھے، آپؐ نے ان سے پوچھا : آج تم کیا سوچتے ہو کہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ ہوگا ؟ انہوں نے کہا، آپؐ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کی اولاد ہیں، ہمیں اچھے ہی برتاؤ کی توقع ہے، آپؐ نے فرمایا : " لاتثریب علیکم الیوم إذھبوا وانتم الطلقاء ۔ آج تمہارے اوپر کوئی ملامت نہیں ہے، جاؤ تم سب کے سب آزاد ہو "۔

اسلام لانے سے پہلے ابوسفیان مسلمانوں سے جنگ کرنے میں فتح مکہ تک کی بیشتر لڑائیوں میں مشرکوں کے سپہ سالار تھے ، فتح مکہ کے روز جب حضرت عباس اپنی پناہ میں انہیں دربار نبوت کی طرف لے چلے تو حضرت عمرؓ نے اسلام دشمنی کے بدلے انھیں قتل کرنا چاہا، لیکن آنحضرتؐ نے روک دیا اور محبت سے پیش آئے، ان کے گھر کو امن کا گھر قرار دیتے ہوئے فرمان جاری کیا کہ ابوسفیان کے گھر میں جو داخل ہوگا اس سے کوئی تعرض نہ ہوگا ۔ (بخاری، مسلم)

خیبر کی ایک یہودی عورت نے آپؐ کے کھانے میں زہر ملا دیا ، کھاتے وقت جب اس کا اثر محسوس ہوا تو آپؐ نے یہودیوں سے پوچھا، ان لوگوں نے اقرار کر لیا ، اس زہر کا اثر اخیر وقت تک ظاہر ہوا کرتا تھا، لیکن آپؐ نے کسی سے کچھ نہیں کہا، البتہ زہر سے ایک صحابی کا انتقال ہو جانے کی وجہ سے یہودی عورت سے قصاص لیا ۔ (بخاری)

غزوۂ اُحد میں دشمنوں نے آپؐ کے دندانِ مبارک شہید کر دیئے اور پیشانیٔ مبارک خون آلود کر دی آپ پر تیر برسائے اور

تلواریں چلائیں، ان حملوں کے جواب میں آپ نے دعا فرمائی: اللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔ اے اللہ میری قوم کو ہدایت دے کہ یہ لوگ نہیں جانتے۔

زید بن سعنہ پہلے یہودی تھے، آپؐ نے ان سے کچھ قرض لیا، وقت سے پہلے وہ تقاضے کو آئے آپؐ کی چادر مبارک کھینچی اور الٹا سیدھا کہا، حضرت عمرؓ نے غصہ سے کہا تو رسول اللہ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، آپؐ نے مسکرا کر فرمایا: عمر اسے بتانا چاہئے تھا کہ نرمی سے تقاضا کرتا اور مجھ سے قرض کی ادائیگی کیلئے کہتے، آپؐ نے حضرت عمر سے فرمایا اس کا قرضہ چکا دو اور بیس صاع کھجور مزید دے دو۔ (بیہقی)

آپؐ کا حسن سلوک مسلمانوں کے علاوہ مشرکوں، نصرانیوں اور یہودیوں سے بہت اچھا تھا، آپؐ ان سے انسانیت شرافت اور رحم وعفو کا برتاؤ کرتے تھے، دشمنوں سے اچھا سلوک کرنا انسان کی عظمت کی دلیل ہے، اور اس پہلو سے آگے بڑھکر انسانیت نواز دنیا نے کبھی نہیں دیکھا، انسانیت نوازی اسلام کی فصل اگانے کے لئے بارش رحمت کی حیثیت رکھتی ہے، ہمارے نوجوانوں کو اس کی سب سے بہتر مثال آپؐ ہی کے اسوے میں مل سکتی ہے۔

اہل کتاب یہود ونصاریٰ کے ساتھ اسلام نے کھانے پینے، نکاح اور رہن سہن کی اجازت دی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ خصوصی سلوک فرماتے تھے، نجران کے عیسائیوں کا وفد جب مدینہ آیا تو آپ نے ان کی مہمان نوازی کی، مسجد نبوی میں ٹھہرا کر اپنے طور پر انھیں عبادت کی اجازت دی۔ (زاد المعاد)

چند یہودی آپؐ کی خدمت میں آئے، السلام علیکم کہنے کے بجائے السام علیکم (تم پر موت آئے) کے الفاظ استعمال کئے، حضرت عائشہ نے اس کا جواب بڑے غصے سے اور سختی سے دیا، آپؐ نے ان سے فرمایا: عائشہ سخت کلامی نہیں نرم کلامی اپناؤ، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی ہی کو پسند فرماتا ہے۔ (مسلم)

ابو بصرہ غفاری کہتے ہیں کہ بحالت کفر میں آپ کے یہاں مہمان ٹھہرا، اور شام کو بکریوں کا سب دودھ پی گیا آپؐ کے اہل بیت بھوکے سو رہے اور آپ نے کچھ بھی نہ کہا۔ (مسند احمد) لبید بن اعصم یہودی نے آپؐ پر جادو کر دیا، لیکن آپ نے اس سے کوئی انتقام نہیں لیا، حضرت عائشہ رضؓ کی خواہش تھی کہ اس کی تحقیق کی جائے لیکن آپ نے ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ (بخاری)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مثالی سیرت کے یہ صرف چند پہلو ہیں، اللہ تعالیٰ نے جس شخصیت کے "اسوۂ حسنہ" اور "عظیم اخلاق" کی گواہی دی ہے، قیامت تک ہر دور کی بہتری کے لئے یہ ایک لازمی ضرورت ہے، بے شبہ آپؐ ہی کا اسوہ ہے جس پر چل کر نوع انسانی اپنی مختلف پیچیدگیوں اور تباہیوں سے نجات پاسکتی ہے۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد آپ نے قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات مبارکہ کی تلاوت فرمائیں :

سبح للہ ما فی السمٰوات وما فی الارض وھو العزیز الحکیم، یاأیتھا الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون، کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون ۔ (الصف ۱-۳)

اس سورۃ کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا بیان ہے

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الأرضِ وَھُوَ العَزِیزُ الحَکِیمُ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا ابتدائی حصہ دعویٰ پر مبنی ہے ، اور اس کے دوسرے حصہ میں اس دعویٰ کی دلیل ہے ، دعویٰ یہ ہے کہ پوری کائنات ما فی السمٰوات وما فی الارض اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل بیان کرتی ہے ۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جسے سننے کے بعد اس کی شستگی اور اچھائی میں ذرہ برابر شک وشبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی ۔ لیکن جب ہم واقعات اس کے مخالف دیکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ بہت بڑا ہے ، مثلاً ہمارے پہلو میں کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتہلیل بیان نہیں کرتے ، اس ملک میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خدا تعالیٰ کی تقدیس کی بجائے خدا تعالیٰ کی اولاد کے قائل ہیں ۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ کے بارے میں ایسے نظریات رکھنا خدا کو گالی دینے کے مترادف ہے ، خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ انسان مجھے گالی دیتا ہے اور اسے یہ گالی نہیں دینی چاہیئے ۔ فرمایا: گالی اس طرح ہے کہ انسان دعویٰ کرتا ہے کہ خدا کی اولاد ہے ، ہمارے ملک میں ہمارے قانون کے ماتحت ایک گروہ موجود ہے جن کے بدولت شخصیاں

اور مشنریاں آباد ہیں، اور حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا گردانتے ہیں۔

قیام پاکستان سے قبل اس ملک میں ہندو بھی آباد تھے جو کئی لاکھ دیوتاؤں کی پرستش کے قائل ہیں، خدا تعالیٰ کی موجودگی میں کسی دوسرے خدا کا دعویٰ کرنا خدا تعالیٰ کی پاکیزگی نہیں، بلکہ یہ اللہ کے ساتھ دشمنی کے مترادف ہے۔ یہ لوگ تو غیر مسلم ہیں، جنہوں نے اسلام کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا۔ ہمارے ہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو مسلمان کہلانے کے بعد خدا تعالیٰ کے بارے میں ایسی زبان استعمال کرتے ہیں کہ الفاظ سنتے وقت دل کانپ جاتا ہے۔

میں سوجاؤں یا مصطفیٰ کہتے کہتے
حبیب خدا کو خدا کہتے کہتے

کیا یہ ایک مسلمان کی زبان ہے؟ اسی پر بس نہیں بلکہ جو شخص ان لوگوں کو ایسی شرکیہ زبان استعمال کرنے سے ٹوکتا ہے تو اسے "کافر" کہہ دیا جاتا ہے، اور ادھر یہ خدائی دعویٰ ہے کہ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی تسبیح سے گونجتی ہے۔

غور فرمائیے ہم لوگ توحید کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر جب ہم عملی زندگی میں اپنے آپ کو پرکھتے ہوئے اپنے اعمال کی پہچان کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم بھی اللہ کی مرضی کے خلاف چلتے ہوئے ایسی حرکتیں کرتے ہیں جو اللہ کو ناپسند ہیں، پھر اس آیت کا مطلب کیا ہوا؟

"سبح للہ ما فی السمٰوات وما فی الارض"

معنیٰ یہ ہے کہ خوشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس صرف مومن کرتے ہیں اور وہ لوگ جنہوں نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا پیشوا پیغمبر اور مقتدا تسلیم کیا، اور وہ خدا تعالیٰ کی صفات میں کسی قسم کی گندگی پیدا کئے بغیر اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جس سے اس کی شان بڑھے اور اس کے مقام کی رفعت دلوں میں پیدا ہو جائے اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خوشی کے ساتھ نہیں بلکہ مجبوراً ان کو خدا تعالیٰ کی پاکیزگی تسلیم کرنا پڑتی ہے، مثلاً: مسلمان عورتوں میں یہ خرابی عام ہے کہ ایک دوسری سے کہتی ہیں: "بہن میں فلاں جگہ گئی، فقیر کی رحم کی نظر ہو گئی ہے" اکثر مرد بھی ایسے الفاظ کہہ دیتے ہیں جبکہ ایسا کہنا خلاف شریعت ہے۔ ذرا سوچئے! جو بے چارہ خود فقیر ہو اس سے کچھ لینے کی امید کیسے کی جا سکتی ہے؟ کسی غنی اور بے نیاز سے اس لئے مانگو کہ وہ کچھ دے سکتا ہے۔

فقیروں سے کچھ لینے کی امید رکھنا محض انسان کی خام خیالی ہے، جب قدرت خداوندی اپنا فیصلہ کرتی ہے تو ساری دنیا میں خوار ہو کر ہم خالی ہاتھ گھر لوٹ آتے ہیں، رزق کی تلاش کرتے ہیں تو نہیں ملتا، بچہ بیمار ہے تو تندرست نہیں ہوتا۔

خاوند کو بیماری کی وجہ سے کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو صحت یاب نہیں ہوتا، پھر یہی کہا جاتا ہے "جی مالک کی مرضی یہی ہے
فقیروں کی چوکھٹ کا مزا چکھنے اور در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد جب تمام نظر کرم کرنے والے فقیر خدا کے سامنے بے بس اور
کمزور ثابت ہوتے ہیں تو پھر خدا یاد آتا ہے۔

دیا رنج بتوں نے تو خدا یاد آیا

اس کے بعد بخوشی نہیں بلکہ جبراً منہ سے نکلتا ہے۔ "خدا کی مرضی یہی ہے"۔

یہ الفاظ تو مسلمانوں نے جبراً کہہ دیئے لیکن وہ شخص جس نے حضرت موسیٰ کی موجودگی میں بہت جوش اور تکبر کے ساتھ
کہا تھا۔ "مَا عَلِمْتُ لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرِي، کہ میں نہیں سمجھتا کہ میرے علاوہ اس دنیا میں کوئی اور خدا ہے"۔ یہ کتنا
عظیم اور ذلیل دعویٰ تھا، لیکن جو کچھ اس کے ساتھ بیتی ۔ فرمایا:

وَلَقَدْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ مُوسَىٰ أَنْ أَسْرِ بِعِبَادِي فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيقًا فِي الْبَحْرِ يَبَسًا لَّا تَخَافُ
دَرَكًا وَلَا تَخْشَىٰ۔ (طٰہٰ ۷۷)

ہم نے موسیٰ کو حکم دیا کہ قانون اور خوشی کے ساتھ فرعون سے انصاف کی توقع مت رکھو، اب میرے بندوں کو لیکر
یہاں سے نکل جاؤ، دریا میں عصا کی چوٹ سے خشک راستہ بن جائے گا، تم بے خوف ہو کر نکل جانا، تمہارے لئے کوئی خطرہ
اور تباہی نہیں ہے، لہٰذا موسیٰ اپنے ساتھیوں سمیت نکل گئے۔

فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ
قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ۔ (طٰہٰ ۷۸-۸۹)

سرکش ظالم، بددیانت اور بے قانون انسان ایک مظلوم قوم کے تعاقب میں نکلا، غور فرمائیے کہ ایک آدمی دوڑ
کر نکل جائے تو فرعون کو شکر کرنا چاہیے تھا کہ ملک ایسے شخص سے خالی ہو گیا جس سے اس کو خطرہ تھا مگر ظلم اس طرح سر پر سوار ہوا
کہ وہ سمجھنے لگا کہ ان کو راستے میں ہی ذلیل کر کے ختم کر دونگا، چنانچہ ان کے تعاقب میں نکل بھاگا، فرمایا پھر اضل فرعون
قومہ وما ھدیٰ وہ لوگ یوں ہی تعاقب کرتے ہوئے پانی میں سے جہنم کی طرف دھکیل دیئے گئے۔

میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فرعون نے خدا کو کس طرح تسلیم کیا؟ جب پانی کی تند اور تیز لہروں کے نرغے میں آیا تو کہنے
لگا کہ میں اس خدا کو مانتا ہوں جس خدا کی دعوت موسیٰ اور بنی اسرائیل دیتے تھے۔ فرمایا: تجھے اب خدا یاد آیا ہے! اس سے پہلے
کیا کرتے رہے؟

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الارض ۔

مؤمن نے تو دل کی خوشی، خشوع، سکون قلب اور عقیدت کے ساتھ " اللہ " کہہ دیا کہ اس کی ذات پاک اور صفات کامل ہیں، مگر منافق اور مشرک نے آخری لمحے پر پہنچ کر اقرار کیا کہ " مالک کی مرضی " جیساکہ اکبرالکافرین (فرعون) نے بھی آخری لمحات میں خداتعالیٰ کی تسبیح وتقدیس کا اعتراف کیا ۔ فرمایا :

فالیوم ننجیك ببدنك لتكون لمن خلفك آیة (یونس ۹۲)

تمہاری لاش تیرتی ہوئی نظر آئے گی اور لوگ دیکھیں گے کہ خدا مارا گیا ہے، فرعون کے بارے میں خداتعالیٰ کو یہ بات کہنے کی ضرورت محسوس کیوں ہوئی ؟ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دنیا میں مشرک سے زیادہ بے وقوف اور احمق کوئی نہیں ہوسکتا، اگر مرنے کے بعد فرعون کی لاش تیرتی ہوئی نظر آتی تو وہ کہہ دیتے کہ " سرکار ابھی زندہ ہیں کہیں تیر کر نکل گئے ہونگے " لاش پانی میں بیٹھ بھی سکتی تھی مگر فرمایا کہ تمہاری لاش پانی کے سطح پر تیرتی ہوئی نظر آئے گی، ایک کنارے موسیٰ اور بنی اسرائیل دیکھیں گے کہ یہ ظالم کی لاش ہے اور دوسرے کنارے پر اس کے درباری دیکھیں گے کہ " خدا " بہتا ہوا جا رہا ہے ۔

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الارض ۔

اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کا تذکرہ آیا مگر اس وقت جب پانی سر تک پہنچ چکا تھا، یہ تو دعویٰ تھا آگے فرمایا :

وھو العزیز الحکیم کہ یہ پاکیزگی ہونی چاہئے تھی ۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اس کی پاکیزگی کے ۲ وصفات ہیں، العزیز اور الحکیم ۔ یہ دو صفات بمنزلہ دلیل کے آئی ہیں ۔

العزیز : بمعنی غالب ۔ ایک غلبہ جبر و قہر کے ساتھ اور دوسرا عزت واحترام کا غلبہ ہوتا ہے مگر ذات حق کا غلبہ جبر و قہر، سختی اور تشدد کے علاوہ احساس مروت کا بھی حامل ہے، جس طرح باپ اپنے بیٹے پر غالب ہے، یہ غلبہ اس لئے نہیں کہ باپ بیٹے کو تھپڑ مار سکتا ہے، بلکہ باپ کی محبت اور عزت بیٹے کے دل میں اس بناء پر ہے کہ اس کے لئے دنیا میں باپ سے زیادہ مہربان کوئی نہیں، اس طرح پیغمبر اپنی امت پر غالب ہے کہ وہ اپنی امت کا خیراندیش ہے، خداتعالیٰ بہت عظیم ہے، اور اس کی عزت اس بناء پر ہے کہ اس نے دنیا کی ربوبیت کا ذمہ لے کر پوری کائنات کو اپنے احسان کا ممنون فرمادیا ہے، پھر اس کی عزت نہ کی جائے تو کیا کیا جائے ؟

الحکیم : بمعنی حکمت والا ۔ حکمت کا کیا معنی ہے ؟

من ینظر فی عواقب الأمور حکیم وہ ہے جو کام کرنے سے پہلے اس کا انجام سوچ لے ۔ فرمایا: خداتعالیٰ نے

اس کائنات کو یونہی بے ڈھنگے طریقے اور بغیر سوچ بچار کے نہیں بنایا بلکہ ہر چیز کے بارے میں سوچنے کے بعد اس کے انجام کا فیصلہ کر کے تخلیق کیا ہے۔

جس ذات بابرکات کی دو صفات العزیز اور الحکیم ہوں تو اس کا دعویٰ تسبیح و تقدیس بالکل بجا ہے، اور واقعی اس کی پاکیزگی زمینوں اور آسمانوں میں بیان ہونی چاہئے، یہ ابتدائی بات ایمان اور عقیدے کی پختگی کی بنیاد ہے اور اس بات کی تشہیر خدا تعالیٰ نے دنیا میں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت کروائی، اس دعویٰ اور دلیل کے بعد اصل مسئلہ یہ ہے۔

یاایھا الذین آمنوا لم تقولون مالا تفعلون

کہ اس عزیز و حکیم خدا کی مخلوق کیسی حالت میں گذر اوقات کر رہی ہے؟ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں مبعوث فرمائے گئے، تو اس وقت لوگ چار اہم گروہوں میں منقسم تھے۔

پہلا گروہ:

یہ مشرک اور بت پرستوں کا گروہ تھا، وہ اپنے بزرگوں کی مورتیاں خود تراشنے کے بعد ان کی پوجا کرتے تھے، بعینہ اس وقت ہماری حالت ہے کہ جب ہمارا کوئی بزرگ فوت ہو جاتا ہے تو اس وقت ہمیں ان کا بہت زیادہ احساس ہوتا ہے اور یہ سوچتے ہیں کہ حضرت مرحوم بہت نیک اور پہنچے ہوئے بزرگ تھے، اب اٹھ نہیں سکتے، پانی منگواؤ تاکہ انہیں غسل دیا جائے گرم پانی میں بیری پتوں کی آمیزش کرتے ہیں اور بزرگ کو نہلانے سے پہلے پانی کو دیکھتے ہیں کہ پانی زیادہ گرم نہیں ہونا چاہئے ہمیں علم ہے کہ شاہ صاحب اس پوزیشن میں نہیں ہیں جو خود بتلا سکیں کہ پانی زیادہ گرم ہے، نہلانے اور کفنانے کے بعد بزرگ کو چارپائی پر لٹا دیا جاتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ حضرت صاحب زندگی کی منزلیں طے کر کے موت کی وادیوں میں پہنچ چکے ہیں، اب ان کے ہوش و حواس، چلنے، پھرنے، بولنے، سوچنے، برداشت کرنے اور محسوس کرنے کی توانائیاں مفلوج ہو گئی ہیں، لہٰذا حضرت جی کی میت کو لحد میں رکھ دیا گیا، پھر پھٹے رکھنے کے بعد مٹی ڈالنے سے پہلے ہم کہتے ہیں، "یہ سوراخ بند کر دو، وہ سوراخ بند کر دو" حالانکہ یہ کہنے کی ضرورت نہیں، نظر کرم کرنے والے بزرگ کو خود بولنا چاہئے کہ مجھے اس طرف سے سردی لگتی ہے یہ راستہ بند کر دو، ہم جانتے ہیں کہ سرکار جی اس جہان فانی سے کوچ کر چکے ہیں، ان کے لئے سردی اور گرمی کی منزل ختم ہو گئی ہے اور اب یہ وہ منزل ہے جہاں ان کے بس میں کچھ نہیں اپنے ہاتھوں مٹی ڈالتے ہیں اور روتے بھی ہیں کہ اب حضرت دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے، چنانچہ حضرت کو اللہ کے سپرد کر کے گھر آجاتے ہیں، اگلے روز معماروں کو حکم دیا جاتا ہے

کہ روضہ شریف کی تعمیر شروع کرو، سارا میٹریل لوگ خود خرید کر اکٹھا کرتے ہیں اور تعمیر کے مراحل طے کرتے کرتے گنبد نما روضہ بنا دیا جاتا ہے، اور وہ مدفون شاہ صاحب لڑکیوں اور لڑکوں کے خزانے سے مالا مال ہوجاتے ہیں۔ جس جنس کی ضرورت ہو مانگ لی جاتی ہے، حالانکہ شاہ صاحب کو نہلا اور کفنا کر لوگوں کے کندھوں کے سہارے قبرستان میں پہنچایا، کیا کوئی سمجھدار آدمی یہ قیاس آرائی کرسکتا ہے کہ اب شاہ صاحب نے لڑکیوں اور لڑکوں کا سٹاک کرلیا ہوگا ایسا جنون اور کفر ہے جو پہلے کافروں نے کیا تھا اور آج مسلمان اسے دہرا رہے ہیں۔

ایک طرف اقرار کیا جارہا ہے لا الٰہ الا اللہ کوئی معبود نہیں سوائے اس ذات حق کے، اور دوسری طرف یہ عمل ہے کہ وہ بزرگ جس کی موت کے بعد تکفین و تدفین کے لوازمات کا ذمہ لوگوں نے اٹھایا اور لوگوں نے یہ بھاگ دوڑ کرکے اس بزرگ کا روضہ تعمیر کرایا جب کہ شاہ صاحب ان امور کی تکمیل کے لئے ذرہ برابر حصہ لینے سے قاصر رہے۔ اب اسی شاہ صاحب سے لڑکیاں اور لڑکے مانگ کر اپنی گود ہری کرنے کی توقع رکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی مراد بھی اسی شاہ صاحب سے مانگی جاتی ہے۔ فرمایا:

" لِمَ تقولون ما لا تفعلون "

یا تم لوگ لا الٰہ الا اللہ کہنا چھوڑ دو، دو راہوں پر کیوں چلے جارہے ہو؟ صرف اور صرف توحید کا راستہ اختیار کرو، چنانچہ اس وقت ایک بت پرستوں کا گروہ موجود تھا جو خود پتھروں سے بت تراشتے اور ان کی پرستش کرتے تھے۔

دوسرا گروہ:

ان لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ ان بتوں کی حقیقت کچھ نہیں مگر مسیحؑ اللہ کا بیٹا ہے اور مریم خدا کی بیوی۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

تیسرا گروہ:

(یہود کا گروہ) ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ان بتوں کی حقیقت کچھ نہیں مگر عزیرؑ اللہ ہے نعوذ باللہ من ذٰلک۔

چوتھا گروہ:

ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ خواہ مخواہ مولویوں نے جھگڑا ڈالا ہوا ہے۔ اتفاق و اتحاد سے رہو، اور ہر گروہ کی کوئی بھی بات مان لو، ان لوگوں کو حلال و حرام کی کوئی تمیز نہ تھی اور کہتے تھے کہ حلال و حرام فضول بات ہے، جو مرضی کھاؤ اور پیو سب کچھ جائز ہے۔

ان چار گردوں کی موجودگی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مذہبوں کی منڈی میں مبعوث فرمائے گئے تھے زندگی کے اس سفر میں ایک مسافر حق آواز بلند کرتا ہے ۔ لا الٰہ الا اللہ کہ معبود صرف ایک ہے اور وہ میرے رب کی ذات ہے ۔ ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے :

اجعل الآلہۃ الٰہا واحدا ان ھٰذا لشیٌٔ عُجاب ، ما سمعنا بھٰذا فی الملۃ الآخرۃ ان ھٰذا الا اختلاق

(ص ۵-۷)

کہنے لگے کہ یہ تو نیا مذہب ہے ، اس سے قبل ہم نے اپنے باپ دادا سے کبھی ایسی بات نہیں سنی کہ اللہ ایک ہے ، بھلا ایک معبود ہر کام کیسے کر سکتا ہے ؟ اس خرابی کے باوجود انجیل اور توراۃ اپنی کسی نہ کسی صورت میں موجود تھیں ، فقیر ، مولوی ، پادری راہب اور رات کو عبادت کرنے والے لوگ بھی موجود تھے ، لیکن یہ مولوی اور راہب مذہب کو خدا اور مخلوق کے درمیان ایک رابطہ سمجھ کر نہیں بلکہ مذہب کو اس لئے تسلیم کرتے تھے کہ جس طرح کپڑا فروش دوکان پر کپڑا فروخت کر کے روزی کماتا ہے اس طرح ہم نے بھی مسجد میں وعظ بیچ کر پیٹ پوجا کا انتظام کرنا ہے یعنی تورات اور انجیل پڑھنے والے مولوی اور راہب نے کتاب اللہ کو اللہ کی راہ بنانے کی بجائے دوکان کا سامان بنا رکھا تھا ۔ قرآن پاک نے بہت واضح شکوہ کیا ہے ان کثیرا من الاحبا والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ۔ (توبہ ۳۴)

فرمایا کہ ان ملاؤں اور فقیروں نے جھوٹ بول بول کر لوگوں سے روپیہ پیسہ چھیننے کے لئے اڈے بنائے ہوئے ہیں ۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ماحول کو بنظر غائر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ اپنے مذاہب کو اپنی اپنی دکانداری چمکانے کے لئے استعمال کر رہے ہیں ، فرمایا : لم تقولون ما لا تفعلون ، کبر مقتا عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون ۔

مذہب دوکان نہیں ہے یہاں دل زبان اور عمل ایک ہی خط مستقیم میں آنے چاہئیں ، جو کچھ دل میں یقین کے ساتھ زبان سے نکلے ہاتھ اور پاؤں اس کی تابعداری کریں ۔ اگر میں محراب میں کھڑے ہو کر امامت کراؤں اور میرے دل میں یہ خیال ہو کہ کس کس طریقے سے لوگوں کو دھوکہ دے کر پیسے بٹور سکتا ہوں ، اگر یہی ذہن ہے تو پھر ایسی ہی امت کے لئے کہا گیا ہے ، لم تقولون ما لا تفعلون ۔ اور یہ آیت عام لوگوں کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ آیت میرے اور میرے ان دوستوں پہ صادق آتی ہے جو برسر منبر لوگوں سے خطاب کرتے ہیں ۔

للٰہیت ، تقویٰ ، اور پرہیزگاری خدا کی طرف راہنمائی ، ترک دنیا اور دنیاوی خواہشات سے بیزاری کا درس دیتے ہیں

جب کہ خود سرتاپا دنیا داری میں مگن رہتے ہیں۔ عامۃ المسلمین تو ہماری باتیں سننے کے عادی ہیں، خود کچھ نہیں کہتے اس لئے میری دانست کے مطابق اس آیت کو اولاً علمائے کرام کی طرف منسوب کیا گیا ہے، عوام کے لئے بھی یہ آیت صادق آتی ہے کیونکہ لوگوں کو بھی اس کی ضرورت ہے، عقیدے کے مطابق ان کو عمل کرنا چاہئے اس لئے عوام اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں مگر اس آیت مبارکہ کا اصل تعلق اہل علم کے ساتھ ہے، میرے جیسے بے عمل لوگوں کو دیکھ کر لوگ مسجد اس لئے آجاتے ہیں کہ ظاہری شکل وصورت اچھی ہے مسجد میں بیٹھتا ہے نیک پاک ہوگا۔ فاسق فاجر کا عیب دیکھ کر دل اتنا برا نہیں ہوتا جتنا ایک عالم کی برائی دیکھ کر گندہ ہوتا ہے، اس بنار پر اس آیت میں ہم جیسے لوگوں کو کہا گیا ہے کہ منبروں پر چڑھ کر جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ بدعملی اور بے عملی کیوں کرتے ہو؟۔

لِمَ تقولون ما لا تفعلون، کبر مقتا عند الله أن تقولوا ما لا تفعلون۔

ایک شخص زندگی اس طرح گذارتا ہے کہ وہ جو کہتا ہے اس کے مطابق عمل نہیں کرتا۔ ایسے شخص پر اللہ سب سے زیادہ ناراض ہوتا ہے۔ فرمایا: جو عالم اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا وہ بت پرستوں سے پہلے جہنم میں داخل کیا جائے گا، علم اور اس کے ساتھ عمل کرنا شرط ہے، محض زبان اور شکل وصورت کوئی چیز نہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی عدالت میں ایسے مجرم پیش کئے گئے جو شراب کی بھٹی کے مالک تھے اور وہاں شرابی شراب پی رہے تھے۔ انہی لوگوں میں سے ایک بزرگ بہت زیادہ خوش شکل اور نیک صورت بھی شامل تھا، تمام شرابیوں نے اس بزرگ کے تقویٰ کی شہادت دی کہ انہوں نے روزہ رکھا ہوا ہے اور انہوں نے شراب کو کبھی ہاتھ تک نہیں لگایا، ہم قصوروار ہیں کیونکہ ہم واقعی شراب پی رہے تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حکم دیا کہ ان شرابیوں کا فیصلہ بعد میں کیا جائے گا پہلے اس خبیث بزرگ کو سزا دی جائے کہ یہ وہاں کیا لینے گیا تھا؟ اگر عمل کی یہی کیفیت ہے کہ ایک مقام پر بیٹھ جائے جہاں بالکل حرام کاری ہو رہی ہے لیکن خود خاموش تماشائی بن کر بیٹھا رہے، ایسا روزہ اور عبادت محض دوکانداری اور دکھاوا ہے۔ عالم جسے صحیح عالم کہا جاتا ہے اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی زندگی ایک مستقل عمل ہے۔ حضرت رسول کریم نے جو جماعت تیار کی تھی اس میں اور یہودی علماء میں فرق ہی یہ تھا کہ وہ جو کچھ کہتے تھے اس پر عمل نہیں کرتے تھے جبکہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کے پاس جس قدر علم تھا وہ دوسروں تک پہنچاتے اور خود بھی عمل کی تصویر تھے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ علمائے دین کو اپنے علم کے مطابق عمل کرنے کی توفیق بخشے اور عامۃ المسلمین کو بھی زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اس میں ہر مسلمان کی فلاح ہے۔ (آمین) وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔ ـــ دوامعی پاکستان

تشہد میں انگلی سے اشارہ اور اس کی کیفیت

از افادات محدث عصر علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ متعنا اللہ بطول حیاتہ

امتیاز احمد سلفی

امام بیہقی نے فرمایا کہ اس بات کا احتمال ہے کہ انگلی کو حرکت دینے سے مراد اشارہ کرنا ہے نہ کہ بار بار ہلانا، تاکہ ابن زبیر کی روایت کے مطابق عمل ہو جائے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشہد میں بوقت دعا اپنی انگلی سے اشارہ کرتے نہ کہ اس کو حرکت دیتے، امام ابوداؤد نے اسے بسند صحیح روایت کیا ہے، اور امام نووی نے بھی اسے ذکر کیا ہے۔

علامہ البانی فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث کی سند صحیح نہیں اور احتمال مذکور بھی حدیث کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے اور اگر اس کی سند صحیح بھی مان لی جائے تو حدیث وائل کے ظاہری مفہوم کو برقرار رکھتے ہوئے ابن زبیر کی حدیث پر عمل ممکن ہے، اس تطبیق کی صورت یہ ہوگی کہ آپ کبھی حرکت دیتے اور کبھی حرکت نہیں دیتے، یا یہ کہا جائے کہ مثبت نافی پر مقدم ہے۔

امام ابن قیم نے اس حدیث کو زاد المعاد میں ضعیف قرار دیا ہے، اور میں نے (البانی) صفۃ الصلوٰۃ کی تخریج اور ضعیف ابوداؤد (۱۷۵) میں اس بابت ایسا دو ٹوک فیصلہ کیا ہے کہ اس کے ضعیف ہونے میں کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہ جاتا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

یہ حدیث محمد بن عجلان عن عامر بن عبداللہ بن زبیر کے طریق سے مروی ہے، ابن عجلان کے بارے میں کلام کیا گیا ہے، پھر اسی حدیث کو چار ثقہ راویوں نے بیان کیا ہے جس میں "لایحرکہا" کا اضافہ نہیں ہے، اسی طرح دو ثقہ راویوں نے عامر سے بھی اسے روایت کیا ہے لہٰذا اس اضافہ کا شاذ اور ضعیف ہونا ثابت ہو گیا، پھر اس کے ضعف کے لئے یہی کافی ہے کہ امام مسلم نے (۲/۹۰) میں بھی ابن عجلان کے طریق سے "لایحرکہا" کے بغیر اسے روایت کیا ہے، لیکن زاد المعاد کے محقق نے ان تمام باتوں سے چشم پوشی کی ہے، اور ظاہر سند دیکھتے ہوئے حسن کا حکم لگا دیا، اور شرح السنۃ (۳/۱۷۸) کی تعلیق میں اسے قوی قرار دیا، باوجودیکہ انہوں نے اس حدیث کے بعد وائل کی حدیث کو بیان کیا جس میں انگلی کو حرکت دینے کا ذکر ہے، اور اسے صحیح بھی قرار دیا، لیکن ان دونوں حدیثوں میں تطبیق دینے

سے اغماض کیا، گویا کہ انہیں فقاہت سے کوئی سروکار نہیں، اسی وجہ سے وہ تشہد میں اپنی انگلی کو نہیں ہلاتے ۔

اس موضوع سے متعلق مزید کچھ مفید باتیں ملاحظہ فرمائیں :

میں نے (البانی) ابھی جلد ہی شیخ غماری کو دیکھا کہ انہوں نے اپنی ایک تازہ ترین تصنیف بنام "الھدایۃ فی تخریج احادیث البدایۃ"، میں حضرت وائل کی حدیث کو ضعیف قرار دیا، اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ روایات میں تحریک اصبع کا لفظ راویوں کا تصرف ہے، کیونکہ اکثر روایات میں صرف اشارہ کا ذکر ملتا ہے تحریک کا نہیں ۔

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۸ھ میں آخری عمرہ کے سفر میں میرے قیام جدہ کے دوران ایک طالب علم نے سوڈانی رسالہ "مجلۃ الاستجابۃ" کی ایک فوٹو کاپی مجھے دکھائی، جس میں کسی یمنی طالب علم کا مقالہ " البشارۃ فی شذوذ تحریک الاصبع فی التشہد وثبوت الاشارۃ " (حالت تشہد میں انگلی سے اشارہ کے ثبوت اور تحریک والی روایت کے شاذ ہونے کی بشارت) کے موضوع پر تھا، جس میں طالب علم مذکور نے شیخ غماری ہی کے موقف کی تائید کی ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا، لیکن فرق اتنا ہے کہ انہوں نے بعض صحابہ سے اشارہ والی احادیث کی تخریج میں قدرے وسعت قلبی سے کام لیا ہے جن میں اکثر روایتیں عاصم بن کلیب عن ابیہ عن وائل کے طریق سے ہیں، اسی میں زائدہ بن قدامہ عن عاصم والی روایت بھی ہے جس میں انگلی ہلانے کی صراحت ہے، اس کی تخریج میں طالب علم مذکور نے محولہ مصادر کے اجزاء اور صفحات بیان کرنے میں بڑی محنت اور جانفشانی دکھلائی، جس پر اللہ تعالیٰ سے ان کے لئے اجر و ثواب کی امید کی جاتی ہے ۔

یوں تو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے لیکن میرے اپنے خیال کے مطابق اس روایت میں جس کے اندر تحریک اصبع کی صراحت ہے، زائدہ بن قدامہ کے منفرد ہونے کی وجہ سے کسی طرح شاذ کا حکم مندرجہ ذیل اسباب کی روشنی میں نہیں لگایا جا سکتا ۔

۱۔ علماء نے ان روایات کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے قبول کیا ہے، حتی کہ جن لوگوں کا عمل اس کے خلاف ہے جیسے امام بیہقی اور نووی وغیرہ انہیں بھی اس کی صحت پر کوئی اعتراض نہیں ہے، اور تمام لوگوں نے اس کی تاویل و تفسیر پر اتفاق کیا ہے، چاہے ان کا تعلق ان لوگوں سے ہے جنہوں نے حدیث کی صحت کی صراحت کی ہے، یا ان لوگوں سے جنہوں نے اس کو تسلیم کیا ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ تاویل صحیح کی ایک قسم ہے (یعنی کسی بھی حدیث کی تاویل و توجیہ کا معنی یہ ہوا کہ وہ حدیث صحیح ہے) ۔

اگر یہ بات نہ ہوتی تو امام بیہقی کو تحریک والی روایت کی تاویل اشارہ سے کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی،

بلکہ یمنی بھائی کی طرح اس روایت کو شاذ کہہ کر معلول قرار دیتے

خصوصاً امام بیہقی کو ابن زبیر کی حدیث جس میں عدم تحریک کی وضاحت ہے، تاویل نہیں کرنی پڑتی جبکہ خود یمنی نے حدیث ابن زبیر کو

شاذ قرار دیا ہے، اور اس کا شاذ ہی ہونا صحیح ہے، اب رہا معاملہ زائدہ بن قدامہ کی روایت کا جس میں تحریک کی وضاحت ہے، تو وہ ان روایات کے معارض ہے جن میں صرف اشارہ کی صراحت ہے تو اس کا جواب عنقریب آرہا ہے۔

۲۔ جن روایات میں سبابہ کے ذریعہ اشارہ کی صراحت ہے وہ نفی تحریک کے لئے نص نہیں، کیونکہ یہ بات معلوم ہے کہ لغوی اعتبار سے اشارہ کا معنی بیشتر اوقات تحریک کے ساتھ پایا جاتا ہے (اشارہ سے حرکت کا معنی بھی سمجھا جاتا ہے)، جیسے کوئی شخص اپنے سے بعید شخص کو قریب بلانے کا اشارہ کرے، یا چند لوگوں کو جو کھڑے ہیں بیٹھنے کا اشارہ کرے تو اس سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اس شخص نے اپنا ہاتھ نہیں ہلایا ہوگا، ہم دور کیوں جائیں اس کی بہترین مثال حضرت عائشہ کی وہ حدیث ہے جس میں صحابہ کرام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بحالت قیام نماز میں تھے، اور آپ بیٹھے ہوئے تھے تو صحابہ کو بھی بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ (ارواء الغلیل ۲/۱۱۹) اس سے ہر صاحب عقل سمجھ سکتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا محض اپنے ہاتھ کو اٹھانا نہیں تھا، جیسا کہ آپ انصار کے سلام کا جواب بحالت نماز دیا کرتے تھے، بلکہ حرکت کو بھی شامل ہے، لہذا ہمیں اشارہ والی روایت کو حرکت والی روایت کے منافی نہیں بلکہ اس کے موافق تصور کرنا چاہئے، میرے خیال سے جن لوگوں نے "یحرکہا" والی روایت کو صحیح تسلیم کیا، اسے قابل عمل سمجھا، یا سمجھتے ہوئے شاذ کا حکم لگانے کے بجائے تاویل کی ان کے نزدیک یہی بات ملحوظ رہی ہوگی۔

ہمارے اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبۂ جمعہ کے دوران انگلی سے اشارہ ثابت اور صحیح ہے جیسا کہ امام مسلم وغیرہ نے روایت کیا اور ارواء الغلیل (۳/۷۷) میں بھی اس حدیث کی تخریج کی گئی ہے، بحالت خطبہ آپ کے اس عمل سے اسی بات کی طرف خیال جاتا ہے کہ انگلی کی حرکت سے وحدانیت اور توحید کی طرف اشارہ مقصود تھا، محض اشارہ سے جبکہ حرکت مراد نہ ہو یہ مفہوم نہیں سمجھا جا سکتا۔

ہمارے اس دعوے کی تصدیق صحیح ابن خزیمہ (۲/۳۵۱) کی روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں حدیث عمارہ کی طرح سہل بن سعد بوجہ سے قدرے ضعف ہے، اس میں یہ الفاظ ہیں "واشار باصبعہ السبابۃ یحرکہا" آپ سبابہ سے حرکت دیتے ہوئے اشارہ فرماتے۔

امام ابن خزیمہ نے اس مفہوم کا ایک باب بھی باندھا ہے۔ "باب اشارۃ الخاطب بالسبابۃ علی المنبر عند الدعاء فی الخطبۃ وتحریکہ إیاھا عند الاشارۃ بہا" باب ہے خطیب کا دوران خطبہ دعاء کے وقت منبر پر سبابہ کے ذریعہ اشارہ کرنے کا اور اس کو اشارہ کے وقت ہلاتے رہنے کا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تسبیح والی انگلی کے ذریعہ اشارہ، حرکت دینے کے منافی نہیں بلکہ دونوں ہی یکساں ہیں، لہذا انگلی سے اشارہ

اور حرکت دینے کے مابین اختلاف پیدا کرنا لغوی اور فقہی اعتبار سے غیر مناسب ہے۔

اس سے آپ کو شیخ یمنی کے غلطی پر ہونے کی بات بھی معلوم ہو گئی ہو گی جو اشارہ کو تحریک کے منافی قرار دینے پر بضد ہیں، چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث جس میں یہ وارد ہے "لھی اشد علی الشیطان من الحدید" کہ سبابہ کے ذریعہ اشارہ کرنا شیطان کے حق میں لوہے سے بھی زیادہ سخت ہے۔

اس حدیث کی بابت وہ کہتے ہیں کہ اس میں تحریک کا کوئی ذکر نہیں، گویا ہمارا یہ دعویٰ ہوا کہ ابن عمر سے زیادہ بہتر طریقہ سے ہم ہی حدیث کو سمجھتے ہیں کیونکہ حضرت نافع نے ابن عمر کی نماز کی کیفیت بیان کرتے وقت تحریک کے بجائے اشارہ کا ذکر کیا ہے۔

ہمارا جواب یہ ہوگا کہ ابن عمر کی حدیث میں سبابہ کے ہلانے یا نہ ہلانے کی کوئی بات مذکور نہیں، درحقیقت ان دونوں صورتوں کا احتمال اس میں موجود ہے، اور یہی صحیح بات ہے، اللہ تعالیٰ انصاف کو پسند فرماتا ہے، لہذا ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک صورت پر محمول کرنے کے لئے دلیل کی ضرورت ہوگی، اور وہ دلیل ہمارے ساتھ ہے جیسا کہ بیان کیا گیا۔ ہاں اگر ابن عمر رضی اللہ عنہ سے کوئی صراحت ہوتی کہ وہ سبابہ کو ہلاتے نہیں تھے، تو اس بناء پر شیخ یمنی کے قول کو راجح قرار دیا جاتا (لیکن ایسی کوئی وضاحت ان کی حدیث میں نہیں)۔

۳۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ابن عمر یا کسی دوسرے راوی سے عدم تحریک کی صراحت ہے تو یہ دو حال سے خالی نہیں، تحریک یا عدم تحریک۔ جیسا کہ صنعانی نے سبل السلام (۱/۲۹۰-۲۹۱) میں اختیار کیا، اگرچہ میرے نزدیک سبابہ کا ہلانا ہی فقہی نقطہ نظر (مثبت نافی پر مقدم ہے) سے زیادہ راجح ہے، اور اس لئے بھی کہ حضرت وائل رضی اللہ عنہ کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت نماز، خاص طریقہ سے حالت تشہد میں آپ کے بیٹھنے کی نوعیت (اور اس دوران تمام حرکات و سکنات) کو بیان کرنا ان کی خصوصی توجہ کی بنیاد پر ہے، چنانچہ حضرت وائل روایت کرتے ہیں:

قلت لأنظرن الى رسول الله صلى الله عليه وسلم كيف يصلى ... ؟ الحديث۔ یعنی میں بنظر غائر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھوں گا کہ آپ کیسے نماز ادا فرماتے ہیں، پھر آگے بیان فرماتے ہیں: آپ نے قعدہ کیا اور اپنے بائیں پاؤں کو بچھایا اور اپنی بائیں ہتھیلی کو اپنی بائیں ران اور گھٹنے پر رکھا، اور اپنی داہنی کہنی کو داہنی ران پر رکھا اور دو انگلیوں کو ایک دائرہ کی شکل بنالی، پھر کلمہ کی انگلی کو اٹھایا، میں نے دیکھا کہ آپ اسے ہلاتے تھے اور التحیات پڑھتے جاتے تھے، پھر میں موسم سرما میں آیا اور لوگوں کو کپڑے میں لپٹے دیکھا کہ لوگ اپنے ہاتھوں کو ٹھنڈک کی وجہ سے کپڑے کے نیچے سے ہلاتے تھے، اسے امام احمد وغیرہ نے روایت کیا، اور ارواء الغلیل میں بھی یہ حدیث گذر چکی جیسا کہ بیان کیا جاچکا۔

حضرت وائل اس حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تشہد کی دقیق کیفیت کو بیان کرنے میں بلحاظ چند امور دیگر صحابہ (جن سے

نماز کی کیفیت مروی ہے، سے منفرد ہیں جو حسب ذیل ہیں :

۱۔ ران پر کہنی کو رکھنا

۲۔ دو انگلیوں کا ملانا، انگوٹھے اور بیچ کی انگلی سے حلقہ بنانا

۳۔ آخر تشہد تک برابر ہلانا

۴۔ شہادت کی انگلی کو اٹھانا اور اسے ہلاتے رہنا

۵۔ موسم سرما میں کپڑوں کے نیچے سے ہاتھوں کو ہلانا

میں کہوں گا کہ مذکورہ حدیث میں عاصم بن کلیب سے روایت کرنے والے تمام راویوں کے علاوہ محض زائدہ بن قدامہ کے منفرد ہونے کی وجہ سے سبابہ کے ہلانے کی تردید کرنا سخت غلطی ہے اور ایسا دو سبب سے ہے :

۱۔ ان تمام لوگوں نے اشارہ کا ذکر کیا جو تحریک کے منافی نہیں ۔

۲۔ زائدہ کا ثقہ ہونا اپنے شیوخ سے روایت کرنے میں اور کمال تثبت اور دقت برتنا ۔

زائدہ کی ثقاہت پر تمام ائمہ کا اجماع ، امام بخاری ، امام مسلم نے بھی ان سے روایت کیا ہے ، اس کے ساتھ ہی ابن حبان (۶ / ۳۴۰) میں ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے اور کہا کہ پختہ حافظے کے مالک تھے ، جب تک تکرار تبہ کوئی بات نہیں سن لیتے تھے اسے سمع سے تعبیر نہیں کرتے تھے ، اور کسی سے روایت بھی نہیں کرتے تھے ، حتی کہ ان کے متبع سنت ہونے کی کسی عادل شخص سے گواہی نہ حاصل کر لیتے ، امام دارقطنی نے کہا زائدہ اثبات میں سے تھے ۔

(ماخوذ از تمام المنۃ فی التعلیق علی فقہ السنۃ)

محدث محمد ناصر الدین البانی حفظہ اللہ

(ص ۲۱۷ — ۲۲۲)

حمدِ باری تعالیٰ

فضا ابن فیضی

بال جبریل ، نشانے کے لئے دیتا ہے
سیڑھیاں سدرہ پہ جانے کے لئے دیتا ہے

جذب ہیں اس میں کل آفاق ، نہ بُعد اور نہ قرب
فاصلے ، ربط بڑھانے کے لئے دیتا ہے

تنگ ہوتی ہے اگر ، ہم پہ ، مکاں کی دہلیز
لامکاں ، پانوٗ جمانے کے لئے دیتا ہے

فاش کرتا ہے وہ یوں ، نکتۂ "سیرُوا فی الارض"
آسماں ، خاک اڑانے کے لئے دیتا ہے

غرفۂ صبح میں رکھ دیتا ہے ، روز ، اک سورج
شام ، قندیل جلانے کے لئے دیتا ہے

سایہ دیتا ہے ، کہ دیوار کی تزئین کر دے
دھوپ ، آنگن میں بچھانے کے لئے دیتا ہے

ربِّ فطرت ہے ، سمجھتا ہے عناصر کا مزاج
بارشیں ، فصل اگانے کے لئے دیتا ہے

دردمند ایسا ، کہ پہلو میں کھلاتا ہے گلاب
خواب ، آنکھوں میں سجانے کے لئے دیتا ہے

پیاس لگتی ہے ، تو رکھ دیتا ہے ، لا کر ، دریا
بھوک ، لگتی ہے تو کھانے کے لئے دیتا ہے

جانتا ہے ، کہ ہے انسان خطا کا پُتلا
پیرہن ، عیب چھپانے کے لئے دیتا ہے

شعلہ کرتے ہیں کشید اس سے ، یہ ہم بھول گئے
وہ کنواں پیاس بجھانے کے لئے دیتا ہے

یہ جہاں باقی ، نہ یہ زندگی قائم دائم
راہ وہ آنے کی ، جانے کے لئے دیتا ہے

اس کی مٹھی میں ہے ، سرچشمہ توانائی کا
حوصلہ ، خون بہانے کے لئے دیتا ہے

کہنہ ہونے نہیں پاتے کبھی اقدارِ حیات
ایسے کردار ، زمانے کے لئے دیتا ہے

قصۂ مریمؑ و موسیٰؑ ہو ، کہ روداد خلیلؑ
تازہ عنوان فسانے کے لئے دیتا ہے

اک براہیمؑ ، مقابل میں ہزاروں نمرود
آگ ، وہ پھول کھلانے کے لئے دیتا ہے

سینہ ایلاف سفینہ ، نفس اقرأ آہنگ
ذہن ، حکمت کے خزانے کے لئے دیتا ہے

اس کے " قرآن " سے ، پیرایہ حرا کا بربط
اپنا پیغام ، سنانے کے لئے دیتا ہے

قرآن کا سچّا پیغام

تحریر / جناب خوشونت سنگھ
ترجمہ و تلخیص / اشفاق احمد سلفی، مسلم یونیورسٹی، علیگڈھ

خشونت سنگھ کا نام صحافتی دنیا میں محتاج تعارف نہیں، آپ ایک مایۂ ناز، بے باک اور باکمال صحافی، دانشور اور ادیب ہیں، مشہور انگریزی ہفتہ وار The Illustrated Weekly دی السٹریٹیڈ ویکلی کے ایڈیٹر رہ چکے ہیں، آپ نے مولانا آزاد کی تفسیر پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں سے ایک قدرے طویل مضمون قرآن کا سچا پیغام The Quran's Real Message کے عنوان سے انگریزی روزنامہ Indian Express کے Sunday Magazine میں مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۹۰ء کو شائع ہوا ہے۔ خشونت سنگھ لکھتے ہیں:

" مولانا آزاد کی قرآن پر غیر معمولی تفسیر قرآن کے اہم پیغام کو واضح کرتی ہے، وہ ہے خدا کی وحدانیت اور انسانی اخوت اسلامیات پر اس عظیم صحافی کے غائر مطالعہ کا اندازہ کیجئے۔

اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد جب لاکھوں مسلمانوں کو اپنا وطن چھوڑ کر پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا تو ہزاروں مسلمان ہندو سکھوں کے خلاف فسادات میں ذبح کیے جا رہے تھے، اور بہت سے مسلمان افواجی کیمپوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو رہے تھے، ایسے حالات میں مولانا ابوالکلام آزاد جو اپنی دور اندیشی کی بناء پر مذہبی بنیاد پر تقسیم ہند کے نتائج سے آگاہ تھے نے دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر حوصلہ شکن مسلمانوں کے ایک بہت بڑے ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔" تمہیں یاد نہیں کہ جب میں نے تمہیں یہ تمام چیزیں بتلانی چاہیں تو تم نے میری زبان کاٹ دی، جب میں نے قلم پکڑ کر لکھنا چاہا تو تم نے میرے ہاتھ کاٹ دیئے، میں نے سیدھی راہ دکھانے کی کوشش کی تو تم نے میرے پاؤں توڑ دیئے، جب میں نے واپس آنا چاہا تو تم نے میری کمر توڑ دی۔"

کلکتہ ۱۹۱۲ء جب مولانا آزاد نے اپنی صحافت اور سیاسی کیریئر کا آغاز کیا اس وقت سے مسلمانوں کے لئے ان کا پیغام

لگاتار جاری رہا، مسلمانوں کی اس بات پر انہوں نے زجر و توبیخ بھی کی کہ وہ اپنے آپ کو تحریک آزادی سے الگ رکھ کر غیر مسلموں کو آگے جانے کا موقع دے رہے ہیں، مسٹر جناح انھیں کانگریس کا "Show boy" کہتے تھے اور باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی اکثریت مسلم لیگ کے اس مطالبہ کی حامی تھی کہ ان کے لئے علیحدہ مملکت کا قیام ہو، مولانا آزاد نہایت یکسوئی سے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت کرتے رہے، یہاں تک کہ گاندھی جی نے بدرجۂ مجبوری اور پنڈت نہرو و سردار پٹیل نے تقسیم وطن کو تسلیم کر لیا ان تمام رہنماؤں کے درمیان مولانا آزاد آخر تک تن تنہا اس کی مخالفت میں ڈٹے رہے، اس اکیلے راستہ پر سفر کے لئے انہوں نے قوت کہاں سے حاصل کی؟ یہ حوصلہ کہاں سے پیدا ہوا جس کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو حق پر اور دوسروں کو غلط سمجھتے تھے، بلاشبہ یہ فیضان اور بلند ہمتی صرف ایک ہی وسیلہ سے آئی، اور وہ قرآن ہے۔

مولانا آزاد کو وراثتاً ایسے عقائد ملے تھے جو توہم پرستی اور پیری مریدی پر مبنی تھے لیکن خداداد ذہانت کی بناء پر انہوں نے اسے یکسر مسترد کر دیا اور حقیقی اسلام کو اختیار کیا، اپنی شروع زندگی ہی میں اس بات کے قائل تھے کہ یہ ہندوستانی مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ وہ استعماریت کے خلاف جدوجہد میں ہندؤں کے ساتھ شریک ہوں۔

۲۰ سال کی عمر سے پہلے ہی انہوں نے ایک ہفتہ وار الہلال کا اجراء کیا جس کے ۲۶۰۰۰ شمارے ہاتھوں ہاتھ ختم ہوگئے ان کے قوم پرست نظریئے نے حکومت کو ناراض کر دیا اور اخبار پر پابندی عائد کر دی گئی، آزاد نے ایک دوسرا اخبار البلاغ کے نام سے نکالا۔ ۱۹۱۶ء میں البلاغ ہی کے ایک شمارہ میں آپ نے اعلان کیا کہ قرآن پاک کے اردو ترجمہ کا آغاز ہو چکا ہے، پہلے تین سورہ یعنی آل عمران تک مکمل ہو چکا ہے اور یہ امید ظاہر کی تھی کہ اس سال کے اخیر تک پورا ترجمہ مکمل کر دیں گے، لیکن ایسا نہ ہونا تھا۔ ۳ر مارچ ۱۹۱۶ء ڈیفنس انڈیا ایکٹ کے تحت آپ کو گرفتار کر کے رانچی جیل میں ڈال دیا گیا، جہاں پر آپ نے سورۂ نساء کا ترجمہ مکمل کیا، گورنمنٹ کے ذریعہ آپ کے مسودات کئی مرتبہ ضبط کئے گئے اور واپس کئے گئے، ادھر آپ اپنا کام کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۱۸ء میں آپ نے اسے مکمل کیا، نومبر ۱۹۲۱ء میں کانگریس کو غیر قانونی قرار دیا گیا اور دو ماہ آپ کو حراست میں لے لیا گیا تیسری مرتبہ پھر آپ کے کاغذات ضبط کر لئے گئے، تقریباً ۱۵ر مہینے جیل میں گذارنے کے بعد جب رہا کئے گئے تو کاغذات ایسی حالت میں واپس کئے گئے کہ جگہ جگہ پھٹے ہوئے اور بوسیدہ تھے بعض اوراق تو ضائع ہو چکے تھے، مولانا نے اس وجہ سے ہمت کھو دیا اور بدقسمتی سے اس منصوبہ کو ترک کر دینا پڑا۔

پانچ سال بعد ۱۹۲۷ء میں اسے دوبارہ شروع کیا اور ۲۰ر جولائی ۱۹۳۰ء کو جب آپ میرٹھ جیل میں تھے ترجمہ اور تفسیر کا کام مکمل کر دیا، ترجمان القرآن کی تینوں جلدیں مولانا کے حوصلہ، ہمت اور جہد و استقلال کا آئینہ دار ہیں۔

کیونکہ یہ تعلیمات قرآنی کے خلاف ہے۔

ترجمان القرآن کے تینوں جلدوں میں سے پہلی جلد سورہ فاتحہ کے متعلق ہے جس کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ اس میں صرف سات آیتیں ہیں، اس سورۃ کا نام ام القرآن، الکافیہ اور الکنز وغیرہ بھی ہے، یہ قرآن کی سب سے زیادہ دہرائی جانے والی سورہ ہے جس کا تذکرہ ایک آیت میں ہے "ولقد آتیناك سبعا من المثانی والقرآن العظیم" اے پیغمبر ہم نے تمہیں قرآن عظیم اور بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں دی ہیں۔

پیغمبرؐ نے کبھی یہ دعوی نہیں کیا کہ وہ نیا مذہب پیش کر رہے ہیں بلکہ جو لوگ صراط مستقیم سے بھٹک گئے ہیں اور ایک خدا کی عبادت سے مکر کر آبا پرستی بت پرستی اور توحیت کو اختیار کر لیا ہے ان کو واپس سیدھے راستے پر لایا جائے، دنیا اور اس کی حیرت انگیز تخلیقات اللہ کے وجود کو چیخ چیخ کر پکار رہی ہیں، سکھوں کے Waheguru واہگرو ٹھیک یہی چیز ہے، رب کے معنے پالنے والا Provider الرزاق مطلب آقا۔

قرآن مجید کی شروعات اللہ تعالیٰ کے حمد سے ہوتی ہے، اللہ کے دو عظیم صفات الرحمن اور رحیم بسم اللہ الرحمن الرحیم میں مذکور ہیں، اس کے بعد یہ صفت رب العالمین سارے جہاں کو پالنے والا اور ساری چیزوں کو فراہم کرنے والا ہے۔

مولانا آزاد نے اس چیز کی نشاندہی کی ہے کہ زندگی کے لوازمات ہوا، پانی اور غذا اگانے کے لئے زمین یہ سب اللہ کی طرف سے وافر مقدار میں مفت عنایتیں ہیں، قرآن نے اسی پر زور دیتے ہوئے کہا ہے ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اسے زمین میں سمو دیا، ہم اسے واپس لینے پر بھی قادر ہیں، اسی کے ذریعہ ہم نے کھجور اور انگور کے باغات اگائے جس سے تم پھل حاصل کرتے ہو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: وہاں پر بہت سارے ذخیرے ہیں جس میں سے ایک اندازے سے ہم تمہیں دیتے ہیں۔ پیدائش نشو و نما زوال اور موت سب کچھ اسی کی طرف سے ہے جیسا کہ قرآن میں فرمایا یہ صرف اللہ ہی ہے جس نے تمہیں کمزور پیدا کیا، پھر طاقت بخشی، پھر طاقت سے کمزوری آئی اور بال پک گئے۔

آزاد نے مقصد تخلیق کے متعلق اسلامی اور ہندو نقطۂ نظر کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے، ہندو ازم کا یقین ہے کہ یہ دنیا خدا کا leela تفریح گاہ اور موہوم چیز ہے، اسلام تخلیق کا ایک مقصد بیان کرتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے، ہم نے انہیں ایک اہم مقصد کے لئے پیدا کیا ہے، مولانا آزاد وجود باری پر اپنے بحث میں دلائل فراہم کرتے ہیں کہ انسانی فطرت بمشکل اس بات پر یقین کرے گی کہ کوئی فعل بغیر کسی فاعل احکامات بغیر کسی فرماں روا کے منصوبہ بندی بغیر کسی منصوبہ ساز کے اور عمارت بغیر کسی معمار کے وجود میں آ سکتی ہے۔ بقول آزاد وجود باری تعالیٰ کے دلائل ہر جگہ ہر اس شخص کے لئے ہیں جو ذرا غور و فکر پر توجہ دے،

کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ ایک ایسی کتاب کے ترجمہ کا جذبہ کیونکر پیدا ہوا جس کے تراجم اردو انگریزی سمیت دنیا کی کئی زبانوں میں متعدد بار ہو چکے ہیں ؟ مولانا آزاد کو یقین تھا کہ قرآن کے جو تراجم موجود ہیں انہوں نے دُوراز کار معانی کو بیان کر کے قرآن کے اصلی پیغام سے چشم پوشی کی ہے ، یہ پیغام اتنے سادہ اور واضح تھے کہ عرب کے ان پڑھ عوام آسانی سے سمجھ لیتے تھے ، نبی اکرمؐ اور اہل بیت کے انتقال کے بعد جب اسلام غیر عرب اقوام میں پھیل گیا ، تو یونانی ایرانی اور بدھ ازم کے خیالات وحی کی تشریح و توضیح میں جگہ پانے لگے ۔ تفسیر بالرّای نے قرآن کے سادہ مفہوم کی شکل بگاڑ دی ۔ مولانا آزاد کے لئے یہی محرک تھا کہ قرآن کی تشریح قرآن ہی کے ذریعہ کی جائے " فذکر بالقرآن " جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس کے مشتق معانی سے بہت کم منحرف ہوتے تھے پوری کوشش ہوتی تھی کہ احادیث کے ذریعہ اپنی بات کی توضیح کریں ۔

چنانچہ جواں عمری ہی میں یورپی زبانوں میں بہت کم واقفیت کے باوجود مذہب یا فلسفہ پر جو کچھ مواد آپ کو ملتا بنظر وسیع مطالعہ کرتے ، آپ پر بہت سے علماء دین کا گہرا اثر پڑا ، سب سے پہلے امام غزالیؒ (بارہویں صدی) جو انہیں کی طرح صحیح مسلک اختیار کرنے سے پہلے بداعتقادی میں مبتلا تھے ، مولانا آزاد سرسید احمد خان بانی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے بھی بہت متاثر تھے ، اس کے بعد جمال الدین افغانی اور شاہ ولی اللہ دہلوی کا بھی آپ کے اوپر اثر پڑا جو مسلم ممالک کے درمیان عالمی اتحاد اسلامی کے علم بردار تھے ۔ لیکن مولانا نے مصر کے مصطفےٰ کمال کی طرح غیر مسلموں کے تعاون سے آزادی کے حصول کو اولیت دی اس سے پہلے آزاد نے ۱۹۱۲ء میں لکھا تھا کہ اکثریت و اقلیت کا انداز فکر تمام مسائل کی جڑ ہے ، اب دنیا کے ۸۰۰ ملین (۸۰ کروڑ) موحدین ہندوستان کے صرف ۲۲ کروڑ بت پرستوں سے خوفزدہ ہیں ۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ آزاد کے ہم عصر شاعر مشرق علامہ اقبالؒ جو اپنی قوم کے مستقبل کے تئیں کافی فکر مند تھے نے بھی آزاد ہی کی طرح اپنے تاثرات اسلامی ذرائع ہی سے حاصل کئے ، لیکن دونوں کے راستے قدرے مختلف تھے ، ۱۰-۱۹۰۵ء کے درمیان دونوں نے بیرونی ممالک کا سفر کیا ، علامہ اقبال یورپی ممالک گئے اور مغربی ثقافت سے کافی متاثر ہوئے ، اور عالم اسلام کے زوال سے کافی دل شکستہ ہو گئے جس کا اظہار انہوں نے اپنی مشہور نظم شکوہ میں کیا ہے ، مولانا آزاد نے مسلم ممالک کا سفر کیا جو یورپی استعماریت سے آزادی کے لئے جدوجہد میں مصروف تھے ، انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کو زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی (قرآن) کے ذریعہ پیغمبر کو وصیت کی ہے ، اسی جذبہ کو مسلمانوں میں عام کیا جائے ، اقبال اسلامی تاریخ سے فیضان حاصل کرتے تو آزاد قرآن اور حیات رسول سے ۔ اقبال اس نتیجہ پر پہونچے تھے کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ قوم ہے لہذا ان کی نجات علیحدہ ملک حاصل کر لینے ہی میں ہے جبکہ آزاد نے دو قومی نظریہ اور علیحدہ مسلم مملکت کے قیام کو یکسر مسترد کر دیا تھا

قرآن کی یہ آیت نقل کی ہے " فلینظر الانسان الی طعامہ ..... متاعا لکم ولانعامکم " انسان اپنے کھانے پر غور کرے ہم نے موسلا دھار بارش نازل کی، پھر زمین کو پھاڑا، پھر ہم نے اس میں اناج انگور، سبزیاں اور زیتون اور میوے اگائے، اسمیں تمہارے اور تمہارے چوپایوں کے لئے بہت فائدے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیوں پیدا کیا اور طرح طرح کے غذا سے نوازا؟، کیا یہ تمام چیزیں اور مخلوقات عالم جن کو قدرت نے اتنے طویل عرصے میں مزین اور سجا کر بنایا ہے، اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ روئے زمین پر چند لمحوں کے لئے کھائیں پئیں اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں ؟ ۔

کوئی یہ بھی سوال کرسکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ اتنا زیادہ قوی مہربان اور رحمدل ہے تو یہ مصائب اور آفات جیسے زلزلے، آتش فشاں اور سیلاب وغیرہ کیوں آتے ہیں جس سے بے انتہا معصوم جانیں ضائع ہو جاتی ہیں، قرآن ہمیں اس طرف بھی رہنمائی کرتا ہے کہ اچھی اور مفید چیزیں باقی رہ جاتی ہیں، مگر جھاگ وہ بہت جلد ختم ہو جاتا ہے اور جو فائدہ مند ہے زمین پر بچ جاتا ہے۔

قانون فطرت میں ہر چیز کا ایک وقت متعین ہے۔" اجل " قرآن یقین دلاتا ہے، سچ کی ہمیشہ جھوٹ پر فتح ہوتی ہے خدا کا نام الحق بھی ہے " سچی ذات " ہم سچائی کو جھوٹ پر غالب کر دیں گے، اس طرح باطل ختم ہو جائے گا۔

اس لئے جو لوگ گناہ کرتے ہیں ضروری نہیں کہ فوراً اس کا انھیں انتقام مل جائے فانی معکم من المتربصین ہم انتظار کرنے والوں کے ساتھ ہیں، آزاد کا یقین ہے کہ ندامت اور پشیمانی رحم کی قوت پیدا کرتا ہے، آنسو کا ہر قطرہ جو ندامت میں بہتا ہے معصیت کے داغ کو دھو دیتا ہے، خود نبی کریمؐ نے اس بات کی یقین دہانی کراتی ہے کہ جو پر خلوص توبہ کرتا ہے وہ اس طرح ہو جاتا ہے گویا اس نے گناہ کیا ہی نہیں، آزاد اس نصیحت کے قائل تھے کہ جسے مخلوق خدا کو معاف کرنا نہیں سیکھا وہ خدا سے اپنے معافی کی توقع کیسے رکھ سکتا ہے۔

یہ قابل غور بات ہے کہ مسیحیت کی طرح اسلام یہ نہیں کہتا کہ دشمنوں سے پیار کرو جو فطرت کے خلاف ہے بلکہ صرف انھیں معاف کرنے کو کہتا ہے، گناہ کرنے والے شخص سے نفرت نہ کرو بلکہ اس کے گناہ سے نفرت کرو، انتقام اور بدلے کو حق بجانب کہتا ہے لیکن اسے محدود بھی کرتا ہے تاکہ نقصان کا اندیشہ نہ رہے، عام خیال کے برعکس قرآن ہرگز یہ بات نہیں کہتا کہ مسلمان کافروں کے خلاف مستقل جنگ چھیڑ دیں، جنگ تو صرف ان لوگوں کے خلاف ہے جو مومنوں کو اذیت پہنچائیں یا قرآن اور رسول پر کیچڑ اچھالیں کیونکہ تشدد سے روکا گیا ہے، بہرکیف ہر شخص کو آزادی ہے جسے بہتر سمجھتا ہے اس پر یقین کرے" لکم دینکم ولی دین " لااکراہ فی الدین ۔

اللہ تعالیٰ کا ایک اہم وصف عدل ہے مالک یوم الدین یوم جزا کا مالک، قرآن یقین دلاتا ہے جو نیک کام

کرے گا وہ اس کے لئے ہے اور جو برا کام کرے گا وہ بھی اس کے لئے۔ اللہ تعالیٰ بندوں کے ساتھ ناانصافی نہیں کرے گا، سامنے انسان پہلے صرف ایک مذہب پر پیدا ہوئے ہیں، پھر مختلف ہو جاتے ہیں۔ آزاد کا یقین ہے کہ خدا کے سلسلے میں اسلامی نظریہ یہودی اور مسیحی خیال کے مقابل کہیں زیادہ بہتر اور معیاری ہے۔

یہودی کچھ منتخب لوگوں کے لئے ہر قبیلہ کا الگ خدا مانتے ہیں، عیسائیوں نے خدا کو انسان کے درجہ میں لا کھڑا کیا، اس طرح کہ عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ اللہ بہت سارے صفات کا مالک ہے خلق ربوبیت عدل رحمت وغیرہ صفات ہیں، اسی لئے پیغمبر علیہ السلام نے حتی المقدور کوشش کی کہ ان کے ساتھ خدا جیسا سلوک نہ کیا جانے لگے۔ آپ کے وفات کے بعد خلیفۂ اول نے مجمع میں اعلان کیا جو شخص محمدؐ کی عبادت کرتا تھا تو جان لو محمدؐ مر گئے ہیں اور جو خدا کی عبادت کرتا تھا تو جان لے کہ اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا، اس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔[1]

دنیا کا صرف یہی ایک قانون ہے کہ انسان ہدایت کی طرف پلٹے، تاکہ وہ ہم لوگوں کو سیدھے راستے کی جانب رہنمائی کرے، وہ راہ جس پر نیک اور خدا ترس لوگ چل رہے ہیں نہ کہ برے لوگوں کا راستہ۔

یہ ان کا اللہ کی وحدانیت اور بنی نوع انسان کے بھائی چارے پر پختہ عزم و یقین تھا جو قرآن میں ظاہر کئے گئے ہیں جس نے مولانا آزاد کے ذہن کو اس تصور سے موڑ دیا کہ مذہبی اختلافات کی بنیاد پر علیحدہ مملکت کی ضرورت ہے، تمہارے خود ساختہ نسلی امتیازات تمہارا وطن، تمہاری قومیت، اور زندگی کے تمہارے دائرہ کار اور حالات و کوائف اگر تم یہ سب صرف خدا کی خدمت کے لئے وقف کر دو تو یہ تمام چیزیں اپنی بے چینیاں ختم کر دیں گی، تمہارے قلوب متحد ہو جائیں گے، اور تم محسوس کرو گے کہ پورا کرۂ ارض تمہارا وطن ہے اور تمام نوع انسانی ایک آدمی ہیں اور تم سب مل کر ایک خاندان کی تشکیل دیتے ہو۔ --۰۰۰--

---

[1] خشونت سنگھ کے یہ تبصرے آج کے ان مسلمانوں کے لئے قابل عبرت ہیں جنہوں نے نبیؐ کو خدا کا درجہ دے رکھا ہے یہاں تک کہ اولیاء کے مزاروں پر بھی سجدہ وغیرہ کرنے سے گریز نہیں کرتے جو صرف اللہ کی صفت ہے، اسلام کے پیغام کتنے واضح ہیں کہ ایک غیر مسلم بآسانی اس نتیجہ پر پہونچ گیا کہ کسی پیغمبر کے ساتھ خدا جیسا برتاؤ کرنا خود اسلام اور قول پیغمبر کے خلاف ہے۔ (مترجم)

رُباعیات

بادۂ عرفاں

پروفیسر حفیظ بنارسی

(۱)
اوہام کی ظلمتوں سے بچ کر نکلو — گردوں پہ مثالِ مہ و اختر نکلو
یہ عالم پُر فضا تمہارا ہوگا — زندانِ "انا" سے پہلے باہر نکلو

(۲)
دامانِ ہوا، و حرص چھوڑ دیا رو! — تسلیم و رضا سے رشتہ جوڑ دیا رو
کیفیتِ لازوال اگر ہے مطلوب — پیمانۂ خواہشات توڑ دیا رو

(۳)
موسم یہ شباب کا گذر جائیگا — یہ خواب حسیں جلد بکھر جائیگا
کیوں اپنی جوانی پہ ہو مغرور بہت — دو روز میں دریا یہ اتر جائیگا

(۴)
بیشی و کمی کے لئے کیوں مرتے ہو — دو روزہ خوشی کے لئے کیوں مرتے ہو
عقبیٰ کی کرو فکر اگر عقل ہے کچھ — دنیائے دَنی کے لئے کیوں مرتے ہو

(۵)
جامِ مئے عرفان ہے اللہ کا ذکر — ذی قدر ہے ذی شان ہے اللہ کا ذکر
دل ذکرِ الٰہی میں لگا کر دیکھو — تسکین کا سامان ہے اللہ کا ذکر

(۶)
مطلوب نہیں مجھ کو زر و گوہر و مال — کیا ایسا کمال آئے جسے جلد زوال
کافی ہے یہی دولتِ بیدار مجھے — دے مجھکو خدا صدقِ مقال اکلِ حلال

(۷)
آسانی سے کٹ جائے گی راہ کلفت
پُر نور نظر آئے گی شامِ ظلمت
دو چیزوں کو مضبوطی سے پکڑے رہیئے
اللہ کی کتاب اور نبیؐ کی سنت

اجودھیا میں مندروں کے انہدام کے قصے

تاریخ جنہیں غلط ثابت کرتی ہے

اس تنازعہ میں کانگریس اور اس کی حکومت کا رول ہمیشہ قابل مذمت رہا

مشہور مورخ اور کالم نگار بھونیشوری پرتاپ کی تحریر

لال کرشن اڈوانی اور انکے لباب اپنے بالاخانوں سے یہ نعرہ لگاتے ہوئے تھکتے نہیں کہ ہندوستان محض اس وجہ سے ایک سیکولر ریاست ہے کہ یہاں کی اکثریت ہندو ہے جو کہ ہمیشہ سے انتہائی لبرل اور روادار رہے ہیں اگرچہ یہ بات تو بیشتر ہندوستانیوں کے تعلق سے بلالحاظ مذہب صحیح کہی جاسکتی ہے تاہم یہ بھی سچ ہے کہ آر ایس ایس اور وشو ہندو پریشد کے زیر اثر ہندوؤں کی ایک خوردبینی اقلیت سب سے زیادہ ناروادار اور جارح ہوگئی ہے۔ تاریخ کے اعتبار سے بھی بی جے پی کا دعوی بالکل غلط ہے۔ اگر بی جے پی اپنے مذہب کا نکتۂ آغاز ویدوں میں پاتی ہے تو پھر وہی وید، بالخصوص رگ وید لنگ پوجا کرنے والے دسیو، لوگوں کے قتل عام اور ان کے شہروں کی تاراجی کرنیوالے اندر کی مدح سرائی سے بھرے پڑے ہیں۔

معمہ دا ۱۹ویں صدی کے ویدک علماء کے لئے دسیو لوگوں کا قتل عام اور ان کی بستیوں کی تاراجی ایک معمہ بنی رہی۔ یہ پہیلی اس وقت حل ہوئی جبکہ اتفاقیہ طور پر موہن جو داڑو دریافت ہوا، جس کے نتیجہ میں کئی مقامات پر کئی موقعوں پر کھدائی کی گئی اور اس طرح سندھ گھاٹی کی عظیم تہذیب روشنی میں آئی۔ یہ تہذیب کئی پہلوؤں سے اپنی ہمعصر سمیری اور بابلی تہذیبوں سے مشابہ تھی، ان تہذیبوں کے طرز حیات اور ان کے مذہب کی بعض تعبیر اگرچہ بڑی حد تک ممکن ہے لیکن ان کی زبان، فلسفہ، حتی کہ ان کی نسل کے بارے میں بھی معلوم نہیں ہے۔ نسل انسانی کی تاریخ میں اس طرح کی عظیم شہری تہذیب کی ایسی مکمل تباہی اور کبھی نہیں ہوئی۔

رگ وید کے تقریباً ہر بھجن میں دسیو لوگوں کی مکمل نابودی کی غرض سے بستیوں کو تباہ کرنے والے اندر (المعروف بہ پھنڈ)

کی تعریف کرتے ہوئے جو کچھ بھی کہا گیا ہے آثار قدیمہ کے شواہد اس کی تائید کرتے ہیں ۔ سندھ گھاٹی کی تہذیب کے اکابر علماء میں سے ایک سر مورٹائمر وہیلر جو غالباً مارشل کے بعد سب سے زیادہ معتبر سند کا درجہ رکھتے ہیں ۔ کچھ ایسا ہی کہتے ہیں :

" آخر یہ قلعے کہاں ہیں ، یا تھے ۔ ابھی حالیہ دنوں تک یہ فرض کیا جاتا تھا کہ یہ سب ضمنیاتی افسانے ہیں یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ حملوں کے دوران حفاظت کی غرض سے سخت مٹی کے ڈھلوان پشتے اور خندقیں تھیں لیکن ہڑپا اور موہن جو داڑو کے فصیل بند قلعوں کی دریافت اور اسی سلسلہ میں ہڑپا کے مقامات مثلاً مکران میں ست کاگندر ، سندھ میں علی مراد اور دیگر نامعلوم زمانوں کے آثار الصنادید کی دریافت سے تصویر بالکل بدل گئی ہے ، کیونکہ یہاں ایک انتہائی ترقی یافتہ تہذیب کا سراغ ملتا ہے جو کہ لازماً غیر آریائی تھی ، اب معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے لوگوں نے بڑے پیمانہ پر قلعہ بندیاں کی تھیں اور ایک ایسے عہد میں شمال مغربی ہندوستان کے دریائی نظام پر قابو پالیا تھا جو کہ اس خطہ میں ابتدائی آریائی حملوں سے کچھ زیادہ بعید نہیں ہے ، ان مستحکم بستیوں والی تہذیب کو کس نے تباہ کر دیا ؟ اس تباہی کی سب سے زیادہ شہادت موہن جو داڑو کے آخری دور سے حاصل ہوئی ہے ، اور ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ تباہی کی وجہ تھی ثقافتی پیمانوں میں موسمی ، معاشی اور سیاسی انحطاط ۔

قلعہ بند بستیوں کے غلہ گوداموں کی ۲۰ فٹ یا اس سے بھی زیادہ اونچی اینٹ گارے کی تعمیرات ملبہ کے ڈھیر میں دب کر رہ گئی تھیں جن کے درمیان معمولی درجہ کی عمارتیں باقی بچ گئی تھیں ، ان تمام بستیوں میں نچلے طبقہ کی گنجان آبادی کے لئے علیحدہ علاقے مخصوص کر کے گھر بنائے گئے تھے جو کہ سیلاب سے بچاؤ کے لئے کچی یا پکی اینٹوں کے چبوتروں پر تعمیر کئے گئے تھے ، یہاں سڑکوں پر ناجائز قبضے کئے گئے تھے یا تو پوری پوری گلیاں یا ان کے کچھ حصوں پر بدنما ڈھانچوں بلکہ بعض جگہوں پر تو بھٹیوں سے بند کر دی گئی تھیں حالانکہ کچھ پہلے کے بہتر دور میں ان کی تعمیر رہائشی علاقوں میں ممنوع قرار دیدی گئی ہوتی ۔

دورِ متاخرین کا موہن جو داڑو ۔

اور غور کیجئے تو ہڑپا اور دیگر بستیاں بھی اپنی ابتدائی ہیئتوں کا بڑا خراب عکس تھیں تاہم اس طرح کے سماج کی انجام کار تباہی کی
ں متوقع یہی ہے کہ یہ تاراجی کسی بیرونی سبب کے بنا پر ہی ہوئی ہوگی ، اور ایسا ہی ہوا بھی تھا ، موہن جو داڑو کے آخری مرحلہ میں
رد ، عورتیں اور بچے گھروں اور سڑکوں پر قتل کر دیئے گئے تھے ، اور ان کے لاشے وہیں پڑے رہے یا بہت ہوا تو بنا کسی رسم تدفین
بس کسی طرح تہ خاک کر دیئے گئے تھے ، چنانچہ ایچ آر ایریا کے ایک کمرہ میں تیرہ بالغ مرد اور عورتوں نیز ایک بچہ کے ڈھانچوں سے
لوم ہوتا ہے کہ یہ سب بیک وقت قتل کئے گئے تھے ، ان میں سے کچھ ہار ، انگوٹھیاں اور نگینے پہنے ہوئے تھے ، ان کی ہڈیاں تک
خم ہو گئی تھیں ۔ لیکن ایک کھوپڑی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ۱۴۶ سینٹی میٹر لمبی سیدھی ضرب کاری لگی تھی جو کسی تیز دھار دار

ہتھیار مثلاً تلوار سے ہی ممکن ہے۔ گمان غالب ہے کہ اسی وار نے رشتۂ حیات منقطع کیا تھا، ایک دوسری کھوپڑی میں بھی ایسے تشدد کے نشانات ملے تھے۔ وی ایس ایریا کی ایک گلی میں ایک بچہ سمیت ۶ ڈھانچوں کا ایک گروہ پایا گیا، ایچ آر ایریا کی ایک اور گلی میں ایک ڈھانچہ ملا جس کی موت اور تدفین کے حالات جو بھی رہے ہوں واضح نہیں ہو سکے۔ ڈی کے ایریا میں ۹ ڈھانچوں کا ایک ڈھیر پایا گیا جن میں سے پانچ بچوں کے تھے اور عجب مسخ شدہ حالت میں ایک دوسرے میں پیوستہ تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک کم گہری خندق میں لیٹے ہوئے تھے، ان کے پاس سے دو ہاتھی دانت بھی برآمد ہوئے ہیں، ان کو کھود نکالنے والوں کا خیال ہے کہ وہ ایک ایسے خاندان کے افراد تھے جنھوں نے حملہ کے وقت اپنی گرہستی سمیٹ کر شہر سے باہر بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن حملہ آوروں نے انھیں قتل کر دیا، اس خاندان کا کوئی فرد یا بعض افراد ہاتھی دانت کی صناعی کے پیشہ سے وابستہ تھے، لیکن حملہ آوروں نے ہاتھی دانت کو فضول شئی سمجھ کر چھوڑ دیا اور باقی گرہستی لوٹ لے گئے۔

اسی آخری دور سے متعلق ڈی کے ایریا کے ایک عوامی کنواں گھر میں ایک اور المناکی کا منظر نظر آتا ہے جس میں چار جانیں گئیں، بغل کی زیریں سٹرک سے اس کنویں تک آنے کے لئے اینٹوں کا ایک مختصر زینہ تھا اس سیڑھی پر دو انسانی ڈھانچہ ملے تھے، بظاہر یہ لوگ باہر بھاگ نکلنے کی ناکام کوشش میں اسی جگہ مارے گئے تھے جہاں ان کے لاشے پڑے ہوئے ملے تھے، غالباً ان میں سے ایک عورت تھی، ایسا لگتا ہے کہ دوسرا شخص مرنے سے قبل پیچھے کی طرف گر پڑا، تیسری اور چوتھی لاش کے باقی ماندہ ٹکڑے بیرونی حصار کے قریب پائے گئے تھے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان چاروں اشخاص کو قتل کیا گیا تھا، اسے تقریباً یقینی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ڈھانچے موہن جوداڑو کی آبادکاری کے آخری مرحلہ سے متعلق ہیں اور اس کے بعد کے حملوں سے متعلق نہیں ہیں۔ اس حقیقت سے کہ ان ڈھانچوں میں سے ایک کی ہڈیاں کنواں گھر کی راہ داری پر اور دوسرے کی ہڈیاں نالی کے گڑھے میں ملی تھیں، یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ کنواں گھر اور نالی اس وقت بھی زیر استعمال تھیں جس وقت کہ یہ سانحہ وقوع پذیر ہوا۔

نظیر۔ اس طرح کے واقعاتی نظائر کو زمانی تسلسل کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اندر مجرم ٹھہرتے ہیں، بصورت دیگر اگر ہم ہڑپا کے فصیل بند قلعوں کو ان قلعوں سے مختلف تسلیم کریں جو کہ اندر اور ویدک آریوں نے بعد میں مسمار کئے تھے، تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس مختصر وقفہ میں جو سندھ گھاٹی کی تہذیب اور آریائی حملوں کے درمیان بتایا جاتا ہے، ایک نامعلوم مگر زبردست تہذیب اسی خطہ میں پنپی اور اس نے حملہ آوروں کے خلاف زبردست قلعہ بندیاں کیں، یہ دوسرا مفروضہ پہلے سے بھی زیادہ مشکل ہے، یہ بہتر معلوم ہوتا ہے جیسا کہ نظائر سے ظاہر ہے کہ دونوں واقعات کو ایک ہی وقوعہ تسلیم کرلیں اور یہ فرض کرلیں کہ پانچویں یا چھٹی صدی قبل مسیح میں لب گور ہڑپا تہذیب آریائی حملوں سے اسی طرح منہدم ہوئی جیسا کہ ویدوں کے بعض دعوی

کرتے ہیں لیکن پھر آریہ لوگ بعد کے درشت مزاج فاتحین سے الگ کہاں رہے ؟

مزید ثبوت ۔ طویل عرصہ کے بعد ہی فاتحین، مفتوحین کی ہزیمت خوردہ تہذیب کے زیر دام آ گئے، اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ وہی شتھنا دیوہ جسے لنگ بھگوان کی حیثیت سے رد کیا گیا تھا، بعد میں ہندو خداؤں کی صف میں بڑے بڑے خداؤں کے ہم سر ٹھہرائے گئے، مثال کے طور پر مہادا س جو ہندو خداؤں کی تثلیث علیا میں شامل ہے، ویدک آریہ بت پرستی نہیں کرتے تھے لیکن بعد میں انہوں نے بت پرستی بھی شروع کر دی، اس تہذیبی ارتداد کے آگے منکرین خدا فلسفیوں مثلاً جے منی اور کماری بھٹ نیز ان لالچی برہمنوں کی کوششیں بھی ناکام ہوگئیں جو ویدک رسومات کی برتری قائم رکھنے کے لئے بھی کوشاں تھے، اور یگیہ کرنے کے لئے بھاری فیس بھی وصول کرتے تھے، اس طرح ایک لمبے عرصہ میں ایک معجون مرکب مذہب کی تشکیل ہوئی جس نے نہ صرف سندھ گھاٹی تہذیب کے مذکر و مؤنث خداؤں کو انگیز کر لیا تھا بلکہ آدی باسیوں کی بہت سی رسومات بھی اپنائی تھیں ۔

تہذیبی اختلاط کا یہ عمل آج بھی جاری ہے اور شرڈی کے سائیں بابا جیسے مسلم صوفی کو مقدس ہندو خداؤں کا درجہ دے دیا گیا ہے، ستیہ نارائن جس کی پوجا عام طور پر کی جاتی ہے اسے صنمیاتی لٹریچر کی سند حاصل نہیں ہے، سنتوشی ماں تو بہت جدید اضافہ ہے، اسی طرح مسلمان بھی ہندوئیت سے متاثر ہوئے ہیں ان میں رائج مذہبی رسومات مثلاً پیر و اولیا کی مزارات کی خدمت گذاری اور تعزیہ داری وغیرہ ان ہندو اثرات کے ثبوت ہیں، مسلمانوں کو ان ہندو اثرات سے نجات دلانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں لیکن ان نام نہاد ہندوؤں کے مظالم صرف حملہ آور ویدک آریوں ہی تک محدود نہیں رہے ہیں۔ بہت سے ہندو راجہ نہایت ظالم بے وفا اور شاہ کشی کے مرتکب ہوئے ہیں، مثال کے طور پر پشیہ متر جو آخری موریہ مہاراجہ کا ایک برہمن افسر تھا، اس نے اپنے ہی مہاراجہ کو دھوکہ سے قتل کر کے سنگ حکومت قائم کی اور اس کے بعد بودھ عوام کا قتل عام کیا اور بودھ خانقاہوں کو مسمار کیا۔

قتال ۔ گپتا عہد کے آخری مہاراجہ نے بودھوں کو بڑے پیمانہ پر قتل کرایا، ان کے مقامات مقدسہ کو مسمار کرایا اور یہانتک کہ بودھوں کے مقدس درخت کو جڑسے اکھاڑ کر پھینکوا دیا۔ نالندہ جو تحصیل علم کا ایک بڑا مرکز تھا اسے اس کی لائبریری سمیت جو کہ اس وقت دنیا کی سب سے بڑی لائبریری تھی، نذر آتش کرا دیا گیا۔ اس طرح بدھ مت کو ہندوستان میں یکسر مٹا دیا گیا جس کا احیاء جزوی طور پر تو آثار قدیمہ کی کھدائی سے ہوا مگر زیادہ تر تبت، چین، ہندچین، سری لنکا اور جاپانی ماخذ کی بدولت ہوا۔ اب یہ بات کہ اورنگ زیب جس کے خلاف خاص الزام تراشی ہوئی، اس کے دور میں بھی نہ تو ہندوؤں کو کلیۃً نابود کیا گیا اور نہ ہی متھرا کے دوارکادھیش اور کاشی کے وشوناتھ سمیت ہندوؤں کے تمام مقدس مقامات کو منہدم کیا گیا، یہ ثابت کرتی ہے کہ مسلمان حکمران ایسے

ظالم نہیں تھے جیسے کہ کچھ صدیوں پہلے ان کے ہندو قائم مقام تھے۔

گرو جی۔ تکبر نسل پرستی اور عدم رواداری کی ایک دوسری مثال آر ایس ایس کے دوسرے سرسنگھ چالک مادھو سدا شیو گولوالکر کے کتابچہ " ہم، ہماری قومیت " میں مہیا ہے، جس میں انہوں نے جرمنی میں یہودی مسئلہ کے حل کے لئے ہٹلر کی کھلے دل سے ستائش کی ہے، یہ کتاب ۱۹۳۹ء کی ابتدا میں شائع ہوئی تھی، اور تعجب ہے کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد بھی اس کی اشاعت پر پابندی نہیں لگائی گئی تھی۔ اس کتاب میں گولوالکر نے صریح طور پر درج کیا ہے کہ غیر ہندوؤں کو ہندو طرز حیات، تہذیب زبان وغیرہ کو اپنانا ہوگا ورنہ بصورت ناکامی انھیں ہندوستان چھوڑ دینا چاہیے، یا ان کے ساتھ محکوموں جیسا سلوک کیا جائے گا، یہ بیان قرآن مقدس کی تعلیمات کے یکسر مخالف ہے جس نے کہ یہ حکم دیا ہے کہ مسلم حکمراں اسلام پر ایمان نہ رکھنے والوں کو بھی پورا تحفظ فراہم کریں ۔ مزید برآں ایڈوانی اور ان کے احباب اپنی حب الوطنی اور تحریک آزادی میں اپنے فعال شرکت کی شیخی بگھارتے ہوئے کبھی تھکتے ہی نہیں جب کہ آر ایس ایس اور ہندو مہاسبھا نے تحریک آزادی میں کبھی حصہ لیا ہی نہیں بلکہ ہندو مہاسبھانے تو مخالفت کی تھی اور تحریک آزادی کو کچلنے میں برطانوی شہنشاہیت سے تعاون کیا تھا۔ اگست ۱۹۴۲ء کے ہندوستان چھوڑو آندولن کے دوران ہندو مہاسبھا برطانوی فوج میں بھرتی کی پرجوش وکالت کر رہی تھی، اور اس کے رہنما مثلاً بی ایس منجے وائسرائے کی انتظامی کونسل کے ممبر تھے، بنگال کے وزیر مالیات کی حیثیت سے شیاما پرساد مکھرجی اس ریاست میں تحریک آزادی کے سفاک ترین انسداد کے ایک فریق تھے۔ شیاما پرساد مکھرجی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ انہوں نے فروری ۱۹۴۳ء میں مشرقی بنگال کے ۴ لاکھ مسلمانوں کو ان کے غریب ہندوؤں بھائیوں کے ساتھ فاقہ کشی سے مار ڈالا۔

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ اگرچہ ہندو مہاسبھا کی کوئی قابل ذکر اساس نہیں تھی پھر بھی آزاد ہندوستان کی پہلی کابینہ میں مکھرجی کو وزیر اقتصادیات وصنعت بنایا گیا جب کہ نیتاجی سبھاش چندر بوس کے بھائی شرت چندر بوس جو کہ ۱۹۴۶ء میں کانگریس کی کامیابی کے درخشاں ستارے تھے نظر انداز کر دیئے گئے۔

بقیہ حیات۔ یوں دیکھئے تو یہ انڈین نیشنل کانگریس تھی اور جواہر لال نہرو تھے جنہوں نے ہندو فرقہ واریت کو رمق حیات بہم پہونچائی، جس وقت مکھرجی نے بھارتیہ جن سنگھ پارٹی قائم کی، نہرو نے انھیں حزب مخالف کے لیڈر کی حیثیت سے ابھارنے کی کوشش کی، باوجودیکہ ان کی پارٹی کے صرف دو ممبر ہی لوک سبھا میں شامل تھے اور مکھرجی کسی بھی اعتبار سے بہترین مقررین میں سے بھی نہیں تھے متعدد ایسے لوگ موجود تھے جو بحیثیت ایک دانشور اور خطیب کے مکھرجی سے کہیں بہتر تھے۔

یہی نہیں بلکہ دختر نہرو اور ان کے نواسہ نے بھی ہندو فرقہ واریت کی منہ بھرائی میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کی، یہ راز تو اب

عیاں ہے کہ بابری مسجد کا تالا کانگریس حکمرانوں نے ہی کھولا تھا اور یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے یاترا اور شلانیاس کی اجازت دی تھی جس نے ہندی بیلٹ میں مسلمانوں کے قتل عام کی راہ ہموار کی جس کا بدترین مظاہرہ بھاگلپور میں ہوا، آج تک نہ تو کوئی پکڑا گیا ہے اور نہ ہی کسی کو سزا دی گئی ہے ۔

اجازت ۔ گذشتہ کانگریسی حکومت کے آخری دنوں میں متنازعہ جگہ پر "شلانیاس" کی اجازت دی گئی تھی، وہ بھی عدالت کے خصوصی احکامات کے برخلاف آج بھی عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے کانگریس آئی اور بی جے پی ایک دوسرے کو اپنا دشمن مشتہر کرتے ہیں، لیکن درحقیقت ایک دوسرے کے مؤید ہیں جیسا کہ لوک سبھا میں اسپیکر اور نائب اسپیکر کے عہدوں پر چھینا جھپٹی کے لئے ان کی باہمی مفاہمت سے ظاہر ہوتا ہے اس وقت بھی جب کہ وشوہندو پریشد، آر ایس ایس اور بجرنگ دل کے شہدوں نے بابری مسجد کو نقصان پہونچایا تھا، کانگریس آئی کا رول قابلِ مذمت تھا جس نے شہدوں کے برپا کئے ہوئے تشدد کو قابل عفو گردانا اور یوپی کے وزیر اعلیٰ سے مطالبہ کیا کہ اجودھیا ستیہ گرہ کرنے والوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کیا جائے جو ان کے مطابق یہ تھا کہ اہم تحریک تحفظ کا درجہ دیا جائے، جن تین ریاستوں میں بی جے پی کی حکومت قائم تھی ان سب کی سرکاری مشینری ان ستیہ گرہ کرنے والوں اور ایڈوانی کی رتھ یاترا کے لئے مختص کر دی گئی تھی ۔

۱۔ یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ بابری مسجد کی تعمیر کے لئے کوئی مندر منہدم نہیں کیا گیا تھا، چنانچہ بابری مسجد ایکشن کمیٹی تو اس بات کے لئے تیار تھی کہ بین الاقوامی حیثیت کے غیر جانب دار مؤرخین جن کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے انھیں تحقیق مسئلہ پر مامور کیا جائے، لیکن وشوہندو پریشد اندھی عقیدت سے مخالفت کرتی رہی، ان کے ساتھ بی بی لال کے سوا کوئی بھی نہیں ہے اور وہ بھی اس صورت میں کہ وہ اپنی ایک دہائی قبل کی تحریروں کی خود ہی نکیر کر رہے ہیں، ان پر یہ الزام عام طور پر لگایا گیا کہ انہوں نے اجودھیا کی کھدائی کے حقائق کو بازخیالی اور ترتیب نو کا موقع دیئے بنا فوراً شائع نہ کر کے آثار قدیمہ کے ماہر کا ضابطۂ اخلاق پامال کیا ہے۔ ان کا قصور یہ بھی ہے کہ انہوں نے بیش قیمت سرکاری املاک کا مجرمانہ تصرف کیا ہے، انہوں نے ابھی تک وہ ڈائری بھی حکومت کے سپرد نہیں کی جس میں وہ اجودھیا کی کھدائی کا روزنامچہ لکھتے تھے بلکہ اسے اپنا ذاتی سرمایہ سمجھ کر رکھے ہوئے ہیں حالانکہ انہوں نے یہ ساری کارروائی ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے اور عوام کے پیسہ سے کی تھی ۔

یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ حکومت ہند نے اب تک ان کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کیوں نہیں کی جب کہ مجرمانہ عہد شکنی ہے، یہ ڈائری بی بی لال کی تازہ دروغ گوئی کو بالکل نمایاں کر دے گی، اور ایس پی گپتا کے ہذیانی بیانات کو بھی حالانکہ ماہرین کے حلقہ میں کسی نے بھی انہیں سنجیدہ بحث کے قابل سمجھا ہی نہیں۔ نام نہاد قومی پریس میں وشوہندو پریشد بی جے پی اور ان کے

یاران غار گوئبلز کی طرز کا پروپیگنڈا کر رہے ہیں، یہ وہ اخبارات ہیں جن کے دھنا سیٹھوں نے حالیہ الیکشن میں غیر جانب دار مورخین کی کردار کشی کے لئے بی جے پی کو کروڑوں روپے دیئے تھے۔

تاریخ ۔ اگر تمام شہادتوں کے برعکس یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ایک مندر منہدم کیا گیا تھا تو پھر یہ تو ایک حقیقت ہے ہی کہ تمام ہندو مندر کسی نہ کسی بدھ یا آدی باسی مقام مقدس کو منہدم کر کے ہی بنائے گئے تھے۔ کیا بی جے پی اس کے لئے تیار ہے کہ تمام ہندو عبادت گاہوں کو آثار قدیمہ کے اس پیمانہ پر پرکھا جائے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ ایڈوانی اور ان کے احباب کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ گیا کی ہندو عبادت گاہ جہاں ہندو لوگ اپنے پرکھوں کی مکتی کے لئے آخری رسومات ادا کر کے سال بہ سال پتر پلیش منعقد کرنے سے پیچھا چھڑاتے ہیں، وہ ایک بدھ عبادت گاہ پر قائم کی گئی ہے۔ کسی کو یہ وضاحت پیش کرنے کا خیال بھی نہیں آیا کہ ایک مقدس بدھ عبادت گاہ ہندوؤں کا ایسا متبرک ترین مقام کیسے بن گئی کہ وہاں پر مردہ روحوں کی مکتی ہوتی ہے۔

بابری مسجد کے انہدام کا ایک اور شاخسانہ سیکولر عناصر نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۹۰ء کو بابری مسجد کو جو کسی قدر نقصان پہنچا بنگلہ دیش میں اس کا شدید ردعمل ہوا۔ یہ تو اس ملک کے مسلمانوں کا ایک کارنامہ ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کی مدد کے لئے کمربستہ ہو گئے، اب اگر مسجد کو منہدم کیا گیا تو ان مسلم ممالک میں کیا ہوگا جنہوں نے پچاس لاکھ ہندوؤں کو ملازمت دے رکھی ہے، کیا وہ سب ملک بدر نہ کر دیئے جائیں گے، اور وہاں پر ہندوستانی برآمدات بھی بند ہو جائیں گی؟۔

سوال ۔ ہمارے ملک سے ان ممالک کو بڑے پیمانہ پر برآمدات فراہم کی جاتی ہیں، اس صورت میں ہمارے بہتیرے کارخانے بند ہو جائیں گے اور ہندوستانیوں کو سخت بے روزگاری کا سامنا کرنا ہوگا اور عدیم المثال تنگی بھی بڑے پیمانہ پر سامنے آئے گی، عراقی انخلا نے ہی ہمیں تقریباً دیوالیہ بنا دیا ہے جس وقت تمام مسلم ممالک ہندو ہندوستان سے بیزار ہوں گے اس کے عواقب کا تصور دھنا سیٹھوں کو کرنا چاہیئے جو ایڈوانی ان کے یاران غار اور بی جے پی، وشو ہندو پریشد وغیرہ کو بانس پر چڑھا رہے ہیں ۔ دوسرا اہم پہلو جو ایڈوانی کو کبھی نہیں بھولنا چاہیئے یہ ہے کہ جس معاہدہ کے تحت ملک تقسیم ہوا تھا اس میں پاکستان سے پوری مسلم آبادی کے تبادلہ کی سفارش کبھی نہیں کی گئی تھی، اگر ایسا ہوتا تو پاکستان کو ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء (تقسیم کے وقت) پورے ہندوستان کی مسلم آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ وسیع خطہ فراہم کیا گیا ہوتا، اس باب کو یونہی بند نہیں کیا جا سکتا بلکہ کسی بھی وقت ہیگ کی بین الاقوامی عدالت سے انصاف کی دہائی دی جا سکتی ہے۔

دفعہ ۳۷۰ ۔ ایڈوانی دستور کی دفعہ ۳۷۰ (جس میں کشمیر کے خصوصی درجہ کی ضمانت دی گئی ہے) مسترد کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے ایڈوانی کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ دفعہ بھی عدالت کے دائرۂ کار کے اندر آتی ہے کیونکہ یہ ضمانت دستاویز الحاق میں دی گئی تھی۔ مزید یہ کہ پاکستان ان ہندوستانی کا شمیریوں کی اتباع کرنے کا دعویٰ کرتا ہے جو

ہندوستان نے حیدرآباد اور جونا گڈھ میں کی تھیں، ایڈوانی آخر کس طرح پہلی کارروائی کو دوسری سے ممتاز کر سکتے ہیں ؟ ۔

آخر میں ایڈوانی کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اگرچہ یوپی میں بی جے پی کو لوک سبھا اور اسمبلی نشستوں کی تعداد میں اکثریت حاصل ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ یوپی میں صرف پچاس فیصد پولنگ ہوئی تھی اور اس پچاس فیصد میں سے محض ۳۳ فی صد ووٹ بی جے پی کو مل سکے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یوپی میں بھی ۸۴ فی صد سے زائد رائے دہندگان نے بی جے پی کو مسترد کر دیا ہے ۔

(سہ روزہ دعوت نئی دھلی ۱۰ اگست ۱۹۹۱ء بحوالہ ریڈینس دھلی)

ہماری نظر میں

نام کتاب، سرِ شاخِ طوبیٰ (حمد و نعت کا مجموعہ)

مصنف ۔ فضا ابن فیضی

قیمت ۔ ۷۵ روپئے

پتہ ۔ جامعہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس (یوپی)

مبصر ۔ ابن احمد

فضا ابن فیضی کا نام آتے ہی ذہن میں ایک باوقار، وضعدار اور خاکساری کی حد تک منکسر المزاج درویش صفت شخص کی دل آویز تصویر ابھرتی ہے، جو اپنے تبحر علمی، فنی کمال اور شاعرانہ عظمت کے پندار سے بے نیاز، ہر شخص سے روایتی وضعداری کے ساتھ ٹوٹ کر ملتا ہے کہ ملنے والے کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے وقت کے ایک عظیم فن کار اور متبحر شخص سے ہم کلام ہے، طبیعت کا خلوص اور اپنائیت فضا کی دلنواز شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ہے، ان کی شخصیت کی طرح ان کا فن بھی مصنوعی رنگ اور آرائش سے پاک ہے، شخصیت اور فن کی اسی سادگی اور خلوص نے فضا کو وہ عظمتیں عطا کی ہیں جو اقلیم سخن میں ہر ایک کی قسمت میں نہیں ہوتیں۔

فضا ابن فیضی کی شاعری کی عمر کم وبیش نصف صدی کو پہنچ چکی ہے، لیکن فکر وفن کی انتہائی بلندیوں کو سر کر لینے کے باوجود ان کے مطبوعہ کلام کے مجموعوں کی تعداد ابھی نصف درجن تک بھی نہیں پہنچ پائی ہے، آج تک ان کے صرف چار مجموعے شائع ہوئے ہیں، پہلا مجموعہ "سفینۂ زرگل" تھا، جس نے غزل کو ایک نیا لہجہ اور جہت عطا کی، اس کے بعد "شعلۂ نیم سوز" جس نے نظم کو نیا آہنگ اور اسلوب دیا۔ حال ہی میں "دریچۂ سیم سخن" ان کی غزلوں کا نیا مجموعہ شائع ہوا ہے جس میں احساس کی شدت اور کرب خود آگہی کا ایک اور ہی انداز ہے، ان کتابوں کے بعد اب یہ زیرِ نظر کتاب منظر عام پر آئی ہے، جو حمد و نعت اور ترانوں پر مشتمل ہے، اس میں فضا کی فکر فلک پیما کے نمونے بھی ہیں، اور حمد و نعت کی زمزمہ سنجی بھی، بھوپال کے گیس سانحہ کا مرثیہ بھی ہے، اور مئو کے فساد پر خون کے آنسو بھی، ہر جگہ فضا کی فکر اور اسلوب اپنی پوری توانائی اور تابندگی کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

ابتدا میں فضا ابن فیضی نے اقبال کی فکر سے استفادہ کیا تھا، اور ان کے اسلوب کا تتبع کرتے ہوئے ان ہی کے آہنگ

میں طویل نظمیں لکھیں، یہ تتبع اتنا بھرپور اور کامیاب ہے کہ بعض اوقات ان کے اور اقبال کے کلام میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔
" یزداں جبریل اہرمن " کا ایک بند دیکھئے :

یہ سوزِ خود افروز کی دولت سے ہے محروم
ہے اس کی ہر اک صبح اندھیروں سے گراں بار
لطفِ نگہ غیر پہ قانع ہے ازل سے
یہ ذلت و محکومیِ جاوید کا شہ کار
زرخیز مگر کر نہ سکا خاک چمن کو
وہ جس نے کیا آتش نمرود کو گلزار
تھراتے ہیں طوفانِ پُرآشوب سے اس کے
کاشانۂ تقدیر امم کے در و دیوار
تو دیکھ چکا جذبۂ تخلیق کا انجام
خورشید سے کہہ دے کہ ہو مغرب سے نمودار

یہ نظم ۱۹۵۴ء کی تخلیق ہے، ۳۶ سال قبل کہی گئی اس نظم میں آج بھی تاثیر کی وہی گرمی اور دل آویزی ہے، اگرچہ آج فکر و فن کے زاویئے اور پیمانے بدل چکے ہیں۔ نئی نسل یزداں، جبرئیل اور اہرمن کی اصطلاحوں اور ترکیبوں سے زیادہ مس نہیں رکھتی، لیکن سخن سنج طبیعتیں جانتی ہیں کہ آج بھی یہ نظمیں اسی طرح ذہن کو جھنجھوڑتی ہیں اور ضمیر کو چونکاتی ہیں، جیسے کل جذبات میں لَو کے لگاتی تھیں۔ اقبال کی شاعری آج بھی اپنی دل کشی اور سحر انگیزی میں اتنی ہی توانا ہے جتنی نصف صدی قبل تھی۔ جبرئیل و ابلیس کا مکالمہ آج بھی پڑھنے اور سمجھنے والوں کو اسی طرح مسحور کرتا ہے، اقبال کے تتبع میں کہی گئی فضا کی یہ نظمیں بھی، آج بھی اسی طرح شگفتہ اور تازہ ہیں، اور دامنِ دل کو کھینچتی ہیں۔

حمد و نعت کا یہ مجموعہ اس لحاظ سے بڑا اہم ہے کہ اس میں سلفی فکر و عقیدہ کے مطابق احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اظہارِ عقیدت کیا گیا ہے، توحید و شرک کا وہ نازک فرق جسے ہمارے اکثر شعراء عقیدت مندی کے غلو میں نظر انداز کر جاتے ہیں، اور شرک کے خارزار میں الجھ کر اپنا دامن فکر چاک کر لیتے ہیں، یہ غلو اور بے احتیاطی فضا کے ہاں نہیں ہے۔ وہ عقیدت اور بے خودی میں اندازۂ گفتار کو فراموش نہیں کرتے۔ ان کی نعتیں پڑھ کر طبیعت میں تکدر اور انقباض پیدا نہیں ہوتا، بلکہ وجدان

میں شگفتگی اور اہتزاز کی کیفیت محسوس ہوتی ہے، وہ طبیعتیں جو حمد و نعت کا پاکیزہ ذوق رکھتی ہیں، لیکن نعت گو شعراء کی بے راہ روی سے بددل ہو چکی ہیں، انہیں فکر و عقیدہ کی سلامتی کے ساتھ کہی گئی دلکش اور کیف آور نعتوں پر مشتمل اس کتاب کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے۔

فضا ابن فیضی نے دینی درسگاہوں کے لئے ترانے بھی لکھے ہیں۔ یہ بھی نغمگی اور پاکیزگی کا دلکش نمونہ ہیں، مترنم بحروں اور نغمہ بار الفاظ کے ساتھ شاعر نے مقصدیت کو فراموش نہیں کیا ہے، توحید و سنت کا تابناک تصور ان کے ہاں ہر جگہ نمایاں ہے، وہ الفاظ کی طلسم آفرینی سے زیادہ فکر کی پاکیزگی کا خیال رکھتے ہیں، اور اپنی فکری اساس کو کہیں بھی متزلزل نہیں ہونے دیتے۔ جامعہ سلفیہ مرکزی دارالعلوم بنارس کے ترانے کا ایک بند ملاحظہ ہو:

سراغِ جادۂ عمل، حدیث مصطفیٰ ہمیں\
اسی کا حرف حرف ہے نشاطِ ماجرا ہمیں\
نہیں قبول اب کوئی پیام دوسرا ہمیں

ادا شناسِ عظمتِ حدیثِ مصطفیٰ ہیں ہم\
کہ گلشنِ رسول کے طیورِ خوشنوا ہیں ہم

فضا ابن فیضی کے فکر و فن کے ارتقائی مطالعے کے لئے یہ کتاب بے حد اہم ہے، اس سے ہمارے پاکیزہ ادب میں ایک گراں قدر اضافہ بھی ہے، اور امید ہے کہ ادب کا ستھرا ذوق رکھنے والے حلقوں میں اس کتاب کی گرم جوشی سے پذیرائی ہوگی۔

...

باب الفتاویٰ

مسئلۂ زکوٰۃ

کیا فرماتے ہیں علماء دین ان مسائل میں کہ :

۱۔ ایک شخص اپنے مکان کے آدھے حصے میں بذاتِ خود رہتا ہے اور آدھے حصے میں کرائے دار تو آدھے حصے پر زکوٰۃ واجب ہے کہ نہیں ؟

۲۔ ایک شخص نے مکان صرف کرائے پر دینے کو بنوایا ہے اور اس کا کرایہ بھی آتا ہے اور وہ دوسرے مکان میں رہتا ہے، تو پہلے مکان میں زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں ؟

۳۔ ایک شخص بہت مفلس ہے، ایک عرصہ سے مکان ورثہ میں ملا ہے جس میں کرایہ دار رہتے ہیں جو کہ پرانے ہیں اور برائے نام کرایہ دیتے ہیں تو اس مکان کی زکوٰۃ وہ مفلس کیونکر ادا کرے ؟

۴۔ ایک شخص پلاٹ خریدتا ہے اور چند سال کے بعد قیمت بڑھ جانے پر فروخت کر دیتا ہے، ان پلاٹوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں ؟

۵۔ ایک شخص کے پاس چند سالوں سے ایک پلاٹ ہے وہ اس پر مکان کی تعمیر کرنا چاہتا ہے فی الحال تعمیر کی رقم نہیں ہے، تب تک وہ اس پلاٹ کی زکوٰۃ دے گا یا نہیں ؟

۶۔ ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ کی سواری موٹر ہے جو کرایہ پر چلتی ہے اچھا خاصا کرایہ آتا ہے، اس موٹر پر زکوٰۃ ہے، یا نہیں ؟

۷۔ ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپے کی مشین اور ہزاروں روپے کے اوزار ہیں جن سے وہ مزدوری کرتا ہے ان مشینوں اور اوزاروں پر زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں ؟

۸۔ ایک شخص کی خود کی ملکیت کی دوکان ہے جو لاکھ روپے سے زیادہ کی قیمت رکھتی ہے، اس پر تجارت کرتا ہے، تو اس دوکان کی زکوٰۃ ادا کرے یا نہیں ؟۔

۹ ـ ایک شخص نے علم نہ ہونے کیوجہ سے چار پانچ سال سے زکوٰۃ نہیں دی وہ پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے یا صرف ایک سال کی ؟ ـــــــــــــــــــ

والسلام

المستفتی

امام مسجد اہلِ حدیث

مچھلی بازار ، اندور ، یوپی

الجواب وھو الموفق للصواب ـ

۱ ، ۲ ، ۳ ـ وہ مکان جو کرایہ پر اٹھایا جاتا ہو اس کی آمدنی پر زکوٰۃ ہے جب وہ نصاب کو پہنچ جائے اور اس پر حولان حول (ایک سال کا وقفہ) گزر جائے ـ

۴ ـــ اگر تجارت کی نیت سے خریدا تھا تو قیمت پر زکوٰۃ واجب ہے ، بعض علماء کے نزدیک صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہے ، بعض کے نزدیک جتنے سال گذرے ہیں اتنے سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے ، احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ جتنے سالوں سے خرید رکھا تھا اتنے سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے ـ

۵ ـــ ایسے پلاٹ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے ـ

۶ ، ۷ ـــ موٹر مشین ، کارخانے پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے ، یہ آلاتِ کسب ہیں ، ان سے ہونے والی آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے ـ

۸ ـــ اس دوکان پر زکوٰۃ واجب ہے ـ

۹ ـــ جب سے زکوٰۃ واجب ہوئی اسی دن سے حساب کر کے ادا کرنا ہوگی ـ

ـــــــ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب ـــــــ

احمد مجتبیٰ سلفی

۲۱ ؍ محرم ۱۴۱۲ھ

الجواب صحیح

محمد رئیس ندوی ـ

جامعہ سلفیہ ، بنارس

NOVEMBER 1991 Vol. IX - No. XI

MOHADDIS

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE

جامعہ سلفیہ کی تازہ ترین پیش کش

تالیف

ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن صاحب

استاذ شعبۂ عربی، راجشاہی یونیورسٹی، بنگلہ دیش

قیمت : Rs. 35/00

مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی

Published by: Abdul Auwal Ansari, on behalf of Darut-Taleef Wat-Tarjama
B. 18/1 G. Reori Talab, Varanasi. Editted by: A. W. Hijaji.
Printed at Salafia Press, Varanasi.